سید تقی عابدی
تعارف، تقاریب، تاثرات
جلد اول
مرتب
پروفیسر سید شجاعت علی
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

سید تقی عابدی

تعارف، تقاریب، تاثرات

(شخصیت، فن، تصانیف اور تالیفات پر مشاہیر کے خیالات)

﴿جلد اوّل﴾

0305 6406067
PDF Book Company

مرتب:
پروفیسر سید شجاعت علی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ!

SYED TAQI ABEDI TARRUF, TAQAREEB, TASSURAT
(vol.1)

By: Prof: Syed Shujaut Ali

Year of Edition : 2023
ISBN: 978-81-19035-39-7
Price ₹ 3000/- (2 vol set)

کتاب : سید تقی عابدی تعارف، تقاریب، تاثرات (جلد اوّل)
مصنف و مؤلف : پروفیسر سید شجاعت علی
سنِ اشاعت : ۲۰۲۳ء
صفحات : ۱۰۷۲
قیمت : ۳۰۰۰ روپے (دو جلدوں پر مشتمل)
تعداد : ۵۰۰
کمپوزنگ : رہبر کمپوزرز 2936۔ کلاں مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی۔۶
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے

☆ ہمالیہ بک ورلڈ، حیدرآباد۔ Ph.040-66822350
☆ صفی بک ایجنسی، ممبئی۔ M.9820480292
☆ بک امپوریم، پٹنہ۔ M.09304888739
☆ پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ۔ M.9389456786
☆ مرزا ورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد۔ M.09325203227
☆ کشمیر بک ڈپو، سری نگر۔ M.09419761773
☆ ویلی پبلشرز، سری نگر۔ M.09419003490
☆ نعیم بک سیلرز، [illegible]۔ M.09450755820
☆ دکن ٹریڈرس، حیدرآباد۔ Ph.040-24521777
☆ کتاب دار، بک سیلر و پبلشر، ممبئی۔ Ph.09869321477
☆ شاہین بک ڈپو، کلکتہ۔ M.09433050634
☆ راعی بک ڈپو، الہ آباد۔ M.07905454042
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔
☆ مکتبہ علم و ادب، سری نگر۔ M.09419407522
☆ قاسمی کتب خانہ، جموں۔ M.09797362280

پاکستان میں ملنے کا پتہ : ملک بک ڈپو، چوک اردو بازار، لاہور (پاکستان) Ph. 0092-42-37247480, 37231388

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
H.O. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.O. 3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 45678286, 23216162, 45678203, 41418204
E-mail: info@ephbooks.com, ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

0305 6406067
PDF Book Company

تعارفی خاکہ

نام : سیّد شجاعت علی
قلمی نام : شجاع کامل
تعلیمی قابلیت : M.A.(Urdu), M.A.(Eng), B.Ed,
SLET, Ph.D,
والد کا نام : سید عنایت علی مرحوم
والدہ کا نام : سکینہ بیگم مرحومہ
پیشہ : درس وتدریس
عرصۂ کارکردگی بحیثیت ٹیچر 6 سال اور بحیثیت لکچرر 24 سال

موجودہ عہدہ ومقام ملازمت:
پرنسپل ایچ. جے. تھم کالج، جلگاؤں
سابقہ صدر شعبۂ اُردو
یشونت مہاودیالیہ ناندیڑ (مہاراشٹر)

دیگر عہدے:

(i) ممبر اکیڈمک کونسل، نارتھ مہاراشٹر یونیورسٹی، جلگاؤں
(ii) چیئرمین BOS (Urdu)
Kavaytri Bahinabai Chaudhari
North Maharashtra University, Jalgaon

ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

(iii) سابقہ چیئر مین، اُردو بورڈ آف اسٹڈیز، سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ
(iv) سابقہ ممبر، اکیڈیمک کونسل، سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ
(v) سابقہ وزیٹنگ ممبر، اُردو بورڈ آف اسٹڈیز، یونیورسٹی آف پونے، پونے
(vi) ممبر، اُردو بورڈ آف اسٹڈیز، مہاراشٹرا اسٹیٹ بورڈ آف سکینڈری اینڈ ہائر سکینڈری ایجوکیشن، پونے (برائے نہم تا بارہویں جماعت)
(vii) ممبر، اُردو بورڈ آف اسٹڈیز، سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ
(viii) ممبر، آرٹس فیکلٹی، سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ
(ix) کوآپٹ ممبر، اُردو بورڈ آف اسٹڈیز، امراوتی یونیورسٹی، امراوتی
(x) ریسرچ گائیڈ (مضمون: اُردو)
(xi) مختلف جامعات کے تحت M.Phil اور Ph.D مقالات کی تنقیح کے لیے بحیثیت ریفری تقرر

تصنیف وتالیف:

[1980ء سے تاحال تصنیف وتالیف کا کام جاری ہے۔
مختصر تفصیل نیچے دی گئی ہے۔]

1. ''میں اور میرا فن'' (تنقیدی مضامین)
2. ''سمندر کے کنارے اگا سورج'' (افسانوی مجموعہ)
3. ''نذر پروفیسر تراب علی'' (مرتب)
4. ''قوسین''
5. ''مضامین شجاع''
6. ''نگارشات'' حصہ اوّل (غزل)
7. ''نگارشات'' حصہ دوّم (نظم)

نصابی کتب کی ترتیب وتدوین:

1. فنکشنل اُردو (برائے سال اوّل گریجویٹ طلبہ)
2. یشونت راؤ چوہان اوپن یونیورسٹی، ناسک کی اُردو نصابی کتاب کی ترتیب (برائے بی.اے. سال اوّل ودوم)

زیرِطبع کتب:

1. ''تاریخ ناندیڑ'' (ناندیڑ کی علمی، ادبی وسماجی تاریخ)
2. ''جدید اُردو افسانے میں ترکِ وطن وہجرت کے مسائل ایک تنقیدی جائزہ'' (تحقیقی مقالہ)

دیگر تعلیمی سرگرمیاں:

(a) ریڈیو ٹاکس آکاش وانی اورنگ آباد، پربھنی ناندیڑ سے افسانے، مباحث اور انٹرویوز نشر

عرضِ مرتب

۲۵؍جنوری ۲۰۱۹ء کو راقم الحروف پر مرتب کتاب کا ناندیڑ میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ اسی موقع پر یہ طے پایا کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کے فکروفن اور شخصیت پر ایک کتاب مرتب کی جائے، جس میں مشاہیرِ اُردو ادب کے خیالات، تاثرات، کتابوں کی رونمائی کی محافل کی تصویریں بھی شامل کی جائیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی سے میں نے تذکرہ کیا۔ انھوں نے آمادگی ظاہر کی۔

احقر نے کوشش اور عرق ریزی کر کے اس پروجیکٹ کو دو جلدوں میں ترتیب دیا تاکہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کے فن اور شخصیت کے مختلف گوشے مزید روشن ہو سکیں۔

والسلام

پروفیسر سید شجاعت علی
(شجاع کامل)
ناندیڑ

0305 6406067
PDF Book Company

فہرست

ارباب ذوق 0305 6406067 PDF Book Company

0305 6406067
PDF Book Company

0305 6406067
PDF Book Company

0305 6406067 PDF Book Company

0305 6406067
PDF Book Company

پروفیسر شارب ردولوی
لکھنؤ (یوپی)

ڈاکٹر تقی عابدی: محقق و دانشور

اُردو کے مشہور و منفرد محقق ڈاکٹر تقی عابدی کا نام ایسا نہیں ہے جس کا تعارف کرایا جائے۔ وہ ایک ایسے محقق و ناقد ہیں جن کے کام سے ہر شخص واقف ہے۔ وہ تنہا ایسے شخص ہیں جنھوں نے ادب سے تعلیمی تعلق نہ ہونے کے باوجود اتنے تحقیقی وتنقیدی کام انجام دیئے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں تلاش کی جاسکتی۔ وہ بنیادی طور پر سائنس کے طالب علم اور پیشہ سے ڈاکٹر (طبیب) ہیں اور یہ بھی نہیں ہے کہ انھوں نے ادب کی یہ خدمات اپنے پیشہ سے علیحدگی کے بعد انجام دی ہوں بلکہ وہ آج بھی اپنے طبی پیشے سے وابستہ ہیں۔ مختصر سے وقت میں جتنا کام انھوں نے اب تک تحقیق وتنقید کا کیا ہے۔ اس کی نظیر ادبی دُنیا میں کم ہے۔ کوئی سوچ نہیں سکتا کہ وہ کس وقت تحقیق وتدوین کا کام کرتے ہیں بعض لوگ جنھیں ان کا مہمان بننے کا شرف حاصل ہوا ان کا کہنا ہے کہ رات کا بیشتر حصہ وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ کام ان کی توانائی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ کام کرتے تھکتے نہیں انھوں نے فرد واحد کی حیثیت سے اب تک جتنا کام کرلیا ہے اس کے لیے اداروں اور تنظیموں کی پوری ٹیم درکار ہوتی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کے تحقیقی کاموں کا اگر جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان کے یہاں تحقیقی جستجو کے ہم رکاب تنقیدی فکر بھی ساتھ سفر کرتی ہے۔ یعنی قدیم تحقیق کے علاوہ تدوین متن کا بہت بڑا کام بھی انھوں نے کیا ہے ساتھ ہی جدید شعرا کے بارے میں بھی ان کی کتابیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی کا ایک منفرد کام میر انیسؔ کے مشہور مرثیے ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کا فنی تجزیہ ہے، جو میر انیسؔ کے مرثیوں کے مطالعے اور تحقیق وتنقید کے لیے ایک مثالی نمونہ ہے۔ اس لیے کہ اس کے بعد نہ کوئی دوسرا اس طرح کا

تجزیہ کر سکا ہے اور نہ خود تقی عابدی صاحب نے کسی نظم کا اس طرح سے تجزیہ کیا ہے۔ اگر میں ان کے اس تجزیئے کے سلسلہ میں طبی اصطلاح کا ہی استعمال کروں تو یہی کہوں گا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی نے مرثیے کا DNA کیا ہے، اس لیے کہ انھوں نے مرثیہ پر صرف ایک تنقیدی نظر ڈالنے کے بجائے اس کی خوبیاں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور خوبیوں میں لسانی خوبیاں بھی ہیں، جمالیاتی خوبیاں بھی ہیں، فنی خوبیاں بھی ہیں، اظہار و بیان کی ندرت بھی ہے۔ رشتوں کی اہمیت، جذبات کا اظہار، مناظر کے اثرات اور احساس کی شدت بھی ہے اور جہاں اتنی ساری چیزیں جمع ہو جائیں وہاں مطالعہ صرف قرأت کا نہیں رہ جاتا قاری کو الفاظ کے اندر اتر کر دیکھنا ہوتا ہے اور یہ عمل اس مرثیے کے سلسلے میں ڈاکٹر تقی عابدی نے بہت کامیابی سے انجام دیا ہے اور مرثیے کی تمام جزئیات پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

میر انیس ادب میں زبان و مضامین کے عمل سے بخوبی واقف تھے یہی سبب ہے کہ وہ جس جگہ جو لفظ استعمال کر دیتے ہیں وہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تجربہ بہت آسان ہے اور کوئی بھی کر سکتا ہے۔ میر انیس نے بعض جگہوں پر غیر مانوس روزمرہ کے الفاظ کا استعمال کیا ہے جیسے ان اشعار میں لفظ ''صندل'' اور ''پرے'' وغیرہ نظر کیجیے ؎

گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا
نکلا پرے سے دیو سا چنگھاڑتا ہوا

•••

صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے
یارب رسولؐ پاک کی کھیتی ہری رہے

اس طرح کے بے حساب مصرعے، بند اور اشعار مل جائیں گے لیکن کوئی لفظ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ جو لفظ استعمال ہوا ہے محسوس ہوتا ہے کہ وہیں کے لیے اس کی تخلیق ہوئی تھی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے الفاظ کو ایک طرح کا سُر قرار دیا ہے اسے نغمگی کہہ سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''شعر میں ہر لفظ ایک قسم کا سُر ہوتا ہے اور بحر، راگ یا نغمہ سروں کے مجموعے کا نام ہے راگ یا نغمہ کے دلکش ہونے کے لیے اسے ایسے سروں سے ترتیب دیا جائے کہ اس میں باہمی تناسب ہو اس لیے ان کی لطافت و

روانی اور شیرینی اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ گرد و پیش کے الفاظ سے ان کی مناسبت برقرار رہے۔''

(بحوالہ یادگار مرثیہ کے متعلقات)

اس طرح ڈاکٹر تقی عابدی نے الفاظ اور وقوافی کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے جو بہت اہم ہے اس لیے کہ شاعری کی ساری عمارت تعمیر ہوتی ہے اسی سُر، راگ یا نغمہ پر، لیکن اس میں بنیادی عمل زبان یا الفاظ کا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا ایک بڑا کام انیسؔ کے کلام کی تدوین ہے۔ اب تک یہ بتانا مشکل تھا کہ انیسؔ نے کتنے سلام کہے ہیں۔ پہلی بار تقی عابدی صاحب نے ان کے 102 سلام یکجا کر کے شائع کیے ہیں۔ اس میں انھوں نے اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے کہ نوحوں کو سلام میں شامل نہ کیا جائے۔ تقی عابدی نے سلام و نوحوں کو الگ کر کے دونوں اصناف میں جو باریک فرق ہے اس کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے میر انیسؔ کے پندرہ نوحے اور پانچ غزلیں بھی سلام کے مجموعے میں علیحدہ ضمیمے کی شکل میں شائع کردی ہیں جس سے انیسؔ پر کسی بھی طرح کی تحقیق کرنے والوں کے لیے راہیں ہموار ہوگئی ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا ایک بنیادی کام ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' [جلد اوّل اور جلد دوم] ہے۔ غالبؔ کا فارسی کلیات دست و بردِ زمانہ سے تقریباً ضائع ہو جانے کی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ قدیم طباعت اور کاغذ کی خستگی دونوں نے کلیات کو پڑھنے کے قابل نہیں رکھا تھا۔ تقی عابدی کا قابل ستائش کام یہ ہے کہ انھوں نے ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کی تدوین کی اور دونوں جلدوں کو جدید تنقیدی مقدمہ کے ساتھ شائع کردیا۔ یہاں پر ایک حوالہ اور دینا چاہوں گا وہ ہے ''غالبؔ دیوانِ نعت و منقبت'' کا۔ غالبؔ کے عقائد کے سلسلہ سے اکثر بحث رہی ہے۔ غالبؔ خود آزاد منش، کشادہ دل اور کشادہ نظر انسان تھے۔ اپنے عقائد کے سلسلہ میں بھی ان کے یہاں وہی وسعت نظر پائی جاتی ہے۔ کبھی وہ اپنے کو کہتے تھے کہ

شیعی کیوں کر ہو ماور النہری

اور کبھی کہتے تھے

ہم اسد اللہی ام ہم اسد اللہی یم

مالک رام صاحب نے اس سلسلہ میں بہت بحث کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے ہر دلعزیز ادیبوں وشاعروں کے عقائد سے بھی لوگوں کو دلچسپی ہوتی ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ غالبؔ اس سلسلہ میں جیسا موقع ہوتا تھا ویسی بات کرتے تھے۔ شاید ان کے زمانے کے لوگ ان کی آزادروی کے باوجود ان کے عقائد سے واقف رہے ہوں لیکن تقی عابدی صاحب نے بغیر ان باتوں کا جواب دیئے ''غالبؔ دیوانِ نعت ومنقبت'' مرتب کرکے خود ایک جواب فراہم کردیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ''غالب دیوانِ نعت ومنقبت'' غالبؔ کے تنقیدی تجزیے میں کہیں زیر بحث نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی لوگ اچھی طرح غالبؔ کے ان قصائد ومنقبت سے واقف نہیں تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ایک بڑا تحقیقی کام انجام دے کر غالبؔ کے بارے میں نہ صرف یہ کہ ایک بحث ختم کردی دوسری یہ کہ ان کے کلام میں اچھے خاصے بڑے ذخیرے کا اضافہ کردیا۔ تقی عابدی نے اس طرح کے بہت سے کام کیے ہیں۔ خاص طور پر ان لوگوں کے بارے میں جن کے کلیات شائع نہیں ہوئے۔

تجمّم آفندی گزشتہ عہد کے ایک بہت مقبول شاعر تھے میں خود جانتا ہوں کہ ایک دور ایسا تھا کہ محرم کے زمانے میں تجمّم آفندی کے نوحے اور سلام کی آواز سے شہر وقصبات گونجتے رہتے تھے۔ لیکن ان کے مجموعے کہیں محفوظ نہیں تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے دو جلدوں میں ''کائناتِ تجمّم'' شائع کرکے انھیں ضائع ہونے سے بچالیا، دوسرے تجمّم آفندی کو ایک نئی زندگی دے دی۔

تقی عابدی کے اس طرح کے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں پر اگر گفتگو کی جائے تو اس کے لیے ایک بڑا دفتر چاہیے۔ تقی عابدی نے دبیرؔ کی مثنویات اور ''مجتہد نظم مرزا دبیرؔ''، ''سلک سلام دبیر'' شائع کرکے دبیر کے نظر انداز کلام کو سب کے سامنے پیش کردیا۔

ڈاکٹر تقی عابدی پیشہ کے اعتبار سے طبیب سہی لیکن جو کام اُردو تحقیق وتدوین کا انھوں نے انجام دیا ہے اور جس طرح سے ان قیمتی کتابوں کو لوگوں تک شائع کرکے پہنچایا ہے وہ ایک بہت بڑا تاریخی کارنامہ ہے جو آج تک کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکا۔

پروفیسر سید شجاعت علی
پرنسپل اقرا ایجوکیشنل سوسائٹی کالج، جلگاؤں

حُرمتِ لفظ کا امین: ڈاکٹر سید تقی عابدی

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی شخصیت اور ان کی تحریروں کا جائزہ لینے کے لیے راقم الحروف اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا۔ مگر اُردو ادب کی تہذیب کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ جونیئر اپنے سینئر کی خدمات کا دیانت داری سے جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اسی قلم قبیلہ وابستہ سمجھتا ہوں۔

عہدِ حاضر کے اُردو کے چنندہ ادباء کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو ان کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اور اس فہرست سے جامعات و کالج کے اُردو اساتذہ کے نام نکال دیے جائیں تو سرِفہرست جو نام نمایاں نظر آتا ہے وہ ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) کا ہے۔

برصغیر کی علمی و ادبی فضاء میں خاص طور سے اُردو ادب میں ڈاکٹر تقی عابدی نے ایک تغیر پیدا کیا۔ شکر ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی کسی جامعہ میں اُردو کے استاذ نہیں ورنہ ان کی راہ اتنی آسان نہ ہوتی۔

اُردو ادب کا یہ مجاہد نہ جانے کیوں کٹھن راہوں کا مسافر بن بیٹھا۔ جب کہ پیشہ سے طب سے وابستگی میں آسودگی ہی آسودگی تھی۔

پھر ڈاکٹر تقی عابدی نے یہ راستہ کیوں چنا؟

ایک طویل عرصے سے وہ اُردو کی ترویج کے لیے تن من دھن کو بھی داؤ پر لگا رہے ہیں۔

حضرت علیؑ کا قول ہے:

''میں نے اپنے ارادوں کو ٹوٹنے سے اپنے رب کو پہچانا۔''

ڈاکٹر تقی عابدی بھی اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہلے اپنی آنکھوں میں چراغ کی لو

تیز کر لیتے ہیں اور کسی دوسرے مشن پر ڈٹ جاتے ہیں۔

انسان کبھی کبھی حالات سے بددل ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے جغادری ادیب راستہ تبدیل کر لیتے ہیں۔

مگر ڈاکٹر سید تقی عابدی آج کے ادیب ہیں۔ کوئی درباری ادیب نہیں۔ اس لیے وہ ان راہوں پر چل پڑتے ہیں۔ جو ان کو اطمینان و طمانیت بخشتی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی سے میں کب ملا؟ مجھے کچھ یاد نہیں۔ ہاں یہ یاد ہے۔ اورنگ آباد (دکن) سے میرے دوست عباسی کا فون آیا۔

''شجاع! کیا تم ڈاکٹر تقی عابدی کو جانتے ہو؟''

میں نے جواب دیا: ''نہیں! مگر میں نے ان کا نام سنا ہے۔ کینیڈا میں رہتے ہیں طب کے پیشہ سے وابستہ ہیں اور رثائی ادب کے ماہر کی حیثیت سے ان کی شہرت ہے۔''

دوسرے ہی لمحہ تقی عابدی فون پر مجھ سے مخاطب تھے۔

تعارف کے بعد انھوں نے حیدرآباد (دکن) کے کسی پروگرام میں ان کے شرکت کی اطلاع دی۔ اس دوران میں بھی حیدرآباد میں تھا۔ اس لیے ان سے ملاقات کی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوا۔ انھوں نے کچھ کتابیں مجھے تحفتاً دیں۔ میں نے مطالعہ کیا، مجھے لگا یہ تو کسی بھی طالب علم کے لیے Ph.D کا مواد ہے۔ میں نے Ph.D تحقیق کے لیے ایک ریسرچ اسکالر سید حبیب کو تیار کیا۔ اور ڈاکٹر تقی عابدی کی کتابیں مطالعہ کے لیے دیں۔ وہ Ph.D کے لیے تیار ہو گئے۔ اس طرح میری نگرانی میں ''رثائی ادب میں تقی عابدی کا حصہ'' اس عنوان پر انھوں نے سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ (مہاراشٹر) سے Ph.D کی ڈگری حاصل کی۔

اس دوران میں نے انھیں بزم اُردو، یشونت کالج، ناندیڑ کے افتتاح کی دعوت دی۔ تقی عابدی اپنے ساتھ پروفیسر فاطمہ پروین، پروفیسر بیگ احساس، مرحوم معظر مجاز، ڈاکٹر شجاعت علی راشد کو بھی لائے۔ بہت خوب صورت پروگرام ہوا۔

اس کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی کے ساتھ پروگراموں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ اورنگ آباد یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں انھوں نے کلیدی خطبہ دیا۔ کنوینز ڈاکٹر کیرتی

جاوڑے تھیں۔

رات میں ان کے اعزاز میں مرحوم خواجہ معین الدین نے وجد میموریل اورنگ آباد کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ مجنوں بلز کے ہال میں منعقد کیا۔

فیروز رشید (نانڈیڑ) کی مشاعرہ کی نظامت سے تقی عابدی بہت متاثر ہوئے۔

دوسرے دن یونیورسٹی آف ممبئی میں ڈاکٹر تقی عابدی اور میں دونوں مدعو تھے۔ مشاعرہ کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی اپنے ہوٹل چلے گئے۔ میں دوسرے ہوٹل میں فیروز رشید کے ساتھ مقیم تھا۔

صبح اورنگ آباد ائیر پورٹ پر ہم دونوں کی پھر ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے حیرت کا اظہار کیا کہ آپ نے رات میں اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ میں خاموش رہ گیا، کیا جواب دیتا؟

ڈاکٹر تقی عابدی کسی بھی سیمینار میں منتظمین پر کوئی بار نہیں ڈالتے۔ اپنے قیام کا وہ خود انتظام کرتے ہیں۔ زادِراہ وغیرہ سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

یونیورسٹی آف ممبئی کا سیمینار جامعہ کے نصاب پر مبنی تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے متاثر کن انداز میں اس بات کا تفصیل سے جائزہ لیا کہ جامعات کے نصاب میں کس طرح کے ادیب وشعراء کو شامل کرنا چاہیے۔

اہم اساتذہ بھی طلباء کی طرح ان کے مشوروں کو غور سے سننے پر مجبور تھے۔ پونے کے شہرت یافتہ اعظم کیمپس کے دکن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی Research Recognition Committee کا میں ممبر تھا۔ اس لیے اعظم کیمپس میں میرا آنا جانا تھا۔ میں نے جناب منور پیر بھائی سے ڈاکٹر تقی عابدی کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے ''فیض فہمی'' کی رسم اجرائی کی تقریب اعظم کیمپس کے سیمینار ہال میں منعقد کی۔ پی.اے.انعامدار، عابدہ انعامدار، منور پیر بھائی، ممتاز پیر بھائی، فیروز رشید اور میں نے شرکت کی۔ مشاعرہ میں تقی عابدی کی نعت ''وہ میرا نبیؐ ہے، وہ میرا نبیؐ ہے'' نے مشاعرہ لوٹ لیا۔

میرے دوست ڈاکٹر عباس عالم رضوی نے رضوی کالج ممبئی میں مرزا دبیر پر نیشنل سیمینار کا انعقاد کیا۔ میں نے ان سے تذکرہ کیا کہ ڈاکٹر تقی عابدی کا مرزا دبیر پر وقیع کام

ہے کیوں نہ ان سے ربط قائم کیا جائے۔ اس کی اجازت سے ڈاکٹر تقی عابدی سے بات ہوئی۔ اور ڈاکٹر تقی عابدی نے مرزا دبیر پر یادگار مقالہ پیش کیا۔

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی اتنی آسانی سے سیمینار میں اپنی بات رکھتے ہیں کہ سامعین اسے قبول کر لیتے ہیں۔ تقریر ہو یا تحریر ان کے نکات میں تسلسل ہوتا ہے۔ تحقیق میں دیوانگی کی حد تک ہمالی ان کا ایمان ہے۔

تقی عابدی کو رثائی ادب سے ایک قسم کا قلبی لگاؤ ہے۔ میر ببر علی انیسؔ کے مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کو جس تحقیقی انداز سے ترتیب دیا۔ وہ ادب کا ایسا شاہکار ہے، جس کا آنے والی نسلیں فخر سے مطالعہ کریں گی۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان دو اشعار کے ساتھ اجازت:

ادب کے مطلعِ انور کا استقبال کرتے ہیں
شگفتہ جذبہ اطہر کا استقبال کرتے ہیں

سُخن کی صبح کے اختر کا استقبال کرتے ہیں
تقی عابدِی برتر کا استقبال کرتے ہیں

ڈاکٹر سلیم اختر
لاہور

انیسؔ سے اقبالؔ تک

معاصر محققین اور ناقدین میں ڈاکٹر سید تقی عابدی اس بنا پر منفرد ہیں کہ ان کی تحقیق مساعی اور تنقیدی کاوشیں ان کے پیشہ کی ضمنی پیداوار نہیں یعنی وہ نہ ایم اے اُردو ہیں اور نہ ہی کالج میں اُردو کے پروفیسر۔ ان کے پیشے کا ادب ونقد سے کسی طرح کا بھی تعلق نہیں بنتا۔ اسے یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر تو ''بائی پاس آپریشن'' کرتا ہے جب کہ شاعریوں گویا ہوتا ہے:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

یا پھر بقول مصحفیؔ:

تیرے تو دل میں بہت کام رفو کا نکلا

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا میں اس وجہ سے بھی قائل ہوں کہ کینیڈا میں رہائش کے باوجود انھوں نے اُردو زبان وادب سے ناطہ نہ توڑا۔ اکثر تارکین وطن شاعری سے محظوظ ہو کر یا خود شعر کہہ کر وطن سے ایک نوع کا جذباتی رشتہ استوار رکھتے ہیں بلکہ بعض تو ایسے جذباتی ہوتے ہیں کہ:

بحرِ رجز میں ڈال کر بحرِ رمل چلے

ڈاکٹر تقی صاحب نے بھاری پتھر اٹھایا یعنی تحقیق وتنقید کو حرزِ جاں بنایا اور اس ضمن میں بھی مرثیہ کو خصوصی ترجیح دی۔ چناں چہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مراثی مدوّن کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں تحقیقی نوعت کا کارآمد مواد فراہم کرتے ہوئے ایسی معلومات اور کوائف سامنے لائے جن سے ان دونوں عظیم شعراء کے بارے میں تنقید کا تناظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے اس ضمن میں ''تجزیۂ یادگارِ انیسؔ''، ''مجتہدِ نظم مرزا دبیرؔ''، ''سلکِ سلام دبیرؔ''، ''مصحفِ فارسی دبیرؔ'' اور ''مثنویاتِ دبیرؔ'' جیسی کتابوں کا بطورِ خاص ذکر کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی سے میرا اوّلین تعارف برادرم ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے توسط سے ہوا۔ انھوں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ''تجزیہ یادگار انیسؔ'' کی تقریب رونمائی کا اہتمام لاہور میں کیا تو مجھے بھی موقع کی مناسبت سے مضمون تحریر کرنے کا حکم دیا۔

یہ کتاب ڈاکٹر سید تقی عابدی سے اوّلین تعارف کا ذریعہ بنی۔ میری خواہش ہے کہ میں جاری مضمون کے درمیان قارئین چہار سو کی خدمت میں وہ مختصر مضمون بھی پیش کروں۔

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کردوں

بحر مواج فصاحت کا تلاطم کردوں

ماہ کو مہر کروں، ذرے کو انجم کردوں

گنگ کو ماہر انداز تکلم کردوں

درد سر ہوتا ہے، بے رنگ نہ فریاد کریں

بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

جس طرح ہم زندگی کلیشوں کے سہارے بسر کردیتے ہیں اس میں یہ ادراک کیے بغیر کہ کلیشے بے رنگ و بو پھولوں جیسے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ادب و نقد میں بھی متعدد کلیشوں کا سکہ چلتا ہے اس امر کا تعین کیے بغیر کہ یہ کھوٹے سکے کس ٹکسال سے برآمد ہوئے۔ ادھر اُدھر کی مثالیں پیش کرنے سے احتراز کرتے ہوئے اور اپنے موضوع کی حدود میں رہتے ہوئے صرف ایک کلیشے کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے، جس کی تردید میں حالیؔ کے الفاظ میں یہی کہا جاسکتا ہے:

یہ کہہ دو دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا

مرثیہ اور شاعری کی ایسی ہمہ جہت صنف ہے جس میں واقعات کا بیان Epic کا رنگ بھر دیتا ہے۔ افراد کی کشاکش، جو حق، باطل کی کشاکش ہے، اسے ڈرامے کی سطح تک لے آتی ہے۔ کردار نگاری افسانہ کی تخلیقی فضا کے مماثل ہے۔ فطرت کی تصویر کشی محاکات کی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے، اسلوب مثنوی کی یاد دلاتا ہے، سوز و گداز اسے غزل نما بنا دیتا ہے تو المیہ کیتھارس کا موجب بنتا ہے۔ اسی لیے مرثیہ سامعین سے آنسوؤں کا نذرانہ وصول کرتا ہے اور بجا کرتا ہے۔ بلاشبہ مرثیہ واحد ایسی صنف ہے جس میں بیشتر اصناف کا ذائقہ، رنگ اور خوشبو شامل ہے۔ ایسی ہمہ

جہت صنف کے فنی تقاضوں سے عہدہ براہی کے لیے میر انیسؔ جیسے شاعر ہی کی ضرورت تھی جنھوں نے صرف ایک مصرع میں اپنی شاعری کی اساس بننے والے عناصر کی نشاندہی کر دی۔ یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال! اگر چہ انیسؔ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں:

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ میں باندھوں

لیکن اس کے ساتھ عجز ہنر کا احساس تعلّی سے باز بھی رکھتا ہے:

خاموش زباں، دعویٰ بے جا نہیں اچھا
ہو جس میں تکبر سخن ایسا نہیں اچھا
بس بس یہ غرور اور یہ دعویٰ نہیں اچھا
آپ اپنی ثناء واہ یہ شیوہ نہیں اچھا
کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر

میر انیسؔ نے درست کہا تھا۔ انھیں تعلّی کی ضرورت نہ تھی، وہ خالی برتن نہ تھے اس لیے عظمت فن کی گواہی زمانے نے دی۔ تنقید کی میزان میں تول کر، تحقیق کے ہفت خواں طے کر کے اور پھر بھی یہ احساس باقی...... حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا! مولانا شبلی نعمانی کی ''موازنہ انیسؔ و دبیرؔ'' سے چلیں تو ڈاکٹر تقی عابدی کی ''تجزیہ یادگار انیسؔ'' تک، اُردو تحقیق و تنقید کی اہم ترین شخصیات نے انیسؔ کے شاعرانہ محاسن اجاگر کرنے میں اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اس لیے اقبالیات اور غالبیات کی مانند اب ''انیسیات'' کی اصطلاح استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے۔

محققین کے بموجب اگر چہ میر انیسؔ کی تاریخ پیدائش متنازعہ ہے لیکن اکثر اسے تسلیم کرتی ہے کہ 1803ء میں فیض آباد کے محلّہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے، گویا انیسؔ کی پیدائش کو دو صدیاں بیت چکی ہیں اور اس مناسبت سے 2003ء میر انیسؔ کا سال قرار دیا جا سکتا ہے۔ سرکاری طور پر نہ سہی ادبی لحاظ سے ہی، اہل علم، دانشوروں اور انیس شناسوں کا یہ اجتماع گویا سال انیس کی افتتاحی تقریب کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس موقع پر اگر یہ تجویز پیش کر دی جائے کہ اکادمی ادبیات پاکستان انیسؔ کے نام کے ایک ایوارڈ کا اجراء کر دے تو اسے بے محل نہ سمجھا جائے۔

یہ امر بھی خوش آئند ہے کہ سال انیسؔ کا افتتاح کینیڈا میں مقیم ڈاکٹر تقی عابدی کی ''تجزیہ

یادگارِ انیسؔ'' سے ہو رہا ہے۔ اگر چہ ڈاکٹر سید تقی عابدی میڈیکل ڈاکٹر ہیں لیکن یہ کتاب انھیں محنت طلب، مشکل پسند بلکہ مشقت پسند محقق کے طور پر سامنے لاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انیسؔ پر ناقدین کے مقالات جمع کر کے مرتب بن کر مصنف کی عزت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب انیسؔ کے اس معروف مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کا ژرف نگاہی پر مبنی تحقیقی مطالعہ، تنقیدی محاکمہ اور شماریات پر مبنی تجزیاتی جائزہ ہے۔

مراثی انیسؔ میں اس مرثیہ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ چناں چہ ناقدین کی اکثریت نے کسی نہ کسی لحاظ سے اس مرثیہ کے شاعرانہ محاسن اجاگر کیے ہیں۔ نامور محقق مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے ''شاہکارِ انیسؔ'' کے نام سے 1943ء میں اس مرثیہ کا دیدہ زیب مصور ایڈیشن لکھنؤ سے شائع کیا تھا، لندن سے مبسوط مقدمہ کے ساتھ ڈیوڈ میتھیوز نے اس کا انگریزی ترجمہ ''The Battle of Karbala'' کے نام سے شائع کیا جب کہ حسن علی خاں ٹالپر نے منظوم سندھی کے قالب میں اسے ڈھالا۔

سائز جیسے آرٹ پیپر پر دیدہ زیب انداز میں مطبوعہ پونے 8 سو صفحات کی یہ کتاب میر انیسؔ کے احوال و آثار کے بارے میں محققین کے مستند حوالوں کی حامل ہے چناں چہ انیسؔ اور خاندانِ انیسؔ کے بارے میں ضروری معلومات اور کوائف حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کا اصل کام...... ایسا کام جس پر ڈاکٹر صاحب نے یقیناً نصف شب کے چراغ جلائے ہوں گے...... اس مرثیہ کے ایک ایک بند کا تجزیاتی مطالعہ ہے ایسا مطالعہ جو فرہنگ و شرح سے لے کر صنائع معنوی اور فصاحت و بلاغت سے وابستہ جملہ امورِ سخن کا حامل ہے۔ اور جس کے مطالعہ سے میر انیسؔ کے اسلوب کی جمالیات کی متنوع جہات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالؔی نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ میر انیسؔ نے اُردو شعراء میں سب سے زیادہ تعداد میں الفاظ استعمال کیے۔ اور اسے تسلیم بھی کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید تقی عابدی نے جس محنت سے الفاظ شماری کی وہ حیرت زدہ کرنے کے ساتھ حالؔی کے دعویٰ کی شماریاتی تصدیق بھی کرا لیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بموجب ''میر انیسؔ نے دو سو کے قریب مرثیے، سو سے زیادہ سلام، چھ سو کے قریب رباعیات'' کہیں۔ مراثی کے سینکڑوں بند اور ہزاروں الفاظ، میر انیسؔ کی پُرگوئی کی واضح دلیل ہیں۔

جس طرح ہر پھول کا جداگانہ رنگ اور بوباس ہوتی ہے اسی طرح ہر لفظ جداگانہ شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے ہر لفظ منفرد، صوتی آہنگ اور نفسی تلازمات رکھتا ہے۔ چناں چہ اسلوب کی جمالیات کا انحصار مناسب اور موزوں ترین الفاظ کے انتخاب پر ہوتا ہے یا ہونا چاہیے، اس لیے شعروں کے انتخاب کی مانند الفاظ بھی رسوائی کا سبب بن سکتے ہیں یہ تو ہوئی عام شاعری کی بات لیکن مرثیہ میں الفاظ اور ان کا انتخاب اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ یہ امام عالی مرتبت کی شہادت کے بیان کے لیے وقف ہے۔اس لیے جوش وغلو کے باوصف عقیدت واحترام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے۔اور یہی کام بطریق احسن میر انیسؔ نے کیا۔

ڈاکٹر تقی ہمیں بتاتے ہیں کہ''196 بند کے مرثیے میں کل الفاظ جن میں تکرار شامل ہے، ان کی تعداد 9493 ہے۔عربی الفاظ کی تعداد 1769، فارسی الفاظ کی تعداد 1948 ۔اور اُردو الفاظ کی تعداد 5776 ہے...... اس مرثیے میں 61 فیصد الفاظ اُردو، بیس فیصد الفاظ فارسی اور انیس فیصد الفاظ عربی زبان کے ہیں۔''(ص:98)

اس لسانی تجزیہ کے بعد اسماء کا شماریاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے جس کے بموجب ''اس 196 بند کے مرثیہ میں امام حسینؑ کا نام، القاب اور کنیت وغیرہ 143 سے زیادہ استعمال ہوئے ہیں، حسینؑ 31 بار اور شبیرؑ صرف چار بار نظر آتا ہے اس کے علاوہ چونسٹھ سے زیادہ القاب اور کنیات سے امام حسینؑ کو خطاب کیا گیا ہے۔حضرت محمدؐ کا نام لقب یا کنیت 49 بار نظر آتا ہے۔ حضرت زینبؑ کا نام 21 بار، حضرت فاطمہؑ کا 17 بار، حضرت علی اکبرؑ کا 13 بار، حضرت عباسؑ 12 بار، حضرت سکینہؑ حضرت بانوؑ پانچ پانچ بار، حضرت جعفر طیارؑ چار بار، حضرت علی اصغرؑ تین بار، روح الامینؑ تین بار، امام حسنؑ، امام باقرؑ، حضرت قاسمؑ، حضرت یوسفؑ دو دو بار، حضرت خلیلؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت داؤدؑ کے علاوہ حضرت عقیلؑ، حضرت مسلمؑ، مالک اشترؓ، شہزادی کلثومؑ، ام البنینؑ اور فضہؑ کے نام ایک ایک بار مرثیہ میں لیے گئے ہیں۔ (ص:110)

''صرف اس مرثیہ میں کل اضافات 587 سے بھی زیادہ ہیں۔''(ص:182)

یہ مرعوب کن شماریاتی مطالعہ کمپیوٹر کی مدد سے معاون ہوا یا دیدہ ریزی سے ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔تاہم ڈاکٹر سید تقی عابدی کی لگن اور محنت سے یہ توقع بندھتی ہے کہ اسی انداز پر وہ

انیس کے دیگر مراثی کا بھی تجزیاتی / شماریاتی مطالعہ کر ڈالیں گے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بھی ''اسلوبیات انیسؔ'' میں میر انیسؔ کے بعض مرثیوں کا اسلوبیاتی مطالعہ کر کے ان کے ذخیرہ کے بارے میں دلچسپ نتائج پیش کیے ہیں۔

اس سے اساسی اہمیت کا یہ سوال جنم لیتا ہے کہ کیا شعر صرف لفظوں کا کھیل ہے؟ یہ درست کہ شعری تخلیقات کی اساس لفظ ہی پر استوار ہوتی ہے یہ نطق و تکلم اور تخلیق و سخن بازیچۂ الفاظ ہی تو ہیں لیکن محض لفظ کے استعمال اور لفظ کے تخلیقی استعمال میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لفظ کے تخلیقی استعمال کا انحصار لفظ کی مزاج شناسی پر ہے۔ لفظ کی مزاج شناسی ہی اسلوب کے جلال و جمال کے انداز متعین کرتی ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں ہر بڑے شاعر کا نام بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے لیکن میر انیسؔ کی گواہی بھی خاصی معتبر ہے۔ ایسی گواہی جسے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شماریاتی مطالعہ مزید معتبر بنا دیتا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ نے کلاسیک پر بحث کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ کسی بھی زبان، ادب، صنف میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر لینے والا شاعر اس زبان، ادب، صنف کے تمام تخلیقی امکانات کو یوں بروئے کار لاتا ہے کہ آنے والے شعراء کے لیے اس کے انداز و اسلوب میں اس سے بہتر بات کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اگر اس معیار پر میر انیسؔ کو پرکھیں تو وہ ''کم عیار'' نہیں ثابت ہوتا۔ کم عیار کیا وہ تو ایلیٹ کے ساختہ کلاسیک کے معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا اور مرثیہ میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ انیسؔ نے مرثیہ میں اسلوب سازی سے جو جو تخلیقی جدتیں کیں ان کی بنا پر معاصرین میں ممتاز ہونے کے ساتھ ساتھ انیسؔ آج بھی اپنی مثال آپ ہے اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ''تجزیہ یادگارِ انیسؔ'' دعویٰ میں دلیل کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ''علامہ اقبالؔ کے عرفانی زاویے'' کی صورت میں اقبالیات کی وادی میں قدم رکھا تو یہاں بھی اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اب ''چوں مرگ آید'' کی صورت میں ایسا کارنامہ انجام دیا جسے بلا مبالغہ اقبالیات میں اہم اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مستند حوالوں، خطوط اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں علامہ اقبالؔ کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص 206 صفحات پر مشتمل یہ کتاب، کتاب سے بڑھ کر علامہ اقبالؔ کی میڈیکل ہسٹری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ کام ایک ماہر معالج ہی کر سکتا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں

مہنگی فیسوں والے ماہر ڈاکٹروں کی کمی نہیں، جن کی مصروفیات کا یہ عالم ہے کہ دو تین ہفتوں سے پہلے اپایئٹ منٹ ملنا محال ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی کو اس قسم کی تحقیق کا خیال تک نہ آیا۔ خیال تو دور کی بات ان میں سے اکثر کو اس کتاب کے مطالعہ کی فرصت بھی نہ ملی ہوگی۔

''چوں مرگ آید'' کا اندازہ میڈیکل جرنلزم میں طبع ہونے والے تحقیقی مقالات جیسا ہے جس میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے علامہ کے سینتیس امراض کا دس اقسام میں جو گوشوارہ مدوّن کیا ہے اس کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ علامہ نے دُنیا بھر کے امراض پال رکھتے تھے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ اتنے امراض کے باوجود علامہ نے اتنی بھرپور فعال زندگی کیوں کر بسر کی؟ علامہ اقبال نے اپنے بارے میں کہا تھا:

''یہ اک مردِ تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا''

اس کتاب سے بھی اس کی توثیق ہو جاتی ہے۔ یعنی علامہ اقبال کی روز مرہ کی زندگی تساہل پسندی کی طرف مائل تھی۔ (ص:41)

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اس قدر امراض کی مندرجہ ذیل وجوہ بیان فرمائی ہیں:

1. علامہ اقبال نے کم از کم تیس، پینتیس برس تک تمباکو نوشی کی۔
2. علامہ اقبال کی تساہلی پسندی (Life Sedentary) جس میں ورزش وغیرہ کا بالکل دخل نہ تھا۔
3. مرغن اور پرچرب غذا کا استعمال مثلاً دیسی گھی وغیرہ۔
4. زیادہ نمک اور میٹھے پھل کا مسلسل استعمال۔
5. اکسیرِ دل، معجونوں اور کشتوں کا استعمال جو قلب وجگر کے لیے انتہائی مضر تھے۔ (ص:31)

علامہ اقبال کے امراض کی تشخیص میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے معالجین اور دواؤں کے ضمن میں بھی مفصل معلومات فراہم کی ہیں۔

تمام امراض کے تجزیہ اور تشخیص کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے والدین اور اولادوں کی اوسط عمر کا گوشوارہ مرتب کر کے یہ چونکا دینے والا نتیجہ اخذ کیا ہے کہ علامہ اقبال نے کم وبیش ''بیس برس کم عمر پائی۔'' (ص:122)

''علامہ اقبالؔ کی نسبتاً کم عمری کی وجہ بچپن سے کمزور طبیعت، تساہل پسندی، ورزش سے گریز، فکری اور Stressful اعصاب، فشارزدہ زندگی، تمباکو نوشی، بد پرہیزی، کشتوں کا استعمال، Ultra Violet Ray's کا بے وجہ استعمال، نقرس کی دوائیں، گردے، دل اور پھیپھڑوں کی بیماریاں اور ان کا یونانی علاج جس میں Drug Effects کے مضر اثرات شامل ہو سکتے ہیں۔'' (ص:123-124)

آج جب کہ اقبالیات محض کلاس نوٹس قسم کے مضامین کی وجہ سے کلیشوں اور تکرار و توارد کی پیدا کردہ یبوست کا شکار ہے تو ایسے میں ''چوں مرگ آید'' تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوتی ہے اور یہ تازہ ہوا کا جھونکا ہماری جانب پہنچانے والے کینیڈا میں مقیم ڈاکٹر سید تقی عابدی ہیں جن کے لیے دل سے جتنی بھی دعائیں اور نیک تمنائیں نکلیں کم ہیں۔

پروفیسر صادق
دہلی

ڈاکٹر سید تقی عابدی: پیہم موجِ امکانی میں

بیسویں صدی میں اُردو تحقیق نے جتنی ترقی کی ہے وہ حیرت انگیز ہے اور قابل قدر و تحسین بھی کہ اس صدی میں ایک سے بڑھ کر ایک ایسے محقق سامنے آتے رہے جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے اس چمن کی آبیاری کی اور اسے قابل رشک بنا دیا۔ مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، امتیاز علی عرشی، مسعود حسن رضوی ادیب، قاضی عبدالودود، نصیر الدین ہاشمی، محی الدین زور، مالک رام، مختار الدین احمد آرزو، گیان چند جین، نثار احمد فاروقی، رشید حسن خاں اور تنویر احمد علوی وغیرہ کس کس کا نام لیا جائے کہ ان سب نے اپنی خداداد ذہانت و صلاحیت کی بنیاد پر اپنی اپنی افتادِ طبع اور دلچسپی کے مطابق اپنے اپنے میدانوں میں نا قابل فراموش کارنامے انجام دے کر تاریخ ادب اُردو کے کئی تاریک گوشے روشن کر دیے۔ لیکن یہ بھی ہوا کہ پرانے بادہ کش جتنی تیزی سے اٹھتے چلے جاتے ہیں ان کی خالی جگہیں پُر کرنے کے لیے اسی مناسبت سے نئے لوگ سامنے نہیں آ رہے ہیں۔ یوں تو برصغیر کی کئی یونیورسٹیوں میں اہم تحقیقی کام ہوتے رہے ہیں، نئے نئے موضوعات پر کئی اہم مقالے بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔ تاہم رفتار تحقیق خاصی تیز ہونے کے باوجود قابل قدر معیاری کام کم ہی ہوئے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں طلبا، اور اساتذہ کے ہاتھوں اس فن کی جو مٹی پلید ہوئی ہے اسے دیکھ کر خوشی کم اور افسوس زیادہ ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے محققین نے اتنے اہم اور یادگار کارنامے سر انجام دیے جنھیں دیکھ کر اہل ادب عش عش کرتے ہیں لیکن اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بیش تر اہم موضوعات کے تحقیقی امکانات کو بروئے کار لا چکے ہیں جس کے نتیجے میں بعد میں آنے والی نسل کے محققین کے لیے زیادہ کچھ کر دکھانے کو نہیں رہ گیا یا یوں کہیے کہ آگے مراحل دشوار تر

ہوگئے۔ لیکن جیسا عموماً کہا جاتا ہے کہ تحقیق میں کہیں حرف آخر نہیں ہوتا کہ حرف آخر سے آگے بھی کچھ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی اس حرف آخر سے آگے تحقیق نگار ہیں جنھوں نے اپنے ذوق و جستجو کے بل بوتے پر گزشتہ چند برسوں میں یکے بعد دیگرے کئی کتابیں پیش کر کے تحقیق کے میدان میں اپنے لیے جگہ بنالی ہے۔ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، انشاءاللہ خاں انشاؔء اور اقبالؔ ان کی تحقیق کے خصوصی محور رہے ہیں۔ ''کائناتِ نجم'' کی ترتیب و تدوین ان کا تازہ ترین کارنامہ ہے۔ علاوہ ازیں ''رباعیات دبیرؔ'' اور فانیؔ بدایونی پر ابھی وہ کام کر رہے ہیں۔

انشاء اللہ خاں انشاؔء کے روزنامچے کے اُردو ترجمے کے ذریعہ میرے استادِ محترم ڈاکٹر سید نعیم الدین نے چند نئے حقائق پیش کیے تھے۔ عابدؔ پشاوری نے انشاؔء پر مزید تحقیق کر کے گویا مضامین نو کے انبار لگا دیے اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب انشاء پر مزید کام کی گنجائش نہیں رہی لیکن تقی عابدی کی کتاب چند نئے حقائق لے کر منظرِ عام پر آئی۔ اسی طرح میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ پر بھی اتنا کچھ لکھا جا چکا تھا کہ اب ان موضوعات پر تحقیق کے نئے دروازے نہیں کھلنے والے لیکن تقی عابدی نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا بالخصوص دبیرؔ اور کلامِ دبیرؔ سے متعلق ان کی پانچ چھ کتابیں پچھلے برس منظرِ عام پر آئیں تو تحقیق کے نئے افق روشن ہوگئے۔ ان میں دبیرؔ سے متعلق تصانیف میں ''مثنویاتِ دبیرؔ'' اور ''ابواب المصائب'' بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ مرزا دبیرؔ کو عموماً مرثیہ نگاری تک محدود کر دیا گیا ہے اُردو کے بیشتر اہم محققین ان مثنویوں کے وجود سے ناواقف رہے ہیں۔ بس معدودے چند نے ہی ان کی دو تین مثنویوں کا ذکر کیا ہے باقی نے ان کی مثنویوں سے صرفِ نظر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاملے میں ادبی تاریخیں بھی مثنوی نگار دبیرؔ کو نظر انداز کر گئیں لیکن سید تقی عابدی نے اپنی مرتب کتاب ''مثنویاتِ دبیرؔ'' میں ان کی چھوٹی بڑی آٹھ مثنویاں شائع کر کے دبیرؔ کو اُردو کے اہم مثنوی نگار شعراء کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جس میں ''دفترِ ماتم'' کی جلد 15 سے ماخوذ 3316 اشعار پر مشتمل مثنوی ''احسن القصص'' کا مکمل متن مع لغات شامل ہے۔ اور بخطِ دبیرؔ 518 اشعار پر مشتمل ایک بے عنوان نایاب مثنوی کا مکمل مخطوطہ بھی شامل ہے۔

اس مثنوی کی نشاندہی سب سے پہلے محمد زماں آزردہ نے کی تھی۔ تقی عابدی کے مطابق ''اس مثنوی کا پورا مخطوطہ آغا گوہر دبیر مرزا صادق مرحوم سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ مثنوی دبیر ہی کے خط سے لکھی گئی جس پر دبیر نے نظرثانی بھی کی اور چند مصرعوں میں تبدیلی اور چند اشعار کو قطع بھی کر دیا ہے۔''

اسی طرح مرزا دبیر کی ایک اہم کتاب ''ابواب المصائب'' ہے۔ یہ ان کی واحد نثری تصنیف ہے جو وقت اور حالات کی ستم ظریفی سے کچھ اس طرح نظرانداز ہوئی کہ اُردو ادب کی تاریخوں اور نثری ادب پر رقم کی گئی اہم ترین کتابوں تک میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا جب کہ رجب علی بیگ سرور کے ''فسانۂ عجائب'' کے بعد یہ لکھنوی نثر کی دوسری اہم کڑی ہے جسے غالباً مذہبی کتاب سمجھ کر عرصہ دراز تک نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ افضل حسین ثابت، محمد زماں آزردہ، اکبر حیدری کشمیری، سید صفدر حسین اور ذاکر حسین فاروقی وغیرہ نے ''ابواب المصائب'' کا ذکر کیا ہے۔ ''ابواب المصائب'' چھ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں پانچ پانچ فصلوں کا التزام رکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں مرزا دبیر نے سورۂ یوسف کی تشریح کرتے ہوئے ان کے مصائب کا موازنہ حضرت حسینؑ اور اہل بیت کے مصائب کے ساتھ کیا۔ معروف ماہر دکنیات سیدہ جعفر کی مرتبہ کتاب ''زلیخا'' میں بھی ''ابواب المصائب'' کا قدرے تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

دبیریات ہی کے سلسلے کی ایک اور اہم کتاب ''رباعیات دبیرؔ'' ہے جس پر تقی عابدی ان دنوں کام کر رہے ہیں۔ یہ کتاب مرزا دبیر کی 1200 سے زائد رباعیات پر مشتمل ہے جن کے یکجا ہونے اور کتابی صورت میں منظر عام پر آنے کے بعد بلاشبہ مرزا دبیر کو ایک اہم ترین رباعی گو شاعر کی حیثیت سے بھی دیکھا جا سکے گا۔ سید تقی عابدی کی ان کتابوں کے بعد اُردو ادب کی تاریخ میں مرزا دبیر کو ایک بڑے مرثیے گو شاعر کے علاوہ ایک اہم مثنوی نگار ایک اہم نثر نگار اور ایک اہم رباعی گو شاعر کی حیثیت سے بھی وہ مرتبہ حاصل ہونے کی توقع ہے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

''پیہم موج امکانی...... اگلا پانوں نئے پانی میں'' کے بمصداق سید تقی عابدی کی مرتبہ تازہ ترین کتاب ''کائناتِ نجم'' ہے جس میں انھوں نے بڑی محنت، لگن اور خلوص کے

ساتھ تجمّم آفندی کی حیات، شخصیت اور فن شاعری پر لکھے ہوئے دیگر قلم کاروں کے مضامین بھی شامل کیے ہیں۔

''کائناتِ تجمّم'' میں تجمّم آفندی کے تین مرثیے (فتح مبین، معراج فکر اور ایک غیر مطبوعہ مرثیہ) شامل ہیں۔ ان میں سب سے طویل مرثیہ ''معراج'' ہے جو رضا کار بک ڈپو، لاہور اور پھر سرفراز پریس سے کتابی شکل میں شائع ہوا تھا۔ اس کا مقدمہ ممتاز ترقی پسند ناقد سید احتشام حسین نے لکھا ہے۔

''کائناتِ تجمّم'' میں تجمّم آفندی کے نثری رشحات قلم بھی ہیں۔ ان میں نفس اللہ، حسین اور ہندوستان کا سمبندھ اور لغات المذہب، خاصے کی چیزیں ہیں تاہم محمد احسن فاروقی کے اس قول سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے کہ نثر میں جو کچھ بھی وہ چھوڑ گئے ہیں وہ آگے آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ سید تقی عابدی نے اس کتاب میں شامل اپنے ایک مضمون میں تجمّم آفندی کی شاعری سے کئی مثالیں پیش کر کے انھیں سرمایہ داری جبر کے خلاف احتجاج کی پہلی آواز قرار دیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق تجمّم آفندی نے اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کے آغاز سے قبل کسانوں، مزدوروں اور سماج کے دبے کچلے افراد کے بنیادی مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کیا تھا لیکن ترقی پسند ناقدین انھیں مسلسل نظر انداز کرتے رہے ہیں۔

امید ہے کہ تقی عابدی کی یہ کتاب تجمّم آفندی کے تعین قدر میں اہم کردار ادا کرے گی۔ اور انھیں نہ صرف عزائی ادب میں بلکہ بیسویں صدی کے اہم رباعی گو اور قطعات نگار شعرا کی صف میں بھی ان کا صحیح مقام و منصب دلانے میں معاون ثابت ہوگی۔

واصف حسین واصف
نیویارک

تقی عابدی: ایک شخصیت

تقی عابدی کی کتاب کی رونمائی سے قبل ہی مجھ پر تقی عابدی کا قرض تھا۔ تقی عابدی کی تین کتابیں میری میز پر موجود ہیں۔ گاہے گاہے وہ میرے مطالعہ میں بھی رہیں۔ تقی عابدی پر مضمون کا خاکہ ان کی کتابوں کے حوالے سے میرے ذہن میں تھا۔ لکھنا بھی چاہا مگر تقی عابدی نے لکھنا مشکل کر دیا۔ وہ کربلا پر رویا تو میں بھی اس کے ساتھ کربلا پر رویا اور پھر مجھے یاد آیا کہ ایک کربلا سے میں بھی گزرا ہوں اس کربلا کو میں بھولا ہی کب تھا۔ میں اس وقت کرب و بلا میں تنہا کھڑا ہوں۔ اس کرب نے اس بلا نے اور اس تنہائی نے بار بار قلم پکڑ لیا۔ گزشتہ دو سال کے دوران میں خواہش کے باوجود تنقیدی مضامین نہ لکھ سکا۔ مکرم حسین زیدی نے کہا تھا کہ "کربلا ہمیں تین رُخ تو دے ہی دیتی ہے۔ کربلا کا ذکر رُلاتا ہے۔ یہ ہمیں فکر بھی دیتی ہے اور حریّت بھی۔ مگر ہمارا شمار ان لوگوں میں ہے جو اس قول کے پہلے حصّے سے باہر نہیں آتے۔ تقی عابدی کا بڑا حوصلہ ہے کہ وہ اس قول کی تینوں حدیں پار کر گیا۔ وہ رویا بھی، اس نے سوچا بھی اور اسے حریّت فکر بھی ہے۔

تقی عابدی سے میری ملاقات کوئی بیس سال پہلے کچھ ادبی محافل میں ہوئی۔ ان محافل میں تقی عابدی کا تعارف ڈاکٹر تقی عابدی کہہ کر کرایا جاتا تھا اور میری طرح لوگوں کو بھی غلط فہمی تھی کہ وہ لٹریچر کے ڈاکٹر ہیں۔ یہ غلط فہمی دور ہوئی تو اس خیال نے آلیا کہ اور بہت سے ڈاکٹروں کی طرح تقی عابدی بھی شہرت کی تلاش میں ہیں۔ شہرت کی تلاش دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ قسم ہے جو عارضہ کہلاتی ہے۔ یہ عارضہ لاحق ہو تو شہرت کا متلاشی کچھ دیر اڑتا ہے اور پھر زمین پر آجاتا ہے۔ ایسے لوگ جب زمین پر آتے ہیں تو زمین ان کو نگل لیتی ہے۔ ہم نے بہت سے لوگوں کو اڑتے گرتے اور زمین بوس ہوتے دیکھا ہے۔ شہرت کی

تلاش میں وہ لوگ بھی نکلتے ہیں جن کے پاس ایک مقصد ہوتا ہے اور ان کے مقصد سے لگن شہرت کو ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہے۔ تقی عابدی کا شمار انہی لوگوں میں ہے۔ تقی عابدی نے شہرت کی تلاش کے لیے کندھے تلاش نہیں کیے۔ اس نے بہت ذہانت سے راستے تراشے۔ ان راستوں پر چلا اور منزل کو پالیا۔ ان راستوں پر چلتے ہوئے تقی عابدی نے مقصد کو کبھی نہیں چھوڑا۔ اس نے باقاعدہ ایک اسکیم کے تحت راستوں کا تعین کیا اور ان راستوں پر بہت ثابت قدمی کے ساتھ چلا۔ اس نے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح چوکھی لڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے شاعری کی اور کر رہا ہے اور شاعری کے ساتھ ساتھ اس نے تاریخ ادب اُردو کو اپنا موضوع بنایا۔ تاریخ ادب اُردو پر وہ جم کر لکھتا رہا۔ ان موضوعات پر لکھتا رہا جو مر رہے تھے۔ اس نے لندن کے اقبال مرزا کی طرح اپنے کالموں میں ان لوگوں کو زندہ کر دیا جو مر چکے تھے اور ادبی دُنیا ان پر فاتحہ پڑھ چکی تھی۔

تاریخ ادب اُردو پر لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ رام بابو سکسینہ نے کہا تھا کہ اُردو ادب کی تاریخ پر جب سال بھر پڑھا جاتا ہے تو اس دوران اتنا مواد اکٹھا ہو جاتا ہے جو چند دنوں میں ضبطِ تحریر میں لایا جا سکے۔ رام بابو سکسینہ جب تاریخ ادب اُردو مرتب کر رہے تھے تو ازراہِ مذاق انھوں نے اپنے احباب سے کہا تھا کہ تاریخ کو مرتب کر رہا ہوں۔ مگر ہوگا یہ کہ اس کتاب کے مرتب کرنے میں رام بابو سکسینہ ختم ہو جائے گا اور رام رام رہ جائے گا۔ یہ کام بڑا Tedious ہے۔ مگر تقی عابدی نے اس تھکا دینے والے کام کو اپنے لیے چنا۔ اس نے کمال، ہوش مندی سے ایک لائبریری قائم کی، ذاتی لائبریری۔ اس لائبریری میں تقی عابدی نے منتخب کتابیں جمع کر لیں۔ فارسی زبان پر دسترس نے اس کا کام آسان بنا دیا۔ فارسی تخلیقات سے وہ استفادہ کرتا رہا۔ اس مطالعے نے اس کی Vision کو بہت کشادہ کر دیا اور ادب کی تاریخ کو سمجھنے کی صلاحیت کو اجاگر کر گیا۔ فانی بدایونی نے حیدر آباد دکن کے بارے میں تو لکھا تھا کہ "حیدر آباد دکن میں ایک ہندوستان آباد ہے۔" مگر جوشؔ ملیح آبادی نے بھی بڑے پتے کی بات کہی۔ جوشؔ نے کہا کہ "حیدر آباد دکن کو نظر انداز کرنا اُردو کو نظر انداز کرنا ہے۔" تقی عابدی کا تعلق خوش قسمتی سے حیدر آباد دکن سے ہے۔ مگر حیدر آباد دکن کے فکری ارتقاء کا بخوبی مطالعہ کیا اور اس ارتقاء کو اُردو ادب کی تاریخ کے پس منظر میں دیکھا

اور یہ محسوس کیا کہ اُردو کی تاریخ پر حیدرآباد دکن کے کیا اثرات ہیں۔ حیدرآباد دکن کی خاصیت رہی کہ وہ فارسی کے بہت قریب رہا۔ فارسی زبان کا یہ خاصہ ہے کہ اس زبان میں آفاقیت سانس لیتی رہی اور فارسی سے قربت کی وجہ سے حیدرآباد دکن کے زعما بھی آفاقیت کے بہت قریب رہے۔ ان رشتوں نے اُردو کے بڑے شاعروں غالبؔ، اقبالؔ اور یگانہ کو ایک خاص پسِ منظر میں دیکھا۔ تقی عابدی کو اس ماحول کا باشندہ ہونے کے سبب اور فارسی پر دسترس ہونے کی وجہ سے اس اُردو کو سمجھنے میں مدد ملی جو حیدرآباد دکن میں رائج تھی اور دلّی اور لکھنؤ کی فکر سے ذرا مختلف ہے۔ تقی عابدی کی تخلیقات اور تالیفات میں یہ قدرے بڑے شعور کے ساتھ زندہ ہے۔

تقی عابدی کا مراثی سے ایک قلبی تعلق رہا ہے اور اس قلبی تعلق کا سبب ظاہر ہے کہ واقعۂ کربلا اور اہل بیت سے محبت ہے۔ مگر تقی عابدی کا شمار ان لوگوں میں ہرگز نہیں ہے جو مرثیے اپنے کانوں سے سنتے ہیں اور آنکھوں سے بہادیتے ہیں۔ تقی عابدی نے مرثیوں کو سنا۔ مرثیوں کو پڑھا اور مرثیوں کی فکر اس کی سماعت سے دل اور دماغ تک کا سفر کرتی چلی گئی۔ وہ مرثیوں پر رویا ضرور مگر اس کو معلوم تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے اور اس کا ذہن محسوسات کا تجزیہ بھی کرتا رہا اور اس نے یقین کرلیا کہ واقعہ کربلا ایک عالمی سانحہ ہے۔ اس عالمی سانحہ پر میر انیسؔ نے جو کچھ لکھا اس سے تقی عابدی متاثر تھا اور اسی تاثر نے تقی عابدی کو مراثی نگاری اور میر انیسؔ کا مطالعہ کرنے پر اکسایا۔ تقی عابدی کے ہاں میر انیسؔ کا گہرا مطالعہ موجود ہے مگر اس مطالعہ کی حقیقت کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ مجتبیٰ حسین کی اس بات پر غور کرلیا جائے۔ مجتبیٰ حسین نے لکھا کہ ''میر انیسؔ پر لکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ آدھے انیسؔ ہوں اور واقعۂ کربلا کو سمجھنے کے لیے پورا انیسؔ ہونا ضروری ہے۔'' تقی عابدی نے میر انیسؔ کے مرثیوں میں اترنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس موقع پر کرار نوری کا یہ قول بھی نذرِ قارئین کر رہا ہوں کہ ''اہلِ بیتؑ کی محبت کے بغیر انیسؔ کو سمجھا نہیں جا سکتا۔'' تقی عابدی ان تمام راستوں سے گزرا ہے اور اس نے ان تمام راستوں سے وہ تمام پھول چُن لیے ہیں جو یادگارِ انیسؔ کی تخلیق کے لیے ضروری تھے۔ یہی پھول گل دستہ بنانے میں کام آتے ہیں۔

تقی عابدی کی شخصیت میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ حسن مزاح بھی ملتی ہے۔ حسن مزاح معاملات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور عمل سکھاتی ہے۔ اس کے علاوہ تقی عابدی کے ہاں وضع داری بھی ملتی۔ اپنی زبان اور اپنی ثقافت سے محبت بھی۔ تقی عابدی نے ان تمام اثاثوں کو بہت سنبھال رکھا ہے اور برتا ہے۔ نیویارک میں جب تقی عابدی نے شرکت کی تو اس کو معلوم ہو گیا کہ راستے ہموار اور آسان نہیں ہیں۔ وہ چھوٹے لوگوں کی باتوں سے دل برداشتہ نہیں ہوا بڑے لوگ (اگر وہ موجود تھے) رہنما کرتا چلا گیا۔ یقیناً کچھ لوگوں کی الزام تراشیوں سے وہ دل برداشتہ بھی ہوا ہوگا۔ مگر تحمل اور بردباری نے اس کی یہ منزل آسان کر دی۔ وہ اپنی دھن میں کام کرتا رہا۔ کسی صلے کی تمنا کیے بغیر۔ چند سال قبل کسی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ تقی عابدی اتنا بڑا کام کر جائے گا۔

مگر تقی عابدی نے آخر یہ کام کر دکھایا اور آج وہ سُرخرو ہے۔ تقی عابدی اگر راستوں کے کانٹوں میں الجھ جاتا تو شاید یہ کام مشکل ہوتا۔ مگر تقی عابدی ان تمام کانٹوں سے گزر کر اب ایک Safe Heaven پہنچ چکا ہے۔ زبانیں بند چکی ہیں اور اب ایک ایسے دور کا آغاز ہو چکا ہے جو تقی عابدی کا دور ہے۔ اس دور میں اس کی شناخت کی پذیرائی ہے اور اس کے کام کو لائق تحسین سمجھا جا رہا ہے۔ تقی عابدی پر یہ سطور تقی عابدی کی شخصیت کا کچھ احاطہ ضرور کرتی ہیں مگر تقی عابدی کے فن پر بات آئندہ ہوگی اور ضرور ہوگی۔ تقی عابدی کی کتابوں کا اقتصادی جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ کام توجہ چاہتا ہے۔ انشاء اللہ تقی عابدی کی شاعری پر جلدی لکھنے کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر فرحت نادر رضوی

صحت کا طبیب اور ادب کا مریض
عجوبۂ ادب ڈاکٹر تقی عابدی

حضرات! شاید آپ کو میرے مقالے کا یہ عنوان نامناسب محسوس ہو یعنی عجوبۂ ادب، میں عرض کرنا چاہتی ہوں کہ یہ میرے الفاظ نہیں بلکہ کسی عابدی شناس کا عطا کردہ لقب ہے۔ ظاہر ہے اِس کی توجیہ بھی اپنی جگہ موجود ہوگی جس پر گفتگو کی جائے گی۔

دُنیا میں علوم وفنون کا دریا سا بہہ رہا ہے جس کی الگ الگ شاخوں اور الگ الگ سر چشموں کو الگ الگ ناموں سے موسوم کیا گیا ہے اور بہ ظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ سر چشمے الگ الگ فطرت اور مزاج کے متقاضی ہوتے ہیں۔

چناں چہ سائنٹفک انٹلیجنس، پتھ میڈکل انٹلیجنس، فزی کل انٹی جنیس یا پکٹوریل انٹی جنیس جیسی مختلف صلاحیتیں الگ الگ انسانوں میں الگ الگ سطح پر موجود ہوتی ہیں اور انھیں صلاحیتوں کی بناء پر کوئی شخص کسی مخصوص علمی شعبہ سے خود بخود وابستہ ہو جاتا ہے۔ یعنی فطری طور پر اس کا رجحان کسی مخصوص شعبۂ علم سے ہونے کے سبب اس کی دلچسپیاں طے ہوتی ہیں اور یہ بھی بات طے ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کس شعبۂ علم سے وابستہ رہے گا اور اسی میں اپنی بہتر کارگزاری پیش کر پائے گا۔

ابھی جس شخصیت کے حوالے سے یہ گفتگو ہو رہی ہے وہ بڑی ہمہ جہت (ڈائنا مک) شخصیت ہے۔ جس کو علم و ادب وراثتاً ملا، شاعری جس کے خون کے سرخ خلیوں کے اندر سرایت کی ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 17-16 سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے زندگی کے تلخ

تجربات شعری پیکرس میں ڈھل کر صفحۂ قرطاس پر اُترنے لگے۔ یعنی تقی عابدی صاحب شعر کہنے لگے جیسا وہ خود فرماتے ہیں: ''شعر گوئی کے حوالے سے ابتداً کچھ جوشِ اظہار کی شدت اور کچھ فطری شاعرانہ مزاج کے سبب کبھی بیت بازی کے لیے تو کبھی مقابلوں کے لیے اسکول کالج میں شعر کہتے رہے لیکن جیسے تعلیمی بندشوں سے ذرا مہلت حاصل ہوئی شاعری باقاعدہ طور پر شروع کر دی اور بغیر استاد کے شاعری کی ''ابتدا میں علوم وعروض و قافیہ سے بے خبری کے سبب تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس'' کا سامنا کرنے والا یہ نوجوان بہت جلد ماہر عروض ثابت ہوا۔ یعنی اس قدر دقیق مطالعہ شعری صنعتوں اور فنی باریکیوں کے حوالے سے کیا اور دیگر علوم وفنون شاعری کی مشق بہم پہچائی کہ خود'' آخر کار شعر کی تقطیع اس کے لیے (میرے لیے) مدرسے کی وہ تقطیع بن گئی جن پر اطفال حروف تہجی کی مشق کیا کرتے ہیں۔ چناں چہ ''رموز شاعری'' کی تصنیف عمل میں آئی۔ اس کتاب میں مروجہ اوزان کی تقطیع مثالوں کے ساتھ اس طرح پیش کی گئی ہے کہ متبدی اور مشاق سب شعر کی صحت سے واقف ہو سکتے ہیں۔'' فن کار اب بھی مشہور ہے۔

(انٹرویو از افتخار امام صدیقی، ایڈیٹر ''شاعر'' ممبئی،
ماہنامہ ''حکیم الامت'' سری نگر، صفحہ:02)

یہاں موجود جن حضرات نے ''تجزیہ یادگار انیسؔ'' کا مطالعہ کیا ہے وہ بہتر جانتے ہیں کہ عروض اور فنی نکات وشعری محاسن کے اعتبار سے صرف ایک مرثیہ کے حوالے سے کیسی بلیغ ودقیق اور تفصیلی گفتگو اس کتاب کے حوالے سے پیش کی ہے اور صرف ایک مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب......'' کے تجزیے سے انیسؔ کے مقام ومنزلت کو کس انداز میں ثابت کر دیا ہے۔

''تجزیہ یادگار انیسؔ''، مکمل کر کے آپ نے پروفیسر اکبر حیدری صاحب کے حوالے کی، تاکہ وہ بہ نظر اصلاح پروف ریڈنگ، طباعت دیکھ لیں۔ حیدری صاحب کے حوالے سے عرفان ترابی لکھتے ہیں:-

> ''غالباً یہ عابدی صاحب کی پہلی ضخیم کتاب تھی۔ حیدری صاحب نے فون پر مجھے بتایا۔ ''یہ ایک ضخیم کتاب ہے، میں آپ سے مدد کا خواست گار

ہوں۔'' دوم یہ انکشاف بھی کیا کہ تجزیہ پڑھ کر اکبر حیدری اپنے آپ کو سبک محسوس کر رہا ہے۔''

(صفحہ: 104، تقی عابدی خصوصی شمارہ ماہنامہ ''حکیم الامت'')

''تجزیہ یادگارِ انیسؔ'' میں تقی عابدی نے انیسؔ کی حیات اور شخصیت پر کھل کر گفتگو تو کی ہی ہے۔ مرثیے کے ہر شعر کے فنی محاسن جس دقتِ نظر کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ انیسؔ کے کلام کے حوالے سے یہ تفصیلی گفتگو ماقبل اتنے سلیقے کے ساتھ الگ الگ زاویہ فن کے پیش نظر میری نظروں سے نہیں گزری اگرچہ اس حوالے سے ساڑھے تین سو، چار سو سے بھی زیادہ کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ ڈھائی ہزار سے زیادہ (2856) صنعتوں کے حوالے سے کس ترتیب اور تناسب کے ساتھ اشعار کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ طالب علموں کے لیے یہ کتاب ''انیسؔ فہمی'' کے مواقع ہی نہیں پیش کرتی بلکہ انیسؔ پر مزید کام کرنے کے نئے زاویہ اور نئے انداز سکھاتی ہے۔ سچ ہے ادب و شاعری اور سائنس و ریاضی یکجا ہو جائیں تو کچھ ایسے بھی معجزے معرضِ اظہار میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے اس کتاب کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''اس کتاب سے انیسؔ کی زبان اور استعمال الفاظ پر کام کرنے والوں کو بھی غیر معمولی مدد ملے گی۔''

جب کہ فرمان فتح پوری: ''یہ ایک کتاب نہیں بلکہ نکات فصاحت و رموز بلاغت کا ایک سرچشمہ ہے۔ محاسنِ لفظی و معنوی کا ایک خزینہ ہے اُردو مرثیہ نگاری کی تفہیم و تحسین کی ایک انسائیکلو پیڈیا ہے اور انیسؔ شناسی و انیسؔ فہمی کے باب میں ایک نادرہ کاری ہے۔''

(1) ''تجزیہ یادگارِ انیسؔ، (2) دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ''، (3) ''دیوانِ سلام و کلام انیسؔ جیسی کتابیں تصنیف و ترتیب دینے والی اس فرہاد صفت ہستی نے کلامِ دبیر کے ساتھ، جس الفت اور محبت کا عملی اظہار کیا ہے حقیقی معنوں میں ''موازیہ انیسؔ و دبیرؔ'' کا عملی جواب شاید پہلی مرتبہ اس قدر جامع طور پر دیا گیا ہے۔ یعنی دبیر کا وجود اور ان کے اشعار کے تفصیلی مطالعہ کی ضرورت خود انیسؔ شناسی کے لیے کیا ہے۔ یہ ثبوت دبیرؔ کے حوالے سے تقی عابدی کی کاوشوں کے مدِ نظر بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

انیسؔ فلکِ مرثیہ کے آفتاب اور دبیرؔ مہتاب ہیں۔ دونوں صاحبان عظیم شعراء تھے...... دبیر شناسی اُردو ادب کے لیے عموماً رثائی ادب کے لیے خصوصاً اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے اُردو کی فصاحت و بلاغت کو ترقی ہوگی...... ہمیں دبیرؔ کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ مرزا دبیرؔ کے کلام میں میر انیسؔ کا رنگ نظر آتا ہے۔ لیکن میر انیسؔ کے کلام میں دبیر کا پرتو بالکل نہیں۔

مرزا دبیرؔ کے حوالے سے (1) ''انتخاب مراثی دبیرؔ''، (2) ''مجتہدِ نظم مرزا دبیرؔ''، (3) ''سلکِ سلام دبیرؔ''، (4) ''ابواب المصائب'' [تصنیف دبیرؔ مرتبہ تقی عابدی]، (5) ''مصحفِ فارسی'' [مجموعہ کلامِ فارسی مرزا دبیر]، (6) ''رباعیاتِ دبیرؔ'' [1300 رباعیاں یکجا کیں]، (7) مطالعۂ دبیرؔ کی روایت'' جیسی دیگر عظیم الشان کتابیں منظرِ عام پر لاکر دراصل ڈاکٹر تقی عابدی نے ہمیں سکھا دیا ہے کہ مطالعہ کس انداز سے کرتے ہیں، زبان کس طرح سیکھی جاتی ہے۔ کتابیں کیسے تصنیف کی جاتی ہیں، شعراء کو سمجھنے کے لیے کس طرح کاوش کرنی چاہیے اور بالآخر یہ کہ رثائی شاعری کی عظمت سمجھنی ہے تو کسی ایک شاعر کی کاوش بھی نظر انداز کرنا خلافِ مزاج تحقیق ہے۔ چناں چہ ایک سچے محقق کی طرح انھوں نے سیماب اکبرآبادی کی رثائی شاعری پر توجہ دی ان کا مقالہ بہ عنوان عاشق امام حسینؑ ''شاعر'' میں شائع ہوا۔ بعد میں اور بھی کئی مجلوں میں شائع کیا گیا۔

تجمؔ آفندی کی حیات اور شخصیت و کلام پر دو جلدوں میں سترہ سو صفحات پر مشتمل کتاب شائع کی (''کلیاتِ تجمؔ''، ''کائناتِ تجمؔ'') کربلائی ادب کے ایک فراموش کردہ شاعر فرید لکھنوی کے مرثیے سلام رثائی قطعات و دیگر کلام ''اظہارِ حق'' کے نام سے اپنے تبصرے کے ساتھ شائع کیا۔ ایک ہی دن یعنی 21؍ مارچ 2005ء کو مرزا دبیرؔ کے حوالے سے بیک وقت چھ کتابوں کا جشن اجراء کر کے ایک مثال قائم کردی۔ روپ کنوار کماری ہندو پنڈت کی لڑکی تھی جس کے کلام کی اصلاح کرنے والے دو عظیم شعرا فضل رسول فضلؔ اور تجمؔ آفندی تھے۔ سید تقی عابدی نے تحقیق کر کے روپ کنوار کماری کا کلام یکجا کیا اور کتاب شائع کردی۔ ''روپ کنوار کماری'' [شخصیت فن اور مجموعۂ کلام] جس کی اشاعت 2006ء میں

ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے بطور سند کئی سلام و مراثی بخطِ روپ کنوار کماری پیش بھی کر دیے۔ جوان کی ذاتی لائبریری میں ٹورنٹو میں موجود ہے۔ اِس پر فضل رسول فضلؔ کی اصلاح اور اس حوالے سے ان کے خطوط مع دستخط موجود ہیں۔ آپ کی ذاتی لائبریری کا ذکر بھی خاصا توجہ طلب ہے۔

جہاں تقریباً بارہ ہزار کتابیں موجود ہیں، یہ دو سال قبل کی بات ہے ابھی میرا خیال ہے کہ مزید اضافہ ہوئے ہوں گے۔ جن میں اُردو، فارسی، ہندی اور انگریزی ادب سے متعلق کتابیں شامل ہیں۔

نعتیہ ادب، رثائی ادب، غالبیات، انیسیات، اقبالیات رسائل میگزین، مخطوطات کئی کتابوں کے فرسٹ ایڈیشن، انگلش ڈکشنری ویبسٹر کی گزشتہ دو سو برسوں میں شائع ہونے والی تقریباً تمام جلدیں۔ چودہ سو کے لگ بھگ قلمی نسخے جن میں مرثیے رثائی بیاضیں اور قدیم مسودے شامل ہیں جن کو انھوں نے 40 سال کے عرصے میں جمع کیا ہے۔ یہ تمام اثاثہ اہلِ علم کے لیے ایک عظیم تحقیقی سرمایہ ہے جسے انھوں نے تحفظ ہی نہیں دیا بلکہ طلبہ تک پہنچانے کا بھی اہتمام کر دیا ہے۔ رثائی ادبی خدمات کے علاوہ بھی بہت سے کارِ خیر ہیں جن پر طائرانہ نظر بھی اس مختصر و قفے میں ڈالی نہیں جا سکتی۔ مختصراً یہ کہ ''دیوانِ حالیؔ'' اور ''کلیاتِ حالیؔ'' سو سالوں سے شائع ہوا بھی نہیں لیکن 1200 صفحات پر مشتمل ''کلیاتِ حالیؔ'' اور ''حالیؔ فہمی'' ادب شناسوں کے لیے ایک بالکل نئے تجربے کا سبب بنی، ''کلیاتِ غالب فارسی'' دو جلدوں میں شائع کی۔ جس کا سہرا حتمی گیتی عابدی صاحبہ کے سر جاتا ہے۔ نہ ایران سے یہ تعلق قائم ہوتا ہے اور نہ یہ باتیں عالمِ وجود میں آتی ہیں۔

''مصحفِ تغزل'' کے نام سے تجمّل آفندی کی غزلوں کا مجموعہ شائع کیا جس میں کئی تنقیدی اور تاریخی مضامین پیش کیے گئے ہیں جن سے تجمّل آفندی کے فن اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ میرے خیال سے یہ مشت نمونہ کافی ہے جس سے میرے ذریعہ طے کردہ عنوان کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن چوں کہ عجوبۂ ادب کسی اور اور کا دیا ہوا لقب ہے لہٰذا چلیں خود اِن کی زبان سے سن لیں کہ آخر یہ نام انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے لیے کیوں پسند کیا، عرفان ترابی صاحب لکھتے ہیں: ''جو معالج 70 سال بعد ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ کے امراضِ موت کی طبی

جانچ کرے اس سے ہم کیسے امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ 1200 صفحات پر بھی نفسانی و عملی امراض امت کی کھوج لگائے اور ''شکوہ و جواب شکوہ'' کی شرح سوا ہزار صفحات پر پھیلائے۔ امت کے ڈاکٹر (اقبالؔ) کی تشخیص، تجاویز، علاج معالجے پر مکمل و مدلل بحث کرے یہ معجزہ نہیں تو اور کیا۔'' (''عجوبۂ ادب: ڈاکٹر تقی عابدی'' از عرفان ترابی، سمبل سوناوادی کشمیر، رسالہ ''حکیم الامت'' صفحہ نمبر 204)

صرف یہی نہیں ہندو پاک کی مختلف یونیورسٹیاں ماہر علم الابدان کو آج ادب و شاعری کے حوالے سے وزیٹنگ پروفیسر بنا چکی ہیں۔ گوپی چند نارنگ صاحب نے غالبؔ اکیڈمی میں ''کائناتِ نجم'' کے جشن اجراء کے موقعے پر کہا تھا: ''عابدی صاحب اتنے ثواب کو کیا کریں گے۔ انھیں ہمارے درمیان بھی یہ ثواب بانٹنے ہوں گے۔'' اور یہ بھی سوال کیا تھا کہ وہ آخر یہ سارے کام کس طرح کرتے ہیں۔ پہلے سوال کے جواب سے تو سامعین محروم رہے۔ شاید وہ ثواب بانٹنے والی بات سے متفق کہ تھے کیوں کہ ثواب تو کمایا جاتا ہے لیکن دوسرے سوال کے جواب میں یہ بتایا کہ ''روزانہ آٹھ گھنٹے اپنی لائبریری میں کام کرتے ہیں۔'' انھوں نے متعدد موقعوں پر یہ بات کہی ہے کہ ہم وقت کی کمی کو ایک جواز بنا کر بہت سے کاموں کی جانب غفلت برتنے کے عادی ہو چکے ہیں جب کہ ہم زیادہ کوشش کر کے ان تمام کاموں کو کر سکتے ہیں اگر جذبۂ عمل صادق ہے۔ ان کے یہ جملے خود میری ذاتی زندگی میں ایک عظیم عملی تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں اور میں نے اپنی مصروف کاروباری زندگی کی بھاگ دوڑ کے درمیان تحریر و تقریر کی گنجائش نکالنے کے طریقے سکھاتے رہتے ہیں۔

نثری حصے میں ایک گزارش یہ ہے کہ مرثیہ اپنی فنی، ادبی، ضخمی اور لسانی حیثیتوں کے ساتھ ایک بار پھر عوام کی جانب سے پزیرائی حاصل کر رہا ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ جس طرح کراچی میں انھوں نے ایک مرثیہ اکادمی قائم کی ہے۔ اسی انداز پر ہندوستان کے مرکز یعنی دہلی میں بھی ایک مرثیہ اکادمی قائم کی جائے تاکہ نئی نسل آداب زبان وطرز ارسال و ترسیل کے رموز و نکات سے نہ صرف باخبر ہو جائیں بلکہ ایک عملی تربیت بھی اس اکادمی کے زیر سرپرستی انھیں حاصل ہو جائے۔

خاتمے سے پہلے امروہہ فاؤنڈیشن کی خدمات کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے جو آج اس پروگرام کا قیام اتنے خراب موسم کے باوجود کامیابی سے کیا۔

امروہہ فاؤنڈیشن 10 سال سے دہلی اور امروہہ میں منفرد طریقے کے ادبی اور سماجی کاموں کو انجام دے رہی ہے کورونا میں بھی کافی امداد کی ہے۔ طلبا کی اسکول فیس لڑکیوں کی تعلیم، شادی وغیرہ کے لیے مالی امداد پیش کر رہا ہے۔ چینل ٹرواول آور کے ذریعہ ہر ہفتہ آن لائن مشاعرہ کرنا بھی امروہہ فاؤنڈیشن کا ایک اہم ادبی قدم ہے۔

بہت شکر گزار ہوں اس فاؤنڈیشن اور تمام سامعین کی بالخصوص جناب صدر اختر الواسع صاحب، جناب تقی عابدی صاحب مہمان خصوصی کی اور مہمان محترم جناب شہپر رسول صاحب کی۔ پروفیسر حسنین اختر صاحب شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی، جناب کلیم اصغر صاحب شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اور جناب نظر عباس صاحب کے علاوہ یہاں موجود تمام بزرگ وخرد سامعین حضرات کی۔ شکریہ

نذرانۂ دل

اُردو اور فارسی ادب کی تنقید میں ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کا جو مقام معین ہو چکا ہے اس سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ انیس، اقبال اور امیر خسرو پر اُن کے مقالوں کی دل آویزی اور افادیت مسلّم ہے۔ یہ سب ان کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ادبیات کی بارگاہ میں ان کی سالہا سال کی تحقیق نہایت مستند اور خیال افروز ہے۔ ہم اس کے معترف ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالے فارسی و اُردو ادب میں نہایت محترم مقام رکھتے ہیں۔ بارگاہِ ادب میں ان کی تحریریں ''نذرانۂ داغ'' کہلائیں گی۔ یہ بہت بیش قیمت تنقیدی سرمایہ ہے تاہم کئی سال کی کوششوں کے بعد عابدی صاحب نے اپنی تمام ادبی تحقیقات سے بلندتر ایک اور قیمتی خزانہ پیش کیا ہے جو ذہنی کاوش سے کہیں برتر ارفع و عالی حیثیت رکھتا ہے یہ عقیدت و ارادات کے مقدس حریم سے برآمد ہوا ہے۔ یعنی حمد، نعت اور منقبت پر مشتمل اشعار جو آج آپ کے ہاتھ میں اُن کی قلبی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔ گرے کے الفاظ میں ان جواہر پاروں کو جو دل کی عمیق تہوں سے نظر افروز ہوتے ہیں۔

Full many a gem of purest ray serene,

The dark unfathomed caves of ocean bear:

کہا جائے تو بالکل درست ہے۔ ان منظومات کو خاکسار راقم ''نذرانۂ دل'' کہتا ہے تاہم اس پاکیزہ تصنیف کا صحیح نام ''جوشِ مودّت'' ہے۔ کتاب کا یہ عنوان میرے تجویز کردہ نام سے زیادہ موزوں ہے کیوں کہ اس میں الفت وعقیدت کا جذبہ پورے جوش وجلال و جمال کے ساتھ موجزن ہے۔ یقین ہے کہ صاحبِ ذوق قاری اس احساسِ مودّت میں میرے ہم نوا ہوں گے۔

پروردگارِ عالم اور اس کے سید المرسلین رسولؐ اور اہلبیتِ اطہارؑ کی بارگاہ میں ہدیہ دل پیش کرنا ہمارے شعرا کا شیوہ ہے۔ جس میں ابوطالبؑ، حسانؒ، فرزدقؒ، فردوسی، سنائیؒ، رومیؒ، حافظ، جامیؒ، انیسؒ، محسنؒ کاکوری، امیر مینائیؒ، علامہ اقبالؒ، بہزادؒ لکھنوی، دلورام کوثری، جوشؔ ملیح آبادی وغیرہ بے شمار سخن ور شامل ہیں۔ اس پاکیزہ فہرست میں اب ڈاکٹر عابدی کا نذرانۂ دل ہمارے مذہبی سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ ان سب باکمالوں کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ ان کے قلم سے محبت و مودّت کے چشمے ابل رہے ہیں۔ جو خالقِ عالم کے قرآنی فرمان ''**الا المودة فی القربیٰ**'' کی تعمیل ہے۔ اسی قرآنی برکت سے ان کی تاثیر جاودانی ہے۔ اہلِ بیتِ اطہارؑ کی شان میں علامہ اقبالؒ کے یہ اشعار ہمیشہ کے لیے ہمارے ذہن پر ثبت ہو چکے ہیں۔

مریم از یک نسبتِ عیسیٰ عزیز — از سہ نسبت حضرتِ زہراؑ عزیز
نورِ چشمِ رحمۃٌ للعالمینؐ — آں امامِ اوّلین و آخرین
بانوئے آں تاجدارِ ہل اتیٰ — مرتضیٰؑ، مشکل کشاؑ شیرِ خدا
مادرِ آں قافلہ سالارِ عشق — مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق
نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت — سطرِ عنوانِ نجاتِ مانوشت

تفصیلی مثالیں پیش کرنے کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ اختصار کے ساتھ اتنا کہنا واجب ہے کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی اسی قافلۂ شوق میں شامل ہیں۔ الفت و مودّت کے کارواں میں اُن کی متاعِ شعر و سخن کی جو قیمت ہے اسے ان چند اشعار کی روشنی میں معین کرنا بہت آسان ہوگا۔

گردشِ چرخ ہے قبضے میں اُنہی بندوں کی
زیرِ شمشیر جو کرتے ہیں عبادت تیری

•••

محمدؐ کا مقام و مرتبہ ہو جائے گا روشن
اگر حیدرؑ کے رتبہ کا تجھے اقرار ہو جائے

•••

علیؑ کا عشق تو چہروں سے ایسا ظاہر ہے
کھلے لفافے میں جیسے جواب رکھتے ہیں

•••

بہت پھیلے ہوئے ہیں مرحب و عنتر زمانے میں
الٰہی ذوالفقارِ حیدریؑ کا وار ہو جائے

•••

کسی کو کیسے سُلاتے رسولؐ بستر پر
گلاب کی جگہ آخر گلاب رکھتے ہیں

•••

دیکھو تقیؔ کے ہاتھ میں کوثر کا جام ہے
کیوں کہ یہی تو شاعرِ خیرالانامؐ ہے

•••

اختیارِ شوق اتنا ہوگیا ہے موت پر
جب تلک حیدرؑ نہ آئیں دم نکل سکتا نہیں

•••

جب بھی علیؑ کی مدح لکھا یوں لگا مجھے
دفتر تمام ہوگیا اور کچھ کہا نہیں

•••

اس واسطے ولا کی مہک ہے کلام میں
لکھواتے ہیں امامؑ لکھے جارہا ہوں میں

قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ مصنف کے کلام میں ادبی محاسن جس حُسن و کمال سے جلوہ گر ہیں اُتنے ہی جمال و جلال سے مودّت کا جوش بھی اس تصنیف میں موجزن ہے۔ یقین ہے کہ ذی علم قاری اس کا احساس مجھ سے زیادہ خود کر سکیں گے۔

محمد حسن حسرتؔ

عصرِ حاضر میں اُردو زبان و ادب کے بے تاج بادشاہ ڈاکٹر سید تقی عابدی...... ایک تعارف

آج کی یہ محفل جس مہمان شخصیت کے لیے سجائی گئی ہے، وہ ہیں اُردو زبان و ادب کے بے تاج بادشاہ اور عالمی شہرت یافتہ شخصیت ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب! ہم سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کو سرزمین ادب، سرزمین خلوص و محبت بلتستان تشریف آوری پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید کہتے ہیں اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ساقی صاحب کی فرمائش ہے کہ میں اس نابغہ روزگار مہمان گرامی جناب ڈاکٹر تقی عابدی کا تعارف پیش کروں۔

اگرچہ مجھ جیسے اُردو زبان و ادب کے ادنیٰ طالب علم کے لیے بھی ڈاکٹر تقی عابدی کی ذات محتاج تعارف نہیں لیکن آپ کو یہ سن کو خوش گوار حیرت ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب پیشے کے اعتبار سے طبیب ہیں۔ آپ نے طبابت کے ساتھ ساتھ جس میدان میں اپنا لوہا منوایا ہے وہ اُردو ادب کا شعبہ ہے۔ آپ اُردو ادب کے سمندر کے غواص ہیں، تحقیق کے مردِ میدان ہیں، تنقید کے راز دان ہیں اور فنِ سخنوری کے شہسوار ہیں۔ آپ جہاں طبابت کے علم سے لوگوں کے جسمانی دکھ درد کا مداوا کرتے ہیں وہ وہاں شاعری اور ادبی تحقیق و تنقید کے فن سے اہل ذوق کے فکری و روحانی امراض کا علاج بھی کرتے رہے ہیں۔

جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی دلّی میں پیدا ہوئے۔ جی ہاں! وہی دلّی جہاں بہادر شاہ ظفر پیدا ہوئے، جہاں مرزا دبیر نے زندگی کی آنکھ کھولی، جہاں مرزا داغ نے جنم لیا، جہاں کی مٹی سے محمد حسین آزاد کا خمیر اٹھا، جہاں مرزا غالب شہرت کے آسمان پر پہنچے۔ میر، سودا،

سر سید، باغ و بہار والے میر امن سب اسی گلشن کے رنگ برنگے پھول ہی تو تھے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی بھی اسی گلشن کے سدا بہار پھول بن کر اُردو ادب کی خوشبو بکھیر رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے جس ماحول میں تعلیم حاصل کی جس کی بدولت شستہ زبان، ادبی چاشنی اور بلند فکر کا ہونا لازمی امر ہے۔ پھر حیدر آباد سے اس نے ایم بی بی ایس کیا، برطانیہ سے ایم ایس، امریکہ سے ایف سی اے پی اور کینیڈا سے ایف سی آر پی کی پیشہ ورانہ ڈگریاں حاصل کیں۔ اب آپ مستقل طور پر کینیڈا میں رہائش پذیر ہیں لیکن پیشہ ورانہ خدمات کے علاوہ آپ پاکستان، ہندوستان، ایران، برطانیہ اور امریکہ جیسے ملکوں میں علم و ادب کے موتی بکھیرنے کے لیے وقتاً فوقتاً علمی و ادبی دورے کرتے رہتے ہیں۔ میری اب تک کی معلومات کے مطابق آپ چونسٹھ کتابوں کے خالق ہیں۔ آپ کی یہ کتابیں اُردو زبان کے مستند شعرا کے کلام پر تحقیق و تنقید کا احاطہ کرتی ہیں۔ گویا آپ اُردو ادب کے ایک ایسے سرجن ہیں جنھوں نے انیسؔ و دبیرؔ سے لے کر جوشؔ ملیح آبادی تک اور غالبؔ و اقبالؔ سے لے کر فیض احمد فیضؔ تک اُردو دُنیا کے ان نامور شاعروں کا آپریشن کیا ہے۔ جن پر اب تک اُردو کو بجا طور پر ناز رہا ہے۔ عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے گلشنِ اُردو کی آبیاری کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ غالبیات، اقبالیات، انیسیات، دبیریات اور اُردو کے دیگر اہم شعراء حالیؔ انشاءؔ اور جوشؔ وغیرہ کے فکر و فن اور اُردو شاعری کے اصناف و رموز سے متعلق مختلف موضوعات پر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے دُنیا بھر کے علمی و ادبی اداروں میں بے شمار مقالے پیش کیے ہیں اور لکچرز دیتے رہے ہیں۔ ان کے مقالات اور لکچرز دلچسپ، اثر انگیز اور زود ہضم ہیں۔ دقیق علمی مباحث اور ادبی نکات کی عقدہ کشائی ان کے لکچرز اور مقالوں کا خاصہ ہے۔ غالبیات کے ماہر، اقبالیات کے رازدان، فیضؔ شناسی میں یکتائے روزگار اور انیسؔ و دبیرؔ کی شاعری کے رموز کے مواقف کار ڈاکٹر سید تقی عابدی کی زیارت مجھے پہلی بار نصیب ہوئی ہے لیکن ان کی تخلیقات، ان کا نام اور ان کی محبتیں ہمارے دلوں میں ایک عرصے سے آباد ہیں۔ یوٹیوب کے ذریعے آپ کی بہت سی تقریریں، مقالے، اور انٹرویوز ہمارے کانوں میں رس گھولتے رہے ہیں۔ 2014ء میں ڈاکٹر صاحب کی جانب سے ہمارے دوست بشارت ساقی کے پاس کچھ کتابوں کے تحفے سکردو پہنچے اور بشارت

ساقی نے یہ کتابیں بلتستان کے شاعروں اور ادیبوں کے درمیان تقسیم کیں۔ عابدی صاحب کی ضخیم کتاب ''فیض شناسی'' میرے حصے میں آئی۔ پڑھ کر بڑا لطف آیا اور میں ڈاکٹر صاحب کی اس موضوع پر کامل دسترس دیکھ حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی طرف سے ''دیوانِ سلام وکلام انیس'' کا تحفہ ہمیں تین دن پہلے موصول ہوا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی دُنیا کی کئی یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر اور کینیڈا رائٹر یونین کے رکن ہیں۔ اب تک پاکستان، انڈیا، یورپ، امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے مختلف اداروں نے آپ کو دو درجن سے زیادہ ادبی اعزازات سے نوازا ہے۔ آپ کے بارے میں چھپنے والی کتابوں اور جرائد کے خصوصی نمبروں کی تعداد سات ہیں جب کہ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح پر آپ کی زندگی اور ادبی خدمات کے حوالے سے اب تک آٹھ تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں، جن میں سے چار تھیس پاکستانی یونیورسٹیوں میں لکھے گئے ہیں۔

حاضرین ذی وقار! ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کی گفتگو میں دریا کی روانی ہے، سمندر کی گہرائی ہے اور آسمان کی بلندی ہے، وہ علم ودانش کے موتی بکھیرتے ہیں۔ بقول احمد فراز

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

لیکن اس سے قبل میں ایک بات ڈاکٹر صاحب کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ اُردو اگر چہ اہل بلتستان کی مادری زبان نہیں ہے لیکن یہاں کے لوگ اُردو سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ ہماری اُردو اگر چہ گرائمر، محاورہ اور روزمرہ کے اعتبار سے شاید اہل زبان کے معیار پر نہ ہو لیکن یہ علاقہ اُردو کی نئی اور زرخیز بستی ضرور ہے جہاں شاعری، نثر نگاری اور خطابت کے ذریعے اس زبان کی آبیاری ہو رہی ہے۔ بلتستان میں اُردو کی عمر ابھی سو سال بھی نہیں ہوئی ہے مگر اہل بلتستان نے اُردو کو اس طرح سینے سے لگایا کہ مختصر وقت میں اُردو زبان وادب نے یہاں بڑی ترقی کی ہے۔ بالخصوص ہمارے نوجوان شعروادب کے میدان میں خوب طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ یہ نوجوان اُردو کے مراکز دلی، لکھنؤ،

کراچی اور لاہور کے اہل قلم اور شاعروں سے کسی طور بھی پیچھے نہیں۔ یہاں کے شاعروں اور ادیبوں کی اُردو گفتگو اور تحریر شستہ و رواں ہے۔ اس لیے اُردو کے ممتاز شاعر قتیل شفائی اور سید ضمیر جعفری جب سکردو آئے تو یہاں کے لوگوں کو شستہ اُردو بولتے ہوئے سن کر انھوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ بی بی سی لندن کے معروف صدا کار رضا علی عابدی نے اہل بلتستان کی گفتگو سن کر رواں اُردو ہونے کی سند دے دی اور کہا کہ ''آپ کے لب و لہجہ پر نہ کشمیری چھاپ ہے اور نہ پنجابی اثرات بلکہ یہ ایک منفرد لہجہ ہے جو جغرافیائی لحاظ سے اُردو کے مراکز سے دور ہونے کے باوجود ان سے قریب ہے۔'' اس طرح اُردو کے ممتاز شاعر افتخار عارف جب یہاں آئے تو انھوں نے یہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے کہا تھا کہ ''مجھے آپ لوگوں کی گفتگو سے لکھنؤ کی خوشبو آتی ہے۔'' قصہ مختصر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس علاقے میں اُردو کا مستقبل تابناک و درخشاں ہے۔

حاضرین ذی الاحترام! میں اس موقع پر بلتستان کے علم دوست، ادب نواز اور خوب صورت لب و لہجہ کے شاعر بشارت ساقی کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کی وساطت سے آج ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب ہمارے درمیان تشریف فرما ہیں، ان کے اعزاز میں اس خوب صورت محفل کا انعقاد ہوا ہے اور ہمیں ڈاکٹر صاحب کی خوب صورت گفتگو سننے کا موقع فراہم ہوا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کا ایک بار پھر شکریہ!!

ڈاکٹر سید تقی عابدی

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو کی عمدہ مثال!

دُنیا کے مختلف ممالک میں اُردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے جو نئی بستیاں آباد ہوئی ہیں ان کو اعتبار بخشنے والوں میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام بغیر کسی تعمیہ و تخرجہ کے سر فہرست آتا ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی اپنے متوازن زاویۂ نگاہ، اعلیٰ علمی ذوق، اُصول تحقیق سے واقفیت، تنقیدی بصیرت اور اُردو اور فارسی کے کلاسیکی ادبی سرمائے سے لگاؤ کی بنا پر سنجیدہ علمی اور ادبی حلقوں میں کافی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اُن کی پیدائش اگرچہ بہشت و خلد سے بھی انتخاب سرزمین دلّی میں ہوئی ہے پیشے کے اعتبار سے ماہر معالج ہیں اور تو اور میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا میں حاصل کر چکے ہیں اس کے باوجود شعر و ادب کی زلفِ پریشاں کو سنوارنا اُن کا پہلا اور آخری عشق ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی اپنی بے پناہ پیشہ ورانہ مصروفیتوں کے باوجود اُردو اور فارسی کے ادبی سرمائے کی ترتیب و تدوین پر اپنا خاصہ وقت صرف کرتے ہیں اور ہندوستان اور پاکستان سے باہر دیارِ مغرب میں اُردو اور فارسی کے ادبی ورثے کی بازیافت خصوصی توجہ سے کر رہے ہیں۔ موصوف دُنیا کے مختلف گوشوں سے مخطوطات اور مطبوعات کو حاصل کر کے انھیں تحقیق کے سائنسی اُصول کے تحت مدون کر رہے ہیں۔ اُن کے علمی و ادبی کارنامے اتنے وسیع ہیں کہ اُن کو ایک مضمون میں سمیٹا نہیں جا سکتا ہے۔ انھوں نے غالبؔ، انشاء اللہ خان انشاؔ، انیسؔ، دبیرؔ، تعشق لکھنوی، علامہ نجم آفندی، اقبالؔ، فانیؔ اور دیگر ادبی اور مذہبی موضوعات پر اپنا وقیع اور غیر معمولی کام انجام دیا ہے۔ جس کو حوالہ جاتی کام کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کے اہم اور غیر معمولی کارناموں میں ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کی تدوین نہایت ہی قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ یہ کلیات دو جلدوں پر مشتمل ہے اور جسے غالب انسٹی ٹیوٹ جیسے مقتدر ادارے نے چھاپا ہے۔ اس کلیات میں موجود کلام غالبؔ کے متن کو ہر اعتبار سے صحیح اور معتبر مانا جاسکتا ہے کیوں کہ کلیات کی تدوین کے وقت اُن کے پیشِ نظر گیارہ قلمی نسخے اور تین مطبوعہ نسخے رہے ہیں جن کا ذکر اُنھوں نے دیباچہ میں کیا ہے۔

''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کی جلد اول غزلیات پر مشتمل ہے اس کے علاوہ اس میں حمد، مناجات، نعت، منقبت، مرثیہ، نوحہ اور دعائے صبح بھی الگ الگ عنوانات کے تحت شامل کیے گئے ہیں۔ جلد اوّل کا مقدمہ تقریباً 150 صفحات پر مشتمل ہے۔ غالبؔ کو دُنیائے ادب میں اگر چہ اُن کے اُردو دیوان ''دیوانِ غالبؔ'' کے ذریعہ سے جانا جاتا ہے مگر غالبؔ نے اسے ''مجموعۂ بے رنگ'' کہا ہے۔

فارسی بین تا بینی نقش ہائے رنگ رنگ

بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

غالبؔ اپنے فارسی کلام میں ظہوریؔ، نظیریؔ اور عرفیؔ کے ہم پلّہ نظر آتے ہیں۔ ''کلیاتِ غالب فارسی'' کے مقدمے میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے نہ صرف غالبؔ کی فارسی شاعری میں موجود موضوعاتی تنوع اور منفرد لب و لہجے کو موضوع بحث بنایا ہے بلکہ فارسی ادب میں ان کا مقام و مرتبہ بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے غالبؔ کی زندگی، تصنیفات اور دیگر معلومات بھی معتبر حوالوں کے ساتھ بہم پہنچائے ہیں۔ اس کلیات کی دوسری جلد میں قصائد، رباعیات، مثنویوں کے علاوہ دیگر اصناف بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس طرح اس کلیات کے ذریعے غالبؔ کا فارسی کلام مکمل طور پر اور صحتِ متن کے ساتھ پہلی دفعہ منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ اس طرح غالبؔ کی تعینِ قدر کی راہیں ہموار ہوگئی ہیں۔ اس کا سہرا ڈاکٹر سید تقی عابدی کے سر جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا دوسرا قابلِ ستائش کارنامہ دبیریات کی بازیافت ہے۔ مرزا سلامت علی دبیر اُردو مرثیے کا نہایت ہی اہم اور معتبر نام ہے۔ انیس اور دبیر نے صنفِ مرثیہ کو اُن بلندیوں پر پہنچا دیا ہے کہ یہ دیگر مروجہ اصناف کہ ہم پلہ گردانی جاتی ہے۔ دبیر

اُردو ادب میں پُر گو اور منفرد لب و لہجے کے مرثیہ نگار ہیں اور اپنی طرز کے موجد بھی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے "مجتہدِ نظم مرزا دبیرؔ"، "سلکِ سلام دبیرؔ"، "مصحفِ فارسی دبیرؔ"، "مثنویاتِ دبیرؔ"، "رباعیاتِ دبیرؔ" جیسی کتابیں مرتب کر کے دبیرؔ کے ادبی کارناموں کی بازیافت کے سلسلے میں اہم رول نبھایا ہے۔ "رباعیاتِ دبیرؔ" کی تدوین یقیناً اِن کا قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے دبیر کی اُردو اور فارسی کی 1323 رباعیاں مختلف مطبوعات اور مخطوطات سے جمع کر کے شامل کی ہیں۔ اس طرح غمگینؔ دہلوی کے بعد دبیرؔ کے یہاں رباعیات کا سرمایہ سب سے زیادہ ہے۔

دبیر کی یہ رباعیاں شکوہ الفاظ، فکری تسلسل اور بندش کی چستی کی بنا پر رباعی کے سرمائے میں نہ صرف ایک اہم اضافہ ہے۔ بلکہ اُن کو بحیثیتِ رباعی نگار الگ پہچان بنانے میں ممد و معاون بھی۔ اس تالیف کے مقدمے میں مرتب نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں رباعی کے سلسلے میں مختلف اختلافی مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اسی کتاب میں موجود فاضل مرتب کا مقدمہ نہ صرف رباعی کے ابتداء اور ارتقاء پر مفصل روشنی ڈالتا ہے، بلکہ صنفِ رباعی میں دبیرؔ کے مقام و مرتبہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اس کتاب میں دبیر کی رباعیات مختلف عنوانات مثلاً حمدیہ، نعتیہ، منقبتی، فلسفیانہ، ذاتی

یہی زمانۂ ناقدر میرے بعد سعیدؔ
مجھے بھی یاد کرے گا میرے کلام کے ساتھ

• • •

زباں کا لطف نہ آجائے تو میرا ذمہ
غزل سعیدؔ کی تو نے نہیں سنی اے دوست

ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ڈاکٹر تقی عابدی کی تصنیف "کلیاتِ سعید شہیدی" کی رونمائی برادر سعیدؔ شہیدی جناب حسن علی سجاد کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مشہور اُردو سائٹ شعر و سخن کے جناب سردار علی صاحب نے سعیدؔ شہیدی کی تاریخ وفات پر مشتمل ایک خوب صورت فریم صدرِ محفل کو پیش کیا۔

اس موقع پر "پاک پائنیرز" کی جانب سے محترمہ تہمینہ نوید نے بزمِ احباب کینیڈا

کی جانب سے مفت اُردو اسکول کا ذکر کرتے ہوئے اُردو زبان کی ترویج اور اشاعت پر پچھلے سولہ سالوں سے بچوں کو اس زبان کو سکھانے کی کوششوں کو سراہا۔ انھوں نے رکن پارلیمان پیٹر فون سیکا کو مدعو کیا جنھوں نے اپنی کمیونٹی کے لیے اپنی جانب سے بھرپور تعاون کا یقین دلاتے ہوئے مادری زبان کو سیکھنے کی کوششوں کو سراہا اور اپنی جانب سے ڈاکٹر تقی عابدی، ناظم الدین مقبولؔ اور اُردو اسکول سے وابستہ آصف علی کو تہنیتی اسناد پیش کیں۔ مشہور شاعرہ اور مہمان خصوصی محترمہ ذکیہ غزلؔ نے اپنے مختصر تاثرات میں کہا کہ ''ایسی محافل نیک شگون ہیں جس میں ادبی شخصیات کو یاد کیا جائے اور ان کے کام اور کلام کو ادب دوستوں تک پہنچایا جائے۔ مہمان خصوصی اور برادر سعید شہیدی مرحوم جناب حسن علی سجاد نے اس موقع پر اپنے بھائی کی غزل ترنم سے سنا کر حاضرین سے خوب داد پائی۔ ''ذی نائن ٹی وی'' کی جانب سے جناب علی شاہ نے اس تقریب کی فلم بندی کی جو ان کے چینل پر دکھائی جائے گی۔ اس موقع پر مشہور غزل گلوکار جناب صادق اعظم نے سعید شہیدی کی مقبول غزلوں کو سازوں کی سنگت میں خوب صورت انداز میں پیش کر کے سامعین سے زبردست داد پائی۔ اس موقع پر مہمانوں کی ضیافت لذیز برنچ سے کی گئی اور دن کے کوئی بارہ بجے شروع ہونے والی یہ پر ہجوم محفل ساڑھے چار بجے تک کامیابی سے جاری رہی۔ بزم کی جانب سے آصف علی، محبوب شریف اور وصاف الرب نے کامیاب محفل کے انعقاد میں بھرپور حصہ لیا۔

ڈاکٹر شہناز قادری
جموں

اُردو کا وکیل: ڈاکٹر سید تقی عابدی

اُردو ادب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ایسی لاتعداد شخصیات ملیں گیں جو اپنی ہمہ پہلو اور ہمہ جہت علمی و ادبی خصوصیات کی وجہ سے جاذب توجہ ہر خاص و عام ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر عہد میں ادیبوں، مفکروں اور دانشوروں کے حالات و واقعات ایک اہم اور دلچسپ موضوع قرار دیئے جاتے ہیں۔ کسی بھی مستند ادیب و قلمکار کی شخصیت کے بارے میں رائے قائم کرنا اور اس کے فن کو پرکھنا جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ یہ عمل اس لیے آسان ہے کہ اگر پرکھنے والے کا قوت مشاہدہ مستحکم ہو تو ادبی و فنی شخصیت کے نقوش اور لکیروں کو بہ آسانی پہچانا جا سکتا ہے لیکن اگر یہی قوت مشاہدہ مضمحل ہو تو ان نقوش میں حق و باطل کا فرق کرنا ناممکن اور مشکل امر بن جاتا ہے جس کی وجہ سے ادبی اور فنی شخصیات کی قلمی تصویریں دھندلی دکھائی دینے لگتی ہیں۔ کسی بھی ادبی شخصیت کی زندگی کے واقعات و حالات اور علمی و ادبی نگارشات اس وقت اور زیادہ دلچسپ ہو جاتی ہیں جب وہ محنت اور جد و جہد کے جذبات سے معمور ہوں۔ دنیائے ادب کی ایک ایسی ہی شخصیت کو زیر نظر تحریر کے موضوع کی حیثیت حاصل ہے جو موجودہ دور میں ''صحت کے طبیب اور ادب کے مریض'' اور ''صحت کے معالج اور اردو کے وکیل'' جیسے القاب سے مشہور ہیں میری مراد ڈاکٹر سید تقی عابدی سے ہے موصوف کی شخصیت میں بیک وقت ایک ماہر معالج، ایک مستند شاعر، ایک دور اندیش محقق، ایک دیدہ ور نقاد، ایک شعلہ بیاں مقرر، ایک ماہر رثائی ادب، ماہر اقبالیات، ماہر غالبیات اور ماہر انیسیات وغیرہ کی بے شمار تجہیں گمٹی ہوئی ہیں۔ تقی عابدی یکم مارچ 1952ء کو دہلی میں تولد ہوئے۔ ان کا آبائی وطن ریاست امروہہ سے متصل نوگاؤں سادات ہے۔ ان کے والد کا نام سید سبط نبی تھا جو اعلیٰ تعلیم یافتہ

تھے اور قانون دان ہونے کی وجہ سے دہلی کے اعلیٰ عدالتی عہدوں پر فائز رہے۔ ساتھ ہی ساتھ مرحوم شعروادب کے بھی دلدادہ تھے۔ سبط علی کے والد اور تقی عابدی کے دادا کا نام سید شبیر علی تھا جو کہ ایک زمیندار تھے۔ تاہم ان کا خاندان علم وادب کا ایک گہوارہ تھا جہاں مروجہ علوم کے بے شمار علماء گزرے ہیں جس کا تذکرہ خود ڈاکٹر تقی عابدی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ہمارے خاندان میں رائج علوم کے بے شمار علماء گزرے ہیں ہمارے جد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ''حق الیقین'' نام دوسو اٹھارہ (218) سال پرانی کتاب میرے پاس ابھی تک محفوظ ہے[1]۔''

تقی عابدی کا شجرۂ نسب حضرت نظام الدین اولیاؒ سے جاملتا ہے یہی وجہ ہے کہ خواجہ حسن نظامی ثانی اسی مناسبت سے انھیں اپنا رشتہ دار گردانتے تھے۔ اسی لیے تقی عابدی کی ذہانت وفراست اور ادب دوستی کے حوالے سے قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کا علم دوست ہونا، ان کا مذہب کی طرف رجحان اور شعروادب کا شوق انھیں وراثت میں ملا ہے۔ اگرچہ علمی اعتبار سے تقی عابدی بنیادی طور پر علم طب سے وابستہ رہے ہیں تاہم انھیں شہرت عام اور بقائے دوام ادب کے میدان میں حاصل ہے۔ چناں چہ تقی عابدی کو مطالعہ کا شوق بچپن سے ہی تھا اور اس پر گھریلو ماحول نے بھی سونے پہ سہاگہ کا کام کیا۔ چوں کہ اس سلسلے میں موصوف خود ہی فرماتے ہیں:

''ہمارے گھر میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی چھٹی اور فراغت کے اوقات میں اس لائبریری سے استفادہ کرتا تھا[2]۔''

اس طرح سے ان کے ''قلب وذہن میں پل رہے ادبی وعلمی جراثیم کو یہ موافق ماحول میسّر آگیا اور یوں تقی عابدی امراضِ انسانی کے طبیب سے علم وادب کے مریض بن گئے۔

اُردو شعروادب کے ساتھ بچپن سے ہی ڈاکٹر تقی عابدی کو شغف تھا۔ ان کے اسکول طالب علمی کے زمانے میں ہندی اور انگریزی زبانیں پڑھائی جاتی تھیں جب کہ اُردو ان کی اختیاری زبان تھی۔ اُردو شعر گوئی کی شروعات ہائی اسکول کے زمانے سے کی، تاہم کالج کے زمانے کے بعد ایک طویل مدت تک شعر گوئی کی مشق میں ایک خلا سا پیدا ہوگیا جس کی وجہ

بقول خود "میڈیکل کی مشکل تعلیم، ہجرت، معاشی معاملات اور ماحول کی تبدیلی" بتاتے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا ہندوستان سے دور یورپ کے ممالک میں رہ کر اُردو زبان وادب کے بال و پر سنوارنا ایک بہت بڑی خدمت ہے اُردو کے حق میں چناں چہ ہمارے لیے اُردو میں لکھنا پڑھنا اور تحقیق وتدوین کا کام اس قدر مشکل نہیں جس قدر یورپ میں یہ کام دقت طلب ہے۔ اگر چہ اُردو زبان اپنی خوب صورتی اور شیریں بیانی کی بدولت دنیا کے دور دراز علاقوں میں پھیل رہی ہے اور اُردو کی نئی بستیوں کی تلاش افریقہ کے گھنے جنگلوں سے ہو رہی ہے کیوں کہ یہ ایک سیکولر کردار والی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو زبان قلیل مدت میں اتنی شہرت و ہر دلعزیزی حاصل کر چکی ہے جو اسے کسی بھی بین الاقوامی زبان کی ہمسری کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ زبان دنیا کی دیگر زبانوں کے لیے قابل رشک بن کر ابھر رہی ہے۔ یہ زبان نہ صرف بصیرت کی دل جوئی بلکہ سماعت کی بھی دلاویزی کا رتبہ حاصل کر چکی ہے اور اس کی شہرتِ عالمگیر کی ایک بڑی وجہ دوسری زبانوں کی لین دین کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے یہ تمام حالات و واقعات عاشقان اُردو کے دوش پر ایک اور اہم ذمہ داری ڈالتے ہیں وہ ہے اس کے رسم الخط کی حفاظت جو اُردو دانوں کے اوّلین فرائض میں سے ایک ہے۔ اُردو رسم الخط زبان اُردو کا ایک بیش بہا سرمایہ ہے جسے اُردو دشمن عناصر سے محفوظ رکھنا ہم سب کا اوّلین فرض ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تقی عابدی اردو رسم الخط کے حوالے سے ایک واضح نقطۂ خیال رکھتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اُردو زبان کا رسم الخط اس کی جان، آن بان، شان اور پہچان ہے۔ اُردو کے بدن پر رسم الخط کی مثال جلد کی مانند ہے اور اگر جلد کو جسم سے الگ کر لیا جائے یا نوچ لیا جائے تو بدن کا زندہ رہنا محال ہے۔

لہٰذا اُردو کے رسم الخط کی حفاظت اُردو زبان کے بقاء کی ضامن ہے۔ تقی عابدی کہتے ہیں کہ یورپ بلکہ ہندوستان میں بھی بیشتر لوگوں کا ماننا ہے کہ اُردو کو سمجھنا آسان ہے لیکن لکھنا مشکل ہے۔ جیسے بیشتر لوگ بول تو سکتے ہیں لیکن لکھ نہیں سکتے تو ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اُردو رسم الخط کی تشہیر کا کام سرعت سے کیا جائے اور اسے سائنسی تقاضوں کے ہم رکاب کیا جائے۔ اس وجہ سے اُردو زبان وادب کی ترویج میں یہ ڈاکٹر تقی عابدی کا ایک اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے سائنس اور انگریزی زبان کے ساتھ اپنی معاشی وابستگی کے باوجود اُردو

زبان وادب کے ساتھ اپنی تخلیقی و تحقیقی وابستگی قائم کی جو اس زبان کی وسعت و جامعیت میں ایک اضافے کا حکم رکھتی ہے۔ وہ فارسی اور اُردو زبانوں سے مکمل طور پر واقفیت رکھتے ہیں جو انھیں اُردو رسم الخط کے محافظ کا درجہ بھی عطا کرتا ہے۔ تقی عابدی کی ان ہی صفات کا بیان ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحوالہ شازیہ گل ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اُردو اور فارسی ادب کے باب میں تقی عابدی کا مطالعہ قابل رشک حد تک وسیع ہے۔ وہ اُردو فارسی دونوں زبانوں کے مزاج شناس، ان کے تاریخی و ثقافتی پس منظر سے واقف اور ان کے نمائندہ شعراء کے محاسن و کمالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ سخن گوئی کے ساتھ ساتھ وہ سخن شناسی کا بھی سچا ذوق رکھتے ہیں۔ علم عروض و علم بیان کے رموز و نکات سے بھی بے بہرہ نہیں ہیں۔''[52]

ڈاکٹر سید تقی عابدی کے دور حاضر میں اُردو تحقیق و تنقید میں مستند مقام کا تعین ان کی شہرۂ آفاق کتابوں کی ایک طویل فہرست سے کیا جا سکتا ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

(53) ''شہید'' (1982)، ''جوشِ مودت''، ''گلشن رویا''، ''اقبال کے عرفانی زاویے''، ''انشاء اللہ خاں انشاؔ''، ''رموز شاعری''، ''اظہار حق''، ''مجتہد نظم مرزا دبیر''، ''طالع مہر''، ''سلک سلام دبیر''، ''تجزیہ یاد گارِ انیس''، ''ابواب المصائب''، ''ذکر درِ باران''، ''عروسِ سخن''، ''مصحف فارسی دبیر''، ''مثنویات دبیر''، ''کائناتِ نجم''، ''روپ کنوار کماری''، ''دربار رسالت''، ''فکر مطمئنہ''، ''خوشۂ انجم''، ''دردریائے نجف''، ''تاثیر ماتم''، ''نجمی مایا''، ''روشِ انقلاب''، ''مصحف تغزل''، ''ھوالنجم''، ''تعشق لکھنوی''، ''ادبی معجزہ''، ''غالب دیوانِ نعت و منقبت''، ''چوں مرگ آید''، ''رباعیاتِ دبیر''، ''سبدِ سخن''، ''دیوانِ غالب دہلوی'' [فارسی]، ''کلیاتِ غالب فارسی'' (دو جلد میں)، ''دیوان غالب فارسی''، ''فیض فہمی''، ''مطالعہ دبیر کی روایت''، ''دیوانِ سلام و کلام انیس''، ''رباعیاتِ انیس''، ''رباعیاتِ رشید لکھنوی اور احوال پیری''، ''کلیاتِ حالیؔ''، ''مسدس حالیؔ''، ''حالیؔ فہمی''، ''حالی کی نظمیں''، ''حالیؔ کی غزلیں''، ''قطعاتِ حالیؔ''، ''حالیؔ کی نعتیہ شاعری''، ''دیوان حالیؔ فارسی''۔

زیر تالیف: ''تجزیہ شکوہ جواب شکوہ''، ''فانی لافانی''، ''مطالعۂ رباعیاتِ فراق گورکھپوری''، ''دوشاہکار نظمیں''، ''اقبالؔ کے چار مصرعے''، ''رباعیاتِ بیدلؔ''، ''باقیاتِ فیضؔ''۔

ان تصنیفات و تالیفات کے علاوہ بے شمار مضامین ڈاکٹر تقی عابدی کے فیض قلم سے نکل کر آئے دن دنیا بھر کے مستند جرائد و رسائل اور اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ یہ بات کافی حد تک حیران کن اور غور طلب ہے کہ موصوف اپنے وقت کو کس مہارت سے تصرف میں لاتے ہیں کیوں کہ پیشے سے ایک میڈیکل ڈاکٹر اور وہ بھی کینیڈا کے مصروف ترین ہسپتال (The Scarborough Hospital) میں اپنے فرائض منصبی کو بحسن و خوبی نبھاتے ہوئے تحقیقی و تنقیدی تصنیفات کی ایک حیران کن تعداد کو معرض وجود میں لانا یہ اعلیٰ ترین وارفع ترین ذہنی صلاحیت کا مالک ہی کر سکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تقی عابدی کی ادبی شخصیت کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تحقیق و تنقید کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ انھوں نے کلاسیکی شعراء، ادباء اور ساتھ ہی ساتھ جدید شعراء و ادباء یہاں تک کہ فارسی کے شہرۂ آفاق شعرا حافظ جامیؔ، رومیؔ اور سعدیؔ کی تخلیقات پر بھی قلم اٹھایا۔ بقول پروفیسر علی احمد فاطمی:

> ''ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے گراں قدر، اہم ادبی و تحقیقی کارناموں کے ذریعے ایک ادیب اور محقق کی حیثیت سے اپنی ایک ممتاز و منفرد حیثیت بنائی ہے۔ انیسؔ، دبیرؔ، انشاؔ، نجم آفندی وغیرہ نیز اُردو قواعد اور گرائمر پر جس نوعیت کی علمی و تحقیقی کتابیں رقم کی ہیں اس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اہل علم و فن لگا چکے ہیں اور اپنی پسندیدگی و معیار بندی کی مہر بھی لگا چکے ہیں[۴]۔''

ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی و ادبی شخصیت مختلف جہات کا احاطہ کرتی ہے۔ دورِ حاضر میں اُردو زبان کی ترقی و ترویج کا دعویٰ کرنے والے مفکروں اور ادیبوں میں اگر کوئی شخصیت متاثر کن ہے تو وہ موصوف کی ادبی شخصیت ہے۔ اُردو زبان کی ترقی و ترویج کے ساتھ ساتھ عقیدت کا جو اظہار ان کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے وہ حیران کن ہے اس پر طرہ یہ کہ تقی عابدی کو اپنی حیات میں ہی دنیائے ادب میں شہرتِ دوام حاصل ہے۔ اگرچہ تقی عابدی کو دُنیا کی

بے شمار ادبی انجمنوں نے انعام و اکرام اور اعزازات سے نوازا ہے وہیں بہت سی جامعیات میں ان کی ادبی شخصیت کے مختلف گوشوں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔ علاوہ ازیں دنیائے ادب کے مستند جرائد و رسائل نے بھی موصوف کی شخصیت کو اپنی زینت بنایا ہے۔ ''چہار سو'' راولپنڈی ہو یا بمبئی سے نکلنے والا ''شاعر'' ان کے خصوصی شماروں میں ''عروسِ سخن''، ''سبدِ سخن''، ''مصحفِ فارسی''، ''کلیاتِ غالب فارسی''، ''تجزیہ یادگار مرثیہ اور ''مصحفِ غزل'' جیسی نادر کتابوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ جو اُردو ادب میں لافانی و لاثانی اہمیت کی حامل ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُردو افق کے اس درخشاں ستارے کی حیات اور کارناموں پر بہت سے مصنّفین نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں ''ڈاکٹر سید تقی عابدی بحیثیت نقاد و محقق''، ''سید تقی عابدی بطور اقبال شناس''، ''سید تقی عابدی شخصیت اور فن کا مختصر جائزہ''، ''فنکار حق شعار'' اور ''بنام تقی عابدی'' کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ تقی عابدی کی ادبی خدمات اور شخصیت کی عظمت کا اعتراف اگرچہ ان تمام تصانیف میں بھرپور ملتا ہے تاہم پروفیسر عبدالمنان طرزی نے اپنی کتاب ''فنکار حق شعار'' میں بڑی ہی خوب صورتی کے ساتھ سید تقی عابدی کے فکر و فن کا منظوم جائزہ پیش کیا ہے۔ مذکورہ کتاب سے نمونتاً چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہے متاعِ آگہی سید تقی عابدی
معتبر دانشور سید تقی عابدی

علم و فن کی خسروی سید تقی عابدی
ایک مردِ آہنی سید تقی عابدی

چارہ سازِ علم جو سید تقی عابدی
خادمِ فن باوضو سید تقی عابدی

نیک دل اور نیک خو سید تقی عابدی
نغمہ ہائے آبجو سید تقی عابدی

خاکِ پائے عارفاں سید تقی عابدی
نازِ فرقِ کاملاں سید تقی عابدی

میر و مرزا کا بیاں سید تقی عابدی
مرثیے کی ہے زباں سید تقی عابدی

محشرِ جذبات ہے سید تقی عابدی
قاطعِ بدعات ہے سید تقی عابدی

زینتِ صفحات ہے سید تقی عابدی
علم کی سوغات ہے سید تقی عابدی

اہلِ دل، اہلِ نظر سید تقی عابدی
مثلِ انوارِ سحر سید تقی عابدی

دردِ دل دردِ جگر سید تقی عابدی
قطرہ ہائے چشمِ تر سید تقی عابدی

جانبِ منزل قدم سید تقی عابدی
داستان خوں رقم سید تقی عابدی

صاحبِ کیفِ قلم سید تقی عابدی
جیسے کوئی جامِ جم سید تقی عابدی

حاصلِ دردِ نہاں سید تقی عابدی
کامیاب و کامراں سید تقی عابدی

دشتِ وحشت کی اماں سید تقی عابدی
التہابِ وافراں سید تقی عابدی

قامتِ جانانِ جاں سید تقی عابدی
ہے یقین بے گماں سید تقی عابدی

گرچہ ہیں لاکھوں یہاں سید تقی عابدی
پر کوئی تجھ سا کہاں سید تقی عابدی

نقدِ فن کا سلسلہ سید تقی عابدی
رب تعالیٰ کی عطا سید تقی عابدی

آگہی کا در کھلا سید تقی عابدی
ایک دردِ لادوا سید تقی عابدی

علم کا اعلیٰ صلہ سید تقی عابدی
تو نے بے شک پالیا سید تقی عابدی

عاشقی کی انتہا سید تقی عابدی
واقعاتِ کربلا سید تقی عابدی

نقص، طرز نقد کا سید تقی عابدی
دور تو نے کردیا سید تقی عابدی

اتنا ثابت ہوگیا سید تقی عابدی
فن کار ہے تو اک بڑا سید تقی عابدی

مستند دیدہ وری سید تقی عابدی
شعری نثری آزری سید تقی عابدی

لاریب ایسا خواب بھی سید تقی عابدی
تعبیر جس کی قیمتی سید تقی عابدی

اب آبرو تحقیق کی سید تقی عابدی
تجھ سے ہوئی محفوظ بھی سید تقی عابدی[5]

نہ صرف کتابوں، جریدوں اور اخباروں میں بلکہ ڈاکٹر تقی عابدی کی ادبی شخصیت کا اعتراف مختلف مشاہیر ادب نے اپنے مکاتیب ''بنام تقی عابدی'' میں بھی بھرپور کیا ہے۔ ان خطوط میں تقی عابدی کی جلوہ صد رنگ شخصیت بیک وقت ایک بین الاقوامی سطح کے ماہر معالج، شاعر، محقق، تخلیق کار اور تجزیہ نگار کے بطور اُبھرتی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر شارب ردولوی کے خط سے تقی عابدی کی ادبی شخصیت کے حوالے سے درجہ ذیل اقتباس نمونتاً پیش کیا جاتا ہے:

''......سائنس اور طب مغربی سے وابستگی کے باوجود مشرقی علم و دانش اور اردو ادبیات سے آپ کا گہرا تعلق ہے اور ادبی کاموں میں جو آپ

کا انہماک ہے وہ قابل ستائش ہی نہیں قابل رشک ہے[۶]۔"

اسی طرح موصوف کی ادبی حیثیت کا ادراک عروج زیدی ۲۱/اپریل ۱۹۹۹ء کے ایک مکتوب میں، بحوالہ ضمیر جعفری ان الفاظ میں ملتا ہے:

"............ ہندو پاکستان کے معروف ادیب حضرت ضمیر جعفری نے عابدی صاحب کی خدمات دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ عابدی صاحب "نیویارک کے جمیل جالبی ہیں" اس امر سے ہم سب اہل علم بخوبی واقف ہیں[۷]۔"

بہر حال ڈاکٹر سید تقی عابدی اپنے بیش بہا ادبی کارناموں اور اپنی منفرد ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر اردو زبان وادب میں ایک فرد ہی نہیں بلکہ ایک انجمن کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان ادب سے دور رہ کر دنیائے سائنس وطب میں رہ کر عروسِ اردو کی مشاطگی کے فرائض انجام دیئے۔ نہ صرف یہ بلکہ سرزمین وطن سے بعید دیارِ غیر میں اردو زبان وادب کی محفلیں سجائیں آخر پر بقول شاعر صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ ؏

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حواشی

۱۔ سید تقی عابدی شخصیت اور فن ایک مختصر جائزہ، مرتبہ: زبیر صدیقی، ص: ۳۱
۲۔ سید تقی عابدی شخصیت اور فن ایک مختصر جائزہ، واصف حسین واسف اردو ٹائمز نیویارک، ص: ۱۳
۳۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی بطور اقبال شناس مرتبہ: شازیہ گل، ص: ۱۴
۴۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی بحیثیت نقاد و محقق مرتبہ: محمد رکن الدین، ص گردپوش
۵۔ ای میل Taqiabedi@rogers
۶۔ بنام تقی عابدی، مرتبہ: ڈاکٹر شہناز قادری، ص: ۳۸
۷۔ بنام تقی عابدی، مرتبہ: ڈاکٹر شہناز قادری، ص: ۳۹

سلطان جمیل نسیم (پاکستان)
''انشاء''

ڈاکٹر سید تقی عابدی: ایک محقق، مصنف اور شاعر

اب سے چار پانچ برس پہلے تک پاکستان کے بعض رسائل میں ڈاکٹر تقی عابدی کے نام سے رثائی ادب یا علامہ اقبال کے بارے میں جب کوئی مضمون دیکھتا تو اس مضمون کے بعض جملے اور فقرے اپنی گہری رمزیت اور فکری معنویت کے اعتبار سے یہ احساس ضرور پیدا کرتے کہ اس مصنف کے سینے میں حق و انصاف کے لیے نہایت وابستگی اور ظلم و انصافی کے خلاف شدید اکراہ دلی کا جذبہ موجزن ہے ہر مضمون پڑھنے کے بعد دل چاہتا کہ مصنف سے رسم و راہ پیدا کی جائے اور ان کے مطالعہ اور خیالات سے استفادہ کیا جائے۔ لیکن میرے علم میں دور دور تک یہ بات نہیں تھی کہ تقی عابدی صاحب سات سمندر پار رہتے ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ لاہور کے کسی کالج میں اُردو پڑھاتے ہوں گے۔

ایک مرتبہ لاہور سے عزیز محترم ڈاکٹر شبیہ الحسن تشریف لائے تو انھوں نے غریب خانے کو بھی یاد رکھا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے والد گرامی قدر سید وحید الحسن ہاشمی جن کے دم سے عہد موجود میں جدید مرثیے کا علم بلند ہے، وہ میرے والد کی کئی کتابوں پر اظہار خیال فرما چکے تھے۔ اور ڈاکٹر شبیہ الحسن نے 1992ء میں حضرت صبا اکبر آبادی کی وفات پر اپنے رسالے ماہنامہ ''شام و سحر'' کا ایک مکمل شمارہ ان کی یاد سے منسوب کیا تھا۔ چناں چہ شبیہ الحسن صاحب سے میں نے بلاتکلف یہ پوچھا کہ ''ڈاکٹر سید تقی عابدی لاہور کے کس کالج سے وابستہ ہیں۔'' انھوں نے یہ بتا کر مجھے ایک خوش گوار حیرت میں مبتلا کر دیا کہ ''عابدی صاحب شمالی امریکہ میں رہتے ہیں اور تعلیم کے نہیں طب کے ڈاکٹر ہیں۔''

خیر! وقت گزر گیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ یہ وقت بھی خوب ہے اپنی کارگزاری بھی عجب رنگ ڈھنگ سے دکھاتا ہے، مسئلہ روٹی کا تھا نہ خوف کا۔ اپنے وطن میں سکون و دلجمعی

کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ہجرت پر مجبور کر دیا گیا۔ 2001ء میں مہاجر بن کے کینیڈا آ گیا۔ یہاں ایک ہی میرے کرم فرما جناب اکرام بریلوی صاحب تھے۔ چناں چہ ان کی چاہت میں ایک تقریب میں پہنچا تو وہاں برادر محترم حمایت علی شاعر سے ملاقات ہوئی۔ اس تقریب کے دوسرے روز کسی صاحب نے اپنے گھر کے بیسمنٹ Basement میں حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام رکھی تھی۔ حمایت بھائی نے اپنے میزبان کے حصے میں مجھے لانے لے جانے کی ذمہ داری بھی شامل کر دی۔

جب میں اس تقریب میں پہنچا تو وہاں صوبے کی اسمبلی کے ایک گورے ممبر بھی موجود تھے اور ایک پاکستانی صاحب بزبانِ انگریزی نائن الیون (9/11) کے تعلق سے افغانستان کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کی تائید میں تقریر فرما رہے تھے۔ اسی طرح دو ایک تقریریں اور ہوئیں اور گھنٹہ بھر تک میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ تقریب جناب حمایت علی شاعر کے اعزاز میں منعقد ہوئی ہے یا امریکی صدر کی حمایت کرنے پر صدرِ پاکستان کے فیصلے کو سراہنے کے لیے یہ اجتماع ہے۔

خدا خدا کر کے کفر ٹوٹا اور شاعری شروع ہوئی۔ میرے لیے ٹورنٹو کے شاعروں کو سننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ یہ بھی اندازہ تھا کہ اس نجی محفل شعر خوانی میں تمام نمائندہ اور سرکردہ شعرائے کرام کو تو مدعو کیا نہیں ہوگا اور ایسا ممکن بھی نہیں تھا۔ ابتدا میں جن دس بارہ شاعروں کو سنا وہ یقیناً میزبان کے ذوق شعر فہمی پر پورے اترتے ہوں گے لیکن میرے لیے شاعری سے عبرت حاصل کرنے کو بہت کافی تھے۔ غالب، جو ہمیشہ اور ہر مرحلے پر سہارا دینے کے لیے موجود رہتے ہیں ان کا یہ شعر ذہن میں آیا ؎

ہنگامہ زبونیٔ ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اس کے باوجود شعرائے کرام کی صورت اور اپنی حالت دیکھتے ہوئے سوچا کہ حمایت بھائی سے اشاروں میں کہوں مجھے گھر بھجوانے کا بندوبست کیجیے۔ مگر وہ آئینہ در آئینہ سامنے رکھے نہ جانے کیا دیکھے جا رہے تھے۔ پھر خیال آیا میزبان سے گزارش کروں۔ جس راستے سے بلایا ہے اسی راہ سے واپسی پہنچوا دیجیے۔ لیکن غالب تسلی دینے کے لیے موجود تھے۔

غالبؔ، تمہی کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

بس یہ سوچ کر کہ

جب دل و دیں کر چکے نذر جیب
اب جو گزرے یا مقدر یا نصیب

(صباؔ اکبر آبادی)

کرسی پر ذرا پھیل کر بیٹھ گیا اور میزبان کے چہرے کی خوشی اور باذوق سامعین کے بشرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ دیکھ کر لطف لیتا رہا۔ اس مشاعرے کے جو معلن تھے وہ شعرائے کرام کا ایک جملے میں تعارف کرانے سے قبل اپنی سابقہ اہمیت اور سیاسی بصیرت کے ثبوت میں تقریر کرتے تھے۔ پندرہ بیس شاعروں کے بعد ایک مانوس نام کا اعلان ہوا۔ میں سنبھل کر بیٹھا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کو زحمتِ کلام دی گئی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ اس نام کے ساتھ تو میں فکر انگیز مقالے اور مضامین پڑھتا رہا ہوں۔ شاعری کبھی نظر سے نہیں گزری۔ کہیں یہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ہم نام تو نہیں ہیں۔ خیر دیکھیں یہ سناتے کیا ہیں۔

ایک بھاری بھر کم شخصیت، سوٹ بوٹ میں ملبوس، مائک پر آتے ہی اپنی کھرج دار آواز میں فرمایا:

نظم پیش کرتا ہوں۔ عنوان ہے۔

مگر نہیں، خواتین و حضرات میں اس نظم کے بارے میں توصیفی کلمات ادا نہیں کروں گا بلکہ وہ نظم آپ کو سناؤں گا اور آپ خود اس نظم کی داد دینے پر مجبور ہوں گے۔ لیکن اس نظم سے پہلے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تصانیف وتالیفات اور ان کے معرکہ آرا کتاب ''تجزیہ یادگار انیس'' کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کی ہر کتاب یوں تو ایک تفصیلی اور تجزیاتی مقالے کی متقاضی ہے لیکن میں نقاد ہوں اور نہ تجزیہ نگار اس لیے چند الفاظ پر ہی گزارا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی اب تک نو (9) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن کے نام ہیں:

''شہید''، ''جوشِ مودّت''، ''گلشن رویا''، ''رموزِ شاعری''، ''عروسِ سخن''، ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے''، ''انشاء اللہ خان انشاء''، ''اظہارِ حق'' اور ''تجزیہ یادگارِ انیس''۔

ادب میں تحقیقی کام کی تاریخی اہمیت رہی ہے۔ اُردو ادب کی تحقیق کے حوالے سے جب بھی تاریخ لکھی جائے گی تو نہ صرف شمالی امریکہ بلکہ پاک و ہند میں بھی رثائی ادب کی تحقیق و تدوین کے سلسلے میں ڈاکٹر عابدی صاحب کے نام اور کام کو نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوگا۔

''تجزیہ یادگارِ انیسؔ'' ایسی کتاب ہے جس کا شہرہ پوری اُردو دُنیا میں ہے۔ یہ کتاب میر ببر علی سلامت انیس لکھنوی کے اس مشہور مرثیے کا جائزہ ہے جس کا پہلا مصرعہ ہے ؎

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

بقول ڈاکٹرِ سید تقی عابدی ان کے اس عظیم اور ضخیم تجزیے کی بنیاد، پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب مرحوم کے اس مقدمے پر رکھی گئی ہے جو ''شاہکارِ انیسؔ'' کے عنوان سے اسی مرثیے کے سلسلے میں اب نصف صدی سے بھی پہلے لکھا گیا تھا۔ اس مقدمے نے ڈاکٹر عابدی کو یہ تحریک دی کہ اس کا مکمل تجزیہ کریں۔ چناں چہ انھوں نے جہاں یہ بتایا ہے کہ اس مرثیے میں 197 بند ہیں وہاں یہ حساب بھی لگایا ہے کہ 691 اشعار ہیں اور 1182 مصرعے ہیں۔ اسی طرح 171 مختلف موضوعات کو جدول بنا کر بھی شامل کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے فارسی، عربی کے الفاظ کتنے ہیں۔ کون کون سی شاعرانہ اور ادبی اصطلاحیں، صنعتیں اس مرثیہ میں برتی گئی ہیں۔

غرض ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے میر انیسؔ کے مرثیہ کا اتنی محنت سے تجزیہ کیا ہے کہ کوئی دوسرا محقق میرے خیال میں کسی ایک مرثیہ پر اتنی محنت کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا اور پھر اپنی اس محبت بھری محنت اور تحقیقی کام کو جس تزئین و آرائش کے ساتھ شائع کرایا ہے میرا خیال ہے وہ لوگ جو اُردو زبان کی سحر طرازی سے پوری طرح واقف بھی نہ ہوں وہ بھی ہمارے عابدی صاحب کے اس تجزیے کی خوب صورت طباعت و اشاعت کو دیکھ کر تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اُردو میں جو چند خوب صورت کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ میرے نزدیک ''مرقع چغتائی'' اور ''تجزیہ یادگارِ انیسؔ'' کے علاوہ شاید ہی کوئی تیسری ادبی کتاب مشکل ہی سے ان کے مقابل ٹھہر سکتی ہے۔

''تجزیہ یادگار انیس'' جتنی خوب صورت طباعت واشاعت کے اعتبار سے ہے اتنی ہی فکری خوب صورتی لیے ہوئے۔ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کی وہ نظم ہے جو میں نے کینیڈا آنے کے بعد پہلے مشاعرے میں سنی اور جس کو سننے کے بعد احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب جس اعلیٰ پائے کے نقاد اور محقق ہیں اسی بلند پائے کے شاعر بھی ہیں اس نظم کی فکری دلکشی اور خوب صورتی میں، میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔

سماعت فرمائیے۔ نظم کا عنوان ہے۔ ''بچوں کی ہنسی''

بچوں کی ہنسی

کتنی معصوم ہُوا کرتی ہے، بچوں کی ہنسی
پھول کی طرح کھلا کرتی ہے، بچوں کی ہنسی
تتلیوں جیسی اُڑا کرتی ہے، بچوں کی ہنسی
گردکو بادِ صبا کرتی ہے بچوں کی ہنسی
دل کے دروازے کو وا کرتی ہے، بچوں کی ہنسی
خود بہ خود دل میں جگہ کرتی ہے، بچوں کی ہنسی
کِھل کھلا کر جو ہوا کرتی ہے، بچوں کی ہنسی
لگتا ہے جیسے دُعا کرتی ہے، بچوں کی ہنسی
ہے پگھلتے ہوئے سونے کی ڈلی
ننھے بچوں کی ہنسی
جس کو سنتے ہی ہر اک شخص کو بچپن سا لگے
درد کے دیس میں جیسے کوئی ہمدرد ملے
جس طرح کھلتے ہوئے پھول کی خوشبو مہکے
چاندنی رات میں جیسے کوئی نغمہ بہکے

جس طرح دل کے کنویں میں کوئی پتھر ڈالے
جیسے بچھڑے ہوئے معشوق کو عاشق پالے

جیسے چوٹی پہ پہاڑوں کی سحر جاگتی ہو
جیسے ہرنی کوئی گھبرائی ہوئی بھاگتی ہو
لگتا ہے جیسے بیاباں میں کوئی شمع جلی
کھل گئی دل کی کلی
سن کے بچوں کی ہنسی

میٹھی آواز میں ساغر کی کھنک بولتی ہے
چشم شفاف میں شیشے کی چمک بولتی ہے
چاندنی دشت میں دریاؤں کو بھرنے والی
روشنی گھر کی منڈیروں پہ اترنے والی
ایسا احساس ہوا
مل گئی مجھ کو خوشی
سن کے بچوں کی ہنسی

یہ تمنا ہے مری
اے خدائے ازلی
لے لے یہ میری ہنسی
جو بناوٹ سے بھری
جو دکھاوے سے بجی
جو سیاست سے بنی
دے دے پھر مجھ کو وہی
مرے بچپن کی ہنسی
مری گم گشتہ خوشی
نو بہاروں میں ڈھلی

وہ ستاروں کی گلی
جو محبت سے بھری
جو حقیقت سے بچی
بھول جاتا ہوں جسے سوچ کے میں تنگ دلی
کاش مل جائے وہ کھوئی ہوئی بچپن کی ہنسی

آئی ہاتف کی ندا رازِ مشیّت ہے یہی
جس میں تبدیلی نہیں کوئی وہ سُنّت ہے یہی
وقت گزرا ہوا پلٹا ہے نہ پلٹے گا کبھی
بچپنا چھوڑ کے اب دیکھ بڑھاپے کی گھڑی
اچھی لگتی ہے فرشتوں کو بھی بچوں کی ہنسی

اس لیے خواب میں بچوں کو ہنساتے ہیں وہی
عرش اور فرش کی ہے جب یہ پسندیدہ خوشی
آؤ پھر مل کے کریں عام یہ بچوں کی ہنسی

کتنے بچے ہیں کہ ہنستے نہیں اس دُنیا میں
پیدا ہو کر بھی جو بستے نہیں اس دُنیا میں
خون کابل میں رواں، سرخ فلسطیں کی گلی
دیکھی جاتی نہیں اب بوسنیا میں بھی خوشی
ننھے بچوں کی ہنسی

جن کے سر پر ہے کھڑی
تیرہ و تار گھڑی

جو مصیبت سے بھری
روتے بچوں کو ہنسا دے یہ عبادت ہے بڑی
پونچھ دے آنکھوں سے بہتی ہوئی آنسو کی لڑی
بانٹ بچوں میں خوشی
دے دے بچوں کو ہنسی

حجِ اکبر ہے یہی
آبِ کوثر ہے یہی
نیک کاموں میں تقی
سب سے بہتر ہے یہی

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

مہجری ادب کا درخشاں ستارہ ڈاکٹر تقی عابدی

کینیڈا میں مقیم ہند الاصل ڈاکٹر تقی عابدی عہد حاضر میں دانشوری کی روایت کے علمبردار ہیں وہ بیک وقت ادیب، ناقد، محقق، مصنف اور شاعر ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک معروف ڈاکٹر ہیں، اُردو درس وتدریس اور اُردو ادب وشعر سے ان کا کوئی پیشہ ورانہ تعلق نہیں ہے لیکن ایک خاص تہذیبی فضا میں ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل ہوئی اس لیے وہ ابتدا سے ہی شعر وادب اور تصنیف وتالیف کی جانب مائل رہے۔ میڈیکل سائنس کی تعلیم کے دوران ہی ان کی کئی تحریروں نے اہل نظر سے داد تحسین حاصل کی، شعبۂ طباعت میں باضابطہ ملازمت کے بعد بھی انھوں نے اپنی اس تہذیبی وثقافتی روش کو قائم رکھا اور ادب کے سرمائے میں اپنی تصانیف وتالیفات سے بیش قیمت اضافہ کیا لیکن کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو بھی متاثر نہیں ہونے دیا بلکہ اپنے معاصرین میں فن طباعت میں بھی امتیازی مقام پر فائز ہیں۔ وہ کینیڈا میں مقیم ہیں لیکن دُنیا کے کئی ممالک میں میڈیکل سے وابستہ تنظیموں اور اداروں میں بطور ماہر طبیب منسلک ہیں۔ تقی عابدی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں انھوں نے اُردو کے نامور شعرا کی شخصیت اور فن پر بہت ہی معیاری اور تحقیقی کام کیا ہے ان میں حالؔی، اقباؔل، فیضؔ، انیسؔ، دبیر اور کئی معاصر شعرا پر ان کا کام اُردو دُنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تقی عابدی کا شمار مہجری ادیبوں میں ہوتا ہے۔ عہد اور معاشرے کے پیش نظر ادب میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور ادب کے پرکھنے کے معیار ومنہاج میں بھی اسی کے مطابق نظریات اور اصول بنتے رہے ہیں لیکن آج کے عہد میں ادب کی تفہیم وتعبیر کے نظریات اور اصول وضوابط میں بہت تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی اور ہمارا معاشرہ بہت سرعت سے تغیر و

تبدل کی جانب مائل ہے۔ موجودہ دور میں کسی ادب کی قدر و قیمت اور اس کے ثروت مند ہونے کے جہاں کئی معیارات ہیں وہاں اب ایک اہم معیار یہ قائم ہو گیا ہے کہ جس ادب میں ''مہجری ادب'' کا سرمایہ جتنا وقیع ہوگا وہ ادب زیادہ ثروت مند تسلیم کیا جائے گا۔ اس کے پیچھے منطق یہ ہے کہ آج کا معاشرہ عالمی گاؤں کا معاشرہ ہے اس لیے ادب کی وسعت بھی اسی قدر ہونی چاہیے۔ یہ معیار و میزان بہت حد تک درست بھی ہے کیوں کہ موجودہ عہد میں زبان و ادب میں ربط و اشتراک اور لین دین کا عمل عالمی سطح پر بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ جب ہم اس معیار پر اُردو زبان و ادب کو دیکھتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ اُردو عالمی سطح پر مہجری ادبی تخلیقات و تصنیفات سے مالامال ہے۔ دُنیا کے بڑے ممالک جیسے لندن، امریکہ، کینیڈا، جاپان، یورپ کے کئی ممالک، ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹے چھوٹے ممالک بھی اُردو کے مہجری مجموعی طور پر اگر جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں ان ممالک میں شعری تخلیقات زیادہ سامنے آ رہی ہیں۔ تقریباً ہر ملک میں شعراء کی بہت ہی اچھی تعداد موجود ہے لیکن نثری تخلیقات اور تصنیفات ان کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ تحقیق و تنقید پر تو بہت ہی کام ہو رہے ہیں۔ موجودہ منظرنامے میں تحقیق و تنقید کے اعتبار سے مہجری ادب کا جائزہ لیں تو ان میں روشن ستارے کی طرح تقی عابدی کی شخصیت سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ سچائی بھی یہی ہے کہ ابھی برصغیر سے باہر اُردو کے ادیبوں میں تحقیق و تنقید کے میدان میں کام کرنے والوں میں سب سے نمایاں نام اور اہم تحقیقی و تنقیدی کام تقی عابدی کا ہی ہے۔ اب تک ان کے پچاس سے زائد علمی، ادبی اور تحقیقی کام سامنے آ چکے ہیں۔ ہندوستان، پاکستان، مصر اور کئی ممالک میں ان پر تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ان کی خدمات کے عوض ہند و پاک کے کئی ادبی اور علمی اداروں نے انھیں اعزازات سے بھی نوازا ہے۔ اُردو کے ساتھ ساتھ وہ فارسی زبان پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ فارسی زبان میں بھی ان کی گراں قدر تصنیف ''کلیات غالبؔ فارسی'' ہے جو ہندوستان اور ایران سے شائع ہوئی۔

تقی عابدی نے حال ہی میں خواجہ الطاف حسین حالؔی کا کلیات مرتب کر کے تحقیق میں بہت اہم خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے بہت سے ایسے کلام کو بھی اس کلیات میں

شامل کردیا ہے جو کہیں دستیاب نہیں تھے اس کے علاوہ حالی کی شاعری کے تمام جہتوں کو جس خوش اسلوبی سے متعارف کرایا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ انیس و دبیر، اقبال و فیض کے حوالے سے بھی ان کی تحقیقی کتابیں بہت ہی وقیع ہیں۔ ان شعرا کے مطالعے میں انھوں نے تقابلی تنقید اور سماجیاتی نقطۂ نظر کو سامنے رکھا ہے۔ ان کی تازہ ترین تصنیف میں ''امجد فہمی'' ہے جو پاکستان سے شائع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی۔ گزشتہ ایک دہائی میں تقی عابدی نے تحقیق و تنقید کے میدان میں جتنے کام کیے ہیں انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جو کام اداروں کے تھے انھیں تقی عابدی نے تن تنہا کیا ہے۔ ان کی تمام علمی و ادبی کاوشوں کو آج بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور آنے والے دنوں میں بھی مزید احترام اور وقعت سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر عظیم امروہوی
امروہہ (یوپی)

رثائی ادب کا مسیحا

سماعت کی سرحدوں میں ایک آواز داخل ہوئی ''ڈاکٹر تقی عابدی''۔ یا کبھی بصارت کے دائرے میں نقوش بن کر یہ الفاظ چمکے۔ یعنی ''ڈاکٹر تقی عابدی''۔ تو فوراً ذہن کے اُفق پر رثائیت کی شفق پھیل جاتی ہے۔ اور کبھی میر انیسؔ تو کبھی مرزا دبیر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان کی ذات والا صفات سے یوں تو دیگر ادبی تصورات بھی وابستہ ہیں۔ انھیں انشاءؔ، فانیؔ، اور اقبالؔ سے بھی دلچسپی ہے اور ان بحیرۂ ذخار کی تہوں میں غوطہ زنی کر کے ایسے موتی نکالنے کی کوشش کی ہے جو ابھی تک ادبی دُنیا کی نگاہوں سے اوجھل تھے یا سامنے آئے بھی تھے تو پوری طرح پہچانے نہیں گئے تھے۔

لیکن ڈاکٹر تقی عابدی نے جتنے کم وقت میں شعرائے رثائیت یعنی میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور فرید لکھنوی پر مختلف اور انوکھی جہات سے جتنا زیادہ کام کیا ہے وہ یقیناً قابلِ رشک حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی ایک کتاب کی رسم اجراء کی تقریبات مختلف ممالک میں اختتام پذیر ہونے سے قبل ہی دوسری کتاب زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہوتی ہے۔

''تجزیہ یادگار مرثیہ انیسؔ'' میں میر انیسؔ کے صرف ایک مرثیے ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کو تحقیق و تنقید کے ساتھ ایسے منفرد انداز میں ترتیب دیا کہ جسے ہم ادب کی تاریخ میں بالکل منفرد مقام دے سکتے ہیں۔ اس میں ترتیب کے سلیقے کے ساتھ ہی جو عرق ریزی کی گئی ہے وہ ایسا بھاری پتھر تھا کہ جسے چومنے کی دوسرا کوئی آسانی سے ہمت بھی نہ کرتا۔ اور اگر چومتا بھی تو صرف چوم کر چھوڑ دیتا۔ لیکن انھوں نے مرثیے کے آخری بند تک اس کام کو اسی انہماک سے انجام دیا جس سے شروع کیا تھا۔ اور حقیقت یہ

ہے کہ صرف ایک مرثیے پر اپنے زاویوں سے کام کرکے انھوں نے دُنیائے ادب کے سامنے ایک محیّر العقول نمونہ پیش کر دیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس سلسلے میں بالکل صحیح فرمایا ہے کہ یہ ایک کتاب نہیں بلکہ نکات فصاحت و رموز بلاغت کا ایک سرچشمہ ہے۔ محاسنِ لفظی و معنوی کا ایک خزینہ ہے۔ اُردو مرثیہ نگاری کی تفہیم و تحسین کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے اور انیس شناسی و انیس فہمی کے باب میں ایک نادرہ کاری ہے۔

کربلائی ادب کے ایک فراموش کردہ شاعر فرید لکھنوی سے اہل علم بھی پوری طرح واقف نہیں تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے فرید لکھنوی کا وہ خزانہ تلاش کرلیا اور ان کے مراثی، سلام، رثائی قطعات و دیگر کلام و تحقیق کے بعد ''اظہارِ حق'' کے نام سے اپنے تبصرے کے ساتھ دُنیائے ادب کے حوالے کر دیا۔ آج یہ ایک ضخیم کتاب ہند و پاک میں پذیرائی حاصل کر چکی ہے اور علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہے۔

ادب کی تاریخ میں آج کا دن یقیناً ایک ایسا یادگار اور اہم ترین دن ہے کہ جس میں رثائی ادب کے امام مرزا دبیر پر چھ تصانیف مختلف عنوانات سے منظر عام پر آ رہی ہیں۔ کسی بھی ایک فن کار پر کسی بھی ایک ادیب کی اتنی اہم کاوش و کوشش، تحقیق و تلاش، تشریح و تفسیر اور تنقید و تبصرہ اتنے کم وقت میں منظر عام پر آنے سے بھی ایک نئی مثال قائم ہو رہی ہے۔ اور یہ حیرت انگیز کام نہیں بلکہ کارنامے ہیں اور وہ بھی ایک ایسی شخصیت کے جس نے اُردو دُنیا سے ہزاروں میل کی دوری پر بیٹھ کر یہ سب کچھ کیا ہے جہاں کا ماحول الگ معاشرہ مختلف، تہذیب جدا، تمدن علیحدگی، بلکہ دُنیا ہی دوسری یقیناً ان کا صرف جسم وہاں رہتا ہوگا اور وہ ذہنی طور پر اسی اُردو دُنیا یعنی دہلی، لکھنؤ حیدرآباد، لاہور اور کراچی کی فضاؤں میں اپنے آپ کو رکھتے ہوں گے۔ کیوں کہ یہ تو ویسے بھی مشکل ترین کام تھا۔ بہرحال مرزا دبیر پر مندرجہ ذیل کتب کی آج 21/ مارچ 2005ء کو رسم اجراء حدیث دل ٹرسٹ کی جانب سے انجام دی جا رہی ہے:

1. ''مصحفِ فارسیِ مرزا دبیر'' [مجموعہ کلام فارسی]
2. ''مثنویاتِ دبیر''

3. ''مجتہدِ نظم مرزا دبیرؔ''
4. ''طالع مہر'' [مرزا دبیرؔ کا غیر منقوط کلام]
5. ''سلکِ سلام دبیرؔ''
6. ''ابواب المصائب'' [تصنیف مرزا دبیرؔ، مع مقدمہ سوانح عمر و تشریح]

اور اس کے بعد ''رباعیاتِ دبیرؔ'' اور ''کائناتِ تجمؔ'' زیر تالیف ہیں اور امید ہے وہ بھی جلد ہی منظر عام پر آئیں گے۔ ہم بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہیں کہ پروردگار عالم ڈاکٹر تقی عابدی کو نظر بد سے محفوظ رکھے اور رثائی ادب کے لیے ان کا یہ کار مسیحائی اسی طرح معیاری انداز میں جاری رہے کیوں کہ اس کی اشد ضرورت ہے۔ یوں تو ہر دور میں ہر قسم کا ادب جتنا تخلیق ہوا ہے سب محفوظ نہیں رہ سکا کچھ ضائع اور تلف بھی ہوتا رہا۔ لیکن جہاں تک رثائی ادب کا سوال ہے یہ سب سے زیادہ ضائع ہوا ہے۔ اور اسے محفوظ نہیں رکھا جا سکا۔ آج بھی شمالی ہندوستان میں بستی بستی پرانے دیوان خانوں، عاشور خانوں، حویلیوں، کتب خانوں، عزاخانوں، الماریوں، سوز خوانوں اور تحت اللفظ خوانوں کے بستوں میں ایک کثیر سرمایہ غفلت کے گرد و غبار کے نیچے دبا ہوا ہے۔ جسے محفوظ کرنا ہماری ذمہ داری اور فرض ہے۔ اور پھر اس لیے بھی اسے محفوظ رکھنا ضروری ہے کہ اس کی افادیت ہمارے آج کے معاشرے کے لیے خاص طور سے بہت زیادہ ہے کیوں کہ یہ سارے کا سارا ادب اعلیٰ اخلاقیات اور تہذیب کا نمونہ ہے۔ جس کی آج کے سماج کو خاص طور سے ضرورت ہے۔ معاشرے میں اخلاقی اقدار کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے میں یہی حسینی ادب اور رثائی ادب مد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام تصانیف میں اس وقت صرف ''ابواب المصائب'' زیر نظر اور زیر غور ہے۔ جو مرزا دبیرؔ کی نظم سے زیادہ نثر کا نمونہ ہے اس کو نہ صرف ڈاکٹر تقی عابدی نے مرتب کیا ہے۔ بلکہ مرزا دبیر کا زندگی نامہ کے عنوان سے ان کی حیات کا خاصا تفصیلی خاکہ بھی پیش کیا ہے اور ایک نہایت جامع مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے۔ ساتھ ہی مشکل الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے تا کہ آج کا عام طالب علم بھی فیض یاب ہو سکے۔

کتاب کے انتساب کے لیے جس ذات کا انتخاب کیا گیا ہے اس سلسلے میں بھی

ڈاکٹر تقی عابدی کو داد دینی پڑے گی، یعنی یہ انتساب ''عاشقِ دبیر امیر کبیر راجہ میوہ رام افتخار الدولہ کے نام'' ہے۔ انتساب کے اگلے دو جملے بھی ملاحظہ ہوں جن میں راجہ میوہ رام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''جو عشق محمد آلِ محمد میں ڈوب کر ابھرے تو کشتی اسلام میں نجات ملی، جنھوں نے اپنی دولت سے عالی شان امام باڑہ بنوا کر عزاداری کو رونق بخشی، جہاں رمضان کی شہادت کی شبوں میں دبیر مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ جو آخر عمر کربلائے معلی جا کر مجاور روضۂ حسینؑ ہو گئے اور زندگی مجاورت ضریح اقدس میں گزار کر خاکِ شفا میں پیوند ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے سجدہ گاہِ عالیشانِ پاک طینت بن گئے۔''

یہاں انتساب میں ڈاکٹر تقی عابدی نے جو تحقیق کے بعد معلومات فراہم کی ہے وہ بھی اہم ہے اور اسے انھوں نے جس اسلوب میں پیش کیا ہے وہ بھی دلکش ہے۔

کتاب میں مرزا دبیر کا زندگی نامہ صفحہ 13 سے 33 تک یعنی 21 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں نام، تخلص، تاریخ ولادت، مقام ولادت، والد، دادا، جد، شریکِ حیات، اولاد، بھائی بہن، تعلیم و تربیت، اساتذہ مذہب، شغل، شکل وصورت، تصویر، آواز، لباس، غذا، نظام الاوقات، آدابِ محفل، حافظہ، خط، اخلاق و کردار، رحم و مروت، سخاوت، مہمان نوازی، کمک و خیرات، قناعت، عدالت، متانت، خودداری، احترام و دلجوئی، وعدہ وفائی، شاعری کا آغاز، مشقِ سخن، پہلا قطعہ، آخری قطعہ، پہلا مرثیہ، آخری مرثیہ، اساتذہ، ضمیر و دبیر میں رنجش، ضمیر و دبیر میں صفائی، شاگردان، پڑھنے کا طریقہ، طریقہ تصنیف، اصلاح کا طریقہ اور ایجادات وغیرہ وغیرہ کے علاوہ کئی اہم دلچسپ اور معلوماتی حکایات بھی پوری تحقیق کے بعد بیان فرمائی ہیں۔ جس سے قاری کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شعراء کے تذکرے، ثابت لکھنوی کی ''حیاتِ دبیر'' اور شاد عظیم آبادی ''پیغمبرانِ سخن'' آج چوں کہ کمیاب ہو چکی ہیں اس لیے ضروری تھا کہ مرزا دبیر کی ایک جامع اور مختصر سوانح تحقیق کے بعد منظر عام پر آئے۔ یہ ذمہ داری بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے بڑے سلیقے سے پوری کی ہے اور صرف 21 صفحات پر تلخیص پیش کر دی ہے۔

یہ مرزا دبیر کا زندگی نامہ صرف زندگی نامہ ہی نہیں بلکہ مختصر سیرت نامہ بھی ہے۔ کیوں کہ اس میں پیش کی گئی حکایات سے کردار کے مختلف پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔

البتہ صفحہ 18 پر نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا کو لکھنوی لکھا ہے، جب کہ نواب حامد علی امروہوی تھے، لکھنؤ میں بیرسٹری ضرور کی ہے لیکن آبائی وطن اور ولادت وغیرہ امروہہ کی تھی۔ جیسا کہ ''حیاتِ حامد'' میں دیا ہوا ہے۔ ان بیرسٹر حامد علی خاں کا ذکر میر نفیس نے بھی کیا ہے اور جوشؔ ملیح آبادی نے بھی ''یادوں کی بارات'' میں امروہہ کا ساکن لکھا ہے۔

''ابواب المصائب'' میں ڈاکٹر تقی عابدی نے اُردو مرثیے میں مرزا دبیرؔ کی 21 ایجادات یعنی اضافوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ جن موضوعات کا مرثیے میں مرزا دبیرؔ کو موجد قرار دیا ہے ان میں سے چند موضوعات کے ابتدائی عناصر اور نقوش کی جھلک قبل دبیرؔ بھی مل جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مرزا دبیر نے ان موضوعات کو مرثیے میں باقاعدہ اور باضابطہ طور پر شامل کیا اور وسعت دی، ان 21 ایجادات کے علاوہ مرزا دبیرؔ کی ایک ایجاد اور بھی ہے یعنی وہ پہلے مرثیہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے ایک مرثیے کو عنوان بھی دیا۔ ورنہ عنوانات سے مرثیہ کہنے کا باقاعدہ سلسلہ مرزا دبیرؔ کی وفات کے بھی تقریباً 50 سال بعد شروع ہوا ہے۔ مثلاً نسیم امروہوی کا ''سازِ حریت'' یا جوشؔ ملیح آبادی کا ''حسینؑ اور انقلاب'' وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس زندگی نامے میں مرزا دبیرؔ کی صرف زندگی ہی بیان کی ہے اس میں اختتام زندگی کا ذکر نہیں ہے اور موت کے بارے میں کچھ تحریر نہیں فرمایا۔ ایک صفحے پر مرزا دبیرؔ کی اُردو اور فارسی تصانیف نظم و نثر بھی شامل ہیں۔ جہاں تک کتب پر مقدمے کا سوال ہے یہ بھی ایک خاص انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ اور پہلے ان کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن میں ''ابواب المصائب'' کا ذکر ہونا چاہیے تھا لیکن مصنفین کی غفلت یا عدم توجہی کے سبب قطعاً ذکر نہیں ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مرزا دبیرؔ کی پہلی سوانح جو فارسی میں ہے یعنی ''شمس الضحیٰ'' کتاب کا ذکر ہے ان کا ذکر بھی مقدمہ میں حوالے کے ساتھ کر دیا ہے۔ یعنی ''حیاتِ دبیرؔ'' افضل حسین ثابت، ''شاعرِ اعظم مرزا سلامت علی دبیر اور باقیاتِ دبیرؔ'' ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری ''مرزا سلامت علی دبیرؔ'' ڈاکٹر محمد زماں آزردہ اور ''پیامِ عمل'' کے مرزا دبیرؔ نمبر میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا مضمون ''اُردو ادب کی توسیع میں دبیر کا حصہ'' وغیرہ وغیرہ میں جو ''ابواب المصائب'' کا ذکر ہے اسے بھی شامل کر لیا ہے۔

''ابواب المصائب'' کا موضوع مجالس عزا ہیں جن میں سورۂ یوسف سے واقعات کربلا کو ربط دے کر بیان کیا گیا ہے۔ اس خالص رثائی موضوع پر اسی انداز سے اس سے قبل کی فارسی میں ملا واعظ حسین کاشفی کی ''روضۃ الشہداء'' اور اس کے بعد ''کربل کتھا'' اور دونوں تصانیف سے موضوع کے اعتبار سے تقابل اور موازنہ بھی کیا ہے اور تینوں تصانیف کا جائزہ لے کر نتائج اخذ کیے ہیں۔ اس میں زبان و بیان مسجع اور مقفیٰ عبارت، صنعتوں کے استعمال، جمع الجمع کا استعمال، صرف و نحو کے اصولوں کی پابندی یا عدم پابندی اور مصنفین کے جذبۂ فخر و مباہات اور عجز و انکسار کے بیان کا تقابل کیا ہے۔

دوسری طرف اسلوب کے اعتبار سے ''ابواب المصائب'' کی نثر کا ''فسانۂ عجائب'' کی نثر سے بھی موازنہ کیا ہے اور مرزا دبیر کی نثر نگاری کی خصوصیات، خوبیاں، سادگی اور صفائی کا بیان کر کے نثر نگاری میں ان کی اہمیت اور مقام کو ظاہر کیا ہے۔ ساتھ ہی قدیم اُردو نثر نگاری کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ یہ اسلوبیاتی تجزیہ ڈاکٹر تقی عابدی کی عمیق النظری کا ثبوت ہے۔ انھوں نے ''ابواب المصائب'' کو اُردو نثری ارتقا کا ایک سنگ میل ثابت کیا ہے اور گراں بہا تصنیف بتایا ہے۔ اور اسے صرف اس لیے نظر انداز کرنا کہ اس نثر پارے کا موضوع رثائی ہے یہ ادب میں بے ادبی ہے۔

مقدمے کے علاوہ ایک باب ''واقعاتی مناظرہ'' عنوان سے بھی ہے۔ اس میں بھی دیدہ وری اور دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ''ابواب المصائب''، ''روضۃ الشہداء'' اور ''کربل کتھا'' سے علیحدہ اور تخلیقی تصنیف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے رثائی ادب کی خدمت کا جو بیڑا اُٹھایا ہے جو رثائی ادب کے دبے، چھپے اور گمشدہ خزینے کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، رثائی ادب کے سلسلے میں جو باقاعدہ تحریک چلائی ہے جو غیر معروف و گمنام مرثیہ نگار شعراء کو متعارف کرانے کی پیہم کاوش ہے اور جو رثائی ادب منظر عام پر آ چکا ہے اس کا نئے اور تکنیکی زاویوں سے تنقیدی جائزہ لینے کی ٹھانی ہے وہ یقیناً نہ صرف رثائی ادب بلکہ اُردو زبان و ادب پر بھی احسان عظیم ہے اس لیے آج ڈاکٹر تقی عابدی اور رثائی ادب لازم و ملزوم ہو چکے ہیں اور یقیناً وہ عصر حاضر میں رثائی ادب کے ایک مسیحا ہیں۔

پروفیسر عبدالکریم خالد
لاہور

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تحقیقی شعور

تحقیق کے بارے میں اہل فن نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس کی مختلف صورتوں اور طریقہ ہائے کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان تمام آراء اور نقطہ ہائے نظر کو یکجا کر کے اگر ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تحقیق ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہنے والا عمل ہے جس میں فکر کی پوری جدوجہد کے ساتھ حقیقت کی جستجو کی جاتی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ معروضی اور خارجی شواہد فکر کو توانائی بخش کر اُسے جدوجہد پر اُکساتے اور اسے ایک ایسی پیچ در پیچ راہ پر ڈال دیتے ہیں جس کی بھول بھلیوں میں اکثر کھو جانے کے امکانات ہوتے ہیں لیکن جستجو کی لگن فکر کو استوار اور غیر مستقیم راہ کو ہموار رکھنے میں مدد دیتی ہے اور تلاشِ حقیقت کے سفر میں ہزار ہا شجر سایہ دار بہم پہنچاتی ہے۔ لیکن ان شجر ہائے سایہ دار کی خنک چھاؤں میں دَم بھر کو آنکھیں موند لینا بھی سفر کا زیاں ہے۔ یہاں ستانے اور کسی کنج عافیت میں اُترنے کا کوئی محل نہیں بلکہ آگے بڑھتے اور بڑھتے رہنے میں مستعد ہونا ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔

نئے حقائق کو دریافت کرنا بجائے خود کسی شے کو وجود میں لانے کا عمل ہے۔ معلوم حقائق کی انوکھی اور منفرد جہت تلاش کرنا اور دستیاب معلومات کے دائرے کو وسعت دے کر اسے دائرہ در دائرہ متشکل کرنا تحقیق کی عمل داری میں شامل ہے۔ اس عمل داری کی حدیں کسی متعین صورت میں قائم نہیں رہتیں بلکہ ہر عہد کے تقاضوں کے مطابق نئے سرے سے استوار ہوتیں اور ماضی کے کھنڈروں پر ایک نیا منظر نامہ ایجاد کرتی ہیں۔

تحقیق میں بنیادی اہمیت اس تاریخی شعور کو حاصل ہے جس کے بغیر کوئی بھی تحقیقی کام مکمل نہیں ہو سکتا۔ تحقیق چاہیے ادبی ہو یا کوئی اور، تاریخی شعور اس کے دُروں میں ایک

قوت محرکہ کے طور پر سرگرم ہوتا اور اسے ایک سِلک میں پرو کر معلوم کا نامعلوم سے ربط قائم کرتا ہے۔ بیسویں صدی کے نامور ادبی محققین کے یہاں اسی تاریخی شعور کے فیضان نے ان گنت دقیقوں کو سلجھانے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ تاریخی شعور فکر کو ژولیدگی اور گمان کی دُھند سے صاف کر کے ایک تمثال دار آئینے کی صورت بنا دیتا ہے جس کے شش جہت میں ہر منظر اُجلا اور روشن نظر آتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ماضی کے ہر تحقیق شناس کے یہاں تاریخی شعور کی کرشمہ کاری نے حقیقت کا راز کھولا ہے لیکن جن ناموں کو دھیان میں لا کر ہم تحقیق کا آغاز کرتے ہیں ان کے یہاں تاریخی شعور کی کارفرمائیاں اپنی متنوع صورتوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ذیل میں اس تمہید کا ایک باقاعدہ جواز موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اصلاً طب کے پیشے سے منسلک ہیں اور طبی تحقیق کے شعبے میں امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے شہرت اور ناموری کی ممکن سطحوں تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ اس وقت وہ کینیڈا میں ایک پیتھالوجسٹ اور فزیشین کے طور پر معروف ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اپنی مصروف ترین زندگی میں انھوں نے ایک ضابطے کے تحت قابل لحاظ اوقات اس کام کے لیے وقف کر رکھے ہیں جس کے بارے میں، میں نے تمہید میں عرض کیا ہے۔ یہ کام نہ صرف یہ کہ ان کے مستقل پیشے سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا بلکہ ذہنی اور اعصابی طور پر انتہائی تھکا دینے والا ہے۔ مزید حیرت اس بات پر ہے کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی اُردو کے ادبی اور لسانی مراکز سے ہزاروں میل دور بیٹھے جو کام تن تنہا انجام دے رہے ہیں اس کے لیے ہمارے یہاں مستقل ادارے قائم ہیں اور ان اداروں کی کارکردگی بھی ہمارے سامنے ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے لکھا ہے کہ شاعری اور ادبی تحقیق ان کا ذوق اور مطالعہ اور تصنیف ان کا شوق ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا یہ ذوق وشوق ان کی بے پناہ فکری اور نظری صلاحیت اور ادب شناسی کی اعلیٰ استعداد کے سبب محض ذوق وشوق کی حد تک نہیں رہا بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ذہنی وقلبی وابستگی اور عقیدت کی صورت اختیار کر گیا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سب کام چھوڑ کر اسی کام کو اپنی زندگی کا مقصد اور محور بنا لیا ہے۔ ہوسکتا

ہے کہ محض شاعری ان کا ذوق ٹھہرے لیکن جب ہم ان کے گراں بار تحقیقی کام پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک عجیب حیرت دامن گیر ہوتی ہے کہ ایک انتہائی معمور الاوقات شخص سے ایسی شاندار ادبی دریافتیں کیسے ممکن ہیں لیکن ادب اور زبان سے ڈاکٹر صاحب کی کمٹمنٹ اور والہانہ وابستگی دیکھ کر اس حیرت کو آسودۂ خواب کرنا ہی پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے کام کمٹمنٹ اور وابستگی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے یہاں کتنے لوگ ہیں جو اپنی کمٹمنٹ میں پکّے اور وابستگی میں اُستواری رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی جولاں گاہِ فکر میں پلنے والے ماہ و نجوم اپنی آب و تاب میں بے مثال ہیں۔ انیسؔ، دبیرؔ اور اقبالؔ تو بطور خاص ان کی دریافتوں اور فکر انگیز تجزیوں میں شامل رہے ہیں۔ ان کے علاوہ انشاؔء اور فانیؔ کو بھی انھوں نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔

گزشتہ دو برس انھوں نے ذہنوں سے محو ہوتے ہوئے مرزا دبیرؔ سے راز و نیاز کرنے میں بسر کیے ہیں۔ میر انیسؔ کے حوالے سے تو ڈاکٹر صاحب یہ اطمینان رکھتے ہیں کہ مولانا شبلی نے ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' میں انیسؔ کا جو مقام و مرتبہ متعین کیا ہے، بعد کے محققین اور ناقدین نے اس میں مزید اضافے کر کے ان کی عظمت اور شہرت کو چار چاند لگا دیئے ہیں لیکن دبیر کے معاملے میں وہ یہ دردمندانہ احساس رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ بہت سی زیادتیاں ہوئی ہیں۔ اوّل تو مولانا شبلی نے موازنہ کرتے ہوئے دبیرؔ کے جو اشعار نقل کیے ہیں ان میں کئی اشعار ایسے ہیں جن کا دبیرؔ سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور دبیر کے جو اشعار دیئے گئے ہیں ان سے ان کے مجموعی مقام و مرتبے کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ دوسرے یہ کہ بعد میں آنے والے محققین اور ناقدین نے بھی دبیرؔ کو بری طرح نظر انداز کیا ہے جس سے ان کی حیثیت اور مقام مجروح ہوا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی انصاف پسند طبیعت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اپنے عہد کے ایک بہت بڑے شاعر پر بے اعتنائی کی گرد ڈال دی جائے چناں چہ انھوں نے مرزا دبیرؔ کو نئے سرے سے دریافت کرنے اور ان کے نظر انداز کیے گئے کام کو منظر عام پر لانے کا بیڑا اُٹھایا اور اس محنت طلب کام میں ایسے منہمک ہوئے کہ دو ہی برس میں دبیرؔ کے منظومات، مراثی، سلام،

مثنویات، رباعیات، فارسی کلام اور نثر پر مشتمل اوپر تلے چھ کتابیں ترتیب دے کر ادب دُنیا میں ایک محیر العقول کام سر انجام دے دیا۔ دبیر شناسی کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

2004ء میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ''مجتہدِ نظم مرزا دبیرؔ''، ''طالعِ مہر'' اور ''سِلکِ سلامِ دبیرؔ'' شائع کیں جب کہ اگلے برس ''مثنویاتِ دبیرؔ''، ''ابواب المصائب'' اور ''مصحفِ فارسی'' منظر عام پر آ گئیں۔

''مثنویاتِ دبیرؔ'' مرزا دبیرؔ کے سلسلے کی چوتھی کتاب ہے جس میں مرزا دبیر کی کل آٹھ مثنویاں شامل کی گئی ہیں۔ اس سے پہلے محققین کو دبیرؔ کی صورت میں مثنویوں کا حال معلوم نہ تھا بلکہ بیشتر کتابوں میں صرف دو مثنویوں ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب کے آغاز میں بعض ایسے معروف محققین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اُردو مثنوی پر اپنی تحقیقی کتابوں میں بعض گمنام شاعروں کی مثنویاں نکال لیں لیکن دبیرؔ کی مثنویاں ان کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کمال عرق ریزی سے دبیر کی پانچ مزید مثنویاں دریافت کی ہیں۔ ان میں سے دریافت شدہ تین مثنویوں سمیت سات مثنویوں کا مکمل متن مدوّن صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک مثنوی بے عنوان غیر مطبوعہ ہے اور مرزا دبیر کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ کتاب میں اس مخطوطے کے 31 صفحات کا عکس شامل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس مثنوی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس غیر مطبوعہ مثنوی کو عوام سے روشناس کرانے کا سہرا ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کے سر ہے۔ راقم کو اس مثنوی کا پورا مخطوطہ مرزا آغا گوہر دبیری فرزند مرزا صادق مرحوم سے حاصل ہوا، جو 31 صفحات پر مشتمل ہے اور پورا مخطوطہ اس کتاب میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ مثنوی بے عنوان جو دبیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، محفوظ ہو جائے اور صاحبانِ تحقیق و تنقید اس پر آنے والے وقتوں میں اظہارِ خیال کر سکیں۔ اس مثنوی کو اب تک صرف چند انگشت شمار افراد نے سرسری طور پر دیکھا ہے اور اس کی تحریر سے بعض

اشعار شاید طویل مدت تک غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے پوری طرح سے پڑھے نہ جاسکیں۔ اس لیے پہلی بار اس غیر مطبوعہ مثنوی بے عنوان کو من و عن اس کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔" (ص: 287-286)

یہاں میں خاص طور پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ایک خاص وصف، یعنی تحقیق میں ان کی دیانت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر مالک رام نے سید مسعود حسن رضوی ادیب کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ اپنی تحریروں میں پابندی کے ساتھ دیانت برتنے کے قائل تھے۔ مصنفین اور محققین کا حوالہ دینا اور کسی موضوع پر ان سے قبل جو لوگ کام کر چکے ہیں، ان کا اعتراف کرنا بڑے ظرف کی بات ہے۔"

یہی بات پورے وثوق کے ساتھ ڈاکٹر تقی عابدی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ "مثنویاتِ دبیر" میں نو دریافت مثنویوں کا احوال بیان کرتے ہوئے وہ ان اوّلین دریافت کنندگان کے نام درج کرنا نہیں بھولے جنھوں نے اوّل اوّل ان مثنویوں کو دیکھا اور ان کا ذکر کیا ہے۔ دبیر کی مثنوی بے عنوان کا قلمی نسخہ ان کی ذاتی ملکیت میں ہے اور وہ آسانی کے ساتھ اس کی دریافت کا سہرا اپنے سر باندھ سکتے تھے اور ان کے اس اقدام کی باقاعدہ توجیہہ بھی موجود تھی۔ لیکن یہ بات ان کے دیانت دارانہ تحقیقی مزاج کے خلاف تھی چناں چہ انھوں نے تعارف کی پہلی سطر میں ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کا ذکر کر دیا۔ ان کی یہ اعلیٰ ظرفی تحقیق میں ان کے اعتبار کو قائم کرتی ہے۔

مرزا دبیر کی نثری تصنیف "ابواب المصائب" بھی ایک نادر و نایاب کتاب ہے۔ سوائے چند ایک کے اُردو نثر کی معروف تواریخ میں اس کتاب کا ذکر تک موجود نہیں۔ کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

> "ابواب المصائب" کو تصنیف ہو کر تقریباً 180 سال کا عرصہ ہو چکا ہے اور اس کو مطبع یوسفی سے شائع ہو کر بھی کم از کم سو سال ہو چکے ہیں اور اس ایک سو اسّی سال کی مدت میں درجنوں عمدہ تحقیقی نثری کتابیں اُردو نثر کے ارتقا پر لکھی گئیں لیکن اکثر کتابوں میں اس کا تذکرہ تجزیہ تو دور کی بات ٹھہری اس کا نام تک نظر نہیں آتا۔ اُردو نثر کی تاریخ اور اس کے ارتقا کی

چشم دید گواہ صرف چند تصانیف اور تالیف ہیں جن کو اُنگلیوں پر گنا جا سکتا ہے چناں چہ ایسے نثری قحط الکتاب کے دور میں اس عمدہ نثری تصنیف سے چشم پوشی شریعتِ ادب میں گناہ نہیں تو اور کیا ہو سکتی ہے جب کہ اغلب دیگر تصانیف اور تذکروں میں کئی ضعیف اور مجہول کتابوں کے ذکر سے درجنوں اوراق سیاہ کیے گئے ہیں۔'' (ص:35)

ڈاکٹر تقی عابدی نے ''ابواب المصائب'' کو مدوّن کر کے فرہنگ کے حواشی کے ساتھ پیش کیا ہے اور اسے انیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں لکھی جانے والی اُردو نثر کا شاہکار قرار دیا ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ اپنی جامعیت اور ہمہ گیری کے ساتھ ساتھ تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ''ابواب المصائب'' کے موضوع اور اسلوب پر نہایت شُستہ اور مبسوط پیرائے میں جو عالمانہ بحث کی ہے وہ تحقیق اور تنقید دونوں میں اعلیٰ معیار قائم کرتی ہے مثلاً کتاب کے تعارف کے ذیل میں یہ سطور دیکھیے:

''مرزا دبیر نے اس کتاب کے دیباچہ میں اس کتاب کی تالیف کا باعث اور سبب تائیدِ غیبی اور الہام لاریبی قرار دے کر اس ارادے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس میں انھوں نے سورۂ یوسفؑ کے ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ مصائب سید الشہداءؑ کو آیات اور احادیث کی روشنی میں ایسا ربط خصوصی دیا ہے جس سے اُردو سے واقف عزادارانِ امامِ مظلوم مستفید ہوں اور اس وظیفہ کو انھوں نے ''بہ طریق تازہ اور بہ حسنِ بے اندازہ'' انجام دیا ہے۔ مرزا دبیر نے سورۂ یوسفؑ کے واقعات سے واقعاتِ کربلا کو اس طرح جوڑا ہے کہ اس سے عمدہ پیوندکاری امکان پذیر نہیں۔'' (ص:41)

یہاں مرزا دبیرؔ کے نثری اسلوب کی ایک جھلک بھی ملاحظہ کیجیے:

''محبو! اگرچہ یوسفؑ کو مثلِ اسیران و غلامانِ شہرِ مصر میں لائے لیکن کسی مردم مصر نے طمانچہ رُوئے یوسفؑ پر نہ لگایا۔ سنانِ نیزہ سے پُشت کسی نے مجروح نہ کی تھی۔ علاوہ اس کے مالک زعر نے خلعتِ فاخرہ پہنا دیا۔

کرسی زرنگار پر بٹھلایا۔ باوجود اس حشمت کے فراقِ یعقوبؑ میں مثل ابرِ نوبہار زار زار روتے تھے۔ اگر کوئی انصاف کرے تو سمجھے کہ حرمِ محترم رسولؐ خدا پر بازارِ شام میں کیا کیا گزرا ہے۔ لکھا ہے جس وقت وہ بے کسانِ کربلا داخلِ شہرِ شام ہوئے تو ساکنانِ شام فوج، فوج نظارۂ اہل بیتؑ کو آتے تھے اور گروہ گروہ مشغولِ تماشا ہوتے تھے۔ سہیل سعدی کہتا ہے کہ اس روز واردِ شام تھا۔ دیکھا میں نے، بازار آئین بند ہے۔ آوازِ دَف و نوبت کوچہ بہ کوچہ پیدا ہے۔ مردم لباس ہائے رنگین پہنے ہوئے ہیں۔ پوچھا میں نے، مگر آج کوئی عید ہے کہ ہم اس عید سے واقف نہیں ہیں۔ لوگوں نے کہا مجھ سے کہ اے مردِ ضعیف آیا تو نہیں جانتا ہے۔

یاں آمدِ ناموسِ حسینؑ ابن علیؑ ہے
یہ حضرتِ شبیرؑ کے مرنے کی خوشی ہے

(ص:45-46)

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تیسری کتاب "مصحفِ فارسی" مرزا دبیرؔ کے فارسی کلام پر مشتمل ہے جس میں مرزا دبیر کی 39 رباعیات، 7 قطعات، 2 سلام، 3 مخمسات، 3 مسدسات کے علاوہ دبیرؔ کے خط میں 2 غیر مطبوعہ نثری رسائل اور 4 مکتوبات شامل ہیں۔ کتاب کے آغاز میں "مرزا دبیرؔ کا زندگی نامہ" کے عنوان سے دبیرؔ کے سوانحی حالات ایک خاص ترتیب سے رقم کیے گئے ہیں جن سے دبیرؔ کی پوری زندگی آئینہ ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی فارسی دانی نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں خوب جوہر دکھائے ہیں۔ تاہم اس کتاب میں انھوں نے تجزیے و تحلیل کا کام اہلِ علم پر چھوڑ دیا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی یہ تینوں کتابیں اُردو ادب کے لیے تحفۂ خاص کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ادب شناسوں کو ان کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے کہ انھوں نے دبیرؔ کی صورت میں ایک پورے عہد کی تہذیبی صورتِ حال کو نہ صرف نئے سرے سے زندہ کر دیا بلکہ اس حوالے سے اُردو زبان کو بھی ایک اثر انگیز تہذیبی قوت عطا کی ہے۔ اللہ انھیں سلامت رکھے اور وہ یونہی اُردو زبان و ادب کی خدمت میں سرگرم رہیں۔

شاہد اقبال کامران
روزنامہ ''پوسٹ انٹرنیشنل''
15/دسمبر 2021ء

اسلام آباد میں دسمبر کی بہار

وہ کہتے ہیں کہ میں طب کا ڈاکٹر، ادب کا مریض اور اُردو کا وکیل ہوں۔ اس میں یہ بھی شامل کر لیتے ہیں کہ وہ اقبالؔ کے عاشق اور فیض احمد فیضؔ کے مداح و محقق ہیں۔ ان کے تصنیفی اور تحقیقی کارناموں کی فہرست اس قدر طویل اور حد درجہ متنوع ہے، کہ حیرت ہوتی ہے کہ کوئی میڈیکل ڈاکٹر، اور وہ بھی ہارٹ اسپیشلسٹ، کینیڈا میں بیٹھ کر، اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے ساتھ ساتھ زبان وادب سے اپنے عشق کو کیسے نبھاتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ مسلسل کام بھی کرتے ہیں، اور عشق بھی کیے جا رہے ہیں۔ ان کا کام عشق کے آڑے نہیں آتا، نہ ہی کام سے عشق الجھتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کسی تحقیقی منصوبے کو ادھورا نہیں چھوڑتے۔

اقبالؔ سے حد درجہ محبت رکھتے ہیں، اور یہ محبت اقبالؔ کی اُردو شاعری سے شروع ہو کر اقبالؔ کی فارسی شاعری سے عقیدت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اقبالؔ کے کام اور پیغام کو دیکھنے اور سمجھنے کا انداز غیر روایتی اور منفرد ہے۔ اقبالیات پر ان کی تصانیف میں ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے''، ''تجزیہ شکوہ و جواب شکوہ'' اور ''چوں مرگ آید'' شامل ہیں۔ موخر الذکر تحقیق اپنی نوعیت کے اعتبار سے حد درجہ مختلف اور منفرد ہے۔ اس میں اقبالؔ کے عوارض اور ان کے علاج کو زمانہ حال کے طبی علم کے تناظر میں موضوع بنایا ہے اور باور کرایا ہے کہ اگر اقبالؔ کے عوارض کا صحیح اور درست علاج ہو جاتا تو وہ اپنی طبی عمر سے کم از کم تیس سال پہلے وفات نہ پاتے۔ ایسی منفرد تحقیق ایک میڈیکل ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے۔ اقبالؔ اور فلسطین کے موضوع پر ایک بڑے تحقیقی منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔

اقبالؔ سے ان کی توجہ فیض احمد فیضؔ کی طرف جاتی ہے۔ مطالعات فیض احمد فیضؔ کی

مبادیات کو یکجا کر کے انھوں نے فیضؔ شناسی کو کیسا سہل کر دیا ہے۔ 2011ء میں جب ہماری یونیورسٹی میں فیضؔ چیئر قائم کی گئی تو شروع دن سے ڈاکٹر تقی عابدی کی مشاورت اور معاونت ہمیں حاصل رہی۔ ''باقیات فیض احمد فیضؔ'' کا منصوبہ فیضؔ چیئر کے ساتھ مل کر بنا، ڈاکٹر صاحب اس منصوبے پر کام کر رہے تھے، اور کام پھیلتا جا رہا تھا۔ فیضؔ چیئر کی طرف سے اس منصوبے کی اشاعت کی ذمہ داری اپنے ذمے لی گئی تھی۔ کام مکمل ہو گیا لیکن فیضؔ چیئر کو آٹھ سال تک کسی قسم کے فنڈ مہیا نہیں گئے، پھر ایسا وائس چانسلر آ گیا جو کثرت سے فیضؔ اور دیگر روشن خیال شعرا کے اشعار کثرت سے پڑھتا تھا، مگر فیضؔ چیئر کو کفریات کے خانے میں رکھ کر ختم کرنے کے درپے رہا، ہم نے فروری 2017ء میں ایک دو روزہ بین الاقوامی فیضؔ کانفرنس کا منصوبہ بنایا، ہر طرح کی منظوری حاصل کی، شرکاء کو دعوت کے خطوط ارسال کر دیئے، یہ کرونا وبا سے پہلے کا قصہ ہے۔ متعلقہ لٹریچر بھی چھپوا لیا۔ کانفرنس سے چند روز پہلے وائس چانسلر کہنے لگا کہ اسے ملتوی کر دیں، میں نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ہم ملتوی نہیں کریں گے۔ سب تیاریاں مکمل ہیں۔ پینا فلیکس تک لگ چکے ہیں۔ بہت زور سے بند چھوٹا سا منہ کھول کر کہنے لگا، پھر اسے دو کی بجائے ایک دن میں مکمل کر لیں۔ میرا دوست جب بھی اسے دیکھتا تو مجھے پوچھتا: ''ایہنوں وی سی کنے بنایا اے''یعنی اسے وی سی کس نے بنایا ہے؟ خیر ہم نے سیشن بڑھا دیئے اور کانفرنس اس طرح مکمل کی کہ وائس چانسلر اس کے افتتاحی اجلاس میں ''ایچ ای سی'' جانے کا بہانہ کر کے غائب رہا۔ ایسی منافقت ہماری اجتماعی زندگی میں عام بلکہ رائج ہے۔ فیضؔ چیئر کی طرف سے خاموشی دیکھ کر ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے ''باقیات و نادرات فیض احمد فیضؔ'' کا نہایت پر شکوہ ایڈیشن بک کارنر جہلم سے شائع کرایا۔ ''باقیات و نادرات فیضؔ'' کا یہ مجموعہ خاصے کی چیز ہے۔ اسے دیکھ کر ڈاکٹر تقی عابدی کی محنت، شوق اور نگاہ کی رسائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انیس و دبیر کے موازنے کی درسی روایت کو ایک طرف رکھتے ہوئے ان دونوں بڑے شاعروں پر نہایت وقیع کام ڈاکٹر تقی عابدی کے مفاخر کا حصہ ہے۔ غالبؔ کے اُردو فارسی کلام کی تدوین اور اب فراقؔ گورکھپوری پر تازہ کتاب۔ یہ سب کچھ پڑھنے کے لیے اک عمر چاہیے۔ لیکن ڈاکٹر تقی عابدی اپنا کام جوان کے ذوق و شوق پر مدار کرتا ہے، جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی مساعی دیکھ

کر یقین آجاتا ہے کہ بیشہ تحقیق شیر مردوں سے خالی نہیں ہوا۔

ڈاکٹر تقی عابدی سراپا دوست شخصیت کے مالک ہیں۔ ''امجد فہمی'' چھپی تو خاص طور پر پاکستان آئے اور آئیڈیا یہ بنا کہ ''امجد فہمی'' کی تقریب رونمائی کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں تو ضرور ہو۔ اسلام آباد والی تقریب ہماری یونیورسٹی میں طے پائی۔ بہر حال متعدد رکاوٹوں کے باوجود ہم نے اس تقریب کا اہتمام کیا۔ امجد اسلام امجد نے ڈاکٹر تقی عابدی کو چند ناموں کی ایک فہرست دی کہ میری طرف سے یہ لوگ اس تقریب میں شرکت کریں گے۔ یہ فہرست مجھ تک پہنچی، اس میں وہ سب شامل تھے، جن کی ولادت کا واحد معلوم مقصد اسلام آباد کی ادبی تقریبات میں شرکت اور صدارت کرنا رہا۔ اس متن کے ساتھ چند حواشی بھی تھے۔ ہم نے بصد احترام سبھوں کو مدعو کرلیا۔ بروقت مخبری ہوئی کہ ''امجد فہمی'' کی تقریب کو ہر طرح سے ناکام کرنے کی تیاریاں ہیں۔ یونیورسٹی کے ملازمین کو منع کیا گیا کہ تقریب میں شامل نہیں ہونا، یہ کمی اسلام آباد میں ہمارے دوستوں اور شاگردوں نے پوری کردی۔ ڈاکٹر تقی عابدی اور امجد اسلام امجد تقریب سے ایک روز پہلے شام کو یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ رات محفل جمی، میں نے چپکے سے ڈاکٹر تقی عابدی کو بتادیا کہ وہ تمام لوگ جنھیں امجد اسلام امجد مدعو کروا چکے ہیں، شامل نہیں ہورہے۔ دوسری طرف امجد اسلام امجد بڑے پرجوش تھے۔ ''ہاں بھئی کل وہ بھی آئیں گے، یہ بھی آئیں گے، بھئی کیا گفتگو کرتے ہیں، دُنیا کے ہر موضوع پر، کمال ہے۔ پھر پوچھنے لگے کہ ان سے بات ہوئی؟ کہا کہ دعوت نامہ بھجوا کر فون پر بات بھی کرلی تھی۔ پر گمان ہے کہ شائد نہ آئیں۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے۔'' پھر امجد اسلام امجد نے فون کرنے شروع کیے، ایک نمبر، دو نمبر، تین نمبر۔ کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ غصے میں آکر ان سبھوں کی اوقات کو مختلف لطائف کے واقعات سے سجا کر اپنے مخصوص انداز میں تادیر بیان کرتے رہے۔ یہ رہا پاکستان اور خاص طور پر اسلام آباد کے ادیبوں کا قصہ، یعنی ایک آدمی کینیڈا میں بیٹھ کر آپ کے ایک شاعر کو عزت دے رہا ہے اور آپ پاکستان میں رہتے ہوئے اپنے حسد یا بغض کی پرورش پر متوجہ ہیں؟ حیرت ہے ڈاکٹر تقی عابدی نے اس رات حیدر آباد دکن کے کئی لطائف سنا کر فضا کو مدہم اور متوازن کرنے کی باکمال کوشش کی۔ یہ ان کا بڑا پن تھا۔

خیر ''امجد فہمی'' کی تقریب ہوئی اور کیا شاندار تقریب رہی۔ سچ ہے دُنیا میں کوئی کام اور کارنامہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

ٹورنٹو میں مقیم یہ بہار آج کل پاکستان میں اتری ہوئی ہے۔ کراچی، بہاولپور، ملتان میں زبان و ادب کے قلعے فتح کرتے ہوئے اسلام آباد تشریف لائے، کل الحمد یونیورسٹی میں سیمینار کی صدارت کی، آج فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی راولپنڈی میں سیمینار میں شرکت اور خطاب فرما کر از راہ محبت، زحمت کر کے مجھ سے ملنے کا وقت نکالا۔ یہ وضع داری، یہ توجہ اور محبت آج کل نایاب اور ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کے ہاں فراواں ہے۔ فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی کے سیمینار کے بعد انھیں جہلم میں منتظر تقریب کی صدارت کے لیے جانا تھا، لیکن وہ تشریف لائے، اور پھر گویا دبستاں کھل گیا۔ کیا کیا باتیں ہوئی، سچ ہے کہ کہتے کسی کو سنیے گا، تو دیر تلک سر دھنیے گا۔ ہر سال ایک نیا علمی اور ادبی کارنامہ سامنے لاتے ہیں۔

دُنیائے ادب، یعنی وہ دُنیا جو ارضی سرحدوں سے ماوراء ہے، کے کئی دلچسپ قصے سنائے۔ مستقبل کے کچھ منصوبے، کچھ تجویزیں اور کچھ آرزوئیں بیان ہوئیں۔ ہم سننے والے بھی اور محض باتیں کرنے والے لوگ ہیں، گویا ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید تقی عابدی کام کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہر وقت ایک سے زیادہ تحقیقی منصوبے جاری رکھتے ہیں۔ جتنا سوچتے ہیں، اس سے دگنا کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی جب بھی تشریف لاتے ہیں، اپنے اطراف و جوانب زندگی کی حرارت، ولولہ، جوش اور حرکت کی برکت پھیلا دیتے ہیں۔ ہاں البتہ میری صحت کے بارے میں فکر مند ہوئے۔ میں نے بھی وہ تمام وعدے کر لیے، جن پر عمل کا امکان بوجہ تساہل کم ہے۔ جس خلوص سے انھوں نے وقت دیا، توجہ کی اور مسرور ہوئے، اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

ڈاکٹر شفیع ایوب
جے این یو، نئی دہلی
9/ جون 2022ء

قلمی چہرہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی

علم کا دریا ہیں، سمندر ہیں، ندی ہیں، جی ہاں، سید تقی عابدی ہیں۔ پیشے سے طبیب ہیں، بے مثال خطیب ہیں۔ اُردو کے چمن میں بادِ نسیم ہیں، دکن و دلّی سے رشتہ ہے، کینیڈا میں مقیم ہیں۔ بزمِ مرثیہ میں نالۂ دلگیر ہیں، اُردو کے عالمی سفیر ہیں۔ ریاضت کے دھنی، معیارِ ضبط ہیں تقی عابدی۔ سکہ رائج الوقت ہیں تقی عابدی۔ اک کھلی کتاب ہیں تقی عابدی، تاریخ کا سنہری باب ہیں تقی عابدی۔ گویا ہوں تو رہ جائے تشنہ کوئی پہلو کب ان سے، یارانِ نکتہ داں سیکھتے ہیں، گفتگو کا ڈھب ان سے۔ ماہر اقبالؔ ہیں، غالبؔ شناس بھی ہیں۔ خوب صورت بھی ہیں، خوش لباس بھی ہیں۔ کبھی سوٹ تو کبھی شیروانی۔ دیارِ غیر میں اسلاف کی نشانی۔ تقریر جیسے دریا کی روانی، ہوئے گویا تو موضوع پانی پانی۔ اگر چہ سفر ان کے لیے خسارہ ہے۔ مگر سرزمین ہندو پاک نے اکثر انھیں پکارا ہے۔ ہم نے جب پکارا، یہ اکثر چلے آئے، لیے ہوئے اک علم کا دفتر چلے آئے۔ یہاں خلیل الرحمٰن جیسے یار گلفام رہتے ہیں۔ دل کے اک خاص گوشے میں خواجہ اکرام رہتے ہیں۔ یہ محبت کے مریضوں کا علاج خاص کرتے ہیں۔ یہ سارا کام بصد اخلاص کرتے ہیں۔ نظر رکھتے ہیں تحقیق کے سر اور تال پر۔ کتابیں لکھ چکے ہیں خسروؔ اور غالبؔ و اقبالؔ پر۔ نظر کرم ہوئی جس پر، اک مکمل باب لکھ ڈالا۔ حالیؔ و فراقؔ و فیضؔ پر کتاب لکھ ڈالا۔ گہری نظر رکھتے ہیں انشاؔ، رشیدؔ و دلگیرؔ پر۔ کتابیں لکھ دی ہیں انیسؔ و دبیرؔ پر۔

تقی کی شخصیت بڑی پہلو دار ہے۔ بقول ناصر عزیز یہ علم و فن کا سردار ہے۔ صبا نے کان میں چپکے سے کہا۔ یہ آدمی اطہر فاروقی کی محبت میں گرفتار ہے۔ نہ سیاست کی، نہ ظلم و جبر کی باتیں۔ گزشتہ سفر میں ہم نے سنی تھی بال مکند بے صبر کی باتیں۔ بے صبر کی باتوں سے

ابھی قرار آیا تھا۔ کہ ہم نے نیرنگ سرحدی کا سراغ پایا تھا۔ پوچھا جناب نریش نے ہم کہاں تک پہنچے۔ کہا میں نے کہ ''تعمیرِ یاس'' سے ''تعمیرِ بقا'' تک پہنچے۔ یاس سے بقا تک تعمیر اک نگر ہے۔ یہ ''تعمیر یاس'' سے ''تعمیر بقا'' کا سفر ہے۔

کبھی موجوں سے الجھے، کبھی دریا کنارے چلے گئے۔ ادائے خاص سے زلف گیتی سنوارے چلے گئے۔ معصومہ اور رویا آپ کی تصنیف خاص ہیں۔ رضا و مرتضیٰ بھی دل کے پاس ہیں۔ کئی ملکوں میں رہے، فکر عالم گیر رکھتے ہیں۔ دماغوں میں جہاں، دل میں یاد شبیر رکھتے ہیں۔ امریکہ و کینیڈا، لندن و ایران کی باتیں۔ مگر دل کو گرماتی ہیں وہ ہندستان کی باتیں۔ یاد سید سبط نبی، یعنی اجداد کی یادیں۔ کبھی دلّی کبھی حیدرآباد کی یادیں۔ یہ یادیں اب بھی دل کو لبھاتی ہیں۔ کینیڈا سے انھیں کھینچ لاتی ہیں۔

سید تقی عابدی بے مثال خطیب ہیں۔ خوش فکر شاعر ہیں، ادیب ہیں۔ عالمی امن و آشتی کے نقیب ہیں۔ محسن ملک وقوم ہیں، حبیب ہیں۔ بقول خود ادب کے مریض اور صحت کے طبیب ہیں۔ ناقد ادب ہیں، محقق ہیں، مولف ہیں۔ پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ہندی نژاد ہیں، رفیق ایران ہیں۔ فاتح دلّی و فاتح تہران ہیں۔ ضخیم ''کلیاتِ غالب فارسی'' کا اجرا تہران میں کیا۔ اہل فارس کو حیران ایران میں کیا۔ حافظ و سعدی پہ لکھا اور قلم توڑ کے رکھ دیا۔ فلسفۂ رومی و جامی کا عرق نچوڑ کے رکھ دیا۔ اہل فارس ہیں فریفتہ اس ہندی نژاد پر۔ سیکڑوں شیریں مرمٹیں اس فرہاد پر۔ مگر یہ مریض دانائی عشق کے دریا کے کنارے کنارے چلا گیا۔ اپنی دھن میں بس زلف گیتی سنوارے چلا گیا۔ ریاضت کررہے ہیں درِ عدنان پر بیٹھے۔ بن کر چغۂ علم و دانش، مسند عرفان پر بیٹھے۔ حسین و جمیل تقی صاحب، خوش پوش، شکیل تقی صاحب، کتابوں کے رسیا، رات دن تپیا، تحقیق و تنقید کے ستون، حصول علم کا جنون، کیا ہے کتنے ارمانوں کا خون، تب بنے ہیں ماہر علم وفنون۔

بظاہر بہت سنجیدہ، اندر سے ظرافت کا پلندہ، لطائف کا ذخیرۂ خاص رکھتے ہیں۔ تبسم کا خزانہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ شوخی وظرافت کا بہت اعلیٰ معیار رکھتے ہیں۔ دماغ تازہ اور دل بیمار رکھتے ہیں۔ دل میں نہ جانے کس کس کا پیار رکھتے ہیں۔ محبت میں کچھ نقد، کچھ ادھار رکھتے ہیں۔ ادائے بے نیازی ہے، مگر خوب خبر رکھتے ہیں۔ اچھے اور برے سب پہ نظر

رکھتے ہیں۔ قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی لکھ لیں، مگر غزلوں کو دل کے پاس رکھتے ہیں۔ نہ جانے کیوں کچھ غزلوں کو اداس رکھتے ہیں۔ غزل سے بات کرتے ہیں، غزل کو پاس رکھتے ہیں۔ مگر کچھ ''کام'' بھی کرنا ہے، یہ احساس رکھتے ہیں۔

سید تقی عابدی کے فکر وفن پہ لکھا جا رہا ہے۔ ان کی طرز ادا، ان کے سخن پہ لکھا جا رہا ہے۔ کچھ احباب نے لکھا، کچھ خواتین نے لکھ دی۔ اک ضخیم کتاب رکن الدین نے لکھ دی۔ لکھنے اور لکھانے کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ دنیائے سخن پہ سید تقی عابدی کا رعب طاری ہے۔

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی
سابقہ صدر شعبۂ اُردو
یونی ورسٹی آف حیدر آباد

ایک فرد یا ادارہ...... ڈاکٹر تقی عابدی

میں ممبئی کے رضوی کالج کے کانفرنس ہال میں بیٹھا ہوا ڈاکٹر عباس عالم رضوی کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا کہ اچانک میرے بجائے ناندیڑ کے ڈاکٹر شجاعت علی اور ان کے ساتھ کے آٹھ دس اشخاص کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور ان سے یہ کہہ رہے تھے۔

آپ لوگ اگر کھانے کے لیے ان کے ساتھ جا رہے ہیں تو یہ بتا دیں تا کہ مجھے اتنے آدمیوں کے کھانے کا انتظام نہ کرنا پڑے۔

ڈاکٹر شجاعت نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے، مجھ سے ڈاکٹر عباس عالم نے کہا کہ ''آپ لوگ تو شاید نہیں جائیں گے؟''

میں نے کہا: ''اے بھیا! جانا کہاں ہے؟''

انھوں نے کہا: ''ڈاکٹر تقی عابدی نے شرکاء سیمینار کو رات کے کھانے کی دعوت دی ہے۔آپ نے اور ڈاکٹر علی حیدر نے شاید معذرت کر لی ہے؟''

میں نے کہا: ''ہاں یہ درست ہے۔'' عباس عالم بھی چلے گئے۔

دو گھنٹے بعد جب سب لوگ لوٹے تو میں نے شجاعت سے پوچھا: ''کیوں بھائی؟ کیسا رہا ڈنر؟'' شجاعت نے بہت ایمانداری سے بتایا: ''زیادہ قسم کے کھانے نہیں تھے۔ دو سالن مرغ کے، ایک تندوری، سیخ کباب، شامی کباب، گلاوٹ کے کباب، رائیتہ، روٹیاں شاہی ٹکڑے اور قلفی!

میں نے علی حیدر کی طرف دیکھا۔ ان سے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور پھر ہم لوگ کانفرنس کی طرف سے جو مرغ اور بریانی تھا اُسے کھا کے سو گئے۔

لیکن میں یہ سوچتا رہا کہ میں نے اور علی حیدر نے غلطی کی کہ اتنا اچھا کھانا نہیں

کھایا۔ یہ تو ایک طرح سے کفرانِ نعمت ہوگیا اور ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ کھانے کی دعوت دینے والے ڈاکٹر تقی عابدی ہیں کون؟

صبح میں نے عباس عالم سے پوچھا۔ ان کے جواب دینے کے انداز میں تھوڑی سی حیرت تھی گویا کہہ رہے ہوں، ارے آپ! ڈاکٹر تقی عابدی کو نہیں جانتے؟

مگر انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر تقی عابدی چلے گئے اور ہم لوگوں کے لیے کتابوں کا تحفہ دے گئے ہیں۔ جب کتابیں دیکھیں تو دہلی کی یاد آئی جہاں میں نے ڈاکٹر تقی عابدی کو دیکھا تھا۔ وہاں کانفرنس کے مہتمم میرے الہ آباد کے ایک عزیز تھے اور پھر وہ دہلی تھی وہاں رشتہ داروں کی گویا ایک کالونی سی آباد تھی۔ وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ لیتے چلے گئے۔ وہیں یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر تقی عابدی کینیڈا میں رہتے ہیں۔ اور اُردو کو مقدس دیوانگی کی حد تک چاہتے ہیں۔

ایک بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ ڈاکٹر تقی عابدی خسیس نہیں تھے۔ اس لیے لوگوں کو کھانے کے لیے مدعو کیا۔ ہم نہیں گئے تو کیا ہوا؟

پھر دوسری کانفرنس میں ملاقات ہوئی۔ اس بار میں نے ان کو سنا جب وہ اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے تو یہ یقین ہوگیا کہ یہ مقالہ خود اس شخص کا لکھا ہوا ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ تبسم عابدی نے مختصر سی توصیفی تقریر بھی کی۔ میں نے یہ دیکھا کہ ڈاکٹر تقی عابدی بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ اپنی تعریف سن کر کچھ گھبرا سے رہے ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ تبسم کی تعریف کے بعد میں نے غور سے اس شخص کو دیکھا جس کے جسم پر شیروانی بالکل میر انیسؔ کے مصرعے کی طرح سے موزوں دکھائی دے رہی تھی۔ اور مجھے اس پر حیرت تھی کہ اتنی شاندار شیروانی کینیڈا میں کہاں سے آگئی۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ تقی عابدی ہندوستانی کانفرنسوں اور سیمناروں کے لیے آتے رہتے ہیں۔ حیدرآباد اور دہلی سے متعلق ہیں۔

ان کی آواز ان کے قد زیبا سے ہم آہنگ تھی۔

میں نے آواز کا ذکر خاص طور سے اس لیے کیا کہ نہ تو اس میں حیدرآبادیت تھی اور نہ دہلی کی ملاحت اور نہ ہی کینیڈین لہجہ تھا۔ وہی روز مرہ کا لہجہ تھا جو ہم لوگ الہ آباد، لکھنؤ، اعظم گڑھ و اطراف میں بولتے ہیں۔

ان کے یہاں ان کا اپنا طرزِ استدلال تھا۔ وہ دبیریت پر تقریر کر رہے تھے۔ بڑے اعتماد کے ساتھ، ایک ایک لفظ ناپ تول کر ادا کر رہے تھے۔ پوری ذمہ داری کے ساتھ، مرزا دبیرؔ کو صرف مثبت انداز میں پیش کر رہے تھے۔ اور اس کا بھی لحاظ رکھا تھا کہ مرزا دبیرؔ کو میر انیسؔ پر فوقیت نہ حاصل ہونے پائے۔

اسی طرح کانفرنسوں میں، میں انھیں سنتا رہا۔ رسمی ملاقات رہی، دراصل ان کو اس طرح لوگ گھیرے رہتے تھے۔ جیسے ان کی جیب میں کینیڈا کا ٹکٹ ہے یا پھر نوٹوں کی گڈیاں۔

لیکن جو بات قابل غور تھی اور جس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا وہ یہ کہ نہ تو ان کے لہجے میں جھلاہٹ آتی تھی نہ چہرے سے انقباض ظاہر ہوتا تھا۔ وہ سب لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اس انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ کچھ باتیں خاص طور سے نوٹ کی تھیں مثلاً یہ کہ غیر ضروری باتیں نہیں کرتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ ایک بار بھی انھوں نے اپنے بارے میں جو اچھا نہیں لگایا۔ اصل میں جب آدمی زیادہ پڑھ لکھ جاتا ہے اور اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے درمیان وہ ہے۔ وہ اس سے بہت کم پڑھے لکھے ہیں۔ اس لیے کچھ بھی کہہ دینے میں مضائقہ نہیں ہے۔

وہ ہانکیالوجی کے ''پروصفر'' ہو جاتے ہیں۔ یعنی عرف عام میں ڈینگ مارتے ہیں۔ اور خودستائی کے مریض ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح سے لوگوں کو مرعوب کریں اور اپنی علمیت کا سکہ جمائیں۔

ڈاکٹر عابدی کے یہاں یہ پہلو بہت نمایاں تھا کہ وہ اس صفت سے بالکل مبرا تھے۔ وہ یہ تو ضرور بتاتے تھے وہ کتنے موضوعات پر کام کر رہے ہیں اور یہ کہ ان کی ذاتی لائبریری میں کس کس کتاب کا قدیم ترین متن ہے۔ لیکن کہیں بھی ان کی گفتگو میں انانیت نہیں جھلکتی تھی۔

الہ آباد کے ایک جلسے میں استاد محترم ڈاکٹر سید محمد عقیل نے ان پر جارحانہ انداز میں مگر درست اعتراضات کیے۔ بعض جگہ استاد بھی بتقاضائے بشریت کا شکار ہوئے لیکن ڈاکٹر عابدی نے نہایت متانت، سنجیدگی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان تمام اعتراضات کو یہ کہہ کے گویا قبول کیا کہ میرا مطالعہ محدود ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس میں مزید وسعت ہو۔

اس طرح کے واقعات سے ان کا پورا کردار سامنے آجاتا ہے۔ ادبی اعتراضات پر چیں بہ جبیں ہونا، چڑچڑانا، جھلانا، جیسے وہ جانتے ہی نہیں۔ اکثر ان پر ایسے اعتراضات بھی کیے جاتے ہیں جو کم علمی پر مبنی ہوتے ہیں۔

لیکن وہ ہر اعتراض پر ایک مسکراہٹ اچھال کر گویا سب کو جواب دے دیتے ہیں۔

''میں ضرور دیکھوں گا۔''

''آپ نے متوجہ کیا۔''

''میں ممنون ہوں۔''

میں نے بہت کوشش کی کہ دھیان سے سنوں شاید ''مشکور'' کہہ دیں لیکن وہ ممنون ہی کہتے رہے۔ اور اس سے یہ اندازہ ہوا کہ انھیں الفاظ کے انتخاب کا بھی سلیقہ ہے اور وہ غلط العوام پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔

یہ سارے پہلو بعد میں کانفرنسوں اور سیمناروں میں ان سے ملاقات کے ردعمل کے طور پر سامنے آئے۔ لیکن جسے قربت کہتے ہیں وہ مجھے حاصل نہ رہی حالانکہ وہ الگ تھلگ رہنے والے شخص نہیں ہیں۔ یا ان کی شخصیت حصار بند نہیں ہے۔ اس ترکیب سے چونکیے نہیں۔ یہ میری اختراع فائقہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی معنویت بہت اہم ہے۔ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں کہ وہ انسانوں سے گھبراتے ہیں اور خود کو اپنی تنہائیوں کے قلعہ میں بند کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب وہ بالکل محفوظ ہیں۔ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایسے لوگوں کو انگریزی میں (Reserve) کہا جاتا ہے۔ میری بدقسمتی کہ میں انگریزی سے بہت کم واقف ہوں۔

ریل گاڑی میں سیٹ تو ضرور Reserve ہوتی ہے۔ مگر شخصیت کو اس طرح کے خانوں میں تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے۔ آپ کتنی ہی الگ تھلگ رہنے کی عادت کیوں نہ ڈال لیں بعض افراد کے سامنے ساری قلعہ بندیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

اس لیے ڈاکٹر تقی عابدی میرے خیال میں Reserve نہیں۔ ملنسار ہیں، خوش اخلاق ہیں، لیکن رکھ رکھاؤ کے عادی ہیں۔ اور اپنے ذوق کی ہم آہنگی کی بنا پر تعلقات کے قائل ہیں لہجے میں مٹھاس ہوتی ہے۔ اندازِ تخاطب میں انکسار ہوتا ہے۔ مگر ان کو اچھی طرح

سے ایک شعر یاد ہے۔

رسمِ تعظیم نہ رُسوا ہو جائے
اتنا مت جھکیے کہ سجدہ ہو جائے

اسی سبب ان کی گلابی شخصیت کے گرد بہت کم شہد کی مکھیاں منڈلاپاتی ہیں ان کے مزاج میں شائستگی، نفاست ضرور ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ یہ ضرور سرحدوں تک پہنچ سکے۔ دراصل ان کے یہاں چھچھوراپن نہیں ہے۔ وہ فرد کو جنس گراں مایہ تو نہیں سمجھتے مگر اتنے ارزاں بھی نہیں ہیں کہ ہر کس و ناکس ان کے حلقۂ احباب میں باریاب ہو جائے۔

ڈاکٹر علی حیدر نے مجھے متوجہ کیا کہ ان کی شخصیت کے اس پہلو پر ضرور روشنی ڈالیے کہ ایک شخص حیدرآباد اور دہلی کا تربیت یافتہ ہے۔ ان تہذیبی اقدار کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جب کہ ان کی ساری زندگی امریکہ، کنیڈا، لندن اور یوروپ میں گزری ہے۔ لیکن نہ تو ان کے لہجے میں نہ عادتوں میں نہ اقوال میں اور نہ ہی مزاج، نہ سرشت میں کوئی ایسی تبدیلی آئی جو ہندوستانیت سے انھیں الگ کردے۔

آپ گھنٹوں بات کرتے رہیں۔ کہیں بھی یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ یہ آدمی اپنے اپنی رہائش کے اعتبار سے یوروپین ہے۔ وہی مہذب و متین لہجہ جو اتر پردیش کے ساتھ مخصوص ہے وہی آپ کو ڈاکٹر تقی عابدی کے یہاں ملے گا۔ وہ ان تہذیبی اقدار کو اور اس تہذیب کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے سے جدا نہیں ہونے دیتے جو انھیں گنگا کے پانی سے دھل کر اور جمنا کے پانی سے نکھر کر ملی ہے۔ وہ اس لحاظ سے اثاثہ ہیں کہ ان سے مل کے یوپی کی قدیم تہذیب کا نمونہ اور ایک روشن شمع سامنے آجاتی ہے۔

بے اختیار زبان پر یہ مصرعہ آجاتا ہے۔

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہیں ہم

اور ایسا لگتا ہے جیسے منتظر نے انھیں کے لیے کہا تھا۔

''یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ''

ایک پہلو اور عرض کرنا ہے۔ دورِ حاضر میں کسی فرد کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ صرف یہ نہ دیکھا جائے اس میں کیا صفات ہیں بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ کن کن علتوں

سے بری ہے۔

ڈاکٹر عابدی نے خدا کے فضل سے دختر زر کو منہ نہیں لگایا۔ بلکہ یہ سمجھئے کہ اپنی اہلیہ کے علاوہ کسی کی دختر کو نہ جھانکا نہ تاکا۔ وہ صرف اسی سلسلے میں مضبوط کردار کے آدمی ہیں بلکہ دوسری انسانی صفات سے متصف ہیں۔ ہم درد، دل نواز اور لوگوں کے کام آنے والے شخص ہیں۔ اور اس کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی بھی ان سے حاجت بیان نہ کرنے پائے۔ اس سے پہلے کہ وہ بیان کرے اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔

ہمارے دوست ڈاکٹر علی حیدر انھیں گھور کے سر سے پیر تک دیکھتے ہیں۔ اور مجھے کہنی مار کر یہ سمجھاتے ہیں کہ آپ سب کو "خطاب" دیتے ہیں اس آدمی کو آپ کیا خطاب دیں گے۔ علی حیدر اتنی زور سے ڈانٹ کر پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی جواب بھی میرے ذہن میں ہوتا تو وہ فراموش ہو جاتا۔ میری خاموشی پر ڈاکٹر صاحب کا ارشاد ہوتا ہے۔ یہ ڈاکٹر نہیں ہے پر "تکمیل الطب کالج" ہے۔ اور مجھے ان کی بات ماننی پڑتی ہے اس لیے ڈاکٹر عابدی اپنے مشاغل کے اعتبار سے بھی ایک منفرد شخصیت ہیں۔ لیکن جب وہ کانفرنس میں آتے ہیں تو اس وقت ان کی حیثیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ ان کی سب سے زیادہ شہرت "مرتب متن" کی حیثیت سے ہے۔

ان کی ساری کتابوں کے نام نہ لکھ کر بھی میں اپنے قول پر قائم ہوں۔

ڈاکٹر تقی عابدی شاعر بھی ہیں۔ اور میری بدقسمتی کہ مجھے ان کا ایک شعر بھی یاد نہ ہو سکا وہ علم بیان اور علم بدیع پر بھی دسترس رکھتے ہیں یہ وہ گوشے ہیں جس سے ہر شاعر اپنی آگہی کا اعلان کرتا ہے۔ اور شاعر اپنی خامیوں، کوتاہیوں، اور بدیع و بیان سے ناواقفیت کا اعتراف کرتے ہوئے معذرت خواہاں بھی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عابدی کے یہاں تنقیدی شعور بالکل اسی طرح سے ہے۔ جس طرح یونیورسٹیوں کے پروفیسر صاحبان میں ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پروفیسر صاحبان تعلقات، روابط اور Examinership اور Refreeship کا بھی خیال کر لیتے ہیں۔

مگر ڈاکٹر عابدی کے پاس اس طرح کی کوئی مجبوری نہیں ہے۔

وہ بڑی شائستگی اور نفاست سے بے لاگ رائے دینے کے قائل ہیں۔ یہ سارے

پہلو اپنی جگہ پر لیکن اُردو کی ادبی دُنیا میں ان کا شمار صفِ اول کے محققین میں ہوتا ہے۔

وہ قاضی عبدالودود کی طرح ریاضی محقق نہیں ہیں۔ نہ وہ اقلیدس کے خطوط اور نہ ہی فیثا غورث کی اشکال (Pythagoras Theorem) سناتے ہیں۔

ان کے یہاں تلاش ہے۔ دریافت ہے اور فراموش کردہ متون کی بازیافت ہے۔ اس سلسلے میں ان کے کارناموں کی طویل فہرست سے ہر کوئی واقف ہے۔ مجھے الگ سے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالنی ہے۔

وہ اب تک ادب کی صرف ایک صنف کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ ہے ''رثائی ادب'' عام لوگوں کی طرح سے ان کی تحقیق ''نوچا کھسوٹا'' تحقیق نہیں ہے کہ جہاں ایک لفظ دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑ پڑے۔ بلکہ وہ بہت ہی متین انداز میں ادب کی صرف ایک صنف یعنی مرثیہ پر اپنے تحقیقی کارنامے بھی پیش کرتے رہے۔ اور ان کی بعض دریافتیں ایسی ہیں۔ جو انھیں ہمیشہ ادب میں زندہ رکھیں گی۔ ان کا علمی وادبی سرمایہ اس اعتبار سے قابل اعتبار ہے کہ انھوں نے صرف رثائی ادب کو اپنا میدان بنایا۔ اور اسی جگہ قلم اٹھایا۔ جہاں ان کے پاس معلومات کا بیش قیمت خزانہ تھا۔ اور اس سلسلے میں جو ان کا مجموعی کردار رہا ہے یعنی جزرسی اور حسیت سے گریز وہی کردار یہاں بھی نظر آتا ہے۔

ان کی تحقیق میں بھی کنجوسی نہیں ہے۔ فضول خرچی بھی نہیں ہے۔ وہ تعین اور (Discipline) کے ساتھ تحقیق کے میدان میں سرگرم رہتے ہیں۔ ان کے تحقیقی کارناموں کا تجزیہ بذاتِ خود تحقیق کا ایک موضوع ہے۔ بلکہ مجموعی اعتبار سے جیسا عرض کیا گیا۔ وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ صرف موضوع سے متعلق رہیں۔

اِدھر اُدھر کی گپیں نہ ہا کیں اور جن موضوعات سے انھیں دلچسپی نہیں ہے اس پر قلم نہ اٹھائیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی اُردو تحقیق کے لیے خصوصاً ''رثائی ادب'' کے لیے ایک بیش قیمت سرمایہ افتخار ہیں۔ انھوں نے اب تک ساٹھ کے قریب تالیفات پیش کی ہیں۔ ان میں سے بیشتر مستند اور پایۂ اعتبار سے مستحکم تحقیق کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور اسی لیے ڈاکٹر تقی عابدی اُردو تحقیق کے دورِ حاضر کے ایک اہم ستون ہیں اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا۔

سید افتخار حیدر
(تعارفی مضمون برائے جلسہ ادبی ایوارڈ ایسٹرن نیوز، ٹورنٹو، کینیڈا)

ڈاکٹر سید تقی عابدی

دوائے دل کی بجائے دردِ دل بانٹنے والے ڈاکٹر جناب سید تقی عابدی صاحب سے میرا تعارف ان کے مضامین کے علاوہ میرے بڑے بھائی جناب ڈاکٹر سید سجاد حیدر صاحب کا احسان ہے۔ بھائی صاحب کا حکم صادر ہوا کہ میں اس دشتِ جنوں کے مسافر سے ضرور ملوں۔ ساتھ ہی انھوں نے میری شاعری کے دونوں مجموعے ''صبحِ دل'' اور ''سوزِ ازل'' بھی انھیں بھیج دیئے۔ لیکن ایک ہوش وحواس کے امین کے لیے کسی دشتِ ویراں میں صاحبِ جنوں کی تلاش کرنا جنگلوں میں خدا ڈھونڈنے سے کم نہیں ہوتی۔ صاحبِ جنوں بھی ایسا جو ہمیشہ سے ہجرتوں کا پاسبان ہو۔ اگرچہ میں خود بھی خرد کی گتھیاں سلجھائے بغیر اپنے مولائے صاحبِ جنوں ہونے کی بھیک تو مانگا کرتا تھا لیکن صحرانوردی کی کبھی جرات نہ ہوئی اور مجھے حضرت سید وارث شاہ صاحب کی یہ نصیحت بھی بھول چکی تھی کہ ''شیر، سانپ اور فقیر کا کوئی دیس نہیں ہوا کرتا۔'' چوں کہ وسیلے بغیر نہ کبھی کسی کا کام نکلا ہے اور نہ نکل سکتا ہے۔ مجھے بھی جناب برادرم عروج اختر زیدی صاحب کی وساطت سے سیٹ لوئیس میں مولائے عشق حضرت علی علیہ السلام کے جشنِ ولادت پر جناب ڈاکٹر تقی عابدی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ اُس وقت سے آج تک الحمدللہ اسی میخوانے کی پاکیزہ نسبت سے ہمارا رشتہ استوار ہے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ دشتِ جنوں میں تعین شدہ راستے نہیں ہوا کرتے۔ یہاں تو صرف جذبہ دل راستوں اور منزلوں کا تعین کرتا ہے۔ جگر مرادآبادی نے کہا تھا۔

اے جذبہ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کی طرف دوگام چلوں اور سامنے منزل آجائے

آخر یہی ہوا اور منزل خود چل کر ٹورنٹو کے قطب شمالی (نیو مارکیٹ) میں آباد ہوگئی۔

اب جس کی ہمت ہے اور وسائل میسر ہیں جا کر مل لیا کرے، عشق کی راہ کوئی آسان تھوڑی ہوتی ہے۔ جب سے آپ یہاں آئے ہیں، اتنی بار خود نظر نہیں آئے جتنی بار ان کے کارہائے نمایاں کے جلوے دُنیا کی آنکھوں کو خیرہ کرتے رہے۔ انشاء، اقبال، انیس، دبیر سے ان کو کہاں فرصت جو اِدھر اُدھر دیکھتے۔ ''سوزِ ازل'' کا شعر ہے ؎

ان کو زیبائش سے کب فرصت ملی، جو دیکھتے
کس قدر ہے اس طرف عشاق کی حالت زبوں

وہ شہر سے اس لیے بھی دور چلے گئے کہ

اب کہاں، وہ سنگ ریزی اور دشنامِ عدو
حیدر اس کوچے میں اب کس کام آئے گا جنوں

ایک بہت بڑے مکان کے بہت ہی چھوٹے سے کمرے میں ایک چھوٹی سی چارپائی کے ساتھ ایک کلرک مارکہ میز کرسی پر، نہایت عاجزانہ انداز میں صحراؤں سے بھی کشادہ وسعتِ خیال لیے، تخلیق، تحقیق، تنقید، ترتیب و تالیف کا عملِ عبادت کرتے رہتے ہیں۔ جب کبھی بات ہو جائے تو حالاتِ حاضرہ سے بے نیاز، کسی نہ کسی کتاب، جس پر کام کر رہے ہوتے ہیں، اس کے محاسن کو ایسی داستان چھیڑ دیتے ہیں کہ آپ اگر خود بھی وہ کتاب پڑھ لیتے تو ایسے باریک نکات تک آپ کی رسائی شاید ہی ہوتی۔ آپ کے ساغر میں پورے کا پورا میخانہ انڈیل دینا چاہتے ہیں۔ ایسے ایسے تڑپا دینے والے پہلو اجاگر کرتے ہیں کہ انسان ان کی قلبی کیفیات اور ان کے پاکیزہ جذبات کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک دن فرمانے لگے ''حیدر بھائی! چادر کے موضوع پر اس سے بڑا شعر میری نظر سے نہیں گزرا جو مونس لکھنوی کہہ گئے ہیں وہ شعر یوں ہے ؎

ردائے بنتِ زہراؑ لوٹنے کو لوٹ لی لیکن
پشیماں بھی ہوئے پیوندِ چادر دیکھنے والے

مولائے کائنات کی معصومہ صاحبزادی کی چادرِ تطہیر کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹنے والے ملعونوں کی ایسی پشیمانی کا علاج جہنم میں آگ کے سوا بھلا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ایک روز فرید لکھنوی صاحب کے فنِ شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے ان

کا ایک کمالِ فن پر فائز مصرع سنایا کہ

گردن کے ساتھ گنتا ہے رستہ بہشت کا

ان سے جب کبھی بات ہو تو یہ پوچھنا نہیں پڑتا کہ ان پر آج کل کس تخلیق کا جنون سوار ہے۔ ان کی کیفیت خود بخود خوب صورت اور فیصلہ کن انداز میں لسانِ شوق جاری ہو جاتی ہے۔

آپ کا اندازِ فکر و عمل ایسا کہ اگر علامہ اقبالؔ سے دشتِ جنوں میں ملاقات ہو جائے تو ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے'' جیسی عارفانہ تصنیف شائع ہو جاتی ہے اور اگر اسی دھن میں اقبالؔ کے دوسرے پہلو میں جا بیٹھیں تو ''شکوہ، جواب شکوہ کا تجزیہ'' پیش کر دیتے ہیں۔ ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے'' میں شامل مضامین کے چند عنوانات ملاحظہ فرمائیں: ''اقبالؔ کی دعا''، ''علامہ اقبالؔ فنافی الرسولؐ''، ''علامہ اقبالؔ اور زیارتِ رسولؐ''، ''علامہ اقبالؔ کی نعتیہ شاعری''، ''اقبالؔ کا تصورِ زمان و مکان''۔ ان عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ادب کے بازار میں کس جنس کے خریدار ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشاؔء پر کتاب لکھی تو اسے کسی موجودہ دور کی مشہور ادبی شخصیت سے منسوب کرنے کی بجائے اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ماہ لقابائی کے نام کیا اور ساتھ ہی اس محترمہ کی عظمت کا ایک عجیب و غریب تعارف کروایا کہ اس محترمہ نے شاہی عتاب کے دوران 500 روپے کی بے طلب ہنڈی بھجوا کر ان کا دل مول لے لیا اور انشاؔء خود اپنا تعارف کرواتے ہیں: (شعر میں تراب اور خاک کی نسبت غور طلب ہے)

بندہ بوترابؔ ہے انشاؔ

شک نہیں اس کی خاکساری میں

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کو جتنا بھی قریب سے دیکھیں ان کی ذات میں دو جذبے سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک پنجتن پاکؑ اور دوسرے اُردو زبان۔ پنجتن پاکؑ اور آل اطہار علیہم السلام سے تو انھیں عشق ہے اور اُردو زبان سے وہ اس عشق کے اظہار کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے پیار کرتے ہیں۔ آپ کی تصانیف ''رموزِ شاعری'' اور ''عروسِ سخن'' اُردو زبان سے آپ کی والہانہ محبت کی ہی دلیل ہیں۔

اپنی زبان دانی کو اظہارِ عشق کا ذریعہ بنانے کا بہترین مظاہرہ انھوں نے اپنی تالیف ''یادگارِ انیس'' میں کیا ہے۔ میر انیسؔ کے ایک مشہور ترین مرثیے کو اپنے ممدوح کے عقیدت مندانہ طواف کا بہانہ بنا کر ڈاکٹر صاحب، اس مرثیے کے بند کے حسن کو چومتے چلے گئے اور ایک کتاب مرتب ہوتی چلی گئی۔ عشق سوا یہ کام ممکن نہیں، 804 صفحات پر مشتمل ہر اعتبار سے خوب صورت ترین کتاب میں حیاتِ انیس، میر انیسؔ مشاہیر شعر و ادب کی نظر میں، یادگار مرثیہ کے متعلقات، شہدائے کربلا کی تعداد کی نسبت سے مرثیہ کے 72 منتخب اشعار اور پھر ان میں سے منتخب نورتن اشعار جیسے

قرآنِ رحلِ زیں سے سر فرش گر پڑا
دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

اور پھر ان نورتنوں میں سے ایک حاصل مرثیہ شعر

جنگل سے آئی فاطمہ زہراؑ کی یہ صدا
اُمت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمداً

ایک بیٹی کا اپنے باپ سے، اسی کی امت کے ہاتھوں کیے جانے والے اس قدر بھیانک ظلم کا بین اور کیا ہوسکتا ہے۔ جنگل، فاطمہؑ، صدا، امت، لوٹ اور وا محمداً کے الفاظ میں اتنی بڑی داستان کو جس سادگی، خوب صورتی اور جامعیت کے ساتھ پرو دیا گیا ہے وہ محض انیسؔ ہی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مرثیہ پر اعتراضات کے جوابات، تجزیے کی مکمل جدول جس میں مرثیہ کے 2129 محاسن اور صنعتوں کی تعداد درج ہے۔ عربی ترجمے کا نمونہ، ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کا کیا ہوا مکمل انگریزی ترجمہ ایسے لگتا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب نے انیسؔ کے مرثیے کو اپنی لیب میں خوردبین کے نیچے رکھا ہوا ہو۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اگر کوئی ان کا ذرہ برابر بھی مددگار رہا ہوگا تو اس کی جزا اسے داورِ محشر ضرور عطا کریں گے۔

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کی کتابوں پر انتہائی موقر اور نامور اساتذہ نے تبصرے کیے ہیں، جن کے ہوتے ہوئے اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس علمی سرمائے سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔ یہ کتابیں ہر گھر اور ہر لائبریری کی زینت بن سکتی ہیں۔ مندرجہ ذیل فہرست میں ان کی کتابوں کے ناموں سے ہی آپ کو ڈاکٹر صاحب کے

مضامین کی نوعیت اور ان کی علمی ادبی وسعت کا اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا۔

1. ''شہید'' (1982ء)
2. ''جوشِ مودّت'' (1999ء)
3. ''گلشنِ رویا'' (2000ء)
4. ''رموزِ شاعری'' (2000ء)
5. ''عروسِ سخن'' (2000ء)
6. ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے'' (2001ء)
7. ''انشاء اللہ خاں انشاؔ'' (2001ء)
8. ''تجزیہ یادگارِ انیس'' (2002ء)
9. ''اظہارِ حق'' (2003ء)
10. ''طالع مہر: کلامِ عاطلہ عطارؔد'' (2004ء)
11. ''مجتہدِ نظم مرزا دبیر'' (2004ء)
12. ''سلکِ سلامِ دبیرؔ'' (2004ء)

زیرِ اشاعت کتابیں:۔

1. تجزیہ شکوہ جواب شکوہ
2. ابواب المصائب: مرزا دبیرؔ
3. رباعیات دبیر
4. مصحفِ تاریخ گوئی

بائیس سال کے عرصہ میں سولہ اعلیٰ ترین کتابوں کو منصۂ شہود پر لے آنا، ان تھک محنت، پر خلوص لگن اور وسائل و ذرائع کے عقل مندانہ استعمال کے علاوہ اخلاق و کردار کی بلندی اور ایسی پاک ہستیوں کی غیبی امداد سے ہی ممکن ہو سکتا ہے جن کی مداح سرائی ڈاکٹر صاحب کا ایمان بن چکا ہے۔ میں اپنے محترم بھائی اور دوست ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کو اس ادبی ایوارڈ کے حصول پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے ایسٹرن نیوز ایوارڈ کمیٹی کی نظر انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ انھوں نے ایک بار پھر اپنے ادارے کی علم دوستی کا پر وقار ثبوت

پیش کیا ہے۔ اپنے ان کلمات تحسین کو میں ڈاکٹر صاحب کے ہی دو عمدہ اشعار پر ان کے زور قلم میں اضافے کی دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

چاند سورج تیری تسبیح کے دانوں کی طرح
گردشِ چرخ میں کرتے ہیں عبادت تیری

•••

ایسی نورانی نظر دے دے تقی کو مولا
جس سے وہ کرتا رہے ہر جا زیارت تیری

علی احمد فاطمی

ڈاکٹر سید تقی عابدی پر دو کتابیں

اس میں شک نہیں کہ پندرہ بیس برسوں میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی اپنی انتھک محنت، تحقیق وتنقید کے تعلق سے گہری عرق ریزی، علم و ادب کی غیر معمولی معلوماتی پے در پے مختلف موضوعات پر کتابوں کی اشاعت نے پوری اُردو دُنیا کو حیران کر دیا ہے اور کچھ لوگوں کو پریشان بھی۔ حیرت کی بات تو ہے کہ ایک ہی وقت میں انیسؔ و دبیر پر یادگار کام کرتے ہیں تو دوسری طرف غالبؔ، انشاؔ، نجمؔ، رشیدؔ، حالیؔ، اقبالؔ، فیضؔ وغیرہ پر بے مثال کام کر جاتے ہیں۔ شاعری کی گرامر پر بھی لکھتے اور شاعری بھی کرتے ہے، عالمی اُردو کانفرنس کا انعقاد کرتے اور دوسرے کام کرنے والوں کا اعتراف اور احترام بھی اور امریکہ، کینیڈا وغیرہ میں اُردو زبان و ادب کے اجلاس بھی۔ کتابوں کی بھیڑ لگانا اور بات ہے لیکن کتابوں میں تحقیق وتنقید فکر وتصنیف صداقتوں اور حقیقتوں کا عرفان حاصل کرنا اور بات ہے اور ان کتابوں کا اہل علم ودانش کے درمیان مقبول ہونا اس بھی بڑی بات ہے یہ قبولیت اور ہیئت ہی مجبور کرتی ہے کہ آنے والی نسل ان کاموں کا حساب کتاب کرے، ان کا تجربہ کرے اور اس کی پذیرائی بھی کرے۔

عین ممکن ہے کہ یہ عمل لمحے بھر کے لیے ستائشی ہو لیکن تقی عابدی کی خدمات کے حوالے سے جس نوع کی کتابیں گزشتہ دنوں منظر عام پر آئی ہیں ان میں ایک سچی تلاش اور سچا محاسبہ ہی نظر آتا ہے۔ یہ وہ کتابیں ہیں، اوّل ڈاکٹر تقی عابدی بحیثیت نقاد و محقق''، دوم ''ڈاکٹر سید تقی عابدی بطور اقبالؔ شناس۔''

قابل غور بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک کتاب یعنی پہلی کتاب ہندوستان سے شائع ہوئی ہے اور دوسری پاکستان میں۔ یعنی اب تقی عابدی کے علمی و ادبی کارناموں کی

شہرت عالمی ہو چکی ہے۔ اور کیوں نہ ہو ان کی اصل اقامت کینیڈا میں ضرور ہے۔ ان کا ایک قدم کینیڈا میں ضرور رہتا ہے لیکن دوسرا پاکستان میں، ہندوستان میں۔ امریکہ میں غرض کہ جہاں جہاں اُردو ہے وہیں وہیں ڈاکٹر تقی عابدی کے جلوے ہیں۔ صرف ملاقاتوں یا رابطوں پر نہیں بلکہ اپنے کاموں سے، کتابوں سے، یہ بڑی بات ہے جو ہر ایک کے نصیب میں نہیں، لیکن یہ بھی ہے کہ نصیب آسمان سے نہیں اُترتا ہے۔ بلکہ دن رات کی غیر معمولی ریاضتوں، محنتوں، لگن جاں فشانی سے بنتا ہے۔ تب جا کر یہ اعتراف ہے ورنہ اپنے آپ میں غرق یہ خود غرض دُنیا کب کس کا آسانی سے اعتراف کرتی ہے۔ آیئے ان کتابوں کا تعارف پیش کریں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ پہلی کتاب ''ڈاکٹر سید تقی عابدی بحیثیت نقاد و محقق'' ہے۔ جسے لکھا ہے نوجوان ادیب محمد رکن الدین جو شعبۂ اُردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے اپنی اس کتاب کو یوں تو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن یہ تحقیقی مقالہ کی پی ایچ ڈی والے ابواب نہیں ہیں بلکہ ایک ایک باب جو دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ مقالہ نگار کی یہ مجبوری بھی ہے اس لیے کہ کتابوں کی فہرست اور کاموں کی طوالت اسے مجبور کرتی ہے۔ ابتداء مصنف و محقق کے تعارف کا یہ انداز دیکھئے۔

''تقی عابدی پیشہ سے طبیب (ڈاکٹر) ہیں۔ موجودہ وقت میں فریشین (Physician) کے ساتھ ماہر اعضائے انسانی (Intorr) اور ماہر امراض قلب ہیں اور طبابت کے پیشے سے ہیں۔ عالمی ادب کے ساتھ ساتھ اُردو ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے خاص طور پر تحقیق و تنقید ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ تحقیق و تنقید، تدوین و ترتیب کی صورت میں اب تک ان کی 60 سے زائد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور ابھی جلد ہی ''کلیاتِ حالی'' کی شکل میں سات جلدوں میں الطاف حسن حالی کی فن و شخصیت، تصالیف اور نقد و شاعری پر مشتمل اب تک کی سب سے مستند اور معتبر کتاب شائع ہو چکی ہے جو اُردو ادب میں حالی فہمی کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ تقی عابدی موجودہ وقت میں اُردو تحقیق و تنقید میں بہت مستند و معتبر نام ہے۔''

ان جملوں سے صد فی صد اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے یہ اندازہ بھی لگایا

جا سکتا ہے کہ ایک مبصر یا تجزیہ گار کے لیے عابدی صاحب کے تمام کاموں کا احاطہ کس قدر مشکل کام ہے تاہم اس نوجوان نے اپنی بساط بھر اولاً ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کا تقریباً تیس صفحات میں جائزہ لیا ہے۔ 15 صفحات میں انیسؔ کے ایک مرثیہ کا، 15 صفحات میں ''رباعیاتِ انیسؔ'' کا تجزیہ کیا۔ گیارہ صفحات میں رباعیات اور بارہ صفحات میں تعشق لکھنوی کا ذکر۔ علامہ اقبالؔ پر لکھی گئی کتاب ''چوں مرگ آید'' دس صفحات، ''کائناتِ نجم'' پر دس صفحات، اور رشید لکھنوی پر بارہ صفحات، دوسرا باب میں یہیں پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرے باب میں ''عروسِ سخن'' تیس صفحات، ''ذکرِ دُرباران'' 26 صفحات، ''سبدِ سخن'' 20 صفحات، ''اقبالؔ پر عرفانی زاویے'' 20 صفحات، ''رموزِ شاعری'' 16 صفحات اور ''فیضؔ فہمی'' 20 صفحات جب کہ اس میں حالیؔ فہمی، سے متعلق کتابوں کا ذکر تو ہے لیکن تبصرہ و تجزیہ نہیں۔ اس کے باوجود اس کتاب کی ضخامت تقریباً 367 صفحات ہو گئی ہے۔ ابتداء میں تقریباً صفحات میں تقی عابدی کے احوال و کوائف پیش کیے گئے ہیں۔ درمیان میں مصنف نے بحیثیت مجموعی چھوٹے چھوٹے آزادانہ تبصرے بھی کیے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''تقی عابدی نے تحقیقی اصول و نظریات کی پابندی کی ہے۔ ان کی تمام تحقیقی تصنیفات و تالیفات میں ان اصولوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔''

اسی مضمون میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''تقی عابدی حرفِ آخر سے آگے کے محقق ہیں جنھوں نے اپنے ذوق جستجو کے بل بوتے گزشتہ چند برسوں سے یکے بعد دیگرے کئی تحقیقی کتابیں پیش کر کے تحقیق کے میدان میں اپنے لیے جگہ بنائی ہے۔''

یہ رائے تحقیق کے بارے میں ہے اب ذرا ان کی تنقید کے بارے میں مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے مصنف نے لکھا۔

''ڈاکٹر سید تقی عابدی اُردو ادب میں معتبر اور مستند نقاد کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شمار عہدِ حاضر میں ان چند نقادوں میں ہوتا ہے جن کے یہاں نظریاتی تنقید کے بجائے عملی تنقید کا اچھا خاصا مواد موجود ہے۔ ان کے تنقیدی سرمائے میں عملی تنقید کو اوّلیت حاصل ہے۔''

آخر میں یہ بھی لکھتے ہیں:

''عہدِ حاضر میں سائنسی طریقۂ کار بھی عملی تنقید میں کافی معاون و مددگار ہے۔ جسے جدید تنقید کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تقی عابدی نے بھی اپنے تنقیدی مضامین میں جدید تنقیدی نظریات سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔''

نوجوان مصنف نے خود بھی ان کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے سادہ سادہ اور اثباتی رُخ اپنایا ہے جو ضروری تھا اس لیے کہ عابدی صاحب اصلاً کلاسیک کے محقق و ناقد ہیں۔ جدید تھیوری مابعد جدید سیاق و سباق سے ان کو جانچنا پرکھنا مناسب نہ ہوتا۔ عابدی صاحب کی مختلف و متنوع کتابوں کو ایک کتاب میں سمیٹنا، محاسبہ کرنا آسان کا نہ تھا۔ لیکن رکن الدین نے اس مشکل مرحلہ کو بہ آسانی طے کرلیا۔ شاید نوجوان کی اسی محنت اور لگن کو دیکھ کر ان کے استاد پروفیسر خواجہ اکرام الدین یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

''ڈاکٹر تقی عابدی پر لکھی گئی کتاب رکن الدین کی عظیم تحقیقی کاوش ہے جس میں تقی عابدی کی جملہ تصنیفات و تالیفات اور ان کی ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب تقی عابدی کی ادبی خدمات کے باب میں دستاویزی حیثیت کی حامل ہوگی۔ میں بھی اس نوجوان کو اس مشکل کام کے انجام دینے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ دوسری کتاب پاکستان کی شاذیہ گل کی ہے جو اسلام آباد کے ایک کالج میں لیکچرار ہیں اور پی ایچ ڈی کررہی ہیں جن کے استاد پروفیسر شاہد اقبال کامران ہیں جو اقبالیات کے ماہر ہیں، غالباً اسی لیے انھوں نے اپنی شاگردہ سے تقی عابدی کی اقبال شناسی پر کام کروایا اور شاذیہ نے نہایت عمدہ طریقہ سے یہ کام انجام بھی دیا۔ 326 صفحات پر مشتمل اس مقالہ کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب کا تعلق تقی عابدی کی سوانح سے ہے لیکن اس سوانحی باب میں بھی مصنفہ نے عابدی صاحب کی ''انیس شناسی''، ''غالب شناسی'' اور ''فیض فہمی'' وغیرہ کا ذکر کر کے ایک طرح سے اقبال شناسی کے لیے علمی پس منظر تیار کیا ہے۔ اس کے فوراً بعد مصنفہ نے عابدی صاحب کے اقبال کے تعلق سے ان کی پہلی کتاب ''چوں مرگ آید'' کا توضیحی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا

ہے جو بے حد اہم ہے۔ ''چوں مرگ آید'' اپنے آپ میں اقبالیات کے سلسلے میں ایک منفرد کتاب ہے جو شعبۂ اقبالیات میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس اقبال کی عمر آخر میں مختلف امراض کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ چوں کہ ڈاکٹر عابدی پیشے سے ڈاکٹر ہیں اس لیے یہاں ان کا قلم اور ذہن خوب چلا ہے اور بڑی باریکیوں سے اقبال کے امراض کا تجزیہ کیا ہے۔ نیز ان کے شوق، مطالعہ، کتابیں بھی کچھ سمٹ آئے ہیں۔ شاذیہ نے تمام تر حوالوں اور مثالوں کے ساتھ اس باب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ جس سے اقبال کے تئیں ان کے وسیع مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

باب سوم میں اقبال سے متعلق عابدی صاحب کی دوسری کتاب ''اقبال کے عرفانی زوایئے'' ہے اس کتاب کا تعلق مذہبیات سے ہے اور عقائد اقبال سے، اقبال کا عشقِ رسولؐ اور آلِ رسول۔ ابتداً مصنفہ نے اپنے طور پر اقبال کی محبتوں اور عقیدتوں کا ذکر کیا ہے۔ یہاں بھی قدم قدم پر حوالے ہیں اور مستند حوالے۔ بعد میں تقی عابدی، لیکن تقی عابدی کے ساتھ ساتھ بھی دیگر علماء، و ماہرین اقبال بھی ہیں۔ کہیں کہیں ایسے جملے بھی ملتے ہیں۔

> ''ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی نعتیہ شاعری میں یہ واضح کیا کہ آپ کی تعلیمات سب کے لیے یکساں تھیں اور عورتوں کو آپؐ نے برابری کے حقوق دلوائے۔ اقبال کو بھی عورت کی آزادی اور حقوق سے خاص شغف تھا۔''

> ''دعا کسے کہتے ہیں۔ دعا کس سے مانگی جاتی ہے۔ دعا کس طرح کی جاتی ہے، دعا کس چیز کی کرنی چاہیے؟ دعا میں وسیلے کی کیا اہمیت ہے۔ یہ بحث طویل ہے اور ڈاکٹر تقی عابدی نے اس بحث کو خارج ازمحل قرار دیا ہے۔''

اس طرح کی اور باتیں اور بحثیں ہیں جس کو وسیع تر سیاق و سباق میں شاذیہ گل نے پیش کیا ہے اور اس نازک لیکن بے حد اہم باب کو معنی خیز اور فکر انگیز انداز سے پیش کیا ہے، بعد میں اقبال اور اکبر، اقبال اور ٹیپو سلطان، اقبال اور رجبہ کشن پرساد، اقبال اور داس مسعود کے علاوہ اقبال کی شاگردی بھی زیرِ بحث آئی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ بھی معلوماتی اور لائق مطالعہ ہے۔ بعد اقبال کے تصور زمین و مکاں پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ آخر میں اقبال سے متعلق تقی عابدی کے چند مضامین بھی شاملِ کتاب ہیں۔ مثلاً اقبال کا شاہین، اقبال کی

ازدواجی زندگی، اقبال پر تہمت شراب نوشی وغیرہ۔ اقبال اور عالمی صورتِ حال کے عنوان کے تحت اقبال اور مسئلہ فلسطین، اقبال اور حیدر آباد کے موضوعات پر بھی عابدی صاحب نے مضامین قلم بند کیے ہیں۔

سب سے آخر میں شاذیہ گل نے تقی عابدی کی علمی زندگی میں مطالعۂ اقبال کی اہمیت و معنویت کیا ہے اس پر فکر انگیز اور نتیجہ خیز گفتگو کی ہے۔ ''چوں مرگ آید'' کے بارے میں شاذیہ کی رائے ہے۔

''اس کتاب کا لفظ لفظ خطوط کے مستند آئینے میں پڑھ کر منتخب کیا گیا ہے جو اقبالیات کے طالب علموں کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔''

دوسری کتاب ''اقبال کے عرفانی زاویے'' کے بارے میں رائے ہے۔ ''ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''اقبال کے عرفانی زاویے'' علامہ محمد اقبال پر اکتیس متفرق مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں 180 صفحات ہیں۔ اس کتاب میں تقی عابدی نے اقبال کی فکر کو مکمل جامعیت کے ساتھ رقم کیا ہے۔

اور آخری جملہ تو واقعی حیرت میں ڈالتا ہے:

''کینیڈا میں بیٹھ کر اُردو کے ایک ضخیم ذخیرے کا حصول کسی معجزے سے کم نہیں۔ اقبال کی فکر اور شخصیت پر تقی عابدی نے بہت ہی سنجیدگی سے قلم اُٹھایا ہے۔''

تقی عابدی جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں پوری سنجیدگی اور لگن سے انجام کو پہنچاتے ہیں۔ تحقیق و تنقید کا حق ادا کرتے ہیں۔ کینیڈا میں، میں نے خود ان کے ذاتی کتب خانے سے فیض حاصل کیا ہے۔ ایسا مرتب اور خانہ بند کتب خانہ میں نے کم ہی دیکھا ہے۔ ان کا کتب خانہ، ان کا کام کرنے کا طریقہ، ایک ایک چیز پر نگاہ دُنیا کے دوسرے کتب خانوں پر ان کی نگاہ، ان سے رشتے اور رابطے غرض کہ سب کے سب حیرت انگیز بھی اور سبق آموز بھی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے کام اسی جنون اور لگن سے ہی ہوتے ہیں اور اب وقت آگیا ہے کہ تقی عابدی کے بڑے کاموں کا معروضی اور حقیقی جائزہ لیا جائے جس کا سلسلہ ان دو کتابوں سے شروع ہو چکا ہے۔ میں ان دونوں کتابوں کے مصنفین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر شہناز قادری
جموں

اُردو میں ہجری ادب
کا پہلا مجموعۂ مکاتیب ''بنامِ تقی عابدی''

مکتوب نگاری کا فن اردو کے غیر افسانوی سرمائے کا ایک لطیف ترین فن ہے۔ مکاتیب کی ترتیب و تدوین کا کام اردو ادب میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ چناں چہ مکاتیب ہی وہ مستند تحریریں ہیں جن میں ہمیں مشاہیرِ ادب کی زندگی کے گونا گوں پہلوؤں کی عکاسی کو دیکھنے اور ان سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ مکتوب نویس اپنے خط میں مکتوب الیہم کی ادبی شخصیت کے مخفی گوشوں سے بے تکلف پردہ وا کرتا ہے اور یوں ادب میں شخصیتیں جاذبِ نظر اور جاذبِ توجہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ جہاں تک علمی وادبی شخصیات کی پرکھ کا تعلق ہے اس ضمن میں خط ایک معتبر ترین حوالہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مکاتیب کی ترتیب واشاعت اس لیے بھی غیر اہم ہے کہ اس سے جہاں مکتوب نویس خط و تحریر کا سلیقہ سامنے آتا ہے وہیں مکتوب الیہم کی شخصیت وفن پہلو بہ پہلو قارئین کے سامنے آتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''بنامِ تقی عابدی'' اُن خطوط پر مشتمل ہے جو ڈاکٹر سید تقی حسن عابدی (تقی عابدی) کے نام مشاہیرِ ادب نے وقتاً فوقتاً تحریر کیے ہیں۔ ان خطوط میں تقریباً 95 فی صد خطوط ایسے ہیں جو آج سے تقریباً دس سال قبل موصوف کے نام تحریر کیے گئے ہیں۔ ان خطوط کو بہ اعتبارِ سنین اس لیے نہیں رکھا گیا کہ ان میں بیشتر خطوط ایسے ہیں جن پر تاریخ رقم نہیں ہے۔ ان خطوط کے بارے میں ایک اہم بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ یہ خطوط مشاہیر ادب نے ازخود تحریر کیے ہیں یعنی ان میں کوئی برقی خط شامل نہیں کیا گیا ہے جو مکتوب الیہم کو

بذریعہ واٹس ایپ، ای۔میل، فیس بک وغیرہ سے ملا ہو۔ ایک اور اہم بات مکاتیب ''بنام تقی عابدی'' کے بارے میں یہاں بتانا لازمی ہے کہ تقی عابدی کے نام خط و تحریر کا ایک لمبا سلسلہ کئی دہائیوں سے چلا آ رہا ہے لیکن اسے ادب کی بدنصیبی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ موصوف نے اپنے نام لکھے گئے خطوط کی ایک بڑی تعداد وقتاً فوقتاً تلف کر دی یعنی ان خطوط کو سنبھالنے کا اہتمام نہیں کیا گیا، جس کی وجہ سے ہم ایک اہم ادبی سرمائے سے محروم ہو گئے۔ البتہ اب جتنے خطوط محفوظ تھے انھیں منظر عام پر لانے کی کافی وجہیں ہیں اسی لیے ان کی ترتیب و تدوین کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ان خطوط کی اشاعت کے کئی فائدے ہیں۔ ایک تو یہ خطوط مکتوب نویسی کے اسرار و رموز کی عمدہ مثالیں فراہم کرتے ہیں۔ اس کے لیے علاوہ مکتوب نگاروں کے سلیقۂ تحریر سے قارئین کو آگاہ بھی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خطوط علم و ادب کا ایک بیش قیمت اثاثہ بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان خطوط میں مکتوب الیہم یعنی دورِ حاضر کے ایک بتِ ہزار شیوہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی و ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ خطوط موصوف کے فن اور شخصیت کے تمام گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ اسی لیے یہ بات بڑے ہی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ خطوط ادب اردو کا ایک پوشیدہ خزانہ تھا جسے منظرِ عام پر لانا ازحد لازمی تھا۔

یوں تو مشاہیر و اکابرین ادب نے ہر قسم کے خطوط ڈاکٹر سید تقی عابدی کے نام تحریر کیے ہیں جن میں نجی، سرکاری، ادبی وغیرہ شامل ہیں تاہم زیرِ نظر کتاب میں خصوصاً ادبی نوعیت کے خطوط کو ہی خاص طور پر جگہ دی گئی ہے۔ ان خطوط میں مکتوب نویسی کے فن کے تقاضے بھی جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان میں اگرچہ طویل خطوط کی مثالیں بھی شامل ہے تاہم اختصار کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ طویل ادبی خطوط میں ڈاکٹر جمال الدین کے تحریر کردہ خطوط کے حوالے کو اس ضمن میں مثال کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ خطوط ایک اہم ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں خصوصاً وہ خط جو ڈاکٹر جمال الدین نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کو 12 / جولائی 2000ء میں ارسال کیا تھا۔ اس طویل خط سے قارئین ایک تو ڈاکٹر جمال کی عروض دانی سے واقف ہو جائیں گے تو دوسری طرف ڈاکٹر تقی عابدی کی ادبی شخصیت سے واقفیت حاصل کریں گے۔ یہ خط فن عروض کے سلسلے میں ایک مکمل اور مدلل

حوالے کا حکم رکھتا ہے اور اس کے مطالعے سے قارئین کو عروض دانی کے سلسلے میں اضافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح کچھ خطوط سے مکتوب نویسی میں اختصار کی عمدہ مثالیں سامنے آتی ہیں۔ ایسے خطوط میں ڈاکٹر خلیق انجم کا 30/دسمبر 2010ء کا تحریر کردہ خط اور عزیز قریشی کا 6/دسمبر 2010ء وغیرہ جیسے خطوط کے حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں زیر نظر کتاب ''بنام تقی عابدی'' میں ایسے خطوط بھی شامل ہیں جن میں مکتوب نگار اپنی دلی خواہشات اور اپنے جذبات و احساسات مکتوب الیہم کے تئیں منظوم ارسال کرتے ہیں جو کہ مکتوب نویسی کی دنیا میں ایک منفرد واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے منفرد خطوط میں سے ایک خط 31/مئی 2010ء کا بشیر آثم (جے پور) کا پیش پذیر بذریعہ پروفیسر سید رضا نمونتاً پیش ہے:

عزت مآب جناب ڈاکٹر سید تقی عابد مدظلہ العالی کی نذر

ادب کے مطلعِ انور کا استقبال کرتے ہیں
شگفتہ جذبۂ اطہر کا استقبال کرتے ہیں

سخن کی صبح کے اختر کا استقبال کرتے ہیں
تقی عابدی برتر کا استقبال کرتے ہیں

مداحِ فاتحِ خیبر کا استقبال کرتے ہیں
فدائے ساقیِ کوثر کا استقبال کرتے ہیں

نظر آتا ہے جن میں حضرتِ اقبالؔ کا پرتو
ہم ایسی فکر کے پیکر کا استقبال کرتے ہیں

خدا شاہد کہ یہ لمحے بڑے انمول لمحے ہیں
سخن فہم و سخن پرور کا استقبال کرتے ہیں

بہت کشمیر کے اہل ادب کو ناز ہے اس پر
حسیں تخلیق کے پیکر کا استقبال کرتے ہیں

بہت افسوس ہے اس کا کہ حاضر ہو نہیں سکتا
مرے اشعار ہر منظر کا استقبال کرتے ہیں

زہے قسمت بشیر آثم کے یہ ساعت بھی آئی ہے
محقق کے حسیں جوہر کا استقبال کرتے ہیں

(کشمیر، 31 مئی 2010ء[1])

اس کے علاوہ "بنام تقی عابدی" کے خطوط ہمیں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی حیات اور شخصیت سے بخوبی واقف کراتے ہیں۔ تقی عابدی ہمہ پہلو اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی تہہ دار شخصیت میں بیک وقت ایک طبیب، شاعر، محقق، تخلیق کار اور تجزیہ نگار وغیرہ کی بے شمار تہیں سمٹی ہوئی ہیں۔ زیرِ نظر خطوط میں ان تمام تہوں کی عکاسی اور تصویر کشی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی اپنے ایک خط میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی شخصیت کے تئیں یوں رقم طراز ہیں:

"......سائنس اور طبِ مغربی سے وابستگی کے باوجود مشرقی علم و دانش اور اردو ادبیات سے آپ کا جو گہرا تعلق ہے اور ادبی کاموں میں جو آپ کا انہماک ہے وہ قابلِ ستائش ہی نہیں قابلِ رشک ہے[2]۔"

تقی عابدی کے نام لکھے گئے خطوط میں ادب اور طب کا ایک بہترین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ خطوط یقیناً تقی عابدی کے یک بتِ ہزار شیوہ ہونے کی بیّن دلیل فراہم کرتے ہیں۔ مشاہیر ادب ان خطوط میں تقی عابدی کی ادبی صلاحیتوں کو دیکھ کر حیران نظر آتے ہیں۔ پیش ہے اس ضمن میں 18/ دسمبر 2008ء میں لکھا گیا اردو زبان وادب کے مستند ادیب خلیق انجم کا یہ خط:

"......آپ کی تقریر سن کر حیرت ہوئی کہ آپ اپنے پیشے کے اعتبار سے اتنے مصروف ڈاکٹر اور پھر بھی اردو اور فارسی ادب پر آپ کی اتنی گہری نظر ہے...... غالبؔ کے فارسی کلام کا جس طرح سے آپ نے تنقیدی ایڈیشن تیار کیا ہے وہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی[3]......"

"بنام تقی عابدی" فنِ مکتوب نویسی میں یقیناً ایک اہم اضافہ ہے۔ اس میں شامل مکاتیب ایک پوشیدہ علمی و ادبی خزانہ ہے۔ ان خطوط کی ادبی اہمیت تو مسلّم ہے ہی مگر تاریخی اعتبار سے بھی یہ خطوط ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں نعیم راشد کے

خطوط سے چند سطور ملاحظہ ہو:

"......شہر برہان پور جسے دارالسرور اور باب دکن اور مدینۃ الاولیا بھی کہا جاتا ہے۔ شہنشاہ شاہجہاں نے شہزادگی کے زمانے میں جب وہ شہزادہ خرم تھے۔ اس شہر میں گورنر بن کر 28 سال گزارے ہیں۔ دو سال بادشاہت کے زمانے میں بھی برہان پور میں رہے اور ارجمند بانو ممتاز کا انتقال بھی یہیں ہوا اور ان کے جسدِ خاکی کو 6 ماہ یہاں رکھنے کے بعد آگرہ لے جا کر تاج محل میں دفنایا گیا......[۷]"

بہرحال ڈاکٹر سید تقی عابدی اپنے بیش بہا ادبی کارناموں اور ادبی منفرد ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر اردو زبان و ادب میں ایک فرد ہی نہیں بلکہ ایک انجمن کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان و ادب سے دور رہ کر دنیائے سائنس و طب میں رہ کر عروضِ اردو کی مشاطگی کے فرائض انجام دیے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ سرزمینِ وطن سے دور رہ کر دیارِ غیر میں اردو زبان و ادب کی محفلیں سجائیں۔ ان کی انھیں صلاحیتوں کی بنا پر عروج زیدی 21ر اپریل 1999ء کے ایک مکتوب میں یوں رقم طراز ہیں:

"ہند و پاکستان کے معروف ادیب حضرت ضمیر جعفری نے عابدی صاحب کی خدمات دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ عابدی صاحب "نیویارک کے جمیل جالبی ہیں" اس امر سے سب اہل علم بخوبی واقف ہیں کہ علم عروض و علم بیان اردو نظم و نثر کے حوالہ سے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں[۸]۔"

چند خطوط نموتاً ملاحظہ ہوں:-

خط نمبر:۱

23۔ مارچ 1998ء

جوہر میر

نیویارک

نذر جناب ابوطالب علیہ السلام

بے سایہ کے لیے نہ کوئی سائباں بنا

تھا ایک، دوسرا ابوطالبؑ کہاں بنا

یہ ابتدائے عہد نبوت کی بات ہے
میرے نبی کا دشمنِ جاں اک جہاں بنا

کانوں میں جب قریش نے رکھ لی تھیں انگلیاں
وہ کون تھا جو میرے نبیؐ کی زباں بنا

وہ کون تھا جو سینہ سپر روز و شب رہا
وہ کون تھا جو دعوتِ حق کی اذاں بنا

کذب وریا کے شور میں جب چُپ تھے سورما
تھا کون احتجاج کا کوہ گراں بنا

جب جُرم تھا تعلقِ خاطر رسولؐ سے
شہر خدا میں ایک وہی نعت خواں بنا

تھا یہ بھی اُس کی ہیبت ایماں کا معجزہ
ہر سنگ راہ خاکِ درِ آستاں بنا

وہ کس کا گھر تھا جس میں رسالت تھی میہماں
مکے کا ایک غنی بھی نہ جب میزباں بنا

وہ کون تھا، کیا تھا مقرر جسے ولی
تھا کون جو نبی کا مرے عقد خواں بنا

ہر اک سفر میں جس کے نبوت تھی ہم سفیر
ہر کاروانِ عشق کا جو سارباں بنا

جو ہر جو تیر سینۂ باطل میں گڑ گیا
اُس تیر کے لیے ابوطالبؑ کماں بنا

خط نمبر: ۲

محترم جناب سید تقی عابدی صاحب

السلام علیکم

''فیکٹ'' پاکستان ہی نہیں بلکہ دُنیا بھر میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا آن

لائن تحقیقی میگزین ہے جو گزشتہ تین سالوں سے ایسے حقائق منظر عام پر لا رہا ہے جنھیں ڈر یا خوف کے باعث یا تو چھپا لیا جاتا ہے یا پھر مصلحتوں کے تحت انھیں منظر عام پر نہیں لایا جاتا۔ فیکٹ کی اسی پالیسی کے باعث اُسے اندرون ملک کے اعلیٰ سیاسی، صحافتی، سماجی اور حکومتی حلقوں کے علاوہ بیرون ملک کی ایک کثیر تعداد کی طرف سے بھی پذیرائی مل رہی ہے۔ فیکٹ نے اُردو صحافت میں تحقیق کی جو بنیاد رکھی ہے اُسے کوئی اور میگزین فالو نہیں کر سکا۔ اس اعزاز پر ہم اپنے رب العزت کے شکر گزار ہیں۔ فیکٹ جہاں دوسرے تمام موضوعات کا احاطہ کرتا ہے وہاں ادب کے میدان میں بھی کچھ نئی شروعات کرنا چاہتا ہے۔

''فیکٹ'' نے اب بیرون ملک مقیم معروف ادیبوں اور شعراء کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے میں فیکٹ آپ کا انٹرویو بھی کرنا چاہتا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات اپنی چند تصاویر کے ساتھ ان پیج یا Tiff, Jiff, JPG فارمیٹ میں جلد سے جلد بھجوا دیں۔

آپ اس سلسلے میں مزید کوئی بات کرنا چاہیں یا کچھ پوچھنا چاہیں تو براہ راستہ رابطہ بھی کر سکتے ہیں۔

اُمید ہے آپ اس سلسلے میں اپنے جواب سے جلد آگاہ کریں گے۔

مقبول ارشد

ایڈیٹر، فیکٹ، لاہور

پاکستان

سوالنامہ

- اپنے بارے میں کچھ بتائیں
- لکھنے کا آغاز کب اور کیسے کیا؟
- بچپن میں کن ادیبوں سے زیادہ متاثر تھے؟
- اب تک کتنی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں؟
- پہلی کتاب کب منظر عام پر آئی؟
- پہلی کتاب آنے کے بعد آپ کے جذبات کیا تھے؟

- کینیڈا میں کب سے مقیم ہیں؟
- یہاں جب آئے تھے تو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا؟
- ادب کی کس صنف کے بارے میں آپ کا خیال ہے کہ یہ زیادہ پڑھی جاتی ہے؟
- معاشرے میں کتاب کلچر دن بدن کم ہوتا جارہا ہے، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں کن اقدامات کی ضرورت ہے؟
- کیا آپ ادبی گروہ بندی کے قائل ہیں اور کیا آپ کے خیال میں یہ گروہ بندیاں ادب کو نقصان نہیں پہنچا رہیں؟
- آپ کے پسندیدہ شاعر اور ادیب کون سے ہیں؟
- آپ پاکستان اور انڈیا میں کن شاعروں اور ادیبوں سے متاثر ہیں؟
- آپ کا کیا خیال ہے کہ بہتر ادب کہاں تخلیق ہو رہا ہے؟
- نئے لکھنے والوں میں کون بہتر شاعری کر رہا ہے اور کون بہتر نثر لکھ رہا ہے؟
- یہاں کے میڈیا کے بارے میں کچھ بتائیں؟
- کوئی پیغام جو آپ پاکستان کی حکومت، یہاں کے شاعروں اور ادیبوں اور عوام کو دینا چاہتے ہیں؟

خط نمبر: ۳

برادرم تقی عابدی صاحب! السلام وعلیکم

مکتوبِ گرامی مورخہ 26/اپریل موصول ہوا۔ شکریہ۔ خوشی ہوئی کہ آپ شاہکار انیس کا پاکٹ ایڈیشن شائع کرنے پر تیار ہیں۔ یہ ایڈیشن بھی انشاء اللہ بہت مقبول ہوگا۔

آپ کی اشاعتی پروگرام میں مولوی خیرات احمد محبؔ (میر سلطان کے والد) کی کتاب ''مطلع انوار'' شامل ہونا چاہیے۔ یہ میر انیس کی شاعری کا عمدہ مطالعہ ہے۔ یہ مختصر کتاب ہے اور اس کی اشاعت زیادہ نہیں ہوئی۔ سید افضل حسین ثابت کی حیات دبیر کا کاغذ اتنا بوسیدہ ہو چکا ہے کہ جلد ہی یہ فنا ہو جائے گی۔ اس کا کم از کم پہلا حصہ (سوانح) شائع ہو جانا چاہیے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کی کتاب کا جواب لکھنا چناں چہ ضروری نہیں اس کتاب کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے۔

میر انیسؔ پر ہونے والے کاموں کی ایک فہرست عبدالقوی دسنوی نے ''انیسؔ نما'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کی ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے بھی اس موضوع پر اچھا کام کیا ہے جو رسالہ ماہِ نو کے انیس نمبر میں شائع ہوا ہے اور غالباً ''اشاریۂ میر انیسؔ'' کے نام سے بھی کتابی صورت میں چھپا ہے۔

مجالس عزا میں پڑھنے کے لیے مراثی انیس کے منتخب بندوں کی اشاعت کا خیال بہت اچھا ہے۔ ان کے ساتھ انیس کے سلاموں اور رباعیوں کا بھی انتخاب شائع ہونا چاہیے۔

رثائی ادب کے تحفظ کا مبارک کام آپ نے شروع کیا ہے۔ اس سے مرثیے پر کام کرنے والوں کو بہت مدد ملے گی۔ سرکارِ حسینی سے حوصلہ ملے گا اس کا حساب نہیں۔ سید علی احمد دانش بیرہ عارف کے پاس جو ذخیرہ ہے وہ اسے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے براہِ راست رابطہ کیجیے۔ پتہ انیس ہاؤس، چوبداری محلّہ، چوک لکھنؤ۔ 226003 ہے۔

آپ کا ایک بار ہندوستان آنا ضروری ہے۔ یہاں کافی چیزیں مل سکتی ہیں اور آپ سے ملاقات کی میری خواہش بھی پوری ہو سکتی ہے۔ مجھ کو فالج نے معذور کر دیا ہے۔ میر انیسؔ کی سوانح عمری مکمل کر چکا ہوں۔ کمپوزنگ وغیرہ ہو چکی ہے۔ عنقریب انشاء اللہ شائع ہو جائے گی۔

اطہر رضوی صاحب کے انیسؔ سیمینار میں ہندوستان سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈاکٹر انیس اشفاق عابدی صاحب شرکت کریں گے۔

آپ انیسؔ اور مرثیے کے سلسلے میں بہت کام کر رہے ہیں۔ خدا توفیقات زیادہ کرے۔ اُمید ہے مزاج بہ خیر ہوگا!

13 مئی 2002ء

آپ کا
نیر مسعود
''ادبستان'' دیال روڈ

خط نمبر: ۴

برادرم محترم۔ سلام عرض

ایک عرصہ سے آپ لوگوں کی خیریت نہیں ملی۔ میں نے آپ کی کتاب پر تفصیلی تبصرہ روانہ کیا تھا۔ اس کی رسید بھی نہیں ملی۔ یقین ہے کہ تبصرہ آپ کو مل بھی گیا ہوگا۔ میری کتاب ''اقبال اور رپورتاژ'' زیر طبع ہے جلد ہی منظر عام پر آئے گی۔

اس درمیان جوشؔ بانی شائع ہو گیا۔ جلد ہی آپ کو ملے گا۔ دہلی کے جوشؔ سیمینار میں اس کا اجراء ہوا۔ شاہد بھائی صاحب نے بتایا کہ آپ اقبالؔ پر سیمینار کرنے والے ہیں۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ جوشؔ کی باری ہوگی لیکن خیر اقبال کو بہر طور اولیت ہے۔ اس کے بعد ہی سہی...... اقبالؔ سیمینار کے لیے ہم لوگوں کے لائق کوئی خدمت! بھائی جان کو سلام عرض۔

مخلص

پروفیسر علی احمد فاطمی

الہ آبادؔ

خط نمبر: ۵

محترم سید تقی عابدی صاحب سلام و نیاز!

آپ کی خیریت کی اطلاع اخبارات سے ملتی ہے۔ ادب میں فعالیت کی مثال دیکھنی ہو تو ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ میری نئی کتاب ''دہلیز پر پھول'' کے چند نسخے ہوائی ڈاک سے پہنچے تھے جو فوراً ختم ہو گئے۔ بحری ڈاک سے مرسلہ کتابیں اب ملی ہیں تو احباب کو روانہ کر رہا ہوں۔ چنانچہ ایک نسخہ آپ کی نذر ہے۔ رسید اور رائے سے مطلع فرمائیے گا۔ نیز حال میں شائع شدہ میری غزلوں پر ایک مضمون کے ساتھ کچھ متعلقہ تبصرہ اور اقتباسات کی نقلیں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

اُمید ہے آپ جملہ افراد خانہ سمیت بخیر ہوں گے۔

مخلص

سید ولی عالم شاہین

24رفروری 2006ء

اٹاوا،کینیڈا[۹]

بنام: ڈاکٹر سید تقی عابدی

1119۔سیکرٹریٹ روڈ۔ نیو مارکیٹ

اونٹیریو، ایل تھری ایکس ون ایم فور

مجموعی طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب ناچیز کی ایک حقیر کوشش ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسی مایۂ ناز شخصیت سے دنیائے اردو ادب کو روبرو کرانے کی، ڈاکٹر تقی عابدی کے خطوط میں معنی و مطالب کی ایک دُنیا آباد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کا منظر عام پر لانے کا مقصد یہی ہے کہ ادب کے اس عظیم سپہ سالار (تقی عابدی) اور علم کے اس عظیم اثاثے یعنی خطوط تقی عابدی کو قارئین کے سامنے لایا جائے تاکہ علم و ادب کے شائقین اس سے مستفید ہوسکیں۔

مجھے امید ہے کہ اس حقیر کوشش کو دنیائے علم و ادب میں سراہا جائے گا۔

گر قبول افتد رہے عزو شرف[۱۰]

حواشی

۱ بنام تقی عابدی، مرتبہ ڈاکٹر شہناز قادری، ص: ۱۰۳

۲ ایضاً،ص: ۱۸۹

۳ ایضاً،ص: ۱۰۲

۴ ایضاً،ص: ۲۹۱

۵ ایضاً،ص: ۱۹۹

۶ ایضاً،ص: ۲۵۔۲۸

۷ ایضاً،ص: ۲۹۔۳۰

۸ ایضاً،ص: ۳۰

۹ ایضاً،ص: ۳۹

۱۰ ایضاً،ص: ۴۰

ڈاکٹر سید کلیم اصغر
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ماہر خسرو و غالب: ڈاکٹر سید تقی عابدی

تقی عابدی کہتے ہیں: ''میں صحت کا طبیب، ادب کا مریض، اُردو کا وکیل اور فارسی کا عاشق ہوں۔'' شاید اسی لیے وہ اپنی چالیس سالہ ادبی خدمات کے دوران اکسٹھ (61) کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ جس کی تفصیل میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اقبالیات، غالبیات، انیسیات، دبیریات، حالی اور فیض پر تحریر کردہ کتابوں سے اہل علم اچھی طرح واقف ہیں۔

تقی عابدی مغرب اور مشرق کی ملی جلی طرز کے محقق ہیں۔ وہ بیک وقت پروفیسر آف میڈیسن ہیں، جموں یونیورسٹی کے تاحیات پروفیسر، مولانا آزاد یونیورسٹی حیدر آباد اور تلنگانہ یونیورسٹی، تلنگانہ میں وزیٹنگ پروفیسر سے سرفراز ہوئے۔ آپ کی زندگی کے بارے میں زیادہ بات نہ کرتے ہوئے ان کی تحقیق سے ہونے والے ادبی فوائد پر گفتگو کی جارہی ہے۔ مغربی تحقیق کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر چیز کو پوری طرح سے تحقیق کرنے کے بعد قبول کیا جاتا ہے جب کہ مشرقی تحقیق میں عام طور سے بڑے لوگوں سے جو چیز منسوب ہوتی ہے اس پر کسی قسم کی کوئی تحقیق نہیں ہوتی۔

امیر خسرو پر گفتگو کرنے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ ڈاکٹر عابدی کا فارسی کے حوالے سے سب سے پہلا کام 1981ء میں مرتضیٰ مطہری ایران کے نامور عالم، دانشور کی کتاب ''شہید'' کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ایران سے اُردو میں شائع ہوئی اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح تقریباً پچاس ہزار سے زیادہ کاپیاں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب تقریباً 42 صفحات پر مشتمل ہے۔ جو شہید مرتضیٰ مطہری کی شب عاشور کو حسینیہ ارشاد تہران کی تقریر کا خلاصہ ہے۔ جسے ڈاکٹر عابدی نے سازمان تبلیغات اسلامی

ایران کے شعبہ بین الملل کے کہنے پر ترجمہ کیا تھا[1]۔ اس ترجمہ کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی اور ستائش ہوئی کیوں کہ یہ نہایت سلیس اُردو ترجمہ ہوا۔ ایران کے علاوہ ہندوپاک کے اکثر دانشور اس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں[2]۔

امیر خسؔرو کے حوالے سے ہندوستان میں مستند اور معتبر کتابوں میں علامہ شبلی نعمانی کی ''حیاتِ خسؔرو'' بھی شامل ہے۔ یہ کتاب اگرچہ سو صفحات سے کم ہے۔ لیکن دانشور اس کتاب سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں خسؔرو کی زندگی اور ان کے فن سے متعلق تمام اہم نکات کو نہایت سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے بعض حوالوں کی تحقیقی چھان بین نہیں کی گئی۔ مثلاً علامہ شبلی نعمانی تحریر کرتے ہیں:

''امیر صاحب کی ایک صاحبزادی تھیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی ایسی بے قدری تھی کہ امیر کو ان کے پیدا ہونے کا رنج تھا جب وہ سات برس کی ہوئیں تو امیر صاحب نے لیلیٰ مجنوں لکھی۔ اس میں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ای زعفت فگندہ برقع نور
ہم عفیفہ بنام وہم مستور

•••

کاش ماہ تو ہم بچہ بودی
در رحم طفل ہشت مہ بودی

•••

لیک چون دادۂ خدائے رواست
با خدادادگان ستیزہ خطاست

•••

من پذیرفتم آنچہ یزدان داد
کانچہ او داد باز نتوان داد

•••

پدرم زمادر است آخر

مادرم نیز دختر است آخر[۴]

سو سال سے تقریباً یہی سلسلہ چلا آرہا ہے اور سب لوگ اس کو نقل کر رہے ہیں۔ سو سال سے ہمارے خسرؔو شناسوں نے یہ دھیان ہی نہیں دیا کہ چار پانچ جملہ خسرؔو کو ایک شخص بے سواد اور عورت کے وجود سے متنفر بتاتے ہیں۔ اب جو لوگوں نے جدید کام شروع کیا تو انھوں نے خسرؔو کے انسان پرست اور انسان دوست ہونے پر سوالیہ نشان لگا دیئے۔ ان کے مطابق خسرؔو تو بیٹی کے پیدا ہونے پر نوحہ پڑھتے ہیں، اظہارِ رنج کرتے ہیں۔ تو وہ کس طرح ایک ہمدرد اور اچھے انسان ہو سکتے ہیں۔ عرب بھی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔

یہی کام خسرؔو نے کیا ہے:

کاش ماہ تو ہم بچہ بودی

در رحم طفل ہشت مہ بودی

(یعنی کاش تو بھی بیٹا ہوتی اور رحم مادر میں ابھی آٹھ مہینے کی ہوئی)

عام طور سے آٹھ مہینے کا بچہ زندہ نہیں رہتا۔

یہاں پر تقی عابدی لکھتے ہیں:

"اس ایک شعر نے خسرؔو کی انسانی، اخلاقی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی قدروں پر سوالیہ نشان لگا دیا کہ خسرؔو بھی عرب کے دورِ جاہلیت کے قبیلوں کی طرح بیٹی کے وجود کو کسرِ شان اور خاندانی ننگ سمجھتے تھے۔"[۵]

یہاں چند نکات قابلِ توجہ ہیں:

1. علامہ شبلی کا یہ شعر مثنوی مجنوں و لیلیٰ کا نہیں بلکہ مثنوی مطلع الانوار سے ہے۔[۵]
2. جس لڑکی کے لیے وہ کہہ رہے ہیں وہ سات سال کی نہیں بلکہ سات مہینے کی تھی۔[۶]
3. علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ خسرؔو کو بڑا رنج ہوا یہ بات صحیح نہیں ہے ایک بہت بڑا الزام ہے جو خسرؔو پر لگا۔
4. یہ خسرؔو کا اسلوب تھا کہ جو معاشرے کی برائیاں تھیں ان کو اپنے اوپر لے کر اس کی صفائی پیش کرتے تھے یعنی جب خسرؔو کی بیٹی پیدا ہوئی تو اس زمانے میں ہر شخص کی

خواہش ہوتی تھی کہ اس کے صرف بیٹا ہی پیدا ہو۔ بیٹی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔
خسرؔو نے بھی اسی لیے اس زمانے کے ماحول کو دیکھتے ہوئے کہا تھا:

ای زعفت فگندہ برقع نور

ہم عفیفہ بنام وہم مستور

یعنی خسرؔو نے اس شعر میں اُس زمانے کے طور طریقوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام طور پر معاشرے میں رائج تھے معاشرے کی تنگ نظری کی طرف اشارہ کر کے خسرو آگے چل کر کہتے ہیں: اے بیٹی تو، تو میرے بیٹوں سے بڑھ کر عزیز ہے، تو ہمارے خاندان، جو ایک سیپی کے مانند ہے اس کے اندر کا قیمتی موتی ہے۔ جس طرح سیپی کی وجہ سے موتی کی قدر ہوتی ہے اُسی طرح تیری وجہ سے خاندان کی قدر ہے۔ بیٹی تیرے پیر میری آنکھوں پر ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو خدا دیتا ہے سوچ سمجھ کر دیتا ہے۔ آخر میری ماں بھی تو بیٹی ہی تھیں۔ میرا باپ بھی تو بیٹی ہی سے پیدا ہوا تھا۔

تقی عابدی نے اپنے مضمون ''کلام خسرؔو میں مقام زن اور حقوق زن'' میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ خسرو کے جو آٹھ دس اشعار علامہ شبلی نے ''حیاتِ خسرؔو'' میں لڑکی کی پیدائش پر لکھے ہیں۔ ساری تحقیق اسی کے اردگرد گھوم رہی ہے۔ کسی خسرؔو شناس نے ابھی تک غالباً اس طرف اشارہ نہیں کیا ہے کہ یہ اشعار مطلع الانوار کے ہیں اور نہ یہ بتانے کی کوشش کی یہ خسرؔو کا اسلوب ہے۔ یعنی تمام خسرو شناس نے ظاہری طور پر ان آٹھ دس شعر پر اکتفا کیا۔ اکثر نے 53/اشعار کی پوری مثنوی پڑھنے کی زحمت نہیں کی۔ عام طور سے مطالب ایک دوسرے سے نقل کرتے ہوئے خسرو کی صرف ایک صاحبزادی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جب کہ خسرو کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا نام مستورہ دوسری کا نام عفیفہ تھا۔ تقی عابدی نے ان کی مثنوی سے دوسری بیٹی کا نام تلاش کیا جو مستورہ ہے۔ ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ خسرؔو وہ شخص ہے جس نے عورت کے حجاب اور اس کے فوائد سے متعلق 60/اشعار تحریر کیے جو عمدہ ہیں۔ لیکن علامہ شبلی نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

کیوں کہ ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق مغربی طرز کے پابند ہیں۔ وہ کسی موضوع کو لے کر اس کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ مشرقی تحقیق عام طور سے کسی بڑے دانشور محقق کی تحریر

سے آگے نہیں بڑھتی جو اس دانشور نے لکھ دیا وہ حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔ تحقیق کے معنی کھوج کے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی اپنے اس مضمون ''کلام خسرو میں مقام زن اور حقوق زن'' میں تحریر کرتے ہیں:

''ہماری اس تحریر کا مقصد یہ بھی ہے کہ صحیح تحقیقی نکات قارئین تک پہنچ جائیں۔ اگرچہ شبلی نعمانی نے ''حیاتِ خسروؔ'' میں ڈیڑھ دو صفحات اس موضوع پر لکھے ہیں لیکن تقریباً دو درجن کتابوں اور مقالوں میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے، جس سے خسرو کے صنف نازک سے متعلق خیالات سے غلط فہمی پیدا ہوئی جو خسرو جیسے انسان دوست شاعر کے ساتھ انصاف نہیں۔ یہ مسائل ''حیاتِ خسروؔ'' کے بعض جملوں، محدود نمونہ برداری اور تقریباً دو سو آٹھ اشعار سے صرف آٹھ منتخب اشعار پیش کرنے سے پیدا ہوئے۔ ہم جانتے ہیں شبلی مرحوم نے ستاون برس کی عمر میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ ستاون انجمنیں مل کر نہیں کر سکتیں لیکن یہ ہر دور کے ادیبوں، محققوں کا ادبی، تحقیقی اور اخلاقی فرض ہے کہ کسی بھی ایسی سہل انکاری نشاندہی کریں جس سے حقیقت اور صداقت کھل کر سامنے آ جائے ورنہ ابرو کی آرائش میں آنکھ کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور کسی کا اجلا دامن داغ دار ہو جاتا ہے۔[۸]''

لہٰذا یہ ناقدین ادب کی ذمہ داری تھی اور ہے کہ ان واقعات پر از سرِ نو غور کر کے حقیقت کو آشکار کریں۔ خسرو پر جو عورت مخالف ہونے کا الزام عائد ہوتا ہے اس کو خسرو ہی کے اشعار سے واضح کرنا محققین کا کام ہے۔ خسرو نے جہاں ایک طرف بیٹیوں کی تعریف کی وہاں دوسری جانب ماں کی عظمت پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ خسرو نے ایک مرثیہ اپنی ماں کی موت پر لکھا ہے جس میں ماں کے قدموں میں بہشت کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ خسرو نے بھی اپنے اشعار میں ماں کے پیر کے نیچے بہشت کا ذکر کیا ہے۔ خسرو کہتے ہیں:

ہر جا کہ ز پای تو غبار یست
ما زار بہشت یادگار یست[۹]

ممکن ہے اُردو میں انیسؔ نے بھی ماں کے پیر کے نیچے جنت کا تصور خسروؔ ہی سے اخذ کیا ہو۔ ''سنتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے۔''

تقی عابدی نے اس 31 صفحات کے مضمون میں ان اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے بیٹیوں کی عظمت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جہاں خسروؔ نے بعض مقامات پر بیٹیوں کو بیٹوں سے افضل بتایا ہے۔

تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق خسروؔ اپنی سات سالہ بیٹی مستورہ کو اپنے دل کے باغ کا خوب ترین میوہ کہتے ہیں۔

خوب ترین میوہ زباغ دلم[۱۰]

ایک جگہ خسروؔ اسی مثنوی کے درج ذیل شعر میں بیٹی کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

گرچہ اخوان تو نیک اخترند
نی ز تو در دیدۂ بھترند[۱۱]

اگر چہ تیرے بھائی سب نیک صفات ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی میری نظر میں تجھ سے بہتر نہیں۔

ایک اور مقام پر اسی مقالے میں تقی عابدی نے مرد و زن کا مقابلہ کرتے ہوئے اس شعر کو نقل کیا ہے:

مرد اگر یک فراغہ کار کند
زن بکف بانوئی ہزار کند[۱۲]

مرد اگر ایک کام کرتا ہے تو گھر میں رہنے والی خاتون ہزار کام کرتی ہے۔

نہ جانے کتنے ایسے اشعار خسروؔ نے لکھے ہیں جس سے عورت کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس اس طرح توجہ نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ان تمام نکات کی طرف ان صفحوں میں توجہ دلانے کی سعی کی ہے اور اپنی تحقیق کو مغربی اور مشرقی طرز کی تحقیق قرار دیا ہے۔

اسی طرح کے اور نکات سے بھی پردے اٹھائے گئے ہیں۔ اب یہاں پر ڈاکٹر تقی عابدی کی ''غالب شناسی'' کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ''غالب شناسی'' ڈاکٹر تقی عابدی

کا ایک معتبر موضوع ہے۔ تقی عابدی نے غالب کے حوالے سے 2006ء میں دہلی سے ''غالب دیوانِ نعت و منقبت'' شائع کیا[13]۔ جس میں غالب کی حمد و نعت و منقبت ترجمہ کے ساتھ پیش کیں۔ یہ کتاب اب دستیاب نہیں ہے البتہ ڈاکٹر عابدی کی ویب سائٹ www.drtaqiabedi.com پر سوفٹ کاپی ''غالب دیوانِ نعت و منقبت'' کے نام سے موجود ہے۔ صفحہ نمبر 51 پر ایک جدول دیا گیا ہے جس میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ اس میں نعتیں، منقبتیں، حمدیں کتنی ہیں، یہ تمام معلومات اس جدول میں موجود ہیں۔ ابھی تک کسی نے ''غالب کا دیوانِ نعت و منقبت'' شائع نہیں کیا۔ اس میں کل اشعار کی تعداد 2888 ہے۔ ابھی تک غالب کی صرف ایک نعت کا ذکر ہی ملتا تھا لیکن تقی عابدی نے بتایا کہ غالب کی آٹھ نعتیں ہیں، دو حمدیں تین مناجاتیں اور سولہ منقبتیں ہیں، غالب کے اُردو اور فارسی کے مذہبی اشعار جو حمد و نعت، مرثیہ اور مناجات پر مشتمل ہیں ان کی تعداد 2888 ہے۔ جدول میں یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ غالب کی فارسی حمد و مناجات کا اُردو ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ غالب کا ''معراج نامہ'' 281 اشعار پر مشتمل ہے جس سے عوام تو کیا خواص بھی نا آشنا تھے۔ تقی عابدی کی وجہ سے لوگوں نے اس پر گفتگو کی ہے۔ ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ تقی عابدی نے بتایا کہ علامہ اقبال نے نوائے غالب کو ''جاوید نامہ'' میں اسی بنیاد پر اسی فلک پر رکھا ہے[14]۔ جس کا ذکر ''معراج نامہ'' میں غالب کر چکے ہیں کہ کعبہ کے اطراف میرے اجداد صف بنا کر کھڑے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے ''معراج نامہ'' سے اقبال واقف تھے مگر اقبال نے غالب کے ''معراج نامہ'' کا ذکر نہیں کیا۔ اقبال نے ''جاوید نامہ'' کی وجہ تصنیف میں تین کتابوں کا ذکر کیا اس میں ایک ابوالعلاء معری کی ''الغفران'' دوسرے ڈانٹے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' اور تیسری ابن العربی کی ''فتوحات مکیہ''۔

دوسری بات یہ کہ تقی عابدی کیوں کہ میڈیکل ڈاکٹر ہیں اور کئی مقالات ادب اور میڈیسن سے متعلق لکھ چکے ہیں اس لیے وہ مغربی اور مشرقی تحقیقی اور تنقیدی نظریہ کو سامنے رکھ کر کتابیں لکھتے ہیں اسی وجہ سے ان کے ہر صفحے پر حوالہ ملتا ہے۔ جب کہ یہ عادت ہمارے برصغیر میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے جو پورا کریڈٹ اپنے اوپر لینا چاہتے ہیں۔ تقی عابدی کی تحقیق کا اندازہ مغرب و مشرق سے ملا جلا انداز ہے۔ مشرق میں ایک اور تشنگی باقی

رہتی ہے یعنی سب کو پوری طرح سے نتیجے تک نہیں پہنچاتے جب کہ مغرب میں لوگ نتیجے پر پہنچا کر اپنا نظریہ بھی پیش کرتے ہیں۔ تقی عابدی اپنی تحقیق وتنقید میں حوالہ جات اور نتائج کے ساتھ مسئلہ کو قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں تا کہ وہ اپنا نظریہ پیش کرے۔ لیکن وہ اپنی رائے دینے سے گریز نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے تقی عابدی کی کتابیں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

تقی عابدی کا غالبیات کے عنوان پر ایک اہم کارنامہ 2008ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے تحت ''کلیات غالب فارسی'' کی تدوین اور ترتیب مع دوسو صفحات کے مقدمے کے ہے[15]۔ تقی عابدی نے تصحیح کے دوران (جدول) بنایا اور غالب کے قطعات، رباعیات، ترکیب بند اور قصائد وغیرہ کی پوری تفصیل اس جدول میں بیان کی۔ غالب کے کل اشعار کی تعداد اس کلیات میں 11337 بتائی ہے[16]۔

پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی مرحوم کو کلیات تصحیح ہونے کے بعد اظہار نظر کے لیے دی گئی تو انھوں نے سب کی موجودگی میں ایک جملہ ڈاکٹر تقی عابدی کی تصحیح کلمات سے متعلق کلیات کی رونمائی کے موقع پر کہا تھا کہ جو کام پروفیسر وزیر الحسن عابدی نے شروع کیا تھا وہ کام تقی عابدی نے مکمل کیا۔

اب تقی عابدی کی تحقیق وتنقید نکات پر بحث کی جاتی ہے۔ غالب ایک مقام پر لکھتے ہیں:

غالب سوختہ جان گرچہ نریزد بشمار
ہست در بزم سخن ہم نفس و ہم دم شان

اگرچہ غالب بدنصیب کسی شمار کے قابل نہیں لیکن پھر بھی بزم سخن میں ان عظیم شعرا کا ہمدم وہم نفس ہے[17]۔

غالب کا یہ دعویٰ، غالب کے شاگرد حالی کو جو غالب کی منزلت شعری جانتے تھے پسند نہیں آیا۔ حالی نے غالب کی اس انکساری کے جواب میں غالب کی وفات پر ''مرثیہ غالب'' لکھا تو اس میں اس انکساری کا جواب یوں دیا۔ تقی عابدی ''کلیات غالب فارسی'' کے صفحہ 40 پر لکھتے ہیں:

''مولانا حالیؔ نے جو خود برصغیر کی شاعری کے نباض اور نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں جن کی شاہکار تصنیف ''یادگارِ غالبؔ'' عمدہ ترین غالبؔ کے فن پر ریویو مانی جاتی ہے، کہتے ہیں:

''قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں

•••

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

•••

غالبؔ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسمان سے کیا نسبت''

یہ ہے وہ تقابل جسے تقی عابدی نے پیش کیا ہے۔

غالب پر ایران میں قابل قدر کام نہیں ہوا کیوں کہ ایرانیوں نے غالبؔ کو زیادہ اہمیت نہیں دی اس لیے کم کام ہوا۔ ڈاکٹر حسن حایری نے غالبؔ پر کچھ کام کیا ہے۔ حسن حایری نے ''تحول فارسی در شبہ قارہ'' کے عنوان سے سومنات خیالی میں غالبؔ کے طرز بیان اور سبک کے متعلق اس طرح لکھا ہے۔ جس کو تقی عابدی نے ''کلیات غالبؔ فارسی'' کے ص 33 پر نقل کیا ہے:

''بدون تردید غالبؔ در شمار نویسندگانی است کہ در تحول نثر فارسی شبہ قارہ موثر افتادہ او با نگارش ''پنج آہنگ''، ''دستنبو''، ''مہر نیم روز''، ''درفش کاویانی'' در زمینہ ھای نثر ''منشیانہ'' تاریخی، علمی، ادبی و انتقادی شیوہ ای دل بست و روشی دل پذیر و سبکی دل انگیز عرض دا است۔ بدان سان کہ صاحب نظران را قبول افتادہ است و سبک شناسان را مطلوب تا جای کہ می توان گفت کہ او ''شیوۂ نگارشی اختراع کرد کہ بہ نام ''سبک غالبؔ'' معروف شد''۔[18]

''غالبؔ کا شمار کسی شک کے بغیر ان قلم کاروں میں ہوتا ہے جن کا کام برصغیر کی فارسی نگاری کے ارتقا میں خاص اثر رکھتا ہے۔ غالب نے اپنی تصانیف ''پنج آہنگ''، ''دستنبو''، ''مہر نیم روز''، ''درفش کاویانی'' اور ''منشایہ'' نثر میں تاریخی، علمی، ادبی اور انتقادی دلچسپ پسند اور دل آویز طریقہ کار اختیار کیا جسے فارسی کے اساتذہ نے قبول کیا اور یہ غالبؔ کا اسلوب ان کے سب کی پہچان بن گیا جسے سب شناسان نے قبول کیا چناں چہ غالبؔ کے ایجاد کردہ طرز بیان کا نام ''سبک غالبؔ'' کے نام سے معروف ہوا۔''

حسن حایری غالبؔ کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ غالبؔ کے یہاں تضاد پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ ایک جگہ لکھتے ہیں میں ایرانیوں کو استاد مانتا ہوں اور دوسری جگہ لکھتے ہیں ایرانی کیا ہیں؟

تقی عابدی کلیات میں حسن حایری کے غالبؔ سے متعلق تضاد کے سلسلے میں درج ذیل اشعار کا حوالہ دیتے ہیں:

''غالبؔ نے مثنوی باد مخالف میں فارسی زبان کی سند کو ایرانی شاعروں سے منسوب کیا ہے۔ غالبؔ معمولی ہندوستانی شعراء کو اہمیت نہیں دیتے۔

کہ زاھل زبان نبود قتیل
ہر گز از اصفہان نبود قتیل

کاین زبان خاص اہل ایران است
مشکل ما وسہل ایران است

•••

سخن است آشکار و پنہان نیست
دہلی و لکھنو ز ایران است

•••

دامن از کف کنم چگونہ وھا
طالبؔ و عرفیؔ و نظیریؔ را

خاصه روح و رواں معنی را
آن ظہوری جہاں معنی را [19]

قتیل اہل زبان نہیں وہ اصفہانی نہیں فارسی زبان ایران کی زبان ہے۔ اور اس کی سند ایرانیوں سے ملے گی۔ یہ بات روشن ہے کہ دہلی اور لکھنؤ ایران نہیں ہو سکتے اس لیے طالب آملی، عرفی شیرازی اور نظیری نیشاپوری کا میں دامن نہیں چھوڑ سکتا خصوصاً ظہوری جو خود ایک جہان معنی ہوتے ہوئے معنی آفرین کی روح و جان ہے۔

یہاں غالب کہہ رہے ہیں کہ میں ایرانیوں کو سند مانتا ہوں، استاد مانتا ہوں اور دوسری جگہ دیکھئے کیا کہتے ہیں:

شیخ شوکت عرفی کہ بود شیرازی
مشو اسیر جلالی کہ بود خوانساری

•••

بہ مومنات خیالم در آی تا بینی
روان فروز برو دوش ہای زناری [20]

غالب کہتے ہیں عرفی کو شیرازی ہونے کی بنا پر اور اسیر کو خوانساری ہونے کی وجہ سے اہمیت مت دو۔ میرے ''سومنات خیال'' میں آ کر دیکھو کہ میری دوش سے کیسے تجلی نکل رہی ہے۔

حایری کہتے ہیں غالب کا تضاد یہی ہے کہ ایک طرف کہہ رہے ہیں معنی آفرینی جو میرے پاس ہیں نہ عرفی کے پاس ہیں نہ زلالی کسی کے پاس۔ وہیں دوسری طرف کہہ رہے ہیں زبان میں ایرانیوں کو استاد مانتا ہوں۔ اور ایک مقام پر کہہ رہے ہیں کہ:

زلہ بردار کس چرا باشم
من ہمایم مگس چرا باشم

''میں کیوں کسی کے دسترخوان کے بچے ٹکڑوں پر زندگی کروں، میں ہما ہوں تو پھر مکھی کی زندگی کیوں بسر کروں [21]''

اسی تضاد کا ذکر تقی عابدی نے کر کے جواب میں کہا کہ یہاں مسئلہ تضاد کا نہیں ہے

بلکہ غالبؔ یہ کہہ رہے ہیں کہ لسانیات اور ہیئت میں ایرانیوں کو استاد مانتا ہوں۔ یعنی قصیدہ، مرثیہ غزل یہ سب ہمارے ایران سے آئے ہیں لیکن جہاں تک معنی آفرینی کا تعلق ہے وہ ہماری زمین سے جڑا ہوا ہے۔ ہماری بھومی سے جڑا ہے تو یہ تضاد نہیں ہے۔

تقی عابدی نے حسن حایری کے اس تضاد کا جواب ایران کے تالار وحدت میں کلیات فارسی کی رسم رونمائی کے موقع پر دیا جب یہ کتاب ایران سے شائع ہوئی تو ایرانیوں نے اس کے مقدمے کا فارسی میں ترجمہ کرا کر تہران سے بھی شائع کی اور اس کی رسم رونمائی تہران کے مشہور آڈیٹوریم تار وحدت میں ہند و پاک کے سفراء کے ساتھ ایران کی معزز شخصیات کی موجودگی میں عمل میں آئی۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے نکات ہیں جو تقی عابدی نے مقدمے میں پیش کیے ہیں۔

تقی عابدی نے اس مقدمے میں کئی مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ

کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

یعنی وہ فارسی ہو یا اُردو، غالبؔ کا اندازِ بیان جداگانہ ہے۔ غالبؔ کے اندازِ بیان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بہت سے تورانی الفاظ کی معلومات ہو۔ یعنی ایک ایرانی اور تاجکی صحیح طرح سے اس کے اصل معنی تک پہنچ سکتا۔ جس کو بہت سی مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ فارسی کے حوالہ سے تقی عابدی نے ''مصحف فارسی دبیرؔ'' شائع کی۔[22] علاوہ ازیں ایک کتاب ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے'' کے عنوان سے بھی شائع ہوئی۔ اس میں سورہ اخلاص کے 115 / فارسی اشعار کا سلیس اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ تراجم کے علاوہ حالیؔ کا فارسی دیوان بھی جو تقریباً چھ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ حالیؔ پر تقی عابدی کی چار کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں ''مسدس حالیؔ''، ''کلیات حالیؔ''، ''حالیؔ فہمی''، ''بچوں کے حالیؔ'' شامل ہیں اور تین زیرِ طبع ہیں۔

کل ملا کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان سے ہزاروں کلومیٹر دور کینیڈا میں بیٹھ کر ڈاکٹر تقی عابدی اُردو ادب کے ساتھ فارسی کی خدمت بھی بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

مختلف یونیورسٹیوں میں ڈاکٹر عابدی پر PhD اور کئی M.Phil وغیرہ پر مقالات

لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں۔

جہاں تک غالبؔ کا مسئلہ ہے اگر ہمارے ناقد چاہتے ہیں کہ غالبؔ کو شیکسپیئر، ہومر وغیرہ کے مقابل کھڑا کریں تو انھیں غالبؔ کے فارسی اشعار کو سمجھنا ہوگا۔ بغیر فارسی کے غالبؔ کا اُردو کلام اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا۔ غالبؔ اپنے اُردو کے اشعار کی بنا پر غالبؔ نہیں بلکہ غالبؔ کو غالبؔ بنانے میں ان کے فارسی اشعار کا بھی کمال ہے۔

غالبؔ خود فرماتے ہیں:

فارسی بہین تا بہینی نقش ھای رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگ من است

•••

حواشی اور منابع:-

۱۔ ''شہید''، استاد مرتضیٰ مطہری، سازمان تبلیغات اسلامیہ شعبہ بین الملل ایران، ۱۴۰۳ھ
۲۔ ''حیاتِ خسروؔ''، مولانا شبلی مرحوم، ادبی پریس لکھنؤ، بھارت 1922ء
۳۔ ایضاً، ص:24
۴۔ ماہنامہ ''انشاء''، صفحہ:66، مطبوعہ کلکتہ، بھارت 2015ء، ایڈیٹر ف.س. اعجاز
۵۔ ''خمسۂ امیر خسرو دہلوی''، ص:142، انتشارات شاہق، مطبوعہ تہران، ۱۳۶۲ف، ایران
۶۔ ماہنامہ ''انشاء''، مضمون سید تقی عابدی، ص:69، مطبوعہ کلکتہ، بھارت، ایڈیٹر ف. س. اعجاز
۷۔ ایضاً، ص:70
۸۔ ایضاً
۹۔ ''حیاتِ خسروؔ''، مولانا شبلی مرحوم، ص:26، ادبی پریس لکھنؤ، بھارت، 1922ء
۱۰۔ ماہنامہ ''انشاء''، ص......، مطبوعہ کلکتہ، بھارت، ایڈیٹر ف.س. اعجاز

۱۱۔ ''خمسہ امیر خسرو دہلوی''، انتشارات شایق، مطبوعہ تہران ۱۳۶۲ف، ایران
۱۲۔ ''خمسۂ امیر خسرو دہلوی''، انتشارات شایق، مطبوعہ تہران ۱۳۶۲ف، ایران
۱۳۔ ''غالب دیوانِ نعت و منقبت''، سید تقی عابدی، شاہد پبلیکشن، دہلی، 2006ء
۱۴۔ ''غالب دیوانِ نعت و منقبت''، ص:190، شاہد پبلیکشن، دہلی، 2006ء
۱۵۔ ''کلیات غالب فارسی''، ڈاکٹر سید تقی عابدی، اصیلا پریس دہلی، 2008ء
۱۶۔ ''کلیات غالب فارسی''، ڈاکٹر سید تقی عابدی، ص:13، جلد اول، اصیلا آفسیٹ پریس دہلی، 2008ء
۱۷۔ ''کلیات غالب فارسی''، ڈاکٹر سید تقی عابدی، ص:31، جلد اول، اصیلا آفسیٹ پریس دہلی، 2008ء
۱۸۔ ''سومنات خیالی''، محمد حسن حایری، ص:19، مؤسسہ امیر کبیر تہران ۱۳۸۱ف
۱۹۔ ''کلیات غالب فارسی''، ڈاکٹر سید تقی عابدی، ص:34، جلد اول، اصیلا آفسیٹ پریس دہلی، 2008ء
۲۰۔ ''دیوانِ غالب''، ص:11، تحقیق و تصحیح تقی عابدی، انتشارات باز ۱۳۸۹ف
۲۱۔ ''کلیات غالب فارسی''، ڈاکٹر سید تقی عابدی، ص:34، جلد اول، اصیلا آفسیٹ پریس دہلی، 2008ء
۲۲۔ ''مصحفِ فارسی دبیر''، مطبوعہ شاہد پبلیکشن

زاہدہ حنا
روز نامہ ''ایکسپریس'' لاہور
13 / نومبر 2019ء

جاوید نامہ: ڈاکٹر تقی عابدی کی نظر میں

نومبر اور دسمبر وہ مہینے ہوتے ہیں جب ہمارے یہاں ادبی محفلوں اور سیمیناروں کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ وہ ادیب اور دانشور جو مختلف براعظموں سے آتے ہیں، ان کی بات ایک طرف رہی، ہندوستان سے آنے والے ادیبوں اور دانشوروں سے ملک اور شہر کی فضا خوش گوار ہو جاتی ہے۔ مختلف موضوعات پر بحث مباحثہ سوئے ہوئے ماحول میں جان ڈال دیتا ہے۔ لوگ منتظر رہتے ہیں کہ اب انھیں کس کی شاعری سننے کو ملے گی اور کس کے خیالات سے وہ استفادہ کریں گے۔

اس برس ماحول پر قدرے سناٹا ہے اور وجہ اس کی سیاست ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان سیاسی کشیدگی ادیبوں کی آمد و رفت پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ اس تناظر میں دیکھیے تو ڈاکٹر تقی عابدی کی پاکستان آمد بادِ نسیم کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ ہم سب کی خوش نصیبی ہے کہ وہ پیدا ہندوستان میں ہوئے، کینیڈا کی شہریت اختیار کی، یہی سبب ہے کہ وہ پاکستان آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان دنوں وہ پاکستان میں ہیں۔ کبھی کراچی یونیورسٹی میں لکچر دے رہے ہیں اور کبھی انجمن ترقی اُردو کے ''اُردو باغ'' میں افکارِ اقبال پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں اور کبھی لاہور کی ادبی محفلوں میں شریک ہو رہے ہیں۔

پیشہ ان کا دل وجگر کے زخم سینا ہے اور شوق انھیں اُردو اور فارسی کے شعر و ادب میں اپنے جوہر دکھانا ہے۔ چند دنوں پہلے وہ ''اُردو باغ'' آئے اور وہاں انھوں نے علامہ اقبال کے اہم ترین فارسی کلام ''جاوید نامہ'' پر ایک توسیعی لکچر دیا۔ ان کی باتیں پرہجوم محفل نے ذوق وشوق سے سنیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ موضوع کتنا ہی ثقیل کیوں نہ ہو، بولنے والا اگر

موضوع کو پانی کر دے تو لوگ اس کی بات سننے میں منہمک رہتے ہیں۔

انھوں نے اپنا تحقیقی اور تخلیقی سفر حضرت امیر خسرؔو کی شاعری کے اسرار و رموز کو سمجھنے اور سمجھانے سے شروع کیا تھا۔ 2010ء میں ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی، شکاگو میں انھوں نے ''اقباؔل کے عرفانی زاویے'' پر گفتگو کی۔ جامعہ اسلامیہ، دلّی میں ان کا توسیعی لکچر ''حقوق انساں کلام امیر خسرؔو'' کے موضوع پر تھا جس کی بہت شہرت ہوئی۔

2018ء میں انھوں نے کراچی اور لاہور میں اقباؔل اور فیضؔ پر توسیعی لکچر دیے۔ ساہتیہ اکادمی، دلّی نے 2018ء میں عبدالرحمٰن بجنوری پر سیر حاصل گفتگو کی۔ حیدر آباد دکن کی مولانا آزاد یونیورسٹی میں انھوں نے برصغیر کے اہم شاعر گلزاؔر کی ''تروینی'' پر 2018ء میں کلیدی خطبہ دیا۔

2018ء میں ہی انھوں نے فیضؔ انٹرنیشنل فیسٹیول لاہور میں شرکت کی اور اسی تسلسل میں وہ ہمیں اقباؔل اکادمی لاہور میں ''مغرب میں اقباؔل شناسی کی حالیہ روایت'' کے موضوع پر لکچر دیتے سنائی دیتے ہیں۔ انھوں نے غالبؔ کا فارسی کلام مرتب کیا، اسی طرح ہندو شعرا کی منقبت، سوز اور سلام یکجا کیے۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی رباعیات کو مرتب کرنا اور ان کا تجزیہ عابدی صاحب کا ایک اہم کام ہے۔ ان کی ضخیم کتاب ''فیضؔ فہمی''، فیضؔ صاحب کی زندگی اور شاعری پر وقیع اضافہ ہے اور اب وہ فیضؔ کی باقیات مرتب کر رہے ہیں۔

ان کے اس مختصر تعارف سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے زندگی کس طرح حکمت و دانش اور بڑے شاعروں کے اشعار کی گرہیں کھولتے ہوئے بسر کی۔ وہ یوپی میں پیدا ہوئے لیکن 4 برس کی عمر سے حیدر آباد دکن میں رہے۔ وہاں انھوں نے اپنی تعلیم عثمانیہ یونیورسٹی سے مکمل کی اور پھر مغرب کا رخ کیا۔

اگر ہم ''جاوید نامہ'' پر نظر کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ نظم مناجات سے شروع ہوتی ہے اور جاوید (ان کے بیٹے کا نام) سے خطاب پر تمام ہوتی ہے۔ شاعر ایک شام دریائے نیکر کے کنارے ٹہل رہا ہے اور مولانا رومؔ کے اشعار گنگنا رہا ہے کہ مولانا رومؔ کی روح نمودار ہوتی ہے۔

اقباؔل اور مولانا رومؔ کا مکالمہ چلتا ہے۔ وہ مختلف افلاک کی سیر کرتے ہیں۔ ان

افلاک پر ان کی ملاقات کئی ارواحِ جلیلہ اور ارواح خبیثہ سے ہوتی ہے۔ ''جاوید نامہ'' کا وہ حصہ بہ طور خاص توجہ کا طالب ہے جس میں اقبالؔ کی ملاقات فلک مشتری میں غالبؔ، حسین ابن منصور حلاجؔ اور قرۃ العین طاہرہ سے ہوتی ہے۔ اس سیر میں ''انا الحق'' پر اور ''خودی'' پر بحث ہوتی ہے۔ ہمارے دانشوروں نے ''جاوید نامہ'' کی اس سیر پر خصوصی توجہ دی ہے۔ یہی وہ سیر ہے جس میں اقبالؔ جدید سیاست کے اہم کرداروں کے بارے میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا کہنا ہے کہ علامہ نے کبھی صرف ایسی شاعری نہیں کی جو ادب برائے ادب ہو۔ اسی لیے ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر میں خواجہ حسن نظامی کی طرح نثر لکھ سکتا تو کبھی شاعری کو اپنے پیام کا ذریعہ نہیں بناتا۔ علامہ صرف فن برائے فن کے قائل نہ تھے بلکہ فن کی قدرت سے انسانیت کے جوہر منوانے کے قائل تھے۔

علامہ شاعرِ انسانیت ہیں، اقبالؔ شاعرِ حیات ہیں، اپنے ایک خط میں سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں: ''میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی، ہاں بعض مقاصد رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔'' اقبالؔ کا مقصد انسان کو بلندیوں تک پہنچاتا ہے تاکہ وہ نیابتِ الٰہی کا فریضہ ادا کر سکے اور دُنیا میں صحیح معنوں میں حکومتِ الٰہیہ قائم ہو سکے۔ اقبالؔ کے پاس انسانی عظمت کا اقرار خدا کی عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔ جب جنگ عظیم اول کے بعد کمزور ملکوں کو پامال کیا جا رہا تھا، اُس وقت یہ اشعار انسانی اقدار کے نقیب بن کر ظاہر ہوئے:

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی
کس نباشد در جہان محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں این است و بس

یعنی کوئی دُنیا میں کسی کا محتاج نہ رہے اور دین الٰہی کا اصلی پیغام یہی ہے۔ کیوں کہ بقول مولانا رومؔ:

آنچہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

جو چیز شیروں کو لومڑی صفت بنا دیتی ہے، وہ صرف اور صرف ضرورت اور احتیاج ہے۔ اقبالؔ انسان کو کھویا ہوا مرتبہ دلانے کے خواہاں ہیں، وہ انسان کی خودی کو ارتقا کے منازل پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں:

منکرِ حق نزد مُلّا کافر است
منکرِ خود نزد من کافر تر است

یعنی اللہ کا منکر مُلّا کے نزدیک کافر ہے اور اپنی خودی کا منکر اور انکار کرنے والا میری نظر میں بڑا کافر ہے۔ پھر فرماتے ہیں:

آنچہ در عالم نگنجد آدم است
آنچہ در آدم نگنجد عالم است

یعنی عالم اور کہکشاں میں آدمی سما نہیں سکتا لیکن آدمی میں عالم اور کہکشاں سما دیے جا سکتے ہیں یعنی انسان کے مقابلے میں کہکشاں ناچیز ہے۔ آفاق انسان سے چھوٹے اور کمزور ہیں بشرطیکہ انسان بیداری اور خودی کی بلندی پر ہو۔ علامہ کے نظریے کے تحت بیداری دل اصلی ایمان ہے۔ فرماتے ہیں:

کافری بیدار دل پیشِ صنم
بہ ز دینداری کہ خفت اندر حرم

یعنی ایک کافر بیدار دل کے ساتھ اپنے بت کے سامنے اُس مسلمان سے بہتر ہے جو کعبہ میں سو رہا ہے۔ آگے ''جاوید نامہ'' میں فرماتے ہیں:

دین حق از کافری رسوا تر است
زانکہ مُلّا مومن کافر گر است
دین کافر فکر و تدبیر جہاد
دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

یعنی دینِ حق کفر و کافری سے رسوا تر ہو چکا ہے کیوں کہ ہمارا مُلّا مومنوں کو کافر بنا

رہا ہے۔ انھیں کفر کی تعلیم دے رہا ہے۔ ایک طرف کافر، جہاد اور لڑائی کی فکر اور تدبیر میں مشغول ہیں تو دوسری طرف ہمارا املاً مسلمانوں میں اللہ کے نام پر فساد برپا کر رہا ہے۔

''جاوید نامہ'' کو علامہ مصور کروانے کے بھی خواہش مند تھے، چناں چہ اپنے مکتوب 31/مارچ 1933 میں لکھتے ہیں: ''اہم کام یہ ہے کہ ''جاوید نامہ'' کا تمام وکمال ترجمہ کیا جائے۔ مترجم کا اس سے یورپ میں شہرت حاصل کر لینا یقینی امر ہے۔ اگر ترجمہ ہو جائے اور اگر اس ترجمے کو کوئی عمدہ مصور بنا دے تو یورپ اور ایشیا میں مقبول تر ہوگا۔ اس کتاب میں تخیلات نئے ہیں اور مصور کے لیے عمدہ مسالہ ہے۔''

پھر علامہ اپنے ایک اور خط مورخہ 25/جون 1935 میں کاظمی کو لکھتے ہیں: ''میرے خیال میں میری کتابوں میں صرف ''جاوید نامہ'' ایک ایسی کتاب ہے جس پر مصور طبع آزمائی کرے تو دُنیا میں نام پیدا کر سکتا ہے مگر اس کے لیے مہارت فن کے علاوہ الہام الٰہی اور صَرفِ کثیر کی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب یہ چیز ایسی شان کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو دُنیا یقینی طور پر اس کو کاظمی اسکول کے نام سے موسوم کرے گی۔ آپ محض مصوری میں اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ دُنیائے اسلام میں بحیثیت مصور اقبالؔ ایک زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں جو کہ قدرت شاید آپ ہی سے لینا چاہتی ہے۔ پوری مہارتِ فن کے بعد آپ نے ''جاوید نامہ'' پر خامہ فرسائی کی تو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔''

اس روز ''جاوید نامہ'' کے موضوع پر جناب شاداب احسانی، جناب عقیل عباس جعفری اور ڈاکٹر رخسانہ صبا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ صدر انجمن جناب واجد جواد نے مختصراً گفتگو کو سمیٹا اور ایک یادگار محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔

اشفاق حسین
کینیڈا

انشا فہمی کا ایک سنگِ میل

یوں تو اُردو کی نئی بستیوں خصوصاً شمالی امریکہ میں شعر و شاعری کے چراغ بہت ابتداء ہی سے جگمگا رہے ہیں لیکن نثر کے میدان میں ابھی بڑی گنجائش پائی جاتی ہے۔

سنجیدہ ادب تخلیق کرنے والے اپنے آپ کو صرف تخلیق شعر تک ہی محدود نہیں رکھ سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اُردو کے مخصوص سماجی حالات کی روشنی میں شاعری کے پودے نے قبولیتِ عام کا درجہ حاصل کرلیا اور اس کی شاخوں پر بہت سے بیل بوٹے اور پھل پھول نکل آئے لیکن اس زبان کا دامن نثر کے سرمائے سے بھی ہمیشہ مالا مال رہا ہے۔ صرف تخلیق نثر ہی نہیں بلکہ تنقید و تحقیق کے کمالات بھی اس زبان میں پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی چمک دمک دکھلا رہے ہیں۔ البتہ شمالی امریکہ میں بیشتر لکھنے والے شاعری کے پودے کی آبیاری میں زیادہ مصروف نظر آتے ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے ان میں سے بیشتر لکھنے والے نثر کی طرف بھی مائل ہوئے ہیں اور اب یہاں کے ادبی سرمائے میں نثری کاوشوں کے بیل بوٹے بھی نظر آنے لگے ہیں۔ یہ منظر بہت زیادہ امید افزا نہ ہوتے ہوئے بھی قابلِ توجہ ضرور ہے۔ اس منظر میں تخلیقی نثر کی کرشمہ کاریوں کو جن میں ناول، افسانہ، ڈرامہ وغیرہ شامل ہیں بڑی آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ البتہ مستشرقین کو مستثنیٰ کرکے دیکھا جائے تو تحقیق کا میدان بالکل صاف نظر آتا ہے۔ اس کمی کو کینیڈا میں مقیم اُردو زبان و ادب کے بے مثال خدمت گزار ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ گو کہ ان کا تعلق طب کی دُنیا سے ہے مگر اُردو کے تحقیق سرمائے پر ان کی نظر بڑی گہری ہے۔ اس بات کا اندازہ ان کی تحقیق تصانیف سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ اس میدان میں ان کی خدمات پاک و ہند کے کسی بھی محقق اور نقاد سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ

انھوں نے تن تنہا اس میدان میں جو کام کیا ہے اس نے شمالی امریکہ کے تحقیقی منظر نامے کو خاصا معتبر بنادیا ہے۔ زیرِ نظر تصنیف ''شاعر شیریں بیاں انشا اللہ خاں انشاؔ'' بھی ایک ایسی یادگار تحقیقی کتاب ہے اور اس کے مطالعے کے بعد یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ شمالی امریکہ میں اُردو کا تحقیقی سرمایہ اگرچہ مقدار میں کم ہے مگر معیار میں یقیناً کسی طرح بھی کم رتبہ نہیں ہے۔

کسی بھی مورخ یا محقق کے کام کو دو طرح سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ کیا مصنف نے مرحلہ وار مکمل تحقیق کے بعد کوئی نتیجہ نکالا ہے اور اپنی رائے قائم کی یا یہ کہ اپنے مطالعے اور مشاہدے کے نتیجے میں پہلے سے قائم کی ہوئی کسی رائے کے اثبات میں دلیلیں پیش کی ہیں؟ انشا اللہ خان انشاؔ کے بارے میں ڈاکٹر تقی عابدی کا پیمانہ دوسری طرح کی شراب سے بھرا ہوا ہے۔ اسے انشاؔ سے ان کی ایک عقیدت خاص کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کہیں کہیں ایک غیر جانبدار محقق پس پردہ چلا جاتا ہے اور ایک چاہنے والے اور مدّاح کا سراپا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مجرد تحقیقی فضا کے طلب گاروں کے لیے یہ صورت کوئی بہت خوش کن صورت نہیں لیکن اس سے ہٹ کر سوچنے والوں کا خیال ہے کہ کسی بھی لکھنے والے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ جس کے بارے میں لکھ رہا ہو اس کی شخصیت کے طلسم سے اپنے آپ کو بالکل علیحدہ کر سکے۔ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب بھی انشاؔ کی شخصیت میں پائی جانے والی محبوبیت کے طلسم سے خود کو علیحدہ نہ کر سکے۔ یہ خصوصیت جہاں ایک طرف ان کی اپنی شخصیت کے شفاف ہونے کی دلیل ہے تو دوسری طرف خود انشاؔ کی شخصیت کو بھی ابھارتی ہے۔ ایسے موقعہ پر وہ فیضؔ کی زبان میں یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

اس پسندیدگی اور محبت بلکہ عقیدت کے باوجود ان کی تحقیق کہیں بھی اعتدال کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔ وہ شروع سے آخر تک معروضی انداز میں انشاؔ کے فن، ان کی شخصیت، ان کے عہد اور ان کے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں اور نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنے پڑھنے والے کو اس راستے کی طرف لے جاتے ہیں جسے وہ تفہیمات انشاؔ کے سلسلے میں سیدھا اور سچا راستہ سمجھتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ایک صفحے، ایک ایک

لفظ اور ایک ایک حرف پر وہ پڑھنے والے کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ جس طرح پرندے اپنے بچوں کو اپنی چونچ سے دانہ کھلاتے ہیں بالکل اسی طرح عابدی صاحب انؔشا کے بارے میں ایک ایک معلومات ایک ایک جزئیات اور ایک ایک پہلو کو اپنے قاری کے ذہن میں اتارتے ہیں۔ اس پورے عمل میں آپ ان سے متفق نہ ہوں تب بھی ان کی صداقت رائے سے انکار نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے انؔشا کا مطالعہ بہت سلسلہ وار اور بڑی جامعیت سے کیا ہے۔ ان کا مرکزی نقطۂ نظر یہ ہے کہ انؔشا کی شاعری اور ان کے فن پر تنقیدی اور تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ انؔشا کی معجز بیانی کے عنوان سے لکھتے ہیں۔ انشا کا شمار اُردو کے ان آٹھ دس شاعروں میں ہوتا ہے جو دو ڈھائی صدی سے اُردو شاعری کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں لیکن ان تمام شاعروں میں انؔشا کے فن پر سب سے کم کام ہوا ہے۔ تذکرہ نگاروں، تنقید نگاروں اور محققوں نے انؔشا اور ان کے حریفوں کے ساتھ معرکہ آرائی پر دفتر کے دفتر سیاہ کردیے لیکن ان کے فن پر ایک دو گھسے پٹے جملے لکھ کر انؔشا پر ہی نہیں بلکہ تمام اُردو شاعری پر ظلم کیا ہے۔ ''تذکرہ ہندی گویان'' میں مصحفؔی تو حریف ہی تھے وہ کیا کہتے؟ تذکرہ مجموعہ نغز میں قدرت اللہ قاسم تو انؔشا کے چھپے دشمن ہی تھے وہ بھی کیا لکھتے؟ نواب مصطفٰی خان شیفتہؔ جن کا ''گلشنِ بے خار'' جو دراصل گلشنِ بے کار اس لیے ہے کہ اس میں چھ سو شاعروں میں سے صرف چھ شاعروں پر تبصرہ ہے۔ جن میں خود نواب موصوف اور ان کے چار ہم عصر غالبؔ، مومؔن، آزردہ اور صہبائؔی اور دو شاعرات جن میں شیفتہؔ اور مومؔن کی محبوبائیں بھی شامل ہیں۔

ان چھ سطروں میں عابدی صاحب نے انؔشا کے فن اور شخصیت پر قلم اٹھانے والے تین بہت بڑے بتوں کو جتنی بے رحمی سے منہ کے بل گرایا ہے اس پر ان کی حق گوئی اور اظہار صداقت کی داد نہ دینا سراسر زیادتی ہوگی۔ لیکن یہ معاملہ صرف جذباتی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ان کی محققانہ محنتیں بولتی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے پورے دلائل کے ساتھ شیفتہؔ اور آزاد پر اپنی گرفت کی ہے۔ اس باب میں عابدی صاحب کا استدلال یہ ہے کہ ''شیفتہؔ'' نے اپنے تذکرے میں ایک ایسا فتویٰ صادر کر دیا جو ڈیڑھ صدی گزرنے پر بھی

ادب کی شریعت میں منسوخ نہ ہو سکا۔ بقول شیفتہؔ ''انشاؔ ہر صنف سخن را بہ طریق راسخہ نگفتہ'' بہ طریق سے مراد قدما کا طریقہ کار ہے۔ یعنی شیفتہؔ، انشاؔ جسے نابغہ روزگار تخلیق کار کو خود اپنے جیسا اکتسابی شاعر سمجھ بیٹھے جو لکیر کا فقیر اور قدما کا مرید ہو کر رہ جاتا۔''

اسی طرح عابدی صاحب نے آزاد پر بھی کڑی گرفت کی ہے۔ محمد حسین آزاد تو ''آب حیات'' میں فراغ کے شاگرد بیتابؔ کے جملے کے سحر سے جاگ نہ سکے کہ ''انشا اللہ خان انشاؔ کے فضل و کمال کو شاعری نے اور شاعری کو سعادت علی خان کی مصاحبت نے ڈبویا۔'' بقول عابدی صاحب یہ جملہ غلط بیانی ہے اس لیے کہ انشاؔ کوئی عالم گیر بادشاہ یا مصور و معمار نہ تھے بلکہ ان کا فضل و کمال ان کی شاعری ہی تھی اور اسی سے ان کی نثری تخلیق بھی وجود میں آئی اور آج دو سو سال گزرنے کے بعد بھی انشاؔ صرف شعر و ادب کی تخلیق سے ہمارے درمیان زندہ ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انشاؔ کی شخصیت نابغہ روزگار تھی اور ایسی شخصیت نہ کسی کے بتائے ہوئے راستے پر آنکھ بند کر کے چلتی ہے اور نا ہی کسی سے رہ نمائی کی طالب ہوتی ہے۔ البتہ دوسرے ان کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ مثلاً یہ دیکھیے کہ انشاؔ کے ادبی معرکے بہت مشہور ہیں ایک معرکہ ان کا میر قدرت اللہ قاسمؔ سے ہوا اس معرکے کو اگر مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ اپنی راہ خود تلاش کرنے والا کون ہے اور کون دوسروں کی راہ پر چلتا ہے؟ انشاؔ نے کسی مشاعرے میں ایک غزل پڑھی جس کی ردیف تھی ''پانچوں'' انشاؔ کی ذہن اور طباع شخصیت نے ردیف کو نباہنے کا حق ادا کر دیا۔ چند اشعار جو عابدی صاحب نے نقل کیے ہیں انھیں میں دوبارہ نقل کرنا چاہتا ہوں تا کہ جینئس اور غیر جینئس کا فرق واضح ہو سکے۔

چشم و ادا و غمزہ شوخی و ناز پانچوں
دشمن ہیں میرے جی کے بندہ نواز پانچوں

•••

آرام و صبر و طاقت ہوش و حیا کہاں پھر
بے دل کے ساتھ یہ بھی اس عشوہ ساز پانچوں

مت پوچھ کارِ انشاؔ، ہجر و وصال میں کچھ
صبر و جنوں و وحشت عجز و نیاز پانچوں

کہتے ہیں کہ انشاؔ کی اس قادرالکلامی پر انھیں بے حد داد ملی اور ان کے حریفوں کے منہ اتر گئے۔ چناں چہ اگلے مشاعرے میں قدرت اللہ قاسمؔ نے اپنا زورِ ہنر دکھانے کے لیے ''ساتوں'' کی ردیف میں غزل کہی۔ ظاہر ہے کہ یہ چبے ہوئے نوالے کو دوبارہ چبانا تھا مگر اصل پھر اصل ہے انشاؔ نے اپنی قادرالکلامی کے بل بوتے پر جواباً ''آٹھوں'' اور پھر یہی نہیں بلکہ ''بیسوں'' اور ''تیسوں'' جیسی مشکل ترین زمینوں میں غزلیں کہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو آدمی فطرتاً طباع اور ذہین ہوتا ہے وہ اپنا راستہ خود بناتا ہے۔

انشاؔ کے ساتھ صورت حال کچھ ایسی ہوئی کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر بہت دور تک چلے گئے۔ اس طرح کچھ لوگوں کا خیال ہے اور شاید کسی حد تک میرے نزدیک صحیح بھی ہے کہ انشاؔ میں جو اصلی جوہر تھے وہ پوری طرح سامنے نہ آسکے۔ اس کے برخلاف تقی عابدی صاحب کا خیال ہے کہ ان کے جوہر سامنے تو آئے مگر ان کے مخالفین نے ان پر پردہ ڈال دیا اور چوں کہ عابدی صاحب اپنی رائے پر کامل یقین رکھتے ہیں اس لیے انشاؔ پر یہ تحقیقی مقالہ لکھ کر انھوں نے اپنی انشاؔ پسندی اور حق پرستی کا کھلا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ اس محنت لگن اور محققانہ کام پر میں انھیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں۔

تقی عابدی مشاہیر کی نظر میں

نثار احمد فاروقی:- (دہلی)......8/اگست 2003ء

تقریباً ایک ماہ کا عرصہ ہوا عزیزم ڈاکٹر شاہد حسین نے آپ کی کتاب "تجزیہ یادگار انیس" کا ایک نسخہ آپ کی جانب سے بطور ہدیہ عنایت کیا۔ نہایت ممنون ہوں کہ اس بیش بہا ادبی سوغات کے لیے آپ نے اس گمنام کو بھی یاد رکھا۔ کتاب کی تعریف سے قلم عاجز ہے، الفاظ گنگ ہیں، زباں لال ہے۔ ظاہری حسن و جمال ہی بے مثال ہے، مگر یہ تو زیادہ خرچ کرنے سے پیدا کیا جاسکتا ہے کہ آپ سونے کے حروف میں کتاب چھپوادیں۔ اس کا اصلی حسن وہ جذبہ اور گہری عقیدت ہے جو آپ کو موضوع کتاب سے ہے اور میر انیس مرحوم یقیناً اس قدردانی کے سچے حقدار تھے۔ اس کتاب میں ان کے بارے میں اتنی معلومات جمع کردی گئی ہیں۔ جو بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ پھر مرثیہ انیس کا تجزیہ جس عالمانہ ژرف نگاہی، دقیقہ رسی اور نکتہ شناسی سے کیا گیا ہے وہ بھی بے نظیر ہے۔ آج تک اُردو تو کیا انگریزی کے کسی بڑے سے بڑے شاعر یا ادیب کے فن کا تجزیہ ایسی عمیق نگاہ سے نہیں کیا گیا۔ ایک بار پھر تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کتاب میرے ذخیرہ میں لعل شب چراغ کی طرح چمکتی رہے گی اور آپ کی یاد دلاتی رہے گی۔

•••

شان الحق حقی:- (کراچی، پاکستان)......10/فروری 2007ء

اس بار کینیڈا کے سفر میں سب سے بڑی کامیابی اگر کوئی تھی تو وہ آپ کے دولت کدے کی سیر جسے جنت ارضی کہا جائے تو مبالغہ ہر گز نہ ہوگا۔ آپ کی نسبت میں پہلے سے بہت کچھ جاننے کا دعویٰ دار تھا مگر آپ کے ذخیرۂ علمی اور ان کی نسبت آپ کی توجہ، لگاؤ اور

اشتیاق دیکھ کر اُردو ادب سے دل ہی دل میں بہت سی توقعات باندھ بیٹھا ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کی توانائیاں اسی طرح بحال رکھیں اور اس میں مزید ترقی و برکت عطا فرمائیں۔ آمین......

ایک بات جو میں آپ سے نہ کہہ سکا اب تحریر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ آپ جس پائے کے معروف طبیب اور ادیب ہیں، اپنے وقت کی اس طرح قدر نہیں کرتے۔ ادباء اور شعراء کے لیے آپ جس طرح ہر وقت اور ہر گھڑی جس بے دردی بلکہ بے رحمی سے وقت اور وسائل لٹاتے ہیں اس کی داد کم از کم میں ہرگز نہیں دے سکتا اور نہ کسی اور کو ایسا کرنے کی اجازت دینا چاہوں گا۔ اس حقیر فقیر نے سرسری طور پر آپ کی ان کتب کی جانب اشارہ کیا تھا جن سے یہ عاجز محروم ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ آپ اتنی ڈھیر ساری کتب اتنے بھاری بھرکم مالیت کے ٹکٹ لگا کر کراچی پاکستان ارسال فرمائیں جب کہ میرا کینیڈا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔ بہر حال میں اس عنایات خاص کے لیے بے حد شکر گزار ہوں اور آپ کی صحت وسلامتی کے لیے دعا گو بھی۔ قدرت نے مہلت دی تو مرسلہ کتب کی بابت ضروری کچھ بلکہ بہت کچھ لکھوں گا۔

...

شبنم رومانی:- یوں تو آپ کی شخصیت وفن کے سحر نے ''گلشن رویا'' کی تقریب رونمائی کے زمانے سے ہی ناچیز کو گرفت میں لیا ہوا ہے مگر انیسؔ و دبیرؔ پر آپ کے حالیہ کارنامے نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ آپ سمندر پار مقیم عاشقانِ اُردو میں اوّل و افضل مقام پر برحق طور پر فائز ہو چکے ہیں۔ مستقبل کے حوالے سے میری امیدیں آپ کی ذات کی نسبت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہیں۔ سنا ہے آج کل آپ کی توجہ کا مرکز علامہ اقبالؔ ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ اس کارِ دشوار سے جس قدر جلد ممکن ہو سرفراز ہو کر گزر جائیں اور گلشن اُردو میں نئے باب کا اضافہ کریں۔

...

گیان چند جین:- (نیویارک، امریکہ)......4/مئی 2002ء

ایک زمانہ سے آپ کی شہرت و ناموری سماعت تک محدود تھی۔ مگر جب آپ برادرم

تابش خانزادہ کے ہمراہ عزیزی گلزار جاوید کے جریدے ''چہار سو'' جسے گلزار جاوید سے زیادہ محترمی ضمیرؔ جعفری مرحوم کا جریدہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ خاص اشاعت کے لیے مسودات اور تصاویر طلب کرنے کی غرض سے تشریف لائے اور اپنی دو تازہ تصانیف ''سہدِ سخن'' اور ''انشاء اللہ خاں انشاؔء'' پیش کیں تو میری خوشی کی انتہا آپ یا برادرم تابش صاحب ہی لگا سکتے ہیں۔ میری نظریں آپ کی تازہ اور آمدہ کتاب میر انیس کے تجزیے پر لگی ہوئی ہیں۔ خدا کرے آپ اس نادر کتاب کو میری رخصتی سے قبل منظر عام پر لے آئیں تاکہ اس کے مداحین میں ایک اور نام کا اضافہ ہو سکے۔

•••

محسن بھوپالی:- (کراچی، پاکستان)......14رجون 1999ء

آج کا دن میرے لیے آپ کی بلند اقبال کتب کی شکل میں خوش قسمت دن ثابت ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں برادرم گلزار جاوید کا شکریہ ادا کروں یا آپ کے روبرو اظہار سپاس کروں کہ آپ نے کس قدر اہم اور نابغہ کتب کا تحفہ عطا فرمایا ہے۔ اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں یا ان کتب کا طلب گار۔ آپ کے ہاں حافظؔ اور خسروؔ سے عقیدت کا جو انداز ہے وہ انوکھا نرالا نہ ہوتے ہوئے بھی جداگانہ حیثیت کا حامل ضرور ہے۔ آپ نے ان بلند قامت شعراء کی شاعری کو جس تنقیدی بصیرت کے آئینے میں جانچا اور پرکھا ہے اس سے آپ کی اُردو اور فارسی کے کلاسیکی اور جدید شاعری کے گہرے مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو شاعری کی آبرو میر، غالبؔ، انیسؔ اور دبیر کے شاعرانہ مرتبے اور خصوصیت کے ساتھ علاّمہ اقبالؔ کی شاعری اور شخصیت پر آپ کی جو نظر اور اس کے جو مختلف پہلو ہیں انھیں نہایت بصیرت افروز کہا جا سکتا ہے اور انھیں اُردو ادب میں خصوصی اضافے کی حیثیت کا حامل بھی گردانا جا سکتا ہے۔ آپ کی شاعری، تنقید، تحقیق کی متنوع جہات کا تقاضا ہے کہ تمام علمی اور ادبی ادارے اور افراد آپ کی بجا اور بھرپور حوصلہ افزائی فرمائیں اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اپنے ساتھ نہیں آپ کے ساتھ بھی نہیں اُردو ادب اور شاعری کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہوں گے۔

•••

باقر زیدی:۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام دُنیائے اُردو میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا ان کا یہ مقام ان کی انتھک محنت، لگاتار کوشش، گہری لگن اور ایک باعزم بے دریغ اور مسلسل جذبہ عمل کا صلہ ہے۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی دھن اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمہ وقت سرگردانی نے انھیں اب بلند ممتاز اور نمایاں درجہ عطا کیا ہے۔ تحقیق و تنقید کے بڑے اہم قلم کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُردو زبان کے مضبوط اور کہنہ منطقوں ہندوستان اور پاکستان سے دور رہ کر بھی جو احترام و اعتبار انھوں نے کمایا ہے وہ لائق تحسین ہی نہیں قابل رشک اور قابل تقلید بھی ہیں۔

•••

صبا اکبر آبادی:۔ کچھ عرصے سے رثائی ادب کو اُردو ادب میں ایک طرح سے فراموش کیا ہوا ہے مگر نوجوان اور پُرعزم تقی عابدی صاحب نے اپنی جولانی طبع کو بروئے کار لاتے ہوئے رثائی ادب کے بانیوں، جاں نثاروں اور معماروں کی نسبت جس قدر جستجو، اشتیاق اور تحرک کام میں لاکر نئے گوشے اور نکات دریافت کیے ہیں اس کے باعث یہ فراموش شدہ صنفِ ادب ایک بار پھر سے زندہ اور توانا ہوگئی ہے۔

•••

احمد ندیم قاسمی:۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی سچے عاشق اُردو اور پکے مرثیہ شناس دانشور محقق اور نقاد ہیں۔ ان کا اشتیاق اور لگن دیکھ کر ان پر پیار بھی آتا ہے اور غصہ کرنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ آج کے دور میں اپنے کام سے اس قدر لگاؤ مشکل ہی دیکھنے میں آتا ہے اس لیے ہم تقی عابدی صاحب کا دم غنیمت جانتے ہیں کہ انھوں نے دیارِ غیر میں جس اخلاص سے اُردو ادب کا پودا لگایا ہے اور جس شیفتگی سے اس کی آبیاری کر رہے ہیں ایک نہ ایک دن یہ نرم و نازک پودا ضرور تناور درخت کا روپ اختیار کرے گا۔

•••

پروفیسر صغرا مہدی:۔ تقی عابدی کا نام اُردو دُنیا کے لیے نیا نہیں ہے۔ موصوف کا پیشہ ڈاکٹری اور دلچسپی اُردو ادب سے ہے۔ شعر بھی کہتے ہیں اور رہائش کینیڈا میں ہے۔ ہندوستان آکر یہاں بھی تنقید اور تحقیق کا کام کرنے والوں کے شوق مہمیز کرتے رہتے ہیں۔ موصوف کا

خاص میدان رثائی ادب ہے۔ دو سال پہلے آپ ہندوستان تشریف لائے تھے ساتھ میں اپنی مرتب کی ہوئی کتاب ''تجزیہ یادگارِ انیس'' بھی لائے جسے دیکھ کر سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ تقی عابدی صاحب کے اعزاز میں جگہ جگہ انیس پر سیمینار ہوئے انھوں نے لوگوں کو انیس پر مزید کام کرنے پر اُکسایا۔ ماہرین انیس سے رابطہ قائم کیا۔ ہم سمجھے موصوف ''انیسیے'' ہیں۔ مگر ابھی حال میں شاہد پبلی کیشنز، دریا گنج سے تین ضخیم کتابیں موصول ہوئیں۔ جو تقی عابدی نے بہت عرق ریزی اور عالمانہ انداز میں مرتب کی ہیں۔ اور بہت صحت اور خوب صورتی سے شائع ہوئی ہیں۔ (1) ''مثنویاتِ دبیر''، (2) ''ابواب المصائب''، (3) ''مصحفِ فارسی''۔

ان کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ موصوف کا شمار انیس کے ان مداحوں میں نہیں ہے جو اپنے پیروں کو اڑاتے ہیں ہندوستان میں بھی دبیر پر کچھ کام ہو رہا ہے اور ماہرین دبیر یہاں بھی موجود ہیں مگر مذکورہ بالا تینوں کتابیں میں جو معلومات دبیر کی سوانح اور شاعری و نثر کے بارے میں فراہم ہوتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری اب تک کی تحقیق میں کس قدر کمی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ تینوں کتابوں اُردو اور فارسی ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ ہم مشکور ہیں تقی عابدی صاحب کے کہ وہ دیارِ غیر میں بھی رہ کر اپنی زبان و ادب کو نہیں بھولے۔ اور گاہے گاہے ہندوستان آ کر ہم لوگوں کو یہ بتاتے رہتے ہیں کہ تحقیق ایسی ہوتی ہے۔ خدا کرے کہ مرحلۂ شوق طے نہ ہو اور وہ اسی طرح بے مثال علمی کارنامے انجام دیتے رہیں۔

•••

ہلال نقوی:۔ مرثیے کے محقق اعظم مسعود حسن رضوی ادیب نے 1943ء میں شاہکار انیس کے نام سے انیس کا جو مرثیہ پوری اُردو دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا آج تقریباً ساٹھ سال بعد اسی مرثیے کو ڈاکٹر تقی عابدی نے فنی و لسانی تشریحات کے ساتھ ایک ایسے نئے زاویے سے اجاگر کیا ہے کہ اہل تحقیق حیران ہیں! یہ حیرانی انیس کی شعری عظمت کی تہہ داریوں پر بھی ہے اور ڈاکٹر تقی عابدی کی فنی و تحقیقی بصیرتوں پر بھی! ڈاکٹر سید تقی عابدی کی اس حیران کن ادبی خدمت نے انیس پر لکھنے پڑھنے سوچنے اور سمجھنے کے کئی دریچے کھول

دیئے ہیں ہر دریچہ ایک نئے منظر کا اظہار ہے اور یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ ابھی انیس کی دریافت کے مراحل بہت باقی ہیں۔ میں نے ٹورنٹو میں ڈاکٹر تقی عابدی کا کتب خانہ دیکھا ہے ان کے گھر رہا ہوں اس کتب خانے میں ڈاکٹر اکبر حیدری اور ڈاکٹر انیس اشفاق کے ساتھ میں نے کئی دن گزارے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا بھی یہی کہنا تھا کہ انیس و دبیر اور اُردو مرثیے کے متعلق اس کتب خانے میں انتہائی گراں قدر نوادرات ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی جیسے مرثیہ شناس اور علم دوست شخصیت کے پاکستان آنے پر ان کی کتاب کی رسم اجراء اور انیس پر گفتگو کا جو اہتمام اقبال کاظمی صاحب نے کیا ہے، اس پر وہ ہم سے بھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

•••

پروفیسر گوپی چند نارنگ:- ادب کی دُنیا دعوے کی نہیں دلیل کی دُنیا ہے۔ یہاں نام نہیں کام بولتا ہے۔ اگرچہ خالی نام کا سکہ چلانے والوں کی بھی کمی نہیں لیکن ٹانکا نکلتے دیر نہیں لگتی۔ البتہ ادب کی آبرو ان لوگوں سے ہے جو خلوص نیت اور لگن سے اپنے کام میں مگن رہتے ہیں، اور دردمندی و انکسار سے کشتِ ادب کی آبیاری کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند برسوں میں انھوں نے جو ترقی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں لیکن بقول ان کے مریض وہ ادب کے ہیں۔ ادھر دس پندرہ برسوں میں انھوں نے ایک کے بعد ایک جو مطبوعات پیش کی ہیں وہ کسی کے لیے بھی باعث رشک ہو سکتی ہیں۔ رثائی ادب، انیسیات، اقبالیات، غالبیات، فراقیات، کیسے کیسے میدان دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے سر کیے ہیں، ''لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر'' وہ خطیب بھی ایسے ہیں کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ شعر بھی خوب کہتے ہیں اور مشاعرے بھی لوٹتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اُن پر ''چہارسو'' کا نمبر آرہا ہے۔ دعا گزار ہوں کہ خدا انھیں زخمِ چشم سے محفوظ رکھے اور وہ اسی طرح اپنے کام میں مگن رہیں۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین آباد!

•••

انتظار حسین:- ڈاکٹر سید تقی عابدی ہمارے عصر کے نامور ریسرچ اسکالر کے طور پر جانے

جاتے ہیں۔ آپ کی شہرت کی خاصی پہچان انیسؔ شناسی گردانی جاتی ہے۔ حالاں کہ آپ نے مرزا دبیر پر بھی بہت کام کیا ہے اور بہت سے نئے نکات سامنے لائے ہیں جن سے اختلاف کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ انیسؔ و دبیر کے علاوہ آپ نے انشاء اللہ خاں انشاؔء، نجم آفندی اور علامہ اقبالؔ پر بھی دقیق نگاہی سے کام کیا ہے جسے نہ سراہنا یا صرفِ نظر کرنا تقی عابدی سے نہیں بلکہ اُردو ادب سے ناانصافی شمار ہوگی۔

...

احمد فراز:- تقی عابدی کچھ نہ بھی کرتے تو ادبا، شعراء کی خدمت کے عوض بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے مگر انھوں نے نہ صرف کچھ کرنے کی دل میں ٹھانی بلکہ بہت کچھ کر بھی گزرے اور آئندہ بھی ان سے بہت کچھ سرزد ہونے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

...

ڈاکٹر سی. نارائن ریڈی:- (حیدر آباد، دکن) ہمیں اپنی شناخت کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی زبان، تہذیب اور ثقافت کو لازمی طور پر زندہ رکھنا ہوگا۔ اُردو زبان بڑی ثروت مند اور علمی، ادبی خزانوں سے مالا مال زبان ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم میرؔ، غالبؔ، داغؔ کی سربلندی کے ساتھ اپنے جوہر نایاب جو اُردو زبان و ادب کی سربلندی و سرفرازی کے لیے ہمہ تن مصروف ہیں کی عزت افزائی سے قطعی غفلت نہ برتیں۔ میرے لیے یہ امر بہت ہی خوش اور اطمینان کا باعث ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے تن تنہا اپنی زبان، ادب اور فراموش کردہ اہلِ قلم کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ لائق احترام بھی ہیں اور اعتبار کی حامل بھی۔ میں اُردو زبان و ادب سے وابستہ احباب سے استدعا کروں گا کہ آپ اپنے درمیان موجود اس جوہر نایاب کی جس قدر بھی عزت افزائی کر سکتے ہیں کیجیے اور جو احباب کچھ نہیں کر سکتے اُن کو چاہیے کہ وہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی درازیٔ عمر کے لیے دستِ دعا ضرور دراز کریں۔

...

نیر مسعود (لکھنؤ): رثائی ادب کے خدمت گزاروں میں اس وقت ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام سرِفہرست ہے۔ وہ اس سلسلے میں کئی کتابیں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کر چکے ہیں اور ابھی کئی کتابیں تیاری کے مراحل میں ہیں۔ ان کا ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ یہ ہے کہ وہ

مرزا دبیر کا تمام کلام نظم ونثر مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے:

1. ''سلکِ سلامِ دبیر'' (سلاموں کا کلیات)
2. ''طالعِ مہر'' (بے نقط کلام)
3. ''مجتہد نظم مرزا دبیر''
4. ''مثنویات دبیر''
5. ''ابواب المصائب''
6. ''مصحف فارسی''

یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس وقت وہ مرزا دبیر کی جملہ رباعیوں کی جمع آوری کے کام میں مصروف ہیں جس میں ہر رباعی کا تنقیدی تجزیہ بھی ہوگا۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا۔ اس کے بعد انشاءاللہ مرزا دبیر کا کلیاتِ مراثی آئے گا۔

مرزا دبیر کا بیشتر کلام ''دفتر ماتم'' کی جلدوں میں شائع ہوا تھا لیکن یہ جلدیں بہت کم یاب اور بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ تقی عابدی صاحب نے ان جلدوں میں شامل کلام کے علاوہ مرزا صاحب کا غیر مطبوعہ کلام اور دوسری جگہوں سے شائع ہونے والا کلام بھی یکجا کر لیا ہے۔ اس طرح ان کے ہاتھوں مرزا صاحب کا حق ادا ہو رہا ہے۔

''ابواب المصائب'' مرزا صاحب کی نثری تصنیف ہے جس میں قرآن مجید کے ''احسن القصص'' یعنی قصہ حضرت یوسفؑ کو امام حسینؑ کے حالات سے ربط دیا ہے اور قصہ یوسفؑ اور واقعہ کربلا میں مماثلتیں تلاش کی ہیں، یہ کتاب مرزا صاحب نے ۱۲۴۵ھ میں لکھی۔ اس کی نثر بہت سادہ و سلیس ہے اردو نثر کی تاریخ میں ''ابواب المصائب'' کا نام بھی شامل ہونا چاہیے۔ یہ کتاب مرزا رجب علی بیگ سرور کی ''فسانہ عجائب'' کے صرف پانچ برس بعد تصنیف ہوئی ہے اور لکھنؤ میں اردو نثر کے ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے۔

''ابواب المصائب'' میں نثر کو جا بہ جا نظم سے تزئین دی گئی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس میں مرثیے کا کوئی بند نہیں ہے (کم سے کم مجھے نظر نہیں آیا) یہ منظومات غالباً خاص اسی کتاب کے لیے کہے گئے ہیں۔

اتنی ضخیم کتاب مرزا دبیر نے صرف ایک ہفتے میں مکمل کر لی اور اس ایک ہفتے میں وہ مجالس عزا میں شرکت اور احباب سے ملاقاتیں بھی کرتے رہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کو امام حسینؑ کا معجزہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ تقی عابدی صاحب کے ہاتھوں مرزا صاحب کے بقیہ آثار بھی اسی

طرح مرتب ہو کر آجائیں۔ یہ اُردو ادب، رثائیات اور مرزا دبیرؔ کی بڑی خدمت ہوگی۔

•••

مشکور حسین یاد:- علاّمہ اقبالؔ پر کچھ لکھنا آسان تو اس لیے ہے کہ علاّمہ کے شعر و ادب اور فکر و نظر کے بہت سے پہلو ہیں لیکن علاّمہ پر کچھ لکھنا مشکل اس لیے ہے کہ علاّمہ کے ان فکری اور فنی پہلوؤں پر سوچ سمجھ کر ہی لکھنے سے کچھ بات بنتی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی اس ضمن میں مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یوں تو علاّمہ کے فن اور شخصیت کے بہت سے پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے لیکن سوچے سمجھے بغیر نہیں۔ ان کے مضامین کو پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ انھوں نے جس موضوع کو لیا ہے اس کے ساتھ حتی المقدور انصاف کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی سعیِ بلیغ کے باعث تقی عابدی صاحب کے مضامین میں ایک اپنے ہی انداز کی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ اب خواہ اقبالؔ کو مفسرِ قرآن کی حیثیت سے دیکھا ہو یا عاشقِ رسولؐ کی حیثیت سے انھوں نے انصاف کا دامن ہاتھ سے کہیں نہیں جانے دیا اور لُطف کی بات یہ ہے کہ علم و عرفان کے موضوعات کے ساتھ ساتھ تقی عابدی نے خالصۃً فلسفیانہ موضوع زمان و مکان پر گفتگو کرتے ہوئے بھی اپنی طرف سے پوری پوری احتیاط سے کام لیا ہے اور پھر جہاں انھوں نے علاّمہ کے ہم سفر اکابرین سلیمان ندوی، حسن نظامی، راس مسعود، مہاراجہ کشن پرشاد سے علاّمہ کے ذاتی تعلقات اور علمی روابط کے ضمن میں بات کی ہے وہاں بھی انھوں نے اپنی ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے غرض اپنی اس کتاب میں مصنف نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی یہ قابلِ مطالعہ کتاب ہے اور ایک کتاب کی سب سے بڑی اور بنیادی خوبی بھی یہی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے کہ اسے پڑھ کر قاری کو اپنے انداز کا ایک لطف حاصل ہو۔ سو ڈاکٹر تقی عابدی نے قارئین اقبالؔ کے لیے یہ ساماں ضرور بہم پہنچا دیا ہے۔ باقی ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے'' تو آپ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی معلوم کر سکیں گے کہ زاویے کتنی کتنی ڈگری کے ہیں اور ہمارے ذہنوں کو اقبالؔ فہمی میں کتنی کتنی وسعتیں عطا کرتے ہیں۔

•••

امجد اسلام امجد:- ڈاکٹر تقی عابدی کی شاعری کا صحیح لطف وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو انھیں ذاتی طور پر جانتے اور اُن سے تعلق خاطر رکھتے ہیں کہ وہ شاعروں کے اُس اقلیتی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو خود بھی اپنی شاعری جیسے ہوتے ہیں۔ تقی عابدی ایک پڑھ لکھے، مہذب، علم دوست، ادب شناس، خوش نما اور خوش گفتار انسان ہیں اُن کا حیدرآبادی لہجہ، الفاظ کا مخصوص چناؤ اور استعمال، رکھ رکھاؤ اور چھلکتا ہوا خلوص ایسی خوبیاں ہیں جو اُن کی شاعری میں بھی اپنی جھلک دکھاتی رہتی ہیں۔

وہ طبعاً اور مزاجاً روایت پسند ہیں چناں چہ اُن کے شعری مضامین ہوں یا تراکیب اور ذخیرۂ الفاظ! اُن سے متعلق ہر چیز پر کلاسیکی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ اُن کی نظمیں سادگی، مقصدیت اور اپنے موضوع سے جذباتی اور فکری کمٹ منٹ سے اس قدر لبالب ہوتی ہیں کہ بعض اوقات وہ اپنے تخلیقی جوش میں فنی حد بندیوں سے بھی صرفِ نظر کر جاتے ہیں۔ اُن کی شاعری ''شوقِ اظہار'' کی لہروں پر سفر کرتی ہوئی قارئین اور سامعین سے کلام کرتی ہے اور سرمۂ مفت نظر کی طرح صرف چشمِ خریدار پر احسان رہ جانے سے بھی شانت اور مطمئن ہو جاتی ہے۔ سو ایسے بھلے مانس اور پیارے شخص اور ایسی سچی خالص اور بے طلب شاعری کا استقبال تو کھلے بازوؤں سے کرنا چاہیے۔

محمد حامد انصاری:- آپ کا تحفہ پا کر مجھے بے پناہ مسرت ہوئی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ''فیض فہمی'' ہمارے دل پسند موضوع پر ایک قابل قدر کتاب ہے۔ اس تحفے کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

خلیق انجم:- آج ہی شاہد ماہلی صاحب نے آپ کی مرتبہ کتاب ''فیض فہمی'' عنایت فرمائی، کتاب دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ آپ نے جس لگن اور محنت سے فیض پر یہ کتاب تیار کی ہے، وہ واقعی بے مثال ہے۔ اس کتاب میں فیض کی شخصیت، سیرت اور ادبی خدمات پر آپ نے ڈیڑھ سو سے زائد جو مضامین یکجا کر دیے ہیں، اُس کے بعد فیض کا شاید ہی کوئی گوشہ باقی رہ گیا ہو۔ اُردو ادب میں فیض کا جو مرتبہ ہے، اُس اعتبار سے ''فیض فہمی'' فیض کے شایانِ شان ہے۔ فیض کے چاہنے والوں کی خوش نصیبی ہے کہ اس کتاب کی ترتیب کے لیے خدا نے آپ کو منتخب کیا۔ کیا خوب صورت کتاب ہے اور بیش بہا! اپنے مشمولات اور معیار

طباعت کے اعتبار سے بھی کیسی خوب صورت ہے! اس کتاب کو دیکھ کر میرے دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدا آپ کو ہمیشہ خوش و خرم، تندرست اور سلامت رکھے اور آپ ادب کی اسی طرح خدمت کرتے رہیں۔

میں اقبالؔ، دبیرؔ، انیسؔ، تعشقؔ لکھنوی اور غالبؔ پر آپ کی کتابوں کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میری زندگی کا بڑا حصہ مطالعۂ غالبؔ میں گزرا ہے، اس لیے آپ کے مرتبہ ''کلیاتِ فارسی'' کی دو جلدوں کے دیدار سے محروم ہونے پر مجھے افسوس ہے۔ آپ پبلشر کو میرا پتا لکھ دیجیے، کلیات کی جو بھی قیمت ہوگی، پیش کر دوں گا۔

پچھلی دفعہ جب آپ ہندوستان تشریف لائے تھے تو آپ نے بتایا تھا کہ فیضؔ کے بعد اب آپ کے سامنے اقبالؔ کے ''شکوہ اور جوابِ شکوہ'' پر بھی ایک ضخیم کتاب شائع کرنے کا منصوبہ ہے۔ اس کتاب میں اس موضوع پر اقبالؔ کی نظموں کے علاوہ وہ مضامین بھی شامل ہوں گے جو اُردو کے نقادوں نے اس موضوع پر لکھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب بھی اُردو میں اپنی مثال آپ ہوگی۔

آپ میرے چھوٹے بھائی ہیں، اس لیے ایک دو باتیں کہنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کتاب کی اشاعت پر آپ کی کثیر رقم خرچ ہوئی ہے، لیکن فیضؔ کے اپنی محبت اور عقیدت کی وجہ سے اور اس خیال سے کہ فیضؔ کی شاعری اور اس کی خصوصیات عوام تک پہنچ سکیں، آپ نے اس کتاب کی کوئی قیمت نہیں رکھی۔ لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ قیمت شائع نہ کرنے کی وجہ سے کتاب کی وقعت کم ہو جاتی ہے، پھر ادیب کے علاوہ انجمن کے پبلشر اور بک سیلر کی حیثیت سے میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اس کتاب کا اشتہار دیں گے تو اُردو والے معلوم کرنا چاہیں گے کہ یہ کتاب کہاں سے اور کس قیمت پر دستیاب ہوگی؟ جب ہم اس کتاب کا اشتہار دیں گے۔ (''ہماری زبان'' کے تازہ شمارے میں یہ اشتہار دے بھی رہے ہیں) تو قارئین پریشان ہوں گے کہ یہ کتاب کہاں سے منگوائیں۔ یہ بات بہت اچھی ہے کہ آپ نے یہ کتاب مفت تقسیم کرنے کے لیے چھاپی ہے۔ یقیناً یہ فیضؔ سے آپ کی محبت اور فراخ دلی کا ثبوت ہے۔ لیکن عام قارئین آپ کے اس جذبے کو قدر کی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ کیوں کہ انھیں یہ عادت ہی نہیں کہ آرٹ پیپر

پر اتنی خوب صورت اور ۴۲۴ صفحات پر مشتمل یہ بیش قیمت کتاب مفت تقسیم کی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو میری باتیں ناگوار نہیں گزریں گی۔ کیوں کہ میں نے جو باتیں کہی ہیں، اس میں میرا خلوص اور محبت شامل ہے۔

میں جانتا ہوں کہ جب آپ دہلی آتے ہیں تو غیر معمولی مصروف ہوتے ہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ اب آپ جب دہلی آئیں تو اُردو گھر ضرورت تشریف لائیں یا مجھے ٹیلی فون کر دیجیے۔ آپ جہاں ہوں گے حاضر ہو جاؤں گا۔ یقین جانیے کہ میں آپ کا عاشق اور مداح ہوں، اس لیے آپ سے ملاقات کی ہمیشہ تمنا رہتی ہے۔

خدا کرے آپ بخیریت ہوں اور خدا آپ کو ایسا ہی عظیم کام کرنے کی توفیق دیتا رہے۔ (آمین)

ڈاکٹر نیر مقصود:- انیسؔ پر تو کام بہت ہوا ہے یعنی اقبالؔ اور غالبؔ کے بعد سب سے زیادہ اور صنف مرثیہ پر غزل سے بھی زیادہ لیکن موازنہ کے بعد کوئی بڑا کام نہیں ہوا۔ ڈاکٹر عابدی نے غیر معمولی اور محنت اور سلیقے سے کام کیا ہے۔ شاہکار انیسؔ کے تجزیے میں ہر بند کے لفظوں کی کیفیت صنائع و بدائع کی تفصیل اور دوسرے جملہ لوازم نے کتاب کو انیسؔ شناسی کا بہت اہم ذریعہ بنا دیا ہے اور نہایت اہم ماخذ بھی۔ اس کتاب سے انیسؔ کی زبان اور استعمال الفاظ پر کام کرنے والوں کو بھی غیر معمولی مدد ملے گی۔ آپ کی اس کتاب کی سب سے زیادہ داد تو والد مرحوم ہی دیتے۔ ان کی نیابت میں آپ کو میں داد دیتا ہوں حالاں کہ ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک'' آپ کے مضامین وغیرہ پڑھتا رہتا ہوں اور ان سے بے حد متاثر ہوں لیکن تجزیہ شاہکار انیسؔ آپ کا کارنامہ ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ ایسے اور بھی کارنامے انجام دیں۔

ڈاکٹر اکبر حیدری:- مجھے اس بات پر فخر حاصل ہو رہا ہے کہ میں نے شہر پر آشوب وادی کشمیر میں ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب کے مسودے ''تجزیہ یادگار مرثیہ گر: جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کو متعدد بار پڑھا۔ اس کے بعد پانچ مرتبہ اس کی پروف ریڈنگ کا شرف بھی حاصل رہا۔ کتاب پڑھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک پیشہ ور معالج (ڈاکٹر) کو اتنا وقت کہاں سے میسر ہوتا ہے کہ وہ ایسی بھاری بھر کم اور ضخیم ترین کتاب لکھ سکے۔ میں خود رثائی ادب کا ایک کم موار طالب علم ہوں جس نے اُردو لٹریچر میں ستر سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ میں یہ بات بلا خوف

تر دید پورے مطالعہ ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج تک ایسی معتبر، مستند اور معلومات افزا کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ صحیفہ ادب چودہ باب پر مشتمل ہے۔ آخری تین باب نہایت اہم ہیں جو نہایت دیدہ ریزی اور محنت شاقہ سے مرتب کیے گئے۔ تیرھواں باب ''تجزیہ کامل'' حامل کتاب ہے اس میں ڈاکٹر صاحب نے ہر بند کے سامنے پورے صفحے میں تجزیہ کیا اور وہ شعری محاسن دکھائے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی نے انھیں حیات جاودانی سے ہمکنار کیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو اس عظیم کارنامے کی ترتیب و اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں اور انھیں سلام عقیدت پیش کرتا ہوں کہ موصوف نے ایسا شاندار اور بے مثال کام کیا جو آج تک کسی سے نہ ہوسکا۔ اگر اُردو لٹریچر اور رثائی ادب کی تاریخ از سرِ نو رقم کی جائے تو ڈاکٹر صاحب کا نام ممتاز ماہرین انیسیات میں سرفہرست ہوگا۔

سید عاشور کاظمی:۔ فی زمانہ تحقیق و تنقید کا ایک انداز یہ ہے کہ اکابرین نقد و نظر کی آراء تلاش کی جائیں انھیں ایک جگہ نقل کر کے فریضہ تحقیق ادا کیا جائے۔ دوسرا انداز یہ ہے کہ تحقیق و جستجو سے حاصل کردہ آرا سامنے رکھ کر کثرت آرا سے اتفاق کر کے اپنی رائے جلی حروف میں لکھ کر خود کو صاحب الرائے محقق ثابت کیا جائے لیکن بیسوی صدی میں ایک فرہاد صفت محقق ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیسؔ کے صرف ایک مرثیے میں 2156 محاسن اور صفتوں کی نشاندہی کر کے عالمانہ تنقید کے لیے راستے متعین کر دیے ہیں۔ مرحبا! ڈاکٹر تقی عابدی آپ کی اس تحقیق کے بعد اکیسویں صدی میں میر انیسؔ پر جو کام ہوگا وہ روایتی تنقید کی بجائے معنوی کام ہوگا۔

(میر انیسؔ کے دوسو سالہ عالمی کانفرنس جو غالب اکیڈمی کے تحت ٹورنٹو میں منائی گئی)

ڈاکٹر بلال نقوی:۔ میں یہ بات فخر کے ساتھ پاکستان میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ٹورنٹو کینیڈا میں دو عجائب دیکھے۔ ایک نیاگرا آبشار اور دوسرے ڈاکٹر تقی عابدی کی شاہکار تصنیف ''تجزیہ یادگارِ انیسؔ''۔ میں نیاگرا آبشار تو اپنے ساتھ نہیں لاسکتا تھا لیکن ''تجزیہ میر انیسؔ'' ضرور اپنے ساتھ لایا ہوں۔

عابد جعفری:۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی سے شناسائی ایک مدتِ طویل پر پھیلی ہوئی ہے ان کا شمار شمالی امریکہ کے ان چند سنجیدہ لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ جو شہرت، نام و نمود یا عظمت و بلند اقبالی کے لیے نہیں لکھتے بلکہ اس لیے لکھتے ہیں کہ لکھنا اُن کی سرشت بھی ہے اور ورثہ بھی۔

تجربے نے ہمیں بتایا ہے کہ لکھنے والا وہی قابلِ مطالعہ ہوتا ہے جو کم لکھے اور زیادہ پڑھے۔ کیوں کہ اس بات کا ثبوت کہ لکھنے والے کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔ اس کی تحریریں فراہم کردیتی ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحریریں بلاشبہ اُن کے وسعت مطالعہ کی مظہر ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ پہلے ان کی افادیت اور اہمیت پر اچھی طرح غور کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تحریر کردہ مضامین موضوعیت اور علمیت کا حق ادا کردیتے ہیں۔ اوران کی اثر پذیری دوچند ہوجاتی ہے۔ وہ موضوع کے انتخاب اور اس میں نیا پن یا جدّت پیدا کرنے کے فن سے بھی واقف ہیں۔ چناں چہ ان کی تحریریں اپنے موضوعات کے اعتبار سے بڑی منفرد ومتنوع اور اچھوتی ہیں اور قاری پر فہم وادراک کے نئے در کھولتی ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بعض ظاہراً غیراہم موضوعات پر اس ہنرمندی سے مضامین تحریر کیے ہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد وہ موضوعات بے حد اہم نظر آنے لگتے ہیں۔ مثلاً ''علامہ اقبالؔ اور مہاراجہ کشن پرشاد''، ''علامہ اقبالؔ کا تصوّرِ زمان ومکاں''، ''اقبالؔ کیسے علامہ سے سرہوگئے''، ''علامہ اقبالؔ کا شاہین'' وغیرہ اسی طرح بعض ایسے موضوعات پر مضامین تحریر کیے ہیں جو لکھنے والے عموماً نظرانداز کردیتے ہیں۔ ''سلام برحسینؑ''، ''اقبالؔ اور عشقِ علیؑ''، ''جمالِ محمدؐ اُردو اشعار کے آئینے میں''، ''اقبالؔ عاشقِ حسینؑ'' اور ''مرزا غالبؔ کا سلام اور مرثیہ'' وغیرہ۔

ڈاکٹر تقی عابدی کے مضامین کی ایک واضح خاصیت جو براہِ راست دل پر اثر کرتی ہے۔ ان مضامین میں ان کا محققانہ اندازِ فکر ہے۔

وہ تحقیق کی طرف سے تنقید کی طرف آتے ہیں اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ تحقیق کی راہ سے تنقید کی طرف آتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ تنقید کے سماجی، تاریخی، جمالیاتی اور نفسیاتی پہلوؤں کے علاوہ وہ سائنس کو بھی جدید تنقید کا ایک حصّہ سمجھتے ہیں اور جیسا کہ ایلیٹ نے کہا تھا کہ ''ہر زمانہ وعہد اپنا تنقیدی ذوق خود متعین کرتا ہے۔'' کو ضروری ہے کہ جدید تنقید میں دوسرے تمام علوم سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم سے بھی استفادہ کیا جائے۔ چناں چہ آج کے کئی اہم ناقدین اس طرف توجہ بھی دے رہے ہیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر شارب ردولوی نے اپنی کتاب ''جدید اُردو تنقید'' میں اس موضوع پر بڑی وضاحت سے

گفتگو فرمائی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا سائنسی علوم سے گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مختلف موضوعات کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھنے کا سائنسی عمل موجود ہے اور ان تجربات سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں انھیں ادبی پیرائے میں بیان کر دینے کا بھی۔ ان کے تحریر کردہ مضامین کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ وہ ڈاکٹر اقبال سے بے حد متاثر ہیں اور ان کے افکار و خیالات کی تشریحات کی ضرورت کے قائل بھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اُردو و فارسی کے اہم شعراء خسرو، حافظ، میر، انیس، غالب اور دبیر کے فن پر بھی اہم مضامین قلم بند کیے ہیں اور ان شعراء کو نئے انداز سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان مضامین کی اہمیت اور ان کے علمی و ادبی معیار کے علاوہ اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسے ذہن سے چھن کر منظر عام پر آئے ہیں جو سادگی خلوص اور محبت سے لبریز ہے اور جس میں بغض و عناد و تعصب کا شائبہ تک نہیں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی اپنے عقائد میں بھی بڑے محکم ہیں جن سے ان کی فکر ظاہر ہو کر مزید روشن ہو گئی ہے۔ اور وہ اس روشنی کو تمام تاریک اذہان میں داخل کر کے انھیں بھی منور کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ عمل مستحسن ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ظاہر اذہان ہی علوم کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے بڑے موضوعات کی اختصار بندی کی اور انھیں عام فہم انداز میں تحریر کیا تا کہ عوام الناس ان مضامین سے استفادہ کر سکیں۔ نیویارک کے اخبارات میں شائع ہونے والے ان کے مضامین کا دائرہ قرات بہت وسیع ہے اور لوگ انھیں بڑی رضا و رغبت سے مطالعہ کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی شمالی امریکہ کے ایک ایسے محترم اُردو اہل قلم ہیں جنھیں نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے اور جن کی اُردو زبان و ادب کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کو یہاں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

پروفیسر جنک پانڈے:۔ میرے لیے یہ بے حد خوشی کا موقع ہے کہ میں ایک ایسی شخصیت کی ادبی تخلیق سے آپ کو ایسے شخص سے متعارف کرا رہا ہوں جو رہتے تو کینیڈا میں ہیں مگر ان کا دل ہر پل ہندوستان کے لیے دھڑکتا ہے ان کے سلسلے میں اقبال کا یہ شعر پوری طور پر معنی

خیز ہے۔

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو ہمیں وہیں پر دل ہو جہاں ہمارا

یہ شعر ڈاکٹر تقی عابدی کے لیے صدفی صد صحیح ہے۔ کینیڈا میں رہتے ہوئے انھوں نے نہ تو حیدر آباد کو بھلایا اور نہ ہی ہندوستانی تہذیب اور ادب کو۔ خاص طور سے آپ اُردو ادب سے جُڑے رہے۔ ریسرچ کا وہ کام جسے کئی لوگ مل کر پورا نہیں کر سکتے ڈاکٹر عابدی نے اکیلے پورا کیا ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر پر ان کی بلند پایہ کتابیں ہیں اور اب تک جیسا کہ مجھے بتایا گیا ہے۔ چودہ تحقیقی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اُن کو مرثیہ سے بے حد دلچسپی ہے جو عشق کی حد تک ہے۔

''کائناتِ تجمؔ'' یعنی تجمؔ کی دُنیا، ایسی کتاب ہے جس میں مشہور شاعر علامہ تجمؔ آفندی کی غزلیں، قطعات، نوحے، سلام وغیرہ جمع کیے گئے ہیں۔ ضخامت کے مدنظر اسے دو جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلے جلد میں 944 صفحے اور دوسری جلد میں 804 صفحات ہیں۔ تجمؔ آفندی کا تعلق حیدر آباد (آندھرا پردیش) سے تھا۔ انھوں نے 195 غزلیں لکھیں ہیں جو اس کتاب میں موجود ہیں۔

تجمؔ صاحب 1893ء میں ہمارے اتر پردیش صوبہ میں پیدا ہوئے اور ان کے بزرگ (جد) حیدر آباد میں رہے۔ پہلے آگرہ گئے پھر اپنے والد صاحب کے ساتھ حیدر آباد گئے۔ ان کا انتقال 1975ء میں ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ بڑا آدمی میری نظروں سے اوجھل تو ہو جاتا ہے، مگر وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اس کے اعمال اسے زندۂ جاوید کرتے ہیں۔ تجمؔ صاحب اپنی شاعری کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ ملک کی آزادی کی تحریک سے جُوے رہے اور جیل بھی گئے۔ مگر وطن کی محبت اور آزادی کے نغمے گاتے رہے۔ ان کی نظم ''قیدی کا راگ'' کے یہ مصرعے دیکھئے جو انھوں نے جیل میں لکھے تھے۔

سن قیدی کا راگ پریمی، چھن بولت ہے زنجیر
سوئے گا کب تک جاگ پریمی، چھن بولت ہے زنجیر

انھوں نے مزدوروں کے حالات پر لکھا۔ کسانوں کو نعرہ دیا ''مزدور کی آواز'' نظم میں لکھتے ہیں:

مجھ سے نفرت کیوں ہے بچو، میں اگر مزدور ہوں
کیا تمھیں یہ وہم ہے، انسانیت سے دور ہوں

•••

میرے ہی دم سے ہے، جو کچھ ہے تمہارے آس پاس
یہ مکان، یہ باغ، یہ بستر، یہ برتن، یہ لباس

•••

میں نے لوہے کو گلایا، میں نے توڑے ہیں پہاڑ
میں نے گلشن کردیا، ورنہ یہ دُنیا تھی اُجاڑ

تجمّل صاحب سرمایہ داری نظام کے خلاف تھے۔ یہ مصرعے دیکھئے۔

ان کا حق کیا ہے دولت دُنیا پر
جن کو کبھی سوچنے کی زحمت بھی نہ ہو

کرلا کے شہیدوں پر ان کی شاعری مرکوز ہے ان کا یہ شعر مشہور ہوا۔

جاں نثاروں نے ترے کردئے جنگل آباد
خاک اڑتی تھی شہیدانِ وفا سے پہلے

آج میں اس کتاب کی اجراء کرتے ہوئے ڈاکٹر عابدی کو مبارک باد دیتا ہوں اور خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ ان کا یہ ادبی سفر جاری رہے۔ یہ ادیب و محقق کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب طبیب بھی ہیں۔

اس جلسہ کے کنوینر ڈاکٹر فاضل ہاشمی کو میں دُعائیں دینا چاہوں گا جن کی کوشش سے یہ ادبی جلسہ ممکن ہوسکا۔ ڈاکٹر ہاشمی خود بھی میر انیسؔ پر ریسرچ کر چکے ہیں اور اب ''شعریات انیسؔ'' پر کام کر رہے ہیں۔

آخر میں آپ سبھی لوگوں کا تہہ دل سے شکریہ۔

افتخار امام صدیقی
ایڈیٹر "شاعر"، ممبئی
اکتوبر 2015ء

"فن کار اب بھی مستور ہے"

ڈاکٹر سید تقی عابدی سے ادبی مکالمہ

س : گفتگو کے آغاز میں آپ اپنے خاندانی پس منظر کو اختصار کے ساتھ بیان کیجیے؟

ج : میرا آبائی تعلق امروہہ سے متصل سادات کی بستی نوگانواں سادات سے ہے۔ ہمارا خاندان سید بڑے کا خاندان کہلاتا ہے اور ہمارا شجرہ نسب حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ہوا، امام زین العابدینؑ سے جاملتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی ثانی اسی نسبت سے مجھے اپنے رشتہ دار کہا کرتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں رائج علوم کے بے شمار علماء گزرے ہیں۔ میرے ذاتی کتب خانہ میں ہمارے جد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی "حق الیقین" نامی سوا دو سو سال پرانی کتاب موجود ہے۔ تقسیم ہند و پاک کے پانچ سال بعد دہلی میں میری پیدائش ہوئی لیکن بچپن ہی سے حیدرآباد دکن میرا وطن بن گیا جہاں میں نے میٹرک پاس کرنے کے بعد عثمانیہ یونی ورسٹی سے ایم بی بی ایس (MBBS) کیا۔

س : کچھ اپنے علمی ادبی پس منظر پر روشنی ڈالیے؟

ج : عثمانیہ یونی ورسٹی سے طب کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انگلینڈ کے شہر گلاسگو کے علاوہ امریکہ، کینیڈا سے مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کی لیکن کبھی بھی ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا، شاید بچپن ہی سے شعر و ادب کے جراثیم میرے بدن میں جگہ کر چکے تھے جس کا نتیجہ آگے چل کر یوں ظاہر ہوا کہ میں صحت کا طبیب اور ادب کا مریض بن گیا۔ بچپن ہی سے شعر و ادب سے خاص دلچسپی رہی اور اسکول اور کالج میں اپنے ہم نشینوں اور ہم جماعتوں کا ملک الشعرا بنا رہا۔ گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا۔

میرے والد سیشن جج ہونے کے ساتھ ساتھ ایک گوشہ نشین شاعر بھی تھے۔ میں مغربی ممالک میں کچھ عرصے کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے دوران شاعری سے کنارہ کشی کر کے صرف جرنلزم اور صحافت کے حلقہ میں شامل رہا اگر چہ سولہ اٹھارہ برس کی عمر سے حیدر آباد دکن کے مؤقر روزنامہ ''سیاست'' کے علاوہ دوسرے مجلّوں میں طبّی مضامین سلسلہ وار لکھتا رہا جو پسند کیے گئے۔ روزنامہ ''سیاست'' کے ایڈیٹر مرحوم عابد علی خان اور جائنٹ ایڈیٹر محبوب حسین جگرؔ ہمیشہ میری عزت افزائی کرتے اور میرے مضامین کو سرخیوں سے شائع کرتے جس کا مثبت اثر یہ نثری مضامین میری شناخت بن گئے۔

مغربی دُنیا میں ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ شاعری کا ولولہ شباب پر پہنچا چناں چہ اب اسی نثر و نظم یا شعر و ادب کے دوراہے پر زندگی کا سفر جاری و ساری ہے۔

س : آپ نے باقاعدہ شعر کہنا کب شروع کیا اور کیا کسی استاد سے باقاعدہ اصلاح لی؟ آپ کی عروض پر کتاب ''رموزِ شاعری'' تصنیف کرنے کی وجہ کیا تھی؟

ج : بے قاعدہ شعر کہنا یا بعض موقعوں پر تک بندی کرنے کا شغل تو مدرسے اور کالج کے ابتدائی دور کی تلخ اور شیریں واردتیں ہیں۔ فطری شاعری جو ایک قدرتی چشمہ کی طرف سے سینے سے اُبل پڑی تھی مجھے شعر گوئی کے علاوہ بیت بازی کے مقابلوں، شعر و سخن کی محفلوں میں شریک کرتی رہتی تھی چناں چہ اسکول میں اگر چہ شاعری کا ماحول نہ تھا، کالج میں بھی شعر و ادب کا گزر نہ تھا لیکن دل میں شعر گفتنی کی شمع روشن تھی۔ جیسے ہی تعلیم اور معاش کی بندشوں سے ذرا مہلت ملی تو شاعری کی چاندنی پھیلنے لگی اور بہت کم عرصے میں شرق و غرب میں شعری محافل میں پذیرائی ہونے لگی۔

میری شاعری میں چوں کہ قدرتی اور فطرتی ذوق شامل رہا اس لیے کبھی اس فن کو علمی سطح پر پرکھنے کی کوششیں میں نے نہیں کیں۔ اس لیے شاعری میں میرا کوئی استاد نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ ابتدا میں علوم و عروض و قافیہ سے بے خبر شعر کہنے پر بعض اوقات تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس کا سامنا کرنا پڑا، جس کی طرف

توجہ کر کے میں نے بذاتِ خود علوم عروض و قافیہ اور شعر و ادب سے مربوط دیگر علوم کا دقیق مطالعہ کیا اور آخر کار شعر کی تقطیع میرے لیے مدرسہ کی وہ تختی بن گئی جن پر اطفال حروف تہجی کی مشق کیا کرتے تھے اس فن پر گرفت حاصل کر کے میں نے ایک آسان کتاب ''رموزِ شاعری'' تصنیف کی جس میں اُردو کے مروجہ اوزان کی تقطیع مثالوں کے ساتھ پیش کی اس کے علاوہ تقطیع ہجائی بھی اس میں شامل کی تاکہ عالم و عامی یا مبتدی اور مشاق سب شعر کی صحت سے واقف ہو سکیں۔

س : آپ تحقیق اور تنقید کے میدان کے شہسوار ہیں اس کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کی شمع سے مشاعروں کو روشن کرتے رہتے ہیں آپ کی شاعری کے مقام کو آپ کیسے تعین کرتے ہیں؟

ج : کسی بھی شاعر سے اس کی شاعری کے مقام کا سوال ایسا ہی ہے جیسے شکر سے اس کی شیرینی کی بابت مذاکرہ، جوشؔ ملیح آبادی نے صحیح لکھا ہے کہ شیطان ہر شاعر کے کان میں یہ بات پھونک دیتا ہے کہ میں مطمئن ہوں جو کچھ بھی شاعری میں میرا مقام ہے۔ یہ دل سے اُٹھتی ہوئی لہریں ہیں جن کا دبانا میرے بس میں نہیں۔ میں شعر و سخن کو برائے ادب اور برائے ہدف استعمال کرتا ہوں۔
شاعری کا لطف کیا ہے وہ تو صرف قدرتی چشمے کا بہتا ہوا پانی بتائے گا کہ پتھروں سے ٹکراتے ہوئے، آبشاروں میں گاتے ہوئے، دریاؤں میں گھل مل جانے میں کیا سرور ملتا ہے۔ اسی لیے شریعت شعری میں شاعر کے لیے تعلّی نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے اور بقول جمیلؔ مظہری ؎

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

مگر ہم تو مولانا روم کے شعر کے معتقد ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبران
گفتہ آید در حدیثِ دیگران

س : طبابت اور ادب کا سنگم حیرت انگیز ہے دونوں کے لیے آپ کس طرح وقت نکال

لیتے ہیں جب کہ آپ کے پیروں سے سفر بندھے ہوئے ہیں؟

ج : سچ ہے ایک نظر سے دیکھیں تو سائنسی علم اور ادب دریا کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے سے دور دکھائی دیتے ہیں لیکن جیسا دریا کا پانی ہمیشہ ان دو کناروں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھتا ہے اسی طرح انسان کا ذوق شوق عزم اور ارادہ سائنس اور ادب کے کناروں کو ملا دیتا ہے۔

س : آپ کی بیگم گیتی عابدی کو بھی لکھنے پڑھنے کا شوق ہے؟ کیا وہ آپ کے ادبی کاموں میں معاون بھی ہوتی ہیں؟

ج : میرا کچھ عرصہ ایران میں گزرا جہاں میں طبیب کی حیثیت سے مشغول رہا۔ اس دوران میری شادی ایرانی خاتون گیتی سے ہوئی۔ میری شریکِ حیات میرے اس علمی ریاضت اور قلمی جہاد میں ہمیشہ تعاون کرتی رہی۔ ہماری چار اولادیں ہیں دو بیٹیاں اور دو بیٹوں کی تمام تربیت اور روزانہ کے مسائل کا حل صرف میری بیگم کے سپرد رہا اور اس فرصت نے مجھے جم کر کام کرنے کا موقع دیا۔ ہمارے گھر کی زبان فارسی ہے اگرچہ ادبی فارسی میں نے ایران میں معلم سے سیکھی اور پھر تقریباً تمام فارسی شعراء کے کلام کا مطالعہ کر کے اپنی تحقیقی اور تخلیقی سفر میں اس گنج بے بہا سے استفادہ کیا۔ میرے تمام بچے فارسی بولنے کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ پڑھ اور لکھ بھی سکتے ہیں اور اسی طرح اُردو چوں کہ ان کی صرف پدری زبان ہے اس کو کچھ بول سکتے ہیں ویسے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ میں انھیں اُردو زبان کی طرف وقتاً فوقتاً متوجہ کرتا رہتا ہوں۔

س : آپ ایک مصروف طبیب ہیں۔ اس مصروف زندگی میں شعر و ادب اور تصانیف کے لیے آپ کیسے وقت نکال لیتے ہیں؟

ج : اگر سچ کہا جائے تو زندگی میں وقت کی کمی نہیں۔ وقت کی کمی کا بہانہ بنا کر ہم بہت سے کاموں سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے شغل کی تمام تر مصروفیات کے باوجود تقریباً (35) یا چالیس (40) گھنٹے ہر ہفتہ ادب پر صرف کرتا ہوں۔ ادبی مضامین پر ہر وقت غور و فکر کرتا رہتا ہوں۔ جس موضوع پر مجھے کچھ لکھنا یا کہنا

ہوا سے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر ذہن میں مطالب تیار کر لیتا ہوں۔ چناں چہ جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو مطالب بارانِ رحمت کی طرح صفحہ قرطاس پر اُترنے لگتے ہیں۔
اس طرح سے مصروف زندگی میں بھی یہ گنجائش رہتی ہے کہ انسان اپنے ذوق و شوق کی تکمیل کر سکے۔

س : اُردو جہان میں صرف دو شاعر ہمیشہ بحث کا موضوع بنتے ہیں، غالبؔ اور اقبالؔ اگر ان دونوں پر لکھی گئی کتابوں، مرتبہ کتابوں، بکھرے ہوئے مضامین، پی ایچ ڈی کے مقالوں کو یکجا کیا جائے تو شاید انسائیکلو پیڈیا آف برٹینکا بھی ناکافی معلوم ہوگا کیا سوچتے ہیں غالب و اقبالؔ مداح سید تقی عابدی، اس ادبی مسئلے کے؟

ج : اُردو ادب کے چار عظیم شاعروں پر لکھے گئے مقالات اور کتابوں پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؔ پر تقریباً چھ ہزار کے قریب کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مقالات کی تعداد کئی ہزار ہو سکتی ہے۔ دوسرے نمبر پر مرزا غالبؔ ہیں جن پر تقریباً دو ہزار کتابیں نظر آتی ہیں۔ میر تقی میر پر حدوداً چار سو، میر انیسؔ پر تقریباً ساڑھے تین سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان مطالب کی روشنی میں آپ کا خیال صحیح ہے لیکن یہاں یہ اشارہ بھی ضروری ہے کہ علامہ اقبالؔ پر لکھے گئے مقالات اور موضوعات میں تکرار بہت ہے بعض افراد نے صرف اس امتیاز کو حاصل کرنے کے لیے کہ وہ بھی اقبالؔ پر تصنیف اور تالیف رکھتے ہیں اس دشت میں قدم رکھا ہے ورنہ یہاں بھی عمدہ کتابوں کی فہرست طویل نہیں۔

س : علامہ سیمابؔ اکبر آبادی وہ بدقسمت استاد شاعر ہیں کہ ان کی غزلوں اور نظموں کے مجموعے اب نایاب ہیں۔ شاید آپ کے بے مثال کتب خانے میں تمام مجموعے محفوظ ہوں گے کیا سیمابؔ کو اقبالؔ کے ساتھ نہیں رکھا جا سکتا؟

ج : میں علامہ سیمابؔ اکبر آبادی کو ان خوش نصیب شاعروں میں رکھتا ہوں جنھوں نے دُنیا اور آخرت دونوں کو حاصل کیا۔ سیمابؔ کو اُردو کے ہر بڑے شاعر کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ جس طرح گل دستہ میں ہر پھول اپنا خاص رنگ اور اپنی خاص خوشبو رکھتا ہے اسی طرح سیمابؔ شعرا اُردو کے گلشن میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ اُردو

ادب میں ریڈرشپ کی کمی کی وجہ سے بہت سے پبلشرز سیمابؔ صاحب کے کلام کو جس طرح پیش ہونا تھا پیش نہ کر سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام تر کلام سیمابؔ کا عمدہ طریقہ سے شائع ہوتا کہ اُردو کے پرستار اس عظیم شاعر کے کلام اور فکر سے آشنا اور محظوظ ہوسکیں۔ میرے کتب خانے میں سیمابؔ کے کچھ نایاب نسخے موجود ہیں جن سے وقتاً فوقتاً مستفید ہوتا رہتا ہوں۔

س : آپ کی کتابوں کی طویل فہرست ہے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے ان موضوعات پر تحقیقی کام کیا ہے جس کی طرف ابھی اُردو مشاہیر کی پوری توجہ مبذول نہیں ہوئی۔

ج : دُنیا کے ہر بڑے ادب میں شہرت اور اعتبار دو علاحدہ علاحدہ قدریں ہیں یہ ضروری نہیں کہ ہر شخصیت کو یہ دونوں اقتدار حاصل ہوسکیں چناں چہ اغلب یہ قدریں علاحدہ علاحدہ بستہ میں رکھی جاتی ہیں۔ اُردو ادب اور خصوصاً لطیف ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں لیکن بہرحال قدرت ایزدی کسی کی محنت کو ضائع نہیں ہونے دیتی اور مشہور ہے کہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے ریاضت کا ثمر مل جاتا ہے۔ اُردو گھوارے میں موجود افراد کی شناخت بدیسی اور پردیسی افراد کی نسبت اور رقابت، اُردو کا شب وروز کا ماحول بخصوص ان شخصیات کے لیے جن کی روٹی اُردو سے جڑی ہوئی ہے ایسے مواقع فراہم کرتا ہے جس میں شہرت کا پہلوا جاگر ہوتا ہے لیکن ان میں سے اکثر افراد بہت جلد سرنگوں اس لیے ہو جاتے ہیں کہ اس پرواز میں ان کی طاقت نہیں بلکہ دوسروں کی قوت شامل ہوتی ہے۔ ع

فوارہ چوں بلند شود سرنگوں شود

الحمدللہ میں اس گوشہ نشینی کے فیض و برکات سے مطمئن ہوں چوں کہ اُردو کی موجودہ عظیم ہستیوں کے سامنے اعتبار رکھتا ہوں۔ ذوق وشوق اور اُردو کی محبت میں دیوانگی حقیقت میں فرزانگی کا پروانہ بن جاتی ہے۔ آج کل بھارت میں اور پاکستان کی کراچی یونی ورسٹی میں اس حقیر وفقیر کے کام اور فن پر یونی ورسٹی کے طالب علم مقالے ترتیب دے رہے ہیں جو ہمت افزائی اور فن شناسی کا مثبت قدم ہے۔ میرے خیال میں ناقدین کی رائے، تبصرہ نگاروں کے اشارے شارحین کی

تشریحات، صحافیوں کے مبالغات وغیرہ سب کسی اہم کام کی رونمائی کے لیے مفید ہیں لیکن سچی اور کھری بات یہ ہے کہ ع

ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ

اور دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ اُردو ادب میں ریڈر شپ یعنی مطالعہ کی عادت بہت کم ہوتی جارہی ہے۔

س : آپ نے اُردو کے رثائی ادب پر عمدہ کام کیا ہے۔ خصوصاً مرزا دبیرؔ پر، میر انیسؔ کی ہمیشہ سے مرزا دبیر پر فوقیت حاصل ہے۔ شبلی نعمانی کا موازنہ انیس و دبیر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا فرماتے ہیں رثائی ادب کے محقق امام تقی عابدی؟

ج : سچ تو یہ ہے کہ ایوانِ مرثیہ کے دو بلند مینار انیسؔ اور دبیر ہیں۔ انیسؔ فلکِ مرثیہ کے آفتاب اور دبیر مہتاب ہیں۔ دونوں صاحبان عظیم شعرا تھے لیکن دونوں کا رنگ جدا جدا بقول مفتی محمد عباس صاحب ایک کے کلام میں نمکین ذائقہ اور دوسرے کے پاس شرین ذائقہ۔ اسی لیے لوگ بھی اپنی اپنی پسند سے دو گروہوں میں بٹ گئے تھے لیکن یہ کہنا کہ انیسؔ کے پاس واہ واہ ہے اور دبیرؔ کے پاس آہ آہ ہے غلط ہے دونوں شاعروں کے پاس واہ اور آہ کی آمیزش ہے اور یہی مرثیے کا حسن بھی ہے۔ انیسؔ فرماتے ہیں ؎

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

یہ سچ ہے کہ انیسؔ کے پاس سلاست شگفتگی اور روانی ہے دبیرؔ کے پاس لفظوں کی شان و شوکت دقیق کاری اور صناعی ہے جسے ہم دبیریت کہتے ہیں لیکن دونوں شاعروں کے پاس معنی آفرینی ندرت بیانی جدت اور مہارت ہے جسے معجز بیانی کہتے ہیں۔

بلوچستان یونی ورسٹی کے اُردو فارسی کے پروفیسر ہیرالال نے آج سے سو سال پہلے صحیح کہا کہ ''دبیر کے کلام سے اُردو کے ایوان کو سجایا جائے، دبیرؔ کو مت گھٹاؤ بلکہ اپنا مبلغ علم بڑھاؤ۔'' انیسؔ اور دبیر میری دو آنکھیں ہیں جن سے شعری فلک کا نظارہ

کرتا ہوں۔ مرزا دبیرؔ پر اب تک میری آٹھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ دبیر شناسی اُردو ادب کے لیے عموماً اور رثائی ادب کے لیے خصوصاً اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے اُردو ادب کی فصاحت و بلاغت کو ترقی ہوگی۔ مرزا دبیرؔ اُردو کا وہ عظیم شاعر ہے جس نے سب زیادہ اشعار کہے، سب سے زیادہ رباعیات لکھیں، سب سے زیادہ الفاظ اُردو میں استفادہ کیے لیکن افسوس کہ موازنہ انیس اور دبیر میں علامہ شبلی نے انصاف نہیں کیا۔ دبیرؔ کے فن، حسب، نسب، کسب اور کلام پر بے رحمانہ حملے کیے گئے۔ ہمیں دبیرؔ کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ مرزا دبیرؔ کے کلام میں میر انیسؔ کا رنگ نظر آتا ہے لیکن میر انیسؔ کے کلام میں دبیر کا پرتو بالکل نہیں۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ اُردو کی ترقی اور توانائی کے لیے دبیریت کو کالجوں اور مدرسوں کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ حسن یوسف کو بازار مصر میں پیش کرنا ہمارا فرض ہے۔ کوئی بھی نقاد کسی تخلیق کار کو مٹا نہیں سکتا۔ خدائے سخن میر تقی میرؔ فرماتے ہیں ۔

جانے کا نہیں شورِ سخن کا مرے ہر گز

تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

س : میر انیسؔ کی شاعری اور ان کے شاہکار مرثیہ پر جو عمدہ دیدہ زیب کتاب ہے اس کا اجمالی تعارف کروایئے؟

ج : میر انیسؔ کے شاہکار مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کا تجزیہ راقم نے تقریباً آٹھ سو صفحات پر کیا جو دُنیائے ادب میں مقبول ہوا۔ اس تجزیہ میں میر انیسؔ کی حیات، شخصیت اور فن پر کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔ مرثیہ کے ہر شعر کا جدا جدا مکمل تجزیہ کیا گیا جس میں فصاحت بلاغت، محاورے، روزمرّہ، تشبیہات، استعارات، کنایات اور مجاز مرسل وغیرہ کی نشاندہی کے علاوہ صنائع لفظی اور صنائع معنوی کو بتایا گیا اور اس طرح میر انیسؔ کی قادر الکلامی کی سند صرف ایک ہی مرثیہ سے ثابت کی گئی ہے کہ اس ایک مرثیہ میں صرف صنعتوں کی تعداد ڈھائی ہزار سے زیادہ ہے۔ تجزیہ کا عمل ہر شعر کو جداگانہ، پھر ہر بند کو جداگانہ اور آخیر شاہکار مرثیہ کا انگریزی ترجمہ پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز نے کر لیا تھا چناں چہ اس شاہکار کتاب میں

اس ترجمہ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

س : ''کلیاتِ غالب فارسی'' شاہکار کاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کتاب پر اجمالی گفتگو کیجیے؟

ج : غالب انسٹیٹیوٹ دہلی کی مرکزی کمیٹی نے مجھے غالب کے فارسی کلام کی تدوین اور ترتیب کی ذمہ داری سونپی چناں چہ راقم نے دقیق نگاری، دیدہ ریزی اور دلچسپی سے اس سنگین پتھر کو یک وتنہا اُٹھا کر محراب عشق پر ایسا جما دیا جو آئندہ وقتوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ چودہ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل دو جلدوں میں مرزا غالب کا فارسی کلام ایک بسیط دو سو صفحات کے مقدمے کے ساتھ جس میں کئی سو اشعار کا ترجمہ اور تشریح بھی شامل ہے گزشتہ سال کتابی صورت میں منظر عام پر آیا جس کی رونمائی دہلی میں گورنر جنرل اور سفیر ایران ڈاکٹر نبی زادہ نے کی۔ ''کلیاتِ غالب فارسی'' میں (11337) اشعار ہیں جن کو ہیتی تقسیم اور تاریخی تدوین اور ترتیب کے ساتھ رائج الوقت فارسی کے رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کلیات میں اختلافات نسخ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے اور اس کے علاوہ ایک مختصر منتخب سوانح عمری بھی قارئین کی معلومات کے لیے کامل دیباچہ اور انڈکس کے ساتھ رکھی گئی ہے تاکہ غالب کی فارسی شاعری کو سمجھنے میں آسانی اور اُن پر تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والے اسکالرس کو مطالب تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔

س : اُردو ادب میں آپ کو اقبال شناسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اقبال کے مضامین کے علاوہ کیا آپ اقبال پر لکھی گئی تصانیف پر روشنی ڈالیں گے؟

ج : ''علامہ اقبال کے عرفانی زاویے'' کی مقبولیت کے بعد راقم نے ''چوں مرگ آید'' تصنیف کی جس میں اقبال کے (251) خطوط جن میں ان کی بیماری، پرہیز اور دواؤں کا ذکر تھا استفادہ کیا گیا۔ اُردو ادب کا شاید ہی کوئی بڑا ادیب یا شاعر ہو جس نے اس تفصیل سے اپنی اور اس سے مربوط مسائل کا ذکر کیا ہو۔ اس کتاب میں اقبال کا موت کا فلسفہ اور زندگی کے کاروبار کا نقش کھینچا گیا ہے۔ عوام میں اس کتاب کی پذیرائی عمدہ طریقہ سے کی گئی۔ اس کتاب کو اقبال اکادمی لاہور نے

شائع کیا اور پوری کتاب میری ویب سائٹ www.drtaqiabedi.com پر پڑھی جاسکتی ہے۔ علامہ اقبالؔ اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد میں اس سال ''تقی عابدی کی اقبالؔ شناسی'' پر ایم اے کی ڈگری پر ایک طالبہ کام کررہی ہیں۔

س : آپ کی تصانیف اور تالیفات کی فہرست طولانی ہے؟ آپ نے بہت سی دیدہ زیب کتابیں اُردو ادب کو پیش کیں ہیں۔ آپ اپنی تصانیف کو قارئین تک کس طرح پہنچاتے ہیں؟

ج : میری (60) سے زیادہ کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ میری سب سے پہلی کتاب فارسی کی کتاب ''شہید'' کا اُردو میں ترجمہ تھا جو 1982ء میں تہران سے شائع کیا گیا۔ میری بعض کتابیں اقبالؔ اکادمی لاہور، غالبؔ انسٹیٹیوٹ دہلی، روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد کے علاوہ تعمیر انسانیت لاہور، اظہار اینڈ سنز لاہور اور ملتان سے شائع ہوئیں۔ بعض کتابیں دہلی اور حیدرآباد دکن سے بھی طبع کی گئی ہیں۔ جو کتابیں اکادمی، انسٹیٹیوٹ اور دوسرے پبلشرز نے شائع کی ہیں وہ سب ان انجمنوں کے تحت فروخت کی جاتی ہیں بعض کتابیں جو یہ ادارے مجھے مفت دیتے ہیں وہ میں اس کتاب کے حقدار قارئین تک بلا معاوضہ پہنچا دیتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ جو کتابیں میں خود اپنے خرچ سے شائع کرتا ہوں وہ بھی بلا قیمت اس لیے اُردو پرستاروں تک پہنچاتا ہوں کہ یہ سب توفیق خداوندی ہے کہ میں کچھ سرمایہ اس شریف زبان پر نچھاور کرسکوں اور شاید اسی کو ادب میں دامے، درمے اور سخنے خدمت کرنا کہتے ہیں۔ شاعر کی جملہ خواہشوں میں ایک خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کا دیوان یا مجموعہ کلام دیدہ زیب شائع ہو۔ مرزا غالبؔ نے اپنے خط میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اقبالؔ کا کلام اس زمانے کے عمدہ ترین مطبوعات میں شامل تھا چناں چہ جو دلی خواہش ان عظیم شعرا کی ان کے دلوں میں رہ گئی اس کی کسی حد تک واجب کفائی کرنے کی سعادت ان چند کتابوں کی صورت میں مجھے حاصل ہوئی۔ یقیناً اس پر آشوب اور کم فرصت کے زمانے میں کسی اُردو کتاب کا مطالعہ خود مصنف یا مؤلف کے لیے اس کتاب کی قیمت تصور کیا جائے تو غلط نہیں۔

س : اقبالؔ اور غالبؔ آپ کے پسندیدہ شعرا ہیں؟ اور دونوں نے فارسی میں بھی شاعری کی ہے۔ اگر دونوں کا موازنہ کیا جائے تو کون کس پر حاوی رہے گا؟

ج : دونوں عظیم شاعر ہیں لیکن بہرحال غالبؔ، غالبؔ ہے۔ اقبالؔ بڑے مقبول شاعر ہیں جو ہمیشہ غالبؔ کے گل چیں بھی رہے۔

س : آپ نے غالبؔ کے فارسی کلام کی تدوین کا کام بھی کیا ہے اور طویل پیش لفظ بھی تحریر کیا۔ حالاں کہ غالبؔ کا فارسی کلام پہلے ہی مدون کیا جا چکا تھا۔ آپ نے ایسا کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

ج : یوں تو غالبؔ کا فارسی کلام ان کی زندگی ہی میں ان کے اُردو کلام سے پہلے 1941ء میں شائع ہو چکا تھا اور اس کے بعد بھی مختلف مطبوعہ نسخے کچھ اشعار اضافہ کر کے شائع کیے گئے۔ آخری بار ''دیوانِ فارسی غالبؔ'' تقریباً تیس چالیس سال قبل لاہور سے شائع ہوا۔ راقم نے ''کلیاتِ فارسی غالبؔ'' کو مکمل طور پر تدوین کر کے تقریباً دو سو صفحات کے بسیط مقدمے کے ساتھ اور لگ بھگ چھ سو اشعار کے سلیس ترجمے کے ہمراہ شائع کیا۔ اس کلیات میں جو غالبؔ انسٹیٹیوٹ دہلی کی مرکزی کمیٹی نے شائع کیا پہلی بار (11337) اشعار کو ہیئتی تقسیم تاریخی ترتیب کے ساتھ رائج الوقت فارسی کے رسم الخط میں طبع کیا گیا۔ اس کلیات میں جو دو جلدوں میں ہے اختلافاتِ نسخ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ایک منتخب اور مختصر سوانح عمری بھی قارئین کی معلومات کے لیے کامل دیباچے اور انڈکس کے ساتھ رکھی گئی ہے تاکہ غالبؔ کی فارسی کو سمجھنے میں آسانی اور ان پر تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والے اسکالرس کو مطالب تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔ اوپر ذکر کی گئی ضروری ہدایات دوسرے نسخوں میں موجود نہ تھیں اس لیے ''کلیاتِ فارسی غالبؔ'' کو اکیسویں صدی کے ماحول میں پیش کرنے کی ضرورت کے تکملہ کے لیے راقم نے دقیق نگاری، دیدہ ریزی، اور دلچسپی سے یہ کام انجام دیا۔

س : غالبؔ کی نعت و منقبت اتنی مشہور نہیں ہو سکیں جیسا کہ ان کی اُردو غزلیں آپ نے ان کا کلام مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ غالبؔ کے منفرد نعتیہ کلام سے مختصر انتخاب

اور ان کی منقبت کے چند شعر مجھے بھی سنایئے؟

ج : یہ زمانے کی ستم ظریفی اور اُردو کی بدبختی تھی کہ غالبؔ کا عمدہ حمدیہ، نعتیہ، منقبتی اور رثائی کلام عوام کی نظروں سے دور رہا۔ حسن یوسف بازار مصر میں پیش ہونے کے بجائے برادران یوسف اُردو کی مجرمانہ سازشوں سے قید رہا، لیکن نور نے ظلمات کا دامن چاک کر کے قرطاس کی سپیدگی پر ظہور کیا اور راقم کی تحقیق، تدوین، تنقید اور تشریح سے یہ صحیفہ جو آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے بعنوان ''غالبؔ دیوانِ نعت و منقبت'' 2006ء میں شائع کیا گیا۔ اس میں غالبؔ کا تمام اُردو اور فارسی کا وہ کلام جو ان کی حمدوں، مناجاتوں، نعتوں، منقبتوں، سلاموں، نوحوں اور مرثیہ پر مشتمل ہے ترجمے کے ساتھ منتشر کیا گیا اور اُردو حلقوں میں بڑی پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس دیوان میں کل (2888) اشعار موجود ہیں۔ اس موقع پر ہم حمد، نعت، منقبت کے چند اشعار بطور تبرک پیش کرتے ہیں ؎

سپاسی کزو نامہ نامی شود
سخن در گزارش گرامی شود

یعنی وہ حمد کہ جس سے تحریر کی آبرو بڑھ جاتی ہے اور بات بیان میں وقعت پاتی ہے۔

حق جلوہ گرز طرز بیان محمدؐ ست
آری کلام حق بزبان محمدؐ ست

یعنی حق ظاہر ہوا حضرت محمد مصطفیؐ کے اندازِ بیان سے ہاں حق کا کلام محمدؐ کی زبان سے جاری ہوا۔

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ ست

یعنی غالبؔ نے حضورؐ کی ثنا کو خدا پر چھوڑ دیا ہے اس لیے کہ وہ صرف محمدؐ کے مقام اور مرتبہ سے واقف ہے ؎

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہؐ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوترابؑ میں

•••

میں قائل خدا و نبیؐ و امامؑ ہوں
بندہ خدا کا اور علیؑ کا غلام ہوں

•••

جس جگہ ہو مسند آرا جانشین مصطفیؐ
اس جگہ تخت سلیماں نقش پائے مور ہے

س : رثائی شاعری کے لیے آگرہ کا نام اُردو جہاں میں مکمل طور پر متعارف نہیں۔ سیمابؔ، بزمؔ، نجمؔ یہ تین بڑے نام ہیں۔ نجمؔ آفندی مرحوم نے سیمابؔ صاحب کے انشائیوں کا مجموعہ حسن کار کا دیباچہ بھی لکھا تھا۔ آپ نے دونوں مرحومین پر بھی تحقیقی کام کیا ہے اختصار کے ساتھ ان کا تعارف مع امثلہ کروایئے۔

ج : آگرہ کی سرزمین اُردو شاعری کی زرخیز زمین رہی ہے۔ آگرہ کی سجاوٹ تاج محل کے علاوہ ان نگینوں سے بھی ہے جنھوں نے فلک شعر و ادب پر روشنی کی۔ اکبر آباد کے سپوت یہاں پیدا ہو کر دوسری زمینوں میں اپنی عظمت کی بارگاہیں بنانے لگے۔ میر تقی میرؔ ہوں کہ غالبؔ، سیمابؔ اکبر آبادی ہوں کہ بزمؔ آفندی، نجمؔ آفندی ہوں کہ ان کے شاگرد صباؔ اکبر آبادی سبھوں نے اس گلشن میں پھول کھلائے۔ میں نے ان تمام شعرا کے رثائی ادب پر کام کیا۔ میرؔ، غالبؔ، بزمؔ اور صباؔ اکبر آبادی کے مرثیوں پر میرے ''مقالاتِ عروس سخن''، ''ذکر دُرباران'' اور ''سبدِ سخن'' میں شامل ہیں۔ سیمابؔ اکبر آبادی کی رثائی شاعری پر میرا مقالہ جو ان کی شاعری کا انفرادی لہجہ اور فلسفہ شہادت کا عمدہ نمونہ ہے بعنوان عاشق امام حسینؑ گراں قدر ماہنامہ ''شاعر'' کے علاوہ دیگر مجلات اور اخبارات میں چھپ چکا ہے۔ سیمابؔ اکبر آبادی قرآن احادیث اور تاریخ اسلام پر گہری اور دقیق نظر رکھتے تھے جس کا پرتو ہی ان کی شاعری میں ہے جس پر انشاء اللہ راقم تحقیقی

اور تشریحی کام کرے گا۔ جب کبھی کسی فن کار پر ظلم ہوتا ہے تو ادب کی روح تڑپ جاتی ہے۔ اس پر آشوب دُنیا میں حقدار کو حق نہیں ملتا چناں چہ دیگر افراد کی طرف میری بھی سعی و کوششیں یہی رہیں کہ ایسے نامور شعرا اور ادیب جن کے ساتھ اہل قلم انصاف نہ کر سکے ان کے فن اور شخصیت کو اُجاگر کیا جائے۔ بیسویں صدی کا عظیم شاعر تجمؔ آفندی کی حیات، شخصیت اور کلام پر دو جلدوں میں سترہ سو صفحات پر مشتمل کتاب برصغیر میں مقبول ہوئی اور اس طرح وہ عظیم شاعر جس نے انگریزی سامراج کے خلاف بغاوت کی جس نے مزدور، کسان اور محنت کش طبقہ کی حمایت کی اس کا تعارف اُردو ادب میں اس طرح سے ہو جس کا وہ حق رکھتا ہو چناں چہ ''کائناتِ تجمؔ'' اس سلسلہ کی وہ کڑی ہے جو ذہن انسانی کو گھیرے ہوئے ہے۔ ''کائناتِ تجمؔ'' میں ایسی نظمیں موجود ہیں جو اس بات کا محکم ثبوت ہیں کہ تجمؔ کے دل میں محنت کش طبقہ کا درد تھا بقول حسین آغا؎

کیوں دل جلوں کے لب پہ ہمیشہ فغاں نہ ہو
ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو

بزمؔ آفندی کا ایک ایسا نعتیہ شعر ذہن میں آرہا ہے جس کی مثال اُردو اور فارسی شاعری میں مشکل ہی سے ملے گی؎

ایک دن عرش پہ محبوب کو بلوا ہی لیا
ہجر وہ غم ہے خدا سے بھی اٹھایا نہ گیا

ان کے فرزند تجمؔ نے کہا؎

صورت گر ازل نے ترے اعتبار پر
اک مشتِ خاک تھی جسے انساں بنا دیا

•••

ملت میں تفرقہ کا نہ سامان کیجیے
قرآن کے ورق نہ پریشان کیجیے

•••

جاں دی تھی اتحاد کی خاطر حسینؑ نے
پورا شہیدِ ظلم کا ارمان کیجیے

•••

کچھ درد سے حسینؑ کے لے گدازِ دل
للّٰہ اپنے دل کو مسلمان کیجیے

•••

سرکارِ دو جہاں کی محبت کے نام پر
آپس کے اختلاف کو قربان کیجیے

•••

مرکز بنا کے آج حسینیؑ نشان کو
دُنیا میں اتحاد کا اعلان کیجیے

سیمابؔ شہادت امام حسینؑ سے ملت اسلام کو جگانے اور سنوارنے کا عزم رکھتے ہیں ؎

بالیقیں سیمابؔ یہ ذبحِ عظیم
خواب ابراہیمؑ کی تعبیر ہے

مولانا جوہرؔ نے کہا تھا ؎

قتل حسینؑ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

سیمابؔ کہتے ہیں کہ کربلا تو ہر جگہ برپا ہو سکتی ہے لیکن حسینؑ کا وجود ممکن نہیں؟

وہ جو کہتے ہیں شہادت ہر زمانے میں ہو عام
''جذبۂ صادق'' سے ہوسکتا ہے اس کا انصرام

•••

پوچھتا ہوں ان سے، تیرہ سو برس سے آج تک
کیوں نہ انسان نے لیا اس جذبۂ صادق سے کام؟

•••

کیوں خدا کی راہ میں دیتی نہیں یہ اپنی جان؟
آج بھی لاکھوں مجاہد ہیں کروڑوں ہیں امام؟

•••

روح ہے اسلام کی مدت سے مرجھائی ہوئی
جوش میں آتا نہیں کیوں ان کا خونِ لالہ فام؟

•••

ہر طرف اسلام پر طاری ہے یکگونہ جمود
سرفروشانہ یہ کیوں کرتے نہیں کچھ انتظام؟

•••

سب زبانی ہیں یہ باتیں، بے حقیقت بے دلیل
منصب ابن علیؑ کا ہوچکا ہے اختتام؟

•••

سبطِ شاہِ مشرقین، اب کوئی بن سکتا نہیں
بزمِ عالم میں ''حسینؑ'' اب کوئی بن سکتا نہیں

س : آپ کو اگر جہاں گرد کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ آپ اپنے اسفار پر بھی کتاب ''سفرنامہ تقی عابدی'' ضرور لکھیے۔

ج : یوں تو میں نے درجنوں سفرناموں کو بڑے شوق سے پڑھا ہے۔ میں نے جن جن ملکوں کو دیکھا ہے ان کی مختصر سی یادداشت بھی اسی زمان اور مکان میں قلم بند کرلی ہے۔ انشاءاللہ وقت ملتے ہی ان سفرناموں کو تصاویر کے ساتھ پیش کروں گا۔

س : آپ کی پسندیدہ صنف شاعری کون سی ہے اور ان میں آپ نے کیا کیا عروضی تجربے کیے؟

ج : نظم میری پسندیدہ صنف ہے میں غزل کہتا ہوا بھی نظم کا شاعر ہوں پابند نظم اور آزاد نظم میں بھی میں نے غزل کی مترنم بحروں سے استفادہ کیا ہے۔ چناں چہ میری بعض نظموں میں غزل کے مصرعے بولنے لگتے ہیں جس سے نظم کا اثر دوآتشہ ہو

جاتا ہے۔

س : ''عروسِ سخن''، ''سبدِ سخن'' اور ''ذکر دُرِ باران'' کا اجمال بھر تعارف کروایئے؟

ج : ''عروسِ سخن''، ''سبدِ سخن'' اور ''ذکر دُرِ باران'' میرے مقالات کے مجموعے ہیں یہ مقالہ میں نے مختلف شعر و ادب کے موضوعات پر گزشتہ دو تین دہائیوں میں مختلف اخباروں، جلسوں، سیمناروں اور میگزینوں کے لیے لکھے جنھیں کچھ کاٹ چھانٹ کر ان کتابوں میں یکجا کیے ہیں تاکہ ان موضوعات پر بھی مواد فراہم ہو سکے جو اُردو شعر و ادب میں خال خال ہیں۔

س : ''مصحفِ تغزل'' کیا ہے؟

ج : ''مصحفِ تغزل'' تجمّم آفندی، اکبرآبادی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں کلام کے ساتھ ساتھ اس میں کئی تنقیدی اور تاریخی مضامین جو شاعر کے فن اور شخصیت سے مربوط ہیں پیش کیے گئے ہیں۔

س : ''روپ کنوار کماری'' کیا کوئی تاریخی عشقیہ داستان ہے۔ لیلیٰ مجنوں طرز کی داستانوں کی؟

ج : ''روپ کنوار کماری'' کشمیری پنڈت خاندان کی پڑھی لکھی خاتون تھی وہ مداح محمدؐ و آل محمدؐ تھی اور فضل اللہ فضلؔ سہ پہری کی شاگرد تھی۔ روپ نے سلام، مرثیے اور قصیدے لکھے تھے راقم نے ایک بسیط مقدمے کے ساتھ ان کو کتابی صورت دی جو بہت مقبول ہوئی۔

س : دُنیا بھر میں آپ کا کتب خانہ شخصی کتب خانوں میں بے مثال ہے؟ اُردو ادب کے تقریباً تمام مشاہیر جو کینیڈا سے آتے ہیں اس کتب خانہ کو سراہتے ہیں۔ سنا ہے کہ اس میں اُردو فارسی قدیم اور کلاسیکی کتابوں کے علاوہ سینکڑوں مخطوطات بھی ہیں۔ ان کا اجمال بھر تعارف کروایئے؟

ج : میری ذاتی لائبریری میں تقریباً بارہ ہزار کتابیں ہیں۔ زیادہ تر کتابیں اُردو شعر و ادب کی ہیں لیکن تقریباً دو ہزار کتب فارسی شعر و ادب سے متعلق ہیں۔ ایک عمدہ تعداد میں انگریزی، عربی اور ہندی کی کتابیں بھی اس کتب خانے میں شامل ہیں۔

اُردو فارسی کی زیادہ تر کتابیں کلاسیک ادب، شعروشاعری، تنقید و تحقیق، تذکروں، سوانح عمریوں، لسانیات اور دیگر ادبی تخلیقات سے مربوط ہیں۔ شاید ہی دُنیا کی کسی ذاتی لائبریری میں انگلش ڈکشنری ویبسٹر (Webster) کی تقریباً تمام جلدیں جو گزشتہ دوسو سال میں مختلف مقامات سے شائع ہوئی ہیں ایک جگہ میری لائبریری کی طرح جمع کی گئیں ہوں۔ نعتیہ ادب، رثائی ادب، غالبیات، انیسیات، اقبالیات، رسائل، میگزین، دُنیا کی مختلف لائبریریوں میں موجود مخطوطات کی شائع شدہ فہرستیں بھی ہماری لائبریری میں ہیں۔

کئی اُردو، فارسی اور انگریزی ادب کے مطبوعہ پہلے ایڈیشن بھی ہم نے جمع کیے ہیں۔ میرے کتب خانے کا مقصد صرف جمع آوری نہیں بلکہ ان سے دن رات استفادہ ہے اور اس سے تحقیق اور ادب پر کام کرنے والے اسکالرس کو مواد فراہم کر کے مدد کرنا بھی ہے۔ جہاں تک قلمی ذخائر اور مخطوطات کا تعلق ہے میرے کتب خانہ میں چودہ سو کے لگ بھگ مخطوطات ہیں جن میں زیادہ تعداد قلمی مرثیوں، رثائی بیاضوں اور قدیم مسودوں کی ہیں۔ ان مخطوطات کو میں نے چالیس (40) سال کے عرصے میں جمع کیا ہے اس لیے اب ان مخطوطات کو یہاں کی یونی ورسٹی کو عطیہ کے طور پر کتب خانہ کی کتابوں کے ساتھ دینے کے لیے ضروری کارروائیوں میں مصروف ہوں۔ چوں کہ میرا تعلق تحقیق اور تنقید کے ساتھ بھی ہے اور میں نے ذاتی تجربات سے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ اُردو ادب کے یہ ذخائر تحقیق اور تنقید کے لیے ضروری ہیں اس لیے میری حیات تک یہ ذخائر میرے پاس موجود رہیں گے لیکن میرے مرنے کے بعد فوری یونی ورسٹی کے ذخائر میں ضم ہو جائیں گے تاکہ اُردو اسکالرس اس سے استفادہ کر سکیں۔ میں نے کتب خانہ اور مخطوطات سے اپنے قریبی اور دور کے رشتہ داروں کو اس لیے بھی بے دخل کر دیا کہ اس ادبی سرمایہ تک اُردو ادب کے پرستاروں کی رسائی ہو سکے ورنہ میرے تلخ تجربوں میں جہاں کہیں بھی نادر مخطوطات ہیں وہاں اس ذخیرہ پر خاندان کا کوئی فرد سانپ بن کر صندوق کے اوپر بیٹھا رہتا ہے اور دوسروں کو اس کے قریب بھی نہیں آنے دیتا

جس کا نتیجہ ذخیرہ دیمک کی نذر ہو جاتا ہے۔

کتب خانہ کی پرانی اور نادر کتابیں اور مخطوطات تمام تر برصغیر سے جمع کی گئی ہیں۔ رثائی ادب کی کتابیں اور کچھ قلمی مرثیے اور قلمی رثائی بیاضیں راقم کو ''جعفر منزل'' کے علمی ذخیرہ سے حاصل ہوئی ہیں جن کی تعداد کوئی خاص زیادہ بھی نہیں۔ مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ بہت سی کتابیں کینیڈا انہیں پہنچ سکیں اور یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں رہ گئیں۔ بہرحال رثائی ادب کا یہ ذخیرہ بھی جو چند سو کتابوں پر مشتمل ہے آئندہ مغربی دُنیا کی یونی ورسٹی میں محفوظ رہے گا۔ گزشتہ آٹھ دس سالوں میں مخطوطات کے تحفظ اور نگہداری کی بابت جدید ٹکنالوجی نے مسئلہ کو بڑی حد تک حل کر دیا ہے۔ بھارت میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً اب مخطوطات کو نئی زندگی دی جا رہی ہے۔ مختلف مراکز، ادارے اور عالمی شہرت یافتہ کتب خانہ اپنی اپنی ورک شاپوں میں یہ کام عمدگی سے کر رہے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی خارج از محل نہیں کہ دوبئی کے معروف تاجر جناب جمعہ الماجد نے شہر دوبئی میں ایک بڑا ورک شاپ اور برصغیر کے مختلف شہروں میں حسب ضرورت مخطوطات کی تعمیر کے سنٹرز کھولے ہیں جہاں دیمک خوردہ، شکستہ، خستہ مخطوطات کی تعمیر کو کرنسی کے کاغذ کی طرح مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ جناب جمعہ الماجد نے میرے دو قدیم مخطوطات کو عمدہ طریقہ سے تعمیر کر کے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ میرے تمام مخطوطات کو بغیر کسی معاوضے کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیں گے۔ چناں چہ ان حالات میں اب کسی فلم یا فوٹو کمپنی کی مشینوں کی ضرورت لاحق ہوگی۔

س : آپ نے کئی عمدہ کامیاب اُردو کانفرنس امریکہ اور کینیڈا میں منعقد کیں اور دُنیا بھر کی دوسری کانفرنسوں میں آپ شرکت کرتے ہیں اس کے بارے میں کچھ اطلاعات دیجیے؟

ج : امریکہ اور کینیڈا میں تین عالمی اُردو کانفرنسیں ہوئیں جن کا تعلق نیویارک ''اُردو ٹائمز'' سے تھا۔ ان کانفرنسوں کی مرکزی کمیٹی کا صدر مجھے بنایا گیا اس بڑی ذمہ داری کی وجہ سے میری خط و کتابت اور بات چیت مختلف شرکائے کانفرنس سے رہی

تا کہ کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں ان کی شرکت اور مختلف موضوعات پر ان کی عالمانہ گفتگو اور اس پر سیر حاصل مباحثہ ہو سکے جو کانفرنس کا مقصد بھی تھا۔ چناں چہ ان عالمی کانفرنسوں میں میرا وجود نمایاں رہا۔ ان شمالی امریکہ عالمی کانفرنسوں کے علاوہ بھارت، پاکستان، انگلینڈ، مڈل ایسٹ کی بعض عالمی اُردو کانفرنسوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا، چوں کہ میرا تعلق اُردو کی نئی بستیوں سے ہے اور ان نئی بستیوں کی حیات کا دار و مدار اُردو کے گھوارے سے ضروری ہے۔ اس لیے بھی اس ارتباطی پُل کو برقرار رکھنے کی خاطر شرکت مفید ثابت ہوئی شمالی امریکہ عالمی کانفرنسوں کے اجلاس کے مضامین اور بحث و مباحثہ کے مطالب نے بھی ہمیں دوسری عالمی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے لازمی جانا۔ یہ ہمیشہ میری کوششیں رہی ہیں کہ ہر کانفرنس میں اپنا مقالہ اور اپنا موردِ نظر، نظریہ پیش کر سکوں اور اس کام کے لیے ہوم ورک بھی ضروری جانتے ہوئے میں ان افراد کے گروہ میں شامل ہو گیا جن کا کانفرنس میں شرکت کا مقصد تفریح یا سیاحت نہیں بلکہ ایک علمی ادبی اور تحقیقی کاوش ہو۔ گزشتہ تیس سال مغربی دُنیا میں رہتے ہوئے مختلف مقامات کی سیر آرزو نہیں رہی یہ سچ ہے کہ میں کسی بھی ادارے یا اکادمی سے سفر و حضر کے مطالبات نہیں کرتا اگر کوئی ان سہولتوں کو مہیا کر دے تو شکریہ کے ساتھ قبول کر لیتا ہوں ورنہ یہ کوئی ایسا بھاری پتھر بھی نہیں جس کو میں اُٹھا نہ سکوں۔ بقول انیس ؎

کسی کے سامنے کیوں ہاتھ جا کے پھیلاؤں

مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

س : اُردو کی نئی بستیوں میں امریکہ اور کینیڈا دو بڑے ممالک ہیں ان دونوں ممالک میں اُردو کل آج اور کل پر روشنی ڈالیے؟

ج : اُردو کی نئی بستیوں میں اُردو کا فروغ جاری ہے اب اُردو صرف اُردوئے معلیٰ تک محدود نہیں بلکہ اُردوئے محلّہ میں رونق بازار ہے۔ اب اُردو کا پرچم اُردوئے معلیٰ نہیں بلکہ اُردوئے محلّہ پر لہرا رہا ہے۔ دبستان دہلی، لکھنؤ، آگرہ، حیدرآباد، پنجاب وغیرہ میں اُردو کی نشو و نما کے لیے جدید لسانی تجربات کی ضرورت ضروری

ہے۔ کسی دبستان کو دوسرے دبستان پر اس دور میں فوقیت حاصل نہیں اور اُردو ادب عالمی شہرت کا حامل ہے۔ اب داغ کا شعر زمان ومکان کی حدوں سے نکل چکا ہے ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

امریکہ اور کینیڈا میں آج کل اُردو بولنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ دوسو کے قریب مشاعرے اور سو کے اوپر ہفتہ وار اخبارات کئی اُردو ریڈیو پروگرامس، کئی عمدہ اُردو ٹی وی چینل کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر ادب عالیہ کی تحقیق اور تنقید کا کام بھی ہو رہا ہے۔ راقم نے ان ہی ملکوں میں رہ کر اُردو کے گیسو کو سنوارنے کی کوششیں کی ہیں۔ کینیڈا اور امریکہ کی بعض یونی ورسٹیوں میں اُردو بھی پڑھائی جاتی ہے۔ گہوارے اُردو کی طرح یہاں بھی اُردو اب کانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے آنکھوں کی زبان نہیں رہی جس کے لیے اس کی بنیادی تعلیم کی ضرورت ہے۔

س : اُردو رسم الخط کی اہمیت کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

ج : جہاں تک اُردو رسم الخط کا مسئلہ ہے میرا نقطۂ نظر بالکل صاف اور برملا ہے۔ جس میں کسی قسم کی گنجائش نہیں۔ میں اُردو رسم الخط کی ہر طور حفاظت کو اُردو کے لیے لازمی سمجھتا ہوں اُردو رسم الخط اُردو کے جسم پر اس کی چمڑی کے مانند ہے جسے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو رسم الخط اُردو کی آن بان اور پہچان ہے اسی رسم الخط میں اُردو تہذیب اور اُردو کی علمی، ادبی اور ثقافتی اقدار شامل ہیں۔ راقم نے مختلف اُردو عالمی کانفرنسوں میں واضح طور پر اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ اُردو رسم الخط کی حفاظت کی ذمہ داری خود اُردو والوں پر ہوتی ہے اگر اُردو والے اس رسم الخط کو اپنی نئی نسل میں منتقل کر دیں تو دُنیا کی کوئی طاقت اُردو رسم الخط کو ختم نہیں کر سکتی۔

خاکسار نے ایک عالمی کانفرنس کے لیے لندن کا سفر کیا تھا۔ وہاں ادباء کے درمیان اُردو کی رثائی شاعری پر مکالمہ شروع ہوا تو خاکسار نے کہا کہ ''اُردو غزل آج تک مراثی کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکی۔'' کیا خیال ہے آپ کا؟

ج : میں آپ کا ہم خیال ہوں۔

س : کراچی شہر میں ایک مرثیہ اکاڈمی قائم ہے لیکن ہندوستان میں لکھنؤ ایک ایسا شہر ہے جہاں اس نوع کی اکاڈمی قائم ہوسکتی تھی اُردو کی نئی بستیوں کا حال کیا ہے، خاکسار کے علم میں نہیں اس موضوع پر اگر آپ روشنی ڈال سکیں تو ''شاعر'' کے بے شمار وہ قارئین جو رثائی شاعری پسند کرتے ہیں ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا؟

س : اُردو کی نئی بستیوں میں مرثیہ نگاری ہورہی ہے۔ مرثیہ پر درجنوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پانچ ہزار سے زیادہ مجالس اُردو میں مغربی دُنیا میں سالانہ ہوتی ہیں جن میں اُردو سلام، مراثی، نوحے پڑھے جاتے ہیں۔ عزاداری کی ضرورت کے تحت تخلیقی کام بھی ہورہا ہے۔ جرمن میں اقبال حیدر، انگلینڈ میں رضا حسن غدیری، نیوجرسی میں شہاب کاظمی، واشنگٹن میں باقر زیدی، عارف امام، سرفراز ابد، ٹورنٹو میں آصف اختر، عابد جعفری، قسیم امروہوی وغیرہ مرثیہ لکھ رہے ہیں۔

س : علامہ سیماب نے مثنوی معنوی مولانا روم کی طویل مثنوی کا اُردو ترجمہ کیا تھا جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے کیا اور بھی کسی نے مذکورہ مثنوی کا اُردو منظوم ترجمہ کیا ہے؟

ج : مولانا روم کی مثنوی معنوی میں تقریباً چھبیس ہزار اشعار ہیں۔ اگرچہ ہمارے درمیان نثری تراجم موجود ہیں لیکن میری دانست میں بجز علامہ سیماب کسی اور نے منظوم ترجمہ نہیں کیا۔ یہ بڑے جگر کاوی کا کام ہے میری نظر میں ان تمام جلدوں کو دوبارہ شائع ہونا چاہیے تاکہ اُردو طبقہ مولانا روم کی شاعری اور فکر کے علاوہ سیماب کی سخن فہمی اور سخن گوئی سے استفادہ کرسکے۔

س : آپ نے فارسی زبان میں بھی دسترس حاصل کی ہے اُردو کی بیشتر اصناف ایران ہی سے ہندوستان آئی ہیں بالخصوص غزل اور رباعی؟

ج : یہ بالکل سچ ہے کہ اُردو غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ فارسی اور عربی زبان سے ہمیں ملے ان کی ظاہری تراکیب اور اصول وہی ہیں جو خارجی زبانوں میں ہیں لیکن جہاں تک معنی آفرینی کا تعلق ہے ان کی جڑیں ہمارے ملک کی زمین میں

گڑھی ہیں اسی لیے اس شاعری کو سبک ہندی کہتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا۔

مسنج شوکتِ عرفی کہ بود شیرازی

مشو اسیر جلالی کہ بود خوانساری

بہ سومناتِ خیالم در آی تا بینی

روان فروز برودوش ھای زناری

یعنی تم عرفی اور شوکت سے مرعوب اس لیے نہ ہو کہ ان کا تعلق شیراز سے تھا۔ تم اسیر جلالی کے اسیر اس لیے نہ ہو کہ وہ خوانسار ایران سے تھا۔ تم میری سومناتی دُنیا میں آؤ اور دیکھو کہ میرے تجلیاتی روح کو گرمانے والے سومناتی خیالات ہیں اگر چہ میرے سینے اور کاندھوں پر زنار کا دھاگا پڑا ہوا ہے۔

س : آپ علم و ادب کے سیاح ہیں اور جہاں گرد بھی ہیں گلوبل ولیج کے سرد و گرم سے پوری طرح آشنا ہیں تو آپ کس طرح کا موسم پسند کرتے ہیں۔ کس ملک کا موسم آپ کو پسند ہے؟

ج : ہر ملک کا وہ موسم جس میں کولر اور ہیٹر کی ضرورت پیش نہ آئے۔

س : آپ نے ایک ایرانی خاتون سے شادی کی اور کامیاب ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ تو کیا آپ عشق کی لذتوں سے بھی آشنا ہیں؟

ج : عاشقی میرا دین و مذہب اور زندگی کا رابطہ ہے۔

س : کس طرح کی پوشاک آپ پسند کرتے ہیں؟

ج : آپ نے خود دیکھا ہے اور تصاویر شاہد ہیں۔

س : آپ کی مرغوب غذائیں کون کون سی ہیں اور کیوں پسند ہیں؟

ج : حیدرآباد کی بریانی، دلّی کا قورمہ اور ایرانی کباب۔

س : مشروبات میں آپ کی پسند کے مشروبات کون کون سے ہیں؟

ج : چائے، لسی اور فالودہ۔

س : پسندیدہ تیوہار کون سے ہیں؟

ج : عیدالفطر، دیوالی۔

س : اب تک کی دُنیاوی زندگی سے آپ مطمئن ہیں؟

ج: خدا کا شکر ہے۔ مولانا روم

ع : "شکر نعمت، نعمت ات افزوں کند"

س : ہر ذی روح سوچ بھر خواب بھی دیکھتا ہے آپ کے خوب سیرت خواب کیا تھے اور اب کیا ہیں؟

ج : خواب دیکھنا میرا حق ہے۔ تعبیر کا انتظار ہے۔

س : نئے محققوں کے لیے موضوعات تجویز کیجیے۔

ج : جواب ان صفحات میں مشکل ہے۔

س : دہلی کے سفر میں ڈی ڈی اُردو نے آپ سے ایک ملاقات کے عنوان سے مکالمہ کیا تھا تب آپ نے (34) کتابوں کا ذکر کیا تھا۔ اب آپ کی کتابیں کتنی ہیں؟

ج : میری (60) سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں کچھ اور زیرِ تالیف ہیں۔

س : از حد شکر گزار ہوں کہ آپ کے قیمتی وقت میں سے خاصہ وقت میں نے چرا لیا ہے۔ معذرت خواہ ہوں۔ اب میں جب بھی کسی عالمی مشاعرے میں کینیڈا آؤں گا تو پھر مفصل مصاحبہ کروں گا۔

ج : آپ کا انتظار رہے گا۔

(ماہنامہ "شاعر" ممبئی، اکتوبر 2015ء)

سید فاضل حسین پرویز

اُردو کی نئی بستیاں

"اُردو زبان، شعراء ادیبوں کی ناقدری سے اُجڑ سکتی ہیں۔" تقی عابدی
کینیڈا میں مقیم حیدرآبادی ادیب، محقق، نقاد، دانشور
ڈاکٹر سید تقی عابدی سے بات چیت

ہندوستان اور پاکستان کو چھوڑ کر دُنیا کے کسی بھی ملک میں اگر اُردو کا فروغ ہو رہا ہے تو اسے اُردو کی نئی بستی کہیں گے۔ یہ سچ ہے کہ اُردو کی نئی بستیاں آباد ہوئی ہیں مگر امید ہے کہ یہ بستیاں آباد رہیں گی بشرطیکہ یہاں سنجیدگی کے ساتھ اُردو کی ترویج واشاعت کے لیے کام کیا جائے گا۔ اُردو کی نئی بستیوں کی اُردو تہذیب سے وابستگی ضروری ہے۔ اُردو انجمنوں اور اُردو یونی ورسٹیز کو اس کے لیے آگے بڑھنا ہوگا۔ ارتباط لازم ہے اور اُردو کا سب سے بڑا مسئلہ بنیادی تعلیم ہے۔ جب تک مکتب میں اُردو نہیں سکھائی جائے گی اُردو کی ترقی ممکن نہیں۔ ان خیالات کا اظہار کینیڈا میں مقیم ممتاز شاعر، ادیب، محقق، نقاد اور مورخ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کیا۔

سرزمین دہلی کے ایک مایہ ناز سپوت سید تقی حسن عابدی کی یکم مارچ 1952ء کو دہلی میں جناب سید سبط نبی عابدی (منصف) کے یہاں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد سے MBBS ایم. بی. بی. ایس. کی تکمیل کی۔ برطانیہ میں ایم. ایس. کیا۔ امریکہ میں ایف. سی. اے. پی اور کینیڈا سے ایف. آر. سی. پی.۔

یوں تو میڈیکل ڈاکٹر ہیں مگر ادبی میدان میں سب سے بڑے نقاد کے طور پر ابھر رہے ہیں۔ 34 کتابوں کے مصنف ہیں۔ کئی اور کتابوں کی تالیف کر رہے ہیں۔ دُنیا کے مختلف ممالک میں اُردو کا کارواں لے جاتے ہیں وہاں سے کچھ سیکھ کر آتے ہیں مگر حقیقت تو

یہ ہے کہ اپنے تجربات کی دولت لٹا کر واپس آتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی معلومات کے بحر بیکراں ہیں۔ کسی بھی موضوع پر وہ گھنٹوں مدلل تقریر بحث کرتے ہیں اور ان سے ملنے والوں کو کبھی بھی وقت کے گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ گزشتہ دنوں مختصر سے قیام کے لیے حیدرآباد تشریف لائے تھے اس موقع پر انھوں نے ''گواہ'' کو مختصر انٹرویو دیا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے یہ ادھورا رہ گیا مگر جو کچھ بھی ان سے بات چیت ہوئی اس کا خلاصہ قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ اس ملاقات کا اہتمام ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے کیا تھا اور اس موقع پر ڈاکٹر شجاعت علی (ہیڈ ڈیپارٹمنٹ آف اُردو یشونت کالج، ناندیڑ)، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی بھی موجود تھے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''اُردو شاعروں، ادیبوں اور تخلیق کاروں کی ناقدری سے اُردو کی نئی بستیوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اُردو کی ترقی، ترویج و اشاعت کے لیے اُردو مزاج کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ مشاعروں سے اُردو کی ترقی نہیں ہو سکتی کیوں کہ مشاعرے اب آموزشی پلیٹ فارم نہیں رہے۔ شعرا اپنا مقام کھو چکے ہیں۔ وہ اپنی چھ شعروں کی غزل ساٹھ بار سنا کر چھ سو بار داد حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ سستی شہرت کے لیے ایسے حضرات جن کا اُردو ادب سے کوئی تعلق نہیں رہتا چند ڈالرس خرچ کر کے ہر وہ شئے خریدنا چاہتے ہیں جس کے وہ حق دار نہیں۔ یہ دراصل کاغذی شیر ہوتے ہیں جن کی اصلیت چند دن میں سامنے آجاتی ہے۔ دراصل مشاعرے بھی اپنی ذہنی عیاشی کی خاطر ہونے لگے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''کینیڈا میں ناظم الدین مقبول نے سنڈے اسکول کے ذریعہ اُردو کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ نارتھ امریکہ میں پہلے سنڈے اسکولس کے ذریعہ اُردو کا کام ہو رہا تھا مگر اب ان اسکولس پر دوسروں نے قبضہ کر کے اُردو کو نقصان پہنچایا ہے۔ اب تو جمعہ کے خطبات تک انگریزی میں ہونے لگے ہیں۔ صرف مجالس عزا، ہی اُردو میں ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''والدین کو احساس نہیں ہے کہ کس طرح اپنے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دلائی جائے تاکہ اپنی تہذیب سے ان کا رشتہ قائم رہ سکے۔ نئی نسل اُردو نہ تو پڑھتی ہے اور نہ ہی بولتی ہے۔ جب تک نئی نسل کا رشتہ اُردو سے جوڑا نہیں جائے گا اس

وقت تک اُردو کے مستقبل سے متعلق کچھ کہنا اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دے لینا ہے۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''اُردو رسم الخط کی تبدیلی کے لیے ایک منصوبہ بند سازش کے تحت وقفہ وقفہ سے تحریکات شروع کی جاتی ہیں۔ رسم الخط ہی زبان کی پہچان ہے۔ جب اسے ہی تبدیل کر دیا جائے تو پوری تہذیب کو ختم کر دینے کے مماثل ہے۔'' انھوں نے نام نہاد دانشوروں اور اُردو نقادوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ''ان کی تخلیقات میں اُردو کی اہمیت سے زیادہ خود اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لیے مغربی ادیبوں اور ناقدین کے حوالے دیے جاتے ہیں جس سے ان کے ادھورے پن کا ثبوت ملتا ہے۔ اُردو سے زیادہ کس زبان میں اتنی شیرینی اور گہرائی ہے؟ اس کی ایک معمولی مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ ایک شعر کی مختلف انداز میں ترجمانی کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر مرقص شعر، جسے سن کر رقص کرنے کو جی چاہے۔ اسی طرح مقبول، مطرب، مسموع اور متروک شعر۔ کیا کسی اور زبان کی مدد کی ضرورت ہے؟

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''اُردو کی بقاء کے لیے اُردو کتابیں ضروری ہیں۔ ٹورنٹو میں ایک لائبریری میں ایک لاکھ سے زائد اُردو کتابیں موجود ہیں۔ اب آہستہ آہستہ کتابوں کا کلچر ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو اُردو کو ختم کرنے کی کوشش ہوگی۔

تقی عابدی نے ڈاکٹر جمیل جالبی کو خراج تحسین پیش کیا جو اُردو ادب اور تاریخ میں بے مثال کام کر رہے ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ''اُردو کے کسی بھی خدمت گزار پر تنقید کا کسی کو بھی حق حاصل نہیں ہے۔ تنقید برائے تعمیر ضروری ہے مگر اُردو کی بنیادوں کا استحکام بخشنے والوں پر غیر ضروری تنقیدیں ناپسندیدہ ہیں۔''

گلزار جاوید
ماہنامہ ''چہار سو'' راولپنڈی
مئی۔ جون 2009ء

براہ راست

اُردو زبان اور اس سے وابستہ علوم وفنون کی ہر دلعزیزی کی بابت جس قدر جی چاہے خوش امیدی و خوش گمانی قائم کر لیجیے! حق کی بات یہ ہے کہ اُردو زبان کے دعوی داروں اور اجارہ داروں کی نسبت وہ علاقے اور احباب زیادہ ایمان داری اور تندہی سے اُردو کی خدمت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں جہاں یہ زبانِ لطیف اور اس سے وابستہ دفینے نہ صرف نامانوس، اجنبی بلکہ نامحفوظ بھی ہیں۔ جب جب بات سمندر پار عاشقانِ اُردو کی ہوگی تب، تب بے شمار نام اور چہرے حافظے کے پردے پر جلوہ گر ہوکر آپ کو اپنی جانب متوجہ ضرور کریں گے۔ ذرا سے غور اور تھوڑی سی فکر کے بعد جو نام سب سے زیادہ روشن، نمایاں اور بلند مقام کا حامل دکھلائی دے گا وہ صرف اور صرف ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ہوگا۔ آج کی محفل ہم نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی و ادبی کاوش اور کارناموں کے اقرار و اعتراف کی غرض سے صرف اس لیے سجائی ہے کہ درست وقت پر درست انداز میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی و ادبی خدمات کا نہ صرف اعتراف کیا جائے بلکہ اپنی زبان اور ادب کے بہتر مستقبل کی خاطر کشادہ دلی سے اُن کی پذیرائی کچھ اس انداز میں کی جائے کہ انیس، دبیر، غالب اور اقبال کی ارواح کو اتنا اطمینان تو ہو کہ اہلِ اُردو نے اُن کی زندگی میں انھیں نہ سہی اُن کے ایک سچے عاشق اور نیاز مند کو اس کی زندگی میں بقدرِ ذوق سرفراز کیا......!

گلزار جاوید

س : ڈاکٹر صاحب! آپ کی علمی، ادبی اور تخلیقی جہات سے باخبر حلقے آپ کی شخصیت سے اُس طور واقف نہیں جس طور آپ کے کارناموں سے آگاہ ہیں۔ کیوں نہ آج

کی نشست میں گفتگو کی ابتداء خاندانی پس منظر سے کی جائے؟

ج : میرا آبائی تعلق امروہہ سے متصل سادات کی بستی نوگاؤں سادات سے ہے۔ ہمارا خاندان سید بڑے کا خاندان کہلاتا ہے اور ہمارا شجرہ نسب حضرت نظام الدین اولیا سے جا ملتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی ثانی اسی نسبت سے مجھے اپنا رشتہ دار کہا کرتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں رائج علوم کے بے شمار علماء گزرے ہیں۔ ہمارے جد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ''حق الیقین'' نامی دو سو اٹھارہ سال پرانی کتاب میرے پاس ابھی بھی محفوظ ہے۔ میری پیدائش البتہ دہلی میں ہوئی اور حیدرآباد دکن بچپن ہی سے میرا وطن بن گیا۔ بچپن ہی سے شعر و ادب سے خاصی دلچسپی رہی جس کے باعث اسکول و کالج کے ایام میں شعری مشغلہ جاری رہا۔

س : آباء کا پیشہ اور دہلی منتقلی کے اسباب پر روشنی ڈالیے؟

ج : میرے دادا سید شبیر علی عابدی تک ہمارا خاندانی پیشہ زمینداری ہوا کرتا تھا۔ میرے والد سید سبط نبی عابدی نے سب سے پہلے اعلیٰ تعلیم کے ساتھ قانون کی ڈگری بھی حاصل کی اور دہلی میں مجسٹریٹ متعین ہوئے ازاں بعد والد صاحب کا تبادلہ حیدرآباد ہو گیا اور یوں ہمارا مستقل مسکن حیدرآباد دکن بنا۔

س : آگے بڑھنے سے قبل کھیل کود کے میدان اور علمی درسگاہوں کے ایام کو کچھ دیر کے لیے آواز دیجیے؟

ج : میں نے عرض کیا نہ کہ گھریلو ماحول علمی و ادبی ہونے کے ناطے کھیل کود تو میں اُس قدر ہی کھیل سکا جس قدر بچپن میں عام بچے کھیلتے ہیں۔ میرے والد صاحب کو بھی شاعری سے شغف تھا اور انہی سے یہ وصف میرے اندر بھی منتقل ہوا۔

س : آپ نے باقاعدہ شعر کہنا کب اور کس طور شروع کیا؟

ج : فطری شاعری ایک قدرتی چشمے کی مانند آپ ہی آپ سینے سے اُبل پڑتی ہے، یہی فرق ایک فطری اور اکتسابی شاعر میں ہوا کرتا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اسکول میں شاعری کا ماحول قطعی نہ تھا اور اسے اتفاق کہیے کہ کالج میں بھی شعر و ادب کا گزر نہ ہونے کے برابر تھا۔ چوں کہ میرے دل میں شعر و شاعری کی نسبت خاص اُمنگ

تھی اس لیے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر شعر و سخن کی محافل میں شرکت کرتا اور بیت بازی کے مقابلوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں شاعری کو اپنی شناخت بنانا چاہتا تھا مگر جب تعلیم اور معاش کی بندشوں سے ذرا فرصت ملی اور میں نے شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا تو بہت ہی کم عرصے میں بطور شاعر میری شناخت قائم ہوگئی۔

س : اب سوال بنتا ہے قلم و کتاب سے آپ کے سنجیدہ عشق یعنی نثری سفر کے آغاز اور اُس کے ابتدائی نتائج کا؟

ج : روزنامہ ''سیاست'' اور حیدرآباد کے بعض مجلّوں میں میرے مضامین کی ابتداء اُس عمر میں ہوگئی تھی جسے انگریزی میں Teen Age کہا جاتا ہے۔ روزنامہ ''سیاست'' کے ایڈیٹر مرحوم عابد علی خاں اور جوائنٹ ایڈیٹر محبوب حسین جگر ہمیشہ میری ہمت افزائی کرتے اور میرے مضامین کو شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کرتے جس کے سبب مذکورہ مضامین میری شناخت بن گئے۔ میڈیکل کالج اور مغربی ممالک کی اعلیٰ تعلیم کے دوران شاعری سے کسی قدر کنارہ کش رہ کر جرنلزم اور صحافت کے حلقے میں شامل ہوا۔ اس کے بعد میری توجہ طب سے زیادہ ادبی مضامین پر مرکوز ہوگئی اور میرے اندر سویا ہوا شاعر اور ادیب پھر سے جاگ اُٹھا۔ اس دوران میرا ادبی و شعری مطالعہ شدید اور بھرپور رہا۔ ایک ہفتے میں کئی کئی کتابیں کھنگال ڈالتا اور اکثر کتابوں کے حاشیوں پر نوٹس بناتا اور اس طرح کئی دفتر اپنے لیے نوٹس اور مطالب کے تیار کر لیے۔

س : بیرون ملک آمد کب اور کس مقصد کے تحت کی گئی؟

ج : آپ کے سوال کا جواب میرے تعلیمی سفر کے اندر پنہاں ہے اور یہی میری بیرون ملک آمد کا واحد جواز تھا۔

س : امریکہ سے کینیڈا منتقلی کے اسباب کیا تھے؟

ج : ہر آدمی پرسکون اور پرلطیف زندگی کا متلاشی ہوا کرتا ہے۔ امریکہ کی نسبت کینیڈا کا ماحول پُرسکون ہے اور صرف انچاس سال کی عمر میں جس وقت میرے موجودہ

ادارے نے مجھے پروفیسری کے اعزاز کے ساتھ یہاں کام کی دعوت دی تو میرے خاندان کا متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ کینیڈا میں مستقل سکونت اختیار کرنا ہمارے لیے ہر لحاظ سے سودمند ہوگا۔ اس کی ایک اور وجہ میری بیٹی کا میڈیسن میں داخلہ بھی بنا۔

س : محترمہ گیتی عابدی سے پہلی ملاقات سے خاتون خانہ تک کی مختصر روداد آپ کے قلمی سفر میں اُن کے کردار دلچسپی کی بابت کچھ فرمائیے؟

ج : مختصر طور پر آپ کے سوال کے جواب میں یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ بطور طبیب جب میں ایران میں مشاغل تھا تو میری خاتون خانہ سے وہیں ملاقات ہوئی اور تھوڑے عرصے بعد ہم دونوں کی رضامندی اور بڑوں کی اجازت سے ہماری شادی ہوگئی۔ میری شریک حیات گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی تعلیم وتربیت کے علاوہ میرے قلمی جہاد میں ہمیشہ میری معاونت کرتی رہی ہیں اور آج بھی ان کے تعاون کے بغیر میرا ادبی سفر جاری رکھنا ناممکن ہے۔

س : آپ کی فارسی زبان وادب کی جانب توجہ میں محترمہ کا کس قدر کردار یا تعاون شامل ہے۔

ج : باقاعدہ فارسی کی تعلیم میں نے قیام ایران کے دوران ایرانی معلّم سے حاصل کی۔ ازاں بعد فارسی ادب اور فارسی شعراء کے کلام کا مطالعہ کر کے اپنی تحقیق اور تخلیق کے سفر میں اس گنج بے بہار سے بے پناہ استفادہ کیا۔ بہر حال چوں کہ ہمارے گھر کی زبان فارسی ہے اس لیے خاتون خانہ کا کچھ نہ کچھ کردار میری فارسی دانی میں لامحالہ شامل ہے۔

س : اس مقام پر آپ کی اولاد، اُن کے مشاغل اور آپ کی مصروفیات کی نسبت اُن کی توجہ واشتیاق سے واقفیت بھی ضروری ہے؟

ج : ہماری چار اولادیں ہیں، دو بیٹیاں اور دو بیٹے۔ میرے بچے فارسی بولنے کے ساتھ کسی حد تک پڑھ لکھ بھی سکتے ہیں اور میری خصوصی توجہ کے باعث اُردو زبان سمجھتے اور کچھ کچھ بول لیتے ہیں۔

س : گہرے مشاہدے کی بات ہے کہ ادبی جتھوں، گروہوں، ٹی ہاؤس، حلقوں اور

محافل میں سرگرم نہ ہونے والے اہلِ قلم کو کم کم سندِ اعتراف دی جاتی ہے۔ آپ کے بارے میں اس حوالے سے صورت حال کس قسم کی ہے؟

ج : گلزار صاحب! معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ آپ کا سوال مجھے کچھ کچھ Out of Date سا محسوس ہو رہا ہے۔ میری ذات سے قطع نظر پڑھے لکھے اور روشن دماغ اہل قلم کے پاس اس قسم کی مصروفیات کے لیے کم از کم آج کل وقت دستیاب نہیں ہے اور مغرب کی تیز رفتار زندگی میں تو اس قسم کے اشغال کا تصور بھی محال ہے۔

س : ڈاکٹر صاحب! آپ علمی، ادبی اور تہذیبی طور پر کس دبستان سے قربت رکھتے ہیں۔ مثلاً دہلی، لکھنؤ، لاہور، حیدر آباد، کراچی وغیرہ نیز ان حوالوں کی اب کوئی حیثیت ہے بھی کہ نہیں؟

ج : میں اس سوال کو بھی اس سبب لائق توجہ نہیں گردانتا کہ جو شخص کسی دائرے یا خول میں جس دن گرفتار ہوا اُسی دن اس کے سیکھنے کا عمل یوں جانیے کے ختم گیا۔ میں تمام مکاتب فکر کا احترام کرتا اور ان کی مثبت تعلیم سے فیضیاب ہونے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہوں اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔

س : کبھی کبھی آپ کی قلمی فتوحات دیکھ کر رشک آتا ہے کہ آپ جیسا بلند پایہ پیشہ ور طبیب تصنیف و تالیف کے لیے اس قدر وقت کیوں کر نکال پاتا ہے۔ کیا آپ ہمیں اپنے نظام الاوقات سے باخبر کرنا پسند کریں گے؟

ج : اگر سچ کہا جائے تو زندگی میں وقت کی کمی نہیں ہے۔ وقت کی کمی کو بہانہ بنا کر ہم لوگ بہت سے کاموں سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود ہر ہفتے اوسطاً پینتیس سے چالیس گھنٹے لکھنے پڑھنے پر صرف کیا کرتا ہوں۔ ہر وقت میرے ذہن کے خانے میں اُن موضوعات پر غور و فکر جاری رہتا ہے جن پر میں آئندہ لکھنے کی منصوبہ بندی کرتا ہوں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ادب میرا اوڑھنا بچھونا ہے جسے میں بیٹھتے، چلتے پھرتے، خود پر طاری رکھتا ہوں معنی اور مطالب خود بخود سانچوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور جب قرطاس و قلم لے کر

بیٹھتا ہوں تو الفاظ بارانِ رحمت کی طرح خود بخود برسنے لگتے ہیں۔ بات صرف ذوق وشوق کی ہے۔

س : رموزِ شاعری میں بقول ڈاکٹر شان الحق حقی نہایت آسان زبان اور عام فہم انداز میں فنِ عروض پر روشنی ڈالی گئی ہے اوّل یہ کہ آپ نے فنِ عروض پر اس قدر کمال کہاں سے حاصل کیا اور اس کمال کے وسیلے سے شاعری میں کیا نمایاں مقام کیوں حاصل کر سکے؟

ج : شاعری میں میرا کوئی باقاعدہ استاد تھا اور نہ ہے۔ علوم عروض وقافیہ سے بے خبر شعر کہنے سے بعض اوقات تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس کا سامنا کرنا پڑا جس کی طرف توجہ کر کے میں نے از خود علوم عروض وقافیہ اور شاعری سے مربوط دیگر علوم و ادب کا دقیق مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شعر تقطیع میرے لیے مدرسہ کی وہ تختی بن گئی جن پر اطفال حروف تہجی کی مشق کیا کرتے ہیں۔ جب اس فن پر کچھ گرفت حاصل ہوئی تو میں نے ''رموزِ شاعری'' کے نام سے ایک کتاب تحریر کی جس میں اُردو کے مروّجہ اوزان کی تقطیع مثالوں کے ساتھ پیش کی۔ اس کے علاوہ ایران میں رائج تقطیع ہجائی بھی اس میں شامل کی تاکہ وہ شاعر جن کو اُردو کے رسم الخط پر عبور نہیں وہ بھی شعر کی صحت سے واقف ہو سکیں۔ ڈاکٹر شان الحق حقی مرحوم کے علاوہ دیگر اکابرین عروض نے بھی اس کتاب کی آسان زبان اور عام فہم مطالب کی تعریف وستائش کی ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ شاعری میں میرا جو بھی مقام ہے دل سے اٹھتی ہوئی لہروں کے باعث ہے جنہیں دبانا میرے بس میں نہیں۔ اس کا لطف کیا ہے وہ تو صرف قدرتی چشمے کا بہتا ہوا پانی بتائے گا کہ پتھروں سے ٹکراتے ہوئے آبشار میں گنگناتے ہوئے دریا کی روانی میں گم ہو کر کیا سُرور ملتا ہے۔ اس قدر تعلّی کا حق تو قدرت نے ہر شاعر کو دیا ہے بقول جمیل مظہری

بقدرِ پیمانۂ تخیل سُرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

اور دیکھیے مولانا روم جن کا میں خلوص دل سے معتقد ہوں کیا فرماتے ہیں

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران
گفتہ آید در حدیث دیگران

س : تیرہ ادب شناس ہستیوں کی نسبت سے ''ذکرِ درباراں'' نام کی نادر کتاب کا احوال اور اُس میں شامل شخصیات کی نسبت سے کچھ فرمائیے؟

ج : جب کبھی کسی فنکار پر ظلم ہوتا ہے تو ادب کی روح تڑپ جاتی ہے۔ اس پُر آشوب دُنیا میں حق دار کو اس کا حق نہیں ملتا، چناں چہ دیگر افراد کی طرح میری بھی سعی و کوشش یہی رہی کہ ایسے نامور شعراء اور ادباء جن کے ساتھ اہل قلم انصاف نہ کر سکے ان کے فن اور شخصیت کو کسی طور اجاگر کیا جائے۔ اسی خواہش کے پیش نظر یہ کتاب تحریر کی گئی ہے کامیابی اور ناکامی کی بابت فیصلہ کتاب کے قارئین اور ناقدین ہی کرنے کے مجاز ہیں۔

س : ''کائناتِ تجمّ'' آپ نے کس جذبے کے تحت ترتیب دی اور آپ کی اس کاوش سے علامہ تجمّ آفندی کی شخصیت وفن کے کون سے نئے گوشے منظرِ عام پر آئے اور اہلِ علم نے اُس کی بابت کیا رائے قائم کی؟

ج : بیسوی صدی کے عظیم شاعر تجمّ آفندی کی حیات، شخصیت اور کلام پر دو جلدوں میں سترہ سو صفحات پر مشتمل کتاب برصغیر میں مقبول ہوئی اور اس عظیم شاعر جس نے انگریز سامراج کے خلاف بغاوت کی جس نے مزدور، کسان اور محنت کش طبقہ کی حمایت کی اس کا تعاوف اُردو ادب میں اس طرح سے ہو جس طرح اُس عظیم شاعر کا استحقاق بنتا ہے۔ چناں چہ ''کائناتِ تجمّ'' اس سلسلے کی وہ کڑی ہے جو ذہنِ انسانی کو گھیرے ہوئے ہے۔ ''کائناتِ تجمّ'' میں ایسی نظمیں موجود ہیں جو اس بات کا محکم ثبوت ہیں کہ تجمّ کے دل میں محنت کش طبقے کا بے پناہ درد تھا۔ بقول حسین آغا ۔

کیوں دل جلوں کے لب پہ ہمیشہ فغاں نہ ہو
ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو

س : انشاء اللہ خاں انشاء مرتب کی گئی کتاب میں آپ نے کیا کچھ نیا دریافت کیا اور اُس

کے اثرات کس قسم کے رہے؟

ج : میں نے اوپر کے کسی سوال کے جواب میں عرض کیا ہے کہ میرا مقصود یہ ہوا کرتا ہے کہ کوئی بھی شاعر وہ انشاؔ ہو، فانیؔ ہو یا نظیرؔ ہو یا کوئی بھی فراموش شدہ ادیب و شاعر جسے اس کا صحیح حق نہ دیا گیا ہو یا جس کے خاندان میں کوئی ایسا فرد نہ ہو جو اس کوتاہی کا ازالہ کرنے کی سکت رکھتا ہو جیسے حالیؔ، شیفتہؔ، شبلیؔ اور ڈپٹی نذیر احمد کے خاندان کے لوگ کرتے رہے۔ انشاء اللہ خاں انشاؔء پر کتاب اسی جذبے کے تحت تحریر کی گئی جو میں نے اوپر عرض کیا ہے۔ سوال جہاں تک کتاب کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا ہے اس کا اختیار میرے پاس نہیں ہے۔

س : مرزا غالبؔ کی نسبت تازہ کتاب میں مرزا غالبؔ کی کسی جہت اور کارنامے کو آپ نے بحث کا موضوع بنایا ہے؟

ج : غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی کی مرکزی کمیٹی نے مجھے غالبؔ کے فارسی کلام کی تدوین اور ترتیب کی ذمہ داری سونپی۔ چناں چہ راقم نے دقیق نگاہی، دیدہ ریزی اور دلچسپی سے اس سنگین پتھر کو یک وتنہا اٹھا کر محرابِ عشق پر ایسا جما دیا جو آئندہ وقتوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ چودہ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل دو جلدوں میں مرزا غالبؔ کا فارسی کلام جس میں کئی سو اشعار کا ترجمہ اور تشریح بھی شامل ہے۔ چناں چہ ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' میں گیارہ ہزار تین سو سینتیس اشعار شامل ہیں جن کو ہیئتی تقسیم، تدوین اور ترتیب کے ساتھ رائج الوقت فارسی کے رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کلیات میں اختلافات نسخ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک مختصر اور منتخب سوانح عمری غالبؔ بھی قارئین کی معلومات کے لیے شامل اشاعت کی گئی ہے تاکہ غالبؔ کی فارسی شاعری کو سمجھنے کے لیے آسانی اور ان پر تحقیقی تنقیدی اسکالرز کو مطالب تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔ اس کتاب کی رونمائی دہلی کے گورنر جنرل اور سفیر ایران ڈاکٹر نبی زادہ کے ہاتھوں انجام پائی۔

س : ''کلیاتِ غالبؔ'' کے ایک ہزار چار سو صفحات کا ذکر اس کے دو سو صفحات پر مشتمل

پیش لفظ کے بغیر نامکمل گردانا جائے گا۔ کیا واقعی آپ نے اس قدر طویل پیش لفظ تحریر کیا ہے؟

ج : جی ہاں! آپ کی اطلاع درست ہے۔ آپ کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے آپ کے ذریعے ہی قارئین ''چہار سُو'' کو یہ خوش خبری بھی سنانا چاہوں گا کہ نہ صرف ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کا دیباچہ دو سو صفحات پر مشتمل ہے بلکہ اس میں عنقریب جدید مطالب کے اضافے کے ساتھ بہت سے نئے صفحات کے اضافے کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا۔ جنہیں علیحدہ طور پر کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔

س : رثائی ادب کی جانب آپ کی خصوصی توجہ کے اسباب کیا ہیں؟

ج : مرزا دبیر پر میری سات کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ دبیر شناسی اُردو ادب کے لیے عموماً اور رثائی ادب کے لیے خصوصاً اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے اُردو ادب کی فصاحت و بلاغت کو ترقی ہوگی۔ مرزا دبیر اُردو کا وہ عظیم شاعر ہے جس نے سب زیادہ اشعار کہے، سب سے زیادہ رباعیات لکھیں، سب سے زیادہ الفاظ اُردو میں استفادہ کیے۔ افسوس موازنہ انیسؔ و دبیر میں علامہ شبلی نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ دبیرؔ کے فن، حسب، نسب، کسب اور کلام پر بے رحمانہ حملے کیے گئے۔ ہمیں دبیر کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ مرزا دبیرؔ کے کلام میں میر انیس کا رنگ نظر آتا ہے لیکن میر انیسؔ کے کلام میں دبیر کا پرتو بالکل نہیں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اُردو کی ترقی اور توانائی کے لیے دبیریت کو کالج اور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ حسنِ یوسف کو بازارِ مصر میں پیش کرنا ہمارا فرض ہے۔ کوئی بھی نقاد کوشش کے باوجود کسی تخلیق کار کو مٹا نہیں سکتا۔ خدائے سخن میر تقی میر کیا خوب فرماتے ہیں ؎

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تاحشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

س : آپ نے ایک نہایت ضخیم کتاب میر انیسؔ کے ایک مرثیے کو عنوان بنا کر لکھ ڈالی۔ کچھ اس کی بابت ہمارے قارئین کو باخبر کیجیے؟

ج : میر انیسؔ کے شاہکار مرثیے ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کا تجزیہ راقم نے قریب آٹھ سو صفحات پر کیا ہے جو دُنیائے ادب میں کافی مقبول بھی ہوا۔ اس تجزیے میں میر انیسؔ کی حیات، شخصیت وفن پر کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔ مرثیے کے ہر شعر کا جدا جدا تجزیہ کیا گیا ہے جس میں فصاحت، بلاغت، محاورے، روزمرہ، تشبیہات، استعارات، کنایات اور مجاز مرسل کی نشاندہی کے علاوہ صنائع معنوی کو اس طرح بتایا گیا ہے کہ میر انیسؔ کی قادر الکلامی کی سند صرف ایک ہی مرثیے سے ثابت کی گئی ہے۔ اس ایک مرثیے میں صرف صنعتوں کی تعداد ڈھائی ہزار سے زیادہ ہے۔ تجزیے کا عمل ہر شعر کو جداگانہ، پھر ہر بندش کو جداگانہ اور آخر میں پورے مرثیے کو اکائی جان کر کیا گیا ہے۔

س : کچھ لوگ آپ کو رثائی ادب کا ماہر کیوں گردانتے ہیں؟

ج : اصولی طور پر تو یہ سوال انہی لوگوں سے کیا جانا چاہیے جن کی جانب آپ اشارہ فرما رہے ہیں۔ میں نے ہمیشہ خود کو ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم گردانا ہے اور آئندہ بھی میں اپنی اس شناخت کو برقرار رکھنے کا آرزومند ہوں۔

س : آپ سے قبل پروفیسر مسعود حسن ادیب کا نام ''مرثیہ'' پر کام کرنے والوں میں نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ آپ اپنے کام کو پروفیسر مسعود حسن ادیب کے کام سے کس قدر مختلف اور بارآور گردانتے ہیں؟

ج : انیسیات پر جس نوعیت کا عمدہ کام پروفیسر مسعود حسن ادیب نے کیا ہے اس کی دوسری مثال رثائی ادب میں موجود نہیں۔ اگرچہ میں بھی اسی راستے پر گامزن ہوں مگر:

گو مشتِ خاک ہوں مگر آندھی کے ساتھ ہوں

میر انیسؔ کے مطبوعہ مرثیوں میں ایک اندازے کے مطابق بارہ ہزار سے زائد اغلاط موجود ہیں جن کی نشاندہی ڈاکٹر صفدر حسین، جناب ہادی علی فائق، ڈاکٹر نیرّ مسعود، پروفیسر ادیبؔ اور سفارش حسین نقوی نے کی ہے۔ ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں ''کلیاتِ انیس'' تصحیح کے ساتھ آٹھ جلدوں میں مرتب کر رہا ہوں۔

س : ایک سوال یہ بھی شدت سے سامنے آیا ہے کہ مرثیہ پابند اجزائے ترکیبی کی وجہ سے

بہت حد تک متاثر ہوا ہے۔ کیا آپ مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں کسی کمی بیشی کی گنجائش محسوس کرتے ہیں؟

ج : مرثیے کے کلاسیکی اجزائے ترکیبی میں چہرہ، گریز، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن جدید مرثیہ میں لازم نہیں کہ یہ اجزا موجود ہوں۔ چناں چہ آج کے دور کی ضروریات کے تحت بعض اجزا، جس میں چہرہ، شہادت اور بین کے اشعار شامل ہیں، مرثیہ کی شناخت نظر آتے ہیں، جب کہ آمد، رجز اور جنگ جس میں تلوار، گھوڑا اور لڑائی شامل ہیں، جدید مرثیوں میں خال خال ہیں۔

س : سمٹتی، سکڑتی اُردو زبان و ادب کے آئینے میں مرثیے کا مستقبل آپ کے خیال میں کیا ہے؟

ج : میرے اندازے کے مطابق آج کے اس دور میں تیس، چالیس افراد کسی نہ کسی طور پر مرثیہ کی صنف سے خود کو وابستہ رکھے ہوئے ہیں جب کہ دس، بارہ افراد مربوط انداز میں مرثیہ لکھنے میں مشغول ہیں۔ میں مرثیے کے مستقبل کی بابت اس لیے پُر امید ہوں کہ مرثیے میں اُردو ادب کا بہت بڑا خزانہ محفوظ ہے۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو شاعر مرثیہ لکھ رہا ہے اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا خوب صورت بات کہی ہے ''اُردو ادب کی جانب سے غالبؔ کی غزلیات اور انیسؔ کے مرثیے دُنیائے ادب کو تحفے میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔''

س : علامہ اقبالؔ سے آپ کے خصوصی تعلق اور لگاؤ کے ہم عینی شاہد ہیں۔ کیا آپ اس عقیدت کی وجوہات بتانا پسند کریں گے؟

ج : علامہ اقبالؔ برصغیر کی ایسی عہد ساز شخصیات میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں جنھوں نے ایک سے زائد نسلوں کو اپنے اقوال و افکار سے متاثر کیا ہے۔ بالخصوص جن گھرانوں میں علوم و فنون پہلی ترجیحات میں شامل تھا وہاں علامہ کے کلام سے نیازمندی کے ساتھ عقیدت کا کوئی نہ کوئی پہلو بھی ضرور موجود ہوتا تھا چناں چہ ہمارے گھرانے میں بھی علامہ اقبالؔ کو ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا جس کے باعث میں بھی بچپن ہی سے علامہ اقبالؔ کی شاعری، فلسفے اور فکر سے بے پناہ متاثر ہوا اور آج

تک ہوں اور وقت گزرنے کے ساتھ اس عقیدت میں مزید پختگی آ رہی ہے۔

س : آپ کے جواب کی روشنی میں یہاں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا آپ کی عقیدت کا مرکز علامہ سے شروع ہو کر علامہ پر ہی ختم ہو جاتا ہے یا اس کے مراکز اور بھی ہیں؟

ج : دیکھیے! یہ سوال پھر انسانی آزادی کے پر کترنے کے مترادف ہے۔ علامہ اقبال سے عقیدت و نیازمندی کبھی بھی آپ سے یہ سوال نہیں کرتی کہ آپ دُنیا کے تمام علوم و فنون سے منہ موڑ کر صرف علامہ کے حصار میں مقید ہو جائیں۔ علامہ اقبال تو خود دعوتِ فکر دینے والے مفکر اور دانشور ہیں۔ لہٰذا میرا غور و فکر کا سلسلہ بھی علامہ کی تعلیمات کے عین مطابق سمٹا سکڑا ہوا ہرگز نہیں ہے۔

س : اوّل یہ کہ علامہ کے خطوط نے آپ کی توجہ کب اور کیوں کر حاصل کی نیز یہ کہ ڈیڑھ ہزار خطوط میں صرف ڈھائی سو کا انتخاب کیوں اور کس پیمانے کے تحت کیا اور یہ کتاب اپنی افادیت کس طرح ثابت کر رہی ہے؟

ج : علامہ اقبال کے عرفانی زاویوں کی مقبولیت کے بعد راقم نے "چوں مرگ آید" تصنیف کی جس میں دو سو اکیاون خطوط کو اس لیے منتخب کیا جن میں علامہ کی بیماری، پرہیز اور علاج کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اُردو ادب کا شاید ہی کوئی بڑا ادیب یا شاعر ایسا ہو جس نے اس تفصیل سے اپنی بیماری اور اس سے مربوط مسائل کا ذکر کیا ہو۔ اس کتاب میں اقبال کا فلسفۂ موت اور زندگی کے کاروبار کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ عوام میں اس کتاب کی پذیرائی عمدہ طریقے سے کی گئی ہے۔ اس کتاب کو اقبال اکادمی لاہور نے شائع کیا اور پوری کتاب میری ویب سائٹ www.drtaqiabedi.com پر پڑھی جا سکتی ہے۔

س : علامہ کے آخری ایام میں ہونے والے علاج پر آپ کے تحفظات کس قسم کے ہیں؟

ج : میرے تحفظات بھی اسی نوعیت کے ہیں جو علامہ سے شیفتگی رکھنے والے عام نیازمند کے ہو سکتے ہیں۔ بطور طب کے طالب علم میں یہ سمجھتا ہوں کہ کاش اس وقت علامہ کے علاج پر جدید طبی نقطۂ نظر رکھنے والے مغربی طبیبوں کو علاج کا موقع

دیا جاتا تا شاید ہمیں علامہ سے مزید استفادے کا موقع میسر آ سکتا۔

س : آپ علامہ اقبال کو عالمی مفکر و دانشوروں کی صف میں کس مقام کا حامل گردانتے ہیں اور مستقبل میں علامہ کو کس مقام پر متمکن دیکھتے ہیں؟

ج : میرا یہ مقام ہرگز نہیں ہے۔ میں تو اپنے بارے کسی قسم کی پیش گوئی کرنے کی پوزیشن میں نہیں پھر بھلا علامہ جیسے دیو ہیکل کے بارے کیوں کر کچھ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں البتہ! اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ وقت گزرنے کے ساتھ علامہ کی شخصیت عظمت کی جانب گامزن ضرور رہے گی۔

س : مجموعی طور پر اگر ہم آپ سے یہ دریافت کرنا چاہیں کہ آپ کی اب تک کی گئی کاوشات سے اُردو ادب کو اور آپ کو کیا حاصل ہوا نیز مستقبل میں کیا حاصل ہونے کے امکانات ہیں تو آپ کیا ارشاد فرمائیں گے؟

ج : سوال جہاں تک میری ذات کا ہے تو الحمدللہ میں کلی طور پر مطمئن ہوں۔ میری تیس (30) سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں میرے دو شعری مجموعے ''گلشنِ رویا'' اور ''جوشِ مودت'' شامل ہیں۔ مختلف ادبی و شعری ہستیوں اور شاعری کے فنی تقاضوں، رسم الخط اور محاسن زبان و صنائع بدائع پر مختلف مضامین تین جلدوں میں مطبوعہ شکل اختیار کر چکے ہیں۔ میرے مقالات کی تین کتابیں ''عروسِ سخن''، ''ذکر درباراں'' اور ''سدِ سخن'' احباب علم و ہنر کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہیں ان کی بابت فیصلہ ہونا باقی ہے جس کی بابت کبھی بھی میرے دل میں بے اطمینانی کے احساسات موجزن نہیں ہوئے۔

س : رام بابو سکسینہ نے ''تاریخ اُردو'' مرتب کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''اس کام میں رام بابو سکسینہ ختم ہو جائے گا اور رام رام باقی رہ جائے گا۔'' آپ کی بابت اگر یہ محاورہ استعمال کیا جائے تو کیا کچھ باقی بچنے کے امکانات ہیں؟

ج : پہلی بار اس قسم کا سوال آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا ہے۔ میں بھی رام بابو سکسینہ کی پیروی میں یہی عرض کروں گا کہ سب فنا ہو جائے گا باقی جو رہے گا وہ نامِ خدا ہو گا۔

س : اس قدر ہمہ رنگ، ہمہ جہت اور کثیر الاطراف شخصیت ہونے کے باوجود آپ کے متعلق کوئی پختہ تاثر قائم نہ ہونے کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں اور یہ کہ آپ کس حوالے سے اپنی شناخت کے آرزومند ہیں اور آپ کی آرزو کی تکمیل کے کتنے فیصد امکانات ہیں؟

ج : دُنیا کے ہر بڑے ادب میں شہرت اور اعتبار دو علیحدہ علیحدہ قدریں ہیں یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو دونوں اقدار حاصل ہو سکیں۔ اغلب یہ قدریں علیحدہ علیحدہ بستے میں رکھی جاتی ہیں۔ اُردو ادب خصوصاً ادبِ لطیف اس سے مستثناء ہر گز نہیں۔ قدرتِ ایزدی کسی کی محنت کو ضائع ہونے نہیں دیتی۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ بہترین اجرت وہ ہے جو پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدور کی ہتھیلی پر رکھ دی جائے لہٰذا میری ایک نہیں دونوں ہتھیلیوں میں احباب کی بے پناہ محبت، خلوص اور احترام اتنی مقدار میں موجود ہے جس سے میری تمام طلب کی تسکین با آسانی ہو رہی ہے اگر آپ میرے خیال سے اتفاق کریں تو یہی میرا ثمر اور یہی میری شناخت ہے۔

س : جس قدر مفید اور با مقصد کام آپ سرانجام دے چکے ہیں اس سے کہیں کم کام کرنے والے، محققین اور ناقدین کی بحث کا موضوع ہوا کرتے ہیں جب کہ آپ کے باب میں ابھی تک اس طرح کی کوئی پیش رفت ہمارے علم میں نہیں ہے؟

ج : اُردو کے گہوارے میں موجود افراد کی شناخت دیسی افراد کی نسبت سریع اور نمایاں ہوتی ہے۔ انجمن، حلقوں کی باہمی کش مکش اور رقابت اُردو کا شب و روز کا ماحول بالخصوص ان شخصیات کے لیے جن کی روٹی اُردو سے جڑی ہوتی ہے ایسے مواقع فراہم کرتا ہے جس میں شہرت کا پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔ ان میں سے اکثر افراد بہت جلد سرنگوں اس لیے ہو جاتے ہیں کہ اس پرواز میں ان کی طاقت نہیں بلکہ دوسروں کی قوت شامل ہوتی ہے۔

ع : فوارہ چوں بلند شود سرنگوں شود

الحمدللہ میں اپنی گوشہ نشینی کے فیض و برکات سے مطمئن ہوں اس لیے کہ اُردو کی موجود عظیم ہستیوں کے سامنے میرا ایک اعتبار ہے، ایک وقار ہے، ایک عزت

ہے۔ یہی اعتبار، یہی وقار اور یہی عزت میری اُردو زبان و ادب سے محبت بلکہ دیوانگی حقیقت میں فرزانگی کا پروانہ بن جاتی ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ اپنے منہ میاں مٹھو بنوں اور اپنے کارناموں اور ان پر تحقیقی کام کی تفصیل بیان کروں یہ مجھے یا کسی بھی حقیقی فنکار کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔ آپ کے اصرار پر اتنا ہی عرض کرسکتا ہوں کہ آج کل بھارت اور پاکستان میں اس حقیر وفقیر کے فن وشخصیت پر کام ہورہا ہے جو میری ہمت افزائی اور فن شناسی کی جانب مثبت قدم ہے۔ میرے خیال میں ناقدین کی آراء، تبصرے، اشارے، تشریحات، مبالغات وغیرہ سب کسی اہم کام کی حوصلہ افزائی کے لیے مفید ہیں لیکن سچی اور کھری بات یہ ہے کہ

ع : ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ

س : یادگارِ انیسؔ کا جو ترجمہ ڈیوڈ میتھیوز صاحب نے کیا ہے اُس کی اشاعت اور تقسیم کس مرحلے میں ہے نیز اور کہاں کہاں تراجم ہو رہے ہیں؟

ج : ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کے منظر عام پر آنے سے قبل پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز نے ترجمہ مکمل کرلیا تھا اور وہ اس شاہکار کتاب میں شامل اشاعت ہے۔ سوال کے دوسرے حصے کی بابت یہی عرض کروں گا:

ع : پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

س : آپ کی تخلیق کردہ کتب انتہائی دیدہ زیب اور بیش قیمت ہوتے ہوئے بھی مفت تقسیم ہونے کے باعث احباب میں آپ کی مالی حیثیت کی بابت خاص طرح کا اشتیاق پایا جاتا ہے؟

ج : جیسا کہ میں نے اوپر کہیں عرض کیا ہے کہ میری تیس سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ میری سب سے پہلی کتاب ''شہید'' (فارسی) کا اُردو میں ترجمہ تھا جو 1980ء میں تہران سے شائع کیا گیا۔ میری بہت سی کتابیں غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی، اقبالؔ اکیڈمی لاہور، تعمیر انسانیت لاہور، اظہار اینڈ سنز لاہور اور ملتان سے شائع ہوئی ہیں۔ بعض کتابیں دہلی اور حیدرآباد دکن سے بھی طبع کی گئی ہیں۔ جو کتابیں اکادمی، انسٹی ٹیوٹ، انجمن اور دوسرے ادارے شائع کرتے ہیں وہ ان

اداروں کے تحت باقاعدگی سے فروخت کی جاتی ہے۔ میرے حصے کی جتنی جلدیں مجھے رعایتاً دی جاتی ہیں وہ میں حق بہ حقدار کے مصداق احباب کی خدمت میں بلا معاوضہ پیش کر دیتا ہوں بلکہ جو کتابیں میں اپنے خرچ سے شائع کرتا ہوں وہ بھی اپنے دوستوں، کرم فرماؤں اور پرستاروں کو بلا قیمت مہیا کرتا ہوں۔ یہ سب توفیقِ خداوندی ہے کہ میں اپنی آمدنی کا کچھ حصہ لہو و لعب میں صرف کرنے کے بجائے اس شریف زبان پر قربان کر سکوں۔ شاید اسی کو ادب میں دامے، درمے، سخنے خدمت کہا جاتا ہے۔ ہر تخلیق کار کی جملہ خواہشات میں ایک خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا دیوان یا مجموعہ دیدہ زیب شائع ہو۔ مرزا غالب نے اپنے خط میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے اور اقبال کا کلام اپنے زمانے کی عمدہ ترین مطبوعات میں شمار ہوتا تھا۔ چناں چہ جو دلی خواہش ان عظیم شعراء کی ان کے دلوں میں رہ گئی اس کی کسی حد تک واجب کفائی کرنے کی سعادت ان چند کتب کی صورت مجھے حاصل ہوئی ہے۔ یقیناً اس پُر آشوب اور کم فرصت کے زمانے میں کسی اُردو زبان کے اہلِ قلم کی کتاب کا مطالعہ مصنف یا مؤلف کے لیے بجائے خود کتاب کی قیمت تصور کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

س : دُنیا کے کسی کونے میں اُردو زبان و ادب کے نام پر کوئی کانفرنس، سیمینار یا مجلس برپا ہو تو اس کے روحِ رواں آپ ہوتے ہیں وگرنہ شریکِ محفل ہونا تو لازمی تصور کیا جاتا ہے۔ اور یہ سب آپ ذاتی خرچ کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ یہاں پھر سوال آپ کی مصروفیت اور سرمائے کی دستیابی کا بنتا ہے؟

ج : امریکہ اور کینیڈا میں تین عالمی اُردو کانفرنسز ہوئیں جن کا تعلق ''نیویارک اُردو ٹائم'' سے تھا۔ ان کانفرنسز کی مرکزی کمیٹی کا صدر مجھے بنایا گیا۔ اس اہم ذمہ داری کی وجہ سے میری خط و کتابت اور بات چیت مختلف شرکاء کانفرنس سے رہی تاکہ کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں ان کی شرکت اور مختلف موضوعات پر ان کی عالمانہ گفتگو اور اس پر سیر حاصل مباحثہ یقینی بنایا جائے۔ چناں چہ ان عالمی کانفرنسز میں میری ذات اس سبب نمایاں رہی۔ شمالی امریکہ کی کانفرنسز کے علاوہ بھارت،

پاکستان، برطانیہ اور مڈل ایسٹ کی بعض عالمی اُردو کانفرنسز میں شرکت کرنے کا موقع اس لیے دستیاب رہا کہ میرا تعلق اُردو کی نئی بستیوں سے ہے اور اُردو کی ان نئی بستیوں کی حیات کا دارومدار اُردو کے گہوارے سے ضروری ہے۔ اس ارتباطی پُل کو برقرار رکھنے کے لیے ان کانفرنسز میں میری شرکت مفید ثابت ہوئی۔ شمالی امریکہ کی کانفرنسز کے مضامین اور بحث ومباحثہ کے مطالیب نے بھی میری شرکت کو دوسری عالمی کانفرنسز میں یقینی بنایا۔ میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ ہر کانفرنس میں اپنا مقالہ، اپنا نظریہ اور اپنا مواد پیش کروں۔ اس کام کے لیے ہوم ورک بھی ضروری جانتے ہوئے میں ان افراد کی صف میں شامل ہوگیا جن کا کانفرنسز میں شرکت کا مقصد تفریح یا سیاحت نہیں بلکہ علمی ادبی اور تحقیقی ہو۔ گزشتہ تیس سال سے مغربی دُنیا میں رہتے ہوئے سیر وسیاحت کی آرزو نہیں رہی۔ یہ سچ ہے کہ میں کسی ادارے یا اکادمی سے سفر وحضر کے مطالبات نہیں کرتا اگر کوئی اپنی مرضی اور منشا سے یہ سہولیات مہیا کرتا ہے تو شکریہ کے ساتھ قبول کر لیتا ہوں وگرنہ یہ ایسا بھاری پتھر نہیں جس کو میں اٹھا بھی نہ سکوں۔ بقول انیسؔ

کسی کے سامنے کیوں ہاتھ جا کے پھیلاؤں

مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

س : ڈاکٹر صاحب! آپ کی تمام تر علمی، ادبی، تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی اور تنظیمی مصروفیات میں شہرت کی طلب کو کس قدر دخل ہے؟

ج : یہ درست ہے کہ شہرت وستائش انسان کو پر کے بغیر ہی مائل بہ پرواز کر دیا کرتی ہے مگر میرا منشا اور مقصود شہرت ہی ہوتا تو مغرب میں رہ کر ایک پڑھے لکھے اور باشعور انسان کے لیے اس کو حاصل کرنے کے ذرائع اور بھی ہیں۔ میں جہاں جس حال میں ہوں بلکہ جس کھال میں ہوں بہت خوش ہوں۔

س : ایک زمانے میں آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کے ذخیرہ کتب میں ڈیڑھ ہزار سے زائد مخطوطات محفوظ ہیں۔ آج ان کی تعداد کتنی اور اُن کی اہمیت کیا ہے؟

ج : جہاں تک قلمی ذخائر اور مخطوطات کا تعلق ہے میرے کتب خانے میں چودہ سو کے

لگ بھگ مخطوطات ہیں جن میں زیادہ تعداد قلمی مرثیوں، رثائی بیاضوں اور قدیم مسودوں کی ہے۔ ان مخطوطات کو میں نے تیس سال کے عرصے میں جمع کیا ہے۔ کتب خانے کی نادر کتابیں اور مخطوطات تمام برصغیر سے جمع کی گئی ہیں۔ رثائی ادب کی کتابیں اور کچھ قلمی مرثیے اور قلمی بیاضیں راقم کو ''جعفر منزل'' سے حاصل ہوئی ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ بہت سی کتب کینیڈا نہیں پہنچ سکیں اور یہ بھی پتہ چل نہ سکا کہ وہ کہاں رہ گئیں۔

س : کینیڈا میں اُردو کی سرگرمیاں اور اُردو زبان و ادب سے کینیڈا کے لوگوں کی دلچسپی کی بابت کچھ آگاہی دیجیے؟

ج : اُردو کی نئی بستیوں میں اُردو کا فروغ جاری ہے۔ اُردو اب صرف اُردو معلیٰ تک محدود نہیں بلکہ اُردو محلّہ میں رونقِ بازار ہے۔ اب اُردو کا پرچم اُردو معلیٰ پر نہیں بلکہ اُردو محلّہ پر لہرا رہا ہے۔ دبستان دہلی، لکھنؤ، آگرہ، حیدرآباد، لاہور، کراچی وغیرہ میں اُردو کی نشو و نما کے لیے جدید لسانی تجربات کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے۔ کسی دبستان کو دوسرے دبستان پر قطعاً فوقیت حاصل نہیں۔ اب اُردو عالمی شہرت کی حامل زبان ہے۔ اب داغؔ کا شعر زمان و مکاں کی حدوں سے باہر نکل چکا ہے:

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

س : سنا ہے! آپ نے اپنی ذاتی لائبریری کینیڈا کے کسی ادارے کے نام وقف کی ہوئی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ آپ کے بعد اُردو کا آپ کے خاندان میں کوئی مستقبل نہیں۔ کیا آپ کو اس خیال سے خوف نہیں آتا؟

ج : چوں کہ میرا تعلق تحقیق اور تنقید کے ساتھ بہت گہرا ہے اور میں نے ذاتی تجربات سے بھی محسوس کیا ہے کہ میرے پاس محفوظ ذخائر مستقبل میں تحقیق و تنقید کے لیے بے حد کارآمد اور مفید رہیں گے لہٰذا میری حیات تک ان ذخائر سے میں استفادہ کرتا رہوں گا میرے بعد فوری طور پر یہ علمی اور ادبی ذخائر یونیورسٹی کے ذخائر علمی میں ضم ہو جائیں گے میں نے اپنی اولاد اور قریبی رشتہ داروں کو بے دخل کرنا اس

لیے مناسب جانا کہ عام پرستاروں کی اس تک رسائی آسانی سے ہو سکے۔ میرے مشاہدے میں یہ تلخ حقیقت بار ہا آئی ہے کہ خاندان کا کوئی فرد اس طرح کے نادر کتب خانے پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور دوسروں کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتا جس کے نتیجے میں دیمک علمی ذخیروں کا مقدر بن جاتی ہے۔

س : اُردو زبان کے رسم الخط کے حوالے سے جاری بحث کی بابت آپ کا نقطۂ نظر اور تجاویز نہایت اہمیت کی حامل ہوں گی؟

ج : اُردو ایک زندہ اور توانا زبان ہے چوں کہ زندہ ہے اس لیے ہر روز اس کے مسائل نئے ہیں۔ اُردو زبان کے اس قدر کم عمری میں اتنی بڑی زبان بن جانے کا راز اس کا دوسری زبانوں سے لین دین ہے۔ آج یونیسکو کی شمار بندی کے لحاظ سے یہ دُنیا کی چوتھی یا پانچویں بڑی زبان ہے۔ اقوام متحدہ کے لحاظ سے یہ بائیسویں نمبر پر اس لیے ہے کہ ہم نے اپنی مادری زبان سندھی، پنجابی، گجراتی، بنگالی، بلوچی یا ملیالم لکھوایا ہوا ہے۔ بہر حال اُردو پھیل رہی ہے۔ اب یہ زیادہ تر کانوں کی زبان بن چکی ہے۔ بعض مقامات پر یہ آنکھوں کی زبان نہیں رہی ایسے نازک موقع پر اس کے رسم الخط اور اس کی تہذیب کی حفاظت ہم سب کی ذمہ داری بنتی ہے۔ جہاں تک سوال اُردو کے ادباء شعراء اور ناقدین کے اختلاف رائے کا ہے اس میں کچھ اثر تو ماحول کا اور کچھ جگہ شخصیات اثر انداز ہو رہی ہیں۔ بقول شاعر

اُردو کی سرنوشت میں ہے اس لیے نفاق
اُردو کے چار حرف ہیں چاروں جدا جدا

س : ڈاکٹر صاحب! اپنی دانست میں ہم نے آپ کی شخصیت اور فن کو گفتگو کا موضوع بنانے کی دیانتدارانہ کوشش کی۔ آپ کے خیال میں کوئی پہلو تشنہ رہ گیا ہو یا آپ ہمارے قارئین سے کسی موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہوں تو بصد شوق کیجیے:

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

ستیہ پال آنند
امریکہ

محترم بھائی جان!

آداب!

پرسوں جب آپ کا ''ای مکتوب'' پہنچا تو میں سفر میں تھا اور کل رات اپنے گھر یعنی امریکہ میں پہنچا ہوں تو صبح اُٹھ کر پہلا کام یہ کر رہا ہوں کہ آپ کے مکتوب کے جواب میں یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔

آپ کی محبت کا بھی جواب نہیں کہ آپ کو یاد رہا کہ میں نے کوئی فی البدیہہ قطعہ پڑھا تھا۔ اب مجھے بھی یاد آ گیا ہے۔ نیچے تحریر کر رہا ہوں۔

تقی عابدی صاحب کی نذر

آپ شاعر بھی ہیں، حکیم بھی ہیں
شعر و حکمت کا ہے پرانا ساتھ
تقی صاحب کے فن کی کیا کہنے
روح افزا، مفرّح جذبات

نیازمند
ستیہ پال آنند

ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی اور ادبی خدمات اور شعور فکر و فن پر منظوم تاثرات

فخرِ دانشوراں ہیں تقیؔ عابدی

فخرِ دانشوراں ہیں تقیؔ عابدی
فکر و فن میں ہے جن کے نئی تازگی

اُردو دنیا میں ہیں وہ سفیرِ ادب
بزمِ شعر و سخن کی ہیں وہ روشنی

ندرتِ فکر ہے ان کے اظہار میں
نقدِ شعر و ادب میں ہے اک دلکشی

جس سے مسحور ہیں اہلِ فکر و نظر
عہدِ حاضر کی ہیں شخصیت عبقری

ہے ہر اک صنف پر ان کی نقد و نظر
کیوں مسلم نہ ہو اُن کی دیدہ وری

دیکھ کر یہ کتابیں کریں فیصلہ
کتنی ہے معتبر اِن کی دانشوری

سحر ہے ان کی تحریر و تقریر میں
ہے جو سحر آفرینی کی جلوہ گری

ان کے برقیؔ ہیں مداح اہلِ نظر
ان کی وردِ زباں ہے ادب دوستی

•••

سید باقر زیدی
27رمئی 2003ء

جناب رضی حیدر رفریدؔ لکھنوی عرف سلطان صاحب کے مراثی کے مجموعے کی کتاب بنام ''اظہارِ حق'' مرتبہ جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی، ٹورنٹو (کینیڈا) کا قطعۂ تاریخ

''اظہارِ حق''

دل کی شب برات ہے آنکھوں کی عید ہے
یہ جو کتابِ نو کی تقیؔ کی نوید ہے
یہ ڈول مرثیہ یہ تقیؔ کا مزید ہے

15+61+21+510+7+755+40+15=1424

ایسے معاملات میں فردِ وحید ہے
یہ بات کچھ شنید نہیں چشم دید ہے
اظہارِ حق کا جذبہ تقیؔ میں شدید ہے
دے دُنیا اِس کتاب کو اظہارِ حق کا نام
تصدیق میرے دعوے کی گویا مزید ہے
ہاتھ آئے کوئی نسخۂ نایاب اور پھر
رہ جائے بن چھپے یہ تقیؔ سے بعید ہے

احسان ہے ادب پہ تقی عابدیِ کا یہ
"اظہارِ حق" کلامِ جنابِ فرید ہے
ہر چند مرثیوں کو کہے گزری اک صدی
اظہارِ حق طباعتِ عصر جدید ہے
پوتے نے حق ادا کیا دادا کی ارث کا
گو یہ روش زمانہ میں اب کم پدید ہے
سچ ہے یہ بات بھی کہ عبادت سے کم نہیں
اظہارِ حق اشاعتِ حق کی کلید ہے
پائے گی اجر اس کا تو اولاد بھی ضرور
ورثہ یہ جد کا ہے تو متاع سعید ہے

15+294+419+60+108+1107=2003

اک اور زندگی ملی سلطانِ شعر کو
اظہارِ حق بہارِ حیاتِ فرید ہے
"کرتا ہے جمع جو جگرِ لختِ لخت کو"
باقرؔ تو ایسے شخص کا غالبؔ مرید ہے

•••

سید باقر زیدی

ڈاکٹر تقی عابدی کی کتابوں کی رونمائی

رسم اجراء کی جو بہار ہے یہ
بزم یاراں کا افتخار ہے یہ

یہ تو پچیس سال کا ہے سپاس
ہیں تقی عابدی بھی خیر سے پاس

رونمائی ہے، دو کتابوں کی
خوشبو آنے لگی گلابوں کی

اک سلامِ انیس پر تنقید
دوسری ہے رباعیاتِ رشید

یوں تو اچھا ہے کُل کلام انیس
دیکھیئے تو ذرا، سلامِ انیس

کیا غضب کے سلام لکھے ہیں
منفرد لاکلام لکھے ہیں

گر نہیں ہوتا مرثیے کا چلن
پھر بھی کہتے انھیں خدائے سخن

ہم تقؔی عابدی کے ساتھی ہیں
پوری رُبع صدی کے ساتھی ہیں

اپنے افکار میں نفیسؔ ہیں یہ
کیوں نہ ہوں واقفِ انیسؔ ہیں یہ

ان کی الفت ہے اپنے کام کے ساتھ
سب سے ملتے ہیں احترام کے ساتھ

راستی کے افق کا منظر ہے
ان کی تنقید، حق کا مظہر ہے

جھوٹ سے پاک ہے، قلم ان کا
صِدقِ بے باک ہے قلم اِن کا

جرمِ ناقدری ڈھونڈ لاتے ہیں
حق یہ حقدار کو دلاتے ہیں

یہ ادب کا سفر مبارک ہو
ناقدانہ نظر مبارک ہو

شور تبریک کا مبارک ہو
امریکہ سے کینیڈا تک ہو

آپ سب کا خیال کرتے ہیں
میزبانی کمال کرتے ہیں

پیار گھر بار سے ٹپکتا ہے
در و دیوار سے ٹپکتا ہے

روز مہمان آتے جاتے ہیں
روز کھانا انھیں کھلاتے ہیں

اِن کی بیگم ہیں گرچہ ایرانی
پر بناتی ہیں خوب بریانی

ہم انھیں بھی سلام کرتے ہیں
ان کا بھی احترام کرتے ہیں

ان کے گھر میں سبھی ہوں خرم و شاد
یہ گھرانا، سدا رہے آباد

ان کو ہو، اتنا طولِ عمر عطا
ان کی تحریر ہو ادب کی بقا

ہو تقی کی یونہی، نگاہِ کرم
رکھ سکیں ہم بھی دوستی کا بھرم

شعر اِس واسطے لکھے پچیس
سال بھی دوستی کے تھے پچیس

میل کوئی نہ دل میں ہو اِن سے
اُٹھو باقر گلے ملو اِن سے

•••

تاریخ کاملِ انیسؔ

یہ فکر نظم در و لعل یادگارِ انیسؔ

2002ء

خصوص رنگ تقیؔ عابدی بکار انیسؔ

2002ء

وہ اک عطائے سخن ہے تو یہ ہے دادِ سخن

2002ء

یہ آرزوئے تقیؔ ہے وہ شاہکار انیسؔ

1427ہجری

باقر زیدی نے ''جوشِ مودّت'' کی تاریخ یوں نکالی

علم حیات و جہل ممات
کارِ سخن ہے کار ثبات
ہجری تاریخ اتنی بات
جوشِ مودّت راہِ نجات

660 + 759

1419 ہجری

◆◆◆

سید باقر زیدی
امریکہ

تجزیہ یادگارِ انیسؔ

''مرحبا تجزیہ نگارِ انیسؔ
اے تقی! اے نگاہ دارِ انیسؔ

2002 = 934+1068

جمع ہیں واقف وقارِ انیسؔ
مونس گلشن بہارِ انیسؔ

امتیازِ قلم ہے کارِ انیسؔ
فخرِ اُردو ہے شاہکارِ انیسؔ
''صاحبِ تجزیہ جزاک اللہ
محوِ گفتارِ رہگذارِ انیسؔ''

2002ء

کھل گیا اور ایک درِ دانش
بڑھ گیا اور اعتبارِ انیسؔ

حشر تک ہے وہ خدائے سخن
حشر تک بن گیا حصارِ انیسؔ

ہے سخن پر وہ اختیار اس کا
اہلِ اُردو میں زیرِ بارِ انیسؔ

ایک اک لفظ مستند مرغوبؔ
ایک اک بیت افتخارِ انیس

جان جاں اس لیے ہے باغِ سخنؔ
لہلہاتا ہے لالہ زارِ انیسؔ

ہے جنھیں کچھ پرکھ وہ جانتے ہیںؔ
ہے سخن کی بہار عیارِ انیس

ہر زمینِ سخن قلمرو میںؔ
کوئی دیکھے تو اقتدارِ انیسؔ

لکھنؤ کا مزہ ہو جنّت میںؔ
ملے قسمت سے گر جوارِ انیس

بات حالؔی کی کتنی سچی ہےؔ
دارِ اُردو ہوا دیارِ انیس

پھول احساس کے چڑھاتے ہیںؔ
اہلِ انصاف بر مزارِ انیس

وجہ آبِ حیات ذوق کا ذکر
کم نہیں ہے گنہگارِ انیسؔ

اک تبلی ہی کا موازنہ ہےؔ
جو ہوا وجہ اعتبارِ انیس

کیسی خاموشی گزری پچھلی صدی
اور کیا ہوسکا ہے کارِ انیسؔ

ساعتیں آئیں گی سپاس گزار
ابھی دُنیا ہے قرضدارِ انیسؔ

حق بہ حقدار کے جو داعی ہیںؔ
ان کو ہوتا ہے پاسدارِ انیس

اس کی قسمت بلندیوں کی نوید
جس نے اپنا لیا شعارِ انیسؔ

نکلے چکبستؔ حالیؔ اور اقبالؔ
خوب پھیلے ہیں برگ و بارِ انیس

مرثیے نے دیا خراج اسے
مرثیہ گو ہیں ورثہ دار انیسؔ

اب بھی اس کا وظیفہ جاری ہےؔ
ہم بھی ہیں اک وظیفہ خوار انیس

تجزیہ مرثیے کا ہے باقرؔ
زیب ناموس رہگذارِ انیسؔ

مرحبا تجزیہ نگارِ انیسؔ
اے تقیؔ اے نگاہ دارِ انیسؔ

1423ہجری

•••

ڈاکٹر جمال الدین صاحب تفہیم العروض نے ''جوشِ مودّت'' کی یہ تاریخ نکالی۔

لکھی تقی نے مودّت کے نام سے جو کتاب
ہے اس میں منقبت و حمد و نعت اور سلام
جمالؔ فکر میں تھا کس طرح کہے تاریخ
ندا یہ آئی ملا رب میں پنجتنؑ کے نام
قوی متین کہے اور ملا دے اس میں
محمدؐ اور علیؑ فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ

قوی متین

616 = 500 + 116 (قوی متین اللہ کے اسمائے حسنہ ہیں۔)

محمدؐ اور علیؑ فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ

803 = 128+6+118+6+136+110+207+92

616 + 803 = 1419 ہجری

•••

ریاضت علی شائق سانکھنوی

آبروئے وطن

آبروئے وطن ہیں تقی عابدی
رونقِ انجمن ہیں تقی عابدی
اُن سے ملنے پہ ہم پر یہ ظاہر ہوا
رہبرِ علم و فن ہیں تقی عابدی

•••

جانِ اُردو ہیں پر شانِ اُردو ہیں یہ
فخر کرتی ہے ان پر زبانِ وطن
ان کا تحقیق میں کوئی ثانی نہیں
ان پہ نازاں ہے یہ ارضِ گنگ و چمن

•••

کیے کام اُردو کی بہبود کے
بن گئے سب کے سب سنگِ میلِ وطن
کوئی اُردو کا ایسا مجاہد نہیں
کردئے جس نے اس پر فدا جان وتن

•••

کتابِ محبّت

کتابِ محبّت تقی عابدی ہیں
ہر اک دل کی راحت تقی عابدی ہیں

جب اُن سے ملو گے تو محسوس ہوگا
سراپا شرافت تقی عابدی ہیں

ہر اک شخص کی ان کے ذمہ ہے عزت
سبھی کی محبت تقی عابدی ہیں

انھیں کس قدر نفرتوں سے ہے نفرت
سراپا محبّت تقی عابدی ہیں

ادیب اور شاعر، محقق مقرر
یہ سر تاپا عظمت تقی عابدی ہیں

یہ اُردو کے وہ نامور ہیں محقق
کہ اُردو کی عظمت تقی عابدی ہیں

ہے کس درجہ اُردو زباں ان پہ نازاں
یہ اِس کی فضیلت تقی عابدی ہیں

شرافت کو ہے کس قدر نازان پر
یہ فخرِ شرافت تقی عابدی ہیں

یہ شائقؔ پہ بھی مہرباں کس قدر ہیں
یہ اس کی عقیدت تقی عابدی ہیں

•••

29.12.2021

قطعہ تاریخ ''کائناتِ تجسّم''

تحقیق وتدوین: ڈاکٹر سید تقی عابدی

اِس انجمن میں آج جو مہماں ہیں عابدی
ارثِ ادب میں وسعتِ امکاں ہیں عابدی
ناقد بھی ہیں ادیب بھی ہیں نکتہ رس بھی ہیں
روشن چراغِ طاقِ دبستاں ہیں عابدی
جاری ہے اُن کا فیضِ ادب زور شور سے
اہلِ سخن میں نیّرِ تاباں ہیں عابدی
جو کہہ دیا زباں سے وہ کر کے دِکھا دیا
کس کو ہسارِ عزم کے انساں ہیں عابدی
کیا کام کر دیا ہے انیسؔ و دبیرؔ پر
تحقیق کے قلم کی رگِ جاں ہیں عابدی
علم و ادب کے کتنے خزانے بچائے ہیں
اہلِ ادب کے درد کا درماں ہیں عابدی

وقت ان کا، مال ان کا، کتابیں ہماری ہیں
ہر زاویے سے رحمتِ باراں ہیں عابدی

اک بے بہا خزانہ کتابوں کا گھر میں ہے
کہتا ہے کون؟ بے سر و ساماں ہیں عابدی

یہ کائناتِ تجسم! انھیں کا کمال ہے
833
منزل بدوش جوئے پریشاں ہیں عابدی
1173 = 2006ء

ہر کام میں خلوص بھی ہے رکھ رکھاؤ بھی
کہہ دو شکیل! جانِ دل و جاں ہیں عابدی

•••

پروفیسر حشمت علی کمال الہامی
سابق پرنسپل وصدرِ شعبۂ اُردو، واستادِ ادبیات اُردو
سفیر ووزیٹنگ پروفیسر بلتستان یونی ورسٹی سکردو

ہدیۂ اخلاص ومحبت

بہ پیش گاہِ محترم المقام، قابلِ صد احترام،
عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب و محقق و نقاد و مایۂ ناز دانشور،
عزت مآب جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی

خادمِ اُردو زباں، اپنے تقی عابدی
عارفِ علم بیاں، اپنے تقی عابدی

ارفع و اعلیٰ ادیب، مشفق و عمدہ طبیب
عشق کا اونچا نشاں، اپنے تقی عابدی

وسعتِ تحقیق ہیں، رفعتِ تنقید ہیں
جہد کا اک آسماں، اپنے تقی عابدی

گلشنِ تصنیف ہیں، اُلفت تالیف ہیں
حُسنِ عمل کا سماں، اپنے تقی عابدی

ہوتے ہیں تخلیق کے، بحر میں، وہ غوطہ زن
پاتے ہیں لعلِ گراں، اپنے تقی عابدی

علم و ادب کے لیے، شعر و سخن کے لیے
رکھتے ہیں قلب طپاں اپنے تقی عابدی

غالبؔ و اقبالؔ و فیضؔ، میرؔ و انیسؔ و دبیرؔ
سب کے ہے راز داں، اپنے تقی عابدی

حالیؔ و امجدؔ، رشیدؔ، جوشؔ کے مداح ہیں
نغمہ گرِ شاعراں، اپنے تقی عابدی

پھرتے ہیں آفاق میں، دیتے ہیں درسِ ادب
زیبِ زمان و مکاں، اپنے تقی عابدی

قافلۂ علم و فن، اُن کا ہی، دم ساز سے
جاتے ہیں جب بھی، جہاں، اپنے تقی عابدی

فکر و تخیل میں ہے، بحرِ ادب، موج زن
صاحبِ طبعِ رَواں، اپنے تقی عابدی

گاتے ہیں بُلبل، ہزار، شعلہ شرر، لالہ زار
ہوتے ہیں جب، گُل فشاں، اپنے تقی عابدی

سہہ نہیں سکتے ہیں جو، دَردِ دِلِ ناتواں
اُن پہ، بہت مہرباں، اپنے تقی عابدی

اُن سے ملاقات کے، کَب سے تھے، ہم منتظر
سب کے ہیں اَب، درمیاں، اپنے تقی عابدی

سکردو کی محفل ہے یہ، آج، ہمارے لیے
سب سے بڑا ارمغان، اپنے تقی عابدی

پنجتنیؑ عِشق ہے، اُن کا کمالِ ادب
زینتِ باغِ جِناں، اپنے تقی عابدی

• • •

نوٹ:۔ یہ منظوم یادگاری عقیدت نامہ، ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں، منعقدہ سیمینار بہ تاریخ 10 /نومبر 2019ء بروز اتوار، بہ مقام مشہ بروم سکردو، بہ وقت ساڑھے تین بجے پیش کیا گیا۔

بشیر آتشم (جے پور)

عزت مآب جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی مدظلہ العالی کی نذر

ادب کے مطلعِ انور کا استقبال کرتے ہیں
شگفتہ جذبۂ اطہر کا استقبال کرتے ہیں

سخن کی صبح کے اختر کا استقبال کرتے ہیں
تقی عابدی برتر کا استقبال کرتے ہیں

مداحِ فاتحِ خیبر کا استقبال کرتے ہیں
فدائے ساقیِ کوثر کا استقبال کرتے ہیں

نظر آتا ہے جن میں حضرتِ اقبالؔ کا پرتو
ہم ایسی فکر کے پیکر کا استقبال کرتے ہیں

خدا شاہد کہ یہ لمحے بڑے انمول لمحے ہیں
سخن فہم و سخن پرور کا استقبال کرتے ہیں

بہت کشمیر کے اہل ادب کو ناز ہے اس پر
حسین تخلیق کے پیکر کا استقبال کرتے ہیں

بہت افسوس ہے اس کا کہ حاضر ہو نہیں سکتا
مرے اشعار ہر منظر کا استقبال کرتے ہیں

زہے قسمت بشیرؔ آتشؔ کہ یہ ساعت بھی آئی ہے
محقق کے حسیں جوہر کا استقبال کرتے ہیں

◆◆◆

پیش پذیر، بذریعہ: پروفیسر سید رضاؔ (کشمیر) 31رمئی 2010ء

ڈاکٹر محسن رضا رضوی
صدر شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی
2/مارچ 2020ء

سپاس نامہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا)

کی اورینٹل کالج پٹنہ سٹی آمد پر

ہم آج جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں
جو زیب بزم اس عالی گہر کو دیکھتے ہیں

ہم اپنے شوق کی بے تابیوں کو کیا دیکھیں
کہ حسن جلوہ گہہ جلوہ گر کو دیکھتے ہیں

ابھر رہا ہے نگاہوں میں کائنات کا حسن
تقی عابدی سے دیدہ ور کو دیکھتے ہیں

ہماری بزمِ ادب مرکز نگاہ بنی
ہم اپنی بزم میں صاحب نظر کو دیکھتے ہیں

زباں کا حسن، ادا کا کمال، فکر کا ظرف
بیان اور بیاں کے اثر کو دیکھتے ہیں

وہ ایک ہم ہیں کہ مرتے ہیں دست قاتل پر
وہ اور ہوں گے جو زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ترے کلام کو سنتے ہیں جب بھی ہم رضوی
ادائے غالب آشفتہ سر کو دیکھتے ہیں

''وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں''

◆◆◆

نامور ادیب، محقق، شاعر
ڈاکٹر سید تقی عابدی کی نذر

کارِ بیکار کو باکار بنا دیتے ہیں
سنگِ الفاظ کو گفتار بنا دیتے ہیں
بات پہنچے جو کوئی سخت کلامی کے قریں
اپنے لہجے سے خوش آثار بنا دیتے ہیں

•••

گفتگو ایسے سلیقے سے بھی کرتے ہیں جناب
علم میں جہل میں دیوار بنا دیتے ہیں
یوں تو اللہ نے بخشی ہے شفا ہاتھوں میں
اپنے بیمار کو بیمار بنا دیتے ہیں

•••

علم و دانش کی جدھر جا کے اُڑائی خوشبو
خار زاروں کو بھی گلزار بنا دیتے ہیں
واقفِ کیفیتِ کربِ بشر ہیں اتنا
دل کی آواز کو اشعار بنا دیتے ہیں

•••

دیکھی جاتی نہیں ناقدریٔ فن ان سے کبھی
صاحبِ مال کو حقدار بنا دیتے ہیں
توڑتے ہیں جو کبھی اپنی خموشی کا حصار
پھر تکلم کو بھی تلوار بنا دیتے ہیں

•••

معنیٔ نور سے نہلا کے قلم کو اپنے
ساری تحریر کو ضوبار بنا دیتے ہیں
ہے تقی نام جو ہیں خادمِ اردو پیکر
خود کو ہر دل کا خریدار بنا دیتے ہیں

•••

فیروز رشید
ناندیڑ (مہاراشٹر)

ڈاکٹر سید تقی حسن عابدی

یہ میدانِ ادب ہے سب یہاں جوہر دکھاتے ہیں
ہزاروں لوگ آتے ہیں، ہزاروں لوگ جاتے ہیں
مگر کچھ لوگ اپنے نقش ایسے چھوڑ جاتے ہیں
مہک گلشن میں اپنی پھول جیسے چھوڑ جاتے ہیں
اُنہی میں اک نمایاں شخصیت باغِ ادب کی ہے
یہ ہی شخصیت ہے جو بڑی محبوب سب کی ہے
تقی کے نام سے وہ شخصیت پہچان رکھتی ہے
کمالِ عابدی میں اک انوکھی شان رکھتی ہے
قلم کی شان ہے علم و ادب کی روشنی بھی ہے
تقی بھی ہے، حسن بھی ہے، بلال عابدی بھی ہے
قلم، اس نے اٹھایا تو گہر افکار کے چمکے
قلم اُس نے اٹھایا تو گُلِ علم و ادب مہکے
ہمیشہ بحرِ نظم و نثر میں غوطہ لگایا ہے
قلم اُس نے ہر اک میدان میں اپنا اٹھایا ہے

وہ پھر تنقید ہو، تحقیق ہو، یا فلسفہ کوئی
ہو کوئی صنف آغوش قلم میں اس کے ہے سوئی

کمالِ عشق اُردو حوصلہ کچھ یوں دکھاتا ہے
نیا جب سال آتا ہے نئی تصنیف لاتا ہے

خیال اس کو کبھی آیا نہیں ہے اپنی شہرت کا
ہر اک تصنیف آئینہ ہے تحقیقی بصیرت کا

ہر اک تحریر گویا علم و فن کی ایک زینت ہے
ہر اک تصنیف اس کی اک اثاثہ بیش قیمت ہے

دھنک تحریر کی اس نے قلم کاروں پہ تانی ہے
ادب کے آسماں پر آج جن کی ضوفشانی ہے

کچھ ایسے کام کرواتی ہے اس کی جستجو اس سے
نئی راہوں میں روشن ہے چراغ اُردو اس سے

وہ حرکت کا ہے شیدائی طبیعت اس کی پارہ ہے
ادب کے آسماں کا وہ بڑا روشن ستارہ ہے

خدائے پاک لمبی عمر، ذہنی روشنی بخشے
قلم کو اُس کے، تحریروں کو اس کی، تازگی بخشے

•••

پنڈت بھوونیش کمار شرما بھون امروہوی

امروہہ فاؤنڈیشن کی جانب سے امروہہ میں
مورخہ 29/دسمبر 2021ء کو ڈاکٹر تقی عابدی صاحب
کینیڈا کے اعزاز میں کیے گئے اعزازیہ پروگرام

''ایک شام تقی عابدی کے نام'' میں پیش نذرانۂ عقیدت
قطعات

لائے ہیں فرمانِ حیدر شخصیت ایسی عظیم
جو کہ عالی مرتبت ہیں صاحب تمکین ہیں
صاحبِ اخلاق ہیں اور دِل کے ہیں یہ ڈاکٹر
کارنامے بھی ادب میں قابلِ تحسین ہیں

•••

جب سُنا علم و ادب کے ہیں محافظ عابدؔی
چار مصرعے اُن پہ کہنے کا مجھے آیا خیالؔ
آج کے اس دور میں یہ ذوق کس میں ہے بھون
عابدؔی جیسی کوئی ہستی تو ملنی ہے محال

•••

قوم و ملت کے ہیں خادم اور اُردو کے سفیر
سج گئی ہے آج کی یہ شام اِن کے نام سے
کتنی شہرت پائی ہے سبطِ نبی کے لعل نے
پوچھ لو تم اے بھون یہ بات خاص و عام سے

•••

عابدؔی صاحب ذرا اس شہر پر ڈالیں نظر
ہے زمیں یہ مصحفؔی کی اور سعادت کا ہے گھر
شاہ ولایتؒ اور واسو دیو کا مسکن ہے یہ
ہیں مہذب لوگ اس کے شانتی کا ہے نگر

•••

سر زمینِ لکھنؤ کے جتنے ہیں اہلِ سخن
اُن کی تخلیقات سے ہیں عابدی بے شک خبیر
غیر سے ماحول میں رہ کر بھی پایا یہ مقام
خدمتِ طب اِن کی اعلیٰ ذوق علمی بے نظیر

•••

ماہر امراضِ دِل ہو کر ادب سے یہ لگاؤ
اُس کی کیا تعریف ہو جو ہے کمال حاصل انھیں
دیکھ کر ذوق سخن شاعر بھی حیراں ہیں بھونؔ
شعر فہمی پر جو پایا اس قدر مائل انھیں

•••

جوہر قابل جناب عابدؔی ہیں خوش کلام
کائنات تجسم ہی کیا اور بھی کتنے ہیں کام
ہے شغف علم و ادب سے مخلصانہ آپ کو
ان کی خدماتِ ادب کو ہے بھونؔ کا بھی سلام

•••

ہے باغِ سخن کی نضارت تقی | عبیرِ زباں کی علامت تقی
یہ الفاظِ گل کا گلستان ہے | علومِ عروضی کی جنت تقی
یہ نازِ ادب، فخرِ اُردو زباں | فصاحت کا نورِ صباحت تقی
یہ فرقِ بلاغت کا اکلیلِ فن | شعورِ بیاں کی طراوت تقی
خیالاتِ تازہ کی آشفتگی | ہے فہم و نظر کی شہامت تقی
یہ دارائے تحقیق و تدوینیت | فنِ شاعری کی حکومت تقی
رثائی کا یہ کعبہِ معرفت | قصیدہ کا حسن و جزالت تقی
زباں اس کی ہے نغمہِ جبرئیل | ہے دینِ ہنر کی شریعت تقی

نہ کیوں فخرِ نوگانواں اس کو کہوں
ہے سلطان کا جذبِ عقیدت تقی

•••

ڈاکٹر سید تقی عابدی کے لیے

انسان ہے ویسے تو یہ ساروں کی طرح ہے
علمی قد و قامت میں چناروں کی طرح ہے

تحقیق کی سوکھی ہوئی کھیتی پہ یہ پیہم
بارش کی برستی ہوئی دھاروں کی طرح ہے

انسان کے دکھ درد پہ لکھتے رہے جو لوگ
تُو ا یہ خود بھی اُنہی درد کے ماروں کی طرح ہے

ہے فیضؔ کا فیضان کہ پھیلی تیری خوشبو
گلزارِ ادب میں تُو بہاروں کی طرح ہے

یہ فیضؔ کی تحسین یہ حالیؔ پر ترا کام
کب دوسرے تنقید نگاروں کی طرح ہے

کرتے ہیں اسے پیار انیسی و دبیری
دونوں کے لیے عابدی یاروں کی طرح ہے

شفق ہو کہ ہو جالبی، فرمان کہ عاشور
میرے لیے یہ بھی انہی چاروں کی طرح ہے

تحقیق کے رہرو کو نہیں رات کا اب خوف
یہ ایک اکیلا ہی ستاروں کی طرح ہے

ہے علم اسے آج کتابوں کی اشاعت
ہے فائدہ ایسا کہ خساروں کی طرح ہے

جس درجہ اسے شعر و ادب سے ہے محبت
اس رشتے سے یہ بھی ہمیں پیاروں کی طرح ہے

ذیشانؔ، تقی عابدی کہتے ہیں جسے لوگ
اس شخص کا ہر کام اداروں کی طرح ہے

•••

زاہد حسین لکھنوی

چند شعر اِس کتاب اور آپ کی خدمات کی نظر ہیں

پڑھی جس گھڑی میں نے ''بُرجِ شرف''
تصور میں جا پہنچا سوئے نجف

علیؑ کے محبوں کا دل کش کلام
شرابِ مودّت، وِلا کا پیام

جواہر وِلا کے جو تھے زیرِ آب
وہ غوطہ زنی سے کیے بازیاب

تھا جوشِ وِلا جس کی تعمیل کی
بڑی عرق ریزی سے تکمیل کی

دُعا ہے یہ زاہدؔ کی ربِ جلیل
تقی کو عطا کر تو عمرِ طویل

ارادوں اپنے رہیں کامیاب
عنایت کریں مجھ کو ہر نئی کتاب

•••

حسام احمد سید
ملٹن، کینیڈا

قصیدہ: برادرِ عزیز و محترم ڈاکٹر عابدی صاحب

ان کی تحریر و تقریر میں دلبری
فکر نو اور شگفتہ کلی تازگی

ان کی محفل ہے دانش کی جلوہ گری
ان کا معیار ہے بس ادب دوستی

چھا گئی ہو جو ابہام کی تیرگی
پھوٹتی ہے قلم سے پھر اک روشنی

جب کہ عالم میں ہو لفظوں کی ساحری
آگہی ہے تقی کو فہم باطنی

اُس کو ملتی ہے تقدیس کی چاندنی
جس کا محور ہمیشہ ہوں مولا علیؑ

بس گئی ان کے دل میں یوں حُبِ نبیؐ
حرزِ جاں ہے خدا کی فقط بندگی

ان کی نظروں میں رہتے ہیں اہلِ نظر
جب کہ ان کی بھی ہے شخصیت عبقری

دیکھتی ہے نگہ ان کی افلاک کو
سب کو تسلیم ہے ان کی دیدہ وری

لطف اُٹھاتے ہیں سب ان کی تقریر سے
ہے شگفتہ لبی میں چھپی رہبری

بزمِ دانشوراں میں یہ کہنا صحیح
ہاں تقی عابدی بس تقی عابدی

کرتے رہتے ہیں دل سے دعا یہ حسّامؔ
ان کو حاصل رہے علم کی سروری

•••

ڈاکٹر خورشید خضر
1369, Elexander Dr.
Boling Brook, IL-60490

منظومِ خراجِ تحسین برادرم تقی عابدی

محبی، قسمی، تقی عابدی
رفیقی، شفیقی تقی عابدی
مصنف، مولف تقی عابدی
محقق، مفکر تقی عابدی
ٹورنٹو میں رہتے ہیں وہ کم سے کم
جہاں گشت ہر دم تقی عابدی
محرب، ہند و پاک اور ایران میں
امریکا، یوروپ کے ایوان میں
تقی عابدی کی کتابوں کا شور
نئی بستیوں میں ہے اُردو کا زور
انیسؔ اور اقبالؔ و غالبؔ کے بعد
ہوا ''فیض فہمی'' کا شہرہ بلند
جہانِ ادب میں وہ ہیں ارجمند

بہت دھوم ہے حسن کاوش کی آج
نگارش میں یکتا تقؔی عابدی
"شناسائی فیض" ہر دل عزیز
ہے فیضان، حضرت تقؔی عابدی

•••

یہ درد!

جناب سید و حالؔی و غالبؔ و اقبالؔ
یہہ دور اردو مشاہیر کا ہے روحِ رواں

پریم چند، انیسؔ، فیضؔ و جوشؔ و مودودی
ہماری فکر و نظر کے ہیں کتنے چارہ گراں

"یہہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے"
سمجھ میں آئے گا اک روز وہ نہاں ہے کہاں

•••

منیر حسین حرہ
ماگام کشمیر

حسنِ تخلیق صورت تقیؑ
سر بسر عشق سیرت تقیؑ

آل رسول سے الفت تقیؑ
مرحبا یہ سعادت تقیؑ

کر گیا عظمت دینِ رسولؐ بیاں
نکتہ داں تھا طبیعت تقیؑ

مراثی اہل بیت نبیؐ کا عاشق
کر گیا بیاں بصیرت تقیؑ

ہے یہ فکر و دانش کا خزینہ
کمال کا فصاحت و بلاغت تقیؑ

ان کا ہر کلام موج علم و یقین
بحیر جز و کل حکمت تقیؑ

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

وہ نعت نبیؐ سنا جو ہم نے
جوش کھا رہی عقیدت تقیؔ

کر گیا بیاں انیسؔ و دبیرؔ و غالبؔ
گفتار کی نرالا میں صورت تقیؔ

مہر کامل جاذبؔ نظر
حکیم الامت کی زینت تقیؔ

فطرتاً وہ اصل میں طبیبؔ
کہہ گیا ادب کا مریض تقیؔ

تاریخ میں چرچا بنا اے منیرؔ
ہر نواح میں ہے شخصیت تقیؔ

•••

دبیر شناسی

ہوتا نہ تعارف کبھی خاقانِ سخن کا
منہ ڈھانپ کے تاریخ ادب درد سے روتی
کرتے نہ نقی عابدی گر قوم پہ احسان
دبیر شناسی کبھی ممکن ہی نہ ہوتی

•••

مونا شہاب
واشنگٹن

تجزیہ یادگارِ انیسؔ

بزم میں روشن ہوئی ہے شمع بن کر دیکھیے
اس کے صفاتِ درخشاں کو اُلٹ کر دیکھیے

چند لفظوں میں ہے سمٹی ایک دُنیائے سخن
بند کوزے میں حقائق کا سمندر دیکھیے

کیوں کریں نہ تعریف و توصیف اربابِ ادب
آج پورا چاند ہے بامِ ادب پر دیکھیے

لو تقیؔ نے دے دیا اپنی عقیدت کا ثبوت
کہہ رہے ہیں آج یہ سارے سخنور دیکھیے

•••

عبدالرحمٰن صدیقی
امریکہ

شاہ سخن

اے نقیؔ! اے اخترِ ارضِ دکن
تو نے زندہ رکھا صدیوں کا چلن

کر دکھایا تو نے تنہا وہ کمال
چاہیے جس کے لیے اک انجمن

تو نے روشن کر دیا اس نام کو
جس نے بخشی نظم اُردو کو پھبن

یعنی وہ سرمایہ اُردو زباں
وہ انیسؔ محترم شاہِ سخن

•••

نسیم فروغ
امریکہ

زورِ شباب

کیوں کر جواب ہوگا کسی لاجواب کا
فکر نقی میں جوش ہے زورِ شباب کا
ایسی لکھی کتاب مچی دھوم چار سو
چاروں طرف ہے ذکر انہی کی کتاب کا

•••

انیس پر جو کوئی خاص کام کرتے ہیں
وہی تو فیضِ سخن اس کا عام کرتے ہیں
یہ دیکھ کر کہ ادب کو دیا ہے اس نے وقار
جو اہلِ فن و ادب ہیں سلام کرتے ہیں

•••

عبدالغفار عزمؔ (لندن)

ہدیۂ تبریک

بتقریبِ اجراء ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' جلد اوّل اور دوئم
کارنامہ ہائے تصنیف و تالیف و تدوینِ سید تقی عابدی، معروف دانشور، محقق،
ادیب، نقاد و ماہرِ فن زیرِ اہتمام اُردو سوسائٹی ایس او اے ایس
(لندن یونی ورسٹی و اُردو تحریک عالمی، یوکے)

رباعی

دل دار وہ اُردو کے سیّد تقی عابدی ہیں
جاں نثار وہ اُردو کے سیّد تقی عابدی ہیں
دانشور، نقاد و ماہر فن کے
شہسوار وہ اُردو کے سیّد تقی عابدی ہیں

14/اگست 2010ء

ڈاکٹر سید تقی عابدی

خادم وہ شیدائی ہیں اُردو کے عظیم
سالار و مجاہد بھی ہیں اُردو کے عظیم
دانشور و نقاد و محقق شاعر
محسن تقیؔ عابدی ہیں اُردو کے عظیم

•••

سید تقی عابدی

علم و ادب کے حسن کی، نقطہ وری کی بات
ہر بزم چل رہی ہے تقی عابدی کی بات

میری زباں پہ آئی مگر ہے سبھی کی بات
خُم خانۂ ادب میں عجب چاشنی کی بات

کہتے ہیں ان کے بارے میں، سب ماہرانِ فن
یہ شخص اپنی ذات میں ہے ایک انجمن

دن ہو کہ رات ہو کبھی سوتے نہیں جناب
جانے تھکن سے چور کیوں ہوتے نہیں جناب

دیتے ہیں اپنی رائے کو، بن کر دلیر یہ
تالیف کر رہے ہیں کتابوں کی ڈھیر یہ

اس فیصلے کی ان کو ضرورت ہی کیوں پڑی
ہر دوسری کتاب ہو پہلی سے کچھ بڑی

یہ فیصلہ ادب کے جہاں میں سبھی کا ہے
یہ آج کل کا دَور تقی عابدی کا ہے

•••

6/مارچ 2022ء

استقبالیہ

ہم اپنی بزم میں اہلِ نظر کو دیکھتے ہیں
ادب کے معنوی لعل و گہر کو دیکھتے ہیں
ہم اِن کی شکل میں شمس و قمر کو دیکھتے ہیں
یہ ایسی شام ہے جس میں سحر کو دیکھتے ہیں
"یہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اِن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

•••

حاضر غزل

رونقِ انجمن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں
بلبلِ نغمہ زن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

ہونٹوں پہ بات بات پر کھلتے ہیں پھول آپ کے
کھلتا ہوا چمن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

غالبؔ و میرؔ کی قسم قائم ہے آپ کا بھرم
ماہرِ فکر و فن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

اُردو زباں سے پیار ہے آپ کا یہ شعار ہے
میرے تو ہم سخن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

بزمِ ادب میں روشنی ہوتی ہے ہر سُو آپ سے
نور کی وہ کرن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

ایسے وفا شعار ہیں کرتے سبھی سے پیار ہیں
نازشِ انجمن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

اِن کا متینؔ زیب تن فکر کا جو لباس ہے
علم کا پیرہن ہیں آپ، آپ بہت عظیم ہیں

•••

ڈاکٹر عبدالرحمان عبؔد
نیویارک

گلہائے خوش رنگ

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تازہ ترین تخلیق ''گلشن رویا'' اس وقت میرے سامنے ہے۔ یہ فکر انگیز کلام اہل ذوق کے لیے گراں مایہ سرمایہ ہے اور ان کی پیش کش ہر اعتبار سے قابل ستائش اور معتبر ہے، جس کے لیے وہ لائق تحسین و مبارک باد ہیں۔ اُردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اسے تقی عابدی جیسی ادب نواز ماہر لسانیات شخصیت میسر آگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیشہ طبابت کے ساتھ ساتھ اُردو نثر، مقالہ نگاری اور تحقیق و تنقید میں ایک ایسا مقام پیدا کرلیا ہے کہ ان کے ادب پارے اب اُردو ادب کے نامور حلقوں میں مستند تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا تو ہونا ہی تھا کیوں کہ مشرقی تربیت، سائنسی ذہن، اعلیٰ تعلیم اور ادبی ذوق جب یکجا جمع ہوجائیں تو اس حسین امتزاج سے کرامات کا ظہور پذیر ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔

میرے نزدیک ڈاکٹر تقی عابدی کا شمار گنتی کے ان چند لوگوں میں ہوتا ہے جس کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اور جو کہنا جانتے بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کاوشوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی تمام تر توانائیوں کو اُردو ادب کے کسی ایک گوشے کی جانب مرکوز نہیں کیا بلکہ وہ اُردو کے گیسوئے پریشان کو سنوارنے کے قائل ہیں۔ نظم ہو یا نثر، مرثیہ ہو یا منقبت، حمد و نعت کا میدان ہو یا تغزل کا شہر، اُردو تحقیق کی بات ہو یا مقالہ نگاری کا تذکرہ۔ ڈاکٹر صاحب کو پڑھ کر قاری کو اندازہ ہوجائے گا کہ آپ نے اُردو کے علاوہ فارسی طرز شاعری پر کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس بحر بیکراں سے کتنے بیش قیمت گہر حاصل کیے ہیں، جن سے آئندہ نسلیں مستفید ہوں گی۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی شاعری میں فکر کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ اپنی بات کو کبھی انیس

کے سوز و گداز کا رنگ دے کر اور کبھی علامہ اقبالؔ کا داعیانہ مفکرانہ انداز دے کر نہایت شائستگی کے ساتھ برملا کہہ دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

آج حیوان صفت پہنے ہیں انسانی نقاب
آج ہر ہاتھ میں رہتی ہے تمدن کی کتاب
آج ظالم کے حوالے ہے عدالت کا حساب
آج قمری کا نگہبان ہے خونخوار عقاب
ایسے عالم میں کوئی ہے جو حقیقت بولے
بند لاشوں پہ کوئی در زنداں کھولے

وہ اپنی بات محض اپنے حوالے سے نہیں کرتے بلکہ اپنے محسوسات کے وسیلے سے، اپنے ماحول اور اپنے گرد و پیش کی منظر کشی کرتے ہیں۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کلی کو بادۂ شبنم پلا دیا میں نے
لہو سے کانٹے کا چہرہ سجا دیا میں نے

•••

چمن کو آتش گل سے کبھی جلاتا ہوں
صدائے بانگِ درا سے کبھی جگاتا ہوں

•••

خیال کو پرِ جبریل دے دیا میں نے
قلم میں رنگِ گلستاں کو بھر لیا میں نے

•••

جو منزلوں کو ملائے وہ رہگزار ہوں میں
چمن سرشت ہوں صحرا کا برگ و بار ہوں میں

•••

صدائے کلک میں روداد زندگانی ہوں
میں کائنات کی اک ان کہی کہانی ہوں

محبت کے عنوان سے جب بات کرتے ہیں تو نظم و غزل دونوں میں اتنی سچائی سے اظہار کرتے ہیں کہ قاری ان کے احساسات کا ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

بھٹکے ہوئے منزل پہ پہنچ جائیں گے خود ہی
رستوں سے اگر راہنماؤں کو ہٹا دو

•••

لوگوں میں فقط عیب نظر آتے ہیں جس کو
اس کو بھی کبھی آئینہ خانہ میں بٹھا دو

•••

خود روشنی پھیلے گی محبت کی زمیں پر
جو تم سے جفا کرتا ہے تم اس کو دعا دو

بچوں کی ہنسی، کے عنوان سے ان کی نظم محبت سچائی اور انسانی ہمدردی کے جذبوں سے سرشار ہے۔ اپنی بیٹی کے لیے انھوں نے جو نظم ''رویا'' کہی ہے اس کی جھلک ملاحظہ ہو:

ننھے ہونٹوں پہ بہاروں کا ترانہ لے کر
برف کے دور میں ساون کا زمانہ لے کر

•••

چاندنی بن کے مرے صحن میں اتری ہے وہ
بن کے رنگین کنول جھیل میں ابھری ہے وہ

•••

یہ ہے رویا کا اثر
مل گئی نور نظر

•••

اس کی تعبیر نہیں
ویسی تصویر نہیں

•••

ایسی تحریر ہے وہ
جس کی تفسیر نہیں

ڈاکٹر تقی عابدی کے اشعار پڑھ کر قاری پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ انھوں نے نئی نئی باتیں نئے انداز میں کہی ہیں گو وہ روایتِ تغزل سے دور بھی ہوئے۔ کہتے ہیں:

نظر بت تراشوں کی جن کو ملی ہے
چٹانوں کے اندر صنم دیکھتے ہیں

•••

عجب دور ہے یہ کہ لفظوں کے اندر
ادیبوں کے ٹوٹے قلم دیکھتے ہیں

•••

خم و پیچِ عالم کو بھی دیکھ لیں گے
ابھی زلفِ جاناں کے خم دیکھتے ہیں

•••

کچھ ایسا خوف تھا شعر و ادب کی بستی میں
میں اپنے نام کی تختی بھی گھر لگا نہ سکا

•••

کس کو صدا کروں کہ کوئی ہمنوا نہیں
کس موڑ پہ کھڑا ہوں مجھے خود پتا نہیں

•••

تم دھوپ کے صحرا میں کسے ڈھونڈ رہے ہو
یہ جھاڑ ہیں کانٹوں کے جو سایا نہیں کرتے

•••

مرے خیال سے رنگین نوا ہیں لوح و قلم
سنوارے میں نے عروسِ سخن کی زلف کے خم

•••

شکستہ خواب کی تعبیر دھن رہا ہوں میں
فضا میں بکھرے ہوئے گیت چن رہا ہوں میں

•••

ادب کی خلعتِ زرباف بن رہا ہوں میں
حریم غیب کی آواز سن رہا ہوں میں

•••

انصاف ترا دیکھنے اے حسنِ جہاں گیر
ہم عدل کی زنجیر ہلائیں گے کسی دن

•••

خاموش ہیں اس وقت تری بزم میں لیکن
جو بات سنانی ہے سنائیں گے کسی دن

ہم ان کی بات سننے کے منتظر ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ یونہی سخن طراز رہیں گے اور اس بزم خیال کی رونق کو اپنے منفرد رنگ سے رونق افروز کرتے رہیں گے۔

"گلشن رویا" کا زندہ دل شاعر: تقی عابدی

تقی عابدی اپنے مسقط الراس سے بظاہر بہت دور شمالی امریکہ اور کینیڈا میں بستے ہیں۔ ظاہر دور میں نے یوں کہا کہ بباطن وہ آج بھی اپنے آبائی وطن عزیز سے بہت قریب ہیں اور ان کا دل جنوبی ہند کے سیاسی و سماجی نشیب و فراز کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ دل کی یہ دھڑکن ایشیائی مسلم ممالک کے نشیب و فراز تک محدود نہیں رہتی بلکہ یہ انسانی سطح پر دُنیائے اسلام کے سارے خطوں کے تغیرات سے منسلک ہو جاتی ہے۔ ایسا ہونا نہ تو بے سبب ہے اور نہ اتفاقی و لاشعوری ہے بلکہ تقی عابدی کے افتادِ طبع کے عین مطابق ہے، سوچا سمجھا ہے اور شعوری ہے، اس لیے کہ وہ اس محدود جمہوریت یا نظام حکومت کے قائل نہیں ہیں جو وطنیت کی تنگ نظری اور علاقائی قومیتوں کی حد بندی سے جنم لے کر انسانی معاشرے کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے بلکہ وہ ایسے جمہوری نظام کے قائل ہیں جو انسانی قدروں اور انسان کے بنیادی حقوق کے مستقل تحفظ کی اساس پر استوار کیا گیا ہو، چناں چہ تقی عابدی کی شاعری میں محدود وطنیت کی نہیں بلکہ عالمی وطنیت و اخوت کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ وہ اقبال کے باشعور پرستاروں میں ہیں اور انھیں کی طرح اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ:

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی ہے نہ صفاہاں نہ سمرقند

نتیجتاً ان کی شاعری جسے شاعر کی زندگی کا ترجمان کہنا چاہیے اور اپنے مخاطب کے حوالے سے مقامی نہیں رہتی بلکہ عالمگیر بن جاتی ہے اور پاک و ہند سے آگے بڑھ کر کشمیر، افغانستان، بوسنیا اور فلسطین کے دور دراز علاقوں کے باسیوں کو بھی اپنا مخاطب بنا لیتی ہے۔

اُردو اور فارسی ادب کے باب میں تقی عابدی کا مطالعہ، قابل رشک حد تک وسیع ہے۔ وہ اُردو فارسی دونوں زبانوں کے مزاج شناس، ان کے تاریخی وثقافتی پس منظر سے واقف اور ان کے نمائندہ شعراء کے محاسن وکمالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ سخن گوئی کے ساتھ ساتھ وہ سخن شناسی کا بھی سچا ذوق رکھتے ہیں۔ عروض وعلم بیان کے رموز ونکات سے بھی بے بہرہ نہیں ہیں۔ وہ **المعجم فی المعباد الاشعار والعجم** سے لے کر پروفیسر ناتل خانلری کی انتقادعروض درزبانِ فارسی تک کی شناوری کر چکے ہیں اور قدیم ادب کی راہوں اور منزلوں سے بھی اتنا ہی واقف ہیں جتنا کہ جدید سے۔ انھیں غالبؔ اور علامہ اقبالؔ سے خاص لگاؤ ہے اور علامہ اقبالؔ کے فلسفہ، پیغام وعمل اور فکر وفن کے حوالے سے وہ علی شریعتی کی طرح اقبالؔ کے پرستار وشیدائی ہیں چناں چہ تقی عابدی کی شاعری خصوصاً ان کی نظموں میں جذبہ ملی کی جو بلند آہنگی نظر آتی ہے وہ علامہ اقبالؔ اور ان کی شاعری کے اثرات کا ثمر ہے۔

تقی عابدی کا تازہ مجموعہ کلام ''گلشن رویا'' طرح طرح کے پودوں اور پھولوں سے سجا ہوا ہے۔ اس میں غزلوں اور نظموں کے ساتھ حمد ونعت، منقبت وقطعات بھی کچھ شامل ہیں اور سب میں فکر وفن کی قابل توجہ رعنائیاں موجود ہیں۔ نظموں میں ملی زاویہ نظر سے، کشمیر، فریاد مسجد اقصیٰ، بوسنیا، جستجو، نہج البلاغہ، عیدالفطر اور خالص فکری نہج سے بچوں کی ہنسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آخرالذکر نظم ''بچوں کی ہنسی'' تو ایسی فکر انگیز اور خوب صورت نظم ہے جسے اپنے موضوع کی ندرت اور فنی تموج کی بنا پر جدید اُردو نظموں کے ذخیرے میں ایک گراں قدر اضافہ خیال کرنا چاہیے۔ اس نظم کو تقی عابدی جس انداز خاص سے پڑھتے ہیں وہ الگ ایک سماں باندھ دیتا ہے اور مجمع کو دیر تک اپنے سحر میں لیے رہتا ہے۔

تقی عابدی کی غزلیں بالعموم چھوٹی بحروں میں ہیں اور جذبات کے آبشار کا عجیب رنگ وآہنگ جماتی ہیں۔ اس جگہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ البتہ چند منتخب اشعار دیکھتے چلیں اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ فکر وفن اور جذبات ومحسوسات کی سطح پر تقی عابدی کی غزل کا نیا روپ ہوتا ہے۔

وہ آنسوؤں میں مجھ کو بہا کر چلے گئے
سیلاب میری آنکھ کا لیکن رُکا نہیں

•••

موت پر مجھ کو اختیار نہیں
اس لیے اس کا انتظار نہیں

•••

مثل خوشبو کسی پہ بار نہیں
میں کسی دوش پر سوار نہیں

•••

درد میرا ہے کچھ، دوا ہے کچھ
میں نے مانگا تھا کچھ، دیا ہے کچھ

•••

اٹھایا جس کو خدا نے کوئی گرا نہ سکا
گرایا جس کو خدا نے کوئی اٹھا نہ سکا

•••

ہر شعر اس غزل کا ہے تیرے لیے مگر
کس کو غزل سناؤں ترے روٹھنے کے بعد

•••

اپنا دکھڑا سنا کے دیکھ لیا
جگ کو خود پر ہنسا کے دیکھ لیا

•••

دن ہمارے اجاڑ تھی محفل
اس نے سب کو بلا کے دیکھ لیا

•••

نیزے پہ اُسی سر کو اٹھاتے ہیں تقی جو
شیطان کی چوکھٹ پہ جھکایا نہیں جاتا

•••

دل میں تو ہے ہر اک سمت روا ہے سجدہ
سر جھکے میرا جدھر کعبہ ادھر ہوجائے گا

ان اشعار میں جو چیز مشترک ہے وہ جذبے کی صداقت اور بیان کی سادگی ہے۔ ہر چند کہ محض اشعار نہایت فکر انگیز ہیں۔ لیکن شاعر کی قادر الکلامی کی معرفت بات ایسی سادگی سے کہہ دی گئی ہے کہ یک بیک میر تقی میر یاد آجاتے ہیں۔ میر کا کہنا ہے کہ:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیئے گا
کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

کچھ یہی صورت تقی عابدی کے شاعرانہ لب ولہجے کی ہے۔ نہیں کہیں مشکل تراکیب والفاظ کا استعمال، نہ استعارات وکنایات کا غیر ضروری ابہام، سچے جذبے کے دباؤ اور بہاؤ کے وقت ہر خیال واحساس اپنا لفظی پیکر اپنے ساتھ لایا ہے اور شعر کی صورت میں ایسا دل کشا وتاثیر بن گیا ہے کہ قاری اپنے آپ کو اس کی داد دینے پر مجبور پاتا ہے۔ بشرطیکہ اسے خوش ذوقی اور سخن فہمی کی توفیق بطور عطیہ الٰہی میسر ہوئی ہو۔ میری دعا ہے کہ تقی عابدی کا ''گلشن رویا'' سدا شاداب وآباد رہے اور اس کی تعبیرات، رویائے صادقہ ورویائے صالحہ کی مثل ونظیر بن جائیں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی
الہ آباد

انشاء اللہ خاں انشآء: ایک جائزہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی طبعی طور پر شاعر اور تخلیق کار ہیں اور پیشہ سے ڈاکٹر ہیں۔ لیکن اپنے غیر معمولی علمی و ادبی ذوق و شوق کی وجہ سے تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ تحقیق و تنقید ان کے نمایاں میدان ہیں خاص طور پر تحقیق۔ جہاں انھوں نے اپنی غیر معمولی تجسس آمیز مزاجی کیفیت اور تلاشِ حقیقت کے حوالے سے کئی غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ویسے تو انھوں نے ''رموزِ شاعری'' اور ''عروسِ سخن'' جیسی کتابیں لکھ کر اپنی زبان دانی بلکہ ہمہ دانی کے ثبوت فراہم کیے ہیں اور مرثیہ بالخصوص دبیر پر ان کے یادگار و لازوال کام نے انھیں جو شہرت و حیثیت بخشی وہ بڑے بڑوں کے نصیب میں نہیں آتی۔ دیارِ غیر میں وسائل کی کمی اور ذرائع کی قلت کے باوجود وہ کلاسیکی ادب کے خزانے تلاش کرتے رہتے ہیں اور پوری منصوبہ بندی و عرق ریزی کے ساتھ جس نوع کے کام کرتے رہتے ہیں اس نے انھیں ایک عمدہ و معتبر محقق کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ سائنس کے طالب علم ہونے کی وجہ سے عابدی صاحب کا انداز سائنسی اور معروضی ہوتا ہے وہ اسی موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں جس کے بارے میں ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس موضوع کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ دبیر پر ان کا غیر معمولی کام ان کے اسی خیال و جذبہ کی تائید کرتا ہے اور یہ سچ ہے کہ اُردو تنقید و تحقیق نے جو سلوک انیس کے ساتھ برتا ہے وہ دبیر کے ساتھ نہیں جب کہ دبیر بھی اسی حق و انصاف کے مستحق ہیں۔ دبیر پر غیر معمولی کام نے پوری اُردو دُنیا (بشمول مشرق و مغرب) کو حیرت میں ڈال دیا ہے جس کی وجہ سے اب عابدی صاحب کا مقام اعتبار و استناد کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ اسی سلسلے کی اگلی کڑی ہے ان کی کتاب ''انشاء اللہ خان انشآء''...... اس کتاب کے لکھنے کی وجہ بھی وہی ہے جو اوپر درج کی گئی ہے۔ وہ خود وجہ

تالیف کی ابتدا یوں کرتے ہیں:

''اگرچہ انشآء کا شمار اُردو کے عظیم شاعروں میں کیا جاتا ہے لیکن دوسرے عظیم شاعروں یعنی میرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ کی بہ نسبت انشآء کی حیات، شخصیت اور فن پر کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ اُردو تذکروں، تاریخوں، قدیم اور جدید تحریروں میں انشآء پر جو اظہارِ خیال ہوا ہے وہ بے طرفانہ نہیں بلکہ معاندانہ بھی ہے جس میں تقریباً ساری توانائی ان کی ادبی معرکہ گیری اور ہنگامہ آرائی کو ثابت کرنے میں صرف کی جاتی ہے۔''

ممتاز شاعر و ادیب اشفاق حسین نے اس کتاب پر تقریظ لکھی ہے۔ انھوں نے اس کام کی ستائش تو خوب کی ہے لیکن انشآء کے نظر انداز ہونے کے کچھ اور اسباب بھی تلاش کیے ہیں۔

انشآء نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں تقی عابدی صاحب نے بڑے سلیقہ و ہنر مندی کے ساتھ اس کی ترتیب و تدوین کی ہے اور معروضی نتائج بھی اخذ کیے ہیں۔ کتاب کا آغاز بایوگرافی سے ہوتا ہے جس میں پیدائش سے لے کر وفات اور آغازِ شعر سے لے کر جملہ تصنیفات کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں لیکن عابدی صاحب نے تمام تر ذرائع و حقائق کو نظر میں رکھ کر ترتیب تیار کی ہے۔ اس کے بعد سفر زندگی، قرآنی استخارے، حمدیہ اقدار، نعتیہ شاعری، منقبتی کلام کے علاوہ نثری تصنیفات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ان سب کی اشاعت، ضخامت، طباعت وغیرہ کے علاوہ ان پر عالمانہ و محققانہ اور کہیں کہیں ناقدانہ تبصرے بھی ملتے ہیں مثلاً یہ جملے دیکھیے:

''انشآء نے تقریباً ہر صنف میں منقبتی اشعار نظم کیے چوں کہ انشآء کا زیادہ کلام ضائع ہوگیا اس لیے ہمارے پاس ان کے رثائی ادب یعنی مرثیہ، سلام اور نوحہ وغیرہ نہیں۔ فارسی اور اُردو میں رباعی کی ہیئت میں حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی اشعار کی کمی نہیں۔ شاید ہی عربی، فارسی اور اُردو میں کوئی ایسی دوسری رباعی موجود ہو جس میں چہاردہ معصومینؑ یعنی محمدؐ فاطمہؑ اور بارہ امام کے ناموں کو اسی سلسلہ میں نظم کیا گیا ہو۔ یہ اگر انشآء کی معجز بیانی

اور قادر الکلامی نہیں تو اور کیا ہے۔" (ص:65)

یا

"انشاء کو عربی زبان پر وہ قادر الکلامی حاصل تھی کہ وہ جس طرح جس لفظ سے کام لینا چاہتے تھے وہ ان کی تخلیق کی مخلوق بن کر ان کے قلم کے زیر فرمان آجاتے۔ دیوان بے نقط میں عربی فقروں کی ردیفیں قافیوں کے ساتھ اس طرح بٹھائی ہیں کہ اس سے بہتر قافیے اور ردیف کی چولیں ایک ساتھ نہیں جڑ سکتیں۔"

"رانی کیتکی کی کہانی" کے بارے میں بھی لکھتے ہیں:

"انشاء کی یہ کہانی آسان اور سلیس زبان میں ہے۔ اس کہانی میں ہندوستانی سماج کے زندہ معاشرہ اور خالص تمدن کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔"

اس کے علاوہ اس کتاب میں انشآء کے اُن کارناموں کا ذکر ہے جہاں انشاء کی استادی، قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے مثلاً نو شعروں میں پچھتّر مقامات کے نام، ایک غزل میں اسٹھ قسمیں بغیر نقط غزلیں اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ مثلاً معرکے، مناظرے، قصیدے، ان کی عربی دانی، ان کی سادگی اور سادہ لوحی وغیرہ ڈاکٹر تقی عابدی نے ان تمام امور کو پوری دیانت داری، ایمانداری سے حقائق کی روشنی میں اس طرح جانچا اور پرکھا ہے کہ انشاء کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے مکمل کارنامے روزِ روشن کی طرح واضح ہو کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اتنی نزاکتوں اور گہرائیوں کے ساتھ انشآء کا مطالعہ اور معروضی تجزیہ اب تک ہمارے سامنے نہیں ہوا تھا۔ تقی عابدی کی یہ کتاب اس کمی کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے اور ایک انوکھے اور البیلے شاعر کے ساتھ مکمل انصاف کرتی ہے۔

چلتے چلتے ایک بار اور...... انشآء جتنے خانوں اور معرکوں میں تقسیم ہوں لیکن ان کی اہل اور بنیادی حیثیت ایک غزل گو کی زیادہ بنتی ہے لیکن اس شعبہ میں بھی ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ وہ ایک ایسے دور کی پیداوار تھے جہاں سوداؔ، دردؔ، مصحفیؔ جیسے اساتذہ کا طوطی بول رہا تھا ایسے میں انشآء کی خود پسندی وانانیت یا دربار کی وابستگی اور اس سے متعلق

ذہانت وشرافت وغیرہ نے ان صفوں سے دور رکھا پھر ان کی غزلوں کی سبک روی، شوخی و شرارت اور تجربہ کاری نے پتہ نہیں کیوں تنقید کی سنجیدہ روش پر آنے سے روکا ہے۔ ان کی شاعری کو چوما چاٹی کی شاعری زیادہ قرار دیا گیا جب کہ یہ بات پورے طور پر سچ نہیں ہے۔ اگر ایک طرف ان کے یہاں ایسے اشعار ہیں ؎

ہے تیرا گال مال بوسہ کا
کیوں نہ کیجیے سوال بوسہ کا

•••

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگے دن ہے ابھی رات کے وقت

وہیں ایسے اشعار بھی ہیں ؎

یہ لال لال ڈورے دکھلائے فصلِ گل میں
نرگس نے تیرے ساقی یاں گل کا منھ چڑھایا

•••

افشاں کا وہ عالم ہے اُس چاند سے مکھڑے میں
جوں وقت سحر انشاء سورج کی کرن نکلے

•••

کبھی عمر بھر پھر نہ تلوے جلیں گے
قدم آپ رکھئے میری چشم تر پر

اس کے علاوہ ذرا یہ دو تین اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر
فعل بد تو اُن سے ہو لعنت کریں شیطان پر

•••

کیا بموقع اس گھڑی تشریف لائے ہے بجا
میں اگر خطِ غلامی لکھ دوں اس احسان پر

پر نہ تھے اس پر بھی پروانوں سے پہنچا کچھ میرے
کیا غضب ہوتا اگر پاتا کہیں انسان، پر

یا یہ غزل ؎

مجھے رونا آتا ہے شمعِ سحر پر
کہ بیماری اب مستند ہے سفر پر

•••

مرے دردِ دل نے فقیرانہ دھونی
لگائی ہے جا عرشِ اعظم کے در پر

•••

جنوں سے اگر آشنائی ہوئی تو
مطول کو دے مار تو مختصر کر

•••

کچھ اک صاف صاف ایسے لکھ شعر انشآء
کہ وہ ماریں چشمک صفائے گہر پر

اوراس غزل نے شہرت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ؎

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

•••

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشآء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ان اشعار کو ملاحظہ کیجیے اس میں تصوف، فکر وفلسفہ کے ایسے ایسے رنگ دکھائی دیں گے جو صرف فنا وبقا کے حوالے سے ہی نہیں تہذیب وثقافت اور معاشرت کے حوالے سے بھی آئینہ بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں جن میں اس عہد کی تہذیب وتمدن، رہن سہن، بود وباش نظر آئے گی۔ حرمان ویاس کی ایک ایسی کیفیت جو اکثر دل بہلاوے کی غرض سے

رومانیت، حسن پرستی اور کبھی کبھی جنس وجسم کے سہارے تلاش کرلیا کرتی ہے اگر انشاؔ محض حسن پرست یا بوالہوس تھے تو حمد ونعت سے لے کران کے متصوفانہ کلام کی بلاغت وعقیدت کس نوع کا پیغام دیتی ہے۔

شاعری میں سارا سچ وہ نہیں ہوتا ہے جو دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کی حقیقت، معاشرہ کی صداقت اور شاعر کی ذہنی کیفیت میں ایک عجیب بے نام سا رابطہ ورشتہ ہوتا ہے۔ نامعلوم سا اور نہ دکھائی دینے والا۔ نقاد کا کام اسی رشتۂ حقیقت کو تلاش کرنا ہوتا ہے۔

اس کتاب میں اشاراتی انداز میں اشعار کو سماجی وتاریخی حوالوں سے سمجھنے کے حوالے بھی نظر آتے ہیں۔ تحقیق کی رو سے ایسے حوالے زیادہ ہیں جہاں سے تنقید کا سفر شروع ہوتا ہے۔

انشاءپر بلاشک وشبہ یہ ایک معتبر ومستند کتاب ہے جسے اُردو تحقیق کی دُنیا تقی عابدی کے ایسے غیر معمولی کام کو یقیناً سراہے گی اور مناسب مقام عطا کرے گی۔ میں ان کی اس غیر معمولی کاوش وکوشش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالرحمان عبؔد

نسخۂ دیانت

علاّمہ اقبالؔ (1877ء-1938ء) بیسویں صدی کے عظیم ترین مفکر اور فلسفی شاعر تھے اور میری نظر میں بیسویں صدی اقبالؔ کی صدی کہلائے گی۔ ان کا نثری اور شعری کلام اخلاقی اور روحانی اقدار پر مبنی ایک ایسے فلسفۂ حیات کا حامل ہے جس نے تمام عالم انسانیت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس حکیمانہ کلام کا تقاضہ ہے کہ گاہے گاہے اسے ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسے رمز شناس اور نکتہ سنج محقق میسّر آتے رہیں، جو اپنے ذوقِ سلیم اور اپنی مخلصانہ کاوشوں کو بروئے کار لاکر فکر و فلسفہ کے اس بحرِ بیکراں سے گراں مایہ موتی چُن کر نذرِ قارئین کرتے رہیں۔ زیرِ نظر نسخہ ''اقبالؔ کے عرفانی اور فکری زاویوں کا مجموعہ'' ایک ایسا ہی تحفہ ہے۔ اس کی تخلیق میں ڈاکٹر عابدی صاحب نے جس ادبی دیانت داری، محققانہ صلاحیت اور مطالعائی گہرائی کا مظاہرہ کیا ہے وہ نہایت ہی قابلِ تحسین و ستائش ہے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ دلدادگانِ اقبالؔ اور اقبالیات کے طلبہ کے ساتھ ساتھ دُنیائے اُردو ادب کے اہلِ نظر حضرات بھی اس مجموعہ کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

حضرت علاّمہ کی شخصیت اور اُن کے کلام کے بارے میں بہت کچھ تحریر ہونے کے باوجود ابھی بہت کچھ تحریر کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ باقیاتِ اقبالؔ کے معیار اور ضخامت دیکھ کر احساس ہوتا ہے کی علاّمہ موصوف نے اپنے کلام کی تشہیر اور اشاعت میں جس احتیاط اور مصلحت کوشی سے کام لیا اُس سے اُن کی ذات کے کئی احسن پہلو عوام الناس سے پنہاں رہے۔ اس میں وقت کی سیاسیات مذہبی رجحانات اور دیگر عناصر کا عمل دخل کتنا تھا یہ تو قیاس ہی کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور کا انگریز نواز اور پنڈت نواز ماحول اس فرزندِ اسلام کو کیسے برداشت کرتا جس کی نگاہ میں ایک سحرِ تازہ کا نقشہ جگمگا رہا تھا اور جو ایک نئے زمانے کی

طلوع کے خواب دیکھ رہا تھا۔

آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

پردہ اُٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

(مسجد قرطبہ)

بقول ''حضرت فرمان فتح پوری ''اقبال سب کے لیے'' اقبال کو بیشتر کتابوں میں اب تک جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ اقبال کے مطالعہ کی راہیں ہموار کرنے کی بجائے مغالطے پیدا کرتا ہے۔ بہت سے مصنفین نے اقبال کے حقیقی افکار سے گریز کر کے اور اپنے متعصبانہ نقطۂ نظر کے تابع ہو کر پیامِ اقبال کو ایسا چوں چوں کا مربہ بنا دیا ہے کہ اس کا مطالعہ نہ صرف اقبالیات کے طلبہ کے لیے بلکہ اہلِ نقد و نظر کے لیے بھی ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔''

اِن حالات کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ موجودہ نسل بلکہ آئندہ نسلوں کو از سر نو کلام و پیام اقبال سے بلا تعصب متعارف کروایا جائے۔ اس کلام کی ہمہ گیریت اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے کج فہم کم ظرف اور کوتاہ اندیش ناقدین کی آراء کے چنگل سے آزاد کر کے عوام الناس تک بلا گزند پہنچایا جائے۔ اس کام کے لیے ادبی دیانت داری، اقبال شناسی اور مخلصانہ محنت کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں اس بات کا احساس وقت گزر جانے کے بعد ہوا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اقبال کا یہ شعر ہم پر صادق آ جائے ؂

اب میری شہرت کی سوجھی ہے! کوئی دیکھے انھیں
مٹ کے میں جس دم غبارِ کوئے رسوائی ہوا

(باقیات اقبال)

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کی یہ تخلیق اس ضمن میں ایک ایسا ہی احسن اقدام ہے۔ گو یہ مجموعہ کسی جامعیت یا حتمیّت کا دعویٰ نہیں کرتا نہ ہی یہ اس بار کا متحمل ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے قارئین یقیناً مستفیض بھی ہوں گے اور اُن کے اقبالؔ شناسی کے اشتیاق میں اضافہ بھی ہوگا۔

علاّمہ اقبالؔ کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے بارے میں تحریری مواد کے بطور مطالعہ اور اس کے تحقیقی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں علاّمہ کے بارے میں قیاس آرائیاں اور غلط فہمیاں خطرناک حد تک موجود پائی جاتی ہیں، اس کا ازالہ ضروری ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کہیں ایک موضوع پر علاّمہ کے خیالات یا اُن کی رائے معلوم کرنا مقصود ہو تو یہ مواد یکجا میسّر نہیں آتا۔ اگر کچھ مل بھی جائے تو وہ بغیر تصدیق اور بغیر حوالہ جات ہوتا ہے، جسے آج کا سائنسی ذہن تسلیم نہیں کرتا۔ اس میدان پر پورا اترنے کے لیے لازم ہے کہ محقق نہایت احتیاط، محنت، بھرپور مطالعہ اور چھان بین کے بعد کوئی رائے پیش کرے اور اس ضمن میں کسی بھی معلوماتی عنصر کو نظر انداز نہ کرے۔ یہ اقبالؔ شناسی کا تقاضا ہے۔ اقبالؔ خود ہر فن میں کمال کے داعی تھے۔

انسان کو فکر چاہیے ہر دم کمال کی
کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی

ڈاکٹر تقی عابدی نے اُسی کمال کی جستجو میں اپنا قلم اٹھایا ہے اور اُسی ادبی ذہانت اور مخلصانہ کاوش کا مظاہرہ کیا ہے جس کی ضرورت تھی۔ علاّمہ کی شخصیت کے جن پہلوؤں کو اس مجموعہ میں زیرِ بحث لایا گیا ہے اُن کے لیے دلائل اور تحریری ثبوت فراہم کرنا ایسی دستاویزات کا متقاضی تھا جو قدرے ناپید ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت ذمہ داری سے ان لوازمات کو نبھایا ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بابائے ظرافت جناب ضمیر جعفری مرحوم جنھوں نے ڈاکٹر عابدی کو ''نیویارک کے جمیلؔ جالبی'' کا خطاب دیا تھا اگر آج حیات ہوتے اور ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ کے معمول کو دیکھتے تو وہ انھیں ''کتابی کیڑا'' نہیں ''کتابی مگرمچھ'' کہتے۔ وہ اس لیے کہ ورق گردانی اور کُتب خوانی میں جو سبک رفتاری انھوں نے دکھائی ہے وہ خیرہ کر دینے والی بات ہے کہ اس برق رفتار ماحول اور پیشہ

طب کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اتنا کچھ اتنے کم وقت میں کر دکھایا۔ دبستانِ اُردو سے ہزار ہا میل دور نیو فاؤنڈ لینڈ کینیڈا میں بیٹھ کر اُردو کتابوں کے ایک ضخیم ذخیرے کا حصول کسی معجزے سے کم نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مدبّرانہ مضمون، کالم اور مقالے اُردو کے معتبر جرائد اور رسالوں میں باقاعدگی سے چھپتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی شخصیت تنقید اور تحقیق کے حوالے سے اُردو ادبی حلقوں میں ممتاز و معتبر مانی جاتی ہے۔ اقبالؔ کے حوالے سے اتنے سنجیدہ اور نازک موضوعات پر قلم اٹھا کر اُن سے کماحقہ انصاف کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ عابدی صاحب نے یہ کر دکھایا ہے جس کے لیے وہ لائق مبارک باد ہیں۔

(حُسن اتفاق دیکھئے کہ اظہارِ خیال کی یہ سعادت مجھے ماہِ اگست کے ان لمحات میں نصیب ہو رہی ہے جو تمام برصغیر کے لیے مژدۂ آزادی بن کر آئے تھے۔ روئے سخن اُس ہستی کی جانب ہے جسے سراپا آزادی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ علامہ اقبالؔ آزادی کے پیامبر بھی تھے، منزلِ آزادی کے خضرِ راہ بھی اور جدوجہد آزادی کے علمبردار بھی۔ انسانی حقوق کے تحفظ میں اُن کا پیام ایک مجسم آئینِ انسانیت کی مثال ہے۔)

آخر میں اپنے ذاتی حوالے سے اتنا کہوں گا کہ اس تخلیق نے ڈاکٹر عابدی کو ایک منفرد اور ممتاز فہرست میں شامل کر کے انھیں ایک نیا تشخص عطا کیا ہے۔ انھوں نے علامہ اقبالؔ سے وہ تعلق قائم کر لیا ہے جس نے انھیں اب کلام و پیامِ اقبالؔ کی طرح ابدیت عطا کر دی ہے۔ اقبالؔ خود کہتے ہیں کہ

اقبالؔ میرے نام کی تاثیر دیکھئے
میں جس کے ساتھ ہوں اُسے ممکن نہیں شکست

ظاہر ہے کہ یہ مژدہ جسے خود اقبالؔ کی جانب سے ملے اُس کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے۔ اقبالؔ سے وابستگی اہلِ قلم حضرات کے لیے باعث افتخار ہی نہیں باعث نصرت بھی ہوا کرتی ہے۔ بارگاہ ایزدی میں میری دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس تعلق کے استوار رکھنے کی ہمت اور مہلت ملتی رہے اور وہ اس وابستگی کا اظہار اپنی تخلیقات کی صورت میں آئندہ بھی نہایت دل پذیر اور مؤثر انداز میں کرتے رہیں۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

"جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے"

"بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو......" کہنے والے کہتے ہیں۔ ممکن ہے چند ایک بگڑے ہوئے شاعر مرثیہ گو بن بھی گئے ہوں لیکن جب شاعری نکھرتی سنورتی ہے، سج دھج جاتی ہے، تب وتاب کی حامل ہوتی ہے فصاحت بلاغت کی حدوں کو پار کر جاتی ہے اور شعر وادب کے عروج واقبال کی منتہاؤں تک رسائی حاصل کر لیتی ہے کہ اونچے اونچے معیارات بھی معمولی لگتے ہیں تو انیسؔ جیسا مرثیہ گو پیدا ہوتا ہے۔ یہ شاعری کا بگاڑ نہیں بناؤ ہے، سولہ سنگھار کے ساتھ، اپنی تمام تر رنگینیوں، رعنائیوں، برنائیوں اور تابانیوں کو لیے ہوئے۔ حقیقت کچھ ایسی ہے کہ ہم نے ایک مدت تک مرثیے کو شعری وادبی زاویوں سے انکار ہی نہیں اس کو ادب میں وہ جگہ ہی نہیں دی جس کا وہ استحقاق رکھتا ہے بلکہ بقول ڈاکٹر سید تقی عابدی "مرثیوں کا مقصد صرف گریہ وبکا اور ثواب دارین حاصل کرنا تھا لوگ صرف مرثیت اور طرز ولحن پر اہمیت دیتے تھے۔" بعد میں اور جو بھی ہوا ہو علامہ شبلیؔ نعمانی نے "موازنہ انیسؔ ودبیرؔ" تسوید کر کے مراثی سے ادبی انصاف کیا۔ کہا جاتا ہے شبلیؔ نے دبیرؔ پر انیسؔ کو ترجیح دی۔ ایسا ہے بھی اور نہیں بھی۔ شبلیؔ نے ادبی اور فنی جن اصولوں کو کام میں لایا اس کے نتیجے میں کچھ ایسا ہی ہونا تھا اور یہ حق بجانب بھی ہے۔ دبیرؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں ان کی قادر الکلامی اور ادبی ہنرمندی میں کس کو کلام ہے۔ دبیرؔ کے مرثیہ نگاری میں عالی مرتبت کے باوصف انیسؔ، انیسؔ ہیں اور اس کا ہر کوئی اعتراف کرے گا۔ شبلیؔ کو کاوشوں کے بعد مراثی پر ادبی زاویوں سے بھی توجہ دی جانے لگی۔ یونی ورسٹیوں کے نصابات میں بھی انھیں شامل کیا گیا اور ہمارے ناقدین نے بھی ان کا مطالعہ اور تجزیہ شروع کیا۔ بے شمار مضامین اور کئی کتابیں سامنے آئیں۔ انیسؔ اور دبیرؔ ہی پر نہیں اور مرثیہ نگاروں پر بھی لکھا گیا۔ دکن میں

مراثی کا جائزہ لیا گیا اور لکھنؤ اور شمالی ہند کے مرثیے بھی توجہ پائے۔ لیکن اب جو کتاب منظر عام پر آئی ہے وہ اپنی نوعیت کی ہے، انفرادی اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

''تجزیہ یادگارِ انیسؔ: جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کی ترتیب، تحقیق اور تنقید کے فرائض انجام دیئے ہیں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی پیشہ کے اعتبار سے معالج ہیں۔ پیدا ہوئے دہلی میں، ایم بی بی ایس کیا حیدرآباد سے، ایم ایس برطانیہ سے، ایف سی اے پی امریکہ سے اور ایف آر سی پی کینیڈا سے۔ اور ان دنوں کینیڈا ہی کے ایک مشہور ہسپتال ہی سے وابستہ ہیں۔ یقیناً تعجب کی بات ہے کہ اپنی بے انتہا، پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود شعر و ادب سے غیر معمولی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ کچھ اور نہیں اس کا اندازہ ان کی تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے۔

انھوں نے تا حال ''شہید''، ''جوشِ مودّت''، ''گلشنِ رویا''، ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے''، ''انشاء اللہ خاں انشاؔ'' جیسی کتابیں تصنیف کی ہیں اور زیر ترتیب ہے ''مراثی فرید لکھنوی''، ''تجزیہ یادگارِ انیسؔ'' لائق توجہ کتاب ہے۔ ظاہری طور پر دیدہ زیب، آراستہ پیراستہ، بڑی سائز نفیس کاغذ، ہر صفحہ پر دلکش حاشیہ رنگین، طباعت اور متاثر کن جلد۔ لائق ذکر بات یہ ہے کہ اس کتاب کا اصل موضوع انیسؔ کا صرف ایک مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' ہے یہ درست ہے کہ ڈاکٹر عابدی نے اس مرثیہ پر جو اس لائق تھا بھی خصوصی توجہ دی ہے لیکن یہ کتاب انیسؔ بلکہ خاندان انیسؔ کی مرثیہ گوئی پر ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود کے خط، اقبال کاظمی کی تقریظ، پروفیسر اکبر حیدری کے مقدمہ اور سید باقر زیدی، عاشور کاظمی اور حسین انجم کی تحریروں کے علاوہ خود سید تقی عابدی (مرتب) کے پیش لفظ سے اس کتاب کی اشاعت کے پس منظر اور دیگر پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ قطع نظر اس کے 13 ابواب پر مشتمل اس کتاب میں کیا نہیں ہے۔ یقین نہیں آتا کہ کسی ایسے شخص نے جس کی زندگی کی اور دلچسپی بھی ایسا وقیع، جامع اور گہرائی اور گیرائی کا حامل ادبی کارنامہ انجام دیا ہو۔ تاریخی، معاشرتی، فنی اور ادبی زاویوں سے ایسا غیر معمولی تجزیہ کہ ہر ہر صفحہ پر منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ تحقیق ہو کہ تنقید، تقی عابدی نے قدرے عقیدت سے ضرور کام لیا ہے لیکن اپنی عقیدت کو مدلل پیش کیا ہے و نیز عمومی طور پر یہ کتاب معروضی تنقید

ہے۔ انیسؔ کے سنہ پیدائش کے بارے ہی میں ہمارے ہاں اتفاق نہیں۔ مختلف اصحاب نے جو سنین دی ہیں۔ تقی عابدی نے ان سب کا تجزیہ کرتے ہوئے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ انیسؔ کی تاریخ ولادت 1802ء اور 1803ء کے درمیان کوئی تاریخ متعین کی جاسکتی ہے۔ اسی کے ساتھ حالات زندگی کے ذیل میں انیسؔ کی تعلیم و تربیت، اساتذہ، شاعری کی ابتداء، حلیہ، وضع، لباس، پابندی اوقات، اخلاق، کردار، نازک مزاجی، شعری ذخیرہ، ان کی غزل گوئی، تلامذہ، اقامت گاہیں، ذاتی امام باڑہ، منبر پر نشست اور پڑھنے کا انداز، منتخب مجالس، عظیم آباد اور حیدرآباد کے سفر، علالت، وفات اور تدفین کے بارے میں خاصی احتیاط اور موثق حوالوں سے تحریر کیا ہے۔ ویسے اور بھی ہیں لیکن تقی عابدی نے بھی انیسؔ کی ایک جامع اور معتبر سوانح ترتیب دی ہے۔ انیسیوں اور دبیریوں کی باتیں اپنی جگہ لیکن دبیر کے تعلق سے انیسؔ کی صاف دلی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''میر انیسؔ مشاہیر ادب'' کے زیر عنوان غالبؔ سے لے کر ڈاکٹر بلال نقوی تک کی آرا شامل ہیں۔ انیسؔ ہی کے ایک مرثیہ پر نہیں کسی اور کے صرف ایک مرثیہ، قصیدہ یا کسی نظم پر ایسا تفصیلی تجزیہ شاید ہی کسی نے کیا ہو اور زبانوں میں بھی ایسی چیز کم ملے گی۔ چناں چہ مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کے متعلقات یعنی وجہ تصنیف، یہ مرثیہ کب اور کہاں پڑھا گیا، مرثیہ کے بندوں اور مطلعوں میں اختلافات مرثیہ کی اشاعت، مرثیہ کے مطلع اور الفاظ کے استعمال کی تفصیل دی گئی ہے۔ اشخاص مرثیہ کے بارے میں بھی تحریر ہے۔ مرثیہ پر اعتراضات کے تحت کلیم الدین احمد وغیرہ کے اعتراضات کا مسکت جواب دیا گیا ہے اور پروفیسر مسعود حسین ادیب، سید اختر علی تلہری اور مرزا جعفر حسین نے اپنے اپنے طور پر اس مرثیہ کا جو مطالعہ کیا ہے اس کو شامل کتاب کرتے ہوئے ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کتاب کے کینوس کو خاصا کشادہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے جس محنت اور باریک بینی کے ساتھ یہ کام کیا ہے اس کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے مرثیہ کے تجزیہ کے طریق کار کو نہایت صراحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ ایک اہم باب ہے۔ دسواں باب ''معجز بیانی'' اس لیے خصوصیت کا حامل ہے کہ تقی عابدی نے اس باب کو ''میر انیسؔ ایک عظیم شاعر تھے اس لیے ان کی شاعری بھی عظیم ہے۔'' کے جملے سے شروع کرتے ہوئے انیسؔ کی منظر نگاری، مرقع نگاری، رزم نگاری، جذبات

نگاری، نفسیات نگاری اور بین نگاری وغیرہ پر اتنی عمدگی اور خوب صورتی سے تبصرہ کیا ہے کہ صرف اس مرثیہ کے لیے نہیں، انیسؔ کے کل مراثی کے مطالعہ کے ضمن میں ایسے صفحات اہمیت رکھتے ہیں۔ تقی عابدی کو علم بیان اور علم بدیع پر جو دسترس حاصل ہے وہ گیارہویں باب ''محاسن شعر'' سے ظاہر ہوتی ہے۔ انھوں نے استادانہ مہارت کے ساتھ لیکن آسان اور رواں دواں پیرایہ میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور صنائع معنوی ولفظی پر شستہ انداز میں روشنی ڈالی ہے اور مثالیں بھی اسی مرثیہ سے دی گئی ہیں کہ مرثیہ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ خوبیاں خود بخود قاری کے سامنے آجائیں۔ اسی کے ساتھ یہ معلومات بھی مبہم پہنچائی گئی ہیں کہ اس مرثیہ میں کل 197 بند ہیں، جملہ اشعار کی تعداد 591 ہے۔ تقی عابدی نے الفاظ شماری بھی کی ہے۔ مرثیہ میں جملہ الفاظ 9517 ہیں جن میں اُردو الفاظ 5813 یعنی 61 فی صد، فارسی الفاظ 1948 یعنی فی صد اور عربی الفاظ 1769 یعنی 19 فی صد ہیں۔ اسی طرح اس مرثیہ میں جملہ حروف کی تعداد 29236 ہے۔ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ کل تشبیہات استعارات اور کنایات وغیرہ کی تعداد بھی دی گئی ہے۔ و نیز خصوصی جدولوں میں یہ ساری چیزیں ہر بند کے ہر شعر کے حوالہ سے درج ہیں۔ مزید یہ کہ ایک صفحہ پر مرثیہ کا ایک بند تحریر کرتے ہوئے اس کے مقابل کے صفحہ پر اس بند کے ہر شعر میں مستعملہ صنائع معنوی و صنائع لفظی کو پیش کرتے ہوئے اس میں وضاحت و بلاغت کی طرف اشارہ کیا گیا اور محاسن علم بیان کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ تقی عابدی کا انہماک اور اخلاص ہر جگہ جلوہ دکھاتا ہے۔ مرثیہ کے منتخب اشعار بھی دیئے ہیں اور مراثی کے مطبوعہ مجموعوں کے سرورق کے عکس بھی۔ اور حاصل مرثیہ شعر بھی جو یہ ہے ؎

جنگل سے آئی فاطمہ زہراؑ کی یہ صدا
اُمت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمداً

انیسؔ کے اس مرثیہ کے فارسی اور عربی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ مرثیہ کے ابتدائی حصہ کا عربی میں ترجمہ مولانا سید علی نقی صاحب مرحوم نے کیا تھا۔ تقی عابدی نے اصل مرثیہ کے تیس بند اور ان کے مقابل عربی ترجمے کے بند شامل کتاب کیے ہیں۔ انگریزی ترجمہ The Battle of Karbala کے بعنوان پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز نے کیا ہے جس کو مکمل طور

پر کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ موجودہ دور میں جب کہ نئی نسل اُردو سے بے بہرہ ہوتی جارہی ہے۔ انگریزی ترجمے کی شمولیت کی افادیت میں کلام نہیں۔ ذیلی ضمنی طور پر اور باتیں بھی سامنے آئی ہیں مثلاً اس مرثیہ کے 118 ویں بند کے آخری مصرعہ ''پانی کنوؤں میں اترا تھا سایہ کی چاہ سے'' پر مسلسل آٹھ سال بحث جاری رہی تقریباً دو سو سے زائد افراد نے حصہ لیا۔ بقول تقی عابدی ''اگر ان مکاتیب اور مضامین کو یکجا کیا جائے تو اس مصرعہ پر پوری ایک کتاب تالیف کی جاسکتی ہے۔'' (ص: 163) اسی طرح ایک دوسرے مرثیہ کے مطلع کے مصرعہ اوّل ''آج شبیرؑ پہ کیا عالم تنہائی ہے'' پر شیفتہ کا تبصرہ! یہاں یہ بھی عرض کروں کہ اتنے اہتمام، بلکہ تزک و احتشام سے شائع ہونے والی کتاب میں کہیں کہیں ہی سہی کمپوزنگ کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ صفحہ 163 پر ''پانی کنویں...... الخ'' کو مرثیہ کے بند (117) کا آخری مصرعہ لکھا گیا ہے جب کہ یہ بند (118) کا آخری مصرعہ ہے۔ اسی طرح صفحہ (242) پر ''محاسن شعر'' کے تحت تشبیہ کو Simile اور استعارہ کو Metaphor لکھا گیا ہے لیکن صفحہ (252) پر استعارہ کے بارے میں درج کیا گیا ہے کہ ''اسے انگریزی میں Simile کہتے ہیں۔'' ظاہر ہے یہاں Metaphor ہونا تھا۔

مرثیوں پر انیسؔ اور انیسؔ کے مرثیوں پر اور لکھا جائے گا، بہت کچھ لکھا جائے گا لیکن ڈاکٹر سید تقی عابدی نے جس ذوق وشوق کے ساتھ یہ کام کیا ہے، اس نوعیت کے کام تا حال تو ہوئے نہیں اور آئندہ بھی کچھ ایسے زیادہ شاید ہی ہوں۔ اُردو مرثیہ کی تاریخ بالخصوص ''انیسیات'' میں اس کا وزن وقار کا انداز بتدریج لگایا جائے گا۔

علامہ اعجاز فرخ
حیدرآباد

ڈاکٹر تقی عابدی اور انیسؔ شناسی

جس طرح غالبؔ کے ساتھ عبدالرحمان بجنوری کا تصور ابھر آتا ہے، اسی طرح انیسؔ کے ساتھ شبلی نعمانی کا بھی خیال آتا ہے۔ شبلی کی کاوش نے بہت سارے افکار کے لیے راہ ہموار کردی۔ اس سلسلے میں امداد امام اثر، پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب، پروفیسر علی جواد زیدی، صالحہ عابد حسین، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز، پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر عقیل رضوی، پروفیسر کلیم الدین اور بہت سارے نام ایسے ہیں جنھیں میں طوالت کی بناء پر لکھ نہیں پارہا ہوں، ورنہ تو خود یہ ایک دفتر بن جائے۔ ان تمام نے کلام انیسؔ پر جتنا غور کیا، اتنے محاسن تو کھلے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت ساری وہ جہات بھی نگاہ میں ابھر آئیں جو ہنوز تشنہ تھیں۔ یہ جہات مستقبل میں بھی غور و فکر کرنے والوں کو نئی منزلوں سے روشناس کرواتی رہیں گی۔ یہ وصف اُردو کے دونوں شعراء غالبؔ اور انیسؔ کے پاس ہے اور باقی رہے گا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خیال کی ترسیل کے لیے لفظ ایک عماری کی حیثیت رکھتا ہے اور آہنگ پر وہ محمل ہوتا ہے۔ کبھی عماریاں مل جاتی ہیں تو خیال کی ترسیل ہو جاتی ہے اور کبھی نہ مل پائے تو تار خیال کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ بھی ہے۔ ادیب اور شاعر کی برتری اسی وقت تسلیم کی جاتی ہے جب اس کی قلم رو میں الفاظ کے وسیع شہر آباد ہوں۔ لفظ بھی انسانوں ہی کی طرح اپنے نام و نسب، قبیلے، صفات، ظاہر و باطن، پیشے، اوصاف قد و قامت، رنگ، روپ، آہنگ، سُر کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ادیب و شاعر کی نہ صرف ان پر حکمرانی ہے بلکہ وہ بھیس بدل کر شب گشت کرکے اپنی رعایا کا احوال سے واقفیت رکھتا ہے کہ رعایا پری کا یہ انداز بھی ان کو موہ لینے کا سبب بن جاتا ہے۔ شاید یہ بات بھی بار خاطر نہ ہو کہ ہر لفظ کے معنی تو ہوتے ہی ہیں مگر جب تک معنی نما موجود

نہ ہو لفظ اپنے سارے اوصاف کے باوجود اثر پذیری سے محروم رہتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ لفظ اپنی جگہ کوئی مستقبل معنی نہیں رکھتا بلکہ اپنے محل استعمال سے معنی پیدا کرتا ہے۔ یہ بات بھی دیکھی گئی کہ کوئی کم حرفی، چھوٹا سا لفظ اپنے جلو میں ہزاروں معنی کا ترجمان ہو جاتا ہے اور ہنوز معنی و مطالب باقی رہ جاتے ہیں۔ غالب کا ایک شعر کہ

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

پہلا مصرعہ تو صاف ہے اور شرح کا متمنی نہیں ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اشارت اور عبارت دونوں واضح ہیں اور اپنے معنی نما کا اظہار بھی رکھتے ہیں لیکن یہ کمبخت سہ حرفی لفظ ''ادا'' اپنے جلو میں ہزار ہزار معنی رکھنے کے باوجود قاری کے ذہن کو ایک ایسی رنگینی خیال کی طرف ملتفت کر دیتا ہے جو ابھی اپنے کنوار پن کو لفظ کے قالب اور آہنگ کے پیرہن کے سپرد کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ بڑا شعر وہ ہوتا ہے جو ایک شعر میں اور بڑا ادیب ایک جملے میں کائنات کو سمیٹ لے لیکن سب سے بڑا شاعر وہ ہوتا ہے جو ایک لفظ میں کائنات کو سمیٹ لے۔ مومن خان مومن کا شعر کہ

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس کو سادہ بیانی کہیے، سہل ممتنع کہیے، مومن کی ساری لطافت اور کمالِ فن میں ایک شعر میں موجود ہے، گویا مومن نے ایک شعر میں کیفیت سمیٹ لی ہے۔ مومن کے ''گویا'' ذو معنی سہی، لیکن جس طرح غالب کے شعر میں ''ادا'' جہانِ معنی کو سمیٹے ہوئے ہے۔

اسی طرح سے میر انیس کے مرثیہ کا ایک مصرع ملاحظہ ہو:

''آج شبیرؑ پہ کیا عالم تنہائی ہے''

اس ایک لفظ ''تنہائی'' کی معنویت اور وسعت کے لیے لغت اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کرتی نظر آتی ہے۔ اس ایک مصرعے اور ایک لفظ ''تنہائی'' کے بعد میر انیس کو مرثیہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ایک مصرع مکمل مرثیہ ہے اور یہ لفظ ''تنہائی'' جملہ جہانِ

درد و الم کو سمیٹے ہوئے ہے اور یہی مرثیہ کا مدعا بھی ہے اور اس کی انتہا بھی۔

بالعموم میدان ادب میں اور خصوصاً کربلائی ادب کی شرح وبسط میں ڈاکٹر تقی عابدی کا نام خوش اعتباری کے سارے لوازمات لیے ہوئے ہے۔ وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ محقق بھی ہیں اور نقاد بھی۔ تمام فنون الگ الگ صلاحیتوں کے متقاضی ہیں۔ تحقیق، جستجو، تلاش مسلسل باریک بینی، عرق ریزی سے کچھ سوا صرف سعیِ پیہم اور مستقل مزاجی کی مدعی نہیں ہوتی بلکہ تقاضائے جنوں بھی کرتی ہے تاکہ دشتِ لاحاصل میں حاصل تلاش ہو جائے۔ جہات انیس پر بہت کام ہو چکا لیکن ڈاکٹر تقی عابدی اس بات کے قائل نظر نہیں آتے کہ

بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

وہ تو پرت در پرت الٹ کر اس زمین کی زرخیزی کو تلاش کرنا چاہتے ہیں جس میں ابھی بے شمار دفینے اور انمول خزانے موجود ہیں۔ انگلیاں فگار سہی، خامہ خونچکاں سہی، عزم محکم کے مقابل کیا ہے، سامنے وسعتِ افلاک سہی۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی شخصیت اور فن پر نقد و نظر کرنے والوں نے اس نکتہ پر توجہ دی ہے کہ وہ پیشے کے اعتبار سے طبیب ہیں اور ذوق کے اعتبار سے ادیب، شاعر، محقق و نقاد ہیں۔ دونوں رخ ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور ان میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ میری نظر میں یہ دراصل یوں ہے کہ

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں؟

ڈاکٹر تقی عابدی دراصل انسانوں کے مسیحا اور اُردو کے بیمار ہیں۔ ساتھ ہی انھیں اس بات کا بھی خیال ہے کہ

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے

حیرت اس بات پر ہے کہ آزار عشق نے انھیں مسیحائی اُردو پر فائز کر رکھا ہے۔ یہ

عجیب پہیلی ہے کہ جب حسن بیمار ہو تو عشق کو قرار بھی نہیں اور بیماریٔ حسن کے نکھار میں لذت نگاہ بھی ہے۔ میں اس پہیلی کو بوجھنا نہیں چاہتا۔ کبھی کبھی پہیلی کو پہیلی ہی چھوڑ دینا اچھا۔

ڈاکٹر تقی عابدی کو عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔ ان کے خاندان سے بھی واقف ہوں۔ اس خاندان میں سب ہی ہونہار بلکہ یکتائے روزگار ہیں۔ وہ دور افتادہ ہیں لیکن محبت فاصلوں کی اسیر نہیں ہوتی۔ اور آج تو فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ آوازِ دوست اور دیدار یار اب کوئی افسانہ ماضی نہیں رہا۔ اب کہاں وہ بات کہ

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

اب تو نامہ بر اور صبا دونوں زیرِ دام ہیں۔ ویسے دل قریب ہوں تو دوریاں کوئی معنی بھی نہیں رکھتیں۔

مرثیہ، مرثیہ کا آغاز، ارتقاء اس کی ہیئت، اجزاء، ادب میں اس کا حصہ، مشاہیر مرثیہ گو شعراء محاسن، ان سب پر گفتگو ہو چکی ہے۔ نقادان سخن نے دفتر کے دفتر لکھ چھوڑے ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش بھی نہیں ہے اور نہ میں اس وقت ڈاکٹر تقی عابدی کی کاوشوں پر تفصیلی مضمون لکھ سکتا ہوں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے مرثیہ شناسی اور انیس شناسی میں محبتوں کے وسیلے سے غلو کیا ہے اور یہ بھی نہیں کہ انھوں نے بعض نقادوں کی طرح سفاک رویہ اختیار کیا ہے۔ ان کی تحریریں اور خیالات عدل کے منصب پر فائز نظر آتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ امجد علی اشہری نے حیاتِ انیس میں ان کے مرثیوں کی تعداد ہزاروں بتائی ہے۔ امیر احمد علوی نے چودہ سو کے قریب بتلائی۔ شاد عظیم آبادی نے ایک ہزار مرثیوں سے زیادہ کی روایت کی ہے۔ میں اس وقت مولانا محمد حسین آزاد اور ''آبِ حیات'' میں انیس کے دس ہزار مرثیوں کی تعداد پر غور کرنا نہیں چاہتا۔ محمد حسین آزاد کی نثر نگاری پر حرف گیری کرنا آپ بے بہرہ ہونے کے مماثل ہے لیکن وہ تحقیق کے آدمی نہیں ثابت ہوئے۔ ان کی بیشتر روایات خوش اعتباری کے میزان پر پوری نہیں اترتی ہیں۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے ان تمام سے پرے مرثیوں کی تعداد 250 بتلائی ہے۔ پروفیسر نیر مسعود کے مطابق مطبوعہ مرثیوں کی تعداد دو سو ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی گراں قدر تحقیق

کے بعد 213 مراثی، 103 سلام، 14 نوحے اور کوئی درجن بھر مناجات اور تضمینات، 579 رباعیات کو حاصل تحقیق قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی جواہر پسند نگاہ نے اس امر کو بھی غور سے دیکھا ہے کہ جہاں بعض لوگ زیادہ الفاظ کو شاعری میں استعمال کی بنیاد پر نظیرؔ اکبرآبادی کو انیسؔ سے بڑا شاعر تصور کرتے ہیں۔ تقی عابدی صاحب نے نظیرؔ اکبرآبادی کے کلیات کا مطالعہ کیا جو 1922ء میں چھپا تھا، اس سے انیسؔ کے کلام کا موازنہ کر کے یہ تحریر رقم کر دی ہے کہ اگر نظیرؔ کے پاس 17000 اشعار ہیں تو انیسؔ کے پاس مطبوعہ غیر مطبوعہ تقریباً 80 ہزار اشعار ہیں۔ تقی عابدی صاحب کی نظر فنِ عروض پر بہت گہری ہے۔ وہ انیسؔ کے مرثیوں کی بحروں کے تعلق سے رقم طراز ہیں کہ انیسؔ کے مطبوعہ مرثیے بحرِ ہزج کے اوزان اخرب، مکفوف و محذوف میں 87 مرثیے، بحرِ مضارع کے اوزان اخرب، مکفوف، محذوف میں 52 مرثیے، بحرِ رمل کے اوزان میں 53 مرثیے اور بحرِ مجتث کے وزن میں 3 یا 4 مرثیے موجود ہیں۔

میر انیسؔ پر بہت کچھ لکھا گیا، بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ابھی تو اس کی شروعات ہوئی ہے۔ وسعتِ نقد و نظر کے ساتھ ساتھ مضامین اور بھی ہیں لیکن جو چیز ڈاکٹر تقی عابدی کو دیگر ناقدین و محققین سے منفرد و ممتاز کرتی ہے، وہ رباعیاتِ انیسؔ پر نقد اور یادگار مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کی شرح ہے۔

''رباعیاتِ انیسؔ کا اجمالی تذکرہ'' میں ڈاکٹر تقی عابدی نے ایک عمومی غلط فہمی کو دور کر دیا کہ رباعی عربی الاصل ہے، ان کی نظر میں ایرانی نژاد ہے۔ رباعی کا وزن فارسی ہے۔ عربوں نے اسے اہلِ ایران سے سیکھا۔ اس بات کی توثیق مولوی علی حیدر نظم طباطبائی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ ''رباعی فارسی والوں کا نکالا ہوا ایک وزن ہے'' پروفیسر محمود شیروانی کا یہ خیال کہ اصناف شاعری میں رباعی اور مثنوی ایرانیوں کی ایجاد تسلیم کی جاتی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے رباعی کو عربی نژاد بتانے کی کوشش کی، اسے طاہریہ خاندان کی پیدائش بتلاتے ہیں، لیکن تقی عابدی نے مختلف دلائل سے اسے رد کرتے ہوئے رباعی کو ایرانی الاصل ثابت کیا ہے۔ رباعیات ہی کے ضمن میں تقی عابدی کی کاوشیں قابلِ داد ہیں۔ انھوں نے 1268 ہجری میں رحلت فرمانے والے شاہ غمگین کے مجموعہ

''مکاشفات الاسرار'' کی اٹھارہ سو رباعیات اور ''مخزن الاسرار'' میں 100 رباعیات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ لیکن انیسؔ کے سلسلے میں انھوں نے رباعیات میں کافی عرق ریزی کی ہے۔ میر انیسؔ کے کلام کی تاثیر کو یوں بیان کرتے ہیں کہ ان کی رباعیات کے بعض مصرعے ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئے۔ مثلاً

''کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں''

''جس طرح چراغ آگے نابینا ہے''

''نادان ہے جو آپ کو دانا سمجھے''

''اس ہاتھ کو اس ہاتھ کا محتاج نہ کر''

ڈاکٹر تقی عابدی انیسؔ سے شکوہ و سنج بھی ہیں انھوں نے جتنی توجہ مرثیہ پر صرف کی ہے، اتنی رباعیات پر صرف نہیں کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیسؔ کے نواسے میر عارف کے فرزند سید یوسف حسین کے قلمی خاندانی نسخوں سے مطبوعہ رباعیات سے تقابل کا اہم کام بھی کیا۔ منشی نول کشور کی شائع کردہ ''مراثی انیسؔ'' کی پہلی جلد میں 81 رباعیات ہیں، ان میں 19 رباعیات میں اغلاط ہیں۔ تقی عابدی نے نہ صرف ان کی نشاندہی کی ہے بلکہ پہلو بہ پہلو صحیح اور مستند مصرعے بھی پیش کیے ہیں۔ مثلاً

''بے'' زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے

کے بجائے

''لے'' زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے

یہ قبر کی منزل بھی ''عجب'' بھاری ہے

یہ قبر کی منزل بھی ''غضب'' بھاری ہے

مجھے چاہیے تو یہ تھا کہ میں ڈاکٹر تقی عابدی کی اس کاوش کو جہاں انھوں نے میر انیسؔ کی وہ رباعیات جن کا ترجمہ دیگر زبانوں میں ہوا، پیش کرتا، لیکن حیران ہوں مضمون میں کیا کیا لکھوں، لیکن یہ لکھے بغیر چارہ نہیں کہ ڈاکٹر عابدی نے جس شاعر پر بھی لکھا، اس کا منصفانہ تجزیہ کیا اور یہ چاہا کہ شاعر کو اس کا صحیح مقام ملے۔ خود انیسؔ کے سلسلے میں نقادانِ اُردو نے جس طرح انھیں نظرانداز کیا، ان پر اعتراضات کیے، اس کے بعد یہ ضروری تھا کہ

از سرِ نو کلامِ انیسؔ کا باریک بینی سے تجزیہ کر کے نہ صرف حقائق کو آشکار کیا جائے بلکہ اس میں وہ پہلو بھی تلاش کیے جائیں جو ہنوز اوجھل تھے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا شاہکار کارنامہ ان کی کتاب ''یادگارِ انیسؔ'' ہے۔ جو انیسؔ کے معرکتہ الآراء مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کی شرح ہے۔ یہ کتاب سن 2002 عیسوی میں مرثیہ فاؤنڈیشن کشمیر سے شائع ہوئی۔ اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کی زیرِ نگرانی شائع ہوئی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر تقی عابدی صاحب سے میری رسم وراہ واجبی سی تھی۔ میں یہ کتاب حاصل نہ کر سکا۔ میرے ایک دوست نے مجھے وہ کتاب مستعار دی اور وہ بھی صرف دس دن کے لیے۔ گیارہویں دن جب وہ یہ نفس نفیس کتاب وصول کرنے میرے گھر آدھمکے کہ مبادا میں اس قیمتی کتاب کے ساتھ فرار نہ ہو جاؤں اور وہ اس بیش قیمت سرمایہ سے محروم ہو جائیں۔ مجھے ان کا یہ کٹھورپن برا نہیں معلوم ہوا۔ دراصل کتابوں کی حفاظت اسی طرح کی جاتی ہے۔ کبھی میرا حافظہ بہت قوی تھا۔ پڑھ لیتا تھا تو برسوں بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ لیکن یہ کتاب پہلی تھی جس کے بعض اندراجات نے تحیر کی لذت سے آشنا کیا۔ میں نے نوٹس لے لیے۔ لاپرواہ، خانماں برباد انسان ہوں اپنے آپ کو نہ سمیٹ سکا۔ اپنی کوئی تحریر محفوظ نہ کر سکا۔ ان نوٹس کو میں نے ''انیسؔ شناس'' کتاب میں محفوظ رکھ دیا تھا۔ گاہے گاہے اس کتاب کو دیکھ لیا کرتا تھا کہ وہ نوٹس محفوظ ہیں کہ نہیں۔ دراصل میر انیسؔ کا وہ مرثیہ ایک معجزاتی کارنامہ ہے جسے میں میر انیسؔ کی الہامی کیفیت کا نتیجہ سمجھتا ہوں، ساتھ ہی اس تجزیہ کو بھی ڈاکٹر تقی عابدی پر سید الشہداء کی کرم فرمائی کا پرتو تصور کرتا ہوں۔

پروفیسر مسعود حسین رضوی گزشتہ صدی کے ماہر انیسیات ہیں۔ ساری عمر کلامِ انیسؔ کے ابلاغ اور ترسیل اور شرح میں گزار دی۔ اپنی محتاط بیانی سے میں یہ کہنا چاہوں کہ پروفیسر مسعود حسین رضوی نے انیسؔ کے لیے وہی کارنامہ انجام دیا جو عبدالرحمان بجنوری نے غالبؔ کے لیے کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے ذوقِ تحقیق کو مہمیز کرنے میں ان کی تحریروں کا غالب اثر محسوس ہوتا ہے۔ ''تجزیہ یادگارِ انیسؔ: جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کے پیچھے بھی حضرت مسعود حسین ادیب کے اس جملے کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے کہ اگر کسی کو

میر انیسؔ کے تمام مرثیے پڑھنے کی فرصت نہ ہو تو وہ یہ مرثیہ پڑھ لے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ میر انیسؔ کے مرثیوں میں یہ مرثیہ کمال پر ہے۔ شاید اس بات سے اتفاق کیا جائے کہ فن کار کے عروج یا شہرت میں اس کے نقاد کا بڑا دخل ہے۔ نقاد اور شارحینِ فن نئے زاویے تلاش کر کے منظرِ عام پر لے آتے ہیں اور پھر

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

علامہ شبلی نعمانی کی موازنہ انیسؔ و دبیر کے سو سال بعد ڈاکٹر تقی عابدی کی یہ بیش بہا تصنیف ''تجزیہ یادگارِ انیسؔ'' اُردو ادب میں ایک غیر معمولی اور قیمتی اضافہ بلکہ اہم سنگ میل ثابت ہوا ہے۔ شبلی کی نظر نے اتنی گہرائی سے حسن مرثیہ کا جائزہ نہیں لیا۔ جس باریک بینی سے ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کو دیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے گھرانے اور مرثیہ سے فطری محبت کا بھی اثر ہے۔ ویسے میں ان کے ذوقِ مطالعہ کا معترف تو ہوں ہی، لیکن مطالعہ اور چیز ہے اور غواصی اور مٹھیاں بھر بھر کے درِ شہوار اچھالنا اور ہے۔

انیس کا یہ مرثیہ 197 بند پر مشتمل ہے اور ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب 800 صفحات پر مشتمل ہے۔ ان 800 صفحات میں ڈیوڈ میتھیوز کا انگریزی ترجمہ The Battle of Karbala اور مولانا سید علی نقی صاحب کا 30 بندوں کا عربی ترجمہ بھی شامل ہے، جس طرح یہ مرثیہ میر انیسؔ کے تمام دفاتر کا کشید کردہ عطر ہے، اسی طرح ڈاکٹر تقی عابدی کی یہ کتاب بھی انیسیات کا انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں 33 عنوانات کے تحت میر انیسؔ کی زندگی اور فن کا شاید ہی کوئی شعبہ چھوٹ گیا ہو۔ اس کتاب میں صرف ایک مرثیہ پر جس طرح ڈاکٹر تقی عابدی نے نظر کی ہے، اس کا اجمالی خاکہ کچھ یوں ہے:

کل 197 بند، اشعار 591، مصرعے 1182، الفاظ 9517، اُردو الفاظ 5813، فارسی الفاظ 1948، عربی الفاظ 1769، اُردو الفاظ کا فیصد 61 فیصد، فارسی الفاظ بیس فیصد، عربی الفاظ انیس فیصد، کل حروف 29236، اضافات 621، جدید تراکیب 111، محاورات 511، جدید محاورے 85، تشبیہات 86، استعارے 45، کنایات 105، صنعت مراعات النظیر 245، صنعت تضمن المزدوج 177، صنعت طباق 154، صنعت مبالغہ

88، صنعت تکریر 71، صنعت تلمیح 66، ایہام 52، صنعت تجنیس 36، تنسیق الصفات 35، حسنِ تعلیل 35، صنعت جمع تفریق و تقسیم 34، ترجمہ اللفظ 30، صنعت ذوقافیتین 29، متفرق صنائع جن کی تعداد 30 سے زیادہ ہیں 182۔

میں چاہتا تو یہ تھا کہ اس ''یادگارِ انیس......'' کا مکمل تجزیہ لکھوں، لیکن کیا کروں۔ مصر کا بازار ہے، یوسف کے خریدار ہیں اور میرے پاس صرف دن بھر کا کاتا ہوا سوت ہے۔ سرکار انیس کو گزرے ہوئے 150 سال ہوئے۔ یاد آئی، بہت شدت سے یاد آئی۔ انھیں کے حوالے سے ڈاکٹر تقی عابدی کی کاوشیں یاد آئیں۔ چند سطور لکھ دیئے۔

انیس! دم کا بھروسہ نہیں، ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

سید باقر زیدی
واشنگٹن

یادگار مرثیہ: یادگار تجزیہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام دُنیائے اُردو میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا ان کا یہ مقام ان کی انتھک محنت، لگاتار کوشش، گہری لگن اور ایک باعزم بے دریغ اور مسلسل جذبہ عمل کا صلہ ہے۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی دھن اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمہ وقت سرگردانی نے انھیں اب بلند ممتاز اور نمایاں درجہ عطا کیا ہے۔ تحقیق وتنقید کے میدان میں وہ نو وارد سہی لیکن بڑے اہم قلم کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُردو زبان کے مضبوط اور کہنہ منطقوں ہندوستان اور پاکستان سے دور رہ کر بھی جو احترام و اعتبار انھوں نے کمایا ہے وہ لائق تحسین ہی نہیں قابل رشک اور قابل تقلید بھی ہے۔ پانچ سال کی قلیل مدت میں اتنا کچھ حاصل کر لینے کی ایک فقید المثال مظہر انھوں نے قائم کی ہے۔ کام کام اور کام ہی ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔ فراغت یا بیکاری کا کوئی لمحہ ان کے حصہ میں نہیں آیا۔ کیوں کہ پیشہ کے اعتبار سے معالج ہیں اس لیے اس طرف بھی ان کی مشغولیت اور ذمہ داریاں کچھ کم نہیں۔ ماشاء اللہ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کے شفیق باپ ہیں۔ ایک ہی بیوی کے سہی مگر ہمہ اوقات یعنی فل ٹائم شوہر ہیں۔ وسیع حلقہ احباب کے مالک ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مخلص دوست اور ایک ہمدرد انسان ہیں حق شعاری اور راست گوئی ان کے سرشت میں شامل ہے۔ کیوں نہ ہو۔ ایک منصف کے بیٹے ہیں۔ لگتا ہے باپ کا منصب بیٹے کے مزاج کا حصہ بن گیا ہے۔ شاید اسی لیے وہ ادبی تبصروں اور تنقیدی مقالوں میں بے باک اور بے لاگ نظر آتے ہیں۔

اقبالیات پر ان کے مقالے ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے'' کے عنوان سے ایک کتاب کی صورت پا چکے ہیں قبول خاص و عام ہوئے۔ انشاء اللہ خاں انشاؔ پر ان کی تحقیق و کاوشیں

سراہی جا چکی ہیں۔ تقی عابدی اپنی مصروف زندگی کے شب و روز میں عدیم الفرصتی کے باوجود اب تک کئی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں اور ان کی طبیعت ابھی سیر نہیں۔ صاحب نہج البلاغہ کا ارشاد گرامی ہے کہ دو ایسے خواہش مند ہیں جو سیر نہیں ہوتے طالب علم اور طلب گار دُنیا۔ تقی عابدی کائنات کے اس قول کی پہلی کیٹگری کے فرد ہیں۔ علم کی اس تشنگی اور طلب نے انھیں اس قابل کیا کہ وہ دُنیائے اُردو کو ایک لاثانی اور شاہکار تحفہ "تجزیہ یادگار انیسؔ" کی صورت میں پیش کر سکیں اُردو ادب پر ایک احسان ہونے کے علاوہ یہ انیسؔ کے اس قرض کی ادائیگی کی بھی کوشش ہے جس کا بوجھ اُردو کے قلم کاروں نے جان بوجھ کر محسوس نہیں کیا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کام کی ابتداء گزشتہ صدی کے آخری مہینوں میں کر دی تھی اور اس اعتبار سے اسے جاتے جاتے پچھلی صدی کا خراج تحسین کہا جا سکتا ہے۔ 1906ء کا شبلی کا موازنہ انیسؔ و دبیرؔ بیسویں صدی کا کارنامہ تھا تو یہ تجزیہ اکیسویں صدی کا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ تقی عابدی کا تجزیہ ان کے تحقیقی کام کا کمال ہے جس کے نتیجہ میں انیسؔ کے معجز نما قلم کی مزید خوبیاں منظر عام پر آ سکیں اور ابھی خدا جانے کیا کچھ ہے جو بے توجہی کے پردوں میں اوجھل ہے۔ تقی عابدی کی کتاب انیسؔ کے یادگار مرثیے "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" کا مکمل تجزیہ ہے۔ یہ کتاب حسن ظاہر اور حسن باطن یعنی صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے لاجواب ہے تقریباً ایک فٹ لمبی اور چوڑی 814 صفحات پر مشتمل یہ ایک نادر تخلیق ہے۔ پہلے صفحہ پر میر انیسؔ کی اس یادگار تصویر کا عکس ہے جو ہاتھی دانت پر بنوائی گئی تھی، اس کی پشت پر کیا خواب گاہ میر انیسؔ یعنی ان کے مقبرے کا عکس ہے اور پھر ٹائٹل کتاب کا انتساب بیسویں صدی کے سب سے بڑے محقق لسانیات پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے نام ہے پھر خود مصنف کی تصویر کوائف اور فہرست مضامین۔ اس کتاب سے متعلق جناب ڈاکٹر نیر مسعود کا خط میر الیعنی باقر زیدی کا قطعہ تاریخ اور ایک نظم بعنوان "تجزیہ یادگار انیسؔ"، عاشور کاظمی کا مکتوب، حسین انجم کی نظم اور اقبال کاظمی کی نظم و تقریظ کے ساتھ ڈاکٹر اکبر حیدری کی تصویر اور میر انیسؔ کی تحریر کا عکس پھر چار صفحات پر مشتمل مقدمہ جو ڈاکٹر اکبر حیدری نے تحریر کیا ہے پھر تین صفحات پر مصنف کا پیش لفظ اور ان سب ابتدائی اور روایتی تقاضوں کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی کا میر انیسؔ پر ایک طویل، جامع، مدلل اور پرشکوہ

مقالہ جو بارہ ابواب پر پھیلا ہوا ہے اوران عنوانات کا حامل ہے۔ (1) ''حیات میر انیسؔ''، (2) ''میر انیسؔ مشاہیر شعر و ادب کی نظر میں''، (3) ''یادگار مرثیے کے متعلقات''، (4) ''مرثیہ کے منتخب اشعار''، (5) ''نمونہ جات مطبوعہ مراثی''، (6) ''اشخاص مرثیہ''، (7) ''مرثیہ پر اعتراضات''، (8) ''مرثیہ کے تجزیاتی نمونے''، (9) ''مرثیہ کے تجزیہ کار کا طریقہ''، (10) ''معجز بیانی''، (11) ''محاسن مرثیہ''۔ یہ گیارہ ابواب انیسؔ شناسی کا بہترین ذریعہ ہیں جو بھی کچھ ایک قاری انیسؔ کے متعلق ان کی ذات اور فن کے حوالے سے جاننا چاہتا ہے وہ سب یہاں موجود ہے۔ 269 صفحات پر پھیلے ہوئے یہ ابواب بذات خود ایک کتاب ہیں جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ بارھواں باب مرثیہ کی تجزیہ کی Statistics پر مبنی ہے۔ یہ جدول بھی بڑی عرق ریزی اور جاں فشانی سے تیار کیا گیا ہے اور وہ تمام 2129 محاسن کلام اور صنعتیں جنھیں فاضل مصنف نے اس تجزیہ میں دریافت کیا ہے ہر بند کے نمبر کے ساتھ تفصیلاً درج ہیں جو 68 صفحات کا احاطہ کرتی ہیں۔ جدول کے بعد دائیں صفحہ پر انیسؔ کے مرثیہ کا بند اور بائیں صفحہ پر مصنف کی محققانہ دیدہ وری کتاب کا یہ حصہ 394 صفحات کو گھیرے ہوئے ہے۔ ہندوستان کے ایک مایہ ناز اسکالر اور جید عالم سید العلماء جناب مولانا سید علی نقی کے عربی نظم میں ترجمہ کیے ہوئے اس مرثیہ کے ۳۰ بند ابتدائی خوشنما عربی خطاط میں موجود ہیں اور اس طرح اس گراں قدر علمی سرمایے کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے۔ آخر کتاب میں Dr. David Mathews کا اس مرثیہ کا ترجمہ The Battle of Karbala بھی شامل ہے پوری کتاب ایک انتہائی دیدہ زیب اور خوب صورت پانچ رنگوں کے حاشیہ کے ساتھ Art Paper پر چھپی ہے جس سے اس کے حسن میں چار چاند لگ گئے ہیں اہم بات یہ ہے کہ یہ کتاب انیسؔ کے کمال سخن وقار اور احترام کی حامل ہے کسی بھی فن کار کے کسی ایک فن پارے پر اتنا جامع اور مضبوط خراج تحسین شاید اس سے بہتر ممکن نہیں ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس سے کیا کام لے اور یہ بات تقی عابدی کی ساری زندگی کے فخر کا باعث ہے کہ اللہ نے اس کام کے لیے انھیں چنا۔

یہ تجزیہ بھی اپنی جگہ یادگار ہے
کار تقی عنایت پروردگار ہے

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس شہ پارے کی تخلیق میں ان کی بیگم گیتی عابدی کو خراج تحسین پیش نہ کیا جائے کہ وہ اس تخلیق کے لیے مناسب فرصت، ضروری ماحول اور ذہنی آسودگی فراہم نہ کرتی رہتیں تو اتنا بڑا کام ممکن نہ ہوتا اس لیے میں گیتی تقی عابدی کو اور خود اُردو ادب کو اس تحقیق وتخلیق پر ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور دست بہ دعا ہوں کہ اللہ انھیں اس سے بھی آگے منزلیں طے کرنے کی توفیق عطا کرے کیا پتہ کوئی اور دُرِ شہوار صدف سے باہر آنے کا منتظر ہو۔

از ہیچ سخنوری نہ آید ایں کار
واللہ کہ اے تقی تو کارے کردی

اور آخر میں ایک حرف سپاس ان سب خوب صورت ذہنوں کے نام جنھوں نے اس شام کو تقی عابدی کے یادگار تجزیہ کی رونمائی کر کے اس پذیرائی کو بھی یادگار بنایا۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

کلام انیسؔ کی ایک نئی خوبی کا انکشاف

کلام انیسؔ کے بحرِ ذخار میں بہت سی خصوصیات ایسی ہیں جن کی طرف ناقدین نے توجہ نہیں کی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کا معرکہ آرا کام "تجزیہ یادگار مرثیہ" واقعی قابل رشک ہے کہ انھوں نے غالباً پہلی مرتبہ انیسؔ کے شعری محاسن کی طرف غور وفکر کیا اور لگ بھگ ایک سو خوبیاں بیان کیں۔ ان میں سے اکثر وبیشتر انیسؔ شناسوں کے لیے نئی ہیں۔

انیسؔ کی بیتیں لاجواب اور غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ جس طرح اساتذۂ رباعی میں چوتھا مصرعہ افکار ومعنی کے اعتبار سے حاوی اور حاصل کلام ہوتا ہے، اسی طرح انیسؔ کے مسدس میں بیت (پانچواں اور چھٹا مصرعہ) مضمون اور بلند خیالی کی وجہ سے مربوط اور جاذب نظر ہوتی ہے۔ ہم مدت دراز سے ان اشعار کی طرف غور وفکر کرتے رہے ہیں۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انیسؔ کی اکثر بیتوں میں یکساں نقطے ہوتے ہیں۔ یعنی جتنے نقطے پانچویں مصرعے میں ہیں اتنے ہی چھٹے مصرعے میں ہوتے ہیں۔ اس خوبی کا نام صنعت مساوی النقاط رکھا گیا ہے۔ اس کا ذکر ہم نے آج سے کوئی تیس سال قبل اپنے دوستوں سے کیا۔ انھوں نے اسے پسند کیا۔ اُس زمانے میں ہم محمود آباد ہاؤس میں مرثیے پر کام کر رہے تھے۔ ایک قلمی مرثیہ سامنے تھا اس کے حاشیے میں بیت کے ساتھ "مساوی النقاط" لکھا تھا۔ اس کے بعد ہم نے انیسؔ کی اکثر بیتوں پر غور کیا اور اس صنعت کو دریافت کیا۔ ذیل میں چند شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

۱۔ ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے = ۲۲
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے = ۲۲

۲۔ نیزے اٹھا کے جنگ پہ اسوار تل گئے = ۱۷
کالے نشاں سیاہ سیہ رو میں کھل گئے = ۱۷

۳۔ چھپا جو شیر شوق میں دریا کی سیر کیے = ۲۵
لیے لی ترائی تیغوں کی موجوں کو پیر کیے = ۲۵

۴۔ بجلی گری پروں پہ شمال و جنوب کیے = ۲۱
کیا کیا لڑے ہیں شام کے بادل میں ڈوب کیے = ۲۱

۵۔ دامن میں رکھ اسے جو محبت علیؑ کی ہے = ۱۶
دولت ہے فاطمہؑ کی امانت علیؑ کی ہے = ۱۶

۶۔ سر جا ملا جو شمسۂ کیواں جناب کا = ۱۱
سونا اتر گیا، ورقِ آفتاب کا = ۱۱

۷۔ قرآن سے عیاں ہے بزرگی امام کی = ۱۶
کھائی قسم خدا نے اسی صبح و شام کی = ۱۶

۸۔ انکار آسماں کو ہے راضی زمیں نہیں = ۱۵
اصغرؑ تمہارے خوں کا ٹھکانا کہیں نہیں = ۱۵

۹۔ اوج و اقبال و چشم فوجِ خدا میں پایا = ۱۸
جب ہوا خاک تو گھر خاکِ شفا میں پایا = ۱۸

۱۰۔ بن کر گہر پسینے کے قطرے ٹپکتے ہیں = ۲۶
ہیکل کی تختیاں کہ ستارے چمکتے ہیں = ۲۶

۱۱۔ آج رتبہ ترا خیلِ شہدا میں ہوگا = ۱۵
شب کو تو صحبتِ محبوبِ خدا میں ہوگا = ۱۵

۱۲۔ خوش خو و خوش خرام و خوش اندام و خوش لجام = ۲۰
گل پوش و تیز ہوش و سمن گوش و سرخ فام = ۲۰

۱۳۔ رکھ دیے جو سم تو رنگ نہ میلا ہو پھول کا = ۱۲
پیارا فرس ہے راکبِ دوشِ رسولؐ کا = ۱۲

۱۴۔ پایا فروغ نیرِ دیں کے ظہور سے = ۱۸
جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے = ۱۸

۱۵۔ جب کربلا میں داخلۂ شاہ دیں ہوا = ۱۳
دشت بلا نمونۂ خلد بریں ہوا = ۱۳
۱۶۔ پنجہ نہ تھا نشاں ثریا مآب کا = ۱۹
تھا فرق جبرئیل پہ تاج آفتاب کا = ۱۹
۱۷۔ آتی ہے اڑکے گرد یمین دیسار سے = ۱۷
گیسوئے مشکبار اٹے ہیں غبار سے = ۱۷
۱۸۔ یہ کیا ہیں تم تو سدِ سکندر کو توڑ دیے = ۱۴
لو ہم کو چاہتے ہو تو دریا کو چھوڑ دیے = ۱۴

ا چاند لگنا...... عموماً ''چار چاند لگانا'' یا ''چار چاند لگنا'' بولا جاتا ہے۔ رونق اور منزلت بڑھانا ہے اور چار چاند لگنا، رونق اور منزلت بڑھنا۔ لفظ چار کے ساتھ محاورہ کا دائرۂ عمل کسی خاص چیز تک محدود ہو جاتا ہے۔ اور خیال میں وسعت نہیں رہتی۔ انیس نے محاورے میں تصرف کر کے اس پہلو کو نکال دیا۔ ''جنگل کو چاند لگ گئے'' یعنی پورا جنگل چہرے کے نور سے منور ہو گیا۔ چار کے اضافے سے خیال محدود ہو جاتا ہے۔ اثر لکھنوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ''مجھے ایک عجیب تجربہ ہوا۔ غالباً ۱۹۳۵ء میں پورا سورج گہن ہوا تھا۔ میرا تقرر ہردوئی میں تھا اور میں اپنے بنگلے میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر درخت کی پتیوں کا سایہ بجائے پتی کی شکل کا ہونے کے ہلال کے مانند تھا اور بے اختیار انیس کا مصرعہ زبان پر جاری ہوا۔

ع : ''جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے'' (فرہنگ اثر ص:214، جلد دوم)

انیس کے بیان محاورے میں ایسے استادانہ تصرف کی اور مثالیں بھی ملتی ہیں ؎

کود کی، پیری، جوانی دیکھ لی
تین دن کی زندگانی دیکھ لی

''محاورہ''، ''دو دن'' کی یا ''چار دن'' کی زندگی ہے۔ چوں کہ عمر کے تین دور دکھانے تھے۔ کودکی، پیری، جوانی۔ لہٰذا تین دن کی زندگانی، دو دن یا چار دن

کہتے، تو ایک دن کم یا ایک دن زیادہ پڑتا۔ ایک نقطہ اور ذہن میں آیا۔ چار اور دو = چھ کا اوسط کیا ہوا؟ تین۔ محاوروں میں ایسا نادر تصرف ہر شخص کا کام نہیں۔ انیسؔ پر اُردو زباں جتنا ناز کرے بجا ہے۔ حالیؔ کی رباعی یاد آتی ہے ؎

اُردو گو راج چار سو تیرا ہے
ملکوں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیسؔ کا سخن ہے باقی
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا

زبان کے اعتبار سے ہی انیسؔ کو خدائے سخن کہتے ہیں۔ اُردو ان کے گھرانے کی مخصوص زبان تھی۔ ناسخؔ کہتے تھے کہ اُردو سیکھنی ہو تو میر خلیق کے گھر جا کر سیکھو۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

تجزیہ مرثیہ یادگارِ انیسؔ

''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے''

دُنیائے اُردو اور خصوصاً اہل لکھنؤ کو یہ مصرع سن کر یقیناً حیران کن مسرت ہوگی کہ کینیڈا کے مشہور و معروف ڈاکٹر سید تقی عابدی (ایم۔ایس) کی ایسی معرکہ آراء تصنیف جو آج تک چشم بشر نے نہیں دیکھی ہوگی۔ انشاء اللہ فروری 2003ء میں منظر عام پر آئے گی۔ کتاب جولائی میں چھپ چکی ہے۔ اب اس کی رسم اجراء سب سے پہلے میر انیس کے شہر لکھنؤ میں ڈاکٹر سید نیّر مسعود رضوی کی صدارت میں قرار پا گئی ہے۔ کتاب پر مختصر تبصرہ کرنے سے قبل پروفیسر مسعود حسن رضوی کا وہ مقولہ بیان کرنا مناسب ہوگا جو مرحوم نے آج سے 80 سال پہلے نواب نصیر حسین خیالؔ سے سنا تھا۔ مرحوم شاہکار انیسؔ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک مدت ہوئی نواب نصیر حسین خان مرحوم (1931ء) نے یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ ایک مرتبہ کسی معزز اور ذی علم انگریز سے اُردو ادب کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا: ''اُردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟'' خیالؔ صاحب نے جواب دیا: ''انیسؔ!'' اس نے کہا کہ ''میں اس شاعر کے کلیات (مجموعۂ کلام) سے اپنے کتب خانہ کو زینت دینا چاہتا ہوں۔'' خیالؔ مرحوم نے مطبع نول کشور کی چھپی ہوئی انیسؔ کی جلدیں خرید کر پیش کیں۔ اس نے سب سے اچھے ایڈیشن کی فرمائش کی۔ مگر اس سے بہتر ایڈیشن تھا کہاں؟ خیالؔ کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ وہ انگریز یورپ کے شاعروں کے اچھے سے اچھے ایڈیشن دیکھے ہوئے تھا۔ کہنے لگا: ''معلوم ہوتا ہے کہ انیسؔ کا اُردو کا سب سے بڑا شاعر قرار دینا آپ کی ذاتی اور انفرادی

رائے ہے۔ ورنہ کہیں ممکن ہے کہ ایک زبان کے بہترین شاعر کے کلام کا
اس سے بہتر ایڈیشن موجود نہ ہو۔'' اس کی بات سے خیال صاحب اور بھی
شرمندہ ہوئے۔ کئی سال ہوئے میں نے یہ واقعہ مرزا محمد جواد صاحب
مالک مطبع نظامی لکھنؤ سے بیان کیا اور انھوں نے ارادہ کرلیا کہ اگر انیس کا
کُل کلام نہ سہی تو کم سے کم ایک مرثیہ اس صورت میں شائع کردیں جو اس
شاعر اعظم کے شایان شان ہو اور جس میں کتابت اور طباعت کی تمام
خوبیوں کے ساتھ اعلیٰ درجے کی تصویریں بھی شامل ہوں۔''

شاہکار انیس نادر و نایاب ہے۔ ڈاکٹر عابدی صاحب کئی سال اس کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہے۔ آخر کار بڑی مشکل سے زرِ کثیر یعنی ہزاروں روپے صرف کر کے ایک نسخہ حاصل کیا۔ اسی کا مکمل تجزیہ زیر بحث کتاب ہے۔ اگر مسعود صاحب زندہ ہوتے اور یہ کتاب دیکھتے تو عابدی صاحب کے ہاتھ چوم لیتے۔

ڈاکٹر تقی عابدی اُردو کے ممتاز شاعر اور نثر نگار بھی ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ کتابیں میری نظر سے گزری ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رثائی ادب کے بھی ماہر ہیں۔ موصوف میر انیس کے مخلص شیدائیوں کے صف اوّل کی ممتاز شخصیت میں ہیں۔ انھوں نے دو سال قبل سید محمد رشید (جعفر منزل) لکھنؤ کا ذخیرۂ مراثی حاصل کر کے کینیڈا میں منتقل کرایا اور اسے جدید سائنسی طور پر محفوظ کرایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے انیس کے مشہور مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ جس عرق ریزی اور ژرف بینی سے لیا ہے اُسے دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ہر بند کے سامنے ہر صفحے میں 36 سے 40 سطروں میں تجزیہ اس مہارت سے کیا گیا ہے کہ رثائی ادب میں ڈاکٹر صاحب کے کمال کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ پوری کتاب فارن آرٹ پیپر پر پانچ خوب صورت رنگوں اور زرد زمین میں کشمیری پیپر ماشی کی طرح آراستہ و پیراستہ ہے۔ جلد بہت مضبوط، شاندار اور سنہری نقوش سے مزین ہے۔ اگر مجھ سے اس کتاب کے بارے میں کوئی سوال کرے تو میں فخر سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر عابدی کی کتاب ''تجزیہ مرثیہ یادگار انیس'' جیسی صاف ستھری پر کشش اور جاذب نظر اور بے

مثال کتاب دُنیائے ادب میں آج تک میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ کتاب کا وزن 3 کلو سے زائد ہے۔ اس کی اشاعت پر دس لاکھ سے زیادہ روپے کی لاگت آچکی ہے۔ کتاب انتہائی نامساعد حالات میں سری نگر میں مرتب کر کے شدت کی گرمی میں دلّی میں میری نگرانی میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ابتداء میں میر انیس اور ان کے مقبرے کے فوٹوز ہیں۔ اس کے بعد پروفیسر مسعود حسن کے نام انتساب مع تصویر درج ہے۔ بعدازاں ڈاکٹر نیر مسعود کا گرامی نامہ، تاریخ کامل انیس، ''تجزیہ یادگارِ انیس'' (سید باقر زیدی امریکا)، سید عاشور کاظمی (لندن)، حسین انجم (مدیر ''طلوع افکار'' کراچی)، سید اقبال حسین کاظمی (مرثیہ فاؤنڈیشن کراچی)، کی منظوم تقریظیں اور راقم الحروف کا مقدمہ شامل ہیں۔ پھر ڈاکٹر تقی عابدی کا معرکہ آراء اور معلومات افزا دیباچہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بجا طور پر درج ذیل شعر کی ترجمانی کی ہے:

حاملِ عمر نثارِ رہ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

کتاب 14/ابواب پر مشتمل ہے۔ باب 11، 12، 13 غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ تیرھواں باب ''تجزیہ کامل یادگارِ مرثیہ'' حاصل کتاب ہے۔ اس میں مرثیہ کے (97 بند) ہر بند کے (3 شعر) کا ایک ایک صفحے میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ یعنی بند کے پہلے، دوسرے اور تیسرے شعر میں کل الفاظ کی تعداد، عربی، فارسی، اُردو ہندی کے الفاظ اور حروف کی تعداد کے علاوہ لغات، صنائع لفظی، صنائع معنوی، فصاحت و بلاغت کا بیان اور محاسن بیان کی خوبیاں نمایاں کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ذوقِ تحقیق اور جدید طرز فکر کی داد دیجیے کہ انھوں نے مرثیے کے کل الفاظ کا شمار بھی کیا ہے۔ یعنی الفاظ کی تعداد بشمول تکرار 9493 ہے۔ ان میں عربی کے 1769، فارسی کے 1948 اور اُردو کے 5776 استعمال کیے گئے ہیں۔ پھر ان الفاظ کا تناسب بھی نکالا ہے۔ عربی الفاظ 19 فیصد، فارسی 20 فیصد اور اُردو 61 فیصد۔

چودھویں باب میں سرکار سید العلماء سید علی نقی قبلہ کے زیرِ نظر مرثیے کے 30 بندوں کا منظوم عربی ترجمہ اور لندن یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے پروفیسر ڈیوڈ میتھوز کا

منظوم انگریزی ترجمہ The Battle of Karbala (194) شامل کیے گئے تا کہ دستبردار زمانہ سے محفوظ رہ سکیں۔ مسٹر ڈیوڈ نے کینیڈا کے سیمینار میں فخر سے کہا کہ ''ڈاکٹر عابدی کی کتاب نے میرے منظوم ترجمہ کو حیاتِ جاودانی بخشی ہے۔''

یہ اطلاع مسرت بخش ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی کینیڈا سے کوئی ڈیڑھ مہینے کے بعد جنوری کے آخر میں ہندوستان آرہے ہیں۔ فروری 2003ء میں کتاب کی رسم اجراء کا انعقاد کیا جائے گا۔ لکھنؤ کے جلسے کی صدارت انشاءاللہ ڈاکٹر نیر مسعود انجام دیں گے۔ دہلی میں سہ (3) روزہ سیمینار 7، 8، 9 رفروری 2003ء کو ''حدیثِ دل'' کے ایڈیٹر سید محمود نقوی کے زیرِ اہتمام ہوگا۔ کتاب کی رونمائی 7 رفروری کو قرار پائی ہے۔ دو جلسے حیدرآباد دکن عابدی صاحب کے وطن مالوف میں بھی ہوں گے ہندوستان کے بعد کتاب کی رسم افتتاح پاکستان کے انیسؔ سیمیناروں میں جناب اقبال حسین کاظمی (مرثیہ فاؤنڈیشن) کے زیرِ اہتمام اعلیٰ پیانے پر کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں ہوگی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کینیڈا اور امریکہ کے انٹرنیشنل سیمینار کی تقریب میں ڈاکٹر عابدی صاحب کی کتاب ''تجزیہ یادگارِ مرثیہ انیسؔ'' کی رسم اجراء وسیع پیانے پر کی گئی۔ کینیڈا میں رسم اجراء سے قبل یونی ورسٹی کے ایک بڑے ہال میں ڈاکٹر موصوف کے نادر الوجود ذخیرۂ مراثی کے اہم اور قدیم قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی نمائش بھی کی گئی تھی۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی اس مقبول عام اور ہر دل عزیز کتاب کی اشاعت اور خدائے سخن میر انیسؔ کی وجہ سے اُردو تحقیقی و تنقیدی ادب میں نہ صرف گراں مایہ اضافہ ہوگا بلکہ اُردو کی نیم مردہ زبان ''اہل لکھنؤ'' کی گنگا جمنی فراموش شدہ اور شکستہ زبان کی آبرو بڑھ جائے گی۔

ڈاکٹر عبدالرحمان عبدؔ
نیویارک

"تجزیہ یادگارِ انیسؔ"

انیسؔ سے جو نسبت تقیؔ نے جوڑی ہے
تقیؔ کا نام رہے گا تقیؔ کے بعد بھی اب

ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کو میں لگ بھگ 13 برس سے جانتا ہوں۔ وہ میرے ہم پیشہ اور ہم ذوق ہونے کے ساتھ ساتھ میرے گہرے دوست اور رفیق کار بھی ہیں۔ ایک عرصہ تک مجھے ان کی ہمسائیگی کا اعزاز بھی رہا ہے جب وہ نیویارک میں مقیم تھے اور اس حوالے سے ہماری بیگمات بھی ایک دوسرے سے خوب متعارف ہیں۔ میں ایک مدت سے ان کی ادبی سرگرمیوں اور ان کے ادبی سفر کی رفتار سے متاثر رہا ہوں مگر "تجزیہ یادگارِ انیسؔ" مرثیہ جیسے شاہکار کے بعد ان کی ادبی پرواز ان کو رفعتوں کی اس سطح پر لے گئی ہے کہ مجھے بے ساختہ کہنا پڑ رہا ہے کہ خدا نے انھیں نہایت بلند اور مخصوص عنایات سے نوازا ہے ؎

ظہورِ شوق کی رہتی ہے دُنیا منتظر صدیوں
برستا ہے بہت نیساں، گہر ہوتے ہیں کم پیدا

ڈاکٹر صاحب کے اس کارنامے نے اُردو ادب کو ایک نئی طرز اور ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ میں نے جدت کے حوالے سے کئی اہل قلم حضرات کی نگارشات کا مطالعہ کیا ہے مگر میری نظر میں اگر کوئی سوچ یا کوئی کام صحیح معنوں میں جدت کے زمرے میں شامل کیے جانے کے لائق ہے تو وہ کام ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کا یہ شاہکار "تجزیہ یادگارِ مرثیہ" ہے۔ موصوف نے میر انیسؔ کے ایک مرثیہ کو موضوع بنا کر ادبی دُنیا کو اتنا جامع اور ضخیم علمی ذخیرہ

مہیا کر دیا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔

تحقیق کی دُنیا میں اکثر یوں ہوتا آیا ہے کہ آپ کسی تحریر یا کسی کتاب یا کسی شخصیت کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں تو آپ اس کے بارے میں موجودہ مضامین اور آراء کا مطالعہ کر کے اور مواد جمع کر کے اپنے الفاظ میں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں اور پھر اس بنیاد پر اپنی ایک رائے قائم کر کے اپنے آپ کو محقق تصور کرنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اس شاہکار کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے 197 بند کے اس مرثیہ کو حرف حرف چھانٹا ہے اور بورڈ سرٹیفائی Pathalogist نے کس طرح اس مشہور زمانہ مرثیہ کی Autopsy کی ہے اس کے رگ رگ اور ریشے ریشے کو الگ الگ کر کے انھیں ہر پہلو سے دیکھا ہے۔ ان کے اجزاء واقسام کو پرکھا ہے اور الفاظ کی گہرائی کی نشاندہی کی ہے۔ تین چار برس کی اس محنت کے دوران یہ مرثیہ انھیں یاد ہو گیا ہے یعنی اب وہ اس مرثیے کے حافظ بھی ہیں۔ انھوں نے میر انیسؔ کے اس مرثیہ "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" کے ہر مصرعہ اور ہر بند کو بلاغت، وضاحت، تشبیہات، مجاز مرسل، صنائع لفظی، تمثیلات ومحاورانہ، صوتی کیفیات، اسلوب، حسن بیان، ترتیب وتسلسل، حسن بندش، الفاظ کی روانی، صفائی، عمدگی، شگفتگی وغیرہ کی تفہیم کے ساتھ ساتھ اس شاہکار انیسؔ کی منظر نگاری، واقعہ نگاری، تمثیل نگاری، المیہ بیانی، جدت نگاری اور سماجی عناصر کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اس مرثیے کے ہر بند کے بارے میں ہمیں بتایا ہے کہ اس میں حروف کی تعداد کیا ہے کتنے الفاظ یا حروف اُردو عربی یا فارسی زبان میں ہیں اس بند میں کیا تراکیب، استعارات، محاورے، کنایات وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔ ہر شعر میں کتنی اضافتیں استعمال ہوئی ہیں کیا صنعت کارفرما ہے۔ اور میر انیسؔ نے کیا اسلوب اور کیا نئی بندشیں پیدا کی ہیں۔ ہر کام وقت طلب، محنت طلب اور تحقیق طلب تھا جو ڈاکٹر صاحب نے اس انداز سے سرانجام دیا جیسے ان کے لیے یہ نہایت فطری اور سہل ہو۔

804 صفحات پر مشتمل دو کلوگرام وزنی سخت جلد میں ملبوس اس ضخیم کتاب میں پندرہ باب ہیں۔ ان میں میر انیسؔ کے بارے میں اور میر انیسؔ کے اس شاہکار مرثیے کے بارے میں تمام تر تفصیل موجود ہے۔ عابدیؔ صاحب نے بڑی جستجو کے بعد اس مرثیے کے

تراجم کو بھی اس کتاب میں جمع کیا ہے۔ پہلے تیس بندوں کا منظوم عربی ترجمہ سید العلماء جناب مولانا سید علی نقی کے قلم سے ہے جو لگ بھگ ساٹھ برس پہلے کا ہے اور معدوم ہو چکا ہے انگریزی منظوم ترجمہ ایک انگلش نژاد دانشور اور معلم اُردو جناب ڈیوڈ میتھیوز کے قلم سے ہے جو ماضی قریب میں The Battle of Karbala نامی کتاب کی صورت میں چھپا تھا۔ ان دونوں توضیحی تراجم کی شمولیت اس شاہکار کو اور بھی جامع بنا رہی ہے۔ کتاب میں اس یادگار مرثیہ کے متعلقات، میر انیسؔ کے بارے میں شاعر شعر و ادب کی رائے، مرثیہ پر اعتراضات اور اس یادگار مرثیہ کی سحر بیانی وغیرہ کے موضوعات نہایت احسن طریقہ سے نبھائے گئے ہیں۔ موصوف نے مرثیے کے تجزیاتی ہونے اور تجزیے کا طریقے کار بھی مفصل طریقے سے قلم بند کیا ہے۔ جس سے صنف کے بارے میں قاری کو مکمل معلومات میسر آتی ہیں۔

دانائی کا جہان ہے روشن کتاب سے
بنتا ہے ذہن علم کا مخزن کتاب سے

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کی اس تخلیق کے مطالعے سے اُردو ادب کے طالب علم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رثائی ادب یعنی صنف مرثیہ گوئی اُردو ادب کا اہم اور وسیع الدامن جزو ہے۔ مرثیہ کے اندر تغزل بھی ہے اور قصیدہ گوئی بھی۔ یہ محض آہ زاری، بین اور اظہارِ غم واندوہ کا نام نہیں۔ اُردو ادب سے اگر رثائی ادب کو نکال دیا جائے یا اسے میر انیسؔ جیسے عظیم شعراء کی تخلیقات سے محروم کر دیا جائے تو یہ ادب نامکمل اور کھوکھلا ہو کر رہ جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُردو ادب پر اور اُردو کے اس دور کے طلباء پر احسان کیا ہے کہ انھوں نے رثائی ادب کے ایک شاہکار کو نہایت عالمانہ انداز میں متعارف کرایا ہے۔

پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری صاحب نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ میں بلا خوف و تردد کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب ادبیات اُردو کے ایک اعلیٰ شاعر، نثر نگار، ممتاز ناقد اور بہت اچھے محقق ہیں۔ انھیں علم عروض کے علاوہ علم بیان و معانی میں بھی خاصی دسترس حاصل ہے۔ فطری علمی استعداد اور اللہ کی دین اسی کو کہتے ہیں۔

مجھے پروفیسر صاحب کی رائے سے سو فیصد اتفاق ہے، میری نظر میں ڈاکٹر صاحب

کے اس کارنامے نے میر انیسؔ کی ادبی شخصیت کو ہی نہیں خود رثائی ادب یعنی مرثیہ گوئی کو از سرِنو حیات بخشی ہے۔ اس لحاظ سے میں انھیں محسن المرثیہ سمجھتا ہوں۔

ساتھ ہی ساتھ میں انھیں اس شاہکار کی تخلیق پہ مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ وہ حسبِ ارادہ اس شاہکار کا چھوٹے سائز کا ایڈیشن بھی شائع کریں گے تاکہ یہ شاہکار ایک عام قاری تک پہنچ سکے۔ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''۔

زبیر صدیقی

تجزیہ یادگارِ انیسؔ
''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے''

انیسؔ سے جو نسبت تقیؔ نے جوڑی ہے
تقیؔ کا نام رہے گا تقیؔ کے بعد بھی اب

تحقیق کی دُنیا میں اکثر یوں ہوتا آیا ہے کہ آپ کسی کی تحریر یا کسی کتاب یا کسی شخصیت کے بارے میں تحقیق کرنے نکلیں تو آپ اس بارے میں موجود مضامین اور آراء کا مطالعہ کر کے مواد جمع کر کے اپنے الفاظ میں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں اور پھر اس بنیاد پر اپنی ایک رائے قائم کر کے اپنے آپ کو محقق تصور کرنے لگتے ہیں۔ تقی عابدیؔ کے اس شاہکار کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے (197) بند کے اس مرثیہ کو حرف حرف چھانا ہے ایک بورڈ سرٹی فائیڈ Pathologist نے کس طرح اس مشہور زمانہ مرثیہ کی Autopsy کی ہے۔ اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے کو الگ الگ کر کے انھیں ہر پہلو سے دیکھا ہے ان کے اجزاء و اقسام کو پرکھا اور الفاظ کی گہرائی کی نشاندہی کی ہے۔ تین چار برس کی اس محنت کے دوران یہ مرثیہ انھیں یاد ہو گیا تقی عابدیؔ اس مرثیے کے حافظ ہیں۔

تقی عابدیؔ کا مرثیے سے ایک قلبی تعلق رہا ہے اور اس قلبی تعلق کا سبب ظاہر ہے کہ واقعہ کربلا اور اہل بیتؑ سے محبت ہے مگر تقی عابدی کا شمار ان لوگوں میں ہرگز نہیں ہے جو مرثیے اپنے کانوں سے سنتے اور آنکھوں سے بہا دیتے ہیں۔ تقی عابدی نے مرثیوں کو سنا، مرثیوں کو پڑھا اور مرثیوں کی فکر اس کی سماعت سے دل اور دماغ تک کا سفر کرتی چلی گئی وہ مرثیوں پر روئے ضرور مگر ان کو معلوم تھا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں اور ان کا ذہن محسوسات کا

تجزیہ بھی کرتا رہا اور تقی عابدی نے یقین کرلیا کہ واقعہ کربلا ایک عالمی سانحہ ہے اس عالمی سانحے پر میر انیسؔ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تقی عابدی بڑے متاثر تھے اور اسی تاثر نے تقی عابدی کو مرثیہ نگاری اور میر انیسؔ کا مطالعہ کرنے پر اُکسایا، تقی عابدی کے ہاں میر انیسؔ کا گہرا مطالعہ موجود ہے۔

یہ کتاب انیسؔ کے معروف مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کا ژرف نگاہی پر مبنی تحقیقی مطالعہ وتنقیدی محاکمہ اور شماریات پر مبنی تجزیاتی جائزہ ہے۔ مراثی انیسؔ میں اس مرثیے کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ چناں چہ ناقدین کی اکثریت نے کسی نہ کسی لحاظ سے اس مرثیے کے شاعرانہ محاسن اجاگر کیے ہیں۔

نامور محقق مسعود حسن رضوی ادیب نے ''شاہکار انیسؔ'' کے نام سے 1943ء میں اس مرثیہ کا دیدہ زیب ایڈیشن لکھنؤ سے شائع کیا تھا لندن سے مقدمہ کے ساتھ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز نے اس کا انگریزی ترجمہ The Battle of Karbala کے نام سے شائع کیا جب کہ ''حسن علی ٹالپر'' نے منظوم سندھی کے قالب میں اسے ڈھالا۔

تقی عابدی کی کتاب ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' 825 صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب 12X9 انچ کے سائز میں پوری کتاب فارن آرٹ پیپر پر پانچ خوب صورت رنگوں اور زردزمین کشمیری پیپر ماشی کی طرح آراستہ پیراستہ ہے۔ وزن 3 کلو سے زائد ہے۔ کتاب سری نگر میں مرتب کی گئی۔ 2002ء میں اکبر حیدری کشمیری کی نگرانی میں دلّی سے اشاعت پذیر ہوئی۔ کتاب میں ہر بند کے سامنے ہر صفحے میں 32 سے 40 سطروں میں اس بند کا تجزیہ بڑی مہارت سے شامل ہے۔ کتاب میں 197 بند کے علاوہ آخر میں 45 صفحات پر مشتمل ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کا The Battle of Karbala منظوم اس پورے مرثیہ کا انگریزی ترجمہ شامل ہے۔ اس سے پہلے سیّد العلماء جناب مولانا سیّد علی تقی قبلہ مرحوم کا 30 بندوں پر مرثیہ کا منظوم عربی ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

ابتداء میں میر انیسؔ اور ان کے مقبرے کے فوٹوز ہیں اس کے بعد ''پروفیسر مسعود حسن خان'' کے نام انتساب معہ تصویر درج ہے۔ بعد ازاں ڈاکٹر نیر مسعود کا گرامی نامہ، تاریخ کامل انیسؔ و تجزیہ یادگار انیسؔ (سیّد باقر زیدی امریکہ)، سیّد عاشور کاظمی (لندن)،

حسین انجم (مدیر ''طلوع افکار'' کراچی)، سیّد اقبال حسین کاظمی (مرثیہ فاؤنڈیشن کراچی) کی منظوم نظمیں اور تقی عابدیؔ کا مقدمہ موجود ہے۔ تجزیہ چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں میر انیسؔ کی حیات کا بیان ہے جو کہ صفحہ 18 سے لےکر 65 تک پھیلا ہے۔ جس میں انیسؔ کی داستان حیات رقم کی گئی ہے۔ اس باب میں 37 ذیلی عنوانات ہیں جس میں ان کی ولادت سے وفات تک اس کے علاوہ ان کی پیدائش کا اختلافی معاملہ بھی زیر بحث آتا ہے۔ انیسؔ کی زندگی کے مختلف گوشوں ان کے رہن سہن کے انداز و اطوار کا تحقیقی طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔ انیسؔ اور ان کے خاندان کے بارے میں ضروری معلومات اور کوائف مستند حوالوں کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ میر انیسؔ کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''میر انیسؔ نے گیارہ برس کی عمر سے ہی شاعری شروع کر دی تھی۔''

شاعری کی ابتداء میں غزل گوئی کی طرف مائل تھے۔ تقی عابدی انیسؔ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''شیخ ناسخؔ نے میر ببر علی کا تخلص حزیںؔ سے بدل کر انیسؔ کر دیا۔ اس واقعہ کی تائید میں سیّد مہدی حسن احسنؔ ''واقعات انیسؔ'' میں لکھتے ہیں کہ جب انیسؔ نے اپنے والد کی موجودگی میں ناسخؔ کے سامنے اپنی غزل کا شعر پڑھا

کھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

ناسخؔ جھومنے لگے اور فرمایا: ''اے فرزند رشید آپ یادگار خاندان ہوں گے اور یاد رکھیے گا ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ان کی زبان اور ان کی شاعری کی عالم گیر شہرت ہوگی، مگر بجائے حزیںؔ کے کوئی اور تخلص ہونا چاہیے والد کی رضامندی سے ناسخؔ نے میر ببر علی کا تخلص انیسؔ رکھ دیا۔''

میر انیسؔ کے کلام کے بارے میں تقی عابدی لکھتے ہیں کہ

''آج اگرچہ اُردو ادب کے دامن میں میر انیسؔ کے دو سو سے زائد مراثی سوا سو سلام اور چھ سو کے قریب رباعیات موجود ہیں لیکن غزلوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ادب کی جدید تحقیقات کی روشنی میں میر انیسؔ

کے صرف چالیس غزل کے اشعار مختلف تذکروں بیاضوں اور مرثیوں کی جلدوں سے جمع کیے گئے ہیں۔ یعنی چار پوری غزلیں اور ایک آدھی غزل اور پانچ منفرد شعر میر انیس کے تغزل کے نمونے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام اشعار میر صاحب کا غیر منتخب کلام ہے مگر اس کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ میر انیس کو غزل گوئی میں دست گاہ تمام اور قدرت کامل حاصل تھی۔

شہید عشق ہوئے قیس نامور کی طرح
جہاں میں عیب بھی ہم نے کیے ہنر کی طرح

•••

بتوں سے آنکھیں لڑا چکے ہیں غضب کے صدمے اٹھا چکے ہیں
ہوئی ہے برباد زندگانی کیسے کو ہم اپنے پا چکے ہیں

•••

رہا تن میں نہ خوں باقی گیا موسم جوانی کا
شباب آخر ہوا روشن چراغ زندگانی کا

باب دوم میں میر انیس کے کلام کے حوالے سے تقریباً 75 مشاہیر شعروادب کے بیانات ہیں جو میر انیس کی قدردانی میں ہیں۔ مشاہیر میں غالب، ناسخ، آتش، دبیر و دیگر مشاہیر شعروادب شامل ہیں۔

تیسرے باب میں یادگار مرثیے کے متعلقات کا جائزہ لیا گیا ہے مرثیے کی تاریخ تصنیف ٹھیک معلوم نہیں، تاریخ اور کتابوں کے حوالوں سے بہ تحقیق معلوم نہ ہوسکا، یہ مرثیہ کب تصنیف کیا، لیکن اس مرثیہ کے آخری بند کے مصرعوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مرثیہ میر انیس کی ضعیفی کے زمانے کا ہے۔

"بس اے انیس ضعف سے لرزاں ہے بند بند
عالم میں مددگار رہیں گے یہ چند بند (ص:82)

تقی عابدی نے اس باب میں مرثیہ کی وجہ تصنیف کے علاوہ اس کے پڑھنے پر بھی تفصیل آمیز گفتگو کی۔ پٹنہ عظیم آباد میں یہ مرثیہ دوبارہ پڑھا گیا۔ 1859ء میں پہلی بار،

دوسری بار 1870ء میں یہ مرثیہ پڑھا گیا۔ مرثیہ کے بندوں اور مطلعوں میں اختلاف کے حوالے سے تقی عابدی نے اس کی تفصیل معتبر دلیلوں کے حوالوں سے پیش کی ہے۔ یہ مرثیہ بحر مضارع کے وزن میں ہے اور اس مرثیے کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس کے تمام ٹیپ کے بند مردف یعنی ردیف رکھتے ہیں اس کے علاوہ 47 بند مکمل مردف ہیں یعنی اس مرثیے کے 290 اشعار مردف اور 298 غیر مردف ہیں۔ تقی عابدی کہتے ہیں کہ

> اس مرثیے کی ایک خصوصیت میر انیسؔ کی زبان و الفاظ پر قدرت ہے بلکہ اس ایک 196 بند کے مرثیے میں کل الفاظ جن میں تکرار شامل ہے ان کی تعداد 9493 ہے۔ عربی زبان کی تعداد 5776 ہے، اُردو الفاظ میں ہندی کے الفاظ بھی شامل ہیں ہم نے ان کو اُردو اور ہندی میں اس لیے جدا نہیں کیا کیوں کہ اُردو خود ہندی نژاد ہے۔ اس مرثیے میں (61 فیصد) الفاظ اُردو میں (20 فیصد) الفاظ فارسی اور (19 فیصد) الفاظ عربی زبان کے ہیں، انیسؔ نے مرثیوں، سلاموں اور رباعیوں، قصیدوں اور نوحوں میں کتنے الفاظ استعمال کیے اس کا تعین کرنا آسان نہیں جیسا کہ خود اپنے مرثیے میں فرماتے ہیں جس کا مطلع ہے؎

"جب شاہ کو فرصت نہ ملی طوف حرم کی"

•••

کر لیجیے شمار اس کا محاسب نہ یہ چاہا
جو کچھ تھا مہندس کا طریقہ وہ بنایا

•••

دی کلک نے آواز کہ ہاں عقل نیاہا
لشکر کی سیاہی سے لکھا جائے سیاہا

•••

تحریر خط و خال کا اب دھیان نہیں ہے
ذروں کا یہ گننا ہے کچھ آسان نہیں ہے (ص:99)

میر انیسؔ نے اس مرثیے میں بیس سے زیادہ قرآنی آیات کے حصے یا مرکب الفاظ یا عربی کے تلمیحات اس خوبی سے استعمال کیے ہیں کہ ان میں کسی قسم کی اجنبیت یا غیر مانوسی ظاہر نہیں ہوتی ؎

صف میں ہوا جو نعرہ قد قامتِ الصلوٰۃ
بسم اللہ آگے جیسے ہو یوں تھے شہ حجاز (ص:100)

تقی عابدی میر انیسؔ کی منظر کشی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"میر انیسؔ الفاظ کے بادشاہ تھے، منظر کشی جب کرتے خود منظر بن جائے تو اسے مرقع کشی کہتے ہیں۔ انیسؔ الفاظ کے ذریعے سہ بعدی کیفیت پیدا کرتے تھے چناں چہ سننے والے کو منظر دکھائی دینے لگتا خود فرماتے ہیں ؎

خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ
دکھلا دوں ہر ورق میں مرقع لڑائی کا

انیسؔ کی قادر الکلامی اور معجز بیانی اس مرثیے میں اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ اس ایک مرثیے میں انیسؔ نے 25 سے زیادہ جانوروں کا ذکر کیا نہ صرف ذکر کیا بلکہ ان سے مربوط خصوصیات کو بھی مضمون شعر سے ایسا رابط دیا کہ اس میں ایک نئی کیفیت پیدا ہوگئی۔

شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسولؐ میں (ص:102)

انیسؔ کے ہاں ہر ذی روح کی وقعت پائی جاتی ہے۔ چاہے وہ چیونٹی ہی کیوں نہ ہو اور انیسؔ کے مشاہدہ کی وسعت کا اندازہ اس شعر سے بھی لگا سکتے ہیں جہاں وہ چیونٹی کو ذی حیات سمجھ کر فرماتے ہیں کہ

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے (ص:103)

انیسؔ کا کمال تشبیہات کے میدان میں خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے ؎

یوں تھے خدنگ ظلِ الٰہی کے جسم پر
جس طرح خار ہوتے ہیں ساہی کے جسم پر

اُردو شاعری میں رزم نگاری کے میدان کے شہسوار میر انیسؔ ہی ہیں ؎

نحل تھا کہ برق گرتی ہے ہر درع پوش پر
منہ کس طرف تھے تیغ زنوں کو خبر نہ تھی

• • •

بھاگو خدا کے قہر کا دریا ہے جوش پر
سر گر رہے تھے اور تنوں کو خبر نہ تھی

اس مرثیہ میں انیسؔ نے تین بند میں دس سے زیادہ گھوڑوں کے نام کے ساتھ ان کے اسمِ خاص کو بھی بیان کیا۔

''اترا ہے پھر زمیں پر براق آسمان سے''

انیسؔ نے اس مرثیہ میں صرف تیر کمان اور اس کے جزیات کے لیے سترہ سے زیادہ الفاظ استعمال کیے۔

اٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے
تیر اور تن میں گڑ گئے جب منہ کے بل گرے

انیسؔ کے مرثیہ میں جنگی لوازمات کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے اور قاری تقریباً تمام لوازم حرب سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

''قلب و جناح و میمنہ و میسرہ تباہ''

انیسؔ نے مرثیے کے چہرے میں صبح کی دلکشی کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا اور اس میں پینتالیس (45) سے زیادہ عنوانات سے وادی مینو اساس کو مزین کیا گیا ہے۔

انیسؔ نے سچے اور باوقار الفاظ استعمال کر کے امام حسینؑ اور ان کے رفیقوں کے حسنِ اخلاق، اعمال و افعال کو اس طرح دکھایا کہ وہ لوگوں کے لیے قابل تقلید نمونے بن گئے۔ سترہ اشعار میں 49 اوصاف حمیدہ کو اس طرح جمع کیا کہ انسانوں پر فرشتوں کا گمان ہوتا ہے۔

''حوروں کا قول تھا یہ ملک ہیں بشر نہیں''

انیسؔ کے اس مرثیہ میں کل 344 بار امام حسینؑ اور ان کے خاندان، اصحاب اور

پیغمبر اسلام کے نام، القاب اور کنیتیں وغیرہ ملتی ہیں۔ ان کے ساتھ ہی دشمنان اور ظالمان میں بھی 7 نام نظر آتے ہیں۔

مرثیے کے چوتھے باب میں مرثیہ میں سے بہتر (72) اشعار منتخب کیے جو کہ مرثیے کے 588 اشعار میں سے لیے گئے ہیں انھیں تقی عابدی نے ''بہتر جواہر'' سے موسوم کیا طوالت کے پیش نظر صرف (3,4) اشعار پیش ہیں ؎

ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

•••

اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

•••

جلوہ تھا تابہ عرش معلی حسینؑ کا
مصحف کی لوح تھی کہ مصلی حسینؑ کا

•••

اب چھوڑیو نہ دشتِ بلا میں حسینؑ کو
یافاطمہؑ چھپالو ردا میں حسینؑ کو

پانچویں باب میں انیسؔ کے چھپنے والے مرثیوں کی جلدوں کا عکس اور ان کے چھاپے خانے کا احوال درج ہے۔ پہلا مرثیہ کب اور کہاں سے شائع ہوا کس نے مرتب کیا وغیرہ۔

چھٹا باب اشخاص مرثیہ کی تفصیل اور ان کا مقام کنیت و نام وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ساتواں باب مرثیہ پر کیے گئے اعتراضات اور ان کے جوابات پر محیط ہے۔ اعتراضات کرنے والوں میں عبدالغفور نساخؔ، پروفیسر کلیم الدین احمد وغیرہ شامل ہیں۔ آٹھواں باب مرثیہ کے تجزیاتی نمونے کے حوالے سے ہے۔ اس میں مختلف اہل قلم حضرات کے تجزیاتی بیانات کو شامل کیا گیا ہے۔ طوالت کا خوف اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ انیسؔ کے اس

مرثیے کی واقعہ نگاری، منظر نگاری، سیرت نگاری، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری، تشبیہ کی ندرت، صنعتوں کا استعمال، تجزیات و تبصرہ مکمل تفصیل کے ساتھ لکھ سکیں۔ ویسے بھی یہ موضوعات ایسے نہیں ہیں کہ ہم ان 2,3 صفحات پر لکھ کر ان کا حق ادا کر سکیں۔ نواں باب مرثیہ کے تجزیہ کے طریقہ کار کے موضوع پر ہے اس سلسلے میں تقی عابدی لکھتے ہیں کہ

"ہمارے زیر نظر مرثیہ 196 بند پر مشتمل ہے۔ بذات خود ایک واحد نظم ہوتے ہوئے بھی اپنے دامن میں 196 مختلف نظمیں یا 588 مختصر نظموں کو احاطہ کیے ہوئے ہیں، اس لیے ہم نے اس مرثیے کو ہر بند ہر مصرع کی آزادانہ تشریح کی ہے۔"

اس مضمون میں تقی عابدی نے مرثیے کو سمجھنے اور اس کے محاسن کو پرکھنے کے ساتھ مرثیے میں فصاحت کلام پر سیر حاصل بحث کی اور مرثیے میں فصاحت و بلاغت پر دوسرے اہل قلم کی رائے اور اقوال کو شامل کیا۔ محاورات کے استعمال کے حوالے سے تقی عابدی کہتے ہیں:

"اس ایک مرثیہ میں چھ سو (600) سے زیادہ محاورات نظر آتے ہیں۔" بعض جگہ ایک بند میں چار چار محاورے استعمال ہوتے ہیں جس سے انیس کی محاورات پر مہارت کا پتہ چلتا ہے۔"

"دُنیا سے جو شہید اٹھے "سرخ رو اٹھے" (سرخ رو اٹھنا)

انیس کے اس مرثیے میں کل اضافات 587 ہیں جن میں ایک اچھی تعداد نئی ترکیبات کی ہے۔ باقی ابواب کا ایک مختصر اجمالی جائزہ پیش ہے۔

انیس کا ایک شعر ہے ؎

چونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار
اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار

شعر کا تبصرہ تقی عابدی یوں فرماتے ہیں کہ

"شعر میں حسن ادا کی جدت دیکھئے۔ جہاں وقت سحر ہر چیز حمد خدا میں مصروف ہے۔ وہاں چیونٹی بھی دُعا میں محو نظر آتی ہے۔ چیونٹی کو روز بھی

لوگ دیکھتے ہیں۔ یہ اتنی حقیر شے ہے کہ سینکڑوں کی تعداد میں روز پائمال ہو جاتی ہیں لیکن باوجود حقیر ہونے کے انیسؔ کے یہاں اس کی بھی وقعت ہے۔ ذرا اس مشاہدے Observation کی وسعت کو دیکھئے کہ ہم لوگ اکثر و بیشتر چیونٹیوں کو پچھلے پاؤں قائم رکھتے ہوئے اور اگلے پاؤں اٹھاتے ہوئے کسی دانے کو لے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن یہ بھی ذہن میں نہ آیا ہوگا کہ اس انداز کا استعمال ایسی شان و شوکت اور دلاویزی سے کیا جاسکتا ہے۔''

ایک اور جگہ چیونٹی کو ذی حیات سمجھ کر فرماتے ہیں کہ

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''دقیق نیچر کا مطالعہ منظر کشی کی جان ہے۔ مچھلیوں کی جلد کو کس نے نہیں دیکھا؟ پانی میں سانس لیتی ہوئی مچھلیوں کے منہ کو کس نے نہیں دیکھا، نہنگ سمندر کی گہرائیوں میں ہوتے ہیں کس نے نہیں سنا۔ موج، گرداب، بہتا دریا اور پانی پر بلبلوں کو ہر شخص دیکھتا ہے لیکن جب میر انیسؔ نے اسے دیکھا تو دوسرے ہی رنگ میں دیکھا۔ چناں چہ ان مشاہدات کو حسن تعلیل کے زیور سے آراستہ کر کے اس طرح پیش کیا کہ حسن کلام دوبالا ہو گیا۔

بند ملاحظہ ہو:

ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر
منہ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن اِدھر اُدھر

•••

بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر
تھے تہ نشیں نہنگ، مگر آب تھے جگر

•••

دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑتے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

غرضیکہ یہ بند کئی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں متعدد محاوروں کے علاوہ کئی صنعتیں بھی ہیں۔ سب سے اہم صنعت مبالغہ کی ہے۔ جس کو فن تنقید نگاری کے بانی ارسطو نے شاعری کے لیے لازم وملزوم قرار دیا۔ یہی وہ صنعت ہے کہ جس سے شاعر اور مورّخ میں فرق کا تعین ہوتا ہے۔ انیسؔ شاعر تھے مورخ نہیں۔ بند میں تعداد الفاظ 46 اور حروف 146 ہیں۔

انیسؔ کو اپنے ممدوح مظلوم کربلا کی قدر و منزلت کا اتنا احساس تھا کہ وہ ان کی شان کے خلاف ذرا بھی سبکی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں یہ لکھنا بھی گوارا نہیں تھا کہ میدانِ جنگ میں امام کو دھوپ کی تمازت سے تکلیف پہنچ رہی تھی۔ انھوں نے دھوپ کی شدت کو شاہی ساز و سامان میں بدل کر آفتاب کو چھتری کے طور پر سایہ فگن قرار دیا ہے۔ بند کی ٹیپ ملاحظہ ہو ۔

چلتی ہے لو حرارتِ خورشید سے دو چند
مرجھا گئے ہیں نخل ہوائیں ہیں پُر گزند

•••

جھیلوں میں ہیں درند، درختوں پہ ہیں پرند
ہے دھوپ میں رسولؐ کا فرزند ارجمند

•••

غربت میں بے کسی ہے شہ دیں پناہ پر
سایہ ہے آفتاب کا زہراؑ کے ماہ پر

یا ذیل کے بند کے ٹیپ کی نزاکت اور طرز ادا کو دیکھئے کہ امام کی بے سرو سامانی کو عالم غربت میں کس شاہانہ تجمل اور شان مظہریت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

سر پر لگائے تھا پسرِ سعدؔ چترِ زر
خادم کئی تھے مروجہ جنباں اِدھر اُدھر

•••

کرتے تھے آپ پاش مکرر زمیں کو تر
فرزند فاطمہؑ پہ نہ تھا سایہ شجر

•••

وہ دھوپ دہشت کی وہ جلال آفتاب کا
سونولا گیا تھا رنگِ مبارک جنابؑ کا

یہ شعر بھی قابل توجہ ہے۔

پرتو فگن تھا نورِ رسالت مآبؐ کا
سر پہ لگا تھا چترِ زری آفتاب کا

مرثیے میں ایک شعر یوں لکھا گیا ہے۔

قرآن رحل زیں سے سرفرش گر پڑا
دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

تقی عابدی نے اس شعر میں ایک نیا گوشہ نکالا ہے۔ جو گویا قیامت کے منظر سے بھی زیادہ ہولناک ہے، فرماتے ہیں کہ

''میر انیسؔ کے کلام کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ واقعہ کو بیان کرتے ہوئے واقعیت کو ختم نہیں ہونے دیتے وہ خیال اور الفاظ کے صحیح جوڑ سے واقف ہیں۔ امام مظلومؑ آخری وقت گھوڑے سے زمین پر گرے لیکن ذاکرین کے لفظ ''گرنے'' میں جو سُبکی ہے اس کو دور کرنے کے لیے اور امامؑ کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ امامؑ زخموں کی تاب نہ لاکر گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے جو صحیح واقعہ نہیں۔ تشریف لانا ایک اختیاری فعل ہے اور ''گرنا'' ایک بے اختیار عمل۔ میر انیسؔ کو ایک طرف اس لفظ کی سُبکی کا احساس اور منزلت امامؑ کا اقرار تو دوسری طرف صحیح واقعہ نگاری کی ذمہ داری۔ چناں چہ انھوں نے اس ایک لفظ ''گرنے'' کی سُبکی کو اٹھانے کے لیے امامؑ کو قرآن، عرش اور کعبہ سے تشبیہ دے کر ان سب کو گرا دیا ہے جس سے سامع اور قاری کو امامؑ کے ''گرنے'' کا احساس

نہیں ہوتا اس طرح میر صاحب نے معجز بیانی سے واقعہ نگاری کے آداب سکھائے۔"

باب 11,12,13 میں محاسن مرثیہ، فہرست کامل جدول بہ ترتیب شعر و بند مرثیہ اور تجزیہ یادگار مرثیہ۔ یہ تینوں ابواب انیس شناسی کے لیے دعوتِ فکر کی متقاضی ہیں۔ ان میں بعض ایسے گوشے پہلی مرتبہ دریافت کیے گئے جو پہلے نظر سے نہیں گزرے ہیں۔

انیس کے پاس الفاظ و معانی کا بحرِ زخار تھا۔ اگر ان محاسن کلام کو کوئی دیکھنا چاہتا ہے تو تقی عابدی کا تجزیہ دیکھ سکتا ہے۔ اس میں محاورات کی تعداد 596، علم بیان کے محاسن کی تعداد 251، علم بدیع کی صنعتوں کی تعداد 1286 یعنی کل محاسن اور صنعتوں کی مجموعی تعداد 2129 ہے۔ علم معانی و بیان، علوم مشرقیہ میں نہایت سنجیدہ اور مشکل فن ہے۔ اس فن کا سورج عرصہ دراز سے یہاں سے غروب ہو چکا ہے۔ اب خوش قسمتی سے تقی عابدی کے ذوق سلیم کی بدولت مغرب میں طلوع ہونے لگا ہے۔ علمائے ادب نے انیسؔ کو تشبیہات کا بادشاہ قرار دیا ہے۔ خود انیسؔ کو اس فن پر ناز تھا

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

تقی عابدی نے انیس کے زیرِ نظر مرثیے میں ایسی تشبیہات کی نشاندہی کی ہے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے ان تشبیہات کو اس سلیقے اور ہنر مندی کے ساتھ جمع کیا ہے کہ انیسؔ کا شعر بے ساختہ یاد آتا ہے ؎

نظم ہے یا گوہر شہوار کی لڑیاں انیسؔ
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

ذیل میں چند مثالیں نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ یہ تشبیہات اگرچہ پڑھنے میں مشکل نظر آتی ہیں لیکن ان کی مثالیں نہایت شاندار اور مسرت افزا ہیں۔

1. تشبیہ حسی بصری: اس تشبیہ کو کہتے ہیں جو قوت باصرہ سے محسوس کی جاتی ہے، مثال:

قرآن کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز
بسم اللہ آ گئے جیسے ہو، یوں تھے شہ حجاز

پہلے مصرعے میں قرآن کی سطریں، جماعت کی صفیں، دوسرے میں بسم اللہ۔ شہ حجاز یعنی امام نماز

2. تشبیہ حسی سمعی: وہ تشبیہ جس کا تعلق سننے سے ہو، مثال:

"گویا صدا رسولؐ کی کانوں میں آگئی"

یہاں رسولؐ کی صدا علی اکبرؑ کی آواز اذاں سے مراد ہے۔

3. تشبیہ حسی شامی: وہ تشبیہ جس کا تعلق سونگھنے سے ہو، مثال:

"خوشبو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول"

(خوشبو، جنگل، خلد کی مہک کی طرح)

4. تشبیہ مذوقی: جن تشبیہ کا تعلق چکھنے سے ہو، مثال:

"سوکھی زبانیں شہید فصاحت سے کامیاب"

تشبیہ مرکب حسی مذوقی کی یہ مثال بھی دیکھیے:

"لبوں پہ شاعران عرب تھے مرے ہوئے
پتے لبوں کے وہ جو نمک سے بھرے ہوئے"

5. تشبیہ حسی لمس: اس تشبیہ کا تعلق چھونے سے ہے، مثال:

آب خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

تضمن المزدوج: انیسؔ نے یہ صنعت مرثیے میں کم و بیش ہر بند میں استعمال کی ہے دیکھنے میں یہ صنعت بھاری بھرکم دکھائی دیتی ہے لیکن معناً بہت آسان۔ یعنی شاعری میں قوافی کے علاوہ کچھ الفاظ ہم قافیہ بھی لائے جاتے ہیں مثال:

سرکو ہٹو، بڑھو، نہ کھڑے ہو علم کے پاس

تیرھواں باب "تجزیہ یادگار مرثیہ" حاصل کتاب ہے۔ اس میں تقی عابدی نے اپنے کمالات و جمالات کا مظاہرہ اس خوبی کے ساتھ کیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مثال میں ایک بند کا خلاصہ مختصر ترین الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ موصوف نے یہ تجزیہ فارسی اور انگریزی ادب کے نقطۂ نظر سے کیا اور یہ ایک کامیاب تجربے کا نمونہ ہے۔

ٹھنڈی ہوا میں سبزہ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک

•••

وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگ گل پہ قطرہ شبنم کی وہ جھلک

•••

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

پہلے مصرع میں سبزہ صحرا میں صنعت تضاد ہے۔ ٹھنڈی اور زنگاری میں صنعت المز دوج ہے۔ دوسرے مصرعے میں اطلس زنگاری فلک استعارہ ہے آسمان سے۔ تیسرے مصرعے میں درختوں اور پھولوں میں تضمن المز دوج ہے درختوں، پھولوں، برگ گل، مہک اور شبنم میں صنعت مراعات النظیر ہے۔

تیسرے شعر میں صنعتِ عکس ہے۔ یعنی دوسرا مصرعہ پہلے نہ رکھنے سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ آخری مصرعے میں رو کے ''تھے'' میں تضمن المز دوج ہے اور پورا مصرعہ حسنِ تعلیل سے تزین ہے۔ آخری شعر میں متعدد صنعتیں ہیں ایک صنعت وہ ہے جس کے موجد تقی عابدی ہیں۔ اس کا نام انھوں نے ''مساوی النقاط'' رکھا ہے۔ یعنی جتنے نقطے پہلے مصرع میں ہیں اتنے ہی دوسرے میں ہوتے ہیں یہاں مصرع اول میں 22 اور مصرعہ دوم میں بھی اتنے ہی ہیں مرثیے میں اس صنعت کے بہت سے شعر ہیں۔

تقی عابدی نے میر انیس کے اس مرثیے ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کے ہر مصرعہ اور ہر بند کو بلاغت وفصاحت، تشبیہات، مجاز، مرسل، کنایات، صنائع لفظی تمثیلات ومحاورات، صوتی کیفیات، اسلوب حسن بیان، ترتیب وتسلسل، حسن بندش، الفاظ کی روانی، صفائی، عمدگی، شگفتگی وغیرہ کی تقسیم کے ساتھ ساتھ اس شاہکار انیس کی منظر نگاری واقع نگاری تمثیل نگاری المیہ بیانی، جدت نگاری اور سماجی عناصر کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اس مرثیے کے ہر بند کے بارے میں ہمیں بتایا ہے کہ اس میں حروف کی تعداد کیا

ہے کتنے الفاظ یا حروف اُردو عربی یا فارسی زبان میں ہیں اس بند میں کیا تراکیب، استعارات، محاورے، کنایات وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ ہر شعر میں کتنی اضافتیں استعمال ہوئی ہیں کیا صنعت کارفرما ہے اور میر انیسؔ نے کیا اسلوب اور کیا نئی بندشیں پیش کی ہیں۔ ہر کام وقت طلب، محنت طلب اور تحقیق طلب تھا تقی عابدی نے اس انداز سے اسے سرانجام دیا جیسے ان کے لیے یہ نہایت فطری اور سہل ہو۔

تقی عابدی کی اس تخلیق کے مطالعے سے اُردو ادب کے طالب علم پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ رثائی ادب یعنی صنعت مرثیہ گوئی اُردو ادب کا اہم اور وسیع الدامن جزو ہے۔ مرثیے کے اندر تغزل بھی ہے اور قصیدہ گوئی بھی۔ یہ محض آہ و زاری، بین اور اظہارِ غم ــــــ کا نام نہیں۔ اُردو ادب سے اگر رثائی ادب کو نکال دیا جائے یا اسے میر انیسؔ جیسے عظیم شاعر کی تخلیقات سے محروم کر دیا جائے تو یہ ادب مکمل طور پر کھوکھلا ہو کر رہ جائے گا۔ تقی عابدی نے اُردو ادب پر اور اُردو کے اس دور کے طلباء پر احسان کیا ہے کہ انھوں نے رثائی ادب کے ایک شاہکار کو نہایت عالمانہ انداز میں متعارف کرایا ہے۔

تالیف اور صاحبِ تالیف

ڈاکٹر تقی عابدی پیشہ کے اعتبار سے طبیب ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں مع ڈاکٹر سید یاور عباس (مرحوم)، اس سے پیشے سے وابستہ کسی شخص کو زبان وادب کے مشاغل میں اتنا مصروف نہیں دیکھا۔ جتنی توجہ، جتنا وقت اور جتنی محنت وہ ادبی مشاغل میں صرف کرتے ہیں لایق آفرین تو ہے لایق تقلید بھی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا پہلا Commitment یہی ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے۔ وہ عام زندگی کے تمام فرائض بھی اُسی تندہی سے انجام دیتے ہیں اور نصف شب کے بعد ختم ہونے والی تمام محافل و مجالسِ شعر و سخن میں مسلسل شرکت اور اُس کے بعد دو گھنٹہ کی طویل ڈرائیونگ کے اپنے گھر لانگ آئی لینڈ پہنچنے کے عادی رہے ہیں اور یہ بات اور بھی قابل ستائش ہے کہ ان کی شریکِ حیات جو ایک ایرانی خاتون ہیں اُردو سے زیادہ شغف نہ رکھتے ہوئے بھی ان کی ان تمام مصروفیات میں شانہ بشانہ ہوتی ہیں اس لیے میں تقی عابدی کی کامیابیوں میں انھیں برابر کا شریک گردانتا ہوں۔

گزشتہ تقریباً دس سالوں میں، میں نے ڈاکٹر تقی عابدی کو پہلے بحیثیت شاعر پھر بحیثیت شاعر اور ناظم اور تین چار سال سے بحیثیت محقق اور مقالہ نگار دیکھا۔ سنا اور پڑھا ہے۔ نظم اور نثر یکساں جوش اور روانی سے لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ جو جی میں ٹھان لیتے ہیں کر کے رہتے ہیں کوئی مشکل انھیں ان کے راستہ سے نہیں ہٹا سکتی۔ جو کام کرتے ہیں سلیقہ سے کرتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے گزشتہ سالوں میں انھوں نے خود احتسابی کے مسلسل عمل سے گزر کر مسلسل محنت انتھک کوشش اور عمیق مطالعہ کے زور پر بڑے میدان فتح کیے ہیں۔ بیسیوں تحقیقی مقالے اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور اب علوم شاعری پر ان کی زیرِ نظر کتاب ''رموزِ شاعری'' ان کے عزم جانفشانی اور کام کی لگن کا ناقابل تردید ثبوت ہے

کہ یہ کتاب دوسروں کے لیے ایک نظیر قائم کرتی ہے کہ اگر جذبہ صادق تو اکتساب علم کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔

اگرچہ اس کتاب کا نفسِ مضمون دلچسپی سے خالی بلکہ خاصا خشک ہے تاہم آسان اور دلچسپ بنانے میں انھوں نے حتی المقدور کوشش کی ہے اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اصطلاحات کی گرانی اور فارسی اشعار کی مثالیں کہیں کہیں عام سطح سے کچھ بلند ہو جاتی ہیں لیکن بارِ خاطر نہیں ہوتیں۔

ایسی کسی کتاب کی ضرورت ایک مدت سے محسوس کی جا رہی تھی بالخصوص امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں جہاں اربابِ سخن باوجود مشکلوں اور محرومیوں کے زبان وادب کی خدمت میں کوشاں ہیں اور انھیں مناسب ذرائع علم بہ شکل کتاب یا کسی استادِ فن کی صورت میں میسر نہیں ہیں۔ تقی عابدی نے اس کتاب کی تالیف سے اس صورتِ حال کا ازالہ کرنے کی بڑی جامع کوشش کی ہے جسے بہ نظر استحسان نہ دیکھنا بڑی حق تلفی ہوگی۔ کتاب کے آخر میں دی ہوئی فہرست کتابیات بتاتی ہے کہ ان کی جمع آوری مطالعہ اور گلہائے مراد جمع کرنے میں جس جستجو اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ وہ فی زمانہ مشکل ہی سے کہیں نظر آتی ہے۔ اپنی اس سعی مشکور کے بارے میں وہ خود رقم طراز ہیں کہ ''میری کوشش پھیلے ہوئے پانی کو آبشار کی دھار بنا کر روشنی تولید کرنا ہے تا کہ دُنیائے شاعری کے زمین و آسمان روشن ہو سکیں۔''

مجھے قوی اُمید ہے کہ اُن کی یہ کتاب اُردو ادب میں ایک مفید کتاب کی حیثیت بہت جلد پالے گی اور مشتاقانِ علم اس سے بھرپور استفادہ کرتے رہیں گے۔ میں کتاب کے مولف اور خواہانِ علم کے لیے توفیقاتِ الٰہی کا طالب ہوں۔

اظہارِ حق

چند ماہ پہلے کی بات ہے۔ ایک کتاب ملی۔ دیکھتے ہی جو خیال آیا وہ یہ کہ انیسؔ یا انیسؔ کے مرثیوں کے بارے میں ہوگی۔ نہایت دیدہ زیب اور متاثر کن جلد۔ سنہری حروف میں کتاب اور صاحبِ کتاب کا نام۔ غیر معمولی عمدہ، آرٹ پیپر پر ساری کتاب۔ ہمہ رنگی طباعت، تصاویر اور زیادہ جاذب نظر، کتاب کا نام تھا۔ ''تجزیہ یادگارِ انیسؔ: جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' اور جب ذرا اوراق الٹے تو معلوم ہوا یہ صرف انیس کے مذکورہ ایک مرثیہ کا مختلف ادبی اور فنی زاویوں سے تجزیہ ہے۔ لگ بھگ (800) صفحات پر مشتمل اس تجزیہ میں کن کن پہلوؤں کو کام میں لایا نہیں گیا۔ غرض یہ کتاب پڑھنے کے بھی لائق ہے اور دیکھنے کے بھی۔ ابھی یہ کتاب ذہن پر چھائی ہوئی تھی کہ اس کے مرتب، محقق اور مؤلف ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ایک اور کتاب پیش کردی۔ ''اظہارِ حق''...... ''اظہارِ حق'' کی نوعیت جدا ہے اور یہ رضی حیدر سلطان صاحب فریدؔ لکھنوی کے مراثی، سلام اور رباعیات کا مجموعہ ہے۔ فریدؔ لکھنوی، لکھنؤ کے ان شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جو بہارِ انیسؔ کے آخری پھولوں میں تھے۔ ان کے خاندان اور ادبی پس منظر کے بارے میں بس یہ کہنا کافی ہوگا کہ فریدؔ لکھنوی میر انیسؔ کے منجھلے بھائی میر انس کے پڑپوتے تھے اور پیارے صاحب رشیدؔ ان کے ماموں۔ فریدؔ کا سنہ ولادت 1892ء اور تاریخ وفات 26؍دسمبر 1968ء بتائی جاتی ہے۔ فریدؔ نے (75) سال کی عمر پائی۔ ہوا کچھ ایسا کہ اپنی زندگی کے آخری (25) برسوں میں انھوں نے کوئی مرثیہ نہیں کہا بلکہ پڑھا بھی نہیں۔ فریدؔ کا شعری سرمایہ یقیناً خاطر خواہ ہوگا لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ ایک دو تعارفی نوعیت کے مضامین ملتے ہیں لیکن ازحد مختصر، نامکمل اور اغلاط سے بھرپور۔

کہا جاتا ہے کہ ان کا (40) فیصد کلام تو یقیناً ضائع ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کو، جو پیشہ کے اعتبار سے معالج ہیں، قدرت نے شعر و ادب کا کچھ ایسا ذوق ودیعت کیا ہے کہ انھوں نے جہاں اور کام کیے فرید کے انتقال کے کوئی (35) سال بعد ان کے کلام کو تلاش کرنا شروع کیا اور انھیں بہ وقتِ تمام اس قدر کامیابی ہوئی کہ فرید کے (15) مراثی، (15) سلام اور (36) رباعیات دریافت ہوئے۔

تقی عابدی نے ان سب کو نہایت لگن، توجہ اور محنت کے ساتھ جانچا، پرکھا اور تحقیق و تنقید کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انھیں کتابی صورت دی۔ تا حال فرید کے بارے میں جو دو، ایک مضامین شائع ہوئے ان کے اغلاط کی ذمہ داری کے ساتھ نشاندہی کرتے ہوئے اپنے فاضلانہ مقدمہ میں فرید کی شاعری کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''فرید لکھنوی کا شمار میدانِ مرثیہ کے شہسواروں میں کیا جانا چاہیے، کیوں کہ فرید لشکر مرثیہ گویوں میں یکتا و ارید ہیں۔ ان کے مرثیہ کلاسیک مرثیوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ کیوں کہ تقریباً ہر مرثیہ میں چہرہ، ماجرا، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین یعنی تمام اجزائے مرثیہ کم و بیش شامل رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان اجزائے مرثیہ میں ''دبستانِ انیس'' کا رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔'' (ص:4)

اسی ذیل میں فرید کے مراثی پر میر انیس کے اثرات کو مثالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ و نیز فرید کے ہاں ساقی نامہ اور بہاریہ مضامین کے جوہر بھی ملتے ہیں۔ ان کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کو اس خصوص میں کتنی کد و کاوش کرنی پڑی ہوگی اس کا قیاس کچھ وہ لوگ ہی کر سکتے ہیں جو اس نوعیت کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔

تقی عابدی نے تحقیق و ترتیب کے بعد اس کی اشاعت کا انصرام بھی اپنے طور پر کیا اور (700) سے زائد صفحات پر مشتمل غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس کی کمپوزنگ اور طباعت و اشاعت ٹورنٹو (کینیڈا) سے عمل میں آئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے لیے بھی ڈاکٹر تقی عابدی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے ان کے پاس (14) سو مراثی کے مخطوطات موجود ہیں۔ توقع ہے وہ ان مخطوطات کا جائزہ لیتے رہیں گے اور ان میں سے

تحقیق شدہ اور موثق مخطوطات کی اشاعت عمل میں آئے گی۔

''اظہارِ حق'' کی رسم اجراء امریکہ، پاکستان اور کینیڈا کے بعض شہروں کے علاوہ لکھنؤ میں ہو چکی اور ظاہر ہے فرید لکھنوی اور تقی عابدی دونوں کا تعلق حیدرآباد سے ہے بلکہ خاصا، اس لیے یہاں بھی اس کی رسمِ اجراء عمل میں آئی تھی اور یہ رسم انجام پائی۔ 6/اگست کو شام ساڑھے سات بجے۔ قبلہ سہیل آفندی صاحب نے رسمِ اجراء انجام دیتے ہوئے فرمایا کہ ''کسی ملک کی سیاست کا اثر اس ملک کے عام حالات پر بھی پڑتا ہے۔ مراثی کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ مؤرخ، تاریخی واقعات قلم بند کرتا ہے، لیکن شاعر وہ لکھتا ہے جو مؤرخ نہیں لکھتا۔ جہاں مؤرخ کا قلم رُک جاتا ہے، وہاں شاعر کا قلم چلنے لگتا ہے جو تشنگی مقالہ نگار/مؤرخ چھوڑ جاتا ہے، شاعر اس کو پورا کرتا ہے۔''

سہیل آفندی صاحب نے کہا کہ ''رثائی ادب کی ہمارے معاشرہ میں بڑی اہمیت ہے اور اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ خوشی کے اظہار کے لیے ہماری زبان میں چند الفاظ ہیں لیکن غم کے اظہار کے لیے کئی الفاظ۔ غم کے اظہار کے لیے کینوس خاص کشادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''کربلا ایک ایسا موضوع ہے جس کی گیرائی اور گہرائی کا اندازنہیں لگایا جاسکتا۔ اعلیٰ انسانی اقدار کربلا میں موجود ہیں اور ان سب کو مرثیہ میں موضوع بنایا گیا ہے۔'' جناب سہیل آفندی صاحب نے کہا کہ ''رثائی ادب کا آغاز ہابیل کی شہادت سے ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر سید حسن اختر نے جو فریدؔ کے پوتے ہیں خطبہ استقبالیہ دیتے ہوئے مقررین اور سامعین کا خیر مقدم کیا اور کتاب ''اظہارِ حق'' کی اشاعت کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ''فرید لکھنوی کے مراثی بستوں میں بند تھے، نہ جانے کیا ہو جاتے اگر تقی عابدی نے انھیں تحقیق اور ڈیڑھ سال کی سخت محنت کے بعد موجودہ صورت میں نہ پیش کیا ہوتا۔'' انھوں نے بتایا کہ ''شمالی امریکہ میں شائع ہونے والی اتنی ضخیم یہ پہلی کتاب ہے۔'' لکھنؤ میں اس کی رسم اجراء انجام پائی اور یہ تقریب کامیاب رہی۔ تقی عابدی صاحب نے فرید لکھنوی کی شخصیت اور شاعری پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس کتاب کی وجہ سے فرید کی شخصیت اور ان کے کلام کو حیاتِ جاودانی حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر ہاشم حسن سعید نے کہا کہ ''تحقیقی اعتبار سے ''اظہارِ حق'' کو اہمیت حاصل ہے۔ حالیہ عرصہ میں ہندوستان میں بھی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی۔'' انھوں نے ڈاکٹر تقی عابدی کو مبارک باد دی کہ ''ان کا یہ کام اوروں کے لیے لائق تقلید ہے۔''

ہاشم حسن سعید نے کہا کہ ''ہندوستانی جامعات میں جو تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں، ''اظہارِ حق'' کی روشنی میں دیکھیں تو وہ نہایت معمولی معلوم ہوتے ہیں۔'' ڈاکٹر تقی عابدی نے اوّلین ماخذات سے استفادہ کیا ہے اور تحقیق کے فرائض بخوبی انجام دیئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ''فرید لکھنوی کا سلسلہ میر انیسؔ سے ملتا ہے ان کے مراثی اپنی مثال آپ ہیں۔'' تقی عابدی نے فنی اعتبار سے فرید کے مراثی کا جائزہ لیا ہے۔

ہاشم حسن سعید نے اس سمت توجہ دلائی کہ ''رزمیہ (EPIC) کا کینوس خاصا وسیع ہوتا ہے۔ ہمارے ان مرثیوں کو رزمیہ نہیں کہہ سکتے۔ ہاں رزم نگاری ان مراثی میں ضرور ملتی ہے اور انیسؔ کے پاس بھی۔ فرید کے پاس انیسؔ کے اثرات واضح ہیں۔'' دبیر کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ہاشم حسن سعید نے کہا کہ ''انیسؔ اور دبیر دونوں بڑے شاعر تھے۔ ہماری شاعری میں ان دونوں کی اہمیت ہے۔''

پروفیسر صادق نقوی نے فنی زاویوں سے مرثیوں پر تفصیل سے گفتگو کی انھوں نے کہا کہ ''رثائی ادب نے اُردو شاعری میں بہت زیادہ اضافہ کیا ہے اور رثائی ادب میں مرثیہ کو مرکزیت حاصل ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''مرثیہ کا آغاز دکن میں ہوا۔ مرثیہ نگاری میں دکن کے کم از کم (22) شعراء کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہاں کے مرثیے غزل کی ہیئت میں تحریر کیے گئے۔ مرثیہ دکن سے لکھنؤ اور دہلی پہنچا۔ شمالی ہند میں مرثیہ نے اپنی ہیئت بدلی اور مسدس کی ہیئت اختیار کی۔ مرثیہ کے اجزاء زمانے کے ساتھ ساتھ بتدریج ترتیب پاتے گئے۔ حیدرآباد میں مرثیہ آج بھی زندہ ہے اور ہر سال کئی شاعر مکمل مراثی پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صادق نقوی نے کہا کہ ''مرثیہ وہی شاعر کہہ سکتا ہے جس کے پاس الفاظ کا اتنا خزانہ ہو کہ خیال ذہن میں آئے اور وہ اس کو نظم کر دے ورنہ خیال ذہن میں آنے کے بعد الفاظ کو تلاش کیا جائے تو خیال گم ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مرثیہ نے الفاظ کے استعمال کا سلیقہ دیا۔ ڈاکٹر صادق نقوی نے مرثیہ میں ساقی نامہ اور بہاریہ شاعری سے متعلق بھی

تفصیل سے گفتگو کی۔

''اظہارِ حق'' کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی نے فریدؔ لکھنوی کے مراثی کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب ادب اور تاریخ دونوں زاویوں سے اہمیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے اس کارنامہ کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔''

ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی نے فریدؔ لکھنوی کو بہارِ انیسؔ کے آخری پھولوں میں شمار کر کے اُردو شاعری میں گویا ان کا مقام متعین کر دیا ہے۔ فریدؔ لکھنوی کو انیسؔ اور دبیرؔ سے عقیدت تھی۔ ''اظہارِ حق'' کے کئی اشعار سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر جلیلی نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی تحقیق سے رثائی ادب کی بازیافت کی ہے۔ لکھنؤ کے ادب کے تحفظ کی یہ ایک وقیع کوشش ہے۔''

ڈاکٹر سید حسن اختر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ ''یہ کتاب اتنی ضخیم ہے کہ ٹورنٹو (کینیڈا) سے وہ اپنے ہمراہ اس کی کئی جلدیں نہیں لا سکے اور جتنی جلدیں لائی گئی تھیں وہ لکھنؤ اور حیدر آباد میں تقسیم کر دی گئیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ ''اظہارِ حق'' کا ہندوستانی ایڈیشن شائع ہو۔ یہ کم قیمت ایڈیشن یقیناً جلد دستیاب ہوگا اور مراثی کے شائقین اس سے استفادہ کریں گے۔''

یہ منتخبہ محفل رات دیر گئے اختتام کو پہنچی۔ بعدِ ازاں محفل شعر منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے فرمائی۔ شائقین شعر و ادب کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

ذکرِ دُرِّ باران

ڈاکٹر تقی عابدی پیدا ہوئے دہلی میں ایم بی بی ایس تک تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی اور مزید اعلیٰ تعلیم امریکہ اور کینیڈا میں۔ لیکن اُردو زبان اور شعر و ادب کے تعلق سے ترتیب و تالیف اور تحقیق و تنقید کا ذوق حیدرآباد میں بھی رہا۔ دہلی میں بھی اور امریکہ و کینیڈا میں بھی۔ جن لوگوں نے کینیڈا میں ان کی رہائش اور ذاتی لائبریری دیکھی ہے وہ ان کے ادبی ذوق کے رطب اللساں ہیں۔ تقی عابدی ہیں تو طب کے ڈاکٹر لیکن ان کے ادبی ذوق کو دیکھ کر شعر و ادب کے کئی ڈاکٹر (پی ایچ ڈی) بے حقیقت نظر آتے ہیں۔ اپنی طبابت کی مصروفیات سے وقت نکال لینا اور شعر و ادب کی دُنیا میں گراں مایہ خدمات انجام دینا کچھ انہی سے ممکن ہو سکا۔ اور پھر کیسے نہایت سنجیدہ، ثقہ اور ثقیل موضوعات پر...... ڈاکٹر تقی عابدی کی تا حال کئی کتابیں سامنے آچکی ہیں جن میں سے چند ایک کے نام ہیں۔ ''اظہارِ حق''، ''تجزیہ یادگارِ انیس''، ''مثنویاتِ دبیر''، ''کائناتِ نجم''، ''اقبال کے عرفانی زاویے''، ''انشاء اللہ خاں انشاء''، ''رموزِ شاعری''، ''عروسِ سخن''، ''چوں مرگ آید''۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے جہاں بعض موضوعات پر تفصیل اور تجزیہ سے کام لیا ہے بعض موضوعات پر اختصار سے کام لے کر اپنی آراء پیش کر دی ہیں۔ گویا جہاں اور جب تقاضہ تھا اس کا حق ادا کیا ہے۔ ''ذکرِ دُرِّ باران'' (تحقیق تنقید کی روشنی میں) ان کی ایک ایسی ہی کتاب ہے جس میں مختلف ادبی، تہذیبی اور سماجی وقیع موضوعات پر حسبِ گنجائش قلم اُٹھایا ہے۔ القمر انٹر پرائزز، لاہور سے شائع ہونے والی اس کتاب میں کوئی (28) عنوانات پر مضامین ہیں۔ عام طور پر اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں کچھ زیادہ ہی اختصار ہے۔ بعض موضوعات ایسے ہیں جن پر تحقیق کا حق ڈاکٹر تقی عابدی ہی ادا کر سکتے تھے۔ مثلاً ''نیویارک لائبریری میں دیوانِ غالب کا نایاب

نسخہ''۔ ظاہر ہے یہ ایسے ہی شخص سے ممکن تھا جو اکثر و بیشتر نیویارک لائبریری سے استفادہ کرتا ہو۔ بہرکیف تقی عابدی نے 1863ء میں آگرہ میں مطبوعہ ''دیوانِ غالبؔ'' کے اس نسخہ کو ڈھونڈ نکالا۔ یہی نہیں اُردو دُنیا سے اس کو متعارف کرانے کا سہرا بھی ڈاکٹر عابدی کے سر ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مضمون میں دیوان کی جلد، صفحات کی تعداد، ہر صفحہ پر سطروں کی تعداد اور اس میں کل اشعار کی تعداد بھی لکھی ہے۔ و نیز غالبؔ کی حیات میں شائع شدہ غالبؔ کے دیوانوں کی اشاعت کی تفصیل سے یہ مضمون اور وقیع ہوگیا ہے۔ غالبؔ پر اور مضامین بھی ہیں۔ مثلاً ''غالبؔ کے اشعار کے معنی خود غالبؔ سے پوچھیے''، ''غالبؔ اور ذوقؔ'' اور ''غالب غزل پر غالبؔ ہوتے ہوئے بھی میرؔ سے مغلوب کیوں؟'' ان مضامین سے مصنف کی غالبؔ سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''غالبؔ کے اشعار کے معنی خود غالبؔ سے پوچھیے'' والے مضمون میں تقی عابدی نے غالبؔ کے اپنے شاگردوں اور احباب کو تحریر کردہ خطوط میں اپنے اشعار کی جو تفہیم کی ہے اور معنی و مطلب تحریر کیا ہے ان کو یکجا کردیا ہے اس سلسلے میں عبدالرزاق شاکرؔ، چودھری عبدالغفور، عبدالجمیل جنونؔ، ماسٹر پیارے لال اور منشی نبی بخش حقیرؔ کے مولومہ خطوط سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یوں غالبؔ اشعار کی تفہیم میں آسانی ہو جاتی ہے۔ دوسرا مضمون ہے شمالی امریکہ کے پہلے کلاسک اُردو شاعر مظفر شکوہ کے بارے میں، اُردو کی نئی بستیوں کے بارے میں ہر چند کہ ہم خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مضمون میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ اپنی جگہ انفرادیت اور اہمیت رکھتی ہیں۔ مظفر شکوہ کے حالاتِ زندگی تفصیل سے تحریر کرتے ہوئے انھیں باقی اُردو دنیا سے روشناس کرایا گیا ہے۔ ان کی شعری صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے مراسم کن ادبی شخصیات سے رہے اور انھوں نے کن سے استفادہ کیا اس کی بھی تفصیل دی گئی ہے۔ مظفر شکوہ کی ادبی اور تہذیبی تربیت ظاہر ہے برصغیر میں ہوئی۔ وہ (28) برس کے ہوں گے کہ امریکہ روانہ ہوئے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے۔ اس زمانہ تک ان کا شعری ذوق جلا پا چکا تھا۔ وہ اُردو شاعری میں اپنا مقام رکھتے تھے۔ امریکہ میں انھوں نے اپنا ادبی و شعری سفر جاری رکھا، اگرچہ ان کا ابتدائی کلام تقسیم ہند کے وقت ہنگاموں کی نذر ہوگیا لیکن امریکہ میں انھوں نے جو کچھ کہا وہ دو مجموعوں ''غبار

ناتواں'' اور ''پیمانہ دل'' کی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔ علاوہ ازیں ''پیمانہ دل'' میں ''بادہ دوشینہ'' کے عنوان سے 1947ء سے پہلے کئے گئے کلام سے پانچ غزلیں، چھ نظمیں اور فرد فرد کے زیر عنوان گیارہ رباعیات اور متفرقہ اشعار شامل ہیں۔ تقی عابدی نے ان کے دونوں مجموعوں کا گہرا مطالعہ کرتے ہوئے مظفر شکوہ کی شاعری پر قلم اٹھایا ہے۔ ہر چند کہ یہ مضمون طویل ہے لیکن عابدی صاحب سے خواہش ہوگی کہ وہ مظفر شکوہ کا غیر مطبوعہ کلام بھی تلاش کریں اور اپنے مزید مفصل ''مقدمہ'' کے ساتھ اُردو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ امریکہ میں اور اُردو شاعر بھی ہوں گے ان کی طرف بھی توجہ دی جاسکتی ہے۔ مظفر شکوہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جہاں عارض و گیسو عجیب دنیا ہے
کہ جس میں شام بھی ہے ساتھ ہی سحر بھی ہے

•••

نہ تحیر نہ تماشا نہ تمنا نہ گریز
چارہ گر کیا یہی انداز جنوں ہوتا ہے

•••

وعدہ کرکے جو ہر روز بھلا دیتے ہیں
کبھی بھولے سے کوئی وعدہ وفا بھی تو کریں

•••

صبح تک منتظر رہے انجم
تم نہ آئے تمام رات کٹی

•••

رکھے جاتے رہے ہر مصر کے بازار میں ہم
پر کبھی آنہ سکے چشم خریدار میں ہم

''ذکر درباراں'' کی خصوصیات اس کے مضامین کا تنوع ہے۔ شعر و ادب کے کلاسیکی اور عصری موضوعات، نظم و نثر دونوں سے تعلق رکھنے والے موضوعات اختصار کے

ساتھ لیکن جامعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تقی عابدی نے قلم اٹھایا ہے۔ اور لگ بھگ ہر مضمون میں کوئی نہ کوئی خاص بات ملے گی۔ جس کو تقی عابدی کی تحقیق یا تنقید کا حاصل کہنا چاہیے جیسے ترقی پسندی کے بارے میں۔ ایک مضمون میں اس تحریک کے بچپن کی روداد ہے تو دوسرے میں ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر کے بارے میں اظہار خیال ہے۔ نعتیہ شاعری پر بھی ایک سے زاید مضامین ملیں گے۔ انشاء کی نعتیہ شاعری کا جائزہ بھی ہے اور اُردو نعت کے ارتقائی سفر کی داستاں بھی ہے اور ان دونوں پہلوؤں پر دلنشین پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ انشاء کی نعتیہ شاعری کے بارے میں تقی عابدی رقم طراز ہیں ''انشاء کی نعتیہ شاعری کا سرسری جائزہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ان کے اشعار حضورؐ کے جمال، جلال، کمال، خصائل اور اقدار سے لبریز ہیں۔ حضورؐ کی آل سے لے کر بلال تک کی عکاسی ان کے شعروں میں نظر آتی ہے۔'' (ص:٦)

ویسے انشاء کی حیات، تصنیفات اور شخصیت پر مضمون بھی اُردو میں انشاء پر لکھے جانے والے چند عمدہ مضامین میں شمار ہوگا۔ اس کے علاوہ بھی ''انشاء کا منقبتی کلام''، ''انشاء اور مصحفی کی معرکہ آرائی کا عادلانہ تجزیہ''، ''انشاء اور مصحفی اور'' انشاء کا شاہکار دیوان بے نقط'' کے مطالعہ سے تقی عابدی کی انشاء پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ نعت کے ذیل میں ''جوشؔ کی مرثیہ نگاری''، ''گل دستہ مناقب مولانا علیؑ''، ''ملا محتشم کاشی کا مرثیہ''، ''رباعی: ''شاہ است حسینؑ'' کا مختصر تجزیہ''، ''منقبت: تاریخ اور تحقیق کے آئینہ میں''، ''عظمت حسینؑ: غیر مسلم شعراء کی نظر میں'' اور'' قاآنی شیرازی کا شاہکار مرثیہ'' جیسے مضامین پڑھیے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے عقیدت کے دامن کو تھامے ہوئے فنی اور ادبی تقاضوں کو باتمام و کمال ملحوظ رکھا ہے۔ ''ذکرِ دُرِ باران'' کے مضامین میں زیادہ تر اختصار سے کام لیا گیا ہے، بعض مقامات پر تو انھوں نے کفایت لفظی کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ ''رباعی: شاہ است حسینؑ کا مختصر تجزیہ'' مختصر ہے لیکن انھوں نے رباعی کے مفہوم کو نہایت کمال کے ساتھ ان چند سطروں میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ رباعی ذہن میں رکھیے۔ ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں: ''رباعی کا پہلا مصرع، شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ، امام حسینؑ کی شخصیت کا مختصر تعارف کرواتا ہے۔ دوسرا مصرع ''دیں است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ'' امام حسینؑ کی سیرت

اور اسوہ حسنہ کی تفسیر ہے رباعی تیسرا مصرع ''سر داد نداد دست در دست یزید'' امام حسینؑ کی شہادت عظمیٰ اور فلسفہ شہادت کا نمونہ ہے اور آخری مصرع ''حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ'' امام حسینؑ کے ابدی کارنامہ معرکہ کربلا کی تابندہ سند ہے۔'' (ص: 166-165) ملاحظہ کیجیے۔ کتنے اجمال اور عمدگی کے ساتھ انھوں نے اس بے مثال رباعی کا مطلب بیان کر دیا ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ سرسید کے بارے میں دو، تین مضامین مل جائیں گے۔ ''سرسید کے لطیفے حالی کی زبانی'' دلچسپ ہیں اس کے علاوہ ''سرسید کے ادبی کارنامے'' اور ''سر محمد اقبال اور سرسید'' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے اور سرسید کے ذہن کی وسعتوں کو سامنے لاتے ہیں۔ اقبال پر سرسید کے حوالے سے ایک مضمون سے قطع نظر ایک اور مضمون ''علامہ اقبال کی وسعتیں ملے گا۔ ادھر ترقی پسند شاعروں میں مجاز اور سردار جعفری پر مضامین عصری شعری منظر نامہ میں رنگ بھرتے ہیں۔ سردار جعفری کے بارے میں لکھتے ہوئے تقی عابدی نے ابتداء میں سردار جعفری کی مرثیہ گوئی اور پھر ان کی ترقی پسندی پر نظر ڈالی ہے اور مجموعی طور پر سردار جعفری کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ سردار جعفری ایک فطری شاعر ہیں اور ان کی شاعری ان کی دیگر ادبی صلاحیتوں پر چھائی ہوئی ہے۔''

''ذکر دُرِ باران'' میں ''اُردو شاعری میں مروجہ اوزان''، ''نظم طباطبائی کی نظم [گور غریباں]''، ''صحرا پھول'' (ذہنی معذور بچوں کی تربیت)، ''قرۃ العین طاہرہ'' اور ''اُردو زبان کی پیدائش'' جیسے موضوعات پر بھی مضامین ہیں۔ ان کے کئی مضامین فکر انگیز ہیں بعض مزید تفصیل کے متقاضی، کوئی عجب نہیں، ڈاکٹر تقی عابدی ہی ان موضوعات پر مزید فکر کریں گے۔

فرحت آرا حیدری
سری نگر (جموں کشمیر)

تصانیفِ دبیؔر اور تقی عابدی

مرزا دبیؔر اعلیٰ پائے کے اُردو مرثیہ گو شاعر تھے۔ انھوں نے ہر صنف میں شاعری کی ہے۔ انھوں نے مرثیے، سلام، قطعات، رباعیات اور قصیدے کہے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں آٹھ مثنویات بھی ہیں۔ ان کا سارا کلام اعلیٰ پائے کا ہے اور زبان فصیح ہے اور سب سے زیادہ قابل تعریف یہ بات ہے کہ ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہے۔ ان کے اسلوب بیان میں فصاحت، بلاغت، روانی اور سلاست ہے۔ سنتے ہیں ان کی آواز بھی اچھی تھی اور مرثیہ پڑھنے کا انداز بھی۔ اس بات کو انھوں نے اپنی رباعی میں بیان کیا ہے ؎

ناحق نہ چیخنا نہ چلانا ہے
بے کار نہ ہر بند پر بتلانا ہے
ابن شہ مرداں کا ثنا خواں ہوں میں
صد شکر کہ پڑھنا میرا مردانا ہے

مرزا دبیؔر نے عربی و فارسی باقاعدہ پڑھی تھی۔ ان کا شمار علماء میں ہوتا تھا۔ انھوں نے 12 سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور اپنے والد کے کہنے سے جب میر ضمیؔر کو اپنا یہ قطعہ سنایا ؎

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دُنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

یہ قطعہ سن کر میر ضمیؔر اور تمام حاضرین پھڑک اٹھے اور بولے۔ صاحبزادے!

صاحبزادے! ماشاء اللہ چشم بد دور! آپ نے بلا کی طبیعت پائی ہے۔ اس کے بعد تقریباً دس سال مرزا دبیر، میر ضمیرؔ کی شاگردی میں رہے۔ میر ضمیر لکھنوی کو خود اس بات پر فخر تھا کہ وہ ذہین اور ہونہار مرزا دبیر کے استاد ہیں اس مضمون کو انھوں نے اپنی ایک رباعی میں پیش کیا ہے ؎

پہلے تو یہ شہرہ تھا ضمیرؔ آیا ہے
اب کہتے ہیں استادِ دبیر آیا ہے
کردی میری پیری نے مگر قدر سوا
اب قول یہی ہے سب کا پیر آیا ہے

مرزا دبیرؔ کی ولادت ۱۱ر جمادی الاول ۱۲۱۸ ہجری میں ہوئی۔ مقام ولادت دہلی ہے۔ بعد میں وہ لکھنؤ میں رہنے لگے اور وفات ۱۲۹۲ ہجری میں ہوئی۔ ان کے دو بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ ان کے بڑے بیٹے مرزا اوجؔ بھی بلند پایے کے اُردو مرثیہ گو شاعر تھے۔

زیرِ نظر مضمون میں ہم ڈاکٹر سید تقی عابدی کی صرف تین تصانیف: ''ابواب المصائب''، ''مثنویات دبیرؔ'' اور ''مصحفِ فارسی'' کا ہی تذکرہ کریں گے۔

۱۔ ''ابواب المصائب'' مرزا دبیر نے اپنی تصنیف ''ابواب المصائب'' میں سورۂ یوسف اور حضرت یوسفؑ کے حالات اور مصائب کی مثال دے کر مصائب شہدائے کربلا کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ دل سوز بیان نثر و نظم دونوں ہی میں کیا ہے۔ مرزا دبیرؔ ''ابواب المصائب'' نثری تصنیف ہے اور یہ کتاب اس زمانے میں تصنیف کی گئی جس زمانے میں نثر شاعرانہ انداز میں لکھی جاتی تھی اور مسجع اور مقفّٰی ہونے کے ساتھ شاعرانہ صنعتوں سے مالا مال تھی۔ ابتدا میں نثرؔ کا اسلوب یہی تھا۔ پہلے عربی اور فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کیے جاتے تھے۔ مرزا دبیر نے ''ابواب المصائب'' میں صاف وشستہ اور عالمانہ زبان استعمال کر کے اپنا الگ مقام بنایا ہے۔ لیکن انھوں نے بھی زیادہ تر فارسی نثر کا اسلوب اختیار کیا ہے اور کسی کسی عبارت میں اُردو نثر کا اسلوب بھی نظر آتا ہے۔ یہ کتاب نثر میں ہے مگر ساتھ ہی ساتھ نظم میں بھی حضرت یوسفؑ اور امام حسینؑ کے حالات اور مصائب بیان کیے گئے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے پہلے نثر اور نظم ملا کر نثر خوانی کا دستور تھا بلکہ اب بھی محرم میں بعض نثار اسی طرح مجلس

پڑھتے ہیں:

کتاب ''ابواب المصائب'' بادشاہ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تصنیف کی گئی تھی۔ بادشاہ بڑی عقیدت اور مودّت کے ساتھ محرم میں تعزیہ داری اربعین تک کرتے تھے۔ اس کے بعد آٹھ ربیع الاول تک عزاداری کی جانے لگی۔

مرزا دبیرؔ کہتے ہیں کہ یہ تائید غیبی ہے کہ ہم نے سورۂ یوسفؑ کے ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ مصائب امامِ حسینؑ کو آیات اور احادیث کی روشنی میں ایسا ربط خصوصی دیا ہے جس سے اُردو سے واقف عزاداران حسینؑ مستفید اور غمگین و دلسوز واقعات پر آنسو بہائیں ؎

ہر چند کہ یوسفؑ پہ ہوئی آفتِ بے داد
پر ماتم شبیرؑ سے فریاد ہے فریاد

•••

یوسفؑ کوئی ساعت رہا اس دشت میں پیاسا
پیاسا کئی دن تک رہا احمدؐ کا نواسا

حضرت یوسفؑ کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے حضرت یوسفؑ سے بہت زیادہ امام حسینؑ پر ظلم و ستم کیے گئے اور آپ نے سب کچھ برداشت کر کے اپنے بھائی، بیٹوں، بھتیجوں کی قربانیاں پیش کیں اور ایمان کی حفاظت کے لیے اپنی جان و مال اور گھر بار سب کچھ لٹا دیا۔ یزید جیت کر ہار گیا اور امام حسینؑ ہار کر جیت گئے۔ اُن کا نام ان کا دین قیامت تک باقی رہے گا ؎

خدا نے قصۂ یوسفؑ کو جو کہا احسن
سو بزم عقل میں یہ شمع راز ہے روشن

•••

کہ اس میں حال حسینؑ و حسنؑ کا ہے مذکور
اسی سے قصۂ احسن ہوا ہے وہ مشہور

حضرت یعقوبؑ کے بارہ فرزند تھے۔ وہ سب بیٹوں سے زیادہ حضرت یوسفؑ کو چاہتے تھے۔ ایک دن یوسفؑ نے اپنے بابا سے بیان کیا کہ میں خواب میں دیکھا ہے کہ

آفتاب اور مہتاب اور گیارہ ستارے اُترے اور مجھے سجدہ کیا۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ تم کو حکومت اور نبوّت ملے گی۔ یہ بات کسی اور نے بھی سن لی تو بھائیوں کو بھی خبر ہوگئی۔ سب بھائی سن کر جل گئے اور حسد کی وجہ سے بھائی کے دشمن بن گئے۔ حضرت یوسفؑ کو باپ سے جدا کرنے کی یہ ترکیب سوچی کہ وہ باپ سے اصرار کرکے یوسفؑ کو صحرا کی سیر کرانے لے جائیں اور وہیں لے جاکر اسے ختم کردیں حضرت یعقوبؑ نے بڑی مشکل سے اجازت دی اور رخصت کرتے وقت گلے مل کر بہت روئے ؎

اے پسر تیرے گلے لگ کے اب ہم روتے ہیں
اب کے بچھڑے ہوئے دیکھئے کب ملتے ہیں

اسی طرح جب عاشور کا امام حسینؑ بیمارِ کربلا سے رخصت ہونے لگے تو عابدؑ بیمار نے روکر فرمایا ؎

بیمار ہوں اے میرے مسیحا نہ بچوں گا
بعد آپ کے حاشانہ جیوں گا نہ جیوں گا
وہ بیکسی حرم کی وہ رخصت حسینؑ کی
پردیس میں وداع شہؑ مشرقین کی

بھائیوں نے یوسفؑ کو صحرا میں لے جاکر نہ پانی دیا نہ کھانا دیا حالاں کہ والد نے سب کچھ ساتھ دیا تھا۔ یوسفؑ پیاسے تھے مگر پانی نہ دیا۔ پیراہن بھی اتار لیا اور رسی سے ہاتھ پاؤں باندھ کر کنویں میں ڈال دیا۔ اللہ نے جبرئیل امیں سے حفاظت کروائی۔ بھائی پیراہن میں کسی جانور کا خون لگا کر لے گئے اور والد سے کہا: ''بابا! یوسفؑ کو بھیڑیے نے کھالیا۔'' یہ سن کر حضرت یعقوبؑ بہت روئے اور کہا: ''تم غلط کہتے ہو۔ مجھے یقین نہیں، میرا یوسفؑ زندہ ہوگا۔'' ؎

میان چاہ تھا یوسفؑ کو ایک باپ کا غم
دل حسینؑ کو واللہ تھے ہزار الم

اتفاق سے اسی صحرا میں ایک کارواں آگیا۔ انھوں نے پانی بھرنے کے لیے کنویں میں ڈول ڈالا اس ڈول میں بیٹھ کر یوسفؑ کنویں سے باہر نکل آئے۔ وہ لوگ حسین لڑکے کو

دیکھ کر کہنے لگے اسے ہم لے جائیں گے۔ ہم کو اس سے فائدہ ہوگا۔ اتنے میں یوسفؑ کے بھائی آگئے اور کہنے لگے یہ ہمارا غلام ہے۔ خریدو گے تو اسے دیدیں گے۔ ان لوگوں نے سو درہم میں خرید کیا۔ شہرِ مصر پہونچ کر اس کو نہلوا کر بہترین پوشاک پہنا کر اسے بازار میں نیلام کیا۔ زلیخا نے عزیزِ مصر سے کہا کہ اسے خرید لیجیے۔ عزیزِ مصر نے خرید لیا اور زلیخا سے کہا کہ اس کو بہت اچھی طرح رکھنا۔ زلیخا نے اسے بہت آرام سے رکھا۔ کچھ عرصہ کے بعد زلیخا اس سے ناراض ہوگئیں اور الزام لگا کر اسے قید میں ڈلوا دیا۔

حضرت یعقوبؑ بیٹے کے لیے رویا کرتے تھے اور حضرت یوسفؑ بھی باپ سے ملنے کے لیے بے قرار تھے اور رویا کرتے تھے۔ حضرت یوسفؑ کی ایک بہن تھی اس کا نام دُنیا تھا وہ بڑی نیک اور دیندار تھی۔ وہ بھی حضرت زینبؑ کی طرح بھائی کو بہت چاہتی تھی اس نے باپ سے کہا: ''بابا! آپ نے یوسفؑ جیسے پھول کو خار جیسے بھائیوں کے ساتھ کیوں بھیج دیا۔ میں نے بہت بُرا خواب دیکھا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگی ؎

غرض کہ دیکھ کے یوسفؑ کا حال رویا میں
سیاہ ہوگئی دُنیا نگاہ دُنیا میں

شبِ عاشور حضرت زینبؑ نے بھی بُرا خواب دیکھا تھا وہ بھی بہت روتی تھیں اور ہمیشہ بین کر کے روتی رہیں ؎

قتل ہوتا نہ حسینؑ اور نہ لٹتی زینبؑ
کاش امت کی شفاعت کا نہ وعدہ ہوتا

•••

شمر چڑھتا پسر فاطمہؑ کے سینے پر
زندہ عالم میں جو شبیرؑ کا نانا ہوتا

حضرت یوسفؑ کو جب قیدی بنایا گیا تو مصر میں آپ کے سارے چاہنے والے روئے تھے ؎

پڑی جو بیڑیاں یوسفؑ کے پائے زیبا میں
خروش ہوگیا برپا تمام دُنیا میں

مگر افسوس ہے کہ ؂

سجادؑ سا قیدی نہ کوئی دُنیا میں
طوق گردن میں رسن ہاتھ میں بیڑی پا میں

•••

بے سر حسینؑ زینبؑ و کلثومؑ بے ردا
یہ ظلم اہلبیتؑ پہ اللہ کی پناہ

•••

یہ کنبہ قید میں سب ننگے سر ہمارا ہے
لقب جہاں میں اب بے پدر ہمارا ہے

حضرت یعقوبؑ اور یوسفؑ کی بہن دینا دونوں باپ بیٹی یوسفؑ کے لیے بے قرار رہتے تھے اور زار زار روتے تھے اور اتنا روئے کہ حضرت یعقوبؑ نابینا ہو گئے ؂

جلد آ کہ یہ بابا تیرا مشتاق ہے یوسفؑ
فرقت میں تری زیست بھی اب شاق ہے یوسفؑ

عاشور کو حضرت فاطمہؑ اور رسول اللہؐ امام حسینؑ کو شہید ہوتے دیکھ کر بہت روتے تھے۔ وہ بے انتہا حسینؑ کو چاہتے تھے۔ پھر بھی وہ حسینؑ کی شہادت پر راضی بہ رضا رہے ؂

یہ کہہ کے لاش کو سینے سے اپنے لپٹایا
رسولؐ روئے یہاں تک کہ اُن کو غش آیا

•••

سرِ حسینؑ نہیں کاٹا میرا سر کاٹا
علیؑ و شبیرؑ و زہراؑ کا ہے جگر کاٹا

•••

زینبؑ کی یہ فریاد تھی ہے ہے میرے بھائی
میں روتی ہوں لاشے پہ تو رونے نہیں پائی

•••

ہوئی بلند صدا رن میں واحسیناؑ کی
ہوا یقیں کہ قیامت خدا نے برپا کی

•••

اے بے وطن حسینؑ سکینہؑ ترے فدا
اللہ میری فکر نہ تم کو رہی ذرا

•••

مارے طمانچے شمر نے میرا گوہر لیا
تم نے میری طرف سے جگر سخت کرلیا

حضرت یوسفؑ کے ساتھ قید خانے میں دو قیدی اور تھے۔ ان دونوں نے اپنے خواب حضرت یوسفؑ سے بیان کیے۔ آپ نے خواب کی یہ تعبیر دی کہ تم رہا ہوکر بادشاہ کے ساقی بنوگے اور دوسرے سے کہا تم کو پھانسی ہوگی۔ عزیز مصر نے بھی خواب دیکھا اور اپنے درباریوں سے تعبیر پوچھی تو اس ساقی نے کہا کہ قید خانے میں ایک یوسفؑ ہیں وہ خواب کی تعبیر بتاتے ہیں۔ عزیز مصر کے خواب کی بھی تعبیر بتائی۔ تو اس نے سوچا کہ یوسفؑ بہت عالم ہیں اور خدا کے نیک بندے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سوچ کر عزیز مصر نے یوسفؑ کو رہا کرکے اپنے محل میں بہت ہی عزت واحترام سے رکھا۔

عزیز مصر کے بعد حضرت یوسفؑ کو حکومت بھی مل گئی اور نبوت بھی۔ قحط کے زمانے میں حضرت یوسفؑ کے بھائی مصر میں غلّہ خریدنے آئے تو حضرت یوسفؑ نے انھیں پہچان لیا اور باپ کی خیریت پوچھی۔ کہا، وہ نابنیا ہوگئے ہیں۔ پھر کچھ پہچان کر پوچھا آپ یوسفؑ ہیں۔ ہاں! میں یوسفؑ ہی ہوں۔ اور کہا پیراہن لے جاؤ بابا کو دینا۔ یہودا بھائی سب سے غنیمت تھا۔ وہ جلدی سے باپ کے پاس پیراہن لے کر پہنچا اور کہا۔ بابا! یوسفؑ کو حکومت بھی مل گئی اور نبوت بھی۔ انھوں نے آپ کو بلوایا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے پیراہن آنکھوں سے لگایا، بوسا دیا اور اسی وقت آپ کی آنکھوں میں روشنی آگئی۔ پھر سب لوگ مصر گئے۔ مصر پہونچتے ہی بھائیوں نے معافی مانگی۔ حضرت یوسفؑ نے معاف کردیا۔

حضرت یوسفؑ سب کو اپنے محل میں لے گئے۔ ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور گیارہ

بھائی سجدے میں گر گئے۔ اس طرح حضرت یوسفؑ کے خواب کی تعبیر پوری ہوئی۔ سب مل گئے اور ہنسی خوشی رہنے سہنے لگے ؎

وصالِ یوسفؑ کنعاں سے خوش ہوئے یعقوبؑ
پڑا یہ غل کہ محبوب سے محبوب ملا

•••

گلے سے باپ کے جس دم وہ نورِ عین ملا
پکارے حضرت یوسفؑ کہ آج چین ملا

ہائے افسوس جنابِ اُمِ لیلیٰ یوں نوحہ کیا کرتی تھیں ؎

اے وائے غضب ہائے ستم وائے مقدر
یعقوبؑ سے یوسفؑ چھٹا مجھ سے علی اکبرؑ

•••

یعقوبؑ سے یوسفؑ تو ملا پھر بھی دوبارہ
واحسرتا دردا میرا اکبرؑ گیا مارا

•••

یوسفؑ کا پسر کون تھا اکبرؑ کے برابر
بچہ کہاں مارا گیا اصغرؑ کے برابر

ملنا کیسا! امام حسینؑ کی شہادت کے بعد اہلِ حرم پر بہت ہی ظلم کیے گئے۔ قیدی بنایا گیا۔ شام وکوفہ کے بازاروں میں ننگے سر ننگے پا پھرا تا گیا۔ ہاں، قید خانے میں سکینہؑ خواب میں ایک بار اپنے بابا سے ملیں اور اتنا روئیں کہ اپنے بابا ہی کے پاس چلی گئیں۔ جب اہلِ حرم قید سے رہا ہوئے اور مدینہ جانے کی اجازت ملی، تو آپ نے اپنے بابا حسینؑ کا سر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ؎

گو فاطمہؑ کے رونے پر اب عرش ہلے گا
شبیرؑ کا سر تو نہ ملا نہ ملے گا

سیدِ سجادؑ مایوس ہو گئے اور سب اہلِ حرم روتے ہوئے مدینہ سدھارے۔ اور جب

سب مدینہ پہونچے ہے

رو کر کہا بانوؔ نے کہ اے فاطمہ صغرؔا
کیا پوچھتی ہو آہ نہ بھائی ہیں نہ بابا

•••

فرزندِ نبیؐ سید عالی گیا مارا
اے شہر مدینہ تیرا والی گیا مارا

•••

حسینؑ بے وطن و بے کفن سلام علیک
غریب و بے کس و تشنۂ دہن سلام علیک

مرزا دبیرؔ کی تصنیف ''ابواب المصائب'' لاجواب ہے اور سنہری حروف سے لکھنے والی کتاب ہے۔ ایسی کوئی کتاب جس میں حضرت یوسفؑ اور امام حسینؑ کے مصائب کا موازنہ کیا گیا ہو ہماری نظر سے نہیں گزری۔

۲۔ ''مثنویاتِ دبیرؔ'' مرزا دبیرؔ کی ''مثنویات دبیرؔ'' بھی بہترین تصنیف ہے۔ اس کتاب میں آٹھ مثنویات ہیں۔ پہلی مثنوی ''احسن القصص'' میں چہاردہ معصومین علیہم السلام کی ولادت فضائل اور معجزات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کے الفاظ شان دار اور پُرشکوہ ہیں۔ زبان و بیان رواں وشستہ ہے۔ کردار نگاری بھی اعلیٰ پائے کی ہے۔ معصومین علیہم السلام کے جذبات تو دل کو چھو لینے والے ہوتے ہیں۔ اور منظر نگاری بھی خوب تر اور دلکش ہے۔

دوسری مثنوی ''معراج نامہ'' ہے۔ اس کو لکھ کر مرزا دبیرؔ نے اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔ بس اس سے زیادہ کہنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

تیسری مثنوی ''اسناد سورۂ الحمد و چہاردہ معصومین علیہم السلام'' ہے۔ اس مثنوی میں سورہ الحمد کی شان وشوکت، اسناد یعنی فائدے بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں حمدِ خدا اور چہاردہ معصومین علیہم السلام کے فضائل ہیں۔ یہ بھی بہترین مثنوی ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کیے گئے ہیں۔ پھر بھی زبان و بیان میں سادگی اور روانی

ہے۔ اس مثنوی کا پہلا شعر ہے ؎

دلا حمد معبود معراج ہے
کہ الحمد قرآن کا تاج ہے

چوتھی مثنوی ''شہادت امیرالمومنینؑ'' کے بارے میں ہے۔ اور شہادت پر گریا وبکا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو بینیہ مثنوی کہتے ہیں اور یہ مثنوی چھوٹی بھی ہے۔ اس مثنوی کا پہلا شعر ہے ؎

یارو نہیں ہے مرثیہ پڑھنے کی احتیاج
دُنیا میں انتقالِ امیرؑ عرب ہے آج

پانچویں مثنوی ''عزائے حیدر کرارؑ بہ غرۂ ماہ شوال کہ روزِ عید ست''۔ اس مثنوی میں بتایا گیا ہے کہ حضرت علیؑ کی شہادت کے دس روز بعد عیدالفطر آ گئی۔ اس لیے امیرالمومنینؑ کے گھر عید نہیں منائی گئی۔ اس مثنوی کا ایک شعر ہے ؎

عید کی تیاریاں ہیں جابجا
پر نبیؐ کے گھر میں ہے ماتم بپا

چھٹی مثنوی ''تواریخ ولادت چہاردہ معصومینؑ'' کے بارے میں ہے۔ اس میں چہاردہ معصومینؑ کی ولادت کی تاریخ اور تیرہ معصومینؑ کی وفات کی تاریخ ہے۔

ساتویں مثنوی ''واقعۂ شہادت علی اکبرؑ'' ہے۔ اس میں علی اکبرؑ کا عالمِ جوانی، حُسن وشباب اور جاہ وجلال کا ذکر کر کے شہادت کا واقعہ نظم کیا گیا ہے۔ یہ بھی بینیہ مثنوی ہے۔

آٹھویں مثنوی بے عنوان اور ادھوری ہے۔

۳۔ ''مصحفِ فارسی'' مرزا دبیرؔ کی تصنیف ''مصحفِ فارسی'' میں مرزا دبیرؔ کے فارسی کلام کا مجموعہ درج ہے۔ رباعیات، مخمسات اور مسدسات وغیرہ فارسی میں نظم کیے گئے ہیں۔ فارسی جاننے والوں کے لیے بہترین کتاب ہے اور اسی کتاب میں مرزا اسلامت علی دبیر کا زندگی نامہ بھی ہے۔ جو عابدی صاحب نے اُردو میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب عنقا ہو گئی ہے۔ کہیں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتی ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے ان کتابوں کو پھر سے شائع کیا۔ انھوں نے ان کتابوں کو شائع ہی نہیں کیا بلکہ ان پر بڑی بحث

کی ہے۔ انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں گراں قدر اور معرکہ آرا مقدمے لکھے ہیں۔ مرزا دبیر کی سوانح عمری بھی بہترین انداز میں لکھی ہے اور تشریح بھی اچھی طرح سمجھا کے کی ہے۔ تحقیق و تدوین اور ترتیب کے کام کو بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ سرانجام دیا ہے۔ اور تفصیل کے ساتھ مرزا دبیر کی فنی خوبیوں کو اجاگر کر کے قارئین کو بتلایا ہے کہ مرزا دبیر نے اُردو میں سب سے زیادہ شعر کہے ہیں۔ وہ قادرالکلام تھے۔ انھوں نے مرثیے کے فکرِ معیار کو بلند کیا۔ ان کی جدّت پسندی، پُرشکوہ طرزِ سخن اور معنی و بیان کے اعتبار سے ان کے کلام کو معراج کمال حاصل ہوا۔ مرزا دبیر کو میر انیس سے کمتر نہیں سمجھنا چاہیے۔ بقول عمر انصاری ؎

نام جن کا کہ ہے انیس و دبیر
آسمانِ ادب کے تارے ہیں

•••

کس کو کہیے قمر کسے خورشید
دونوں ہی نور کے منارے ہیں

بہرکیف ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے ان کتابوں کو شائع کر کے ایک بڑا کارنامہ ہی انجام نہیں دیا بلکہ مرزا دبیر کی روح کو بھی شاد کیا اور خود بھی ثواب کمایا۔ وہ انیس شناس ہی نہیں دبیر شناس بھی ہیں۔

میرزا کوکب قدر
کلکتہ

''مثنویات دبیر''، ''ابواب المصائب'' اور ''مصحف فارسی''

مرزا سلامت علی دبیر پر یہ تینوں کتابیں ''مثنویات دبیر''، ''ابواب المصائب'' اور ''مصحف فارسی'' حسن طباعت کے لیے تو اپنی مثال آپ ہیں ہی نفس مضمون کے لیے عدیم المثال کہی جاسکتی ہیں۔ ان کے مرتب پیشہ کے اعتبار سے طبیب اور اسی لیے ایسے تخلیقی اور تجدیدی ادب کی اشاعت میں عرصے سے کوشاں ہیں، جس کے آگے ڈاکٹریٹ کی نمائشی ڈگریاں ہیچ ہیں۔ موصوف کی پرخلوص جستجو، وسیع مطالعہ اور دقیقہ رسی کے اندازے کے لیے ان کتابوں کا سرسری جائزہ ہی کافی ہے۔

نرم لہجہ اور میانہ روی ڈاکٹر تقی عابدی کا مخصوص اسلوب ہے اور اسی لیے وہ اُردو مثنویوں کی تحقیق پر نکتہ چینی کرتے ہوئے محقق کاوشوں کا ذکر تو ضرور کرتے ہیں لیکن اس پہلو پر توجہ دینا ضروری نہیں جانتے کہ تحقیق کرنے والے نے ایسا کیوں لکھا۔ چناں چہ مثنوی ''احسن القصص'' پر ڈاکٹر گیان چند جین کا پورا بیان نقل کیا ہے (ص: 17) سوائے اس آخری جملے کے:

''معراج نامہ'' کے بارے میں بھی جملہ معلومات موصوف پروفیسر مسعود حسن رضوی نے فراہم کیں۔''

شاید اس لیے کہ وہ مرحوم کا نام زیر بحث لانا نہیں چاہتے جیسا کہ چند سطروں کے بعد بعنوان مختلف اس کا اعتراف بھی کیا ہے:

''یہ مثنویات ادب میں کیوں نمایاں نہ ہوسکیں اس کی وجہ ان مثنویوں کا

موضوع نہیں ادیبوں کی سہل انگاریاں ہیں جن کا ہم کسی دوسرے مقام پر ذکر کریں گے۔''

حقیقت یہی ہے کہ مثنویات کا موضوع اور ادیبوں کی سہل پسندی دونوں ہی مثنویات دبیر کے ''عمیق مطالعہ'' سے روکتی رہیں اور ایک کشادہ دل کشادہ ذہن ڈاکٹر جین یا کندن لال کندن تو کیا دبیر کے ہم عقیدہ ہم مسلک ڈاکٹر سید محمد عقیل اور ڈاکٹر سلیمان حسین وہ محقق ہیں جن کو صرف دو مثنویوں کی اسم نویسی سے ہی سروکار تھا۔ ان کا ادبی اور تنقیدی تجزیہ وہ بھاری پتھر تھا جسے چوم کے چھوڑ دینا ہی مناسب نظر آیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ''احسن القصص'' اور ''معراج نامے'' کے چار ہزار اشعار کے علاوہ پانچ اور چھوٹی چھوٹی مثنویوں کا جن کے اشعار کی مجموعی تعداد 164 ہے توجہ کے قابل سمجھا اور ہر مثنوی کے تعارف کے طور پر ایک دیباچہ لکھا۔ آٹھویں مثنوی ''مثنوی بے عنوان'' کی دریافت کا سہرا تو ڈاکٹر مرزا محمد زماں آزردہ کے سر ہے لیکن اس کے مکمل متن (31 صفحے) کی فوٹو کاپی کا شائع کرنا کہ ''دبیریے'' دبیر کی تحریر سے بھی واقف ہوں اور جو مخطوطات کے پڑھنے میں کچھ مہارت رکھتے ہیں اس کے پڑھنے میں مددگار ہوں اسی صاحب ذوق اور صاحب حیثیت محقق کا کام ہے جو حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کا شیدائی ہے۔

دبیر کا نثری کارنامہ جو ان کی مذکورہ بالا مثنویوں کی طرح اہل قلم کی بے التفاتی کا شکار ہوا کتاب ''ابواب المصائب'' ہے (مطبوعہ مطبع یوسفی، دہلی)۔ اسے اردو نثر کے ارتقاء خصوصاً دبستان لکھنؤ کی خدمات میں ممتاز جگہ ملنا چاہیے تھی لیکن اسے اُردو ادب کی تاریخ کا المیہ کہیے یا کچھ اور، ہم کسی بھی جامع حیثیات فن کار کی کسی ایک حیثیت کو ترجیح دیتے ہوئے اگر اس کی دوسری خدمات کو بالکل ہی فراموش نہیں کرتے تو قابل ذکر بھی نہیں جانتے۔ دبیر اگر مرثیہ نگار تھے تو صرف مرثیہ نگار تھے اور وہ بھی مسدس کی ہیئت میں۔ اگر وہی موضوع مثنوی کی شکل میں ظہور پذیر ہوا تو اس ثانوی حیثیت کے ذکر سے حاصل؟ اور پھر اگر وہی موضوع دبیر کی بالکل ابتدائی شہرت کے زمانے میں ''ابواب المصائب'' کی منفرد نثر کی صورت میں نمودار رہا تو اس کے ذکر سے فائدہ؟ بالخصوص ایسی حالت میں جب مصنف نے خود اسے اہمیت نہ دی ہو اور جب یہ مطبوعہ شکل میں منظر عام پر آیا ایک دوسرے دبستان

کی چھاپ لیے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر صفدر حسن، ڈاکٹر آزردہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا ''ابواب المصائب'' کی بازیافت کے سلسلے میں کام ڈاکٹر تقی عابدی کے کام سے کچھ کم قابل ستائش نہیں کہ کاشانۂ اُردو ادب کے ان جدید معماروں نے اس گمنام ادب پارے کی اہمیت کو واضح کیا اور ڈاکٹر تقی عابدی نے کھلے دل سے ان جوہر شناسوں کی شناوری کی داد دیتے ہوئے اس کی اشاعت اور تشریح کا وہ کام اپنے ذمے لیا جو صلہ اور ستائش کی طلب سے بے نیاز ادارے ہی کر سکتے ہیں۔

ع : ''این کار راز تو آید و مرداں چنیں کنند''

دبیر کے متفرق فارسی کلام کو یکجا کر کے فاضل مرتب نے اس مجموعے کا ''مصحف فارسی'' نام رکھا جو سلسلۂ دبیر کی اس چھٹی کڑی کے لیے ہر طرح موزوں ہے۔ بلاشبہ ایسے نادر و نایاب کلام کا اس آب و تاب سے جا بجا بخط دبیر شائع ہونا اسے حیات نو عطا کرنا ہے۔ ''دبیر کا زندگی نامہ'' کے عنوان سے دبیر کی زندگی کی خاص خاص باتوں کو ذیلی سرخیوں کے پہلو میں ایسی خوبی سے پیش کیا گیا ہے کہ تمام باتیں خود بخود آئینہ ہو جاتی ہیں لیکن اس آئینہ ہونے کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ خرابیاں بھی بہ یک نظر سامنے آجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر دبیر کا ایک قطعہ اس طرح شائع ہوا ہے ۔

کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے ۔۔۔ کسی کا کندہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے ۔۔۔ عجب سرا ہے یہ دُنیا کہ جس میں شام و سحر

بیس صفحات کے بعد ص: 31 پر وہی قطعہ بغیر کسی معقول سبب کے ایک دفعہ پھر پیش کیا گیا ہے لیکن تیسرے مصرعے میں ''میں'' کی جگہ ''کی'' درج ہے۔ دبیر جیسے اساتذہ کے کلام میں ہر لفظ کو آیت الٰہی سمجھنے والے اس ''میں'' اور ''کی'' جیسی بھول بھلیاں میں ہمیشہ بھٹکتے رہے اور ہمیشہ بھٹکتے رہیں گے۔ امید کرنا چاہیے کہ پہلے مصرعے میں دبیر نے کندہ ہی نظم کیا ہوگا کیوں کہ یہ ان کا ابتدائی کلام ہے لیکن کندہ کی ساقط ہائے ہوز سے قطع نظر کیا۔ کاف کاف کی تین دفعہ متواتر قرأت تنافر حرفی کی کیفیت پیدا نہیں کرتی؟ ساٹھ پینسٹھ برس پہلے جو کلام ہمارے بزرگوں نے ہمیں پیش خوانی کے لیے دیا تھا اس میں بجائے کندہ کے ''نقش'' درج تھا۔ کیا یہ کسی گستاخ کا لفظی تصرف تھا یا وہ کلام جس پر

دبیرؔ نے خود نظر ثانی کی تھی؟

کلاسکی متون کو پیش کرتے وقت واجبات سے ہے کہ ان کی صحت کا خیال رکھا جائے اور اس طرح کا مطالبہ اگرچہ نامنصفانہ ہے کہ تلاش، تحقیق اور تحریر پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ڈاکٹر عابدی پروف ریڈنگ پر بھی دیدہ ریزی کریں۔ ان کی پیش کش کا افادی پہلو بہر حال مجروح ہوا ہے کہ افسوس مندرجہ بالا کتابوں میں سے کوئی کتاب اس سہو نظر سے خالی نہیں۔ آفسیٹ کی پلیٹوں پر ہاتھ سے بنی ہوئی تصحیح کے آثار غمازی کرتے ہیں کہ طباعت کا یہ شعبہ توجہ سے محروم نہیں رہا۔ لیکن جب متعارف متون میں اختلاف کی نشاندہی ممکن ہے تو ایسے متون کے بارے میں کوئی کیا کہے جسے چند خوش نصیبوں نے ہی دیکھا ہے۔ مثال کے طور پر ص:3 پر یہ مشہور مصرع ؎

طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیسؔ

بغیر واوٗ معطوفہ کے درج ہے جب کہ خواہ زبر و بینات سے ہجری تاریخ نکالیے خواہ جمل محض سے عیسوی، واوٗ کا وجود لازمی ہے اور ص:68 پر دونوں جگہ یہ مصرعہ واوٗ کے ساتھ لکھا ہے۔ ان باتوں کی وضاحت طوالت اور اصل موضوع سے گریز کا سبب بنے گی، لیکن اتنا عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ دبیرؔ کا طبغراد معرکتہ الآرا قطعۂ تاریخ ملا محمد نعیم ندیمؔ اصفہانی کے قطعۂ تاریخ سے مستفاد ہے جو انھوں نے آصف الدولہ کے انتقال پر کہا تھا اور وزیر السلطان نواب امیر علی خاں امیرؔ کے بیان کے مطابق آصف الدولہ کی قبر پر کندہ تھا۔ آخر کلام میں یہ دو شعر اسی قطعے سے پیش خدمت ہیں ؎

لکھنؤ بی آصف است و آسمان بی آفتاب
شہر یوناں بی مسیح و طور سینا بی کلیم

• • •

نقش بندِ کاف دنوں بر تربت آصف نوشت
بہنا روح، و ریحان، و جنات نعیم
(وزیر نامہ) ۱۲۱۲ھ

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی
ممبئی

شوقِ کلامِ دبیر

دہلی میں پیدا ہونے والے اور کینیڈا میں مقیم، ہندوستانی نژاد ادیب و شاعر ڈاکٹر تقی عابدی، ڈگریوں کی تعداد کے اعتبار سے بھلے ہی ایک شاندار طبیب ہوں لیکن کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک ایماندار ادیب ہیں، جن کا ذوق و شوق تحقیق و تنقید ہے اور مزاج اور افتادِ طبع عرفانی اور روحانی۔ اس کا اظہار ان کی اُن تصانیف سے ہوتا ہے جن میں مذہبی عقائد و اعترافات کے ساتھ ساتھ روحانی اور عرفانی ادب کا ذائقہ بھی شامل ہے۔ مثلاً ''جوشِ مودت''، ''سلکِ سلامِ دبیرؔ''، ''تجزیہ یادگارِ انیسؔ''، ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے''، ''تجزیہ شکوہ جواب شکوہ'' اور ''رباعیات دبیرؔ'' وغیرہ وغیرہ۔ اس جان بکف محقق نے مختلف سمتوں میں دشت نوردی کی ہے۔ جن میں سلام، مرثیہ، رباعی وغیرہ کے علاوہ چند نثری اصناف بھی شامل ہیں۔ اور اب ان کا یہ شوقِ کلامِ دبیر سے متعلق اس سلسلۂ مطبوعات سے مترشح ہے جس کی چھ جلدیں حال ہی میں منظر عام پر آئی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''مثنویاتِ دبیر'' اسی سلسلے کی چوتھی جلد کی حیثیت رکھتی ہے۔

کتاب کی ابتدا میں قاری کی تفہیم اور موضوع کی مناسبت سے ایک باب ''مثنوی۔ ایک اہم صنفِ سخن'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں صنفِ مثنوی کی فنی و معنوی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اس کی ہیئت، اوزان و بحور، معنوی ساخت، محاسن و لوازم اور معیار نقد پر مختلف نقادوں کی آرا کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ جہاں تک مثنوی کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ وہ اُردو کی تمام اصنافِ سخن میں اپنی انفرادی خصوصیات کے باعث ممتاز مقام رکھتی ہے۔ شبلی کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''انواعِ شاعری میں یہ صنف تمام انواعِ شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔'' شاید یہی وجہ ہے کہ

اُردو کی ابتدائی نظمیں بھی مثنویوں کی شکل میں ملتی ہیں۔ مثلاً خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور شاہ برہان الدین جانم کے چکّی نامے، ولی ویلوری کی روضۃ الشہدا اور قطبن کی مرگاوتی وغیرہ لیکن تعجب یہ ہے کہ جتنی طبع زاد، غیر طبع زاد یا ماخوذ اور ترجمہ شدہ مثنویاں اُردو میں لکھی گئیں، اتنی تنقیدی کتابیں اس صنف پر نہیں ملتیں۔ پھر بھی اطمینان قلب کے لیے یہ امر کافی ہے کہ جو کام مثنویوں پر ابتداء سے آج تک ہوا ہے وہ اپنی اپنی جگہ لائقِ توجہ اور قابل قدر ہے۔ مثلاً ''اُردو مثنوی کا ارتقاء'' (عبدالقادر سروری)، ''تاریخ مثنویات اُردو'' (جلال الدین احمد جعفری)، ''اُردو مثنویات'' (امیر احمد علوی)، ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں'' (ڈاکٹر گیان چند جین)، ''اُردو مثنوی۔ ایک عمومی مطالعہ'' (اظہر علی فاروقی)، ''اُردو مثنوی کا ارتقا۔ شمالی ہند میں'' (سید محمد عقیل)، ''اُردو کی دو قدیم مثنویاں (نائب حسین نقوی)، ''اُردو کی تین مثنویاں'' (خان رشید)، ''اُردو کی منظوم داستانیں (فرمان فتح پوری)، ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں'' (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)، اور ''شمالی ہند کی تاریخی مثنویاں'' (ڈاکٹر کندن لال کندنؔ) وغیرہ۔ ان میں سے بیش تر کے حوالے ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ہاں موجود ہیں لیکن ایک اہم نام علی جواد زیدی کا ہے جن کی کتاب ''مثنوی نگاری'' (مطبوعات سلسلہ اتر پردیش نمبر 2) جس میں اتر پردیش کی مثنویوں پر تحقیقی کام ملتا ہے اور جس میں صنفِ مثنوی سے متعلق ایک بسیط اور وقیع مقدمہ شامل ہے۔ غالباً ڈاکٹر تقی عابدی کی نظر سے نہیں گزر سکی یا انھیں دستیاب نہیں ہو سکی، ورنہ وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ کیوں کہ موضوع سے متعلق براہ راست تنقیدی کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر عابدی نے ان تنقیدی کاوشات کو بھی پیش نظر رکھا ہے جن میں ضمناً مثنوی کے فن پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً امداد امام اثرؔ کی ''کاشف الحقائق''، مولانا حالیؔ کی ''مقدمہ شعر و شاعری''، علامہ شبلی کی ''شعر العجم'' وغیرہ۔

ہر چند کہ مثنوی کی اصطلاح عربی سے لی گئی۔ اور یہ ''مزدوجہ'' یعنی دو دو ہم قافیہ مصرعوں کے جوڑی دار اشعار پر مشتمل ہوتی ہے جس کی خوبی تسلسل بیان اور ترتیب واقعات ہے، لیکن اس کا فروغ ایران میں ہوا۔ اُردو پر اس کے دہرے اثرات ملتے ہیں۔ فارسی مثنویات کی مروجہ سات بحروں کے جن پر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے بحث کی ہے اور سنسکرت کی طویل رزمیہ نظموں کی جو ''دوہا کوش'' کی روایت سے وابستہ رہیں، اُردو والوں

نے ان میں اضافہ کر کے مثنوی بحروں کی تعداد گیارہ تک پہنچا دی۔ بعض نقادوں نے تو موضوع کے اعتبار سے مثنویوں کے لیے بحریں بھی مخصوص کر دیں۔ تقی عابدی نے ان مروجہ سات بحروں کے ارکان بھی تحریر کیے ہیں جو اُردو مثنویوں میں عام طور پر مستعمل ہیں۔

بہر حال اُردو میں مثنویاتی ادب وافر مقدار میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ یہ طے کرنا بھی مشکل ہے کہ اُردو کی اولین مثنوی کون سی ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تحقیقی سفر بھی آگے بڑھتا جا رہا ہے اس لیے اس ضمن میں نقادوں میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل حضرت بابا فرید شکر گنج کے ان صوفیانہ اشعار میں اُردو مثنوی کا پہلا نقش دیکھتے ہیں جو ۱۱۷۳ھ کی تحریر ہے۔ جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک
پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک

•••

خاک لانے سے گر خدا پائیں
گائیں بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق اُردو کی اولین مثنوی بہمنی دور کے شاعر نظامی کی ''کدم راؤ پدم راؤ'' (۸۶۷ھ۔۸۶۵ھ) ہے۔ جب کہ علی جواد زیدی ''مثنوی نگاری'' میں ملّا داؤد کی مثنوی ''چندا این'' (۷۸۱ھ مطابق 1379-80ء) کی نشاندہی کرتے ہیں جو لورک اور چندا کے قصے پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے سید محمد عقیل کے حوالے سے بابا فرید شکر گنج کی مثنوی ہی کو اولین مثنوی قرار دیا ہے۔ نیز اٹھارہویں صدی کے اواخر اور خصوصی طور پر بیسویں صدی میں مثنوی نگاروں نے ہیئت کی جو تبدیلی کی جس کی وجہ سے مثنوی اور نظم کا فرق جاتا رہا، ڈاکٹر تقی عابدی نے بھی ڈاکٹر گیان چند جین اور سید محمد عقیل کی طرح اس دور کی نظموں کو مثنوی کی بحث سے خارج کر دیا ہے۔

چوں کہ مثنوی میں موضوع اور اشعار کی قید نہیں، لہٰذا اس میں ایک تنوع ملتا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے بھی دیگر نقادوں کی طرح موضوع کے اعتبار سے مثنویوں کی مختلف قسموں کو گناتے ہوئے مذہبی مثنویوں کا ذکر کیا ہے اور مثنویاتِ دبیرؔ کو مذہبی مثنویوں کے

زمرے ہی میں رکھا ہے۔

صنف مثنوی سے قطع نظر ایک پورے باب میں انھوں نے اس بات پر اظہار تاسف کیا ہے کہ ہمارے اکثر ناقدین اور محققین نے سہل انگاری سے کام لیتے ہوئے ''مثنویاتِ دبیرؔ'' کو طاقِ نسیاں کے سپرد کر دیا۔ سب سے زیادہ شکوہ انھیں مولانا امداد امام اثر کی ''بے خبری'' سے ہے۔ جنھوں نے دبیرؔ کی مثنوی نگاری سے انکار فرمایا ہے۔ اس سے زیادہ دُکھ انھیں اس بات کا ہے کہ خود دبستانِ دبیرؔ کے شعرا نے بھی اس طرف غفلت برتی، یہاں تک کہ چودھری سید نظیر الحسن فوق کی المیزان'' مرزا دبیرؔ کی شاعری پر مفصل بحث کے باوجود دبیرؔ کی مثنویات کے ذکر سے خالی ہے۔ اوج لکھنوی کے شاگرد سید فراز حسین خبیر لکھنوی، جنھوں نے مرزا دبیرؔ کے چودہ عدیم النظیر مرثیوں کو ''سبع مثانی'' عنوان سے مرتب کیا، اس میں بھی ''مثنویاتِ دبیرؔ'' کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اگر بعض حضرات نے ذکر کیا بھی ہے تو سرسری اس جہان سے گزر گئے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی کے مطابق ان ملزمین میں مرزا دبیرؔ کی پہلی سوانح حیات ''شمس الضحیٰ'' کے مصنف مولوی فدا علی بھی شامل ہیں۔ جن نقادوں یا محققوں نے دبیرؔ کی طرف دو مثنویوں ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' کا تذکرہ کیا ہے ان میں ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر سید سلیمان حسین (مثنویات دبستان، لکھنؤ) اور ڈاکٹر سید محمد عقیل ہیں جنھوں نے اپنی کتاب ضمیمہ نمبر 1 میں دبیرؔ کی مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی ایک ایک دو دو جملے میں۔ ''حیاتِ دبیرؔ'' کے مصنف ثابت حسین کو ڈاکٹر تقی عابدی اس لیے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ دبیرؔ سے واقفیت کے باوجود ان کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ انھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' دو الگ الگ مثنویاں ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین سے انھیں گلہ ہے کہ انھوں نے امیر اللہ تسلیم کی مثنویات کے بارے میں تو پچیس سے زیادہ صفحات میں تبصرہ کیا ہے اور ''احسن القصص'' اور ''معراج نامہ'' کو صرف ڈیڑھ صفحہ کے تبصرے کے قابل گردانا۔ جب کہ ان مثنویوں پر ڈیڑھ سو صفحات لکھے جا سکتے تھے۔ ڈاکٹر کندن لال کندنؔ سے وہ اس لیے شکوہ کناں ہیں انھوں نے ''جنوبی و شمالی ہند کی تاریخی مثنویوں'' میں سو کے قریب تاریخی مثنویوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے لیکن مرزا دبیرؔ کی مثنویات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ ناچیز کا خیال ہے کہ اس ضمن میں ڈاکٹر تقی

عابدی کو ڈاکٹر کندن لال کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی طرح، جن کے نام یہ کتاب منسوب کی گئی ہے، مستثنیٰ قرار دینا چاہیے کیوں کہ دونوں کا موضوع اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ جس طرح ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا موضوع ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں'' ہیں جن میں مقامی موضوعات کی بنیاد پر مثنویوں کو جن چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ان میں پہلی قسم ان مذہبی مثنویوں کی ہے جو ہندوستانی قصوں سے ماخوذ ہیں لہٰذا ''مثنویاتِ دبیر'' اس میں شامل نہیں کی جا سکتی تھیں کہ وہ ہندوستانی قصوں کی نہیں، اسلامی اور خصوصاً شیعی عقاید کی تشریح کرتی ہیں اس طرح ڈاکٹر کندن لال کندن کا موضوع تاریخی مثنویاں ہیں جب کہ تقی عابدی خود اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ''مثنویاتِ دبیر'' کا شمار مذہبی مثنویوں میں ہونا چاہیے کہیں کہیں ضمناً تاریخ ضرور قلم بند ہو گئی ہے۔ البتہ وہ غیر مطبوعہ مثنوی جس کا موضوع سراسر تاریخی ہے۔ ہنوز تحقیق کی منزلوں میں ہے، غالباً اسی لیے اس کا ذکر نہ ڈاکٹر نارنگ کے ہاں ملتا ہے اور نہ ڈاکٹر کندن کے۔ البتہ ڈاکٹر تقی عابدی ان محققین اور ناقدین سے گلہ گزار ہونے میں حق بجانب ہیں جنھوں نے دبیر کی مثنویوں کا ذکر تو کیا مگر وہ بھی سرسری۔

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے بھی جن کا شمار ماہر دبیریات میں کیا جا سکتا ہے، دبیر کی جس مثنوی کا انکشاف ''ممتاز نامہ'' کے عنوان سے کیا ہے وہ بھی دراصل ''معراج نامہ'' ہی کا دوسرا نام ہے جو عہد نظیر الدین حیدر شاہ میں ان کی ملکہ ممتاز الدہر کی فرمائش پر لکھی گئی اور اسی فعایت سے ان کے نام سے منسوب ہو کر ''ممتاز نامہ'' نام پایا۔ اسی طرح ڈاکٹر کاظم علی خان دبیر کی تیسری مثنوی کا جو ''دفترِ ماتم'' کی بیسویں جلد میں شامل ہے، ذکر تو کرتے ہیں مگر اس کے متعلق خاطر خواہ مواد یا معلومات نہیں دے پائے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اس مثنوی کا پورا نام ''اسناد سورۂ الحمد وفضائل چہاردہ معصوم علیہم السلام'' ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر زماں آزردہ کی دریافت شدہ غیر مطبوعہ مثنوی کے علاوہ ڈاکٹر تقی عابدی نے ''دفترِ ماتم'' کی بیسویں جلد سے دبیر کی مزید چار مثنویاں دریافت کی ہیں۔ فاضل محقق کی ان کاوشوں کے نتیجے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ دبیر نے محض دو مثنویاں نہیں بلکہ کل آٹھ مثنویاں لکھیں، تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق جن نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ ''احسن القصص''

۲۔ ''معراج نامہ''یا''ممتاز نامہ''

۳۔ ''اسناد سورۂ الحمد و فضائل چہاردہ معصوم علیہم السلام، دریافت کاظم علی خاں''

۴۔ ''ولادت و وفات حضرات چہاردہ معصوم علیہم السلام''

۵۔ ''غیر مطبوعہ مثنوی''

۶۔ ''مثنوی شہادت امیر المومنینؑ، دریافت پروفیسر آزردہ''

۷۔ ''مثنوی واقعہ شہادت علی اکبرؑ''

۸۔ ''مثنوی عزائے حیدر کرارؑ بہ غرۂ ماہ شوال کہ روز عید ست''

ان مثنویات کے موضوعات کی تفصیل یوں ہے۔''احسن القصص'' ایک طولانی مثنوی ہے جس میں تین ہزار تین سو، سولہ اشعار ہیں اور اس میں چہاردہ معصومین کی ولادت اور معجزات قصوں میں نظم کیے گئے۔

''معراج نامہ'' چھ سو چوراسی اشعار پر مشتمل ہے اس میں معراج نبوی اور آئمہ اثنا عشر کے فضائل رقم کیے گئے ہیں۔ دبیرؔ کے علاوہ اس موضوع پر دیگر شعرا نے بھی مثنویاں کہیں مثلاً مظفر علی اسیر کی ''معراج الفضائل''، منیرؔ شکوہ آبادی کی ''معراج المضامین'' اور میر ضمیرؔ کی ''ریحان معراج'' وغیرہ ان میں رسولؐ و آئمہ اثنا عشر کے فضائل، مناقب اور معجزات نظم کیے گئے ہیں۔ دبیرؔ کا ''معراج نامہ'' شعری اور فنی اعتبار سے قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ بے عنوان مطبوعہ مثنوی سماجی حالات پر ہے اس میں پانچ سو اٹھارہ اشعار ہیں۔ مثنوی شہادت علی اکبر میں اکسٹھ اشعار ہیں۔ البتہ نو دریافت مثنویاں مثلاً مثنوی شہادت امیر المومنین (چودہ اشعار) اور ''مثنوی عزائے حیدر کرار بہ غرہ ماہ شوال کہ روز عید ست'' (سولہ اشعار) مثنویوں سے زیادہ صنف ماتم کے قریب ہیں ان میں بینیہ رنگ پایا جاتا ہے اور عام طور پر دبیرؔ کی یہ مثنویاں ماتم کے طور پر ہی مجالس عزا میں ماتمی لے میں پڑھی جاتی ہیں۔ خصوصاً اول الذکر جس کا یہ شعر ٹیپ کے مصرعے کی طرح ماتم کے دوران بار بار دہرایا جاتا ہے۔

یہ رات مرتضیٰ کی شہادت کی رات ہے

زہراؑ کی بیٹیوں پہ قیامت کی رات ہے

اس طرح مثنوی عزائے حیدر کرار بھی عید کے موقع پر حضرت علی کے دسویں کی یاد میں ماتم کا انداز لیے ہوئے ہے۔ اور مادرِ عباس جناب ام البنین کی جانب سے فریادی ماتم کی شکل ہے ملاحظہ ہو

نام بیوہ اب ہمارا ہوگیا
آج دسواں بھی تمہارا ہوگیا

مثنوی تاریخ ولادت وفات حضرت چہاردہ معصوم کی ادبی اہمیت سے قطع نظر یہ مثنوی محض اس غرض سے کہی گئی معلوم ہوتی ہے کہ لوگ اس بہانے سے چودہ معصومین کی ولادت کی تاریخیں حفظ کرلیں۔ لہٰذا اس مثنوی کو مذہبی سے زیادہ تدریسی یا فرہنگی مثنوی کہا جاسکتا ہے۔ بقول علی جواد زیدی شاعروں نے یہ مثنویاں صرف اس لیے لکھیں کہ پڑھنے والوں کو منظوم ہونے کی وجہ سے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔ ایسی مثنویوں کی تعداد خاصی ہے جن میں عقیدہ، فقہ وغیرہ سے متعلق معلومات کو بحر و قافیہ کے سانچوں میں ڈھال دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مثنوی کے ضمن میں خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ ممکن ہے اسی سبب سے بعض محققین نے انھیں قابل اعتنا نہ گردانا ہو۔ بہر حال ہر مثنوی کی ابتداء میں اس کا تنقیدی جائزہ اور تاریخی و تحقیقی حال قلم بند کیا گیا ہے۔ نیز مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی ذیلی حاشیوں میں درج ہے۔ اس دریافت سے ایک نیا دبیر ہمارے سامنے آتا ہے جو ایک اعلیٰ مقام مرثیہ گو ہی نہیں، ایک قادرالکلام مثنوی نگار بھی ہے کہا جاسکتا ہے کہ ''دبیریات'' کے ادب میں یہ تحقیقی کاوش ڈاکٹر تقی عابدی کا بلاشبہ ایک کارنامہ ہے اور دبیر سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر سید مجاہد حسین حسینی
سابق صدر شعبۂ اُردو وفارسی
(بمبئی یونی ورسٹی)

آفتابِ مرثیہ گوئی مرزا دبیرؔ کا نثری شاہکار

انگریزی زبان کے معروف انشائیہ نگار فرانسس بیکن (Francis Bacon)، (1561ء تا 1626ء) نے آج سے صدیوں پہلے کتابوں کے مطالعے کے سلسلے میں جو اصول وضع کیے تھے وہ زمان ومکان کی گرفت میں آج تک نہ آسکے۔ اس دانشور نے کہا تھا کہ کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں صرف چکھا جاتا ہے جب کہ بعض ایسی ہیں جنھیں نگل لیا جاتا ہے، لیکن چند تصانیف اس قابل ہیں کہ انھیں چبا چبا کر ہضم بھی کرلیا جائے۔ ایک اور نام برآوردہ ادبی نقاد، مذہبی پیشوا اور انشائیہ نویس جان رسکن (John Ruskin)، (1819ء تا 1900ء) کا قول ہے کہ مطالعہ کے دوران ہمیں عام کتاب (A Book) کے بجائے مخصوص کتاب (The Book) ہی پڑھنا چاہیے، مخصوص کتاب سے اُس کی مراد صُحفِ آسمانی، سیرت علما وفضلاء اور اقوال حکما وفلاسفہ ہے۔ مذکورۂ بالا دونوں بزرگوں نے کتابوں کی تقسیم نظم ونثر یا دیگر اصناف علوم کی بنیاد پر نہیں کی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر ہم آفتاب مرثیہ گوئی، مرزا سلامت علی دبیرؔ کو ایک مخصوص کتاب یا الکتاب کہہ کر پکاریں تو اسے شاعرانہ تعریف وتحسین یا ''مدلّل مداحی'' ہرگز نہ سمجھنا چاہیے۔ آیئے ہم اس نسبتاً کم مشہور مگر وقیع تصنیف کا کسی قدر بالاستیعاب مطالعہ کریں۔ تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ یہ مخصوص کتاب بہ اعتبار متن کن علمی وادبی خصوصیات کی حامل ہے؟

''ابواب المصائب'' اگرچہ مرزا دبیرؔ کی ایک نادر روزگار نثری تصنیف ہے لیکن اسے بالکل نئے اور سائنٹفک انداز ترتیب وتحشیہ کے ساتھ میرے محترم کرم فرما اور اُردو کے محقق بے بدل جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی مقیم حال کینیڈا نے اپنے تفصیلی مقدمہ مع سوانح عمری مصنف اور عالمانہ تشریح مطالب کے ساتھ 2004ء میں بعنوان کلام دبیرؔ جلد پنجم شائع فرمایا

ہے۔ ایک سو پچاس صفحات کو محیط سفید و روشن کاغذ پر بے عیب کمپوزنگ سے مزین اس سفینۂ علم و حکمت کی طباعت شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی نے انجام دی ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم اصل کتاب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں:

''الحمد اللہ رب العالمین کے اعانت عنایت پروردگار اور تائید ائمۂ اطہار علیہم السلام سے ان سطور لطافت گنجور کی تحریر سے انفراغ حاصل ہوا۔ اب التماس اس ابجد خوان لوح بے سوادی اور ہیچ مدان دبستان بی استعدادی کا خدمت ارباب فصاحت و اصحاب بلاغت میں یہ ہے اگر چہ یہ مجموعہ پریشان مثل میرے نامۂ عصیاں کے حرف قبول سے معرّا ومبرّا ہے مگر چشم داشت دقیقہ شناسان معنی رس کے لمعات انوار و انظار سے یہ ہے کہ عین عطا کو ملاحظہ خطا میں کارفرمائیں بخدائے لایزال کے نشاط حواس اور تردد بے قیاس میں بہ تعجیل تمام اور بعجلت مالا کلام مدت یک ہفتہ میں اس خود غلط نے یہ اوراق سفید، سیاہ کیے ہیں اور اس زمانہ میں بھی اکثر اکتساب ثواب مجالس عزا میں اور تحصیل سعادت ملازمت احبا میں حاضر اور موجود رہا ہے[1]۔''

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مرزا دبیر بنیادی طور پر ایک شاعر تھے نہ کہ نثر نگار، اُردو کے رثائی ادب میں وہ ایک بہت ہی بلند اور ممتاز مقام کے مالک تھے۔ ان کا مذہبی کلام اس پایہ کا ہے کہ ان کے معاصرین میں اگر کوئی دوسرا ان کے ہم پلّہ تھا تو وہ صرف اور صرف خدائے سخن میر ببر علی انیسؔ ہی تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ روایتی قسم کے، تنگ نظر اور سہل انگار ناقدین، بیک آواز انیسؔ و دبیرؔ کو ایک دوسرے کا رقیب اور بدخواہ سمجھتے تھے لیکن جب میر انیسؔ کا 1874ء میں انتقال ہوگیا تو مرزا دبیر نے اُن کا قطعہ تاریخ وفات کہا۔

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ، منبر بے انیسؔ

اس کے علاوہ مرزا دبیر کے بڑے بھائی مرزا غلام محمد نظیر کا ۱۲۹۱ھ میں انتقال ہوگیا۔ چناں چہ میر انیسؔ اور نظیرؔ، دونوں کو بیک وقت یاد کرتے ہوئے مرزا دبیرؔ نے فرمایا تھا

وا دریغا، عینی و دینی دو باز و یم شکست
بے نظیر اوّل شدم امسال و آخر بے انیس

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا دبیر نے جو آخری مرثیہ کہا وہ یوں تھا ؎

انجیل مسیح لب شبیرؑ ہیں، عباسؑ

''مرزا دبیر یہ مرثیہ نظم کر رہے تھے کہ میر انیس کے انتقال کی خبر ملی۔ مرثیہ نا تمام چھوڑ دیا اور کہا کہ ''دبیر، یہ تیرا آخری مرثیہ ہے۔'' اور یہی ناتمام مرثیہ انھوں نے اپنی آخری مجلس میں ۲۵ر ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ میں پڑھا تھا۔ یہ مرثیہ حضرت عباسؑ کے حال میں تھا۔''

میر انیس و مرزا دبیر کے حوالے سے اوپر جو جملہ ہائی معترضہ لکھے گئے وہ بے ربط اور بے مقصد نہ تھے۔ عرض یہ کرنا تھا کہ انیس کے ہم عصر مرزا دبیر جتنے اچھے نثر نگار تھے۔ اُتنے ہی اعلیٰ درجے کے شاعر اور نفیس انسان بھی تھے۔ ''ابواب المصائب'' کے اختتام پر جو قطعۂ تاریخ کہا ہے اُس سے اُن کی قادر الکلامی اور ملکۂ تاریخ گوئی کا ثبوت ملتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

اے زہے این کتاب حزن اثر	کہ مزیّن بنام آل عباست
در معانی و لفظ ہر ورقش	محضر خون سید الشہداست
سطر سطرش بجلوۂ تاثیر	مدّ آہ جناب خیر نساءست
ہست عاری عبارت از اغراق	چون الف ہست حرف حرف راست
در کتاب زمانہ این اوراق	یادگار دبیر بے سر و پاست
چون بہ لطف ائمہ گشت تمام	اے ہمیں لطف خضر منزل ماست
غور کردم بہ سال تالیفش	کہ ز آئین فرقۂ شعر است
ناگہاں فوج فوج آمدہ عقل	از چپ و راست داد مژدہ راست

گفت بامن کہ سال تاریخش
مصحف طاق چشم اہل عزاست (۱۲۴۵ھ)

''ابواب المصائب'' کا انتساب، بجا طور پر، عاشق دبیر، امیر کبیر راجہ میوہ رام افتخار

الدولہ کے نام ہے جو مسلمان ہو کر آخر عمر میں کربلائے معلی تشریف لے گئے اور وہیں پیوند خاکِ شفاف بھی ہوئے۔ ان ہی افتخار الدولہ کے تعمیر کردہ عالی شان امام باڑے میں مرزا دبیر ہر سال اپنے نو تصنیف مراثی پڑھا کرتے تھے۔ مرزا صاحب کی کہی ہوئی یہ رُباعی قابل ذکر ہے ۔

اس در پہ ہر ایک شادماں رہتا ہے
خنداں گل امید، یہاں رہتا ہے
ہر فصل میں دستِ افتخار الدولہ
نیساں کی طرح گہر فشاں رہتا ہے[5]

کتاب مذکور کے مقدمہ میں فاضل مرتّب، ڈاکٹر سید تقی عابدی نے قدرے تلخی و تُرشی کے ساتھ لکھا ہے:

''یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اُنیسویں صدی کا اس شاہکار تصنیف کو سہل نگاری کے غلاف میں لپیٹ کر پہلے خود، دبیر کے گھر والوں نے اور بعد میں غیروں نے اپنے ذاتی کتب خانوں کی الماریوں کے طاق نسیاں میں رکھ چھوڑا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے عوام تو ایک طرف خواص اور رثائی ادب کے ماہرین بھی بے بہرہ رہے۔ ''ابواب المصائب'' کو تصنیف ہو کر تقریباً (180) سال کا عرصہ ہو چکا ہے اور اس کو مطبع یوسفی سے شائع ہو کر بھی کم از کم سو سال ہو چکے ہیں اور اس ایک سو اسّی سال کی مدت میں درجنوں عمدہ تحقیقی نثری کتابیں اُردو نثر کے ارتقاء پر لکھی گئیں لیکن اکثر کتابوں میں اس کا تذکرہ و تجزیہ تو دور کی بات ٹھہری اس کا نام تک نظر نہیں آتا۔ اُردو نثر کی تاریخ اور اس کے ارتقاء کی چشم دید گواہ صرف چند تصانیف اور تالیفات ہیں، جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ چناں چہ ایسے نثری قحط الکتاب کے دور میں اس عمدہ نثری تصنیف سے چشم پوشی، شریعت ادب میں گناہ نہیں تو اور کیا ہو سکتی ہے جب کہ اغلب دیگر تصانیف اور تذکروں میں کئی ضعیف اور مجہول کتابوں کے ذکر سے درجنوں اوراق

سیاہ کیے گئے ہیں۔ یہ بھی تعجب کا مقام ہے کہ میرزا دبیر کی پہلی سوانح "شمس الضحیٰ" جو فارسی میں ہے (اور جس کا ترجمہ راقم نے تقریباً تکمیل کرلیا ہے) اس کتاب کے ذکر سے یہ خالی ہے۔"

اب آیئے نہایت اختصار کے ساتھ ان مستند حضرات کا ذکر کریں جنھوں نے "ابواب المصائب" کے ضمن میں اپنی معلومات اور آراء پیش کی ہیں:

(۱) افضل حسین ثابت، تلمیذ دبیر اپنی کتاب "حیات دبیر" میں لکھتے ہیں:

"ایک اُردو نثر کی کتاب مصائب میں، مطبع یوسفی میں چھپی ہے جس کا نام "ابواب المصائب" ہے۔ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ سے بر سبیل تذکرہ معلوم ہوا کہ اس کا اصل مسودہ مرزا صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ میرے کرم فرما سید صغیر حسین صاحب شمس، مالک مطبع یوسفی دہلی و منیجر اخبار "اثنا عشری" دہلی کی شعاع توجہ و مہربانی سے یہ کتاب مجھے پہنچی۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم اودھ کے عہد میں یہ کتاب مرزا صاحب نے کہی۔ حضرت یوسفؑ کے واقعات جا بجا لکھ کر حالات امام حسینؑ کا پیوند لگایا ہے۔ باوصف کہ اب سے اسّی (80)، پچاسی (85) سال پہلے کی تصنیف ہے مگر زبان سلیس ہے۔ عبارت میں اس زمانہ کی روش کے موافق فارسی و عربی کے الفاظ بہت ہیں مگر عبارت کو خواہ مخواہ مقفّٰی نہیں بنایا ہے اس لیے دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔"

(۲) ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری کا بیان:

"راقم الحروف کو دبیر کی ایک نثری تصنیف موسوم بہ "ابواب المصائب" دستیاب ہوئی۔ یہ کتاب نایاب ہے اور اب عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ "ابواب المصائب" مرزا دبیر نے عین عالم جوانی میں بعمر ۲۷ سال ۱۲۴۵ ہجری میں تصنیف فرمائی۔ "ابواب المصائب" رجب علی بیگ سُرور متوفی ۱۲۸۴ ہجری کے "فسانۂ عجائب" (سال تصنیف ۱۲۴۰ ہجری) کے بعد دبستان لکھنؤ کی دوسری نثری تصنیف ہے۔ اس کی زبان سادہ اور سہل ہے اور

اس میں ''فسانۂ عجائب'' جیسی پُرتصنع، مقفّی اور مسجع عبارت نہیں ہے۔[۵]''

(۳) ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کی رائے:

''دبیر نے اُردو نثر میں ایک مستقل تصنیف ''ابواب المصائب'' یادگار چھوڑی ہے، جو کئی اعتبار سے اُردو نثر کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے اور لکھنؤ کے نثری دبستان کے مطالعہ میں ناگزیر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زیرِ نظر کتاب اُردو نثری کے محققوں اور ناقدوں کی نظروں سے اوجھل تھی کیوں کہ اُردو نثر کی تاریخ کے اولیں دور کے بیان میں ''ابواب المصائب'' کا ذکر نہیں ملتا۔[۶]''

(۴) صاحب دبستان دبیر، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مرحوم رقم طراز ہیں:

''مرزا صاحب نے اس کتاب کی تاریخ بھی خود ہی نکالی تھی۔

ع ''مصحف طاق چشم اہل عزا ست'' (۱۲۴۵ ہجری)۔ یہ کتاب (178) صفحات پر شائع ہوئی تھی اور اُردو نثر کی ابتدائی کتابوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب ذاکری کے اس طریقے سے تعلق رکھتی ہے جسے ''نثر خوانی'' کہتے ہیں۔ نثر خوانی کے دستور کے مطابق جگہ جگہ اشعار بھی چسپاں کیے گئے ہیں۔[۷]''

''ابواب المصائب'' کی متنی تنقید

جناب مرزا سلامت علی دبیر، باعث تالیف اور سبب تصنیف ''باب المصائب'' کا حسب ذیل الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

''بتائید غیبی اور بالہام لاریبی بندۂ حقیر، کثیر التقصیر اعنی دبیر کا یہ عزم بالجزم ہوا کہ ترجمہ سورۂ یوسف: ۴، کا مشتمل بمصائب جناب سید الشہدا الیہ التحیۃ والثنا بطریق تازہ اور بہ حسن بے اندازہ از روئے تفاسیر معتبرہ اور احادیث معتمدہ کے تعزیہ داران جناب! ابا عبداللہ الحسین علیہ السلام کے مطالعہ کے واسطے زبان اُردو معلّٰی میں کرے۔

نظم

حق تعالیٰ سے مجھ کو ہے امید
یہ کتاب عزا رہے جاوید
روئیں پڑھ پڑھ کے اس کو تعزیہ دار
کریں فقروں پہ دُرِ اشک نثار
آفریں شاہ خوش نہاد کریں
ہر ورق پر حسینؑ صاد کریں

برادران مومنین و شیعان ائمہ معصومین علیہم السلام پر واضح ہو کہ بنای تالیف اس کتاب ''ابواب المصائب'' کی مقرر کی گئی کیفیت نزول سورۂ یوسف علیہ السلام پر اور مطابقت مصائب یوسفؑ آل عبا اعنی جناب سید الشہداء علیہ التحیۃ الثناء و اہلبیت رسول خداؐ پر اور مصائب حسینؑ ابن علی علیہ السلام چناں چہ تمام کیفیت سورہ مسطور (لکھا گیا) مشتمل کی گئی شش باب میں۔''

اس مقام پر میرا مقصد اصلی یہ نہیں کہ حضرت دبیرؔ کے ترتیب دادہ جملہ ابواب و فصول کا تفصیلی ذکر کروں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ قرآن کریم میں موجود سورۂ یوسفؑ کے حوالے سے واقعات کربلا پر روشنی ڈالنا کوئی نئی بات نہیں۔ ملا حسین واعظ کاشفی نے اپنی مشہور زمانہ نثری تصنیف ''روضۃ الشہداء'' ہرات کے ایک شہزادے سید مرزا کی فرمائش پر ۹۰۸ ہجری میں تخلیق کی تھی۔ اس کتاب کے پہلے باب میں تفصیل کے ساتھ سورۂ یوسفؑ کے نزول اور حضرت یوسفؑ کے قصہ کو بیان کیا گیا ہے، لیکن بقیہ ۹/ابواب میں یہ ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے برعکس ''ابواب المصائب'' کے تمام چھ حصوں میں حضرت یوسفؑ کے واقعہ کو بیان کر کے واقعاتی مناظرہ کیا گیا ہے۔ ایک اہم بات یہ کہ باوجودیکہ مرزا صاحب کثیر المطالعہ تھے، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ ''ابواب المصائب''، ''روضۃ الشہداء'' کا ترجمہ یا تفسیر ہے۔

بعینہٖ فضل علی فضل کی ''کربل کتھا'' (سال تصنیف ۱۱۴۵ہجری) بھی مرزا صاحب

کے پیش نظر رہی ہوگی، مگر ہم زبان و بیان اور مواد و ترتیب کسی بھی لحاظ سے ''ابواب المصائب'' کو خدانخواستہ ''کربل کتھا'' کا چربہ یا مثنیٰ نہیں کہہ سکتے۔ ''کربل کتھا'' اور ''روضۃ الشہداء'' نے ایران کے مذہبی شعرا محتشم کاشی اور مقبل کے اشعار سے استفادہ کیا ہے جب کہ مرزا صاحب نے ''ابواب المصائب'' میں تقریباً پانچ سو سے زیادہ خود اپنے کہے ہوئے اشعار استعمال کیے ہیں۔

''کربل کتھا''، ''روضۃ الشہداء'' اور ''باب المصائب'' میں چند مطالب مشترک ہیں۔

1. ان سب کا موضوع شہدائے کربلا کے واقعات کا بیان ہے۔
2. تینوں میں کم و بیش حضرت یوسف کا تذکرہ اور ربط مصائب کربلا ہے۔
3. تینوں کتابوں میں آیات قرآنی، احادیث نبویؐ اور تاریخی روایات کا بیان ہے۔
4. نثر کے ساتھ نظم بھی شامل ہے ''کربل کتھا'' اور ''روضۃ الشہداء'' میں ''ابواب المصائب'' کے برخلاف نظموں میں طوالت پائی جاتی ہے۔
5. ''ابواب المصائب'' میں معتبر روایات زیادہ نہیں جب کہ ''کربل کتھا'' اور ''روضۃ الشہداء'' میں ضعیف روایات اور واقعات بھی شامل ہیں۔

آخر کلام میں بطور نمونہ ہم ''ابواب المصائب'' کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام اس مقدس مجموعہ مجالس کے دلکش اسلوب تحریر اور مرزا دبیر کے عالمانہ انداز نگارش سے کسی قدر آشنا ہو جائیں:

> ''راویان اخبار بیان کرتے ہیں کہ یعقوبؑ کے بارہ فرزند تھے۔ الّا یوسفؑ کو سب فرزندوں میں زیادہ دوست رکھتے تھے اور نظر شفقت و تربیت ہمیشہ اس کے حال پر تھی اسی جہت سے زنگ حسد آئینہ دل برادران یوسفؑ پر رنگ پذیر ہوا ناگاہ ایک روز جبرئیل امین بہ فرمان رب العالمین بہشت بریں سے عصائے زبرجد سبز یا نقرہ سپید لائے۔ کہتے ہیں کہ وہ عصائے دوحہ تھا شجرۂ طوبیٰ سے خوشبوتر مشک از تر سے اس عصا کو یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کو دیا۔ برادران یوسفؑ کو زیدہ تر حسد ہوا اور ایک سبب رشک یہ تھا کہ حضرت یعقوبؑ نے ایک پیراہن کہ حضرت

خلیلؑ سے میراث میں پہنچا تھا اور وہ پیراہن وہ تھا کہ حق تعالیٰ نے جامہ غیب سے خلیل کو درمیان آتش عنایت فرمایا تھا کہ بہ سبب اس پیراہن کے شعلۂ آتش غنچہ وگل ہو گئے تھے وہ پیراہن بھی حضرت یعقوبؑ نے یوسفؑ کو عنایت کیا اور سر اس شہریار خوبی کا عمامہ خلیلؑ سے آراستہ کیا۔ جب حضرت یوسفؑ نے اس لباس کو پہنا ایک روز اپنے باپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ یا ابتاہ! اس شب کو میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آفتاب و مہتاب اور گیارہ ستارے اُترے اور مجھے سجدہ کیا۔ یعقوبؑ نے فرمایا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ تمہیں نبوت اور سلطنت ہوگی۔ جب حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے یہ سنا نہایت رنج ہوا اور باہم مشورہ کیا کہ یوسفؑ کو کسی تدبیر سے جدا کیجئے اور مطابق من حفر سراً کے عمل کیا اور اعدائے نافرجام!! کوفہ و شام نے اس سے زیادہ امام حسینؑ پر جفا کی باوجود اس کے کہ جناب رسولؐ خدا نے وقت انتقال امت سے سفارش اہلبیتؑ کی تھی اور فرمایا تھا۔

هٰذا کتابِ اللهِ و اهل بیتی لَا یفرق منها حتیٰ یَرِدَ اِلیٰ الحوض۔

(یعنی یہ کتاب اللہ کی اور یہ ہیں اہل بیت میرے اور نہ ہوں گے یہ جدا یہاں تک کہ پہنچیں گے میرے پاس حوض پر)

قرآن سے نگہباں مری عترت سے خبردار
ہے ان کی اطاعت سبب رحمت غفار

•••

عرفان الٰہی کی نشانی ہیں یہ دونوں
باہم صفت لفظ و معانی ہیں یہ دونوں

•••

پرزے مرا دل ہوگا جو قرآن کو مٹایا
تڑپے گی مری روح جو عترت کو ستایا

ہیں آلِ نبی کون، سنو دل سے یہ تقریر
زہراؑ ہے، ید اللہ ہے اور شبرؑ و شبیرؑ

•••

واللہ جو ان پر کوئی بیداد کرے گا
خالق سے نبیؐ حشر میں فریاد کرے گا

مختصر یہ کہ حضرت میرزا دبیرؔ کا یہ نثری شاہکار ''ابواب المصائب'' اہل ذوق و عقیدہ سے خصوصی التفات و توجہ کا طالب ہے۔ شرط اس کے لیے ہے تشنہ کافی!

حواشی:۔

۱ ''خاتمہ ابواب المصائب''، ص:168
۲ یہ مکمل قطعہ مرزا دبیرؔ کی کتاب ''مصحف فارسی'' مرتبہ ڈاکٹر سید تقی عابدی میں موجود ہے۔
۳ ''ابواب المصائب'' (مرزا دبیرؔ کا زندگی نامہ)، ص:27
۴ ''ابواب المصائب''، ص:47
۵ ''ابواب المصائب''، ص:11
۶ ''ابواب المصائب''، ص:35
۷ ''افضل حسین ثابت: حیات دبیرؔ''
۸ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری ''شاعر اعظم مرزا اسلامت علی دبیرؔ اور باقیات دبیرؔ''
۹ ڈاکٹر محمد زماں آزردہ ''مرزا اسلام علی دبیرؔ''
۱۰ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ''پیام عمل: دبیر نمبر'' (1977ء) ''اُردو ادب کی توسیع میں دبیر کا حصہ''
۱۱ ''ابواب المصائب'' (مصنفہ مرزا دبیرؔ)، مرتبہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی، ص:52-51

مجتہدِ نظم مرزا دبیر

اُردو ادب کی تاریخ میں تمام مرثیہ گو شاعرات میں روپ کماری کا نام سرِ فہرست ہے۔ ایک غیر مسلم خاتون ہونے کے باوجود سیرت رسولؐ، کردار علیؑ، عصمت فاطمہؑ اور قربانی حسینؑ سے وہ بے حد متاثر تھیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع انہی ذواتِ مقدمہ کو بنایا۔ روپ نے قرآن مجید کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ (روپ کا انتقال 1938ء سے قبل ہو چکا تھا) ان کا شجرۂ تلمذ میر انیس سے جا ملتا ہے۔ رثائی ادب میں روپ کا مقام بہت اہم ہے۔ ان کے حالات اور کلام پردۂ خفا میں تھے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے دیارِ غیر (کینیڈا) میں رہ کر روپ کماری کے حالات اور کلام کو یکجا کر کے ایک ضخیم تحقیقی کتاب "روپ کنوار کماری" (مطبوعہ پاکستان) تصنیف کر کے اُردو شاعری خصوصاً رثائی ادب پر احسان کیا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی اب تک گیارہ کتابیں اُردو حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں جن میں "اقبال کے عرفانی زاویے" (2001ء)، "انشاء اللہ خان انشاء" (2001ء)، "تجزیہ یادگارِ انیس" (2002ء) اور "سلکِ سلامِ دبیر" (2004ء) قابل ذکر ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب "مجتہدِ نظم مرزا دبیر" شناسی میں ایک اہم اضافہ کا درجہ رکھتی ہے۔ انیس پرستی نے ایک عرصے تک دبیر کو دھندلکوں میں گم رکھا۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ شخصی عقیدت مندی کا غلغلہ ختم ہوا اور ادبی قدر و قیمت کے تعین کا عمل شروع ہوا۔ اس طرح اُردو کی فراموش کردہ ادبی شخصیتوں کے ادبی مرتبے کو متعین کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ یگانہ کا ادبی مقام متعین کیا گیا۔ دبیر کے متعلق غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا ازالہ ہوا اور ان کے فنی اور ادبی کمالات نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ ڈاکٹر محمد زماں آزردہ، ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر

اکبر حیدری، ڈاکٹر کاظم علی خان اور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے دبیرؔ کے سلسلے میں جو کاوشیں کیں وہ لائق ستائش ہیں۔

پیشِ نظر کتاب میں شجرۂ مرزا دبیرؔ کے علاوہ پابندیٔ وقت، آدابِ محفل، اخلاق و کردار، قناعت، خودداری، طریقۂ اصلاح اور دبیرؔ کے حالاتِ زندگی کو ڈاکٹر تقی عابدی نے بڑے اہتمام سے قلم بند کیا ہے۔ دبیرؔ نے شعر گوئی کا آغاز غزل سے کیا تھا۔ سوانحی حوالوں پتا چلتا ہے کہ انھوں نے غزل کے تین دیوان مکمل کر لیے تھے۔ اس دیوان میں کچھ غزلیں بھی شامل ہیں۔ محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں دبیرؔ کے مرثیوں کی تعداد کم از کم تین ہزار بتائی ہے۔ دبیرؔ کے محققین نے مطبوعہ مراثی کی تعداد 388 بتائی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر تقی عابدی کی حالیہ تحقیق کی روشنی میں مطبوعہ مراثی کی تعداد 390 اور غیر مطبوعہ مراثی کی تعداد 285 اور کل موجود مراثیٔ دبیرؔ کی تعداد 675 اور سلاموں کی تعداد 133 ہے۔ مرزا دبیرؔ نے اُردو میں سب سے زیادہ غیر منقوط اشعار کہے ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد 557 اور غیر منقوط رباعیات کی مجموعی تعداد 1332 ہے۔ ''مقامِ دبیرؔ مشاہیرِ سخن و ادب کی نظر میں'' کے تحت فاضل محقق نے غالبؔ، ناسخؔ، آتشؔ، انیسؔ، میر ضمیرؔ، رجب علی بیگ سرورؔ، واجد علی شاہ، محمد حسین آزادؔ، شبلی نعمانی، شادؔ عظیم آبادی، میر مینائی، گارساں دتاسی اور گوپی چند نارنگ کے علاوہ دیگر اکابرینِ ادب کی گرانقدر آراء شاملِ کتاب کر دی ہیں۔ کتاب کے آخر میں انتخابِ کلام بھی شامل ہے۔ تشبیہات و استعارات کی ندرت، نادر پیکروں کی تلاش اور زبان و بیان کی قادر الکلامی مرزا دبیرؔ کے شعری رویے کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ بعض ناقدین شرکتِ الفاظ کو دبیرؔ کی خامی قرار دیتے ہیں مگر انھوں نے نرم اور لطیف زبان کا بھی استعمال کیا ہے۔ دبیرؔ کے مرثیوں میں محاوروں کا برجستہ استعمال ہوا ہے۔ بلکہ انھوں نے محاوروں کو نئی معنویت عطا کی۔ جزئیات کے بیان کے معاملے میں دبیرؔ کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز ہے۔ صنائع و بدائع کا گہرا تعلق بلاغت سے ہے۔ اس کی پیش کشی دبیرؔ کے مراثی میں خوب صورت انداز میں ہوئی ہے۔ میدانِ کربلا کی منظر کشی میں مرزا دبیرؔ مختلف صنائع و بدائع مثلاً مبالغہ، مراۃ النظیر، حسنِ تعلیل، تضاد، لف و نشر کے کام لیتے ہیں۔ صنعتِ تضاد کے وافر نمونے دبیرؔ کے کلام میں ملتے ہیں۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔

یہ سن کے پیٹتی ہوئی دوڑی وہ یک بیک
لاشے پہ یوں گری کہ لرزنے لگے فلک

•••

کچھ پاس تھا نہ صدقے کو روئی بلک بلک
ماتھے سے سَر ملا کے اُتارا قدم تلک

•••

اکبرؔ نے غش میں پوچھا یہ کون اے امام ہے
بانوؔ پکاری، کوکھ جلی جس کا نام ہے

ڈاکٹر تقی عابدی میدان طب کے ساتھ میدانِ تحقیق کے بھی شہسوار ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی سائنسی فکر اور سائنسی طریقۂ استدلال کو تحقیق کے شعبے میں بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ رثائی ادب کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ خوب صورت گیٹ اپ، عمدہ طباعت اور نفیس کاغذ پر 190 صفحات کی اس مجلد کتاب کی قیمت 195 روپے ہے جسے چغتائی پبلشرز، اُردو بازار، لاہور سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

توصیف احمد ڈار
شعبۂ اُردو، کشمیر یونیورسٹی

''عروسِ سخن'' کے خصوصی حوالے سے

سید تقی عابدی کی تحقیقی وتنقیدی خدمات ''عروسِ سخن'' کے خصوصی حوالے سے انسانی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اور انسانی زندگی کے تقاضے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ ہر دور اور ہر زمانہ اپنی ایک الگ اور منفرد منطق کا حامل ہوتا ہے۔ یہی منطق اس مخصوص عہد کے غالب رجحان کے طور پر سامنے آکر ہر ایک شعبۂ زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ دیگر شعبہ ہائے زندگی کو ایک طرف چھوڑ کر اگر ہم ادبی دُنیا، بالخصوص اُردو کی ادبی روایت کی بات کریں تو یہاں بھی تغیر وتبدل کا یہ عمل ہر دور میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اُردو میں تحقیق وتنقید کے ابتدائی نقوش تذکروں میں دیکھے جاتے ہیں۔ تذکرہ نگار اپنی بساط کے مطابق شعراء وادباء کے حالات وواقعات اور ان کے کلام پر اپنی تنقیدی رائے ظاہر کرتا تھا۔ یہ تذکرہ نگار باقاعدہ طور پر کسی تحقیقی وتنقیدی ضوابط کے پابند نہیں تھے بلکہ آزادنہ طور پر اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتے تھے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان تذکروں اور تذکرہ نگاروں کی اس آزادروی کو کئی بڑے بڑے نقاد اور محققینِ ادب نے ہدفِ تنقید بنایا ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ نمایاں معنویت کی حامل ہے کہ یہ تذکرے اُردو تحقیق وتنقید کی راہ ہموار کرنے میں اپنا ناقابلِ فراموش کردار رکھتے ہیں۔ کئی صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد آج اُردو ادب میں تحقیق وتنقید ایک کامل اور باقاعدہ ڈسکورس کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ایک محقق ونقاد آج اپنی ایک نمایاں اور معتبر شناخت رکھتا ہے۔ جدید سے جدید تر ذرائع اور وسائل کے سہارے آج تحقیق وتنقید ترقی کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے اور ادبی دُنیا یہ تسلیم کر چکی ہے کہ تحقیق وتنقید، تخلیقی ادب کے لیے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی زندہ رہنے کے لیے سانس۔ ترقی کے اس تیز

رفتار دور میں نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی بہت سارے نام ایسے ہیں جو اُردو تحقیق وتنقید کے میدان میں سرگرمِ عمل ہوکر نہایت عرق ریزی سے اُردو زبان وادب کی آبیاری کرتے ہیں۔ جن کی لازوال ادبی خدمات معاصر ادبی روایت کا ایک وقیع اور ناقابلِ فراموش سرمائے کا اعتبار رکھتی ہیں۔ ان ہی غیر معمولی اور مستند علمی و ادبی شخصیات میں ایک اہم نام ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شمار اُردو دُنیا کے سرِ فہرست قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ آپ بیک وقت کئی ایک زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ آپ کا مطالعہ ومشاہدہ کافی گہرا اور وسیع ہے۔ آپ نے اُردو اور فارسی کی کلاسیکی ادبی روایت کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں کے اعلیٰ تخلیق کاروں سے متعلق جو تحقیقی وتنقیدی نگارشات اپنی یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں وہ اُن کی عالمیت، سنجیدگی اور فکری وفنی بالیدگی پر دلالت کرتی ہیں۔ آپ کی جو تحقیقی وتنقیدی نگارشات اب تک شائع ہوکر ادبی دُنیا میں مناسب داد وتحسین وصول کرچکی ہیں ان میں ''فیض شناسی''، ''دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ''، ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' [جلد اوّل و دوم]، ''تجزیہ یادگارِ مرثیہ''، ''کائناتِ نجم'' [جلد اوّل و دوم]، ''مثنویاتِ دبیرؔ''، ''تاثیرِ ماتم''، ''عروسِ سخن''، ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے''، ''رموزِ شاعری''، ''انشاء اللہ خان انشاءؔ'' ''رباعیاتِ دبیرؔ'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان تخلیقات کے علاوہ ان کے متنوع تحقیقی وتنقیدی نوعیت کے مقالات اور مضامین ملک وبیرون ملک کے معیاری ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں، جن کے مطالعے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ آپ جس کسی بھی موضوع سے متعلق قلم اُٹھاتے ہیں اس کا بھرپور حق ادا کرتے ہیں۔ آپ کا اسلوب بیان اور اندازِ پیش کش قدرے دلکش اور متاثر کن ہیں۔ عام طور پر سہل وآسان زبان کا ہی استعمال کرتے ہیں جس سے آپ کی تحریریں قابلِ فہم اور متاثر کن ثابت ہوتی ہیں۔ اس مضمون میں، جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے، تقی عابدی صاحب کی تحقیق وتنقید نگاری سے متعلق ''عروسِ سخن'' کے حوالے سے مختصراً روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ تحقیقی وتنقیدی تصنیف چوں کہ کم وبیش پچپن مقالات پر مشتمل ہے اس لیے طوالت کے خوف کو ملحوظ رکھتے ہوئے محض چند منتخبہ مقالات کو ہی زیرِ بحث لایا جائے گا۔ شعروادب کی دُنیا میں امیر خسروؔ کا نام

محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ ایک جید عالم، بے بدل شاعراور باکمال ادیب گزرے ہیں۔
آپ بیک وقت اُردو، عربی، فارسی اور سنسکرت وغیرہ زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ امیر خسرؔو کی حیات وشخصیت اور علمی وادبی کارناموں کے حوالے سے محققین و ناقدینِ ادب نے ہر دور میں بعض اہم اور مخفی گوشوں کو اُجاگر کرنے کی کامیاب سعی کی ہے، جو آج بھی جاری وساری ہے۔ ''عروسِ سخن'' میں شاملِ اشاعت اوّلین تحقیقی مقالہ بعنوان ''امیر خسرو دہلوی'' بھی اسی تحقیقی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں مقالہ نگار نے تحقیق کے اصول وضوابط کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے موصوف کی پیدائش، خاندانی حسب ونسب، سلاطین سے وابستگی، القاب وخطابات، وفات اور ادبی تخلیقات وغیرہ جیسے ناگزیر پہلوؤں کو مفصل ومدلل انداز میں زیرِ بحث لایا ہے۔ یوں یہ تحقیقی مقالہ خسرؔو شناسی کے میدان میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُردو کی منظوم اصناف میں نعت نگاری ایک باقاعدہ اور مقبول صنفِ سخن کے طور پر اپنا مقام حاصل کر چکی ہے۔ نعتیہ کلام میں نعت نگار سرورِ کائنات کی تعریف وتحسین، جمال وکمال، عظمت وفضیلت اور کمالات ومعجزات وغیرہ جیسے اوصاف کو نہایت عجز وانکساری کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ عربی وفارسی کے ساتھ ساتھ اُردو کی شعری روایت کے بغائر مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو ادب سے وابستہ بیشتر شعراء نے بھی حضورؐ کے فضائل وشمائل، دیارِ محمدؐ کے دیدار اور آپؐ کے سراپا کو نظم کرنے میں کمال فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے اور اس زمین میں بڑی رنگین گل کاریاں کی ہیں۔ نعت نگاری کے علاوہ دوسری اصنافِ شعر میں بھی شاعروں نے احترام وعقیدت کے طور پر ایسے بے شمار اشعار تخلیق کیے ہیں جن سے نبی اکرمؐ کی فضیلت وعظمت کے دریا ٹپکتے نظر آتے ہیں۔ ''فضائل وشمائل محمدؐ: اُردو اشعار کے آئینے میں'' کے عنوان سے کتاب میں شامل مقالے میں مصنف نے نمائندہ اُردو شعرا کے یہاں اس نوع کے موضوعات کی نشاندہی کر کے تحقیق کا ایک نیا در وا کیا ہے۔ اس مقالے کی اہمیت ومعنویت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ محقق نے چار سو سال کی اُردو شعری روایت کو کھنگال کر تمام بڑے شعراء کے کلام سے ایسے اشعار کو سامنے لایا ہے، جو اس نوع کے موضوعات کو محیط ہیں۔ ان میں صنعتؔی، ولؔی دکنی، یزدانؔی، حسؔن بریلوی، دبیرؔ،

ناسخ، اکبر میرٹھی، میر حسن حالی، حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد، جوش وغیرہ جیسے مسلم وغیر مسلم شعراء شامل ہیں۔ چند ایک اشعار مثال کے لیے پیش کیے جاتے ہیں ؎

خداوندِ دو عالم، ہے تیرا مدّاح، قرآن میں
تری تعریف لکھنے کی، کہاں طاقت ہے انسان میں (یزدانی)

•••

نبی کریمؐ، شفیع امینؐ
رسول خدا رحمت العالمینؐ (صنعتی)

•••

ورفعنا لک ذکرک پر تصدیق
سب اونچوں سے اونچی ہے، شوکت تری (حسن بریلوی)

اس مقالے میں محقق نے نعتیہ کلام کے تقاضے، عقیدت واحترام کا پاس ولحاظ، شریعت کے حدود وغیرہ جیسے نازک پہلوؤں سے متعلق بھی روشنی ڈالی ہے جو مقالے کی اہمیت اور مصنف کے تحقیقی وتنقیدی استدلال کو مزید تقویت عطا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ اُردو کی شعری روایت میں ایک زندہ جاوداں نام ہیں۔ آپ کا تمام کلام عالمِ انسانیت بالخصوص امتِ مسلمہ کی فکری تعمیر کے حوالے سے ایک بے لوث کارنامہ ہے۔ آپ نے اپنے کلام (خواہ وہ فارسی ہو کہ اُردو) کے ذریعے تاریخ وتعلیماتِ اسلام، پیغمبرانِ اسلام کی جاہ وحشمت اور اصحابِ رسولؐ کی عظمت وفضیلت کو آشکار کر کے امتِ مسلمہ کو غفلت شعاری سے بیدار کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ حضرت علیؓ کی مدح میں کلامِ اقبال میں جو کئی ایک نظمیں اور مناجات موجود ہیں انھیں یکجا کر کے مصنفِ کتاب نے ''اقبال اور عشق علیؓ'' کے عنوان کے تحت ایک تحقیقی مقالے کی صورت عطا کی ہے۔ اس مقالے میں علامہ کی جن اُردو وفارسی نظموں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اُن میں طلوعِ اسلام، اسرار رموز خودی، جاوید نامہ، میں اور تو وغیرہ شامل ہیں۔ موصوف نے اپنے منفرد تحقیقی وتنقیدی زاویہ نگاہ کو بروئے کار لا کر مذکورہ بالا نظموں کے نمائندہ اشعار کے حوالے سے اقبال کی حضرت علیؓ سے والہانہ عقیدت اور عشق واحترام کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ دراصل مصنف قارئین کو یہ باور

کرانا چاہتے ہیں کہ علامہ نے کس طرح ایک جامع اور انوکھے اسلوب میں حضرت علیؓ کے متعدد نام، کنیات، خطبات، القاب اور فضیلتوں وغیرہ کی تشریح کر کے ملتِ اسلامیہ کو دعوتِ فکر دی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر پیش کیا جاتا ہے ؎

کہ ہر دانائے رموزِ زندگی ہست

ہر اسمائے علی داند کہ چیست

(یعنی یہ کہ اس شخص نے زندگی کے تمام رازوں کو پہچان لیا ہے جس نے حضرت علیؓ کے ناموں کے اسباب اور رازوں کو جان لیا)

''پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے'' کے تحت کتاب میں جو مقالہ شاملِ اشاعت ہے اس میں اُردو و فارسی زبان کے بلند قامت شاعر ''مرزا اسداللہ خان غالبؔ'' کی شخصیت کے بعض اہم اور دلچسپ گوشوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ غالبؔ کی پیدائش سے لے کر تادم آخر تک کے ایسے واقعات کو اس تحقیقی مقالے کی زینت بنایا گیا ہے جن سے ادبی دُنیا آج تک نابلد ہی تھی۔ خصوصاً غالب کی منفرد شخصیت کے حوالے سے جو نکات اُبھارے گئے ہیں وہ موصوف کی تحقیقی صلاحیتوں اور بصارتوں کا بین ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مذکورہ مقالہ غالبؔ فہمی کے سلسلے میں ایک کارآمد اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالبؔ کی حیات کے مطالعے اور مشاہدے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ایک الگ اور منفرد وضع قطع رکھتے تھے۔ آپ کا مزاج، اندازِ گفتار، عادات و اطوار، لباس، رہن سہن یہاں تک کہ تخلیقی و تنقیدی فکر و اسلوب بھی اپنے معاصر رفقاء سے قدرے مختلف ڈکشن کو محیط رہے ہیں۔ خودداری و خود پسندی کی خداداد صلاحیتیں آپ کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کی جیتی جاگتی جھلکیاں آپ کے منشور و منظوم کلام میں جگہ جگہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ غالبؔ کی خودداری اور انفرادی ذہنیت کو پیش کرتے ہوئے سید تقی عابدی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

''اُردو ادب کے چار عظیم شعراء میں میر تقی میر، میر انیس اور علامہ اقبالؒ نے اپنے اپنے دور میں اپنا استاد بنایا اور اپنے ابتدائی دور میں ان سے فیض حاصل کیا۔ لیکن مرزا غالبؔ وہ تنہا شاعر ہیں، جنھوں نے بھی شاگرد

کی حیثیت سے، کسی کے سامنے اپنا زانو خم نہیں کیا۔ علماء ادب اور محققین ادب نے اشارات کیے ہیں کہ مرزا غالب بعض اوقات علوم عروض و قواعد و نحو میں مصطفیٰ خان شیفتہ سے مشاورت کرتے تھے، لیکن بہر حال، کسی کے بھی شاگرد نہ رہے۔''

موصوف کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا قابلِ ذکر نمونہ کتاب میں شامل مقالہ ''دیوانِ حافظؔ کے تراجم'' ہے۔ اس مقالے کے اصل موضوع سے قبل مصنف نے ایک نہایت ہی اہم اور غور طلب مسئلے کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے کہ ''کیا دیوانِ حافظ کے ترجموں کی ضرورت ہے؟'' اور آسان و مفصل انداز میں اس دیوان کے ترجمے اور ان سے مستفید ہونے کی اشد ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ نیز ترجمے کے اسرار و رموز، اہمیت و ضرورت، مترجم کے فرائض، الفاظ محاورے اور اصطلاح سازی میں درپیش مسائل و معاملات اور ان کے معقول و موزوں حل وغیرہ کے حوالے سے بھی دلچسپ اور قابلِ مطالعہ بحث پیش کی گئی ہے۔ مثال کے لیے ایک مختصر سا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''ترجموں کی بدولت ایک تہذیب اپنے شاہکار کو دوسرے تمدن سے آشنا کراتی ہے، یعنی اگر چار سو سال قبل حافظ کے دیوان کا یورپ کی زبانوں میں ترجمہ نہ ہوتا تو آج مغربی دُنیا میں حافظؔ کا نام بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ کھلی حقیقت ہے اور ہم سب کا مشاہدہ بھی کہ امریکہ کے کسی محلّے کی لائبریری ایسی نہیں، جس میں حافظ کا کلام یا اس کے کلام پر پیام موجود نہ ہو۔''

اس مقالے میں میں محقق نے دُنیا کی مختلف زبانوں میں (جن میں عربی، ترکی، فارسی، فرنچ، جرمن، انگلش، لاٹن وغیرہ شامل ہیں) ''دیوانِ حافظؔ'' کے منظوم و منثور تراجم اور شرحوں کی نشاندہی کر کے ان کی مقبولیت و غیر مقبولیت کے اسباب و وجوہات کو مثالوں کے سہارے ثابت کیا ہے۔ یہ استدلالی موقف آپ کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں پر دال ہے۔

اُردو ادب کی شعری اصناف میں رباعی ایک مختصر مگر مقبول صنف کے بطور اپنی پہچان قائم کر چکی ہے۔ دیگر کئی شعری اصناف کی طرح یہ صنفِ سخن بھی اُردو میں فارسی ادب ہی کی دین ہے۔ اُردو ادب کے کم و بیش ہر بڑے شاعر نے اس صنف کو اپنے داخلی اور خارجی

جذبات واحساس کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ مذکورہ کتاب میں شامل مقالہ بعنوان ''رثائی رباعی: اُردو رباعی کا تاریخی، عروضی اور تحقیقی جائزہ'' میں مصنف نے اُردو رباعی کی ہیئتی و تکنیکی ترجیحات، موضوعاتی تنوع، عروضی قواعد اور اس کے عہد بہ عہد ارتقائی سفر کے ساتھ ساتھ اُردو رباعی کے ایک اہم فکری رجحان ''رثائی رباعیات'' کو مناسب تحقیقی وتنقیدی انداز میں سامنے لایا ہے۔ کئی ایک دستاویزی تخلیقات کی وساطت سے مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ صنفِ رباعی اصل میں ''ایرانیوں'' کی ایجاد ہے جو بعد میں فارسی سے عربی اور اُردو میں منتقل ہوئی۔ اصل موضوع کے تحت محمد قلی قطب شاہ، سید وجہی، سراج دکنی سے لے کر اکیسویں صدی کی ابتدائی دہائی تک کے نمائندہ شعراء کے یہاں موجود رثائی رباعیات کو صفحۂ قرطاس پر اُتار کر اُردو تحقیق وتنقیدی سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ کیا گیا ہے۔

''شاعروں کی قسمیں'' نامی کتاب میں شامل مقالہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا اور منفرد تحقیقی وتنقیدی کارنامہ ہے۔ اس نوع کے مقالات اُردو کے تحقیقی وتنقیدی سرمائے میں نہایت کم وقلیل تعداد میں نظر سے گزرتے ہیں۔ اُردو ادب بالخصوص اُردو شعر وشاعری سے شغف رکھنے والے اہل علم وقارئین کے لیے یہ مقالہ نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتا ہے، جو یقیناً مطالعے سے تعلق رکھتا ہے۔ مقالے کی ابتداء میں قلم کار نے، شعر کیا ہے؟ شاعر کسے کہتے ہیں؟ جیسے اہم مباحث سے متعلق خامہ فرسائی فرمائی ہے اور متنوع مستند تخلیقات و تالیفات سے اخذ واستفادہ حاصل کر کے ان سوالات کے معقول اور تسلی بخش جوابات پیش کیے ہیں۔ شعر کی تعریف اور اچھے شعر کی خصوصیات کے حوالے سے آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ یوں ہیں:

> ''شعر کے لغوی معنی دانائی اور طبع رسا سے معنی دریافت کرنا ہے، اور اصطلاح میں شعر ایسے سخن کو کہتے ہیں جو اوّل موزوں ہو، دوّم معنی رکھتا ہو، سوم قافیہ رکھتا ہو، چہارم شعر ایسا موزوں کلام ہے جسے کہنے والا شعر کے قصد وارادہ سے کہا ہو۔''

شعر وشاعر کی تعریف اور بنیادی خصوصیات سے متعلق تفصیلی گفتگو کے بعد مذکورہ مقالے میں شعراء کی ان گنت قسموں کو صفحۂ قرطاس پر اُتارا گیا ہے۔ پہلے عالمی ادب سے

وابستہ شعراء کی مختلف قسمیں بیان کی گئی ہیں اور پھر ''ادبِ مشرقیہ'' خصوصی طور پر اُردو ادب کے حوالے سے شعراء کی مزید تقسیم پیش کی گئی ہے۔ جن بنیادی پہلوؤں اور عناصر کو بنیاد بنا کر شعراء کی تقسیم عمل میں لائی گئی ہے ان میں زبان، منطقہ، جنسیت، عمر، موضوعات، اصناف، زماں، محل اور مکان، نئی ریاضت، مہارت اور مشق، علاقہ سرحدی، علم اور خیال، شعرا کا کلام، مذہبی اعتقادات، اندازِ بیان، عروض کے استعمال اور اجتناب وغیرہ شامل ہیں۔ عروض کے استعمال و اجتناب کے اعتبار سے موصوف شعرا کو درج ذیل تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں:

> ''شعرا کو عروض کے استعمال اور اجتناب کی نسبت سے عروضی شعراء اور خروجی شعراء کہہ سکتے ہیں۔ عروضی شعراء عموماً علمِ عروض و نحو کے تمام نکات کا لحاظ رکھتے ہیں اور عموماً ان بندشوں کی وجہ سے ان کے اشعار پھیکے ہوتے ہیں اور خروجی شعراء اپنے آپ کو مکمل ان بندشوں سے خارج رکھتے ہیں اور جو دل چاہیے کہتے ہیں اور اسے شاعری میں جائز سمجھتے ہیں۔ ان دونوں کناروں کے درمیان ''درمیانی'' شعراء ہوتے ہیں، جو عام طور سے عروض کا لحاظ کرتے ہوئے بھی قید نہیں ہوتے اور عموماً یہ گروہ کامیاب اور اکثریت کا حامل ہوتا ہے۔''

درج بالا مقالات کے علاوہ مذکورہ کتاب میں حضرت نظام الدین اوؔلیا اور امیر خسؔرو، لسان الغیب خواجہ حافظؔ شیرازی، غالبؔ سریر خامہ نوائے سروش ہے، علامہ اقبالؔ اور مہاراجہ کرشن پرشاد، میر تقی میرؔ کا رثائی کلام، واقعہ نگاری کا تاجدارِ سخن۔ میر انیسؔ اور کئی دوسرے مقالات بھی شاملِ اشاعت ہیں جو متفرق موضوعات کو محیط ہیں اور جن کے گہرے مطالعے اور مشاہدے سے ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کی تحقیقی، تاریخی اور تنقیدی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تمام مقالات کسی نہ کسی صورت اُردو کے تحقیقی، تنقیدی اور تاریخی روایت میں ایک نئے باب کی حیثیت رکھتے ہوئے بعض اہم فکری و فنی گوشوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر علی حیدر

اُردو تنقید اور ڈاکٹر تقی عابدی
(''عروسِ سخن'' کے حوالے سے)

عصر حاضر میں اُردو کی ادبی و علمی دُنیا کا ایک معروف اور نمایاں نام ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ہے جو بیک وقت ایک باریک بیں محقق، اعلیٰ مفکر، عمدہ شاعر، بلند پایہ مترجم، خوش بیان مقرر، ماہر تعلیم، ماہر طبیب (میڈیکل ڈاکٹر) اچھے نثر نگار اور معروف نقاد ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کی مدت اگرچہ قلیل ہے لیکن اس قلیل مدت میں انھوں نے علم و ادب کے مختلف میدانوں میں اپنی فہم و فراست کے روشن نشانات ثبت کیے ہیں۔ مگر ہمیں اپنے مطالعے کو زیر نظر کتاب ''عروسِ سخن'' کے حوالے سے گفتگو تک محدود رکھنا ہے یعنی ہمارا مطالعہ تقی عابدی کی تنقید کے دائرے میں ہی مرکوز ہے۔ حالاں کہ تقی عابدی نقاد سے پہلے محقق ہیں۔ ان کی تنقید میں تحقیق وہ بنیاد فراہم کرتی ہے جس پر تنقید کی عمارت کھڑی ہے جیسا کہ ڈاکٹر عبداللہ کہتے ہیں:

> ''کوئی سنجیدہ تنقید، تحقیق سے آنکھیں نہیں چرا سکتی، بلاشبہ تقی عابدی کی زیر نظر کتاب کے مشمولہ مضامین ان کے ایسے تنقیدی عمل ہیں جو تحقیق سے پُر ہیں اس لیے کہ تلاش و تحقیق تقی عابدی کے مزاج کا خاصہ ہے۔''

سید تقی عابدی یوپی کے ضلع امروہہ کی معروف بستی ''نوگاؤں سادات'' میں 1952ء کو تولد ہوئے۔ اس بستی میں ہوش کی آنکھ کھولتے ہی زبان الفاظ کی ادائیگی سیکھنا شروع کر دیتی ہے اور گھر و خاندان کی گفتگو کے ساتھ ہی زبان سے شناسائی ہونے لگتی ہے۔ عزاداری کی مجلسوں میں ذہنی تربیت ہونے لگتی ہے۔ یہ مجلسیں لسانی اظہار کی سب سے موثر درسگاہیں ہوتی ہیں۔ تقی عابدی نے بچپن ہی سے تقریریں شروع کر دیں اور شاعری

سے دلچسپی لینے لگے۔ شاعری کے ساتھ مضامین نویسی کا شوق بھی پیدا ہوا اور پندرہ سال کی عمر میں پہلا مضمون ''قطب شاہی گنبد'' کے نام سے روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد میں شائع ہوا۔ 1975ء کے دوران ایران جانے کا موقع ہاتھ آیا تو ایرانی ادب کے گہرے مطالعے کی جانب متوجہ ہوئے۔ فارسی اور اُردو ادب کی قدروں میں غرق ہوئے ایران کے مشہور عالم ''مطہری'' کی فارسی کتاب کا اُردو میں ترجمہ کیا جس کی بے حد پزیرائی ہوئی۔ اس کے بعد فارسی وانگریزی کتب کے کئی ترجموں نے تقی عابدی کو ادب کے تنقیدی اصولوں سے بھی آشنا ہونے کے مواقع فراہم کیے تو ان کے وسیع وعمیق مطالعے اور تجربے نے ذوق علم کو مہمیز کیا اور اُردو شعر وادب کی پرکھ کی طرف متوجہ ہوئے۔ زیر نظر کتاب ''عروس سخن'' ان کے ایسے ہی تنقیدی عمل کا نتیجہ ہے۔

بلاشبہ ایک تنقید نگار کا یہ منصب ہوتا ہے کہ فن پارے کے معائب ومحاسن تک پہنچنے کے لیے وہ فن پارے کو ہر زاویے سے دیکھے، ہر ممکن طریقے سے اس کی پوشیدہ باریکیوں تک رسائی حاصل کرے اور اپنے مقصد کی کامیابیوں کے لیے تلاش وجستجو کی ہر ممکن کوشش کرے۔ زیر نظر کتاب کے مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے ڈاکٹر تقی عابدی کے یہاں یہ عنصر غالب نظر آتا ہے اور ان کے ہر مضمون میں تحقیقی پہلو کی اہم کارکردگی ہے۔ اسی کی بنیاد پر وہ اپنی نکتہ سنجی اور سخن فہمی کو راہ دیتے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کی علمی تنقید کا نمونہ ہے جہاں انھوں نے اُردو شاعری کی تمام اہم اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی پر عبور حاصل کیا ہے۔ ادب کی تفہیم وتحسین کے ضمن میں ان کا نقطۂ نظر بھی علامہ شبلی کی طرح رومانی نظر آتا ہے۔ وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ شاعری ایک وہبی جذبہ ہے جسے شاعر بے اختیار ظاہر کرتا ہے۔

''عروس سخن'' ان کا پہلا تنقیدی مجموعہ ہے جو پہلی بار 2004ء میں لاہور، پاکستان سے شائع ہوا۔ جس میں 52 مضامین شامل ہیں اور جو 339 صفحات کو محیط ہے حرف چند کے عنوان سے محسن بھوپالی کا تبصرہ بھی شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''عروسِ سخن اپنے متنوع مضامین اور نئی فکری، تحقیقی اور تنقیدی حیات کے سبب اُردو تنقید میں اضافے کا حکم رکھتی ہے۔''

ڈاکٹر تقی عابدی اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"میں نے اس مجموعے میں ان مطالب پر روشنی ڈالی ہے جو اس دور کے سخن وروں اور سخن دانوں کے لیے باعث امتنان ثابت ہو سکتے ہیں۔"

یہ کتاب نئی صدی کے نمودار ہوتے ہی منصۂ شہود پر آئی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کتاب کے مشمولات پر بیسویں صدی کے اختتام کے اُردو ادب کے اثرات کا پرتو ہے۔

کتاب میں 52 مضامین ہیں جن کے عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی ایک وسیع المطالعہ ادیب، ناقد و محقق ہیں اُردو شعر و ادب کے ستونوں، ماہرین اور مشاہیر کا عابدی صاحب کا مطالعہ بہت ہی وسیع و عمیق ہے۔ امیر خسرؔو، حافظ شیراز، اقبالؔ، غالبؔ، انیسؔ، دبیرؔ کے فن پر بحثیں کی گئیں ہیں اور ان سب ہی مشاہیر کی فکر و فلسفہ اور کلام کے محاسن پر متعدد مضامین شامل ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہے کہ امیر خسرؔو، اقبالؔ، غالبؔ، انیسؔ، دبیرؔ کو کتنے پہلوؤں سے وہ مطالعہ کا موضوع بنا کر ان کے کلام کے ان گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں جہاں تک لوگوں کی نگاہیں نہیں پہنچتی تھیں۔ مثال کے طور پر علامہ اقبالؔ کو لے لیجیے۔ اقبالؔ اُردو کے وہ نامور اور خوش قسمت شاعر ہے جس پر بے حساب تحقیقی و تنقیدی اور تجزیاتی مطالعے ہوئے ہیں مگر ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبالؔ کے مطالعے میں جو نئے گوشے تلاش کیے ہیں وہ اس سے اقبالؔ کے مطالعے کے لیے ایک نئے ڈھنگ سے سوچنے کے مزید امکانات بیدار ہوں گے مثلاً اقبالؔ پر مقالے کے عنوانات ملاحظہ ہوں۔ اقبالؔ اور عشق علی، اقبالؔ عاشق امام حسین، علامہ اقبالؔ کی مثنوی (سورۂ اخلاص کا ترجمہ) علامہ اقبالؔ اور مہاراجہ کشن پرشاد، اقبالؔ کا تصور، زمان و مکان، علامہ اقبالؔ کی دعا، علامہ اقبالؔ کا شاہین، قصیدہ بردہ اور علامہ اقبالؔ، اقبالؔ کیسے علامہ سے سر ہو گئے۔ علامہ اقبالؔ اور حیدرآباد دکن اور معلم اقبال شمس العلماء میر حسن یعنی ایک درجن مضمون ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبالؔ شناسی، اقبالؔ فہمی، اقبالؔ کی اقبالیات پر لکھ کر اُردو کے بڑے سے بڑے ماہر اقبالیات کے لیے ایک بار پھر سے غور و فکر کرنے کے مواقع فراہم کر دیے اور اقبالؔ کی عظمت اور بلندی اور سربلندی عطا کی ہے۔

اسی طرح تقی عابدی نے امیر خسرؔو کی عظمت جس کا زمانہ قائل ہے اس کے

اعتراف میں ان پر کئی طرح سے مطالعہ پیش کر کے اپنی کتاب کو وقیع بنایا ہے یا غالبؔ اور انیسؔ و دبیرؔ پر بھی ان کی سیر حاصل گفتگو ان کی باریک بینی کا ثبوت ہے۔ تقی عابدی کے مضامین کے اس مجموعے ''عروسِ سخن'' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عابدی کو اُردو زبان وادب سے کس قدر محبت ہے کہ وہ ادب کے تو رسیہ ہیں ساتھ ہی اُردو ادب سے محبت کرنے والوں اور اُردو کو فروغ دینے والوں سے ان کو بے حد محبت ہے وہ زیر نظر کتاب میں ادب کے ایک باریک بین پارکھ کا رویہ پیش کرتے ہیں جہاں ان کا رویہ تشریحی وتوضیحی نظر آتا ہے اپنے وسیع مطالعہ کی بنا پر لسانی مباحث سے بھی کام لیتے ہیں۔ اپنے اس مجموعے کے توسط سے وہ اُردو تنقید میں اپنا مقام بناتے ہیں۔ ان کی اس تنقیدی کاوش کو ادبی دُنیا میں وقار کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

رباعیاتِ انیسؔ

اُردو میں مراثی اور مراثی نگاروں پر ایسا کچھ زیادہ نہ سہی قابل لحاظ تحقیقی کام ضرور ہوا ہے۔ تنقید نے بھی اس طرف توجہ کی ہے۔ مراثی کے متعلقہ موضوعات پر بھی لکھنے والوں نے خاصا لکھا ہے بلکہ مراثی کی ترتیب، تالیف اور تدوین بھی ہوتی رہی ہے۔ مراثی کی سماجی اور ادبی معنویت کو بھی اُجاگر کیا گیا۔ اب مرثیہ سے صرف مذہبی جذبات کی تسکین نہیں ہوتی اس کی سیاسی اور سماجی عصری معنویت بھی جلوہ دکھاتی ہے۔ شبلی نے ''موازنہ انیسؔ و دبیرؔ'' تحریر کر کے ایک وسیع تناظر سے متعارف کیا۔ مذہبی جذبات کا احترام کیا ہے اس کی آفاقی معنویت پر بھی روشنی ڈالی اس کی عصرے حسیت پر گفتگو کی۔ یوں مرثیہ کو ایک اہم صنف کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

شبیر کی مداحی میں انیسؔ کی پانچویں پشت رہی ہو، انیسؔ اور دبیرؔ متخالف محاذوں پر مرثیہ کا پرچم بلند کرتے رہے۔ انفرادی طور پر بھی ان دونوں کی خدمات ناقابل فراموش رہیں۔ مراثی اور مراثی نگاروں پر لکھنے والوں میں شبلی کو امتیاز اور اولیت حاصل ہے۔ پھر مسعود حسن رضوی ادیب، نیر مسعود، شبیہ الحسن سے ہوتا ہوا ڈاکٹر رشید موسوی تک چلتا ہے۔ کوئی شبہ نہیں آج بھی مرثیہ نگاروں پر کام کرنے والوں کا اپنا مقام ہے جن میں قابل ذکر ڈاکٹر تقی عابدی ہیں۔ تقی عابدی کا شمار نہ انیسیوں میں ہے اور نہ دبیریوں میں۔ انھوں نے ان بلند قامت عظیم شاعروں پر گراں قدر تحقیقی، تدوینی، تالیفی اور تنقیدی کام کیے ہیں۔ ان کے اونچے قد کو کچھ اور اونچا کر دیا ہے۔ عابدی طب کے ڈاکٹر ہیں لیکن خود کو ادب کا مریض کہتے ہیں۔ پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب اتنا وقت کیسے نکال لیتے ہیں کہ ایسے سنجیدہ کام توجہ سے کرسکیں۔

علاوہ ازیں اپنے پیشہ طب کی ان کی مصروفیات اپنی جگہ خوش اسلوبی سے انجام پا جاتی ہیں۔ گزشتہ ہفتہ چند ایک روز کے لیے وہ حیدرآباد تھے جہاں ان کی تازہ تصنیف ''دیوانِ رباعیاتِ انیس'' کی رسم اجراء اور مولانا آزاد کلب کے زیر اہتمام توسیعی لکچر بعنوان ''کلامِ انیس میں ادبی اور اخلاقی اقدار'' تھا۔ ہوٹل انمول کانٹی نینٹل میں اپنے توسیعی خطبہ کے دوران انھوں نے بتایا کہ ابھی چار پانچ کتابوں کے مسودے اشاعت کے منتظر ہیں۔ لیجیے ان کی ایک اور کتاب شائع ہوچکی ہے۔ ''دیوانِ رباعیاتِ انیس'' جو 579 رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس تقریب کی صدارت فرما رہے تھے۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں۔

پروفیسر محمد میاں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ''اگرچہ وہ اُردو ادب کے طالبِ علم نہیں رہے لیکن بچپن میں انھوں نے ابتدائی جماعتوں میں اُردو پڑھی ہے وہ انیس اور دبیر سے واقف ہیں۔'' پروفیسر محمد میاں نے کہا کہ ''ان کا پسندیدہ شعر

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''ادب میں تنقید کی بڑی اہمیت ہے لیکن تنقید برائے تنقید نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ تنقید سے ادب اور معاشرہ کی اصلاح و فلاح کا کام لیا جائے۔ ایسی تنقید کی اہمیت ہمیشہ رہے گی تاکہ معاشرہ کھلی فضا میں سانس لے سکے۔'' شیخ الجامعہ نے فرمایا کہ ''اُردو کو ضروری اور اہم کتابوں کی ضرورت ہے۔ اُردو سے دیگر زبانوں میں اور دیگر زبانوں سے اُردو میں ترجمہ یہ اُردو کے حق میں مفید ثابت ہوگا۔ اس طرح کام بڑھے گا اور ترقی کی صورتیں پیدا ہوں گی۔'' پروفیسر محمد میاں کے اپنے دورہ کینیڈا کے موقع پر ٹورنٹو میں تقی عابدی صاحب کی ذاتی لائبریری دیکھنے کا جو موقع ملا اس کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے تقی عابدی کی اُردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی اور تصنیف و تالیف کی مصروفیات کی ستائش کی ڈاکٹر عابدی کے ہاں کینیڈا میں نایاب کتابوں کے نسخوں کے تعلق سے کہا کہ ''اگر یہ نسخے اور مخطوطات اُردو یونی ورسٹی کے حوالے کردی جائیں تو زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کرسکیں گے۔ اور یہ اُردو کی لائق ستائش خدمت ہوگی۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے خطبہ میں کہا کہ ''اُردو تنقید نے انیسؔ کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ انیسؔ کا مطالعہ کیجیے، ہمارے ذہن اور ضمیر کا اندازہ ہوگا۔ انیسؔ کے مراثی کی تعداد (213) ہے اور ان مرثیوں میں اشعار کی تعداد گوئی 28 ہزار ہے۔'' رباعی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ''انیسؔ رباعیات کے بادشاہ ہیں۔ انھوں نے منبر پر بیٹھ کر بھی رباعیات سنائیں۔ ہوتا کچھ ایسے تھا کہ شاعر منبر پر مرثیہ سنانے سے قبل ایک دو رباعیات پڑھتا تھا۔ انیسؔ نے بھی یہی طریقہ اپنایا۔ ان کی رباعیات عموماً فلسفیانہ موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں ان میں اخلاقی اقدار کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ انیسؔ نے ایسی رباعیات زیادہ تر فی البدیہ کہی ہیں۔ انیسؔ نے رباعی کے فن کے تقاضوں کو بہ ہر صورت ملحوظ رکھا ہے۔''

پروفیسر بیگ احساس نے اپنے گراں قدر تبصرے میں انیسؔ کے خاندانی حالات پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ ''انیسؔ خاصی رکھ رکھاؤ کی حامل شخصیت تھے ان کی رباعی فکر اور تفکر دونوں کا احاطہ کرتی ہے۔'' پروفیسر بیگ احساس نے کہا کہ ''انیسؔ نے کئی مجالس بھی پڑھی ہیں۔''

پروفیسر فاطمہ پروین نے اپنے دلکش خطاب میں مرثیہ اور رباعی کی اہمیت پر اظہارِ خیال کیا۔ بیگ احساس نے کہا کہ ''انیسؔ کو حیدرآباد سے ایک خاص تعلق خاطر تھا۔ وہ حیدرآباد آئے اور یہاں مجالس پڑھیں اور اپنے مرثیے سنائے۔ حیدرآباد کے امراء، روساء اور وزراء نے انیسؔ کی خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ رعیت نے بھی ان کا استقبال کیا۔ انیسؔ کو حیدرآباد سے جو جذباتی وابستگی تھی اس کا اندازہ ہوگا۔ یہ رباعی:

اللہ رسولؐ حق کی امداد رہے
سر سبز یہ شہر فیض بنیاد رہے
نواب ایسا رئیس اعظم ایسے
یارب آباد حیدرآباد رہے''

پروفیسر فاطمہ پروین نے اپنے دلنشین خطاب میں سب سے پہلے ڈاکٹر محی الدین قادری کو خراج عقیدت پیش کیا کہ ان کی مساعی تھیں کہ مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کے سلسلے میں

چہل پہل دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے یاد دلایا کہ انیسؔ مراثی کے ذریعہ اخلاقی اقدار کو عام کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے معاشرہ میں رباعی کے مطالعہ کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ زندگی کو سمجھنے کے لیے انیسؔ کو سمجھئے اور انیسؔ کو سمجھنے کے لیے ان کی رباعیات کو سمجھنا چاہیے۔ انیسؔ کی رباعیات ان کے دور کی معاشرتی ادبی اور اخلاقی اقدار کی ترجمان ہیں۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس موقع پر معروف رباعی گو شاعر امجد حیدرآبادی کو بھی خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ ''اپنی رباعیات کی وجہ سے امجدؔ کا نام سدا زندہ و پائندہ رہے گا۔ تقی عابدی کے بموجب انھوں نے امجدؔ کی رباعی گوئی پر بھی کام شروع کر دیا ہے انشاء اللہ اس کی تکمیل جلد ہوگی اور پھر اشاعت عمل میں آئے گی۔''

پروفیسر اشرف رفیع نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی نے مرثیوں کے بارے میں جو تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے وہ نہایت اہم ہے۔ سچ پوچھئے تو انھوں نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ مراثی کا خاص طور پر لکھنؤ میں زور و شور رہا ہے، لیکن 1857ء کے بعد لکھنؤ کے حالات ہی بدل جاتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی منظر نامہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ زندگی اور زمانے میں ہونے والی تبدیلیوں کا ہر ذی روح پر اثر ہوتا تھا۔ چناں چہ لکھنؤ کے منظر نامہ کا بھی ان سے دو چار ہونا تھا۔ ان تبدیلیوں کا شعر و ادب پر اثر ناگزیر رہا۔

مرثیہ پر بھی یہ تبدیلیاں موثر ہوئیں لکھنؤ میں بھی حالات ایسے رہے۔ مرثیہ کے حوالے سے انیسیئے اور دبیریئے شعر و ادب کی دُنیا میں اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ انیسؔ نے نہ انیسیوں کا ساتھ دیا اور نہ دبیریوں کے حق میں کچھ کہا۔ انھوں نے شعر و ادب کے حق میں ووٹ دیا۔ انھوں نے شعر و ادب کے حوالے سے شستہ و شائستہ اقدار کی تائید کی۔ انھوں نے (اور دبیرؔ نے بھی) ادبی موسم کو خوش گوار رکھا۔ ان دونوں انیسؔ اور دبیرؔ کی بزرگی اور برگزیدگی اسی میں ہے۔ پروفیسر محمد میاں نے جو اس تقریب کی صدارت فرما رہے تھے اپنی دفتری مصروفیات کے سبب زیادہ وقت نہ دے سکے۔

اپنے صدارتی خطبے کے بعد انھوں نے اجازت چاہی اور پروفیسر پدم شری مجتبیٰ حسین سے خواہش کی کہ وہ تقریب کے دوسرے حصے کی صدارت کریں۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے صدارتی خطاب میں اپنے انداز میں محفل کو خوش گوار بنا دیا۔ سامعین نے دھیمے دھیمے

قہقہوں سے داد دی۔ ابتداء میں ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد میاں کا تعارف کرایا اور اُردو یونی ورسٹی اور اُردو کی ترویج و ترقی کے تعلق سے ان کی مساعی کی ستائش کی۔

بانی وصدر مولانا آزاد کلب اور ڈپٹی ڈائریکٹر C.P.D.UMT مانو ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے پروفیسر بیگ احساس کا تعارف کرایا اور تقریب کی کارروائی شائستہ انداز میں چلائی۔ آخر میں مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور یہ خوب صورت محفل اختتام کو پہنچی۔

پروفیسر بیگ احساسؔ
حیدر آباد

دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ از ڈاکٹر تقی عابدی

میر ببر علی انیسؔ اُردو کے چار عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ بڑے شاعروں کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے بارے میں کافی لکھا جا چکا ہے، اور مزید اُن پر لکھنا کچھ دشوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ میرؔ کا حق ادا ہو سکا اور نہ میر انیسؔ کا...... غالبؔ اور اقبالؔ نسبتاً خوش قسمت ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے پھر ایک بار بھاری پتھر اُٹھایا ہے۔ اس سے قبل وہ اقبالؔ پر ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے'' اور ''چوں مرگ آید''، غالبؔ پر ''غالبؔ کا دیوان نعت و منقبت'' اور ''دیوانِ غالبؔ فارسی''، میر انیسؔ پر ''تجزیہ یادگارِ انیسؔ'' لکھ چکے ہیں۔ اب انھوں نے ''دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ'' ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ اس دیوان کا انتساب انھوں نے ماہرِ انیسیات پروفیسر سید نیّر مسعود کے نام کیا ہے۔ ابتداء میں حیات، فن اور شخصیت میر انیسؔ ہے۔ میر انیسؔ دُنیا کے واحد ایسے شاعر ہیں جن کے خاندان میں نسل در نسل آٹھ ممتاز شاعر پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے مطابق اس خاندان نے تقریباً تین صدیوں تک پہلے فارسی اور پھر اُردو زبان کی خدمت کی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے میر ضاحک، میر حسن، میر خلیق، میر مہر علی اُنسؔ، میر نواب مونسؔ، میر رئیسؔ، میر سلیسؔ، خورشید حسن عروجؔ کی تاریخِ پیدائش، تاریخِ وفات اور مختصر حالاتِ زندگی درج کیے ہیں۔ انھوں نے نظم طباطبائی کی اس بات کو غلط ثابت کیا ہے میر انیسؔ نے محمد عسکری رئیسؔ کے نام سے مرثیہ ''نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری'' کہا اور رئیسؔ ہی کی پشت یہ شعر بھی شامل کیا ہے ؎

عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؔ کی مداحی میں

ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں: ''ویسے بھی میر ہدایت کو شاعر تسلیم کر لیا جائے تو خود کو انیس کی پانچویں پشت ہوتی ہے۔ اسی لیے تو دولہا صاحب عروج نے جو انیس کے پوتے تھے خود کو

کہا تھا۔ ''سات پشتوں کا شرابی ہوں کوئی اور نہیں'' : ع

ڈاکٹر تقی عابدی کا یہ انکشاف بھی چونکا تا ہے کہ میر انیس کے مرثیوں کی ترتیب کے لیے جب ''دارالترجمہ عثمانیہ یونی ورسٹی'' نے دولہا صاحب سے رجوع کیا تو انھوں نے اس بات کے لیے دس ہزار روپیوں کا مطالبہ کیا جو اشاعتی کمیٹی نے منظور نہیں کیا۔ بعد میں اس کام کو نظم طباطبائی کے سپرد کیا گیا۔

دولہا صاحب عروج کے فرزند فائز صاحب لاولد تھے۔ میر انیس کے خاندان کا سلسلہ یہاں ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر عابدی نے میر انیس کی تاریخِ ولادت، اُن کے ابتدائی اساتذہ، تعلیم اور شاعری کی ابتدا کے بارے میں مستند حوالوں سے تفصیلات درج کی ہیں۔ شیخ ناسخ نے میر ببر علی کا تخلص حزیں سے بدل کر انیس کر دیا۔ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب کے حوالے سے ڈاکٹر تقی عابدی نے لکھا کہ شاعری میں انیس کے کسی استاد کا نام نہیں ملتا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور امجد علی اشہری کے بیان کردہ میر انیس کے قد و خال کی تفصیل لکھی ہے۔ شاد عظیم آبادی کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ میر انیس نے مشکور الدولہ سے تصویر کھنچوائی تھی اور ایک عرصہ بعد جب فوٹو کا رنگ اُڑنے لگا تو میرزا نثار مہدی مرحوم سے اس فوٹو کی نقل آئل پینٹ سے بنوائی۔ یہ تصویر 1930ء تک شاد عظیم آبادی کے پاس محفوظ تھی۔ میر انیس کی مستند تصویر وہ اس ہاتھی دانت کی تختی پر بنائی ہوئی مصور کی تصویر قرار دیتے ہیں۔

تقی عابدی نے وضع اور لباس، پابندی وقت، اخلاق و کردار کے عنوانات سے تفصیل درج کی ہیں۔ میر انیس کسی کی غیبت گوارہ نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر مرزا دبیر کی برائی کرنے والوں سے وہ سخت خفا ہوتے تھے۔ میر انیس کا شعری ذخیرہ کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب نے تمام اہم محققین نے جو تعداد اشعار دکھائی ہیں وہ درج کی ہیں۔ ان کی اپنی تحقیق کے مطابق مراثی 213، سلام 103، نوحے 4 اور درجن بھر تضمینات، مناجات

کے علاوہ رباعیات کی تعداد 579 ہے۔ انھوں نے حالؔی کے اس خیال کو بھی غلط ثابت کیا کہ ''نظیر اکبر آبادی نے شاید انیسؔ سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔'' انتخاب بحر، مرثیوں کے مطلعے، شعراء کی قدر دانی، تقلید طرز مرثیہ، تلامذہ، اقامت گاہیں، ذاتی امام باڑہ، منبر پر نشست اور پڑھنے کا انداز کے عنوانات سے تفصیلات لکھیں۔ اس کے علاوہ مجالس کی تفصیلات، بیماری اور وفات کے بارے میں لکھا ہے۔

''رباعیاتِ انیسؔ کا اجمالی تذکرہ اور تجزیہ'' کے باب میں ڈاکٹر تقی عابدی نے رباعی کو ایرانیوں کی ایجاد قرار دیا۔ انھوں نے ڈاکٹر ناتل خانلری، محمد قیس بن رازی، اوجؔ لکھنوی، علی حیدر طباطبائی، محمود شیرانی، نجم الغنی، پنڈت دتاتریہ کیفیؔ کے حوالوں سے اسے ثابت بھی کیا اور سلیمان ندوی کی اس رائے سے اختلاف کیا کہ رباعی عربی نژاد ہے۔ انھوں نے ''حدائق'' میں ابن قیس نے امام حسن قطان کے ترتیب شدہ چوبیس اوزان کے لیے جو دو شجرے اخرم اور اخرب تیار کیے تھے انھیں پیش کر دیا۔ انھوں نے فارسی رباعی کے ارتقائی سفر کی نشاندہی کی اور عمر خیام، ابوسعید ابوالخیر، عطارؔ اور سرمدؔ کو نمائندہ رباعی گو شاعر قرار دیا۔ اُردو رباعی کے ارتقاء پر بھی سیر حاصل گفتگو کی۔ اُن کی تحقیق کے مطابق غالبؔ نے صرف سولہ اُردو رباعیاں کہی ہیں۔ علامہ اقبالؔ کی رباعیاں، رباعی کی بحر میں نہیں ہیں، انھیں رباعی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''رباعی میں جذبات سے زیادہ تجربات کا دخل ہوتا ہے، اس لیے رباعی فکر و تفکر کا سر چشمہ ہوتی ہے، چناں چہ جذباتی اشعار کی طرح اس کا اثر تیز و تند اور کوتاہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی تاثیر سانچے کوئلے کی آگ کی طرح دھیمی مگر دراز مدت تک ذہن کو گرماتی اور روشن کرتی ہے اور پھر مشکل ہی سے ذہن سے نکلتی ہے۔ شاید اسی لیے نظموں میں رباعی سب سے زیادہ حافظے میں محفوظ رہتی ہے۔'' (ص:94)

ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی رباعیوں میں مضامین کی تکرار تلاش کی ہے اور ایسی 21 رباعیات پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے رباعیات کے مجموعوں کی فہرست بھی شائع کر دی اور ان میں شامل رباعیات کی تعداد بھی درج کر دی ہے۔ ان

مجموعوں میں ڈاکٹر عابدی کے ''دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ'' کو فوقیت حاصل ہے جس میں (579) رباعیات ہیں۔

مراثی انیسؔ مطبوعہ نول کشور پریس کی ایک جلد اوّل میں (81) رباعیات ہیں جن میں 19 رباعیات غلط ہیں۔ تقی عابدی صاحب نے غلط مصرعے رباعیات کے اور اس کے مقابلہ صحیح مصرعے درج کر دیے۔

میر انیسؔ کی رباعیات کے فارسی اور انگریزی تراجم بھی اس دیوان میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے رباعیات کو موضوع کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے۔ حمدیہ، نعتیہ، منقبتی، اخلاقی، سماجی، ذاتی، اعتقادی اور رثائی رباعیات۔ ان رباعیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے موضوعات، لب ولہجہ، لفظیات، سلاست وروانی، تشبیہات، استعارات، تلمیحات، تراکیب، محاوروں کا استعمال، فکر و جذبے کا امتزاج، اجتماعی تہذیب، داخلیت، معنوی اور صوری، قوّتِ مشاہدہ، صنعتوں کے استعمال کو مثالوں کے ساتھ پیش کیا۔ یہ ایک اہم کام ہے جو انتہائی عرق ریزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

میر انیسؔ کے کلام پر بنگال کے رئیس نساخؔ نے ناموزوں مصرعوں کو انیسؔ سے منسوب کر کے جو اعتراضات کیے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اُن کا جواب بھی دیا۔ آخر میں ''میر انیسؔ مشاہیرِ شعر و ادب کی نظر میں'' کے عنوان سے مشاہیر کی رائے اکٹھا کی گئی ہے جن میں مرزا غالبؔ سے لے کر افتخار عارفؔ تک بھی شامل ہیں۔

افتخار عارفؔ کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہ ''پچھلے چند برسوں میں انیسیات میں کوئی بہت قابلِ قدر اضافہ نہیں ہوا۔ گرامی قدر نیّر مسعود نے اپنے والد بزرگ استاذالاساتذہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی روایت میں بلاشبہ جو گراں اضافے کیے اور مرحوم و مغفور سید علی جواد زیدی، شارب ردولوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ کے کچھ مضامین استثنا قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اب تو رثائی ادب کی تحریروں عزاخانوں کے مذہبی کتب مجموعہ بہت مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔''

میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی خدمت میں اس اہم کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ

قفس سے تا چمن پھیلی ہوئی ہے داستاں میری
ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو سنتے ہیں فغاں میری

رباعی اُردو شاعری ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو گزشتہ چار صدیوں سے اربابِ علم و ادب کے مذاق شاعرانہ کا مرکز ومحور ہے۔ فارسی کو شعرا نے رباعی کو مضامین کی رنگارنگی کے ساتھ جواَوج وعروج بخشا تھا اس کے بعد اُردو جیسی نو ساختہ زبان میں رباعی کے حسن ووقار میں چار چاند لگانا کوئی آسان کام نہ تھا، قلی قطب شاہ کے زمانے سے میرؔ وسوداؔ کے عہد تک اس صنفِ سخن کے جتنے بھی نمونے دستیاب ہوئے ہیں وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ:

چوم کر چھوڑ دیا اس کو خرد مندوں نے

دو صدیوں تک کسی نے اس صنفِ سخن کے سلسلے میں ریاضت کا حق ادا نہیں کیا، اُردو مرثیے کے دورِ عروج میں مرثیہ کو شعراء نے اس صنفِ سخن کو سرنامۂ کلام قرار دیا، اس طرح اس صنفِ سخن کو پھولنے اور پھلنے کا موقع فراہم ہوا، مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ نے اس باغ میں نت نئے چمن آراستہ کیے، رباعی کی چاروں روشوں کو فردوسِ فکر ونظر بنا دیا، اس ذیل میں رباعی کی ساخت اور اس کے محاسن کا شرح وبسط کے ساتھ جائزہ لینے سے قطع نظر کرتے ہوئے رباعیات انیسؔ کی طباعت کے حوالے سے بعض باتیں قارئین تک پہنچانا مناسب خیال کرتا ہوں۔

10/دسمبر 1874ء کو میر انیسؔ جنت نشین ہوئے، جس کے بعد میر صاحب کے مرثیوں کی اشاعت کا مرحلہ درپیش ہوا، کلام کی فراہمی اور تہذیب وترتیب کی ذمہ داری کا بارِگراں مولوی سید تصدق حسین عاشقؔ کشوری نے اٹھایا اور انھیں کے زیرِ اہتمام مطبع نول

کشور حضرت گنج لکھنؤ سے مراثی و رباعیات پر مشتمل چار جلدیں طبع ہو کر ظہور میں آئیں۔ جس کے بعد اثنا عشری پریس لکھنؤ نے مراثی کی جلدیں اور ایک جلد ''مجموعہ رباعیاتِ انیس'' کے نام سے شائع کی۔

1322 ہجری میں میر صاحب کی 125 رباعیوں کا ایک مجموعہ سید محمد حسن بلگرامی نے پاکٹ سائز پر حیدر آباد سے شائع کیا۔ کچھ عرصے بعد عمِ محترم سید محمد عباس آصف لائبریرین کتب خانہ راجہ صاحب محمود آباد نے میر صاحب کی منتخب اخلاقی رباعیاں مرتب کر کے مجموعے کا نام ''انیس الاخلاق'' رکھا۔ مذکورہ مجموعہ رباعیات دار التالیف محمود آباد ہاؤس نے لکھنؤ سے مشہور مطبع نظامی پریس سے 1939ء میں چھپوا کر شائع کیا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد رباعیات کی تلاش و جستجو کے ذیل میں گھر کے ذخیروں کو کھنگالا گیا۔ سید علی مانوس جو میر انیس کے نواسے اور محمد عباس آصف کے دادا تھے ان کا زبردست تعاون عباس صاحب کو حاصل رہا۔ مانوس میر انیس کے آخری تیس برسوں میں ان کے ساتھ تھے۔ محمد عباس آصف نے 1939ء سے 1948ء تک نہایت محنت و جانفشانی کے بعد میر صاحب کی جو رباعیاں جمع کیں وہ 1948ء میں مطبع نول کشور حضرت گنج لکھنؤ سے شائع کی گئیں۔

دسمبر 1988ء میں مشہور ادیب علی جواد زیدی نے ترقی اُردو بیورو نئی دہلی سے جو مجموعہ شائع کرایا اس میں بعض رباعیوں کا اضافہ ہوا۔ اس مجموعے کی ترتیب اور رباعیات کی تلاش میں اپنے امکان بھر میں نے بھی بھرپور تعاون کیا۔

اسی سلسلۂ اشاعت کی تازہ ترین کڑی ''دیوانِ رباعیاتِ انیس'' ہے جسے جدید تحقیق و تشریح کے ساتھ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ڈاکٹر سید شاہد حسین نئی دہلی کے زیرِ اہتمام شائع کر کے پیش کیا ہے۔

موصوف نے ابتدائی صفحات میں میر صاحب کی تصویر ان کا مقبرہ اور نادر تحریروں کے عکس شامل کیے ہیں جس سے کتاب کا حسن دوبالا ہو گیا ہے، پانچ سو تین صفحات پر مشتمل کتاب میں حیاتِ فن اور شخصیت میر انیس، تعارف خاندان، میر انیس کی ولادت، تعلیم و تربیت، شاعری کی ابتداء فنونِ سپہ گری، حلیہ، وضع و لباس، پابندیٔ اوقات، اخلاق و کردار۔ میر انیس کا شعری ذخیرۂ انتخاب بحر، مرثیوں کے مطلعے، نظام الاوقات، شعراء کی تقلید، طرز

مرثیہ، تلامذہ، اقامت گاہیں، ذاتی امام بارہ، مجلس چہلم اہلیۂ میر ضمیر، مجالس عظیم آباد، میر انیس حیدر آباد میں، آخری مجلس، بیماری اور وفات تک کا ذکر کیا گیا ہے، جو اسّی (80) صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے اس سے قبل بھی کئی اہم تصانیف شائقین ادب کی خدمت میں پیش کی ہیں جن میں ''شہید'' (1982ء)، ''جوشِ مودّت''، ''گلشنِ رویا''، ''اقبال کے عرفانی زاویے''، ''انشاء اللہ خاں انشاء''، ''رموزِ شاعری''، ''اظہارِ حق'' [سلطان صاحب فرید لکھنوی کے مرثیے]، ''مجتہدِ نظم مرزا دبیر''، ''طالعِ مہر''، ''سلکِ سلام دبیر''، ''تجزیہ یادگارِ انیس: جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے''، ''ابواب المصائب: تصنیف مرزا دبیر''، ''ذکرِ دُرِّ باران''، ''عروسِ سخن''، ''مصحف فارسی دبیر''، ''مثنویاتِ دبیر''، ''کائناتِ نجم''، ''روپ کنوار کماری'' [مراثی کنور]، ''دُربارِ رسالت''، ''فکرِ مطمئنہ''، ''خوشۂ انجم''، ''دُرِ دریائے نجف''، ''تاثیر ماتم''، ''نجمی مایا''، ''روشِ انقلاب''، ''مصحفِ تغزل''، ''ھوالنجم''، ''تعشق لکھنوی''، ''ادبی معجزہ''، ''غالب دیوان نعت ومنقبت''، ''چوں مرگ آید''، ''رباعیاتِ دبیر''، ''سبدِ سخن''، ''دیوانِ غالب فارسی''، ''فیضِ فہمی''، ''مطالعہ دبیر کی روایت''، ''دیوان: سلام وکلامِ انیس''، ''تجزیہ شکوہ جواب شکوہ''، ''فانی لافانی''، ''مطالعۂ رباعیات فراق گورکھپوری''، ''اُردو کی دو شاہکار نظمیں''، ''اقبال کے چار مصرے''، ''رباعیاتِ بیدل''، ''باقیات و نادرات فیض احمد فیض'' کے نام میرے علم میں ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی یہ گراں قدر ادبی خدمات بانظر افراد کے لیے نعمت ثابت ہوں گی۔

ہمیں یقین ہے کہ ارباب ادب میر انیس کی متذکرہ رباعیات کے مجموعہ کا مطالعہ کرتے وقت درج ذیل رباعی کی صداقت کی روشنی میں اس کا مطالعہ کریں گے۔

یوں جوہرِ طبع کب عیاں ہوتا ہے	پانی ہر ایک استخواں ہوتا ہے
راتوں کو گھلاتی ہے مجھے فکرِ سخن	تن شمع صفت صرفِ زباں ہوتا ہے

ڈاکٹر محمد ظفر حیدری
(ایڈیٹر ماہنامہ ''حکیم الامت'' سری نگر)

تجزیہ ''کائناتِ تجمؔ''

تجمؔ آفندی اُردو کے باکمال شاعر تھے۔ وہ ایک فطری شاعر تھے۔ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا، اپنے کلام میں پیش کیا۔ ان کے اشعار دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ وہ دورِ جدید کے شعراء میں سے تھے اسی لیے ان کے کلام میں جدیدیت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے والد بزمؔ آفندی مرحوم اور دوسرے اساتذہ کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ابتداء ہی سے پختگی آگئی تھی۔ ریاض کا نتیجہ تو اچھا ہوتا ہی ہے دوسرے وہ فنِ عروضی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ میر انیسؔ نے اپنے بارے میں کہا تھا۔ ''پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں۔'' ان ہی کی طرح تجمؔ بھی پشتینی شاعر تھے۔ موصوف کے دادا مرزا عباس بلیغؔ مشہور شاعر مرزا فصیحؔ لکھنوی کے بھتیجے تھے۔ اسی لیے فخریہ تجمؔ کہتے ہیں:

تجمؔ ہوں خاکِ پائے مسند آرائے فصیحؔ
مدح کی دولت ملی ہے ورثۂ اجداد سے

تجمؔ کے کلام میں سادگی بھی ہے اور افسردگی بھی۔ ان کو انسان سے بڑی ہمدردی تھی۔ وہ انسان کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کے رنج و غم میں شریک رہتے تھے۔ ان کا سارا کلام پیغام اور پند و نصائح سے لبریز ہے:

بہت پیام ملیں گے میرے سلام میں تجمؔ
نگاہِ غور سے نقاد نے اگر دیکھا

تجمؔ آفندی کو ائمہ ہدا علیہم السلام سے بڑی معرفت تھی۔ اسی عقیدت و مودّت کی وجہ سے وہ مداحِ اہلِ بیتؑ تھے۔ انھوں نے بے شمار نوحے اور سلام کہے ہیں اور تین مرثیے بھی۔ ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت کا سمندر موجزن ہے۔ روزمرّہ، زبان کی صفائی،

سادگی وسلاست، لطیف استعارے، تشبیہیں، درد سے ڈوبی ہوئی جذبات نگاری، بلند کردار نگاری دل کو چھو لیتی ہے۔ ان کے سلام و نوحے اس قدر مقبول ہوئے کہ زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ جب تک حسینؑ کا غم باقی رہے گا، دونوں کو بقائے دوام حاصل ہے۔

سویا علیؑ کا لال دو عالم کو جیت کر
مٹھی میں کائنات تھی خنجر گلے پہ تھا
عاشور کے دن ظہر کو دُنیا ہوئی واقف
مومن کی نماز اور مجاہد کی دعا سے
شبیرؑ کا غم زندگیِ فکر و نظر ہے
ملتا ہے یہاں درسِ عمل اشکِ عزا سے

تجمل آفندی نے نوحے وسلام کے علاوہ حمد، نعت، قصیدے بھی کہے ہیں اور مختلف موضوعات پر نظمیں بھی۔ ان کو ہر صنفِ سخن میں ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی۔ ان کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ وہ شعر و سخن میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ تجمل آفندی نے امام حسینؑ کی زندگی کو ایک مثالی انسان کی زندگی کے طور پیش کر کے عوامی شعور کو بے دار کیا ہے۔ وہ کربلا کے واقعہ کو اصلاحِ انسانیت کا عظیم کارنامہ سمجھتے تھے اور کربلا کے حق پرست شہیدوں کے تعمیری پہلو پیش کرتے تھے:

یہ نہ قراں میں نہ قرآن کی تفسیر میں ہے
روحِ احساس و عمل اسوۂ شبیرؑ میں ہے

•••

تربیت کی ذہنِ انساں کی غمِ شبیرؑ نے
صاحبِ دل بن گئے جو غم کے خوگر ہوگئے

•••

یہ مجلسِ غم ظلم مٹانے کے لیے ہے
دُنیا کو راہِ راست دکھانے کے لیے ہے

تجمل آفندی ایک حساس دل رکھتے تھے جو قوم کی پسماندگی اور خستہ حالی دیکھ کر تڑپ

اٹھتا تھا۔ اسی لیے انھوں نے رنج والم کو حاصلِ حیات قرار دیا۔ ان کی شاعری کا محور حسینؑ کی ذات ہے۔ حسینؑ ہی نے کربلا میں آزادیٔ ضمیر، جرأتِ اظہار اور دردناک قربانیاں پیش کیں:

اے حسینؑ ابنِ علیؑ اے کار سازِ حریّت
تو نے مرگ و زندگی دونوں کو آساں کر دیا

تجمّ آفندی کی شاعری کا مقصد انسان کے اصل نصب العین کی نشاندہی کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں انسانی عظمت سے بڑھ کر کسی کی عظمت نہیں ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لیے اس میں خودی کا جذبہ ہونا چاہیے:

خود پرستی رفتہ رفتہ حق پرستی بن گئی
تجمّ آخر شاعرِ آلِ پیمبرؐ ہو گئے

تجمّ آفندی کو اُردو، فارسی اور انگریزی کے علاوہ ہندی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ ان کا کلام ہندی میں بھی ہے۔ انھوں نے ہندی زبان میں بھی نوحے وسلام اور نظمیں کہی ہیں تاکہ دوسرے مذاہب تک اپنے پیغام کو پہنچا سکیں۔ ان کا کلام دعوتِ عمل کا درس دیتا ہے:

سن ساٹھ تھا سنسار میں ڈالے ہوئے ڈیرا
چھایا ہوا تھا پاپ کے بادل کا اندھیرا
سنسار نظر آیا جو اُپدیش کا پیاسا
کوفے کو چلا گھر سے محمدؐ کا نواسا

تجمّ آفندی نے محمدؐ وآلِ محمدؐ کی عقیدت ومودّت میں مدح سرائی کی ہے۔ انھوں نے حمد، نعت اور قصیدے کافی تعداد میں کہے ہیں:

توحید کا رابط کیا سخن دانی سے
مرعوب ہوں جلوؤں کی فراوانی سے

***

کوششیں وہ سمجھنے کی تیرے کیوں کرتا
عرفاں ہے تیرا جسے حیرانی سے

موزوں تھے سب انبیاء نبوّت کے لیے
مخصوص محمدؐ تھے ہدایت کے لیے

•••

تا مہدیؑ دینِ علیؑ کی خوشبو نکلی
جو پھول بھی گلشنِ امامت میں کھلا

•••

اے صلِ علیٰ جلوہ جانا نہ علیؑ کا
قرآن ہی قرآن ہے افسانہ علیؑ کا

سلام و نوحے، مرثیے، حمد، نعت، قصیدے، منقبت، رباعیات، قطعات اور نظمیں تجم کی شاعری کا سرمایہ ہیں۔ وہ شعر و سخن کے ذریعہ محمدؐ و آلِ محمد کی شان میں مدح و ثنا کے قسم قسم کے پھول کھلاتے رہے۔ ان کے انقلاب آفرین نوحے و سلام اور وجد آفرین قصیدے بہت مقبول ہیں۔ اسی لیے وہ شاعرِ اہلِ بیت کہلاتے ہیں:

تجم صاحب کو راستہ دینا
مذہبِ عشق کے امام آئے

تجم آفندی غزل کے شاعر تھے۔ ہر شاعر فطرتاً غزل کا شاعر ہوتا ہے۔ بعد ازاں شاعر کی دوسری صنفوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ کچھ شاعر غزل ہی تک محدود رہتے ہیں اور بعض شاعر رثائی ادب کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ تجم نے غزلیں بھی کافی تعداد میں کہی ہیں۔ ان کی غزلیں بھی بڑی دلکش ہیں۔ کہا جاتا ہے محبت میں شک و شبہات کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ دونوں کو ایک دوسرے پر بھروسہ ہوتا ہے، مگر دیکھا گیا ہے کہ زیادہ تر محبت ہی شک میں گھر جاتی ہے۔ جب ہی تو تجم نے یہ شعر کہا:

مظاہرے تو ہیں دونوں طرف محبت کے
نہ اعتبار انھیں ہے نہ اعتبار مجھے

تجم آفندی نے غزل کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ چناں چہ پہلے ہی مشاعرے میں جو آگرہ میں ہوا تھا اور جس میں سیماب اکبر آبادی بھی

تھے، اس پر چھا گئے تھے۔ جو غزل وہاں پڑھی تھی اس کا مطلع یہ ہے:

چاندنی میں تم ذرا گھر سے نکل کر دیکھتے
قبرِ عاشق اور اک میلی سی چادر دیکھتے

مسلمانوں کو عظمت گزشتہ کا احساس یوں دلاتے ہیں:

جس قوم نے سر کی مہمِ کرب و بلا
اس قوم میں ملتے نہیں آثارِ حیات؟

•••

وہ ٹھوکریں کھاتی پھرے تاریکی میں
جس قوم کے ورثے میں ہو عاشور کا دن؟

•••

اسلام پیامِ امن ہے یاد رہے
سنّی ہو کہ شیعہ ہو مسلمان بھی ہو

نظم کے علاوہ نجم آفندی کی نثر بھی ادبی مقام رکھتی ہے۔ انھوں نے نثر میں بھی کچھ ادبی، مذہبی اور نصیحت آمیز شہ پارے قلم بند کیے ہیں۔ جس میں لغات المذہب، لغت ہے۔ حضرت علیؑ کا زندگی نامہ، اقوالِ امامؑ اور مکالمے، حسینؑ اور ہندوستان کا سمبندھ اور کچھ نصیحت آمیز افسانے۔ نجم آفندی کو کربلائے معلیٰ، نجفِ اشرف اور سامرہ وغیرہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے تاثرات بھی نظم کیے ہیں۔ بعنوان "درِ نجف پر" جو نظم کہی اس کے صرف تین اشعار پیشِ خدمت ہیں:

نجف میں شاعرِ گردوں حاضر ہے
درِ امیر سلامت، فقیر حاضر ہے

•••

سند ہے ماتمِ شبیرؑ کی خدا رکھے
پڑی ہے دل پہ جو غم سے لکیر حاضر ہے

•••

امیر ہے کوئی ایسا نہ مجھ سا غریب
غریب نجم حضورِ امیر حاضر ہے

نجم آفندی شاعر ہی نہیں، وہ ایک انقلابی شاعر بھی تھے۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ دُنیا میں انقلاب لانا چاہتے تھے۔ چاہے وہ انسان اور انسانیت کی عظمت قائم رکھنے کا انقلاب ہو، قومی یا مذہبی محبت کے لیے انقلاب ہو یا انگریز حکومت کے لیے انقلاب ہو! وہ انقلابی لڑائی میں جیل بھی گئے اور جیل میں بھی شاعری کرتے رہے۔

نجمی کا اپدیش پھل ہو دھرم پھل ہو دیش پھل ہو
کاہے نین نیر بہائیں آؤ سہیلی جیل چلیں
ساجن میرے جائیں نہ جائیں آؤ سہیلی جیل چلیں

نجم آفندی وطن پرست تھے، مگر جب انھیں ہندوستان میں چین نہیں ملا تو وہ غمِ روزگار سے گھبرا کر پاکستان چلے گئے۔ پاکستان میں مشہور و معروف ادیبوں، شاعروں اور خطیبوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ ان کا کلام روزناموں، رسالوں، جریدوں میں شائع ہوتا رہتا تھا، مگر ان کو وہاں بھی چین نہ ملا۔ آخرکار تنگ دستی کی حالت میں انتقال کیا۔ ان کی ولادت 1893ء میں ہوئی اور وفات 1975ء میں۔

نجم آفندی کے ہم عصر شعراء اقبالؔ، حالیؔ، حسرتؔ موہانی، صفیؔ لکھنوی، آرزوؔ لکھنوی اور جوشؔ ملیح آبادی وغیرہ تھے۔

مختصر یہ کہ نجم آفندی ہر صنفِ سخن کے شاعر تھے مگر ان کے نوحے اور سلام بے حد مقبول ہوئے۔ اسی لیے ان کو شاعرِ اہلِ بیتؑ کا خطاب ملا۔ اور اس شاعرِ اہلِ بیتؑ نے امام حسینؑ کے پیغامِ حق اور جد و جہد کو عام کیا۔ لوگوں میں عمل کا جذبہ پیدا کیا اور عزم و استقلال کے ساتھ طوفانوں اور چٹانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ دیا:

بڑھتا تھا کفر کہ اسلام کا نشاں نہ رہے
تڑپ کے روک لیا دل پہ وار کیا کہنا

ابتداء میں نجم آفندی پر بہت کچھ لکھا گیا۔ وہ کافی مشہور و مقبول ہوئے۔ کچھ عرصہ

کے بعد نقاد نے لکھنا چھوڑ دیا تو دھیرے دھیرے لوگ ان کو بھولتے چلے گئے۔ جب لوگ تجم آفندی کو بھول گئے تو ایسے وقت میں ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کو ان کی یاد آ گئی۔ یاد آتے ہی ڈاکٹر صاحب نے بڑی جاں فشانی سے تحقیق کر کے تجم کے کلام کا مواد جمع کیا اور ایک کتاب لکھ ڈالی۔ اس کتاب کا نام ''کائناتِ تجم'' رکھا۔ اس کتاب کی دو جلدیں ہیں۔ جلد اول میں غزلیں، قصیدے، رباعیاں اور قطعات ہیں۔ تجم کا زندگی نامہ وغیرہ بھی ہے۔ جلد دوم میں نوحے وسلام اور مرثیے ہیں۔ تجم کا ہندی کلام ہے۔ نثری شہ پارے بھی ہیں اور تاثراتِ زیارات بھی۔ صفحات بالترتیب 1944 اور 804 ہیں۔ اشاعت 2006ء کی ہے۔ یہ دونوں کتابیں دبیز پیپر پر چھپی ہیں۔ ان کی جلد بھی پختہ اور خوب صورت ہے۔ جلد سیاہ رنگ کی ہے اور سنہری حروف اور نقش ونگار سے سجی ہوئی ہے۔ کتاب کا نام بھی خوب صورت ہے'' کائناتِ تجم'' ڈاکٹر صاحب نے بڑے سلیقے اور دلکش انداز میں اس کتاب کی ترتیب وتدوین کی ہے اور دونوں کتابوں میں جامع تبصرے بھی کیے ہیں۔ تجم کی سوانح عمری بھی دلچسپ انداز میں پیش کی ہے۔ ان کی حیات، شخصیت اور فن کے نئے نئے گوشوں سے قارئین کو آگاہ کیا ہے۔ مطالعہ کرنے کے شوقین لوگ ان کتابوں کو بڑی دلچسپی سے پڑھیں گے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے بجا فرمایا ہے:

> ''کائناتِ تجم ان تمام سوالوں کا جواب رکھتی ہے، صرف گردش اوراق شرط ہے، شاید یہ میری تجمی عقیدت اور اُردو محبت ہو، یہ ایک خوش گوار حادثہ تھا جس کے فیض سے میں'' کائناتِ تجم'' کو دریافت کر سکا۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے یہ کتاب بھی نہایت خوب صورت انداز میں شائع کر کے عظیم کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے تحقیق کی وادیِ پُر خار میں چھوٹے چھوٹے تنکے جمع کر کے ''کائناتِ تجم'' مرتب کر کے تجم آفندی کی محبت وعقیدت میں ایک حیرت انگیز تاج محل کھڑا کر دیا ہے۔ موصوف نے یہ کارنامہ انجام دے کر محبانِ اُردو کے دلوں میں اپنا سکّہ بٹھا دیا۔ تجم کی بھی یہی خواہش ہے کہ:

شاعر ہوں ان کا تجم جو ہیں وجہِ کائنات
ممکن ہے تا ابد مرا نام و نشاں رہے

فرحت آرا حیدری
(سابق معاون ایڈیٹر ماہنامہ ''حکیم الامت'' سری نگر)

''روپ کنوار کماری'' ایک باکمال شاعرہ

گھر کے ماحول کا اثر بچوں پر کافی پڑتا ہے۔ اچھا ماحول ہو تو بچے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ بُرا ماحول ہو تو بچے بھی بُرے بن جاتے ہیں۔ اگر گھر میں مذہبی ماحول ہوتا ہے تو بچوں کو مذہبی واقفیت ہوتی رہتی ہے۔ لیکن دیکھا گیا ہے جہاں ہر سال محرم منایا جاتا ہے، مردانی و زنانی مجالس و محافل ہوتی رہتی ہیں وہاں کے بچوں کو اکثر کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے! وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ امام حسینؑ کس کے بیٹے تھے؟ ان کے کتنے بھائی تھے؟ کتنی بہنیں؟ ان کے کتنے بچے تھے؟ لڑکے کتنے تھے اور لڑکیاں کتنی تھیں؟ اور نہ یہ معلوم کہ بھانجے کتنے اور بھتیجے کتنے تھے؟ کیوں کہ نہ اُن کے بزرگ انھیں بتاتے ہیں اور نہ انھیں خود دلچسپی ہوتی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں سے سوال کریں۔ ہاں کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں کہ سوال کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ بچوں سے ہمارا مطلب ہے دس سال کی عمر سے لے کر اٹھارہ سال تک۔

جب اہلِ اسلام کے بچوں کا یہ حال ہے تو غیر مسلم بچوں کو کیا کہا جائے۔ روپ کنوار کماری ہندو پنڈت کی لڑکی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے رسولؐ و آلِ رسول کی ساری داستان کیسے معلوم ہوئی اور ان سے محبت و عقیدت کیسے ہوئی؟ بلکہ آدمؑ سے لے کر آج تک کے حالات کیسے معلوم ہوئے؟ شعر کہنا الگ بات ہے۔ یہ تو خداداد چیز ہے۔ جس کو خدا توفیق کرے وہی شعر کہہ لیتا ہے اور اصلاح بھی کروا لیتا ہے۔ عموماً شعراء غزلیں کہتے ہیں۔ غزلوں میں گل و بلبل، حسن و عشق اور ہجر و وصل کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اب تو ہر موضوعِ سخن پر غزلیں کہی جاتی ہیں۔ بے روزگاری ہو یا دُنیا کی بے ثباتی، لیکن ادبِ عالیہ ایسا موضوعِ سخن ہے اس میں بغیر سوچے سمجھے کوئی اشعار نہیں کہہ سکتا۔ مثلاً اگر کسی کو کربلا موضوعِ بحث بنانا ہے

تو اسے امام حسینؑ کی پوری داستان معلوم ہونی چاہیے، فلسفۂ شہادت سے بخوبی واقفیت ہونی چاہیے، حق و باطل کے فرق کی سمجھ ہونا چاہیے۔ روپ کماری کو ہر چیز سے واقفیت تھی۔ سب کچھ انھیں کیسے معلوم ہوا؟ ہمارے خیال میں وہ ضرور کسی ایسے انسان کی صحبت میں اکثر بیٹھتی تھی جس نے اس کو شروع سے آخر تک کا ہر واقعہ بتایا۔ ہر واقعہ کی اہمیت سمجھائی اور اس طرح سمجھائی کے اس کے دل و دماغ میں ہر بات پیوست ہوگئی۔ روپ کماری سولہ سال کی عمر سے شاعری کرنے لگی۔ وہ صرف اشعار ہی نہیں کہتی تھی بلکہ اسے خدا اور رسولؐ و ائمہ ہدا علیہم السلام سے محبت و عقیدت ہوگئی تھی۔ اس کا دل اسلام کی طرف جھک گیا تھا۔ وہ کہتی ہے:

کفر اور شرک سے ہے پاک جو طینت میری
ہوش آتے ہی بڑھی کفر سے نفرت میری
مئے توحید تھی گھٹی میں جو شامل ساقی
اس لیے طبع ہے اسلام پہ مائل ساقی

کفر اور شرک کی آغوش میں پالا اس نے
ڈوبی گنگا میں تو کوثر میں نکالا اس نے

روپ کماری نے غزلیں تو نہیں کہیں مگر غزلوں میں جو کچھ حالِ دل کہنا تھا وہ سب کچھ مرثیوں میں کہہ دیا۔ روپ کماری نے دو سلام، ایک مخمس بعنوان تائید ایزدی، گیارہ قطعات اور رباعیات اور پانچ معرکہ آرا مرثیے کہے ہیں۔ ایسے پانچ معرکہ آرا مرثیے ہیں کہ وہ مشہور و معروف شعراء سے مقابلہ کر سکتی ہے۔ وہ صرف امام حسینؑ سے نہیں بلکہ آدمؑ سے لے کر آج تک کے حالات اور انبیاء علیہم السلام کے واقعات سے بھی واقف ہے۔ مثال کے طور پر ہم چند بندوں کے چند اشعار پیش کرتے ہیں جن میں انبیاء اور حکماء کے نام آئے ہیں:

خطاب اسی سے ملا آدمی کو انساں کا
یہی تھا ذوق فرزدقؔ کا شغل سحبانؔ کا
یہی تو گل ہے مری نظم کے گلستاں کا
یہی ثنا ہے نمونہ ہمارے ایماں کا

حجاب میں محمدؐ نے جانے کیا دیکھا
اسی کے پردہ میں ہم نے مگر خدا دیکھا

•••

اسی پہ حضرت آدمؑ کو رشک آیا تھا
اسی کو لوح پہ لکھا ہوا پایا تھا
جبھی کچھ آپ نے اپنا بھی حق جتایا تھا
خدا کے کھیت کا گندم کہاں سے کھایا تھا
خطا جو سمجھے خطا ہے یہ ترکِ اولیٰ تھا
کہ اس ثنا کا سزاوار میرا مولیٰؑ تھا

•••

اسی ثنا سے کھلا ہے میرے کلام کا باغ
یہی ثنا ہے فرشتوں کی انجمن کا چراغ
اسی ثنا سے مرا آج عرش پر ہے دماغ
اسی ثنا کا خدا تک لگا چکی ہوں سراغ
بنا ہوئی شبِ معراج اس ثنا کے لیے
جو مصطفیٰؐ کے لیے تھا وہ مرتضیٰؑ کے لیے

•••

مسیحؑ ان کے طریقہ پر فخر و ناز کریں
جو فہم دیکھیں تو خود نوحؑ مرحبا کہہ دیں
کلیمؑ سُن کے مناجات آئیں حیرت میں
یہ حال جب ہو تو احمدؐ یہ کیوں نہ فرمادیں
بھری ہیں سب صفتیں انبیاء کی حیدرؑ میں
ہیں نوے خصلتیں ایسی میرے برادار میں

•••

جمال پاک میں یوسفؑ تو صبر میں ایوبؑ
وہ قوّت ان کی کہ داوٗدؑ بھی کہیں کیا خوب
خلیلِ حق کی طرح سے خوش اسلوب
وہ زُہد حضرت یحییٰؑ کو جو ہوا مرغوب

جو دیکھو فخرِ سلیمانؑ ہیں آپ حجت میں
بنے بنائے ہیں آدمؑ یہ علم و حکمت میں

•••

مرثیہ: ''عروسِ نظم کی زینت ثنائے حیدرؑ ہے'' (ص:195)

زمانے میں تھا لقب جن کا افصح الفصحیٰ
فصاحت اور بلاغت کا جن کی تھا چرچا
سخن شناس سخن سنج صاحبِ انشاء
گیا کدھر کو فلاطون ہوئی وہ حشمت کیا

کلام جن کے تھے شیریں وہ رشکِ فن نہ رہے
جہانِ شعر کے وہ خسروِ سخن نہ رہے

•••

جنابِ خضرؑ سے پوچھو پتہ سکندر کا
نہ تخت کا ہے نشان اب کہیں نہ لشکر کا
پتہ نہ آئینے کا ہے نہ تاج پُر زر کا
نہ دور ہے ارسطو سے اہلِ جوہر کا

پکارتی ہے اجل وہ حشم گیا کہ نہیں
کدھر کو جم گیا رنگ اپنا جم گیا کہ نہیں

•••

مرثیہ: ''جہان کا ورقِ زرنگار فانی ہے'' (ص:287)

کھال بھی ان کی محبت میں جو کھینچے کوئی
شمس تبریزی کی مانند رکھوں دل کو قوی

التجا آٹھ پہر ہے مری ایشور سے یہی
بڑھ کے منصور سے رکھ بات جہاں میں میری
کلمہ منہ سے نہ بے جا میرے حاشا نکلے
قطرۂ خوں سے صدا ہائے حسیناً نکلے

•••

آشیانوں سے پرند اُڑ گئے حیواں بھاگے
ہر طرف ساکنِ کہسار و بیاباں بھاگے
پیل تن چھپ گئے شیرانِ نیستاں بھاگے
گرد کی طرح عدو چھوڑ کے میداں بھاگے
شور دریا پہ ہوا ثانیِ الیاسؑ آئے
غل علمداروں میں ہونے لگا عباسؑ آئے

•••

مرثیہ : ''کون سا دل ہے کہ جو دل نہیں دیوانۂ عشق'' (ص:337)

روپ کماری کے مرثیوں میں منظر نگاری، جذبات نگاری، ساقی نامہ، فضائل و مصائب اور بین سب ہی کچھ ہے بلکہ ہر مرثیہ میں اس نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے ہیں۔

روپ نے ایک سو باون (152) بند کا مرثیہ حضرت عباسؑ کے حال میں کہا ہے۔ اس کے اٹھارہ بندوں میں عشقِ مجازی کا ذکر کر کے حضرت عباسؑ کی محبت اور وفا کا تذکرہ کیا ہے اور بعد میں آپ کی شہادت پیش کی ہے:

لکھ رہی ہوں میں حقیقت میں مجازی کا جو حال
یہ بلا جان حزیں کے لیے ہر دم ہے وبال
اختلاجِ دل مضطر ہے محبت کا مآل
ہو بیاں عشقِ حقیقی کا ہے دشوار و محال

سچ تو یہ ہے رہِ تسلیم و رضا مشکل ہے
سہل ہے عشقِ بشر عشقِ خدا مشکل ہے

روپ کماری نے ایک سو سڑسٹھ (167) بند کا مرثیہ حضرت علیؑ کے حال میں کہا ہے۔ مرثیہ میں بڑے پُرکشش انداز میں حضرت علیؑ کی مدح کی ہے۔ پورا مرثیہ فضائل پر مبنی ہے۔ آخر میں علی اصغرؑ کی شہادت پیش کی ہے۔ شہادت کے بند بڑے بہیہ ہیں۔ مرثیہ کا پہلا بند ہے:

عروسِ نظم کی زیست ثنائے حیدرؑ ہے
بیاں کا حسن لطافت ثنائے حیدرؑ ہے
گلِ ریاض فصاحت ثنائے حیدرؑ ہے
خدا کی عین عبادت ثنائے حیدرؑ ہے
جو حق شناس ہیں ان کو ثنا یہ بھاتی ہے
یہی ثنا تو بہشت بریں دکھاتی ہے

روپ کماری نے ترانوے (93) بند کا مرثیہ حضرت فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کے حال میں بھی کہا ہے جو بہت ہی عمدہ مرثیہ ہے۔ ان کے فضائل بھی دل کو روحانی خوشی پہنچاتے ہیں اور مصائب تو دل ہلا دینے والے ہیں۔

رسولِ خدا کی وفات کے بعد اُمت والوں نے دخترِ رسول کو بہت ستایا۔ بڑی ایذائیں پہنچائیں۔ وہ رات دن روتی تھیں اور اتنا غم کیا کہ اسی غم میں دُنیا سے رخصت ہوگئیں۔ مرثیہ کا پہلا بند پیشِ خدمت ہے:

زیست حجلۂ عفت میں جنابِ زہراؑ
رونق کشورِ عصمت ہیں جنابِ زہراؑ
خلق میں حق کی ودیعت ہیں جنابِ زہراؑ
پرتوِ مہرِ نبوت ہیں جنابِ زہراؑ
باپ کی طرح سے یکتائے زمانہ ہوئیں
مختصر یہ ہے دُنیا میں یگانہ یہ ہوئیں

روپ کماری نے دُنیا کی بے ثباتی پر ایسا مرثیہ کہا ہے کہ دل بجھ سا جاتا ہے۔ یہ مرثیہ ایک سو بائیس (122) بند کا ہے۔ اس میں دُنیا کی ناپائداری پر تقریباً پینتیس (35) بند ہیں۔ آخر میں امام حسینؑ کی شہادت کا حال بیان کیا ہے۔ اس مرثیہ کا پہلا بند ہے:

جہاں کا ورق زر نگار فانی ہے
یہ زیستِ چمن روزگار فانی ہے
بشر کا حسن گلوں کا سنگار فانی ہے
خزاں پکار رہی ہے بہار فانی ہے
چمن میں ہوں گے پریشاں دماغ پھولوں کے
بجھیں گے بادِ خزاں سے چراغ پھولوں کے

روپ کماری نے ایک سو سینتیس (137) بند کا مرثیہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حال میں بھی کہا ہے۔ پورے مرثیہ میں مدح و ثنا کی گئی ہے اور آخر میں امام حسینؑ کی شہادت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو بڑے ہیئیہ بند میں ہے۔ اس مرثیہ کے پہلے بند کا پہلا مصرعہ یہ ہے:

ع : ''بحر وحدت کی شناور ہے طبیعت میری''

یوں تو ہر ادیب ہر شاعر نے ذکر کیا ہے کہ رسولؐ خدا کا سایہ نہیں تھا۔ کیوں نہیں تھا؟ کس لیے نہیں تھا؟ کیا وجہ تھی؟ اس بارے میں سوال و جواب کر کے روپ کماری نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں کہ رسولؐ خدا کا سایہ نہیں تھا۔ مثال کے طور پر ہم اٹھارہ بندوں کے بجائے صرف پانچ بند پیش کریں گے:

میں یہ سنتی ہوں قدِ پاک کا سایہ بھی نہ تھا
لاکھ کی فکر ولیکن یہ معمّا نہ کھلا
متعجب ہوئی میں بے حد کہ تعجب کی تھی جا
ناگہاں بڑھ کے میری عقلِ رسا نے یہ کہا
بھید دُنیا میں کسی نے نہیں پایا ان کا
مجھ سے سُن حیدرِ کرارؑ ہیں سایا ان کا

•••

لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا سایہ ہے معدوم
پر میں اب کھولتی ہوں رازِ خدائے قیوم
چارسو خلق میں سایہ کے نہ ہونے کی ہے دھوم
لو بتاتی ہوں میں تمہیں میں جو ہے مجھ کو معلوم

قولِ قرآں کا ہے یہ ظلِ الٰہی ہیں حضور
اب تو ثابت ہوا یہ نور کا سایہ بھی ہے نور

•••

سایہ کے ساتھ سائے کی طرح ذہن گیا
جستجو کرنے میں تب سایہ کی پردہ یہ کھلا
آپ کے سائے کو وحدت سے جو تھا حسنِ ولا
اس لیے ہجر تھا مشکل ہوا دم بھر نہ جدا

جا سکا نورِ الٰہی سے نہ ہٹ کر سایہ
رہ گیا جسمِ منور سے لپٹ کر سایہ

•••

اسی سایہ میں لگاتی ہوں مضامین کے میں باغ
بزمِ وحدت کا یہی سایۂ عالی ہے چراغ
حق سے ملتا ہوا اس سایہ کا پاتی ہوں سراغ
سائے کے ساتھ میرا عرش پہ پہنچا ہے دماغ

تھی یہ معراج میں بھی ناز و ادا کی صورت
سایہ پردے میں رہا رازِ خدا کی صورت

•••

اور سایہ کے نہ ہونے کا کھلا اک یہ سبب
ظاہری طور پر کچھ تھے جو مسلمانِ عرب

گر قدم سایہ پہ رکھتے تو یہ تھا ترکِ ادب
اس لیے ہوگیا حسنینؑ کی وہ شکل میں اب

کیوں نہ پیارے ہوں محمدؐ کو یہ جانی دونوں
سایۂ احمدؐ ہوں جب احمدِؐ ثانی دونوں

روپ کماری نے پورے مرثیہ میں حمد و ثنا کے پھول کھلائے ہیں اور اپنی دکھ درد بھری آپ بیتی بیان کی ہے:

قصہ کوتاہ یوں ہی غم میرا بٹ جاتا ہے
دن اسی مدح میں مداح کا کٹ جاتا ہے

واضح رہے روپ کماری کے کلام کی اصلاح کرنے والے دو عظیم شعراء تھے۔ فضل رسول فضلؔ اور نجم آفندی۔ فضل رسول نے جب دیکھا کہ روپ کماری عاشق رسولؐ و آلِ رسولؐ ہے اور اس نے دل سے کلمہ پڑھ لیا ہے تو انھوں نے روپ کماری کو ''کنیزِ فاطمہ زہراؑ'' کا خطاب دیا۔

عالمی شہرت یافتہ ادیب، شاعر، فلسفی اور دانشور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے مذکورہ بالا تحقیق کر کے روپ کنوار کماری کا کلام جمع کیا اور کتاب چھپوائی جس کا نام ''روپ کنوار کماری: شخصیت فن اور مجموعۂ کلام'' رکھا۔ پروفیسر اکبر حیدری کشمیری اپنی کتاب ''ہندو مرثیہ گو شعراء'' (2004ء) میں رقمطراز ہیں کہ:

''اُردو مرثیہ نگاری میں محترمہ روپ کماری تخلص روپ اور کنوار میری آنکھوں میں ایک معمہ بن کے پھر رہی ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی مجھے کہیں نہیں دستیاب ہوئے۔ کوئی انھیں فضل رسول فضلؔ کے تلمذ میں شامل کرتا ہے اور کوئی علامہ نجم آفندی اور اکبر الہ آبادی کے شاگردوں میں شمار کرتا ہے۔'' (ص:245)

لیکن ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے زیرِ نظر کتاب (اشاعت 2006ء) میں بہت سے ثبوت پیش کر کے ثابت کر دیا ہے کہ روپ کماری کا وجود تھا اور وہ باکمال شاعرہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بطورِ سند کئی سلام و مراثی بخطِ روپ کنوار کماری پیش کیے ہیں۔ اس

کے علاوہ مکتوب: فضل رسول فضلؔ اور قلمی نسخہ مع اصلاح کو بھی شامل کیا ہے۔ اس سلسلے میں مزید ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''یہ حقیقت ہے کہ اگر راقم کی ذاتی لائبریری واقع ٹورنٹو کینیڈا میں روپؔ کماری کے ہاتھ سے لکھے مراثی جناب فضلؔ رسول صاحب کے ہاتھ بنائی گئی اصلاح اور اصلاح کے تعلق سے لکھے گئے تفصیلی خطوط خود فضلؔ رسول صاحب کے دستخط کے ساتھ موجود نہ ہوتے تو نوبت محاکمہ اور حقیقت تک نہیں پہنچتی اور روپؔ کماری تخیلاتی کیریکٹر بن کر اُردو ادب کی خلاؤں میں گم ہو جاتی۔'' (ص:34)

مذکورہ کتاب 405 صفحات پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ پہلے ہی کہا جاچکا ہے کہ کتاب میں روپؔ کماری کے پانچ مراثی اور سلام کے علاوہ روپؔ کماری کا نعتیہ اور منقبتی کلام بھی شائع کیا گیا ہے، نیز روپؔ کماری کی مختصر سوانح عمری، منظوم خودنوشت اور ''روپؔ کماری: افسانہ یا حقیقت'' جیسے اہم باب بھی ہیں۔ غرضیکہ ڈاکٹر تقی عابدی نے مذکرہ کتاب شائع کر کے روپؔ کماری کی روح کو شاد و مسرور کر دیا!

روپ کماری! تمہارے بھی ہیں مہمان کیسے کیسے۔

عطیہ شبیر جعفری
ٹورنٹو (کینیڈا)

مرثیہ نگار محترمہ روپ کماری کے متعلق چند لائنیں پیش ہیں

ہندوپاکستان میں تقریباً ہر شیعہ گھرانے میں خواتین کی سوز وسلام خوانی، نوحہ خوانی اور مرثیہ خوانی کا رواج صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ مردوں کے مقابلے میں خواتین کی مرثیہ نگاری کی مثالیں نہ ہونے کے برابر نظر آتی ہیں۔ اگر ہیں بھی تو اُن کی نشر واشاعت کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ایسی ہی خواتین میں ایک اہم مثال روپ کماری کی مرثیہ نگاری کی ہے۔ ان محترمہ کا تعلق یوپی کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ ہندو گھرانے سے تھا۔ وہ خود بھی بہت عالم وفاضل خاتون تھیں۔ قبولِ اسلام کے بعد انھوں نے اپنا نام تبدیل کر کے کنیز فاطمہ رکھ لیا تھا۔

مرثیے اور منقبت نگاری میں ان کے استاد ہماری برادری کے بزرگ عالم اور مرثیہ نگار جناب سید فضل رسول صاحب کا تعلق اس برادری سے ہے جس کے افراد ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں اور جس کو مجموعی طور پر ''ساداتِ بھرت پور اور نوح'' یا ''ساداتِ آگرہ یا نوح'' کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ان سادات کا تعلق موجودہ راجستھان اور یوپی کی مندرجہ ذیل بستیوں سے تھا۔ بیانہ، بھرت پور، پہرسر، سید پورہ، ہیلک، شاہ گنج آگرہ، اُول، مہابن اور راہ رہ وغیرہ وغیرہ

فضل رسول صاحب کو میر انیس کے بھائی میر اُنس سے ابتدا میں اصلاح لینے کا شرف حاصل رہا تھا۔ فضل رسول صاحب کے والد ماجد جناب وزیر حسین صاحب تھے، جن کی مشہور ومعروف تصنیف ''چہل مجلس شبیر'' ہے، جس کا تاریخی نام ''ذائقہ ماتم'' ہے، اس

کی تکمیل ۱۲۹۷ھ یعنی تقریباً ۱۸۸۱ء میں ہوئی۔

جناب تقی عابدی صاحب تمام قارئین کی جانب سے مبارکباد اور خراجِ تحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نہایت عرق ریزی کے بعد رثائی ادب کے متعلق تاریخی معلومات کے باب میں سب سے پہلے نہ صرف روپ کماری کے بلکہ ان کے استاد محترم جناب فضل رسول صاحب، دونوں کے کلام اور سوانحی حالات سے اپنی اس کتاب کی وساطت سے قارئین کو آگاہ کرکے اہم ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر سید یحیٰ نشیط

"غالبؔ: دیوانِ نعت ومنقبت" ایک جائزہ

تقدیسی اصنافِ سخن میں سوائے مرثیہ کے اور کسی صنف کی بارگاہِ نقد وادب میں اتنی پذیرائی نہیں ہوئی، جتنا کہ ان کا حق تھا۔ حالاں کہ ان کی سلوٹوں میں بلاغت کے عمدہ نمونے پوشیدہ ہیں۔ ان کی اثر انگیزی، انقلاب آفرینی اور جمالیاتی اقدار دیگر اصنافِ سخن سے کم نہیں، بلکہ اہل نظر کے یہاں کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ہمارے ناقدین شاید معتقدانہ ادب سے پہلو تہی برتنے ہی میں اپنی نجات متصور کرتے رہے ہیں۔ درآں حالیکہ افلاطون جیسا دانا جس نے اپنی جمہوریت سے شاعروں کو جلاوطن کرنے کا کہا تھا، ہومر اور اس کی ایلیڈ کے اشعار سے منحرف ہو جانے کے باوجود ایسی شاعری جس میں حمد یا بزرگوں کی مدح ومنقبت ہو قبول کر لیتا تھا۔ اس شہادت کی روشنی میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ دُنیائے ادب میں باوجود اغماض برتے جانے کے تقدیسی ادب ہی کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔ یقیناً چاہے حمدیہ دواوین ہوں یا نعتیہ شہ پارے، منقبت و سلام کے مجامع ہوں یا مرثیہ ونوحے کے کلیات یہ دُنیائے ادب پر ہمیشہ غالب رہیں گے، اور آج بھی ان کے تفوق سے انکار ناممکن ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے غالبؔ کا تخلص برمحل استعمال کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حمد ونعت ومنقبت ایسی اصناف ہیں جو غالب رہنے والی ہیں۔

ہمارے تقدیسی ادب میں شاعری کے ذیل میں حمد ومناجات، نعت ومنقبت اور سلام ونوحہ وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ غالبؔ نے شغلِ مے وبادہ کے ساتھ ہی صہبائے عقیدتِ مذہبی کو بھی نوش جان فرمانے کے شعوری طور پر جتن کیے ہیں۔ ان کی شوخ اور چلبلی طبیعت (جو کشاکش حیات کے ردعمل کا نتیجہ تھی) کی وجہ سے بظاہر مذہب جیسے قشف آمیز امر

میں بھی وہ غیر سنجیدہ نظر آتے ہیں لیکن بہ باطن ان کا ایمان وایقان بڑا پختہ تھا۔ ان کا مذہبی شعور بڑا بالیدہ تھا اور عقیدۂ مذہبی ان کی رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں دُنیاوی لذات کے مضامین غیب سے اتنے نہیں اترتے جتنے مذہبی نوعیت کے مضامین ان کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ زیرِ تذکرہ کتاب ''غالب دیوانِ نعت ومنقبت'' سے عیاں ہوتا ہے کہ غالب نے فارسی واُردو ہر دو زبانوں میں تقدیسی اصناف پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان کے سارے کلام پر غالب آگیا۔ میں مبارک باد پیش کرتا ہوں ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کو کہ انھوں نے غالب کا تقدیسی اصناف پر سارا کلام یکجا کرلیا۔

حمد نگاری کی ابتداء اس وقت سے ہوتی ہے جب جیتوں اور عیلائیوں نے اپنے تعبدانہ تصورات کے نقش ونگار بنائے تھے اور کالڈیشیا کے صنعت گروں نے مٹی کی پکی ہوئی اینٹوں پر حمد وثنا کے وہ ترانے کندہ کیے تھے جو گزری ہوئی قوموں سے انھیں ورثے میں ملے تھے۔ آج تو دُنیا کی ہر زبان میں یہ روحانی نغمے بآسانی دستیاب ہوجاتے ہیں۔ غالب کے یہاں نہ صرف یہ کہ حمدیہ عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے بلکہ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے تو ان کی مستقل حمدیں بھی تلاش کی ہیں اور نہایت سلیقے سے ان پر اپنے خیالات قلم بند کیے ہیں۔ فارسی حمدوں کے اُردو ترجے کی وجہ سے عام قاری ان کے مفاہیم تک بآسانی پہنچ سکتا ہے۔

غالب کی فارسی حمدوں کا پیکرِ شعری قصیدہ ومثنوی ہے۔ مثنوی کی ابتداء چوں کہ حمد ہی سے ہوتی ہے اس لیے شاعر کو ضابطہ کی پابندی کی خاطر حمد لکھنی پڑتی ہے، لیکن غالب نے حمد رب العالمینؑ میں ایک پورا قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں بلاغت بھی ہے اور اللہ رب العزت کی جلالت کا اظہار بھی۔ قصیدے میں غالب نے ''گریز'' کا پہلو نہایت شاندار طریقے پر نکالا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی موثر انداز میں ان کی نشاندہی کی ہے۔ دوسری حمد غالب کی ناتمام مثنوی ''ابر گہر بار'' کی ہے۔ کتاب میں اس کا ترجمہ بڑا سلیس اور رواں دواں ہے۔

غالب نے اگرچہ بندگی میں بھلا نہ ہونے کا شکوہ کیا ہے، لیکن دراز کے علاوہ جائیں گے بھی کدھر؟ انھیں تو انگریزوں کی خوشامد اور مدح سرائی بھی کام نہ آئی تھی۔ اس

لیے وہ بارگاہِ ایزدی میں دستِ دعاء دراز کرتے ہیں۔ دعاء دراصل رفعِ احتیاج کے لیے اللہ برتر کے آگے طالبِ استعانت ہوتا ہے۔ دعاء میں غایت عجز اور آہ وزاری ضروری ہے۔ تضرع والحاح کی ایسی حالت اللہ کی ذات کو بندے کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ نے دعاء مانگنے کا حکم دیا ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن:۶۰) اور اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً (سورہ الاعراف ۵۵)۔

عابدی صاحب نے دعاء کے ذیل میں ایک مناجات دو فاتحہ، دعائے صباح اور دعائے حضرت سجادؑ کے فارسی ترجمے کا ذکر کیا ہے۔ حضرتِ سجاد امام زین العابدینؑ کی دعاء کا منظم ترجمہ جو غالبؔ کی رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے بڑا موثر اور رقت انگیز ہے۔ یہ وہ امام ہیں جن کے فقر کے سامنے سطوتِ خسرو بھی ماند پڑ گئی تھی۔ یہ وہ امام ہیں جن کے متعلق فرزدق نے ہشام بن عبدالملک کو کہا تھا۔

> ''یہ اللہ کے بندوں میں سے بہترین کی اولاد ہے۔ یہ متقی پاک صاف اور سردار ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کے قدم کو سارا مکہ جانتا ہے یہ وہ شخص ہے جس کو بیت اللہ جانتا ہے۔ اس کو حِل وحرم پہچانتے ہیں۔ یہ وہ شخص ہے کہ جب حجرِ اسود کا بوسہ دینے کے لیے اس کے قریب جائے تو حجرِ اسود کا کونہ اس کے ہاتھوں کا استعلام کرے۔
>
> یہ وہ شخص ہے جس نے بجز ''لا الہ'' کے کبھی لا نہیں کہا۔
>
> او ہشام! اگر تو اس سے جاہل ہے تو سن کہ یہ فاطمہؑ کی اولاد ہے اور اس کے نانا پر نبوت ختم کر دی گئی۔ تیرا یہ کہنا کہ یہ کون ہے اس کو عیب نہیں لگا سکتا۔ جس کے پہچاننے سے تو نے انکار کر دیا ہے اس کو عرب جانتا ہے۔
>
> یہ وہ شخص ہے جو شرم کی وجہ سے اپنی آنکھ نیچی رکھتا ہے اور ساری دُنیا اس کی عظمت اور ہیبت سے آنکھ نیچی رکھتی ہے۔
>
> یہی حضرت زین العابدین احرام باندھتے وقت ''لبیک'' اس خوف سے نہیں کہتے کہ کہیں جواب میں بارگاہ ایزدی سے ''لا لبیک'' کی صدا نہ آجائے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی ظاہری حالت میں خوف خداوندی کا یہ عالم

ہوتو دعاء کی کیفیت میں آپ کی رقت وزاری کا کیا عالم رہتا ہوگا۔

غالبؔ نے حضرت سجادؑ کی ایسی ہی ایک تضرع آمیز دعا کو فارسی میں منتقل کیا ہے، جس میں جذب واضطرار اور عجز وانکسار کے علاوہ بندے کی بے بسی وبے کسی نمایاں ہوتی ہے۔ حضرت علی کریم اللہ وجہہ سے منسوب دعاء ''دعائے صباح'' کا منظوم ترجمہ بھی خوب ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت اہتمام سے اس کے قدیم نسخے کی عکس ریز کاپی کالی داس گپتا کے مضمون کے ساتھ کتاب میں شامل کرلی ہے۔

اس دیوان میں غالبؔ کی نعتوں کے ساتھ ان کا ''معراج نامہ'' بھی شامل ہے۔ یہ نعتیں مختلف اصناف میں لکھی گئی ہیں۔ ایک غزل کی صنف میں چار قصیدے میں اور تین مثنوی کی شکل میں ہیں۔ ایک قصیدہ خمسہ بر غزل قدسیؔ ہے۔ اس کے علاوہ ایک نعتیہ رباعی دو قطعات اور اُردو کے پانچ نعتیہ اشعار بھی شاملِ کتاب ہیں۔

غالبؔ نے اپنے ''معراج نامے'' میں افلاک ان کے سیارے اور برجوں کا ذکر کیا ہے جو علم نجوم سے متعلق ہیں۔ اس قسم کی منظومات عربی، فارسی میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ابن عربی کی فتوحاتِ مکیہ، ابوالعلا معری کا رسالہ ''الغفران'' اور فارسی میں ''جاوید نامہ'' وغیرہ لیکن آخر الذکر دونوں کتابیں معراج نامے نہیں ہیں۔ اُردو میں اس نوع کا معراج نامہ لچھمی نرائن شفیقؔ نے بھی لکھا تھا۔

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے غالبؔ کی نعتیہ غزل کا تجزیہ بھی خوب کیا ہے اس نعت میں عقیدتِ رسول تغزل کی چلمن سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے باقی نعتوں میں غالبؔ کا عشقِ رسولؐ نمایاں ہے۔

غالبؔ کی فارسی نعت ومنقبت علیؑ کے تحت تقی صاحب نے غالبؔ کی وہ مشہور نعت شاملِ کتاب کی ہے، جس میں ان کے زمانے میں چھڑی ایک علمی بحث ''امتناع النظیر: خاتم النبیینؐ'' کی تصریح ہے۔ ہوا یوں کہ مولانا فضل حق مرحوم غالبؔ کے بڑے گاڑھے دوست تھے۔ انھیں وہابیوں سے بڑی کد تھی۔ مولانا نے مرزا سے اصرار کیا کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو جس میں مسئلہ ''امتناع النظیر: خاتم النبیینؐ کی شرح وبسط کے ساتھ تصریح ہو۔ مرزا نے اوّل تو عذر کیا کہ مسائل علمی کا نظم میں بیان کرنا مشکل ہے۔

مگر انھوں نے نہ مانا تو لاچار مرزا نے ایک مثنوی لکھ کر انھیں سنائی۔ اس مثنوی میں مرزا نے ''مسئلہ امتناع النظیر'' کے باب میں مولانا کی رائے کے خلاف لکھا تھا۔ اس پر مولانا سخت ناراض ہوئے۔ بعد میں مولانا کی رضا جوئی کی خاطر غالبؔ نے مثنوی کو ان دو اشعار پر ختم کیا جن میں خاتم النبینؐ کے ممتنع بالذات ہونے کی صراحت ہے۔

منفرد اندر کمالِ ذاتی است ۔۔۔ لاجرم مثلش محالِ ذاتی است

زیں عقیدت برنگردم و السلام ۔۔۔ نامہ را درمی نور دم و السلام

اس نعت کا ظ. انصاری کا کیا ہوا ترجمہ بھی خاصے کی چیز ہے۔

رہی منقبت! تو ہمارے یہاں اوّل تو اسے صنف شاعری ہی میں شمار نہیں کیا جاتا۔ موضوعی صنفِ سخن کے زمرے میں بھی اس پر کم توجہ دی گئی ہے۔ منقبت اصطلاح میں اہلِ بیت، اصحابِ کبار اور اولیاء اللہ کی توصیف بیانی کا نام ہے۔ عربی، فارسی اور اُردو کا دامن مناقب کے شہ پاروں سے بھرا پڑا ہے۔ اُردو ادب میں تو مناقبِ اہل بیت اور اصحابِ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر مستقل و مبسوط کتابیں دستیاب ہیں اور الحمد اللہ ممبئی یونی ورسٹی میں رفعیہ شبنم عابدی صاحبہ کی زیر نگرانی اس پر کام بھی ہو رہا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی اس ضمن میں یہ اوّلین کوشش ہے کہ آپ نے غالبؔ کی منقبتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ منقبت سے متعلق بعض اصطلاحات کی وضاحت بھی اگر ضمناً ہی اس میں ہو جاتی تو سونے پر سہاگا ہو جاتا۔ مثلاً ''اہل بیت، اثناعشری نظام، یوم غدیر، نادعلی کرم اللہ وجہہ، انگشتری علیؓ، شیرِ خدا، وغیرہ کہ ان میں سے بعض کا استعمال بلاقی کے معراج نامے'' جیسے معراج ناموں میں بھی ہوا ہے، اور منظوم سیرت رسولؐ میں بھی۔ عام قاری ہی نہیں بلکہ بعض اساتذہ بھی ان کے معنی و مفاہیم سے لاعلم ہیں۔ بہر حال! ڈاکٹر صاحب نے نہایت وضاحت کے ساتھ غالبؔ کی منقبتی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور منقبت کی باریکیوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

سلام و نوحے ابھی تحقیق کے منتظر ہیں۔ 15-10 سال قبل اُجین یونی ورسٹی میں سلام نگاری پر کام ہوا تھا لیکن وہ صرف مقالے میں بند رہا۔ منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ اس اعتبار سے بھی ڈاکٹر صاحب سابقین و اوّلین میں شمار ہوتے ہیں۔

غالبؔ نے زمانے کی صعوبتیں خوب جھیلی تھیں۔ اس لیے بعض اوقات تغزل میں

بھی نوحے کی سی رقت پیدا ہو جاتی تھی۔ کلکتہ کا جو ذکر کیا والی غزل کی ردیف وقافیہ ہائے ہائے، اور روتے ہو زار زار کیا کرتے ہو ہائے ہائے کیوں میں قافیہ ہائے ہائے اس قبیل کے چند اشعار بطور دلیل پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب طبیعت ہی افسردہ ہو تو نوحہ بطور عقیدت کہنے میں کچھ زیادہ ہی حزن و ملال کا اظہار ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس ضمن میں بھی غالبؔ کے نوحوں کی وضاحت کر دی ہے۔

کتاب کے اولین صفحات میں غالبؔ سے متعلق چند مضامین بھی انتہائی معلومات افزا ہیں۔ نہایت باریک بینی سے آپ نے تحقیق کر کے غالبؔ کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا ہے۔ میں ایک بار پھر ڈاکٹر سید تقی عابدی کو ہدیۂ تبریک پیش کر کے اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ وما علینا الا البلاغ۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری

تقی عابدی اور "غالبؔ دیوانِ نعت ومنقبت"

غالبؔ کا دیوانِ نعت ومنقبت ڈاکٹر تقی عابدی صاحب (کینیڈا) کا گرانمایہ شاہکار ہے جو دسمبر 2006ء میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آیا۔ کتاب بڑے سائز (15x25 سنٹی میٹر) میں نہایت مضبوط، خوب صورت جلد، عمدہ اور دبیز کاغذ پر 820 صفحات پر مشتمل ہے۔ غالبؔ پر ایسی ضخیم اور معلوماتی کتاب آج تک میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر صاحب نے گزشتہ تین چار برسوں میں رثائی ادب پر "تجزیہ یادگارِ انیس"، "مثنویات دبیر"، "ابواب المصائب"، "روپ کنوار کماری" اور "کائناتِ نجم" کے بلند و بالا کارناموں کو پیش کر کے شہرتِ عام اور بقائے دوام کا تاج پہن کر ادبی دُنیا میں اپنی مقبولیت کا سکہ بٹھادیا۔

ڈاکٹر صاحب کسی یونی ورسٹی کے اُردو فارسی کے استاد نہیں بلکہ ماہر طب یعنی معالج ہیں۔ ان پر اپنے پیشہ کے الرغم ایسا ادبی ذوق غالب ہوا ہے جو اپنی نظیر آپ ہے۔ ڈاکٹر صاحب تین درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے ایک اور بلند پایہ کتاب "سبدِ سخن" اعلیٰ درجہ کے کاغذ اور خوب صورت جلد کے ساتھ شائع ہوئی۔ کتاب موصوف کے تیس تحقیقی اور تنقیدی مقالات پر مشتمل 383 صفحوں میں ہے۔ سبھی مضامین دلچسپ اور مفید ہیں۔

غالبؔ پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ حکومتِ ہند نے اس عظیم شاعر اور آزاد خیال انسان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے لیے غالبؔ انسٹیٹیوٹ محض اس لیے قائم کیا تھا کہ غالبؔ کے ہمہ جہت پہلوؤں پر تحقیق کر کے روشن کیا جائے۔ ابتدائی چند برسوں میں تھوڑا بہت کام ہونے لگا تھا، لیکن اب سناٹا چھایا ہوا ہے۔ اگر یہ ادارہ ڈاکٹر عابدی صاحب کے زیرِ نظر کارنامہ کو ہاتھ میں لیتا تو برسوں تک مکمل نہ ہو جاتا۔ میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا

ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ بے مثال کارنامہ غالبیات میں ایک اہم اور قابل قدر اضافہ ہے۔ پاکستان میں بھی ''ادارۂ یادگارِ غالبؔ'' کراچی میں قائم کیا گیا۔ وہاں بھی غالبؔ پر کتابیں چھپی ہیں۔ لیکن ایسی بھاری بھر کم کتاب تحقیقی مواد کے اعتبار سے وہاں بھی نظر نہیں آتی ہے۔ برصغیر میں آج تک ادبی حلقوں میں ''دیوانِ غالبؔ'' اور ''خطوطِ غالبؔ'' ہی نظر آتے تھے اس لیے کہ غالبؔ کی فارسی تصانیف سے اُردو والے اب واقف نہیں ہیں۔ چہ جائیکہ ان کی نعت و منقبت پر کوئی کام کیا جاتا۔

میں نے چند سال قبل کینیڈا میں ڈاکٹر صاحب کا بے نظیر کتب خانہ دیکھا۔ اس میں اُردو فارسی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے جس سے موصوف شب و روز استفادہ کرتے رہتے ہیں اگر وہ تھوڑے سے عرصہ میں کوئی ضخیم کتاب مرتب کریں تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا۔ جو بھی کتاب وہ لکھتے ہیں اس میں ان کے خلوص کے ساتھ ساتھ محنت و مشقت کا کام بھی کارفرما رہتا ہے۔ نہ معلوم وہ تحقیقی گوشوں کو اُجاگر کرنے کے لیے کیا کیا ہفت خوان طے کرتے رہتے ہیں۔ آج کل دانش گاہوں میں تحقیقی ادب کا فقدان ہے۔ لوگ محنت نہیں کرتے ہیں بلکہ آسان طریقوں سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ مجھے کئی یونی ورسٹی میں کام کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ کسی مقام پر ایک نیا شعبہ وقوع پذیر نظر آیا جس کو میں نقلستان کہتا ہوں۔ اس کی تشریح میں کسی اور وقت کروں گا۔ مقصد یہ کہ غالبؔ پر عرصۂ دراز سے تحقیقی دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب پہلے ادیب ہیں جنھوں نے غالبؔ کے اس پاکیزہ حصۂ ادب کو نہایت دیدہ ریزی سے پیش کیا جس کو ماہرین غالبؔ نے نہ معلوم کن وجوہات کی بنا پر نظر انداز کیا تھا۔ یعنی غالبؔ کا وہ فارسی اُردو کلام جس میں اُنھوں نے عمر بھر محمدؐ و آلِ محمدؐ کی شان میں گل دستۂ عقیدت پیش کیا تھا۔ مرتب نے غالبؔ کے خطوط سے اس قسم کے وہ تعریفی جملے بھی تلاش کر کے کتاب میں یکجا کیے ہیں جن سے ان کے تہذیبی معتقدات روشن ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ غالبؔ کا دیوان نعت و منقبت عشق محمدؐ و آلِ محمدؐ کے موضوع پر غالبیات میں پہلا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے راقم حروف کو کینیڈا سے گزشتہ نومبر میں فون پر اطلاع دی تھی کہ

وہ اس کتاب کی رسم رونمائی دہلی کے علاوہ الہ آباد اور لکھنؤ وغیرہ مقامات پر کروائیں گے اور وہ لکھنؤ 20 دسمبر کو پہنچ رہے ہیں لہٰذا میرا لکھنؤ میں ہونا ضروری ہے۔ کتاب 18 دسمبر 2006ء کی رات میں موصول ہوئی۔ ''حرفے چند'' ٹورنٹو (کینیڈا) میں 28 نومبر 2006ء کو لکھا گیا تھا۔ اتنے قلیل وقت میں کتاب کا دہلی میں اشاعت پذیر ہونا معجزے سے کم نہیں ہے۔ بہرحال میں نے پوری کتاب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تھی۔ ڈاکٹر صاحب 20 دسمبر کو لکھنؤ پہنچے۔ دوسرے دن 21 دسمبر کو لکھنؤ یونی ورسٹی میں جناب پروفیسر آر۔ پی۔ سنگھ وائس چانسلر کی صدارت میں کتاب کی رسم رونمائی ایک بڑے ادبی جلسے میں قرار پائی۔ پروفیسر ولی الحق انصاری مہمانِ خصوصی تھے۔ مقررین میں پروفیسر انیس اشفاق، شارب ردولوی، شاہ عبدالسلام شمس تبریز ندوی اور کاظم علی خان تھے۔ راقم حروف نے مقالہ پڑھا۔ آخر میں ڈاکٹر عابدی صاحب نے اپنی طویل تقریر میں پوری کتاب کا مختصراً جائزہ لیا تھا۔ کتاب کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:-

صفحہ 8: ''رو میں ہے رخشِ عمر'' مرتب کا بیوڈاٹا

صفحہ 10: ''حرفے چند'' میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ''غالبؔ کی نعت و منقبت کے بارے میں اجمالی گفتگو کرنا بحرِ بیکراں کو کوزے میں بند کرنے سے کم نہیں۔ پھر بھی اس سنگ گراں کو میں نے یکہ وتنہا بلند کر کے محرابِ عشق پر جما دیا ہے۔ میری زبان اور میرے بیان پر فارسی کی گہری چھاپ ہے جو شاید میرے فارسی مطالعہ اور ذاتی ماحول کی وجہ سے ہے۔ راقم نے بعض مقامات پر خود فارسی اشعار کا ترجمہ کیا اور بعض مقامات پر اگر فارسی ترجمہ حاصل ہوا تو شکریہ کے ساتھ اس بیاضِ عشق میں شامل کیا۔''

صفحہ 43-13: ''غالبؔ کا زندگی نامہ''

صفحہ 44: ''جدولِ دیوانِ نعت و منقبت'' کے تحت کل اشعار کی تعداد 2888 (اشعار فارسی 2649، اشعار اُردو 239)

صفحہ 51-45: جدولِ دیوانِ نعت و منقبت

صفحہ 60-52: غالبؔ اور ذوق (ادبی معرکہ یا ادبی مغالطہ)

صفحہ 85-61: غالبؔ غزل پڑھتے ہوئے میر سے مغلوب کیوں۔

صفحہ 86-88: نیویارک لائبریری میں دیوانِ غالبؔ کا نایاب نسخہ

صفحہ 89 تا 96: غالبؔ کی حمد پر ڈاکٹر صاحب کا تبصرہ۔ اس کے بعد غالبؔ کی فارسی حمد کے 52 شعر، حمد عرفیؔ کی زمین میں ہے مطلع یہ ہے ؎

اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ

صفحہ 105-138: ''مثنوی ناتمام موسوم بہ ابر گہر بار'' پہلا شعر ؎

سپا سے کز و نامہ نامی شود سخن در گذار گرامی شود

ترجمہ: وہ حمد کہ جس سے تحریر کی آبرو بڑھ جاتی ہے اور بات بیاں میں وسعت پاتی ہے۔

صفحہ 139-144: غالبؔ کی فاتحہ: اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

''ہم قرآن مجید کے پہلے سورۂ حمد کی تلاوت کرتے ہیں اس لیے اس کو فاتحہ پڑھنا یا فاتحہ خوانی کرنا بھی کہتے ہیں۔ برصغیر کے اسلامی ماحول میں شہدأ کی روح کو شاد کرنے اور ان کے وسیلے سے دُعا کرنے کا رواج پرانا ہے، جس میں شربت اور مٹھائی پر فاتحہ پڑھ کر نذرو نیاز تقسیم کی جاتی ہے۔ یہاں فاتحہ پڑھنے والا قبلہ رخ کھڑے ہو کر ہاتھوں کو اُٹھا کر دُعا میں سورۂ حمد پڑھنے کے بعد کچھ مناجاتی یا دُعائیہ اشعار پڑھتا ہے۔ غالبؔ کے فارسی کلام میں ایسی دو فاتحہ ہمیں نظر آتی ہیں۔ پہلی فاتحہ میں (67) اشعار اور دوسری فاتحہ میں (120) اشعار ہیں۔''

اس کے بعد دونوں فاتحہ میں چودہ معصومینؑ کی شان میں غالبؔ کے کہے ہوئے اشعار کی جدول مرتب کی گئی ہے۔ حضور اکرم بخشش میں کہتے ہیں ؎

جرم بخشائے کہ گر جوشد بہار رحمتش
برفنائے خویش لرزد چوں دل مجرم عذاب

(یعنی جب آنحضرت کی رحمت گناہ بخشنے کے لیے جوش میں آتی ہے تو خود گناہ اپنے نابود اور خفا ہونے کے ڈر سے کانپتا ہے جیسے کسی مجرم کا دل سزا کے ڈر سے۔)

دوسری فاتحہ میں دُعا کرتے ہیں ؎

حرمت جان محمدؐ یک نظر کن سوئے من

یا علیؑ یا مرتضیٰؑ یا بوالحسنؑ یا بوترابؑ

دوسری فاتحہ میں دُعا کرتے ہیں۔ اس کے بھی اشعار کی مفصل تشریح محاسن کے ساتھ بیان کی گئی ہے نو اشعار کی تشریح چھ صفحوں پر مشتمل ہے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو

حق جلوہ گرز طرزِ بیانِ محمدؐ ست

آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ ست

اس شعر کا ترجمہ اور وضاحت یوں کی گئی:۔ ''حق ظاہر ہوا حضرت محمد مصطفیٰؐ کے اندازِ بیان سے، ہاں حق کا کلام محمدؐ کی زبان سے جاری ہوا۔'' (تشریح ومحاسن) خدا کی معرفت اور دین اسلام حضرت محمدؐ کی گفتگو ہی سے ظاہر ہوئے اور بے شک قرآن کریم اور احادیثِ قدسی کو ہم نے محمدؐ کی زبان سے ہی سنا۔ مصرعۂ اولیٰ میں ترکیب ''طرزِ بیان'' غالبؔ کا منفرد ''طرزِ بیان'' ہے اور یہی پورے شعر کی جان بھی ہے۔ مسلمانوں سے ہٹ کر قریش کے کفار اور مکہ ومدینہ کے مشرکین بھی اس بات کے قائل تھے کہ پیغمبر اکرمؐ سچے، امین اور صادق تھے۔ ان کی زبان سے کبھی غلط یا جھوٹا بیان ادا نہ ہوا۔ یہی محمدؐ کا طرزِ بیان تھا اور یہی محمدؐ کے لہجے کا اثر بھی تھا کہ جو شخص بھی انھیں سنتا تھا وہ دِل سے ان کی صداقت کا قائل ہو جاتا۔ اسی لیے قرآن کریم اور احادیثِ نبوی کو جب لوگوں نے آپ کی زبان مبارک سے سُنا کسی تامل اور شک کے فوراً قبول کیا اور ان کو من وعن محفوظ کیا۔ مختصر الفاظ میں اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کو، دینِ خدا کو اور کلام خدا کو محمدؐ کے ذریعہ سے پہچانا۔ غالبؔ نے اس شعر میں سورۂ النجم کی آیت تین اور چار سے استفادہ کیا کہ ''اور نہ اپنی خواہش سے منہ سے بات نکالتے ہیں۔ یہ تو حکمِ خدا کہتے ہیں جو بھیجا جاتا ہے۔'' اس شعر میں صنعت مراعات النظیر کی دو مثالیں ہیں یعنی بیان، زبان اور کلام کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے جو ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں۔ حق، کلامِ حق اور محمدؐ کو بھی ایک ہی جگہ نظم کیا گیا ہے۔ اس شعر میں صنعت تلمیح ہے جس میں حق سے مراد ھوالحق، حق تعالیٰ اور کلامِ حق سے مراد قرآن مجید ہے۔ پورا شعر صنعت تعلیق میں ہے۔

صنعت مسجع متوازی میں دونوں قافیے ''بیان اور زبان'' ہیں جو ہم وزن ہم عدد اور

حروف روی میں برابر ہیں۔

صفحہ 189-220: ''غالبؔ کا معراج نامہ'' ہے۔ اس کا جو تجزیہ ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے وہ قابلِ ذکر ہے۔ چناں چہ لکھتے ہیں۔

''فارسی اور اُردو ادب میں اگر معراج ناموں کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ موضوع کا تسلسل مطالب کا ہجوم اور ہر گونہ واقعات، مناظر اور مکالمات کو نظم کرنے میں سہولت کی خاطر عموماً دوسری ہیئت پر مثنوی کو ترجیح دی گئی ہے۔ ہم نے ''مثنویاتِ دبیرؔ'' میں دبیر کے معراج نامہ، جس میں کل 684 اشعار ہیں تفصیلی تحقیقی گفتگو کر کے یہ بتایا ہے کہ یہ مثنوی 1837ء سے قبل کی تصنیف ہے۔ یعنی دبیرؔ کا معراج نامہ بھی تقریباً اسی وقت کی تخلیق ہے جب غالبؔ ''مثنوی ابر گہر بار'' میں معراج نامہ لکھ رہے تھے۔ اور دبیر کے معراج نامہ کے ساتھ بھی دُنیا نے انصاف نہ کیا۔ چناں چہ اس کے شعری محاسن، نادر مضامین اور قادرالکلامی کے بارے میں دُنیائے ادب خاموش ہے۔ اُردو ذخائر میں ہمیں میر ضمیرؔ کی مثنوی ''ریحانِ معراج'' نظر آتی ہے، جس کی دبیرؔ کے کلام پر گہری چھاپ ہے۔''

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے معراج نامہ کا آغاز کیا۔ ذیل میں چند ابتدائی اور آخری شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

همانا در اندیشهٔ روزگار شبے بود سر جوش لیل و نہار

''شبِ معراج کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے۔ زمانے کے خیال میں وہ رات ایسی ہے جو راتوں اور دنوں کا اصل جوہر ہے۔ اور پھر مسلسل بیس پچیس اشعار میں رات کی تازگی، رات کی رونق، رات کی روشنی کا انوکھے انداز میں بیان ہے۔ اشعار تشبیہات اور استعارات میں اپنی معجز بیانی دکھا رہے ہیں۔ الغرض غالبؔ نے شبِ معراج کے رخ کو نہ صرف روشن بلکہ روزِ روشن سے روشن تر کر دیا۔ بلکہ ؎

درآں روز فرخندہ آں شب نخست همه روز خود در ابخورشید شست

اس مبارک دن کو رات نے پہلے تو سورج کے نور سے دن بھر خود کو دھویا اور نور سے ذرے ذرے میں خورشید کی چمک بھر گئی۔

کہ نگاہ درودِ سروشاں سروش

در آں بیکراں قلزم افگند جوش

اتنے میں فرشتوں کا فرشتہ (جبرئیل) وارد ہوا اور اس کی آمد سے نور کا بے کراں سمندر ابل پڑا اور پھر جبرئیل کی تعریف کہ وہ خدا تعالیٰ کا سب سے بڑا دربان ہے۔ جس کی بدولت روح اور عقل کا کام چلتا ہے۔ جو رموز حق سے واقف ہے وہ پیغمبر اکرمؐ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

خداوند گیتی خریدارِ تست

شبست ایں ولے روز بازار تست

نہ زمین اور آسمان کا مالک آپ کا طلب گار ہے اگر چہ کہنے کو یہ رات کا وقت ہے۔ لیکن آپ کے لیے یہی روز بازار ہے۔ ناز برداری کے لیے آپ کو زحمت نہ ہوگی۔ آپ کے لیے موسیٰؑ کی طرح کے کلام کی تکرار نہیں ہوگی۔ آپ کی تو وہ ہستی ہے کہ موسیٰؑ نے جو خدا سے تقاضا کیا تھا، اے خدا مجھ کو اپنا جلوہ دکھا دے وہی تقاضا خداوند یکتا آپ سے کر رہا ہے۔

اب معراج نامہ کے آخری اشعار ملاحظہ ہو ؎

بگوشش زبطع وفا گوش او ہماں میم او حلقۂ گوش او

چوں کہ فطرتِ احمدی میں وفا بھری تھی۔ میم کا فاصلہ ان کی بندگی کا اظہار بن گیا۔

نہ رفتہ برون پائے از نقش پائے

کہ کردہ قدم بر قدم گاہ جائے

جتنی دیر میں نشانِ قدم سے قدم اٹھے۔ اتنی ہی دیر میں وہ اپنے مسکن پر آ گئے۔

شرارے کہ از سنگ آں آستاں

بدر جست از نعل برق جہاں

جو چنگاری ان کے آستانے کے پتھر سے براق کی نعل کی رگڑ سے نکلی (جب براق آپ کو لینے آیا تھا)

ہنوزش قدم در رہِ اوج بود
کہ آمد ز بالا بہ پستی فرود

ابھی وہ شرار اور اوپر ہی جا رہا تھا کہ وہ معراج کا سفر طے کر کے نیچے اتر آئے۔

بجنبش درش حلقۂ در ہماں ز وے گرم بالین و بستر ہماں

باہر جاتے وقت دروازے کی جنبش سے زنجیر کا حلقہ ہلا تھا، وہ اسی طرح ہل رہا تھا۔ بستر اور تکیہ پر ان کے جسم کی گرمی اسی طرح موجود تھی کہ وہ واپس آ گئے۔

سحر گہ کہ وقتِ سجودش رسید
ز ہم نام یزداں درودش رسید

صبح ہوتے ہی جب سجدے (نماز کا وقت آیا تو انھیں خدا کے ہم نام (علیؑ) کی طرف سے درود کی آواز آئی۔

بسا دید در آمد علیؑ از درش و حالِ علیؑ شادیِ دیگرش

علیؑ ان کے دروازے میں خوش و خرم داخل ہوئے اور (خدا کے بعد) علیؑ سے ملنا ایک اور خوشی کا سبب ہو گیا۔

شب از بادۂ قدس ساغر گرفت
صبوحی ز دیدار حیدرؑ گرفت

رات کو انھوں نے نور قدسی کا ساغر پایا
اور صبح علیؑ کے دیدار کا جام ملا

جمال علیؑ چشمۂ نوش بود
صبوحی ہم از بادۂ دوش بود

حضرت علیؑ کا جمال ایک خوش گوار چشمہ تھا اور صبوحی کا جام ملا تو وہ بھی کل والی صہبائے جلوہ کا تھا (نورِ علیؑ بھی نورِ خداوندی کا ہی حصہ تھا)

چو چشمت و ہر چشم راہنشست
ولی انچہ بینند ہر دو یکیست

آنکھیں دو ہیں، ہر ایک کی نظر جدا جدا ہے، لیکن دونوں آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ حقیقت ایک ہی ہے۔

نہ گنجد دوئی در نبیؐ و امامؑ علیہ الصلوٰۃ علیہ السلام

ایک نبیؐ ہے ایک امامؑ، ان کے درمیان کوئی دوئی نہیں ہے۔ نبیؐ پر درود ہو علیؑ پر سلام۔ اس کے بعد صفحہ 331 تا 817 محمدؐ و آلِ محمدؐ کی منقبتیں اور نوحیں ہیں۔ چناں چہ ''غالب کی منقبت'' کے زیرِ عنوان ڈاکٹر صاحب کا ایک طویل مضمون ہے۔ ذیل میں چند جملے اقتباس کے طور پر لکھتے ہیں:-

''غالبؔ کے فارسی اور اُردو کلام میں منقبتی اشعار بصورت قصیدہ، غزل، مخمس، ترکیب بند، ترجیع بند، مسدس، رباعی، مثنوی، قطعہ اور مفرد اشعار بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کے منقبتی اشعار میں غضب کا جوش ہے۔ ظ. انصاری کے لفظوں میں ''حضرت علیؑ کا نام زبان پر آجائے تو غالبؔ کی روح جھوم اُٹھتی ہے...... غالبؔ نے تمام عبادات و فرائض میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسرے نبیؐ اور آلِ نبیؐ کی محبت اور اس کو وہ وسیلہ نجات سمجھتے تھے ہم نے اس مضمون میں غالبؔ کے منقبتی قصاید کو منقبتوں سے اس لیے الگ نہیں کیا کہ منقبت خود قصیدوں کی ایک قسم ہے۔ منقبت کے معنی کسی کی توصیف، ثنا، یا تعریف کرنا ہے۔ شاید ثواب دارین کی خاطر غالبؔ نے اپنے کلام کا ایک بڑا حصہ عشق محمدؐ و آلِ محمدؐ سے چھلکتے ہوئے آبدار اشعار کی تصنیف کے لیے وقف کر دیا اور خصوصاً حضرت علیؑ کی مدح سرائی کو نماز عشق جان کر تمام عمر اسی عبادت میں صرف کر دی۔

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگیِ بوترابؑ میں

علیؑ آں ز دوش نبیؐ را فرش
علیؑ آں ید اللہ را کف کفش

''علیؑ وہ ہیں کہ نبیؐ کا کاندھا ان کی سواری بنا۔ علیؑ وہ ہیں کہ ان کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے۔''

کتاب میں غالبؔ کا ''قصیدۂ ضریحیہ'' بھی ہے۔ قصیدہ کے بارے میں بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کی شانِ نزول مشہور عالمِ دین مولانا سید سلیمان ندوی کے رسالہ ''معارف'' جلد 9، نمبر 4 بابت اپریل 1922ء میں حافظ احمد علی خان رام پوری ناظم کتب خانہ رام پور نے اپنے مضمون ''سراج الدین ظفرؔ شاہ دہلی اور مرزا غالبؔ کی زندگی کا ایک گم شدہ ورق'' میں دو قسطوں میں بیان کی ہے۔ اس کی تفصیلات ہم نے ''نوادر غالبؔ'' مطبوعہ ادارۂ یادگارِ غالبؔ، کراچی 2002 میں درج کی ہیں۔'' مضمون میں ''واقعہ علم'' بادشاہ دہلی کے نصب کرانے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے ایما پر غالبؔ نے ایک بے نام مثنوی ۱۲۷۰ھ (1854ء) میں لکھی۔ اس سے لکھنؤ کے مجتہد العصر سلطان علماء، سلطان واجد علی شاہ اور اہلِ لکھنؤ غالبؔ سے خفا ہو گئے۔ اسی زمانے میں کچھ دنوں کے بعد مئی 1854ء میں لکھنؤ میں کربلا سے خاکِ شفا کی ضریح کا ورود ہوا۔ اس کی پذیرائی لکھنؤ کے طول و عرض کے علاوہ متعدد اخباروں میں ہوئی۔ جب غالبؔ کو اس تبرک کی اطلاع ملی تو اپنی غلطی یعنی مثنوی بے نام لکھنے پر پریشان ہونے اور زیرِ نظر قصیدہ لکھ کر اپنے مخلص دوست سلطان العلماء کی خدمت میں خط کے ساتھ بادشاہ کی خوشنودی کے لیے روانہ کیا۔ موصوف نے اِسے اپنی سفارش کے ساتھ بادشاہ واجد علی شاہ کے پاس بھیج دیا۔ اور یہ بھی لکھا کہ قصیدہ کے ابتدائی اشعار نہایت مبکی ہیں۔ بادشاہ نے قصیدہ کو پسند کیا اور غالبؔ کو انعام و اکرام سے نوازا۔ غالبؔ نے قصیدہ عرفیؔ شیرازی کی زمین میں لکھا تھا۔ مطلع یہ ہے۔ ''زخود گردیدہ بربندی چہ گویم کام جاں بینی۔''

ذیل میں لکھنؤ اور واجد علی شاہ کی مناسبت سے چند شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

بیا در کربلا تا آں ستم کش کارواں بینی
کہ در وے آدم آلِ عباؑ را سارباں بینی
بود تا تکیہ گاہِ نازِ آمرزش پژوہاں را
ضریحے سوئے ہند از خاکِ آں ہشد رواں بینی

ضیائے زاں زیارت گاہ بر روئے زمیں بارد
کہ خاک لکھنو را مردمِ چشم جہاں بینی
مگر در خواب دادند آگہی سلطان عالم را
کہ سوئے شاہ از پیشِ شہنشاہ ارمغاں بینی

مقطع کس زور وشور سے بیان کیا گیا ہے ؎

وگر خواہی کہ بینی چشمۂ حیوان بتاریکی
سواد نظم و نثرِ غالبؔ معجز بیاں بینی

راقم حروف نے اس بلند پایہ کتاب سے بھرپور استفادہ کیا۔ اور غالبؔ معجز بیاں کے پرستاروں اور محبِ اُردو کے میگساروں کے لیے اس بہارِ بے خزاں کا مطالعہ کرنا بے حد مفید ہوگا۔ اس کے مطالعہ سے غالبؔ کے معتقدات کے بارے میں کماحقہٗ واقفیت ہوگی۔ جس عرق ریزی اور جانفشانی سے ڈاکٹر تقی عابدی سلمہ نے اس دفترِ بے مثال کو شب و روز مرتب کر کے حلیۂ طبع سے آراستہ کیا ہے اس کے لیے میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اسے پڑھیے، لطف اندوز ہوئیے اور اپنی معلومات میں اضافہ کیجیے۔

ف۔س۔اعجاز
کولکاتہ

غالبؔ دیوانِ نعت ومنقبت

سید تقی عابدی حسن عابدی ایک غیر مقیم ہندوستانی یعنی NRI ہیں۔ پیشے سے طبی معالج۔ ایم بی بی ایس حیدرآباد، آندھرا پردیش سے کرنے کے بعد .M.S برطانیہ سے، ایف سی اے پی امریکہ سے اور .F.R.C.P کینیڈا سے کی۔

اہل ادب کے لیے خاص بات یہ ہے کہ آپ کا ذوق خاص شاعری، ادبی تحقیق و تنقید ہے۔ ہندوستان کے بعد آپ کا قیام ایران، برطانیہ اور نیویارک میں رہا ہے۔ اب کینیڈا میں مقیم ہیں۔ ان کے علمی وادبی شوق کی پرورش بھی ان کی عمر کے اس حصے میں ہوئی جو اُن ممالک میں گزرا۔ تیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اقبالؔ، انشاء اللہ خان انشاؔ، مرزا دبیرؔ، نجم آفندی، نقش لکھنوی پر آپ نے بڑی حیثیت کے تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں۔ آئندہ کارناموں میں اقبالؔ کی ''شکوہ جواب شکوہ'' کا تجزیہ، ''رباعیاتِ دبیرؔ''، ''فانی لافانی اور'' ''تجزیہ رباعیاتِ فراق گورکھپوری'' خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ مضامین کا ایک مجموعہ ''سبد سخن'' بھی شائع ہوا ہے۔

''غالبؔ دیوانِ نعت ومنقبت'' سید تقی عابدی صاحب کا 800 صفحات پر مشتمل تازہ ترین تحقیقی کارنامہ ہے۔ ان کی یہ کتاب اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ اس موضوع پر غالب کی نہ صرف اُردو اور فارسی شعری تخلیقات بلکہ نثری تحریروں کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے ایک چوتھائی صفحات غالبؔ کی فارسی و اُردو نعتوں، رباعیات و قطعات، فاتحہ، معراج ناموں، امام علیؑ کی شان میں کہی گئی منقبتوں، قصیدوں، امام مہدی، حضرت عباسؑ کے لیے کہے گئے مرثیوں، سلاموں اور نوحوں پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ

چند صفحات پر عبدالباری آسی، کالی داس گپتا رضا اور ڈاکٹر ظ. انصاری کی تحریروں کو جگہ دی گئی ہے۔ غالب کی فارسی مثنوی ''ابرِ گہر بار'' کا ظ. انصاری کا اُردو ترجمہ بڑی خوش سلیقگی سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن کُل 72 میں سے 18 مضامین خود تقی عابدی صاحب کے لکھے ہوئے ہیں۔ کتاب کا مقصد مصنف کے اپنے مضامین سے واضح ہوتا ہے۔ نعت و منقبت کے حوالے سے غالب کے اولاً فارسی اور ثانیاً اُردو کلام کو تحقیق کا موضوع بنانے کی پہلی کوشش سید تقی عابدی نے کی ہے۔

بہترین ریسرچ سے تنقید کو بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ تقی عابدی صاحب کے کئی مضامین اور چند مضامین کے اجزا تحقیق و تنقید کے میدان میں ان کی اصول پسندی کا نمونہ کہے جاسکتے ہیں۔ غالب کے فارسی حمدیہ، نعتیہ، منقبتی کلام کا اُردو ترجمہ و تشریح عابدی صاحب کی ترجمہ و تفسیر کی صلاحیت کا روشن ثبوت ہے۔ ''غالب دیوانِ نعت و منقبت'' کی وجہ سے پہلی بار غالب کی نعتیں اور منقبتیں، قصائد اور سلام وغیرہ دوسرے محققین کی توجہ کا مرکز بنیں گے۔ غالب فطرت کی فن کارانہ دانشوری کا ایک بہترین نمونہ ہے جس کی کامیاب نقالی کی کوشش ناممکن نظر آتی ہے۔ غالب کی مفہومیت تہہ در تہہ ہے۔ اسی لیے کلام غالب کے تشریحی پہلو بھی ان گنت ہیں۔ لیکن نعتوں، منقبتوں وغیرہ کے معنوی تمول Enrichment پر اگر شک نہ بھی کیا جائے تو ان کی مفہومیت غالب کے متصوفانہ کلام سے کم تر درجے کی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ پیغمبر اور بزرگان دین کو موضوع بناتے وقت یا انھیں اپنا مخاطب سمجھتے ہوئے شاعر کو قصداً اور احتیاطاً محدود ہو جانا پڑتا ہے۔ عرفی کے فرمان ''باخدا دیوانہ باشد با محمد ہوشیار'' میں ایک تلقین ہے وہ اسی شعوری محرک کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پیغمبروں اور بزرگان دین کی بارگاہ میں عقیدتیں مجرم ہونا اور میلی ہونا پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے غالب کے اس کلام کے ترجمہ اور تشریح پر کتابِ مقدس کے پاکیزہ سائے تو لہراتے نظر آتے ہیں لیکن غالب کی اصل شاعرانہ فکر کے جلوے اس میں کم نظر آتے ہیں۔ تو کیا ترکِ رسوم کا کیش اپنانے والا غالب جسے موحد ہونے پر ناز تھا مسلک کے نام پر اپنے عقیدے اور عقیدے کے اظہار میں ایک عام روایت پسند اور عاجز سا بندہ تھا۔ یہ سوال بھی اُٹھایا جانا چاہیے تھا لیکن اس سوال کو جذبہ

کی طاقت وررو بہالے گئی۔ البتہ فارسی حمد یہ مثنوی ''ابرِ گہر بار'' ایک انتہائی ارفع درجے کا کلام ہے جس میں خدا کی ثنا از حد لطیف ہے۔ ظاہر ہے حمد ہر مسلک سے اونچی اور تمام مسلکوں میں مساوی طور پر قابل قبول سمجھی جاتی ہے۔ مثنوی ''ابرِ گہر بار'' کا اُردو ترجمہ ظ. انصاری نے بڑے جذبہ سے کیا ہے۔ اس کے سلیس اور پاکیزہ ترجمہ میں روح شرابور ہوجاتی ہے۔ لفظ لفظ شبنم کا قطرہ معلوم ہوتا ہے۔

سید تقی عابدی نے غالبؔ کی حمد، نعتوں اور منقبتوں کے تجزیے الگ الگ باب میں مختلف زاویوں سے کیے ہیں۔ ان کا تجزیاتی طریقہ بڑی حد تک سائنسی ہے اور کسی نئی عقلی راہ پر ہمیں لے پہنچتا ہے۔ میں بہت اختصار سے ان کے ایک مضمون ''غالبؔ کی منقبت'' صفحہ 380 سے ایک حوالہ دینا چاہوں گا۔ ابتداء میں ڈاکٹر ظ. انصاری کا ایک فقرہ تقی عابدی نے نقل کیا ہے کہ ''حضرت علیؑ کا نام زبان پر آجائے تو غالبؔ کی روح جھوم اُٹھتی ہے۔'' پھر ''یادگارِ غالب'' سے حالیؔ کی یہ عبارت تحریر کی ہے کہ ''غالب نے تمام عبادات و فرائض میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسرے نبیؐ اور آل نبیؐ کی محبت اور اس کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔'' آگے چل کر مصنف نے ڈاکٹر فاروقی کے غالبؔ کے علوی نظریۂ حیات کو مانتے ہوئے اپنی تلاش و تعبیر عمدگی سے بیان کی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''وہ علوی انسان "Superman" کا تصور جو نطشے نے گوئٹے کے فاؤست سے لے کر اپنے نظریات میں عروج پر پہنچایا اُسی غالبؔ کی تخلیق میں حضرت علیؑ کی صورت و سیرت میں موجود تھا جس کا عکس غالبؔ کی فارسی کی اس غزل میں ملتا ہے جسے علامہ اقبالؔ نے ''جاوید نامہ'' کی انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑ دیا ہے ؎

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم
قضا بگردنِ رطل گراں بگردانیم
ز حیدریم من و تو زما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

ترجمہ: آؤ تاکہ آسمان کی گردش کو پلٹ دیں، تقدیر جو لکھی جا چکی بدل دیں، تو اور میں حیدری ہیں اور یہ ہمارے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر ہم نے ڈوبتے سورج کو پکڑ لیا ہو۔''

اب دیکھئے موضوع کا محور مسلکی ہی سہی لیکن اس پر تنقید کا ذہن ماورائے مسلک ہے اور نطشے کے سپر مین تک رسائی حاصل کرنے میں آزاد ہے۔ اور جس طرح غالبؔ خود کو بندگی میں ''آزاد اور خود بین'' سمجھتا تھا اسی طرح سید تقی عابدی نے اپنی تنقید کو آزاد اور خود بین بنانے کی جا بجا کوشش کی ہے۔

''غالبؔ کی حمد'' عنوان کے تحت اپنے مضمون میں عابدی صاحب لکھتے ہیں:

''ہمیں سخت تعجب ہوتا ہے کہ اُردو فارسی کے اس عظیم شاعر کی حمدوں کے بارے میں کوئی خاطر خواہ تحقیقی و تنقیدی کام تو ایک طرف اس عمدہ کلام سے عوام نہیں، بلکہ خواص بھی نا آشنا ہیں۔'' اور واقعی تقی عابدی اپنی پہلی نظر کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں جو ''غالبؔ دیوانِ نعت و منقبت'' جیسا شاہکار منظر عام پر لے آئے۔

غالبؔ کے دیوانِ نعت و منقبت کے جدول کو عابدی صاحب نے اپنی کتاب میں خاص جگہ دی ہے۔ اس کے مطابق غالبؔ کے نعتیہ و منقبتی اشعار فارسی میں 2649 ہیں، جب کہ اُردو میں صرف 239 ہیں۔

غالبؔ پر بنی فلموں نے لوگوں کو غالبؔ کی زندگی میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا ہے، لیکن فلم کے پردے پر دکھائی گئی غالبؔ کی زندگی تفریحی بخش زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ادب میں تحقیق کرنے والے غالبؔ کی زندگی میں اپنے اپنے طور پر دلچسپی لیتے ہیں۔ تقی عابدی کی اس کتاب کا سب سے دلچسپ باب غالبؔ کا زندگی نامہ ہے جو 31 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں غالبؔ کے مذہب پر 11 صفحات میں جو روشنی ڈالی گئی ہے۔ تقی عابدی کی اس کتاب کا نظریہ اسی سے متعین ہوتا ہے۔ الطاف حسین حالیؔ، مالک رام، کالی داس گپتا رضا، میکش اکبر آبادی، جوش ملسیانی، پروفیسر البرٹ تھائی لے، پروفیسر انا ماری شمل، پروفیسر الی ساندرا بوسانی، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، ادیب رائے پوری و دیگر اسکالروں کے غالب کے مذہب کے بارے میں نظریات اور بیانات اقتباس کی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ان

سے یہ ثابت ہے کہ غالبؔ اہل تشیع تھے لیکن ان کا حلقۂ احباب بیشتر اہل تسنن پر مشتمل تھا۔ غالبؔ کے انتقال پر حکیم محمود خاں اور نواب ضیاء الدین نے ان کی آخری رسمیں سنّی مسلک کے مطابق ادا کیں۔ غالباً وہ غالبؔ کو سنّی ہی سمجھتے تھے۔ ایسا اس وجہ سے ہوا۔

صفحہ 33 پر غالبؔ کے خط بنام مرزا حاتم علی مہرؔ سے ایک اقتباس پیش کیا گیا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں:

''صاحب! بندہ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمہ پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو۔ ہم تم ایک آقا کے غلام ہیں۔''

آگے چل کر تقی عابدی لکھتے ہیں:

''......لیکن یہ بھی واقع ہے، کہ ان کی شیعیت صرف اسی حد تک ہے کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو تمام دوسرے صحابہؓ پر ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ انھوں نے باقی صحابۂ رسول کو ستاروں اور حضرت علی کو چاند سے تشبیہ دی ہے......اس کی تعبیر ہم دوسرے لفظوں میں یوں بھی کر سکتے ہیں کہ ان کی شیعیت کا امتیازی نشان تبرا نہیں، بلکہ تولاّ ہے۔ یعنی وہ دوسرے صحابہ پر تبرا نہیں کرتے بلکہ حضرت علی سے اپنے تولاّ و محبت کا شدت سے اظہار کرتے ہیں۔ اب یہ کوئی مخصوص شیعی عقیدہ نہیں بلکہ تفضیلہ سنّی بھی یہی مسلک رکھتے ہیں۔'' (صفحہ:35)

سید تقی عابدی کی یہ کتاب غالبؔ کے دینی مسلک پر پورا زور صرف کرتی ہے۔ ایمان کی بات ہے اس اپروچ کے بغیر نہ یہ کتاب اپنے مقصد کو پاتی اور نہ غالبؔ کا اولین دیوانِ نعت و منقبت تیار ہوتا۔ صفحہ 30 پر مصنف نے لکھا ہے۔

''ماہرین غالبیات نے...... غالبؔ کے اشعار میں بال کی کھال نکالی ہے۔ غالبؔ کی نجی زندگی پر تبصروں میں ولایتی شراب کے نام اور ان کے دام تک ملتے ہیں لیکن ان کے نعتیہ اور منقبتی کلام کے جام کا ذکر تک نہیں ملتا۔''

بہر حال اس بحث سے غالبؔ کی شخصیت اور شاعری میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میری نظر میں شاعری خود ایک مذہب ہے۔ اور جیسا کہ پیشتر حالیؔ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔ ''غالبؔ کا مذہب صلح کُل تھا اور انھوں نے تمام عبادات و فرائض میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحیدِ وجودی اور دوسری نبیؐ اور آل نبیؑ کی محبت اور اس کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔'' (صفحہ: 31)

میری ناقص رائے میں غالبؔ کی عظمت حالیؔ کی اسی رائے سے طے پاتی ہے۔ لیکن اس کے مسلک اور اس کے اقرار کو تقی عابدی کی اس کتاب کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ انھوں نے اپنی قلندرانہ طبیعت سے بے جا تکلفات کے پردے اُٹھا دیئے ہیں۔

چوں کہ یہ ایک تحقیقی کتاب ہے اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی پروف ریڈنگ کی غلطیوں کی طرف اشارہ کردیا جائے۔ مثلاً زندگی نامہ میں غالبؔ کی پیدائش کا سال 1897 عیسوی لکھا ہے۔ یہ 1797 عیسوی ہونا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر امام اعظم
کولکاتہ

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی: اقبالؔ اور غالبؔ کے مخفی گوشے

ڈاکٹر سید تقی عابدی اُردو کے معروف و معتبر شاعر، نقاد، محقق اور دانشور ہیں۔ ان کی کئی معرکۃ الآرا کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور داد و تحسین وصول کر رہی ہیں۔ پیشہ سے ماہر امراض قلب ہیں لیکن تحقیق سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ تحقیق کرنا عرق ریزی کا کام ہے۔ تحقیق میں صرف منطق اور استدلال سے کام نہیں چلتا ہے۔ تحقیق میں حقیقت کے لیے ثبوت فراہم کرنا پڑتا ہے اور ثبوت فراہم کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ کینیڈا میں رہ کر یہ اور بھی مشکل کام ہے۔ پورے برصغیر میں سید تقی عابدی کے تحقیقی کارنامے بڑی وقعت اور اعتبار رکھتے ہیں اور بعضوں کو دیکھ کر تو اہل نظر و اہل قلم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ فروعی اور غیر ضروری باتوں سے ناطہ جوڑ کر کوئی بات طے کر لینا اور بھونڈی دلیلوں سے منوانے کی کوشش کرنا ایک عام سی بات ہے لیکن عرق ریزی کر کے سند کے ساتھ کوئی نئی بات پیش کرنا اور ندرت کے ایسے پہلو کھوج نکالنا جہاں تک عام افراد کی رسائی مشکل ہو ایک ایمان دار شخص کا کام ہے۔

اقبالؔ سے متعلق ان کی تحقیقات کتاب ''چوں مرگ آید'' ہے جس میں علامہ اقبالؔ کی زندگی کے آخری ایام، ان کی علالت اور ان کی تشخیص، طب سے واقفیت، جدید ایلوپیتھی سے استفادہ اور دیگر مخفی پہلوؤں کو اس کتاب میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی وہ تمام باتیں جو غیر مستند تھیں ان کو رد کیا گیا ہے۔ سید تقی عابدی چوں کہ خود بھی سرجن ہیں، بیماری اور اس کی علامتوں کے اثرات نیز اس کی صورت سے واقف ہیں اس لیے ایسی باتیں جو محض اقبالؔ سے اپنی قربت ثابت کرنے کی کوشش میں علامہ اقبال سے منسوب کر دی گئی ہیں ان پر بے لاگ تبصرہ بھی کیا ہے۔ چند اقتباسات یہاں نقل کر رہا ہوں:

''ہم یہاں پر عادلانہ قضاوت کر کے یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ اگر یہ کوتاہیاں علاج کے راستے میں حائل نہ ہوتیں تو علامہ کا علاج شاید کامیاب رہتا اور یہ چراغ جو بقول خود اقبال ع ''بارِ پرستارانِ شب دارم ستیزم''۔ ظلمت اور اندھیرا پھیلانے والوں سے لڑ رہا تھا اور کچھ مدت اپنی روشنی سے فیض پہنچاتا۔'' (عنوان: تشخیص اور علاج کی کوتاہیاں، ص:110)

''ایسا لگتا ہے چڑیا کو مارنے کے لیے توپ استعمال کی گئی۔ چناں چہ چڑیا تو اڑ گئی لیکن دیوار گر گئی۔ بھوپال میں تین برقی کورس جسے علامہ نے اپنے خط میں Ultra Violet Rays کا غسل لکھا ہے غیر ضروری اگر نہیں تو ضروری بھی نہیں تھے۔ یہاں علامہ کی زندگی اور موت کا سوال نہ تھا اس غیر کنٹرول ابتدائی برقی ایکسپوژر کے کئی مضمرات ضرور ہوئے ہوں گے۔ اگر چہ علاج کہ بعد آواز ٹھیک نہ ہوئی لیکن علامہ کا چہرہ زرد، چہرے پر کبھی کبھار ورم، ضعف اور دمہ قلبی کا نمایاں اور زیادہ ہو گیا شاید اس علاج نے ہڈیوں پر اثر کر کے خون کو جلا دیا اور علامہ کم خونی (Anemia) سے دو چار ہو گئے ہوں جس کا منفی اثر پھیپھڑوں اور قلب پر پڑا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کمزور پھیپھڑوں کو برقی علاج کی وجہ سے نقصان پہنچا اور وہ سخت ہو کر پھیلنے اور سکڑنے کی کیفیت کو کھو چکے ہوں۔ اس علت کو Pulmonary Fibrosis کہتے ہیں جو Radiation کے مضر اثرات میں شامل ہے۔'' (ص:111)

''کہتے ہیں بڑے آدمی کی چھوٹی بات بھی بڑی ہوتی ہے۔ جیسا کہ مختلف خطوں میں خود علامہ اقبال نے لکھا کہ لوگ میری بیماری میں اس لیے دلچسپی لے رہے ہیں کہ تا کہ وہ دیکھیں ڈاکٹروں کو کب شکست ہوتی ہے یعنی ایلوپیتھک (انگریزی دواؤں) کو طبی (یونانی دواؤں) سے کب شکست ہوتی ہے..... نیویارک کے ممتاز طبیب اور شاعر ڈاکٹر عبدالرحمٰن

عہد جو علامہ اقبالؔ سے والہانہ محبت کرتے ہیں مجھے ایک کتابچہ کی فوٹو کاپی روانہ کی جسے انھوں نے حکیم نابینا کے نبیرہ ڈاکٹر انصاری صاحب سے حاصل کی جن کے ہم مشکور ہیں جس میں روح الذہب کے معجزہ نما خواص پر گفتگو کی گئی ہے کہ یہ نسخہ پانچ ہزار سال قدیم ہے جس میں سونے کو بطور دوا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کتابچہ کے صفحات 30 اور 31 پر مزید لکھا ہے کہ...... افتخار قوم و ملت علامہ اقبالؔ مرحوم اعلیٰ اللہ مقامہ کے بائیں گردے میں اس قدر بڑی پتھری تھی کہ ایکس ریز دیکھ کر ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ گردہ اس کی ضخامت کی تاب نہ لا کر پھٹ جائے گا اور آپریشن اس کے لیے محال بتایا گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو عرصے سے قلبی عارضہ تھا۔ روح الذہب کے استعمال سے صرف 24 گھنٹے میں پتھری بلا تکلیف ریزہ ریزہ ہو کر پیشاب سے خارج ہو گئی۔ راقم نے درد گردہ Renal Colic کے بیان میں اس پر گفتگو کی۔ اس قسم کے معجزات کو جدید طب قبول نہیں کرتی۔''

(عنوان: دواؤں کے نام، ص: 120-121)

یہ ایسا کام ہے جو تحقیقی ہونے کے باوجود الفاظ کی بازیگری سے احتراز کرتے ہوئے سامنے لایا گیا ہے جس سے اُردو دُنیا ناواقف تھی۔ یہ تحقیق اقبالؔ سے متعلق اور اقبالؔ کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبالؔ کتنے زبردست قوت ارادی کے مالک تھے۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے لیکن دُنیاوی طریقوں اور علمی بصیرت سے اس کی مدافعت کرنے کی کوشش نہ چھوڑی۔ ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا اور زندگی کے آخری دور میں بھی وہ دینی اور ملی جذبہ سے سرشار رہے۔

پیشِ نظر دوسری کتاب بنام ''غالبؔ دیوانِ نعت و منقبت'' بھی خاص تحقیقی نوعیت کی ہے۔ میرے خیال میں غالبؔ دُنیائے شاعری میں اُردو دیوان کی بدولت غالب ہوئے۔ اس لیے عام طور پر غالبؔ شہنشاہ غزل کے طور پر جانے جاتے ہیں لیکن غالباً پہلی بار ڈاکٹر تقی عابدی نے اُردو فارسی دونوں زبان میں غالب کی حمد، نعت، منقبت و مرثیے کا

دیوان مرتب کیا ہے اور اس پر ناقدانہ نظر ڈال کر معین کیا ہے اس سلسلے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ ایسی کتاب برصغیر میں اب تک موجود نہیں جس میں غالب کے حمدیہ، نعتیہ اشعار، مرثیے اور منقبت پر علیحدہ سے بحث کی گئی ہو۔ دُنیا کے سامنے غالبؔ کو ہمیشہ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہی پیش کیا گیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تنگنائے غزل کے شکوے کا مداوا غالبؔ نے غزل کے کینوس کو وسیع کر کے کیا۔ اسی طرح غالبؔ کے دست قدرت میں مذکور اصناف نے بھی خوب گل کھلائے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے فن، جذبہ، عقیدہ، مسلک، مذہب اور محبت ہر پہلو کا ناقدانہ و محققانہ جائزہ لیا ہے جو اُردو تحقیق میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ غالبؔ بھی معتقد میرؔ تھے اور اس ضمن میں ڈاکٹر عابدی نے غالبؔ کی غزل پر غالب ہوتے ہوئے بھی میرؔ سے مغلوب کیوں ہیں؟ انتہائی دلچسپ اور معلومات افزا مباحثہ پیش کیا ہے:

> ''ہم نے اس مضمون میں غالبؔ کی مشہور غزل ''نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا'' کو منتخب کر کے اسی بحر، ردیف اور قافیہ میں کہی گئی چار متقدمین کی غزلوں سے مقابلہ کیا ہے جو ادب کے طالب علموں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ غالبؔ کی اس غزل میں، جو ان کے دیوان کی سب سے پہلی غزل قرار دی گئی ہے، صرف پانچ اشعار ہیں جن کے چھ مصرعوں میں قافیے تحریر تصویر، شیر، شمشیر، تقریر اور زنجیر باندھے گئے ہیں...... ایک ہی بحر میں ہم قافی اور ردیف اشعار کا مقایسہ اس لیے دلچسپ ہے کہ مختلف عظیم شعراء کی قوتِ تخیل اور فن تغزل کو کس حد تک ایک ہی معیار پر تولا جا سکے۔'' (ص:62)

ظاہر ہے ہر بڑے شاعر کی زمین میں اسے عمدہ غزل کہنے کی روایت قدیم ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے غالبؔ نے اس روایت کو جاری رکھا۔ لیکن سب سے بڑی چونکا دینے والی بات سید تقی عابدی نے یہ کہی ہے کہ جب Paradise lost جو خالص عیسائی عقیدہ کی تشریح پر مبنی ہے، لکھ کر ملٹن عالمی شعر و ادب کا عظیم شاعر قرار پاتا ہے تو لگتا ہے کہ غالبؔ کی مذہبی، مسلکی شاعری کو سازشی طور پر پس پشت ڈال کر غالبؔ کی شاعرانہ عظمت

کومجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر غالبؔ کے مذہبی عقیدے اگراس کے اشعار میں موجود ہیں تو اس کو ہائی لائٹ کرنے میں اُردو کے محققین کو کیا دشواری تھی۔ اس لیے سید تقی عابدی نے اپنا یہ فرض منصبی سمجھا کہ وہ غالبؔ کے مذہبی عقائد اور شعری پیرایۂ اظہار جس سے ان کا مسلکی تعلق اور عقیدت کا پتہ چلتا ہے اسے پیش کیا جائے اور ان کی شاعرانہ عظمت کو اجاگر کیا جائے۔ یہ ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے اور اُردو تحقیق میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

اس تصنیف کی بابت خود ڈاکٹر سید تقی عابدی نے لکھا ہے کہ ''سچ تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ غالبؔ کی نعت و منقبت کے بارے میں اجمالی گفتگو کرنا حقیقت میں بحر بیکراں کو کوزے میں بند کرنے سے کم نہیں۔ پھر بھی اس سنگِ گراں کو میں نے تنگ و تنہا بلند کر کے محرابِ عشق پر جما دیا ہے۔ راقم نے بعض مقامات پر خود فارسی اشعار کا ترجمہ کیا اور بعض مقامات پر اگر عمدہ فارسی ترجمہ حاصل ہوا تو شکریہ کے ساتھ اس بیاضِ عشق میں شامل کیا تا کہ میرا مقصد اور ان علمائے ادب کے کام کی قدر دانی ہو سکے۔ اس کتاب میں مرحوم ڈاکٹر ظ۔ انصاری، مرحوم عبدالباری آسیؔ کے ترجموں کے ساتھ ساتھ آنجہانی کالی داس گپتا رضاؔ کے مقدمہ کے اقتباس کو بھی شامل کیا گیا ہے۔'' (حرفِ چند، ص:10)

سید تقی عابدی ایک بصیرت افروز، ایماندار اور مستند محقق کی صف میں کھڑے ہیں۔ ان کا کوئی بیان محض قیاس آرائیوں پر مبنی نہیں ہے۔ تحقیق کے جملہ شرائط کا نفاذ وہ اپنے تحقیقی کاموں میں کرتے ہیں اور بہت ہی عرق ریزی کے ساتھ۔ تو جوئے شیر لانے سے کم یہ تحقیقی کارنامے نہیں ہیں۔

بقول غالبؔ:

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
حیدرآباد، دکن

چوں مرگ آید

شاعر مشرق علامہ اقبال اُردو ہی نہیں دُنیا کی اور کئی زبانوں کے ان گنے چنے شاعروں میں سے ہیں جن کی حیات، شخصیت اور شعری و ادبی خدمات کے بارے میں، بہت کچھ تحریر کیا گیا ہے۔ یوں تو آج بھی لکھا جا رہا ہے لیکن تکرار بھی اتنی ہی ہو رہی ہے چناں چہ اب اقبال پر سنجیدگی سے قلم اُٹھانے والوں کے لیے لمحۂ فکر ہے کہ وہ کس موضوع کو اختیار کریں۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری کے کس گوشہ کو عنوان بنائیں کہ کہی ہوئی باتیں زیادہ دہرانے میں نہ آئیں۔ ہر چند کہ اقبال کی علالت اور ان کے آخری ایام زندگی پر سید نذیر نیازی، خالد نذیر صوفی، جاوید اقبال، فقیر سید وحید الدین، عبدالمجید سالک، صہبا لکھنوی، ممنون حسن خاں، غلام رسول مہر اور دیگر اصحاب قلم نے بھی قلم اُٹھایا ہے لیکن ڈاکٹر تقی عابدی نے جو اپنے وطن سے دور کینیڈا میں مقبول میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ اقبال کے مکاتیب، مستند حوالوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں علامہ اقبال کی بیماریوں اور ان کے مرض الموت کی تحقیق کرتے ہوئے ایک نیا منظر نامہ سامنے لایا ہے۔ کوئی اور شخص بھی یہ کام کر سکتا تھا جیسا کہ بعض لوگوں نے تھوڑا بہت کیا بھی ہے لیکن ایک میڈیکل ڈاکٹر اور پھر سید تقی عابدی جیسے ممتاز فزیشین نے اقبال کی علالت کے بارے میں قلم اُٹھاتے ہوئے، مرض، مریض اور علاج کے مختلف پہلوؤں اور باریکیوں پر نظر رکھی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کو شعر و ادب سے بھی اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی اپنے پیشہ طب سے۔ اس لیے انھوں نے ادبی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے طبی نکات پر بھی خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ اور پھر اپنے حامل تجزیہ و تحقیق کو بعنوان ''چوں مرگ آید'' کتابی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ آخری عمر میں اقبال کے علاج کے تعلق سے کیا کمیاں رہیں۔ متعلق افراد اور خود اقبال نے مرض اور علاج کے بارے میں کہاں تساہل برتا۔ حالاں

کہ اقبال کے علاج کے سلسلے میں اس دور میں حاصل جملہ ترقی یافتہ اور جدید علاج اور ادویہ کو کام میں لایا گیا تاہم بعض باتیں ایسی رہیں جن پر جس قدر کہ دی جانی چاہیے تھی توجہ نہیں دی گئی۔ انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔ اس باعث مرض نے شدت اور پیچیدگی اختیار کی اور طول کھینچا۔ سچ پوچھیے تو اقبال کئی عارضوں کا شکار رہے۔ جیسے عوارض چشم، عوارض گردہ، نقرس، عوارض قلب، پھیپھڑوں کی تکالیف، درد گلو، امراض دہاں، ملیریا اور کم خوابی وغیرہ۔ بعض بیماریاں کبھی رہیں اور بعض آتی جاتی رہیں اور بعض نے ان کے جسم پر قبضہ جمائے رکھا۔ اس کے وجوہ بھی رہے۔ اقبال کا مزاج اور ان کی غذائی عادتیں مثلاً یہ کہ اقبال نے کم از کم 35-30 سال تک تمباکو نوشی کی، ورزش پر توجہ نہیں دی، مرغن اور مچرب غذائیں...... دیسی گھی وغیرہ زیادہ نمک اور میٹھے کا مسلسل استعمال، اکسیروں معجونوں اور کشتوں کا استعمال جن میں سونے چاندی اور دیگر دھاتیں شامل ہوں جو قلب و جگر کے لیے مضر ہوتی ہیں۔ یہی نہیں تقی عابدی نے تفصیل سے لکھا ہے کہ ''اقبال اوائل جوانی میں تیز چٹ پٹے اور مرغن کھانوں کے علاوہ شلغم کا اچار شوق سے کھاتے تھے۔ انھیں بعض اوقات بدہضمی، سوئے ہاضمہ اور تبخیر معدہ کی شکایت ہو جاتی تھی۔ فی زمانہ تمباکو نوشی کو تبخیر معدہ کی علت بتایا جاتا ہے جو اقبال کا سب سے پسندیدہ شوق تھا۔'' میں اس سلسلے میں ڈاکٹر تقی عابدی کے دو، تین جملہ نقل کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ انھوں نے لکھا ہے: ''عجب نہیں کہ اقبال کی ہر روز یونانی اور ایلو پیتھک دوائیں معدہ کی دیوار کو متورم کر کے تبخیر پیدا کر دیتی ہوں۔ اقبال کی کئی دواؤں میں کشتہ ملا ہوا تھا جو کچی دھات یا ان کے مرکبات سے بنا ہوتا۔ جدید تحقیقات میں یہ تمام مرکبات اگر زیادہ مقدار میں ہوں تو مضر ہوتے ہیں۔ تبخیر معدہ کی وجہ سے اقبال کا معدہ کمزور ہو چکا تھا ان کی بھوک مر چکی تھی اور ان کی خوراک بھی کم ہو چکی تھی۔'' (ص:62)

''اقبال قلب کے مریض تھے ہی، قلب کی رگیں تنگ ہو جانے کی وجہ سے قلب کے عضلات کو خون کی نارسائی نے کمزور کر دیا تھا۔ مزید تفصیل میں گئے بغیر عرض کرنا یہ ہے کہ نتیجتاً جگر پھیل گیا تھا، دل بڑا ہو گیا تھا اور بدن میں پانی جمع ہونے کی وجہ سے بدم متورم ہو گیا تھا۔ اقبال نے اپنی بیماریوں کے لیے ایلو پیتھک (انگریزی) علاج کرایا ضرور لیکن یہ علاج بنیادی طور پر انھیں پسند نہیں تھا۔ ان کی ناپسندیدگی اور بدظنی کو ہوا بھی ملی۔''

ڈاکٹر تقی عابدی کی زبانی سنئے: ''اقبال کے اطراف قریبی دوستوں میں شامل کچھ حکیم اور کچھ نیم حکیموں نے بھی اس نفرت کی آگ کو ہوا دی اور اقبال کو ایلو پیتھک علاج سے بدظن کر دیا۔ چناں چہ وہ بسا اوقات ایلو پیتھک علاج سے صریحاً انکار کر دیا کرتے تھے۔'' بقول ڈاکٹر عابدی: ''جس زمانے میں علامہ مرض الموت سے فریش تھے، اسی زمانے میں لاہور میں جرمن کے دو عمدہ طبیب ڈاکٹر ژیلشر اور ڈاکٹر کالیش مطب کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ژیلشر نے صحیح تشخیص دی اور علاج کرنے کی خواہش کی لیکن انھیں صرف مشورہ دینے کی حد تک رکھا گیا اور ان کا علاج جو ایلو پیتھک علاج تھا نہیں کرایا گیا۔ کاش کہ انھیں علامہ کے علاج کا موقع فراہم ہوتا۔'' جیسا کہ تقی عابدی لکھتے ہیں: ''یہ ایک افسوس ناک اقدام تھا۔'' ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی حیات پر تحریر کتابوں سے تو استفادہ کیا ہی ہے انھوں نے خطوط کا بھی نہایت غائر نظر سے جائزہ بھی لیا ہے۔ حتیٰ کہ کسی خط میں ایک آدھ جملہ اور چند الفاظ بھی مل گئے تو انھیں کام میں لایا ہے۔ اس طرح کوئی (251) خطوط ہیں۔ جن میں اقبال نے اپنی علالت اور ادویہ وغیرہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ اقبال کو لاحق عوارض میں آواز کا بیٹھ جانا بھی ہے۔ آواز کا بیٹھ جانا ان کی آخری علالتوں میں بہت زیادہ موضوع گفتگو رہا۔ اس کے علاج کے لیے انھوں نے زیادہ اور خصوصی توجہ دی۔ بھوپال میں تین مرتبہ بجلی کا علاج ہوا۔ حتیٰ کہ وہ اس عارضہ کے لیے ویانا بھی جانا چاہتے تھے۔ اقبال کو اپنی آواز کے بارے میں کتنا تردد تھا۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے 30 معالجین میں سے اکثر اس کے علاج میں مہارت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے یہاں بھی اقبال کے علاج کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کی آواز بیٹھ جانے کی جو علامتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے اکثر آج جدید طبی نقطۂ نظر سے مسترد کی جا سکتی ہیں۔ علامہ اقبال کے گردے کے درد کے بارے میں بھی انھوں نے حکماء کے علاج سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی بات کہی ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ اقبال کی آواز بیٹھ جانے کے علاج میں کچھ غلطیاں ضرور ہوئیں۔ نہ صرف یہ کہ اقبال طب یونانی کی طرف مائل رہے بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ کسی معتقد نے کہیں ذکر کر دیا یا خط میں کسی دوا کے بارے میں لکھ دیا تو اس کے حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ مثلاً سید نذیر نیازی کے خط مورخہ 22 مئی 1934ء میں لکھا: ''سنا ہے ہندوستانی

دواخانہ دہلی میں کوئی شربت ہے جو گلے کی بیماریوں کے لیے مفید ہے۔ اگر یہ بات درست ہوتو آپ وہاں سے ایک بوتل شربت بذریعہ وی. پی. میرے نام بھیج دیں۔'' کبھی لکھا:''ایک ایرانی الاصل سیدزادہ کی دوا سے بہت فائدہ حاصل کیا۔ کیا عجب کہ آواز پھر عود کرآئے اس کا دعویٰ تو یہی ہے۔''غرض وہ چاہتے تھے کہ اور کچھ نہ ہو آواز عود کرآجائے کہ وہ اپنی زندگی کے لگ بھگ آخری (ساڑھے آٹھ) سال آواز کے بیٹھ جانے سے متاثر رہے۔ یہ معاملہ اس لیے بھی باعث تشویش تھا کہ اقبالؔ کی مصروفیات، ان کی علمی ادبی سرگرمیاں بلکہ ان کا مقصد حیات متاثر ہورہا تھا۔ انھوں نے جلسوں وغیرہ میں تقریر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بیرسٹری کا کام بھی پہلے کم اور بعد میں ترک کردیا۔ قرآن حکیم کی بہ آواز بلند تلاوت جو ہر صبح کیا کرتے تھے بند کردی۔ سیاست اور انتخابات میں بھی شرکت نہیں ہونے لگی اور لاکھوں باتوں کی ایک بات یہ کہ ان کی نفسیات پر گہرا اثر پڑا اور وہ عام طور پر غمزدہ نظرآنے لگے۔ گویا۔ آپ اپنی شخصیت سے وہ محروم ہوتے جارہے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید بیماریوں کے ان مسلسل اور مستقل حملوں سے مایوس ہو جاتا اور اپنی تاب وتوانائی کھو بیٹھتا لیکن اقبالؔ نے ایک مردِ مومن کی طرح زندگی کا آخر تک سامنا کیا۔ بیماریاں بڑھیں، پیچیدہ ہوئیں۔ کبھی جیتے کبھی ہارے۔ انھوں نے موت سے چند گھنٹوں قبل درد کم کرنے کے لیے افیونی دواؤں کے استعمال کو یہ کہہ کر رد کردیا کہ میں نیم بے ہوشی یا بے ہوشی کی حالت میں مرنا نہیں چاہتا۔ چناں چہ دوا لینے سے انکار کردیا اور متبسم چہرہ کے ساتھ اس دارِفانی سے کوچ کیا۔ وہ تو یہ کہہ ہی چکے تھے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

جن اصحاب نے میت کو دیکھا وہ اس کی توثیق کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے جس زاویے سے یہ کتاب تحریر کی ہے وہ اہمیت رکھتی ہے۔ خطوط سے مواد اکٹھا کر کے کوئی بھی ایسی کتاب لکھ سکتا تھا لیکن ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ایک میڈیکل ڈاکٹر کی حیثیت سے یہ کتاب تحریر کر کے اقبالؔ کی زندگی کے آخری ایام، ان کے امراض، ادویہ، پرہیز اور اقبالؔ کے مزاج کو ایک ادیب کے بطور ہی نہیں ایک ماہر ڈاکٹر کی حیثیت سے بھی آئینہ کردیا ہے۔ یہ کتاب اقبالیات میں بلاشبہ اضافہ ہے۔

افضل خان نیرؔ

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب ''چوں مرگ آید'' پر

-:اظہارِ خیال:-

ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسے مستند اور مشہور اُردو دان کی کتاب پر تبصرہ کرنا میرے بس کی بات نہیں البتہ یہ کتاب پڑھ کر جو خیالات اور احساسات قائم ہوئے انھیں ''اظہارِ خیال'' کے طور پر رقم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ ہاں میرا ''اظہارِ خیال'' اس لحاظ سے اہم ہے کہ ایک کہنہ مشق تبصرہ نگار کے بارے میں یہ دیکھنا کہ ایک عام قاری کیا رائے قائم کرتا ہے۔

اس منفرد کتاب ''چوں مرگ آید'' کا سرورق علامہ اقبال کی بلیک اینڈ وائٹ فوٹو گراف پر مشتمل ہے اور بلیک اینڈ وائٹ فوٹو گرافی میں بھی ایک منفرد حسن ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے سرورق سادہ اور خوب صورت ہے۔

مجھے سرورق دیکھ کر یوں لگا جیسے سیاہ پس منظر میں علامہ اقبال کا منور چہرہ شب کی تاریکی میں نوید سحر دے رہا ہو۔'' اس سرورق کی تصویر میں علامہ اقبال کے چہر پر ہلکے سے تبسم کا گمان ہو رہا ہے۔

اس کتاب میں ایک ایسے ہی تبسم کا ذکر ہے جو اس کتاب کے عنوان کا باعث بنتا ہے۔ جس کا ذکر علامہ اقبال کے نام سے تحریر کردہ باب میں موجود ہے۔

کتاب کا عنوان ''چوں مرگ آید'' چونکا دینے والا ہے لیکن بہت مناسب اور موزوں عنوان ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کتاب کو ''ایک پر خلوص گمنام حکیم'' کے نام سے منسوب کیا ہے۔ جس کا ذکر خود علامہ نے اپنے خط میں بھی کیا ہے۔

جس میں علامہ کی اس عقیدت کو جو پر خلوص گمنام حکیم کے لیے ان کے دل میں تھی

اور مصنف سید تقی عابدی کے اس جذبہ قدر دانی کو جو انھوں نے اس کتاب کو جس پر خلوص گمنام حکیم کے سے منسوب کیا خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ مصنف کا یہ کتاب ان کی قدر شناسی اور انسان دوستی کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ اقبال کے مطبوعہ ساڑھے چودہ سو خطوط میں دوسو اکیاون (251) خطوط اور 18 مستند کتابوں کے حوالہ جات سے یہ کتاب رقم کی ہے۔ مصنف نے علامہ کے دس سے زائد امراض اوران کی ذیلی شاخوں کا ذکر کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ علامہ نے 18 یونانی ادویات اور تقریباً 5 ایلوپیتھی دواؤں سے استفادہ حاصل کیا۔ انھیں ایلوپیتھی کی دوائیں پسند نہ تھیں جب کہ انھیں یونانی طریقہ علاج پر اعتقاد تھا۔ انھیں کڑوی بدذائقہ ادویات پسند نہ تھیں بس مجبوراً پی لیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ اقبال کے بعض امراض کی تشخیص کے طریقہ ہائے علاج پر اپنے تحفظات کا ذکر کیا ہے چوں کہ مصنف پیشہ ور ڈاکٹر مفروضات درست معلوم ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال کی داہنی آنکھ میں جونک لگانے سے ان کے مرض میں اضافہ تو ہوا مگر مصنف کے خیال میں جونک لگانے کی وجہ سے ہی علامہ اقبال کی دہنی آنکھ کی بینائی ختم ہوگئی تھی۔

مصنف نے منطقی دلائل سے اور نہایت ماہرانہ انداز میں اس کو ثابت کیا ہے۔ اسی طرح علامہ کے درد گردہ اور پتھری کے اخراج کو علامہ اقبال نے حکیم نابینا کے علاج کی وجہ قرار دیا ہے۔ جس پر مصنف نے اپنی پیشہ ورانہ رائے دیتے ہوئے اسے مسترد کر دیا کہ یونانی ادویات سے اقبال کے درد گردہ کا خاتمہ پتھری کا اخراج محض حسن اتفاق ہے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اقبال کو بار بار بخار آتا تھا ان کے خیال میں بار بار بخار ملیریا کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی اور وجہ سے آتا تھا۔ مصنف کو حکماء سے کوئی عدو نہیں بلکہ وہ ان کا احترام کرتے ہیں، لیکن ان کی ماہرانہ رائے کے مطابق بعض یونانی ادویات علامہ کے لیے مضر تھیں چوں کہ علامہ اقبال مصنفِ قلب کے بھی مریض تھے، ان کے لیے مقوی اور دھات سے مرکب ادویات کا استعمال مضر صحت ثابت ہوا۔ مصنف نے یہ بھی واضح کیا کہ علامہ ایلوپیتھی اور یونانی دوائیں ایک ساتھ کھالیا کرتے تھے۔ ایسی دو مختلف طریقہ ہائے علاج کی ادویات کا ایک ساتھ استعمال بھی جسم میں مضر Reaction پیدا کرتا ہے۔

مصنف نے علامہ کے قلندرانہ مزاج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ''وہ اپنی صحت کے سلسلہ میں تساہل اور بد پرہیزی کا بھی شکار رہے۔ مثلاً وہ ورزش اور چہل قدمی سے اجتناب برتتے تھے۔ حکماء کے منع کرنے کے باوجود ٹھنڈی لسی، فالودہ اور دہی شوق سے استعمال کیا کرتے تھے۔ علامہ کو چٹ پٹے اور مرغن کھانوں کا شوق تھا۔ حالاں کہ وہ کم خوراک تھے۔ مگر پلاؤ اور کباب وغیرہ شوق سے کھایا کرتے۔ علامہ اقبال کثرت سے تمبا کو نوشی کیا کرتے تھے۔ وہ سگریٹ اور حقہ دونوں پیتے تھے۔ کڑوی دوا کھانے میں تساہل برتتے ان باتوں کی وجہ سے مصنف کے خیال میں ان کی صحت خراب ہوئی۔

علامہ اقبالؔ کے گلے کی خرابی اور ان کی آواز بیٹھ جانے کا خود علامہ کو بھی بہت دکھ تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کافی علاج بھی، بجلی بھی لگوائی مگر فائدہ نہ ہوسکا۔ مصنف نے اس طریقہ علاج پر بھی اپنی ماہرانہ رائے دیتے ہوئے نامناسب قرار دیا۔ مصنف نے علامہ اقبال کے امراض کی وجہ سے علامہ کی زندگی پر جو گہرے اثرات مرتب ہوئے اس کا بھی ذکر کیا۔ مصنف کو علامہ کے اس دُکھ کا احساس ہے کہ وہ بہت سے کام جو وہ امت کے لیے کرنے کے خواہش مند تھے وہ علامہ کی علالت کی وجہ سے مکمل نہ ہوسکے۔ علامہ نے بہت سی تکالیف برداشت کیں۔ مصنف نے اس بات کو بھی اُجاگر کیا کہ علامہ اقبالؔ کو اپنی تشویشناک علالت کا علم ہونے کے باوجود انھوں نے آخر دم تک اپنے روزمرہ کے معمولات میں فرق نہ آنے دیا۔ اس سے ان کی ہمت اور صبر و استقلال کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے گو کہ ایک مشکل اور ادق موضوع پر قلم اٹھایا ہے لیکن جوں جوں کتاب کا مطالعہ کرتے جائیں یہ مشکل اور ادق موضوع ایک دلچسپ کہانی کا روپ دھار لیتا ہے۔ مصنف نے مستند کتابوں اور خطوط کے حوالوں سے کتاب کو اس طرح ترتیب دیا کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ علامہ کی صحبت میں موجود ہو۔ مصنف نے جہاں کتاب میں علامہ اقبالؔ کی بیماریوں اور مرض الموت کی ہے۔ علامہ کے مقربین، مصاحبین اور معالجین کے تذکرے، علامہ کی علمی و ادبی سرگرمیاں ان کی پیشہ ورانہ سرگرمیاں ان کی سیاسی سرگرمیاں ان کے سفر کے واقعات مقامی و بین الاقوامی دوستوں سے ملاقاتوں کے تذکرہ مطالعہ کے دوران سامنے آتے ہیں۔ مصنف نے علامہ اقبالؔ کے بارے میں

ایک اہم پہلو یہ بھی اُجاگر کیا کہ انھوں نے شراب نوشی کبھی نہیں کی۔ علامہ دیندار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ روحانی اعتقادات کے قائل تھے مصنف کی تحریر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ عاشق رسولؐ تھے اور محبِ اہل بیت تھے۔

جیسا کہ میں نے لکھا کہ جوں جوں کتاب کا مطالعہ کرتے جائیں یہ مشکل موضوع دلچسپ کہانی کا روپ دھار لیتا ہے اور قاری اپنے آپ کو علامہ کی صحبت میں موجود پاتا ہے نہ صرف یہ بلکہ قاری پر وہی کیفیات طاری ہوتی ہیں جو اس وقت موجود علامہ اقبالؔ کی صحبت میں موجود لوگوں پر ہوتے رہے۔ خصوصاً اقبالؔ کی زندگی کے آخری لمحات، علامہ اقبالؔ کی آخری رات یا ان کے جلوس جنازہ کا ذکر پڑھتے ہوئے بعض اوقات قاری کو اپنے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مصنف نے علامہ کی بیماریوں ان کے علاج اور تشخیص پر اپنی رائے ضرور لکھی لیکن دیگر معاملات میں حوالہ جات کو من وعن لکھ دیا ہے۔ اس طرح کہ نہ صرف وہ ایک تاریخی دستاویز بلکہ ایک ادبی شہ پارہ بن جاتی ہے۔

علامہ کی آخری رات میں دوستوں سے ملاقات، اپنی بیٹی منیرہ سے آخری ملاقات کا ذکر ان کے صاحبزادہ جاوید اقبال کو لپٹانے کا واقعہ اور موت سے چند لمحے قبل ان کے ملازم علی بخش کی کیفیات نہایت متاثر کن ہیں۔ موت سے چند روز قبل بڑے بھائی عطا محمد کے تسلی دینے پر اقبالؔ کا یہ بیان کہ ''میں مسلمان ہوں موت سے نہیں ڈرتا اور مردِ مومن کی یہ علامت ہے کہ مرنے کے بعد اس کے لبوں پر تبسم ہوتا ہے۔''

مصنف نے اقبالؔ کی وفات، جلوس جنازہ اور تدفین کی جگہ اس طرح بیان کیا کہ ''تدفین کے موقع پر ان کے بھائی عطا محمد دیر سے قبرستان پہنچے وہ روتے ہوئے مجمع کو ہٹاتے جاتے تھے اور کہتے تھے لوگو مجھے میرے بھائی کا چہرہ دیکھ لینے دو اس نے کہا تھا اس کے چہرہ پر مرنے کے بعد تبسم ہوگا۔''

ہاں یقیناً اقبالؔ کے چہرہ پر تبسم تھا۔

اقبالؔ نے موت سے تین چار دن قبل اپنے بھائی کو یہ کہا تھا۔

نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

اور اسی شعر سے اس کتاب کا عنوان اخذ کیا گیا ہے۔

آخری باب ''رَو میں ہے رخشِ عمر'' کے عنوان سے مصنف نے خود اپنے بارے میں اختیار سے ایک خاکہ تحریک کیا ہے۔

یہ کتاب اقبالؔ اور اُردو کے پرستاروں طالب علموں خصوصاً طب کے طلباء بلکہ ڈاکٹرز اور حکماء کے لیے بھی گنجانے گرانمایہ ثابت ہوگی۔

مصنف ڈاکٹر سید تقی عابدی کی یہ کاوش قابل ستائش ہے۔ میں مصنف اور ناشر کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

شاہین
(آٹوا، کینیڈا)
31/مارچ 2008ء

''چوں مرگ آید''

ڈاکٹر سید تقی عابدی کینیڈا کے ان معدودے چند اہل قلم میں شمار کیے جاتے ہیں جنھیں کینیڈا، امریکہ، انگلستان، بھارت اور پاکستان کے سنجیدہ اُردو داں ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اعلیٰ پائے کے کثیر التصانیف محقق، شاعر، تاریخ گو اور نقاد ہیں۔ یہی نہیں، ان کی انتظامی صلاحیتیں اور پیشہ ورانہ مہارت بھی مثالی ہے۔ اُردو اور بالخصوص رثائی ادب کی ترویج اور فروغ کے سلسلے میں ان کی خدمات کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ انھوں نے اپنے چند احباب کے تعاون سے عالمی پیانے پر ایسے سیمینار اور کانفرنسوں (انیس، دبیر، اقبال) کے انعقاد کا بندوبست کیا جو برصغیر سے باہر اُردو کی ہمہ گیری کو استحکام بخشنے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''چوں مرگ آید'' علامہ اقبالؔ کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص کے بارے میں ہے۔ کتاب کا خوب صورت نام علامہ کے فارسی شعر (نشانِ مردِ مومن با تو گریم/ چوں مرگ آید تبسم برلبِ اوست) سے ماخوذ ہے۔ ''چوں مرگ آید'' ڈاکٹر سید تقی عابدی کی جزئیات رسی، ادیبانہ اسلوبِ نگارش اور ان کی پیشہ ورانہ طبی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اُردو میں میرے علم کی حد تک ایسی کسی کتاب کا وجود نہیں۔ علامہ اقبالؔ اپنی زندگی میں مختلف بیماریوں (کمزور بینائی، دردِ گردہ، جوڑوں کے درد، دل پر اثر انداز ہونے والے عارضے، دمہ، معدے کی تبخیر، گلے کی تکلیف، مسوڑھوں کی سوجن، دانتوں کے درد، ملیریا اور نیند کی کمی) میں مبتلا رہے۔ علاج کے سلسلے میں انھوں نے تیس سے زیادہ معالجوں سے رجوع کیا، جن میں چھوٹے، بڑے اور کاملینِ زمانہ الغرض ہر طرح کے ماہر شامل تھے۔ سید تقی عابدی نے ایسے تمام خطوط اور متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کیا جو اس ضمن میں معاون

ہو سکتے تھے۔ کتاب کی آخر میں سولہ صفحات پر مشتمل علامہ اقبالؔ کے لکھے ہوئے دو سو اکیاون (251) خطوط کی فہرست درج ہے جن میں ان کی بیماریوں کے حوالے ہیں۔ اس کے علاوہ اٹھارہ متعلقہ کتابوں کی ایک دوسری فہرست بھی ہے۔ عابدی صاحب نے ان میں سے ہر ایک کا بغور جائزہ لینے کے بعد طبیبوں کی تشخیص اور پھر علاج کے لیے تجویز کردہ دواؤں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے علامہ اقبالؔ کے معالج کی تشخیص اور طریق کار سے اختلاف بھی کیا ہے اور بہتر متبادل علاج کی طرف اشارے کیے ہیں۔ ''تشخیص اور علاج کی کوتاہیاں'' کے تحت عابدی صاحب کا دلچسپ اندازِ تحریر ملاحظہ ہو:

> ''علامہ کی آواز بیٹھ جانے کے علاج میں کچھ غلطیاں ضرور ہوئیں۔ ایسا لگتا ہے چڑیا کو مارنے کے لیے توپ استعمال کی گئی۔ چناں چہ چڑیا تو اڑ گئی لیکن دیوار گر گئی۔''

سید تقی عابدی صاحب نے منجملہ چند دیگر اصحاب کے اپنے نیویارک کے شاعر دوست ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبدؔ کی رائے سے بھی استفادہ کیا ہے۔ دراصل مصنف نے ایک انتہائی خشک موضوع کو اپنے قلم کے اعجاز سے اس قدر دلچسپ اور معلوماتی اعتبار سے اتنا بھرپور بنا دیا ہے کہ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ دیکھو سخنور اس طرح سہرا کہتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ باتوں باتوں میں بعض ادبی گوشے بھی منور کر جاتے ہیں۔ کئی ذیلی تفصیلات عالمانہ تحقیق کا درجہ رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا یہ کارنامہ اپنی نوعیت کی بے نظیر چیز ہے۔ اور وہ ہم سب کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

کتاب ''اقبال اکادمی'' نے شائع کی ہے۔ اس ادارے کی مطبوعات کو ہر طرح کے عیب سے پاک ہونا چاہیے۔ کمپیوٹر سے حرف سازی کے سبب اب کتابت کی اغلاط کو بآسانی درست کیا جا سکتا ہے۔ ''چوں مرگ آید'' میں کئی اغلاط در آئے ہیں جو نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ دو مثالیں کافی ہوں گی۔

مثلاً حافظ شیرازی کا ایک مصرعہ ص: 74 پر یوں ہے:

''چوں ندیدند حقیقت در افسانہ زوند''

ص:110 پر یہ مصرعہ اس طرح درج ہے کہ خارج از بحر ہو گیا ہے۔

"چوں نا دیدن حقیقت در افسانہ زوند"

ص:120 پر حکیم نابینا اور ان کی دوا روح الذہب کی تعریف میں علامہ کے تین اشعار پر مشتمل جو بند درج ہے اس کا پانچواں مصرعہ خارج از بحر ہو گیا ہے:

"اس سے زیادہ اور کیا لکھوں میں اے لقماں ملک"

لفظ "زیادہ" بروزن "زادہ" غلط ہے۔ اور "لقمان" کی جگہ "لقماں" کا بھی مقام نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اصل مصرعہ کیا ہے لیکن ایک ممکن صورت یہ ہو سکتی ہے:

اور کیا لکھوں زیادہ اس سے میں لقمانِ ملک

یا اور کیا اس سے زیادہ میں لکھوں لقمانِ ملک

یا اور کیا لکھوں زیادہ اس سے اے لقمانِ ملک

پہلی اور تیسری صورت میں لفظ "لکھوں" تشدید کے ساتھ ہے۔ لیکن نقل بہ مطابق اصل ضروری ہے۔ بہر نوع، یہ کام "اقبال اکادمی" کا ہے کہ اپنی مطبوعات کی صحت پر توجہ دے۔

تسلیم الٰہی زلفی (کینیڈا)

چوں مرگ آید
ڈاکٹر سید تقی عابدی: مریض، علاّمہ اقبالؔ

عصرِ حاضر کے ایک مشاق معالج ڈاکٹر سید تقی عابدی نے جدید تحقیقات کی روشنی میں شاعرِ مشرق علاّمہ اقبالؔ کی بیماریوں اور مرض الموت کی تفصیلات کا جائزہ، ایک ادبی محقق کی نظر سے، اپنی تازہ تصنیف ''چوں مرگ آید'' مطبوعہ 2007ء میں لیا ہے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر عابدی، پیشے کے لحاظ سے طبیب ہیں، لیکن دُنیائے اُردو ادب میں یہ ایک باریک بیں تجزیہ نگار اور محقق کی حیثیت سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی طبیب نے اپنے منصب کی پاسداری کرتے ہوئے، تاریخِ اُردو ادب میں پہلی بار کسی عظیم ادبی ہستی کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص، تحقیق اور تجزیہ۔ خطوط، مستند حوالوں اور جدید طبّی تحقیقات کی روشنی میں کیا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ادبی دُنیا میں اب تک کسی بھی اہم شخصیت کے حوالے سے فقط علمی، تخلیقی، فنی، فکری، شخصی اور عملی تناظر میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ تحقیق سے علم و فن کی نئی راہیں دریافت ہوئیں۔ نئی جہتیں ابھریں اور نئے انکشافات نے جنم لیا۔ ان نئی دریافتوں، نئے حقائق اور نئے انکشافات کی روشنی میں، مروّجہ نتائج یا نظریات پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے ان کے اثرات کا کھوج لگا کر اس کی صحیح تاویل پیش کی جاتی ہے۔ اقبالؔ پر تحقیقی کام ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ جو تا حال جاری و ساری ہے۔ علاّمہ پر تحقیق کے نئے نئے گوشے وا ہو چکے ہیں اور بہت سے منور ہونا باقی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر عابدی نے علاّمہ مرحوم کے بدن کی اندرونی کارکردگی اور کیفیات کا جائزہ لے کر نہ صرف یہ کہ اقبالؔ کے حوالے سے کی جانے والی تحقیق کے ضمن میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے

بلکہ آئندہ کسی بھی بڑی اور اہم شخصیت پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی ایک نیا دروا کردیا ہے۔ بدن کی اندرونی کارکردگی اور کیفیات کی بدنظمی کے سبب انسان کے جذبات میں جو طلاطم پیدا ہوتا ہے، اس کا اثر براہِ راست اُس کی کارکردگی اور تخلیقی عمل سے ظاہر ہوتا ہے، جس کی مثال خود قریب المرگ اقبال کی آخری عمر کی خالص اور بغیر کسی بناوٹ اور ملاوٹ کی نظمیں ہیں۔

آیئے اب اوپر پیش کیے جانے والے اپنے نکات کی روشنی میں ڈاکٹر عابدی کی کتاب ''چوں مرگ آید'' کا جائزہ لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا کہ اس کتاب کی انفرادیت اور بنیادی چیز علامہ اقبال کی زندگی کے آخری دنوں میں ان کے بدن کی اُس اندرونی کارکردگی اور کیفیات کی بدنظمی کا جائزہ لینا ہے جو مختلف بیماریوں اور مرض الموت کا سبب بنی۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر عابدی نے ایک پیشہ ور طبیب اور ممتاز ادبی محقق ہونے کی حیثیت سے، اس کتاب میں طبّی معلومات، بدنی کیفیات، روحانی اعتقادات کو خاص طریقے سے برتا ہے، اقبال کی خود طب سے واقفیت اور وابستگی کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے، یہ بھی بتایا ہے کہ اقبال کو زمان و مکان کے لحاظ سے تیس سے زیادہ بہترین معالجین کی طبّی امداد بھی حاصل رہی، گفتگو لفظ بہ لفظ خطوط کے آئینے میں، اور مستند حوالوں کی روشنی میں کی ہے، اور طبّی جائزے کے ساتھ نتائج اخذ کیے ہیں۔

میری باقاعدہ طبّی تعلیم تو ظاہر ہے نہیں ہے۔ لیکن ایک قلم کار ہونے کے ناتے اپنی معلومات میں اضافے اور اپنے شوق کی تسکین کے لیے، انسانی نفسیات اور جسمانی ساخت اور کیفیات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے، اس ضمن میں بہت کچھ پڑھا ہے، جس کی رو سے...... انسان پر اُس کے ذہن اور مزاج کے مطابق، اپنے معاشرے، موسموں اور بیماریوں کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم اس نظریے کو اقبال پر منطبق کریں تو دیکھتے ہیں کہ اُن کی زندگی کے آخری دور میں بالخصوص مسلم معاشرے کی جو دگرگوں حالت تھی اُس کا براہِ راست اثر اُس حکیم الامت نے قبول کیا...... کہ جب انسانیت مریض ہو جاتی ہے تو معالج انتہائی کوشش کرتا ہے کہ ناصحانہ حکمت و موعظت اور مشفقانہ انداز و تبشیر سے اس کا علاج ہو جائے۔ وہ ان افراد کی اصلاح کی کوشش میں اپنے دل کو پگھلاتا

اور اپنی روح کو انڈیلتا ہے۔ ان کی ہلاکت اور تباہی کا تصور اس کے قلب حساس میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے وہ ان کی صحت کے لیے دوائیں کرتا اور دعائیں مانگتا ہے۔ ان کے مرض کی شدت اور اس کے انجام کے خیال سے اس کا جگر گداز ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کی ہٹ دھرمی اور علاج سے انکار سے اسے سخت صدمہ ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ارشاد ربانی ہے:
وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَلَا تَكُ فِىۡ ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ ۔ (سورہ النحل، آیت ۱۲۷) ان لوگوں کے انکار و بحث داور ضد اور ہٹ دھرمی سے رنجیدہ خاطر ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ان کا ناسور لاعلاج ہو چکا ہے۔ ان کی انسانیت اس حد تک مُردہ ہو چکی ہے کہ اس میں زندگی پیدا ہی نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ان کے انجام و عواقب پر دل گیر نہیں ہونا چاہیے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اس پیغام حیات کو عام کرتے جاؤ۔ جن قلوب میں زندگی قبول کرنے کی ذرا سی بھی صلاحیت موجود ہے وہ "زود یا بدیر" اس پر توجہ دیں گے اور اپنے علاج پر مائل ہو جائیں گے۔ اقبالؔ نے اپنے افکار کی بنیاد اور اساس قرآنِ کریم کو بنایا اور اپنی تعبیر میں انسان کو اپنے آپ کو پہچاننے کی دعوت دی۔ انھوں نے مسلمانوں کو ناامیدی اور مایوسی سے نکالا اور ان کے تابناک ماضی کی یاد دلاتے ہوئے مستقبل کی امید دلائی۔ درحقیقت انھوں نے عصرِ حاضر کے مسلمانوں کو نئی جرأت دی اور انھیں اسلامی ثقافت کے مطابق علم و دانش حاصل کرنے کی تلقین کی اور تا دمِ آخر کی...... کہ مسلم امتہ کی فکر اور غم ہی انھیں بسترِ مرگ پر لے گیا...... لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اقبالؔ اپنی آخری سانس تک حکیم الامت بنے رہے اور اپنی زندگی کی آخری چند گھڑیوں میں ایک ٹیکہ لینے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کیوں کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ وہ فرماتے تھے کے I want to face death اور ایسا کہتے ہوئے یقیناً ان کے پیشِ نظر قرآن کی یہ جامع آیت ہوگی:
قُلۡ اِنَّ صَلَاتِىۡ وَنُسُكِىۡ وَمَحۡيَاىَ وَمَمَاتِىۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَۙ، لَا شَرِيۡكَ لَهٗ، وَبِذٰلِكَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ (سورہ الانعام، آیت ۱۶۳-۱۶۲) یعنی میرے فرائضِ زندگی کی ادائیگی اور اس ادائیگی کے طور طریق، حتیٰ کہ میری زندگی اور میری موت، اُس خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے ہے جس نے ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ میں اس مقصد میں کسی اور جذبہ یا مفاد کو شریک نہیں کرتا۔ اس کا مجھے حکم

دیا گیا ہے اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس کے سامنے سب سے پہلے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے ابتداء میں عرض کیا کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ، موضوع کے اعتبار سے اقبالؔ کی آخری عمر میں لاحق ہونے والی بیماریوں اور مرض الموت کے حوالے سے نہایت مستند اور اپنی نوعیت کی پہلی دستاویز کتابی شکل میں پیش کی ہے، جس کے مطالعہ سے نہ صرف عام اہلِ ادب کی معلومات میں اضافہ ہوگا، بلکہ اقبالیات کے خاص طالب علم بھی مستفید ہوں گے۔

خالد اقبال یاسؔر
''اقبالیات'' ۴۹:۳ (جولائی ۲۰۰۸ء)

''چوں مرگ آید'': ڈاکٹر تقی عابدی

اقبالؔ کی شخصیت اور شاعری کے یوں تو بہت سے پہلو ہیں اور پچھلے تقریباً سو برسوں سے ان پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے گوشے ابھی پوشیدہ ہیں۔ ناقدین اور اقبالؔ شناسوں نے ان کی شاعری، خطوط، شخصیت، مزاج، خطبات اور حسِ مزاح سے لے کر ان کی زندگی کے مثبت و منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، حتیٰ کہ معاصر شعرا نے اقبالؔ کی شاعری پر اعتراضات بھی اٹھائے ہیں اور ناقدین نے ان کے اعتراضات کے مکمل وضاحت کے ساتھ جوابات بھی دیے ہیں لیکن اقبالؔ کی زندگی میں آنے والی بیماریوں اور مرض الموت میں مبتلا ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملنے کی حقیقی داستان بہت کم لوگوں نے رقم کی ہے۔ اس حقیقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کچھ عرصہ قبل اقبالؔ کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص کے حوالے سے منظر عام پر آنے والی ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب ''چوں مرگ آید'' اس لحاظ سے ایک منفرد کاوش ہے کہ اس سے پہلے اقبالؔ کی بیماریوں اور ان کی تشخیص اور علاج کے بارے میں کوئی مستند کتاب موجود نہیں تھی۔ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں شاعر کی طویل علالت اور مرض الموت میں مبتلا رہنے کی لحہ بہ لحہ روداد شامل ہے۔

یہ کتاب اقبالؔ کے بیمار ہونے سے لے کر موت تک کے واقعات کی مکمل سرگزشت ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک انتہائی اہم کتاب ہے۔ اگرچہ اقبالؔ شناسوں اور ان کے چاہنے والوں کے لیے کتاب کا مطالعہ بہت سے حقائق جان لینے کے ساتھ ساتھ انتہائی اذیت اور دکھ کا باعث بھی ہے کہ شاعرِ مشرق اپنی زندگی میں کیسی کیسی موذی بیماریوں سے نبرد آزما رہے اور آخرکار موت نے انھیں اپنے دامن میں سمیٹ لیا،

لیکن عمر حتیٰ کہ اپنی کے آخری لمحات میں بھی اقبالؔ نے اپنے آپ کو مایوس نہیں ہونے دیا اور ایک عزم اور اُمید سے بیماریوں کے خلاف لڑتے رہے اور ان بیماریوں کی شدت کو زائل کرنے کے لیے استقامت سے ڈٹے رہے۔

کتاب میں اقبالؔ کی بیماریوں کے نام، میڈیکل معائنہ، ٹیسٹ اور طبی آلات کا ذکر ہے۔ اقبالؔ کے تیس معالجین کی فہرست بھی شامل ہے۔ اقبالؔ کے مرض کی تشخیص اور علاج میں ہونے والی کوتاہیوں پر مختصر مگر جامع طور پر لکھا گیا ہے۔ اس وقت کے اعتبار سے اقبالؔ کا بہترین علاج کیا گیا لیکن تحقیق سے یہ بات بھی ثابت ہو رہی ہے کہ اقبالؔ کے معالجین نے سختی سے انھیں نہ تو کسی پرہیز پر مجبور کیا اور نہ دواؤں، کشتوں اور برقی کورس کی وجہ سے صحت پر پڑنے والے منفی اثرات کو کنٹرول کر سکے۔ اس سے اگلا باب ''خوراک اور پرہیز'' ہے جہاں اقبالؔ کے خطوط اور مستند حوالوں سے یہ بات منظرِ عام پر آئی ہے کہ شاعرِ مشرق کھانے میں نفاست پسند اور کم خور ہونے کے باوجود تیز نمک مرچ، ترش، چٹ پٹی اور مرغن غذاؤں کے شوقین بھی تھے۔ اپنی پسندیدہ چیزیں کھانے کی وجہ سے وہ بعض اوقات خوش خوراکی کا مظاہرہ کرتے اور ہر طرح کی پرہیز چھوڑ دیتے تھے جس کی وجہ سے بیماریوں سے افاقہ ہونے کی بجائے اُن میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

اس کتاب میں اقبالؔ کے زیرِ استعمال رہنے والی دواؤں کے نام بھی شامل ہیں اور دواؤں کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو گیا ہے جو مختلف موقعوں پر لوگوں نے پھیلا رکھی تھیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کتاب مدلل انداز سے اقبالؔ کی ذات پر اُٹھنے والے منفی سوالات کا محاکمہ بھی کرتی ہے۔ کتاب کا وہ حصہ بہت اہم ہے جس میں مصنف نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ کیا اقبالؔ نے بیس سال کم عمر پائی تھی؟ اس بات کی تصدیق کے طور پر انھوں نے اقبالؔ کی موت کی وجوہات اور اسباب بھی بیان کیے ہیں اور اقبال کے خاندان کے افراد کی عمریں بھی تحریر فرمائی ہیں۔ چند حادثاتی اموات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اقبالؔ اپنے قریبی رشتہ داروں میں سب سے کم عمر تھے اور انھوں نے اپنے دوسرے عزیزوں کے مقابلے میں پندرہ سے بیس سال کم عمر پائی۔

یوں تو کتاب کا ایک ایک صفحہ اقبالؔ شناسوں کو پڑھنا چاہیے لیکن ان موضوعات

میں سے استقامت اور اُمید، گزارشِ امراض۔ اقبالؔ کے قلم سے اور علامہ اقبالؔ کی آخری رات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ استقامت اور اُمید کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبالؔ کے عقیدے میں نا اُمیدی کفر تھی اور بقول مصنف استقامت وتوکل ان کا ایمان تھا۔ ان کی زندگی میں مشکل سے مشکل مواقع بھی آئے جن میں انھوں نے انہی طریقوں سے فتح حاصل کی۔

اسی طرح گزارشِ امراض میں اقبالؔ کے 251 خطوط کا ذکر ہے جن میں انھوں نے اپنی بیماریوں کا ذکر کیا۔ بقول مصنف وہ اُردو ادب کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے بذریعہ خطوط اپنی بیماریوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمان عبؔد
(خلاصہ گفتگو 23 /نومبر 2008ء
علامہ اقبال گلوبل فورم سیمینار)

چوں مرگ آید

''چوں مرگ آید'' جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کی تازہ تصنیف ہے جس میں انھوں نے علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص خطوط، مستند حوالوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں کی ہے۔ دو سو پانچ صفحات پہ مشتمل اس دیدہ زیب کتاب کی اشاعت 2007ء میں اقبال اکادمی پاکستان کے زیر اہتمام ہوئی۔ یہ تصنیف دُنیائے اُردو میں بالعموم اور اقبالیات میں دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں بالخصوص ایک اہم اور گرانقدر اضافہ ہے۔ میرے لیے مقامِ حیرت تو یہ ہے کہ آج حضرتِ علامہ کے انتقال کو ستر برس ہو چکے ہیں مگر اس مضمون پر اس نوعیت کا تفصیلی اور مدلّل کام کرنے کے لیے اس سے پہلے کسی کا قلم نہ اُٹھ سکا۔ ڈاکٹر عابدی نے 18 کتب اور علامہ اقبال کے 251 ذاتی خطوط سے مواد حاصل کر کے علامہ کی علالت اور علاج معالجے کو ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کے چند ایسے گوشوں کو بھی اُجاگر کیا ہے جو اس سے قبل عوام سے قدرے پوشیدہ تھے۔ اس مختصر تبصرے میں، میں اس شہکار کے تمام پہلوؤں پہ روشنی تو نہیں ڈال سکتا مگر اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ چند دلچسپ باتوں کا تذکرہ کر کے آپ کے ذوقِ مطالعہ میں تجسّس کی چنگاری سلگا کر آپ کو آپ ہی کے اشتیاق کے حوالے کر دوں۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (پیدائش 9 /نومبر 1877ء) کا انتقال 60 برس کی عمر میں 21 /اپریل 1938ء کو عارضہ قلب کے باعث لاہور میں ہوا جہاں وہ مدفون ہیں۔ ''چوں مرگ آید'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کا علاج تیس سے زیادہ معالجوں نے کیا جن میں مسیح الملک حکیم اجمل خان اور افسر الاطبا حکیم نابینا صاحب جیسے مایۂ ناز حکیموں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر متھرا داس اور بھوپال کے ریڈیالوجسٹ ڈاکٹر عبدالباسط جیسے فزیشنز بھی

شامل تھے۔ علامہ کو داہنی آنکھ کا ضعفِ بصارت، دردِ گردہ، دل کے پھیلاؤ اور ضعفِ تنفس اور نقرس (گنٹھیا) وغیرہ کی شکایات تھیں اور آخری چند برس ان کی آواز بھی کسی باعث متاثر ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں وہ مشاعروں میں اپنا کلام سنانے سے قاصر ہوگئے تھے۔ یہ بھی واضح ہے کہ ان کی عمر کے آخری پانچ برس کافی علالت میں گزرے جن میں انھیں سانس کے پھول جانے اور پاؤں متورم ہو جانے اور چھاتی کے درد نے پریشان رکھا۔ ان منجملہ بیماریوں نے انھیں اپنے معمولات میں کماحقہ شرکت کرنے میں دشواریاں پیدا کیں اور وہ ان کے باعث کئی کاموں میں عملاً نہ شامل ہو سکے۔ بایں ہمہ، یہ بات بھی مسلم ہے کہ ان عارضوں سے ان کے ذہن، حافظے اور ان کے تخلیقی معیار یا سوچ پر کوئی منفی اثر نہ پڑا اور وہ تادمِ آخر اُسی باکمال سوچ اور صاف ذہن سے اپنے رفقا سے تبادلہ خیال کرتے رہے اور شعر کہتے رہے۔

حضرتِ علامہ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی بیماری کی علامات اور علاج وغیرہ کے بارے میں اپنے احباب اور رفقاء کو خاصا باخبر رکھا ہوا تھا۔ باالاختصار یہ کہا جاسکتا ہے کہ علامہ نے تمام عمر اپنا بیشتر علاج حکیموں سے کروایا۔ وہ ایلوپیتھک (انگریزی) طرزِ علاج کو کمتر سمجھتے تھے اور ان کے خیال میں انگریزی دوائیں ان کی طبیعت کے غیر موافق تھیں۔ گو انھوں نے ایلوپیتھی کے تشخیصی ذریعے استعمال کیے اور احباب کی ایما اور اصرار پر ایلوپیتھک دوائیاں متعدد بار استعمال کیں، وہ اپنے علاج کا اصل جزو، ہومیو پیتھک علاج کے نسخوں کو ہی سمجھتے رہے۔

حضرت علامہ کے ہومیو پیتھک طرزِ علاج کو پسند کرنے کی وجوہات میں طِب کی طویل اور شاندار تاریخ، مسلمان حکیموں اور دانشوروں کے طب میں اعلیٰ مقام اور ایلوپیتھی طرزِ علاج کی طفل سالی کا بڑا دخل تھا۔ اس کے باوجود، علامہ نے نیند کی گولیاں، امونیم کلورائیڈ، فروٹ سالٹ، گلسرین اور انجکشن آف Mersaly/Mersyles وغیرہ جیسی انگریزی دوائیں بھی استعمال کیں۔

حضرتِ علامہ نے حکیم نابینا (حضرت علامہ لقمان الملک، حکیم عبدالوہاب صاحب) سے تادیر علاج کروایا اور ان کے مشہورِ زمانہ "روح الذہب" نامی نسخے کو بکثرت

استعمال کیا۔ خالص سونے سے تیار ہونے والے اس نسخے کے تیار کرنے میں کئی مہینے لگتے تھے لہٰذا اس کی مانگ ہمیشہ رہتی تھی۔ حکیم نابینا صاحب کے اس نسخے کی افادیت اور ترکیب استعمال وغیرہ کے بارے میں حکیم عبدالغنی انصاری صاحب نے ایک کتابچہ مرتب کیا تھا جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مختلف امراض کے لیے مفید ہے اور اس سے دل کو تقویت ملتی ہے، خونِ صالح کی مقدار بڑھتی ہے اور گردے میں اگر پتھری ہو تو ریزہ ریزہ ہو کر نکل جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ علاج کے اوائل میں حضرت علامہ اس نسخے سے اتنے پُرامید تھے کہ انھوں نے روح الذہب کے حوالے سے حکیم صاحب کو درجِ ذیل اشعار عنائت کیے:

"ہے دو روحوں کا نشیمن قالبِ خاکی مرا
اک سراپا شو رومستی اک سراپا تاب و تب

•••

ایک جو اللہ نے بخشی مجھے روزِ ازل
دوسری ہے آپ کی بخشی ہوئی روح الذہب

•••

اس سے زیادہ اور کیا لکھوں میں اے لقماں ملک
رکھتا ہے بے تاب دونوں کو مرا حسنِ طلب"

•••

خلیق انجم
دہلی

''چوں مرگ آید''

علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص

(خطوط، مستند حوالوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں)

سید تقی عابدی صاحب ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ ان کی پیدائش یکم مارچ 1952ء کو دہلی میں ہوئی تھی اور ان کے والد سبط نبی عابدی پیشے کے اعتبار سے منصف تھے۔ تقی عابدی صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ حیدرآباد میں گزرا تھا۔ ان کی شخصیت پر حیدرآباد کی تہذیب کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔ انھوں نے حیدرآباد ہی سے ایم. بی. ایس. کیا، پھر برطانیہ سے ایم. ایس.، امریکہ سے ایف. سی. اے. پی اور کینیڈا سے ایف. سی. آر. سی. پی جیسے اعلیٰ ترین امتحانات طب میں پاس کیے۔ حیدرآباد کی تہذیب کا سب سے نمایاں اثر اُن کی شخصیت پر یہ ہوا کہ انھیں شاعری، تنقید اور تحقیق سے دلچسپی ہوگئی۔ سید تقی عابدی صاحب ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک اور کینیڈا میں رہے جس کی وجہ سے ان کا ذہنی اُفق بہت وسیع ہوگیا۔ انھوں نے سائنسی اور طبی علم میں مہارت حاصل کی۔ انھیں دُنیا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ تین درجن سے زیادہ مطبوعات کے مصنف یا مؤلف ہیں جن میں سے پانچ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی چھ اور کتابیں زیر تالیف ہیں جن میں سے ''تعشق لکھنوی'' منظر عام پر آ بھی چکی ہے۔

حال ہی میں ان کی ایک اور کتاب علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص پر ''چوں مرگ آید'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے علامہ کے ان 251 خطوط سے استفادہ کیا ہے جو مرحوم نے اپنی بیماریوں کے سلسلے میں دوستوں،

عزیزوں اور اپنے طبیبوں کو لکھے تھے۔ چوں کہ پیشے کے اعتبار سے سید تقی عابدی صاحب ایک نامور ڈاکٹر ہیں، اس لیے انھوں نے جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں علامہ اقبال کی تمام بیماریوں کا جائزہ لیا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے علامہ کی بیماریوں کی تفصیل بیان کی ہے اور پھر مختلف ابواب قائم کر کے علامہ کی مختلف بیماریوں کا ذکر کیا ہے اور ہر بیماری کے بارے میں ماہر ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی رائے بھی دی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ علامہ پر طبی، ایلوپیتھی، سرجری، ریڈیو تھراپی جیسے طریقۂ علاج کا کیا اثر ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ علامہ اقبال کی بیماریوں کی تشخیص اور علاج میں ان کی معالجوں سے کیا کیا کوتاہیاں ہوئیں۔ انھوں نے علامہ کی خوراک اور پرہیز کا ذکر کیا ہے۔ عابدی صاحب نے ان طبی اور ایلوپیتھک دواؤں کے ناموں کی فہرست بھی دی ہے جن کا ذکر علامہ نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔

انتقال کے وقت علامہ اقبال کی عمر اکسٹھ سال اور کچھ مہینے تھی۔ جب کہ ان کے والد نے ترانوے سال، والدہ نے پچھتر سال، بڑے بھائی نے اکیاسی سال اور چھوٹی بہن نے اسّی سال کی عمر میں وفات پائی۔

ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے تقی عابدی صاحب کا خیال یہ ہے کہ ''اقبال کی نسبتاً کم عمری کی وجہ بچپن سے کمزور طبیعت، تساہل پسندی ہے انھوں نے کوئی ورزش نہیں کی۔ فکری اور Stressful اعصاب فشاردہ زندگی، تمباکونوشی، بدپرہیزی، دل، گردے اور پھیپھڑوں کی بیماریاں اور ان کے ساتھ یونانی علاج، جس میں ڈرگ افیکٹ کے مضر اثرات شامل ہوتے ہیں۔'' ان تمام مسائل کے مطالعے کے بعد یہ کہنا صحیح ہے کہ ؎

سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں

تقی عابدی صاحب کا یہ خیال بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اپنی طبیعی عمر سے بیس سال پہلے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

کتاب کے آخر میں ''شاعرِ مشرق کا وقت آخر''، ''زندگی کے آخری لمحات''، ''علامہ اقبال کی آخری رات''، ''کاش آخری خواہش پوری ہوتی''، ''علامہ اقبال کا جلوسِ جنازہ''، ''علامہ اقبال کا مقبرہ'' جیسے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

آخر میں اُن تمام 251 خطوط کے مستند حوالے دیئے گئے ہیں جن سے تقی عابدی صاحب نے علامہ کی بیماریوں کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مشرق کا یہ عظیم مسیحا بہت بڑی تعداد میں مختلف بیماریوں کا شکار رہا۔

اقبالؔ کی وفات کو تقریباً ستر سال گزر چکے ہیں۔ اس دوران اقبالؔ کی شخصیت، سوانح اور فن پر بلا مبالغہ ہزاروں مضامین اور سیکڑوں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ میری محدود معلومات کے مطابق اُردو کا شاید ہی کوئی ایسا ادیب یا شاعر ہو، جس کے سوانح اور فن پر اُردو میں اتنا زیادہ لکھا گیا ہو۔

ٹورنٹو (کینیڈا) کی علمی اور ادبی زندگی میں تقی عابدی صاحب غیر معمولی اہمیت کے مالک ہیں۔ بہت کم اُردو ادب اور دوسرے موضوعات کے سیمینار ایسے ہوں گے جن میں تقی عابدی صاحب شرکت نہ کرتے ہوں۔ وہ ہندوستان اور پاکستان سے آنے والے مہمانوں کی پذیرائی میں بہت زیادہ وقت صرف کرتے ہیں، یہ بات میں اپنے ٹورنٹو کے قیام کے خوش گوار تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں۔

غرض ''چوں مرگ آید'' ایک مختصر مگر انتہائی جامع کتاب ہے اور اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ تقی عابدی صاحب نے یہ کام بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے کیا ہے۔ اب وہ اسی انداز کا کام غالب پر کرنا چاہتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا انھیں اپنے اس مقصد میں کامیاب کرے۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی

''چوں مرگ آید''

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے گراں قدر، اہم ادبی و تحقیقی کارناموں کے ذریعے ایک ادیب اور محقق کی حیثیت سے اپنی ایک ممتاز و منفرد حیثیت بنالی ہے۔ انیسؔ، دبیرؔ، انشاؔ، نجم آفندی وغیرہ نیز اُردو قواعد اور گرامر پر جس نوعیت کی علمی و تحقیقی کتابیں رقم کی ہیں اس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اہل علم و فن لگا چکے ہیں اور اپنی پسندیدگی و معیار بندی کی مہر بھی لگا چکے ہیں۔ تازہ ترین اور زیر نظر کتاب ''چوں مرگ آید'' نہ صرف اس سلسلے کی اگلی کڑی ہے بلکہ اپنے نام اور کام کی انفرادیت اور انوکھے پن کی وجہ سے ڈاکٹر تقی عابدی کی غیر معمولی وابستگی۔ عرق ریزی اور حق شناسی کی غیر معمولی دلائل و براہین پیش کرتی ہے۔

''چوں مرگ آید'' اقبالؔ کے ہی مصرعہ سے عنوان قائم کر کے عابدی نے اقبالؔ کے حیات و موت کے درمیان علالت و امراض کے ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جن پر ابھی تک کسی نے توجہ نہ دی یا اگر دی تو بہت کم...... اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ موضوع ایسا تھا ہی نہیں کہ جس پر علم تحقیق اور شعور نقد اپنی توجہ مبذول کرے اور با قاعدہ کتاب رقم کرے، لیکن تقی عابدی کی نظر دقیق اور پیشہ رفیق نے ایک ایسے موضوع کو نہ صرف تلاش کیا۔ بلکہ علامہ کی حیات و امراض کے حوالے سے ایسے مخفی پہلوؤں پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈال دی کہ وہ ایک روشن کتاب بن گئی۔ انتہائی دلچسپ، معلومات افزا اور کہیں کہیں بصیرت افروز بھی...... اپنے مقدمے کی ابتدا میں وہ لکھتے ہیں:-

''علامہ کی زندگی کے اُس پہلو پر گفتگو کی جائے جس سے ان کی ذات کا تعلق تھا اُس سے عوام کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اور انتقال کے بعد خود علامہ کو کیا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ ان تمام سوالوں کا تشفی بخش جواب اس

کتاب کے ہر صفحہ پر سطور سے زیادہ بین السطور بیاض سحر کی طرح روشن
ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی انفرادیت رکھتی ہے کہ اس میں طبّی
معلومات، بدنی کیفیات، روحانی اعتقادات کو خاص طریقہ سے برتا گیا
ہے۔ گفتگو لفظ بہ لفظ خطوں کے آئینے میں، مستند حوالوں کی روشنی میں
کرکے نتائج اخذ کیے ہیں، جن کے مطالعہ سے عوام ہی نہیں، اقبالیات
کے خاص طالب علموں کو بھی معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔''

مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ اقبالؔ، فردوسیؔ، عطارؔ، حافظ، جعفر زٹلی وغیرہ کی طرح بدنصیب نہ تھے کہ ان کو قتل کیا گیا یا مفلسی و بیچارگی کی موت مرتے، بلکہ اس کے برعکس اقبالؔ ان خوش نصیبوں میں سے تھے جن کے علاج کے لیے اس عہد کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر، حکیم وید سب دست بستہ اقبالؔ کے حضور میں ایستادہ تھے اور ہر طرح کی خدمت کو ہمہ وقت تیار رہتے۔ اس کے باوجود قسمت، فطرت نے یاوری نہ کی اور علاّمہ ایک نہیں کئی موذی و مہلک امراض میں گرفتار رہے اور محض اکسٹھ/ باسٹھ سال کی عمر میں اس دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔ چوں کہ یہ امراض ایک دو نہیں متعدد تھے اور معمول نہیں بلکہ غیر معمولی تھے اس لیے اقبالؔ نے ان کے علاج کی ہر طرح کی کوشش کی۔ اس ضمن میں انھوں نے قرب و بعد تمام حکیموں و ڈاکٹروں سے رابطے کیے اور خطوط لکھے۔ یہ کتاب انھیں خطوط کی حقیقتوں اور بعض بنیادی کتابوں کے تعاون سے رقم کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف رقم طراز ہیں:

''اُردو فارسی ادب کا شاید ہی کوئی دوسرا اعظیم شاعر ہو، جس نے علاّمہ کی
طرح اپنی بیماری کی کیفیتوں کو لکھا ہو۔ علاّمہ کے مطبوعہ ساڑھے چودہ سو
خطوں میں 251 خطوط ہمارے بیان کی سند ہیں۔''

ان خطوں کے حوالے سے اخذ کردہ حقائق سے بے حد اہم، دلچسپ اور معلومات افزا صداقتیں ہمارے سامنے آئی ہیں جن سے نہ صرف اقبالؔ کے امراض بلکہ ان کی ذہنی کیفیت، گھریلو حالات اور امکانات پر قابلِ قدر روشنی پڑتی ہے۔ نیز ان حکماء، رفقار اور خدمت گزاران کے بارے میں علم ہوتا ہے جن کے بارے میں اب تک اُردو قارئین اور

اقبالؔ پسندوں کا علم نہ برابر تھا۔ چناں چہ اسی خیال کو مصنف نے اپنے چند نکات میں سر فہرست رکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اقبالیات کے طالب علم اُن چند افراد کے نام و نشان سے واقف ہیں جنھوں نے اقبالؔ کے انتقال کے بعد اقبالؔ کی قربت کو اپنے مقام کو بلند کرنے کے لیے صرف کیا اور بات کا بتنگڑ بنایا اور خود کو اقبالؔ کے خدمت گزاروں کی صف میں سرِ فہرست رکھا۔ اقبالؔ کے معالجین میں بعض افراد جو خصوصی طور پر اقبالؔ کی نگاہ میں معتبر اور مہم تھے ان کا ذکر بھی نہیں کیا۔ چناں چہ اس کتاب میں خطوں اور مستند حوالوں سے ان کی حقیقی خدمت گزاروں کے نام اور کام سے بھی آشنائی ہو سکے گی۔''

اقبالؔ کی طب سے واقفیت، اقبالؔ کے نظام اوقات، معمولات، نیز بیماری کی نفسیات اور پھر اقبالؔ کی ذہنی کیفیت، ہمت اور استقلال کو بھی بڑے پُر سوز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ چوں کہ تقی عابدی خود ڈاکٹر ہیں اس لیے انھوں نے بڑے تجربے کی بات کہی ہے۔

''راقم کے تیس (30) سالہ طب کے تجربہ میں کئی بار یہ دیکھا گیا کہ جب کسی مریض کو اُس کے مہلک مرض کی اطلاع دی جاتی ہے تو بڑے سے بڑے بلند ارادہ شخص کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل جاتی ہے لیکن جب لاہور کے ریڈیو لاجسٹ ڈاکٹر ڈک سینے کے ایکس ریز کے معائنہ کے بعد علاّمہ کے سینے میں مہلک ٹیومر کی تشخیص دیتے ہیں، اُسی دن چند گھنٹوں بعد جو خط علاّمہ نے سید نذیر نیازی کو حکیم نابینا سے مشورہ کرنے کے لیے لکھا۔ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اقبالؔ تمام آرامش قلب اور بغیر تشویش کے زندگی اور موت کے مباحثہ میں مشغول ہیں۔ یہی نہیں موت سے کچھ گھنٹے قبل درد کم کرنے کے لیے افیونی دواؤں کے استعمال کو یہ کہہ کر منع کر دیا کہ میں نیم بے ہوشی میں مرنا نہیں چاہتا۔

علاّمہ کے عزائم، استقلال مزاج اور حقیقت حیات اور ممات کے مسائل

اور مراحل بھی اسی دفتر میں نظر آئیں گے کیوں کہ خود علامہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

ع : ہر چہ از دوست میرسید نیکواست

بیسوی صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں موجود برصغیر میں طبّی سہولتوں کا بھی پتہ چلتا ہے کیوں کہ علامہ کے مرض کی جدید طبّی آلات سے بھی تشخیص کی گئی تھی۔

علامہ کی آواز بیٹھ جانے، دمہ قلبی، رسولی اور مرض قلب وغیرہ کی صحیح علّت اور تشخیص جدید طبّی اصولوں سے اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔

بیماری کی وجہ سے جو صدمات اقبالؔ کے جذبات اور زندگی کے روزمرّہ مسائل پر وارد ہوئے اس کا اجمالی ذکر بھی کیا گیا ہے۔''

اس سے زیادہ ایک ادب دوست اور اقبالیات کے پُرشوق قاری کے لیے یہ اہم ہے کہ ان بیماریوں کی وجہ سے اقبالؔ وہ کام نہ کر سکے جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ قدرت نے انھیں چند برس اور دیدیے ہوتے اور ان کے علمی و ادبی منصوبے پورے ہوئے ہوتے تو یقیناً ادب اور قوم کو کچھ اور بیش قیمتی چیزیں میسر آ گئی ہوتیں۔ مقدمہ کے آخر میں تقی عابدی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سب سے اہم نکتہ جو اس موضوع سے ہمارے سامنے اُجاگر ہوتا ہے وہ حکیم الامت کی کوشش جدوجہد، محنت اور خدمت خلق و امت ہے جو زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہی۔ ہم نے دیکھا ہے جب خطرہ کی گھنٹی بجتی ہے تو لوگ اپنی تمام تر شغل جس میں شاعری، رفاہی کام وغیرہ بھی شامل ہیں چھوڑ چھاڑ کر بستر علالت پر صرف افسردگی کے عالم میں موت کے منتظر رہتے ہیں۔ جب کہ علامہ جو یہ بخوبی جانتے تھے کہ وہ چراغ سحری ہیں اور صرف کچھ دنوں یا گھنٹوں کے مہمان ہیں، لیکن انتقال کی آخری شب تک اگر ان کے نظام اوقات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اُسی انہماک اور کوشش سے امت کے کاموں میں مصروف ہیں، جیسے

انھیں کچھ ہوا ہی نہیں۔ علامہ اقبالؔ کی یہ مثبت فکر ہی ہمارے لیے بہت بڑا درس ہے اگرچہ۔"

مقدمہ کے بعد کتاب کی باقاعدہ ابتدا علامہ کی بیماریوں سے ہوتی ہے جن میں سرِ فہرست علامہ کی آنکھ کی بیماری ہے۔ داہنی آنکھ کی ضعف بصارت، دونوں آنکھوں میں موتیا اُترنا۔ اس کے علاوہ عوارض گردہ (Kidney Problem)، نقرس (Gout)، عوارض قلب (Heart Problem)، عوارض ریوی (Lung Problem)، اس کے علاوہ دردِ گلو امراض دہان، ملیریا، کم خوابی وغیرہ بیماریاں بھی تھیں۔

مصنف نے بالترتیب ان بیماریوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہ مرض کیا ہے کیوں ہوا اور کیسے ہوا، کس مرض کا علاج کس ڈاکٹر سے ہوا۔ ان ڈاکٹروں کے اقبالؔ سے کیا مراسم رہے اور اقبالؔ کس قدر پریشان رہے۔ ان سب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ جس سے اقبالؔ کی علالت ہی نہیں ان کی شخصیت اور حیات کے مختلف اور کارآمد گوشوں پر معنی خیز روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً آنکھ کی کمزوری کے بارے میں سید نذیر نیازی "دانائے راز" میں لکھتے ہیں:

"اقبال دو سال کے ہوئے تو ایک بیماری کے علاج کے لیے ان کی بے جی (والدہ) نے ان کی داہنی آنکھ کے قریب جونکیں لگوائیں۔ جونکوں نے فاسد خون چوس لیا۔ بیماری جاتی رہی لیکن آنکھ کی بینائی متاثر ہوئی۔ یہاں تک کہ عمر کے ساتھ ساتھ یہ بینائی بالکل جاتی رہی۔"

"روزگار فقیر" میں سید وحید الدین لکھتے ہیں:

"اقبالؔ کی ایک آنکھ بچپن ہی سے کمزور تھی۔ 1901ء میں جب ایکسٹرا اسسٹنٹ کے امتحانِ مقابلہ میں شریک ہوئے تو طبی بورڈ نے آنکھ کی بینائی کمزور ہونے کے سبب ان کو سرکاری ملازمت میں لیے جانے کی سفارش نہیں کی۔ یہ بظاہر ایک طرح کی ناکامی تھی، مگر علامہ کے مستقبل کے تابناک اور کامیاب ہونے کا پیش خیمہ تھی۔ سرکاری ملازمت میں وہ کمشنر اور گورنر بن سکتے تھے مگر ترجمانِ حقیقت اور حکیم مشرق غالباً نہ بن سکتے۔"

ضعف بصارت سے اقبالؔ کو کس قدر پریشانیاں ہوئی ہوں گی اس کا اندازہ خود

علامہ کے دو مختلف خطوط کے ان جملوں سے لگایا جا سکتا ہے:

''میری بصارت کمزور ہوگئی ہے اس واسطے اب میری خط و کتابت جاوید کرتا ہے یا دیگر احباب...... آپ کالی سیاہی سے سفید کاغذ پر لکھیں تو آپ کا خط میں خود بھی پڑھ سکوں گا......''

مولوی عبدالحق کو لکھتے ہیں:

''مجھے ضعف بصارت کی وجہ سے ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کردیا ہے۔ یہ خط ایک دوست سے لکھوایا ہے۔ نظم کا ان سے دوسرا بند الٹا لکھا گیا ہے۔ معاف فرمایئے۔''

خان محمد نیاز الدین خاں لکھتے ہیں:

''مجھے درد گردہ کی شکایت رہی جس کا سلسلہ ایک ماہ سے اوپر جاری ہے۔ جدید طبی آلات کے ذریعہ گردہ کا معائنہ کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ گردہ میں پتھر ہے اور یہ عمل جراحی کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے مگر تمام اعزا اور دوست عمل جراحی کے خلاف ہیں۔ درد فی الحال رُک گیا ہے اور میں حکیم نابینا صاحب سے علاج کرانے کی خاطر آج شام دہلی جا رہا ہوں۔ وہاں چند روز قیام رہے گا......''

فقیر وحید الدین نے لکھا ہے کہ 1928ء میں علامہ کو درد گردہ کی شدت سے تکلیف اُٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں حسبِ ذیل دُعائیہ اشعار کہے جو روزنامہ ''انقلاب'' میں شائع ہوئے۔

وہ مرا فرصت ہُو حق دو سہ روزے دگرے
کہ در ایں دیرِ کہن بندۂ بیدار کجاست

•••

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

ایک اور دلچسپ اور سبق آموز واقعہ غلام رسول مہر نے کتاب ''درون خانہ'' کے

دیباچہ میں لکھی ہے:

''ایک مرتبہ گرمیوں میں گردے کی تکلیف ہوئی اور وہ کئی روز بیمار رہے۔ میں دوپہر کے وقت دفتر جاتے جاتے مزاج پُرسی کے لیے حاضر خدمت ہوا۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں ان کی خواب گاہ کے پیچھے ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ شمالی جانب تھا۔ اس میں تپش کم ہوتی تھی۔ فرش پر خوب پانی ڈلوا کر اس کمرے میں لیٹے ہوئے تھے...... اس اثنا میں ایک اور صاحب بھی عیادت کے لیے آ گئے اور میرے پاس بیٹھ گئے۔ یکا یک مرحوم نے مجھ سے پوچھا۔

''مہر صاحب! تکلیف انسان پر اس کے نفس کی طرف سے آتی ہے یا اللہ کی طرف سے؟''

میں جواب میں حدیثِ جبرئیلؑ سے وہ الفاظ دھرا دینا چاہتا تھا، جو رسول اکرمؐ نے قیامت کے سوال پر فرمائے تھے۔ یعنی......

''جس سے پوچھا گیا ہے اس کا علم پوچھنے والے سے زیادہ نہیں۔'' لیکن میں کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ جو صاحب میرے پاس بیٹھے تھے بول اُٹھے۔ ''ڈاکٹر صاحب! سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔''

یہ سنتے ہی ان پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ پہلے چیخ نکلی۔ پھر روتے روتے کہتے جاتے کہ ''اگر یہ تکلیف اللہ کی طرف سے ہے تو میری توبہ میری توبہ......'' ''میں نے کیوں شکوہ کیا۔''

اس کے بعد نقرس (Gout) کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نقرس کیا ہے اور اقبالؔ کے یہاں اس بیماری کی کیا نوعیت تھی اس کی تصدیق کے لیے وہ اقبالؔ کے ہی خطوط کے حوالے دیتے ہیں مثلاً ایک خط میں حکیم نابینا کو لکھتے ہیں:

''اس بات کا بھی خیال رہے کہ مجھے گاہے گاہے دردِ نقرس بھی ہو جاتا ہے اس کی روک تھام بھی ہوتی ہے۔ انگوٹھے پر لگانے کی دوا بھی ہو تو

اور بہتر ہے۔''

ڈاکٹر جاوید اقبال بھی ''زندہ رود'' میں لکھتے ہیں:

''اس کے بعد دردِ نقرس کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ اس کے دورے پڑتے تو لگاتار کئی راتیں کرب اور بے چینی کے عالم میں تڑپتے گزر جائیں۔''

''روزگارِ فقیر'' میں وحید الدین لکھتے ہیں:

''صاحبِ درد ہونا علامہ کی قسمت میں لکھا تھا۔ دردِ گردہ گیا تو اس کی جگہ نقرس نے لے لی جو پاؤں کے انگوٹھے کے جوڑ میں ہوتا تھا۔ اس کا دورہ جب بھی پڑتا، علامہ کے لیے سخت تکلیف دہ ثابت ہوتا۔''

ان بیماریوں کی شہ بیماری۔ بیماریٔ قلب۔ جس کی وجہ سے وحشت، گھبراہٹ اور نیم بے ہوشی کی حالت سی رہتی لیکن اس حالت میں بھی وہ علم اور عالم کے گھیرے میں رہتے۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ تو بے خبری میں پلنگ سے فرش پر گر گئے۔ انہی ایام میں دمے کے پے در پے دوروں کے بعد نیم بے ہوشی کے عالم میں راقم نے انھیں دو مرتبہ اپنی خواب گاہ میں مرزا اسد اللہ غالب اور مولانا جلال الدین رومی سے باتیں کرتے سُنا تھا۔ دونوں مرتبہ علی بخش کو بلوا کر پوچھا کہ مرزا غالب یا مولانا رومی ابھی اُٹھ کر گئے ہیں دیکھنا کہیں چلے تو نہیں گئے۔''

اور علی بخش کے اس جواب پر کہ ''یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔'' فرمایا: ''چلو ٹھیک ہے۔''

اس کے بعد مصنف نے اقبال کے اختلاج قلب اور تمبا کو نوشی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں عابدی صاحب نے اقبال کی زندگی کے کچھ بے حد اہم واقعات درج کیے ہیں۔ ہر چند کہ ان واقعات کا ذکر اقبال کے خطوں یا بعض اہم کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن فاضل مصنف نے ان کو کچھ ایسی ترتیب دی اور حقائق کو کچھ اس طرح ترتیب وار پرویا اور سجایا ہے کہ یہ کتاب اپنے آپ میں ایک زندہ رود سی لگنے لگتی ہے۔ جانے انجانے میں اقبال کی شخصیت کی کمزوریاں یا مزاجی کیفیتیں وغیرہ بھی بڑے دلچسپ انداز

میں سامنے آتی ہیں۔ اور یہ بھی کہ کچھ غلط فہمیاں بھی دور ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اقبالؔ تمباکو کے علاوہ شراب نوشی بھی کرتے تھے لیکن مصنف نے بڑے دعویٰ سے یہ بات کہی ہے:

> ''علامہ اقبالؔ ہرگز شراب نوش نہ تھے بلکہ شراب نوشی کو خودکشی کے مترادف قرار دیتے تھے۔ یہاں یہ بیان کردینا بھی ضروری ہے کہ قیامِ یورپ کے تین برسوں میں اور بعد میں بھی جب کبھی وہ یورپ گئے انھوں نے گوشت بالکل استعمال نہ کیا۔ چہ جائیکہ شراب........''

اس دعویٰ کی تائید میں وہ کئی واقعات اور کئی ثبوت بھی پیش کرتے ہیں جو یقین کی منزلوں کو چھوتے ہیں اور باتوں باتوں میں عیسائیت و مغربیت پر تبصرے بھی ہوتے چلتے ہیں جو اقبالؔ کی ذاتی زندگی کو سمجھنے میں تو مدد کرتے ہی ہیں نیز ان کی شاعرانہ و مفکرانہ شخصیت کی تفہیم میں معاونت کرتے ہیں۔ اور آگے بڑھتے ہوئے مصنف نے اقبالؔ کی معمولی اور چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا بھی ذکر کیا ہے، مثلاً امراض حلق و سینہ، برونکائٹس، تنگی نفس، دم پھولنا، ورم ریوی اور نمونیا، ناک اور حلق کی بیماریاں، آواز کا بیٹھ جانا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ آواز کا ختم ہوتے چلے جانا اقبالؔ کی نہ صرف ذاتی زندگی بلکہ ان کی ادبی و سماجی اور سیاسی زندگی پر گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ مصنف نے 1936ء کو لکھے ایک خط کا ذکر یوں کیا ہے۔ اقبالؔ پروفیسر الیاس برنی کو لکھتے ہیں:

> ''دو سال سے اوپر ہو گئے جنوری کے مہینے میں عید کی نماز پڑھ کر واپس آیا سویّاں دہی کے ساتھ کھاتے ہی زکام ہوا۔ بھی دانہ پینے پر زکام بند ہوا تو گلا بیٹھ گیا۔ یہ کیفیت دو سال سے جاری ہے۔ بلند آواز سے بول نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے بالآخر بیرسٹری کا کام بھی چھوڑنا پڑا۔ انگریزی اور یونانی اطبا دونوں سے علاج کیا مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔''

اس کے بعد جو نتیجہ نکالا وہ یوں ہے:

اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ کی آواز تقریباً جنوری 1934ء سے بیٹھ گئی تھی جو ان کے انتقال یعنی سوا چار سال تک بحال نہ ہو سکی۔ جس نے علامہ کی روزمرہ زندگی، سیاسی

زندگی کے ساتھ معاشی اور اقتصادی حالات پر گہرا اثر چھوڑا۔

1. علامہ نے جلسوں اور میٹنگوں میں قریب تقریر کرنا چھوڑ دیا۔
2. علامہ نے بیرسٹری کا کام بھی پہلے کم اور بعد میں ترک کر دیا۔
3. علامہ نے قرآن پاک کی با آواز بلند تلاوت جو ہر صبح کیا کرتے چھوڑ دی۔
4. علامہ نے سیاست اور انتخابات میں بھی شرکت کم کر دی۔
5. آواز کے بیٹھ جانے کے بعد علامہ کی نفسیات بھی مجروح ہوئی اور عام طور پر علامہ غم زدہ نظر آنے لگے جس کا ذکر علامہ کے احباب اور اطرافیان اس بیماری سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبالؔ کی زندگی کے آخری ایام کس کرب سے گزرے ہوں گے اور بہت سارے کام جو وہ کرنا چاہتے تھے نہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بیماریوں کی وجہ سے اقبالؔ کا سکون چھن گیا۔ نیند نہ آنے کی بیماری بھی ہوگئی۔

بیماریوں کی تفصیلات کے بعد وسط میں ان معالجین کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جنھوں نے ہر طرح سے نہ صرف پیشہ وارانہ بلکہ نہایت مخلصانہ بلکہ عقیدت مندانہ طور پر اقبالؔ کا علاج کیا جس کی وجہ سے تھوڑی بہت راحت ہو جاتی، لیکن کثرت امراض اور مہلک بیماریوں نے اقبالؔ کو جکڑ سا دیا۔ ان ممتاز معالجین میں حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر عبدالباسط انصاری، ڈاکٹر رحمان، ڈاکٹر امر چند، ڈاکٹر احمد بخش خاں وغیرہ خاص تھے ان میں یونانی، انگریزی بھی طرح کے معالج تھے۔

ان بیماریوں کی وجہ سے ایک طرف ان کی صحت گرتی گئی تو دوسری طرف ان کے پروگرام منسوخ ہوتے گئے۔ تلاوت سے محروم ہوئے۔ جلسے جلوس چھوٹے، خطبے نہ دے سکے۔ وکالت چھوٹی، مصنف نے بڑی دردمندی کے ساتھ ایک جگہ لکھا ہے:

> ''آخری علالت کے مہینوں میں آواز سے مایوس ہوگئے اور پھر دمہ کے حملوں کے اسیر رہے۔ اب اقبالؔ کی توجہ آواز سے زیادہ تنگیٔ نفس پر تھی۔''

ع : اے بسا آرزو کہ خاک شد

تف برتو اے چرخ پیر! تو نے اس برصغیر کی اذان صبح گاہی کی آواز کو دھیما کر دیا۔ جو ملت کو خواب گراں کر جگا رہی تھی۔

چند اقتباسات اور ملاحظہ کیجیے:

”برقی علاج کے سلسلے میں اقبالؔ پہلی بار 37 دن بھوپال میں رہے۔ اس دوران انھوں نے ریاض منزل میں سات نظمیں لکھیں ”ضربِ کلیم“ میں موجود یہ نظمیں سلطانی، تصوف، وحی، مقصود، حکومت، نگاہ اور اُمید اس علاج کی روداد کو تازہ کرتی رہیں گی۔ اس قیام کے دوران بھوپال کے نواب اقبالؔ سے بہت متاثر ہوئے اور سر راس مسعود کو اس گزارش پر پانچ سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا، جس میں انھوں نے لکھا تھا۔ ”دورِ حاضر کے سب سے بڑے مسلم زندہ شاعر سر محمد اقبالؔ کے نام نامی سے آپ ضرور واقف ہوں گے ان کا نہ صرف ہماری قوم کی ذہنی وفکری زندگی میں بلند ترین مقام ہے بلکہ مغربی دُنیا آج انھیں ادب وفلسفہ ہر دو کے میدان میں مسلمانانِ ہند کی ثقافت کا عظیم نمائندہ تسلیم کرتی ہیں۔ بدقسمتی سے گزشتہ بارہ ماہ سے وہ حلق کے ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہیں اور اس کی کوئی امید باقی نہیں کہ وہ آئندہ کبھی اپنی بیرسٹری کی پریکٹس جاری کر سکیں گے جو ان کی معاش کا واحد وسیلہ تھی۔“

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

”بھوپال میں برقی علاج کے دوسرے دورنے اقبالؔ کی صحت پر اچھا اثر ڈالا۔ یوں تو وہ علاج کے مسائل میں مصروف تھے لیکن شیش محل میں انھوں نے قرآن کریم پر نوٹس لکھنے کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ فکر اور استغراق میں ہمیشہ ڈوبے رہے۔ جب بھی موقع ملتا اور طبیعت میں آمد کا نزول ہوتا تو شعر بھی کہتے۔ چناں چہ شیش محل کے پرسکون ماحول میں اقبالؔ نے پانچ نظمیں لکھیں جواب ”ضربِ کلیم“ کی زینت ہیں۔ صبح، مومن، ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام، جمعیت اقوام مشرق اور مسولینی وہ نظمیں ہیں جو اسی قیام کے دوران لکھی گئیں۔ یہی نہیں، بلکہ اقبالؔ نے اس مختصر قیام کے دوران کئی مشاہیر احباب اور افراد سے خط و

کتابت بھی کی اور اس طرح سیاست اور قومی مسائل میں پوری طرح
شریک بھی رہے۔''

اسی قیام کے دوران اقبالؔ نے ایک فارسی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' کے نام لکھنی شروع کی جو لاہور جا کر تکمیل کی۔ اس مثنوی کی بابت 29/ جولائی 1936ء کو سر راس مسعود کو لکھتے ہیں:

''3/ اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا۔ میں نے تمہارے دادا رحمتہ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں عرض کر۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل ساٹھ شعر ہوئے۔ لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا حصہ ہو جائے تو خوب ہو۔ الحمدللہ۔''

مصنف نے اقبالؔ کے وہ فارسی اشعار بھی پیش کیے ہیں جن میں علامہ نے اپنی بیماری اور بے چارگی کا ذکر کیا ہے، وہ اشعار یوں ہیں ؎

کار این بیمار نتواں بُرد پیش
من چوں طفلان نالم از داروئی خویش

•••

در نسازد با دوا ہا جان زار
تلخ و بوئیش ہر مشامم ناگوار

•••

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز

ترجمہ: - بیماری سے چھٹکارا نہیں اور میں بچوں کی طرح کڑوی دواؤں سے گھبراتا ہوں۔ میں تاریکی پھیلانے والوں سے لڑ رہا ہوں کچھ تیل اور میرے چراغ میں ڈال دے۔''

ان تمام اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال شعری و ادبی سطح پر کیا کیا منصوبے رہتے تھے اور کیا کیا کرنا چاہتے تھے۔ قدرت نے انھیں چند برس اور عطا کر دیے ہوتے تو وہ یقیناً کچھ اور شعری سرمایہ بھی چھوڑتے اور قرآن شریف کے نوٹس بھی تیار کرتے جو ظاہر ہے کہ معرکے کی چیزیں ہوتیں لیکن...... ''اے بسا آرزو کہ خاک شد''

کتاب کے آخری حصہ میں علاج کی کوتاہیوں۔ پرہیز کی کمزوریوں اور دوسری قسم کی چیزوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور پھر آخر میں ایک سوال بھی قائم کیا ہے۔ کیا اقبال نے بیس سال عمر کم پائیں؟ اور یہ بھی کہ قبل از وقت موت نے ان کے کن کن منصوبوں کو ادھورا چھوڑ دیا جس میں سر فہرست ہے قرآن کے نوٹس یعنی مقدمہ القرآن کا نہ لکھ پانا اور راس مسعود کے نام یہ خط:

> ''میں قرآن کریم پر عہدِ حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کرلیتا جو عرصے سے میرے زیرِ غور ہیں لیکن اب تو نہ معلوم کیوں محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیاتِ مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آجائے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیش کش مسلمانانِ عالم کو پیش نہیں کرسکتا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف کے نوٹ لکھنے پر صرف کردوں گا۔''

مقدمہ قرآن کے علاوہ وہ ایک اور کتاب فراموش شدہ پیغمبر کا صحیفہ لکھنا چاہتے تھے، نہ لکھ سکے۔ ان مہلک اور اذیت ناک بیماریوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ وہ کلکتہ کی لیگ کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی لینے نہ جاسکے۔ ترکی، مصر تقریر کرنے کی دعوت دی گئی، نہ جا سکے اور بہت کچھ نہ کر سکے۔ جس کی تفصیل مصنف نے بڑے سلیقے اور عرق ریزی سے ترتیب دی ہے جس سے نہ صرف ان کے آخری دور کی تکلیف، مجبوریاں اور پریشانیاں کھل کر سامنے آتی ہیں بلکہ اقبال جیسے عظیم شاعر و مفکر کی مایوسی و بے چارگی پر رونا بھی آتا ہے کہ مذہب، قوم، شاعر وغیرہ کو زندہ کرنے والا شاعر، فلسفی، مفکر کو قدرت نے کتنی جلدی، آواز حرکت و عمل سے محروم کر دیا۔

یہاں تک کہ کبھی کبھی خود اقبالؔ پر رقت طاری ہو جاتی۔ فقیر وحیدالدین نے ایک خط کے حوالے سے لکھا ہے: ''خدا نے مجھے زبان تو عطا کی ہے لیکن آواز سے محروم رہا۔ یہ کہتے کہتے ان پر رقت طاری ہو گئی۔'' اقبالؔ انسان تھے کبھی کبھی اس کیفیت کا طاری ہونا فطری تھا لیکن اس کیفیت کا تعلق اپنی ذات کے لیے کم تھا بلکہ وہ قوم وملت کو ابھی اور بہت کچھ دینا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ اکثر امید ونشاط کی کیفیت میں ہی رہتے۔ لوگ حیران ہوتے، سوال کرتے تو وہ کہتے ؎

اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

مصنف نے علاج ومعالجہ کی تفصیل تو لکھی ہے اس طرح کے واقعات سے اقبالؔ کی شخصیت وشاعری پر بھی جابجا روشنی ڈالی ہے۔ زندگی کے آخری لمحات یہاں تک کہ اقبالؔ کے جلوس جنازہ تک کو بھی اس کتاب میں تفصیل سے پیش کیا گیا ہے اور پھر سب سے آخر میں مقبرہ تک کا ذکر ملتا ہے۔ غرض کہ اسی گراں قدر کتاب میں مصنف نے نہایت عرق ریزی دیدہ داری اور دیانت داری کے ساتھ اقبالؔ سے متعلق ایسی روداد اور ایسے حقائق جمع کر دیئے ہیں جن کو اس انداز سے آج تک کوئی نہ جمع کر سکا۔ یہ سچ ہے کہ یہ حقائق، خطوں، کتابوں یا تذکروں میں بکھری ہوئی شکل میں کہیں نہ کہیں موجود تھے لیکن مصنف کی بے پناہ تلاش وتحقیق اور تخلیق نوعیت کی ترتیب دینے کا جو غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے اس کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے۔ یہ کتاب اپنی انفرادیت۔ اپنی حقیقت وواقفیت اور غیر معمولی ترتیب وتدوین کے ذریعہ دُنیائے اقبالؔ شناسی میں مدتوں یاد کی جائے گی۔ جس کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

محمد ممتاز راشد
مدیر اعلیٰ ''خیال و فن'' لاہور/ دوحہ

''سبدِ سخن''

(تیس تحقیقی و تنقیدی مقالات)

اُردو ادب کے بنیادی مراکز (پاک و ہند) سے دُور اُبھرنے والے مراکز میں کینیڈا کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہاں مقیم نثر نگار ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام دُنیائے ادب کے روشن ناموں میں سے ایک نام ہے۔ ''سبدِ سخن'' انہی کے تیس تنقیدی و تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ پُر مغز کتاب مجھے دہلی سے ڈاکٹر شاہد حسین کی طرف سے ڈاک سے ایک ساتھ دیگر تین کتب کے ساتھ 23/ اپریل 2008ء کو دوحہ میں ملی۔ دیگر کتب یہ تھیں۔

1. ''مجتہدِ نظم مرزا دبیرؔ'' (فن و شخصیت)، 189 صفحات...... ڈاکٹر سید تقی عابدی
2. ''غالب دیوانِ نعت و منقبت''، 820 صفحات...... ڈاکٹر سید تقی عابدی
3. ''فنکارِ حق شناس''، 112 صفحات (یہ کتاب ڈاکٹر سید تقی عابدی کے بارے میں ہے)...... پروفیسر عبدالمنان طرزیؔ

زیرِ تبصرہ کتاب ''سبدِ سخن'' کا مطالعہ میں نے مہینہ بھر میں مکمل کیا کیوں کہ میں اسے سرسری طور پر نہیں پڑھنا چاہتا تھا اور پھر میں نے اس کے مباحث پر غور و فکر کرتے ہوئے اور تحریر کی خوب صورتی کا لطف لیتے ہوئے اسے مکمل کیا۔ اس کتاب میں ضابطے کا صفحہ شامل نہیں ہے جس سے کتاب کے بارے میں کوائف مثلاً سنِ اشاعت، قیمت اور ناشر وغیرہ کا پتہ چلتا البتہ بیک ٹائٹل پر ''پرنس آرٹ پرنٹرز'' درج ہے مگر شہر کا نام غائب ہے۔ انتساب نامور ادیب ڈاکٹر شان الحق حقی کے نام ہے جو 2007ء میں کینیڈا میں فوت ہوئے تھے۔ وہ کراچی سے چند سال قبل ہی کینیڈا منتقل ہوئے تھے۔ انتساب کے بعد دو صفحات پر مصنف کے کوائف ہیں اور ان سے مصنف کے بارے میں قاری کو کافی معلومات مل جاتی ہیں۔ مثلاً

پیدائش دہلی یکم مارچ 1952ء، تعلیم: ایم بی بی ایس (حیدرآباد، انڈیا)، ایم ایس (برطانیہ)، ایف سی اے پی (امریکہ)، ایف آر سی پی سی (کینیڈا)، پیشہ: طبابت، ذوق وشوق: شاعری، ادبی تحقیق وتنقید، مطالعہ اور تصنیف وتالیف، اہلیہ: گیتی، ایران، برطانیہ اور امریکہ میں بھی رہے۔ دو بیٹیاں (معصوما اور رویا)، دو بیٹے (رضا و مرتضٰی)، تین کتب کے خالق ہیں جو زیادہ تر مرثیہ نگاروں کے حوالے سے ہیں۔ ''سبدِ سخن''، کے صفحہ 7 پر مصنف نے ''وجہِ تالیف'' میں لکھا ہے کہ ''عروسِ سخن'' اور ''ذکرِ دُرباران'' کی پذیرائی کے بعد مضامین کا یہ تیسرا مجموعہ پیش ہے جو میرے لیے محلِ سر سبد جیسا ہے۔ اگلے دو صفحات پر فہرست مشمولات ہے۔ اس کتاب میں کسی کا تحریر کردہ کوئی دیباچہ یا مصنف کا پیش لفظ شامل نہیں ہے اور مضامین کا سلسلہ فہرستِ مشمولات کے فوراً بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ کبھی مضامین ادبی شخصیات اور ادبی کتب پر لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ ٹائٹل ہی پر واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ تحقیقی وتنقیدی مضامین ہیں مگر تنقید کے حوالے سے مصنف کا لب ولہجہ عام نقادوں کا سا نہیں ہے بلکہ تنقید میں بھی زیادہ تر توصیفی پہلو ہی نمایاں ہیں۔ کتاب میں شامل زیادہ مضامین مرثیہ نگاری کے تجزیوں پر مشتمل ہیں اور ان میں بھی میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے بارے میں زیادہ لکھا گیا ہے۔ ان کے بارے میں جگہ جگہ یہ مضامین ملتے ہیں:۔ ''مثنوی مرزا دبیرؔ'' میں معراج نامہ کا ادبی معیار، مرزا دبیر اور ''دیارِ نجف'' میدانِ رباعی کا شہسوار مرزا سلامت علی دبیرؔ، میر انیسؔ کی جذبات نگاری، زہرا کی جھلک دبیر کے کلام کی روشنی میں، شبلی کے پیمانوں سے دبیرؔ کی مثنوی ''احسن القصص'' کی ارزش یابی، ''ابواب المصائب'' تصنیفِ مرزا دبیر، ''مراثی دبیرؔ'' میں استعاراتی نظام کا ہجوم...... اس فہرستِ مضامین سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ زیادہ تحریریں دبیر کے بارے میں ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مصنف نے اپنے مضامین میں مرزا دبیر کے بے پناہ تخلیقی کارناموں خصوصاً رباعیات کو بڑی عرق ریزی سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ (سب سے زیادہ اُردو رباعیات یعنی 1332 مرزا دبیر ہی کی ہیں۔)

''سبدِ سخن'' میں مرثیہ کے مضامین کے بعد سب سے زیادہ مضامین علامہ اقبالؔ کے بارے میں ہیں بلکہ صورت یہ ہے کہ اقبالؔ کے بارے میں مصنف کی یہ تحریریں اگر جمع کی جائیں تو اقبالؔ پر الگ سے ایک کتاب آ سکتی ہے البتہ مصنف چاہیں تو اس کتاب میں

اقبالؔ کے بارے میں اپنے کچھ نئے مضامین بھی شامل کر سکتے ہیں۔ ''سبدِ سخن'' میں اقبالؔ کے بارے میں مضامین یہ ہیں۔

''علامہ اقبالؔ اور ملک الشعراء گرامی...... باہم مہربان، مصاحب اور معترف''، ''علامہ اقبالؔ کا سچا سخن گو...... علی بخش'' (علی بخش بچپن میں علامہ اقبالؔ کا ملازم ہوا اور چالیس سال تک علامہ کی رحلت تک ان کا خدمت گزار رہا۔)، ''علامہ اقبالؔ کی آخری رات'' (اس میں ذکر ہے کہ کاش علامہ کی آخری رات میں کی گئی خواہش پوری ہو جاتی جو کہ ایک نعت خواں سے ایک پنجابی نعت سننے کے بارے میں تھی۔ یہ نعت علامہ کو بے حد پسند تھی۔)، ''علامہ اقبالؔ کی تاریخ گوئی'' (اس میں وہ درجنوں منظوم تاریخیں درج ہیں جو علامہ نے مختلف مواقع پر کہی تھیں)، ''اقبالؔ کا فلسفۂ تقدیر''، ''جاوید نامہ: اقبالؔ کا انسان سازی کا زندۂ جاوید شاہکار''، ''علامہ اقبالؔ اور علی بخش''، ''علامہ اقبالؔ کا مقبرہ'' (نزد صدر دروازہ شاہی مسجد لاہور)۔

''سبدِ سخن'' میں ان اقبالی مضامین میں علامہ اقبالؔ کے فنی اور فکری کمالات کا بخوبی احاطہ کیا گیا ہے البتہ کتاب میں یہ مضامین مرثیوں کے مضامین ہی کی طرح کسی ایک جگہ جمع نہیں ہیں بلکہ بکھرے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان جگہ جگہ دیگر مضامین بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔

مرثیہ نگاری اور علامہ اقبالؔ کے بارے میں مضامین کے علاوہ ''سبدِ سخن'' میں شامل دیگر نمایاں مضامین یہ ہیں: ''غالبؔ کی نعتیہ غزل کا اجمالی تجزیہ''، ''اردو کا سحبانِ محمدؐ'' (میر مہدی مجروحؔ)، ''ایک ہندو شاعرہ ''روپ کنوار کماری: افسانہ یا حقیقت؟'' (یہ مرثیہ نگار تھیں)، ''شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ'' نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ایک مختصر جائزہ، ''نظم اُردو'' ناطق لکھنوی (اس نظم میں زبانِ اُردو کی منظوم تاریخ ہے۔)، ''عمر خیام: اتنا تو ہمیں جاننا چاہیے'' عمر خیام کا تعارف، فانیؔ بدیوانی کا ''فانی کا لافانی فن''، ''غزل حقّی کی حقیقی پہچان''، ''حدیثِ دل'' (نعتیہ مجموعہ ''ارمغانِ عارفؔ'' کا تجزیہ)، ''جدید مرثیہ میں صبا اکبر آبادی کا منفرد چہرہ''، ''رہتا خموش کیوں مرے دادا کلیم تھے'' (باقر زیدی کے مرثیوں کے مجموعہ ''فراتِ سخن'' کا اجمالی جائزہ)، ''حامد امروہوی کی نعتیہ شاعری'' ان مضامین میں بھی

تین مضامین مرثیہ کے حوالے سے ہیں اس طرح کتاب کا یہی رنگ دیگر رنگوں پر حاوی نظر آتا ہے تاہم کسی بھی طرح کے مضامین ہوں مصنف نے جگہ جگہ قواعدِ زبان، شاعری کی صنعتوں اور دیگر فنی پہلوؤں کی روشنی میں بھی اہلِ ادب اور ان کی تخلیقات کا تجزیہ کیا ہے عمومی طور پر توصیفی اور تحسینی انداز کا ہے۔ کہیں کہیں تنقیدی پہلو بھی ہیں مثلاً صفحہ 113 پر وہ لکھتے ہیں: ''ردیف کا استعمال شاعر کی پختگی اور کلام کی عظمت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگرچہ ہمارے اساتذہ شعراء نے بھی ردیف کی بابت سہل انگاریاں کی ہیں، جہاں ردیف کے ہونے نہ ہونے سے مصرعوں کے معنی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ردیف ''نہیں ہے'' میں سے ''ہے'' نکال بھی دیا جائے تو چنداں فرق نہیں ہوتا''...... اس کے بعد مصنف نے فانؔی بدایونی کی تعریفیں کی ہیں کہ ان کے ہاں ایسے عیوب نہ تھے حالاں کہ آگے جاکر انھوں نے فانؔی کے جو اشعار دیے ہیں ان میں بھی مذکورہ عیب موجود ہے مثلاً ؂

دیوانہ تمہارا کوئی دیوانہ نہیں ہے یہ اُن کی گلی ہے ترا غم خانہ نہیں

بلکہ فانؔی کے اس مطلع میں تو تنافر بالمخارج کا عیب بھی موجود ہے۔ اور یہی عیوب مصنف کے دیگر ممدوحین شان الحق حقی اور میر انیسؔ کے ہاں بھی ہیں اور ان شعراء کے یہ عیب دار اشعار بھی مصنف کی اسی کتاب میں موجود ہیں۔ بہر حال اصل بات یہی ہے کہ ایسے فنی عیوب سے کوئی شاعر بچ نہیں سکا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے عیوب کا عادی ہے کہ غیر ارادی طور پر یہ غلطی سرزد ہوئی ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ اس کا یہ عیب دار کلام نومشقی کے دَور کا ہے کہ پختگی کے دَور کا؟...... جہاں تک ڈاکٹر سید تقی عابدی کی زیرِ تبصرہ کتاب ''سبدِ سخن'' کے بارے میں مجموعی تاثر کا تعلق ہے تو میں نے یہ پایا ہے کہ یہ کتاب بہت سے ادبی مباحث کا احاطہ کرتی ہے اور ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے بہت سی وسعتیں اور ابعاد سامنے لاتی ہے۔ بعض مقامات پر وہ اپنے کسی ممدوح شاعر کی حمایت میں قدرے جذباتیت کا شکار بھی نظر آتے مگر اُن کی غالب تحریریں بہت متوازن اور متواضع ہیں جس کے لیے ان کی لازمی طور پر تحسین ہونی چاہیے اور اسی بنا پر بھی انھیں خاکسار کی جانب سے بھی ہدیۂ تبریک......

ع...... اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

علاّمہ سید عقیل الغروی
انگلینڈ

رباعیاتِ دبیر: از ڈاکٹر سید تقی عابدی

یارب جبروتی تجھے زیبندہ ہے
ہر تن ترے سجدے میں سر افگندہ ہے
توحید کا کلمہ یہی پڑھتا ہے دبیر
جو تیرے سوا ہے وہ ترا بندہ ہے

اُردو میں ہائیکو یا ثلاثی کی درآمد اور دریافت سے پہلے مختصر ترین شعری اظہار کا مستحکم ترین سانچہ رباعی ہی تھی۔ اس کی علمی اور فنی نزاکتوں کے پیشِ نظر اسے مشکل ترین اصنافِ شاعری میں شمار کیا گیا ہے۔ اس کے مخصوص اوزان اور اس کی معین ہیئت میں عجب سحرِ جلال یا اعجازِ سخن کا نقش پنہاں ہے۔ اس کا ظرف محدود ہے لیکن اس کی ظریفت اتھاہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس میں بیشتر حکیمانہ مضامین سموئے گئے ہیں۔

ہمارے بعض محققین اس مسئلے میں خاصے اشتباہ میں مبتلا رہے ہیں کہ یہ عربوں کی ایجاد ہے یا اہلِ فارس کا اختراع؟ اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی اپنی رائے میں بالکل منفرد ہیں۔ مولانا امداد امام آثر نے بھی ''کاشف الحقائق'' میں یہی لکھا ہے کہ ''یہ صنفِ شاعری اہلِ عرب کی ایجاد ہے جیسا کہ کتب تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔'' تاہم اس قضیہ میں حق، حافظ محمود شیرانی ہی کے ساتھ ہے اور ایجادِ رباعی کے بارے میں جملہ بحثوں کا بہترین خلاصہ اور نتیجہ تحقیق ہمیں شیرانی کی اس مختصر عبارت میں مل جاتا ہے:

''رباعی کسی شخصی ایجاد کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ارتقا یافتہ شکل ہے قدیم چار بیتی کی جو بحر ہزج مربع اخرم واخرب میں لکھی جاتی تھی۔ ان ایام میں صدور وابتداء میں اخرب ومکفوف، اخرب وموفور کا اختلاف جائز سمجھا

جاتا تھا جو چار بیتی کے ہر مصرعے میں کارفرما ہے۔ جس کی بناء پر پہلے مصرع میں مفعول کے مقابلے میں دوسرے مصرع کے شروع میں مفاعیل یا مفاعلین آجاتا ہے۔ بحرِ ہزج عربی میں مربع الارکان مستعمل ہے۔ جب عربی عروض فارسی میں اختیار کی گئی تو ضروری ہے کہ ابتداء میں اشعار ہزج کے مربع لکھے جاتے ہوں۔ چناں چہ رباعی بھی مربع میں لکھی گئی۔ چوں کہ اس میں چار شعرا ہوا کرتے تھے اس بناء پر اس کا نام چار بیتی رکھا گیا۔ ایک عرصۂ دراز کے بعد جب اصولِ مثمنات کی دریافت نے اہلِ ایران کو زیادہ خوش آئندہ اور شگفتہ اوزان سے آشنا کر دیا، مربعات ترک کر دیے گئے اور مثمنات کو اختیار کر لیا گیا۔ اور ترانہ جو چار بیت مربع میں شامل تھا وہ بیتِ مثمن کے قالب ڈھل گیا اور دو بیتی کہلایا۔'' (''مقالاتِ محمود شیرانی'' ج:5، ص:726)

رباعی کی صنف و ہیئت سے متعلق تاریخی اور عروضی نقطۂ نظر سے اس سے زیادہ بحث و بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔

تاریخِ شعر و ادب میں رباعیات کے تخلیقی سرمایہ کی چھان بین میں بھی کوتاہیاں بہت رہی ہیں۔ جس کی بناء پر ایک طرف بعض ناموں کو بحیثیتِ رباعی گو کو غلط شہرت حاصل ہو گئی تو دوسری طرف بعض مستحقینِ تحسین و تقدیر رباعی گویاں کی رباعیات کے تنقیدی جائزوں میں صحیح قدردانی نہ ہو سکی۔ جس کی سب سے حیرت انگیز مثال سلطانِ اربابِ تصوف شیخ ابوسعید ابوالخیر سے منسوب رباعیات کا قضیہ ہے جس کا حل و فصل پروفیسر عندلیب شادانی کی ژرف کارتحقیق نے کیا۔

اُردو میں صنفِ رباعی کے سرمایہ سے متعلق عموماً جو رائے دی جاتی رہی ہے اس کا سب سے بڑا سبب رباعیات کے ذخیرے کی باقاعدہ اشاعت کا نہ ہو پانا ہے۔ میرے اس مفروضہ کے کئی پہلو برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے اس اندراج سے سامنے آجائیں گے۔

''یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ جیسے رباعیوں کے مجموعے فارسی میں ملتے ہیں، ایسے اور اتنے مجموعے اُردو میں نظر نہیں آتے۔ لیکن کہنے والا یہ بھول جاتا

ہے کہ فارسی اور اُردو کی عمروں میں کتنا فرق ہے پھر بھی اُردو نظم کا ذخیرہ رباعی کے مجموعوں سے خالی نہیں۔ میر انیسؔ نے بہت رباعیاں کہیں اور ایسی کہیں کہ رباعی کہنے کا حق ادا کیا۔ ان کے ہاں اکثر چوتھا مصرع رباعی کو چوتھے آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔"

اُردو میں رباعیوں کے بلند پایہ مجموعوں کی کمی سے متعلق سوال کا ایک جواب تو خود کیفی نے دیا ہے لیکن یہ مکمل جواب نہیں ہے۔ رباعیوں کے دواوین کی عدم اشاعت بھی اس سوال کے پیدا ہونے کا ایک بڑا سبب ہے۔ خود اسی اقتباس میں کیفی نے جو صرف انیسؔ کا نام لیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اُن کے سامنے دبیرؔ کی رباعیوں کا پورا ذخیرہ نہیں تھا۔ رباعی پر بحث و گفتگو کرنے والے بیشتر اصحابِ قول و قلم کے ساتھ یہی صورت حال رہی ہے۔

دبیرؔ کی رباعیوں کا سرمایہ بڑا ہے اور بہت قیمتی ہے جس کی نظر اس پر پڑی ہے اُس نے اس کی قدر دانی ضرور کی ہے۔ اس کی ایک مثال رباعیوں پر تحقیقی تنقیدی اور تخلیقی تینوں زاویوں سے نہایت قابل قدر کارنامے انجام دینے والے صاحبِ قلم پروفیسر وحید اشرف کچھوچھوی کی یہ تحریر ہے:

"رباعی کو اپنا پورا رنگ و آہنگ سب سے پہلے مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ کے ہاتھوں ملا۔ مرزا دبیرؔ نے سب سے پہلے رباعی کو مذہبی اور اخلاقی گوناں گوں مضامین سے وسعت دی۔ میر انیسؔ نے مرزا دبیرؔ کی بنائی زمین کو سرسبز و شاداب کیا۔" (مقدمہ رباعی، ص:46-56)

پروفیسر وحید اشرف نے جو بات لکھی ہے اُن کے پاس اس کے دلائل ضرور ہوں گے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ مرزا دبیرؔ نے صنفِ رباعی کی طرف میر انیسؔ سے کہیں زیادہ توجہ کی۔ یہ بات ان کی رباعیوں کی کمیت اور کیفیت دونوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے اپنے پیشِ نظر تحقیقی کارنامہ میں دبیرؔ کی تیرہ سو سے زیادہ رباعیوں کو جمع کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جب اپنے اس کارنامہ پر نظرِ ثانی کریں گے اور اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کریں گے تو اس تعداد میں اور اضافہ ہوگا۔ میر انیسؔ کی رباعیوں پر تحقیق کا کام ہمارے بزرگ سال و بزرگ مرتبہ ادیب جناب علی جواد زیدی صاحب کو انجام دیے ہوئے

کئی برس ہو گئے اور ابھی تک اس پر کوئی استدراک سامنے نہیں آیا۔ ان کے شائع کردہ مجموعہ ''رباعیاتِ انیس'' میں رباعیوں کی تعداد چھ سو کے آس پاس ٹھہرتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ تعداد کے لحاظ سے دبیر کی رباعیاں انیس سے زیادہ ہیں بلکہ موضوعات اور مضامین کے لحاظ سے بھی دبیر کو فوقیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کا مرتبہ اس مجموعۂ رباعیاتِ دبیر کا مطالعہ خود اس بات کا ثبوت فراہم کرے گا۔

دبیر نے رباعیات کے نہایت محدود و عروضی چوکھٹے میں خوب زورِ طبیعت صرف کیا۔ ان کے یہاں زبان کی پختگی، مصرعوں کی برجستگی، آہنگ و عروض کا توازن، مضامین کا تنوع اور طرح طرح کا تفنن قابلِ دید ہے۔

''دفترِ ماتم'' کی بیسویں جلد میں (ص:32 تا 48) ایک ہی قافیہ و ردیف میں اُن کی 29 رباعیاں ملتی ہیں، جس میں سے ایک رباعی یہ ہے:

انجم نے شرف نورِ قمر سے پایا
اور ماہ نے خورشید سحر سے پایا
اس قافیہ و ردیف کا فیض دبیر
جس نے پایا ہمارے گھر سے پایا

اور اسی ردیف و کافیہ میں دبیر کی ایک نعتیہ رباعی بھی ملاحظہ فرمایئے:

آدم نے شرف خیرِ بشر سے پایا
رشتہ ایماں کا اس گہر سے پایا
دو میمِ محمدؐ سے جہاں روشن ہے
مضموں یہ دل شمس و قمر سے پایا

ایسی اور بھی مثالیں ہیں جن میں ایک ہی ردیف اور قافیہ میں دبیر نے دسیوں رباعیاں کہہ ڈالی ہیں۔ اور یہ دبیر جیسے قادرالکلام کے لیے کوئی بہت بڑی بات نہیں۔

مرزا دبیر یا میر انیس کے کلام پر بعض حضرات موضوعات کی محدودیت اور یکسانیت کا اعتراض کرتے ہیں، ممکن ہے وہ رباعیاتِ دبیر کے بارے میں اسی طرح کا خیال ظاہر کریں۔

یہ حضرات دراصل موضوع اور مضمون کے فرق کو بھلا دیتے ہیں۔ شعر و ادب کے موضوعات تو محدود ہی ہیں۔ یہ مضمون ہے جس میں تمام بوقلمونی ہے۔ اور یہ مضمون ہے جس کے لیے باوا آدم شعراء اُردو وؔلی نے کا تھا:

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

آپ دُنیا بھر کا ادب پڑھ جائیں، موضوعات کے لحاظ سے آپ کو یکسانیت ملے گی۔ ادب و شعر کے موضوعات ہی کیا ہیں؟ یہی محبت، غم، خوشی، وصال، ہجر و فا، جفا، درد، دوا، مرض، شفا، بھوک، غذا، پیاس، وطن، غربت، سفر، قیام، تغیر، ثباتِ زمین، زمان، آسمان، شجر، حجر وغیرہ یہ سب موضوعات ہیں۔ ایسے عنوانات کا شمار کرتے جایئے تو یہ نسبتاً محدود ہی ہوں گے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک عنوان پر سینکڑوں ہزاروں شعر یا مختلف اسالیب اظہار کے فن پارے مل جائیں گے۔ یہ سب شعر خیزی، سخن پروری، یا ''فن افروزی'' مضمون آمرینی یا نکتہ آفرینی ہی کی بدولت ہے اور یہ وہ ملکہ ہے جس میں دبیرؔ کا مقابلہ شاید ہی اُردو کا کوئی دوسرا شاعر کر سکے۔

بے شک دبیرؔ نے شعر و ادب کے محدود موضوعات میں سے بھی اپنے لیے چند مخصوص موضوعات کا انتخاب کرلیا اور اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے موضوعات کے دائرہ کو اور بھی محدود کرلیا۔ لیکن دیکھنے سے تعلق رکھنے والی بات یہ ہے کہ جس قدر انھوں نے اپنے موضوعات کو محدود کیا اسی قدر مضامین کو وسعت دی۔ اور تنوع سے آشنا کیا۔ ان کا یہ دعویٰ محض تعلّی نہیں ہے کہ:

ع : مخلوقوں میں خلاقِ مضامین ہم ہیں!

اوران کا یہ کہنا بالکل مبنی بر حقیقت ہے کہ:

ع : جب حرف شناس ہوں تو کھلتا ہوں میں!

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر دبیرؔ کی رباعیوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا گیا تو انھیں اُردو کا سب سے بڑا رباعی گو شاعر تسلیم کرنا پڑے گا! انیسؔ بھی اس میدان میں ان کے حریف ثابت نہ ہوسکیں گے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مجموعہ میں رباعیوں کی موضوع وار دستہ بندی کی زحمت اٹھائی ہے۔ انھوں نے مذہبی، اخلاقی، فلسفیانہ، سماجی، اقتصادی اور ذاتی رباعیوں کے عنوانات قائم کیے۔ انھوں نے بہرحال ''موضوعات'' کی نشاندہی اور فہرست سازی کی ہے۔ مضامین کی نشاندہی اشعار سے علیحدہ کی بھی نہیں جاسکتی۔ اور اگر کی جاسکتی ہے تو شعر کی نثر بنا دینے اور اُس کی تشریح لکھنے کی صورت میں کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر عابدی نے رباعیات کو انتہائی عرق ریزی اور جاں فشانی سے تحقیقی نقطۂ نظر سے جمع کیا ہے۔ وہ ان رباعیات کی شرح لکھنے کے متکفل نہیں ہوئے ہیں۔ ہاں ان کی اس محنت کی ستائش بھی ضروری ہے کہ انھوں نے جدید نسل کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے رباعی کے نیچے مفردات یا مشکل تراکیب کے معانی بھی لکھ دیے ہیں۔ اور ان رباعیوں میں پائی جانے والی صنعتوں کی بھی نشاندہی کردی ہے۔ جس سے نہ صرف اُردو کے عام قاری کے لیے رباعیوں کو سمجھ کر پڑھنے کا امکان روشن ہو گیا ہے بلکہ اُردو ادبیات کے باقاعدہ طالب علموں اور معلمین کے لیے بھی استفادے کی بڑی سبیل پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بجائے خود خاصہ قابلِ قدر کام ہے بلکہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔

بات موضوع اور مضمون کی ہورہی تھی۔ معلوم ہے کہ دبیرؔ اور انیسؔ کا بنیادی موضوع حضرت سید الشہداء امام حسینؑ اور ان کا معجزہ کربلا ہے۔ دبیر کی رباعیوں میں سب سے زیادہ تعداد اسی موضوع پر کہی گئی رباعیوں کی ہے۔ یعنی ان کے عنوانات امام حسینؑ، کربلا، عباسؑ، وفا، حُرؑ یا شہادت وغیرہ ہی رہتے ہیں۔ لیکن مضمون یقیناً بدلتا رہتا ہے۔ اور مضمون کا حال تو یہ ہے کہ کبھی صرف کسی ایک لفظ کی تبدیلی یا مصرع میں لفظ کی نشست بدل دینے سے مضمون بدل جاتا ہے۔ جب تک یہ نکات نظر میں نہ ہوں دبیر کی رباعیوں میں جو مضامین کا تنوع ہے اس میں بہت سے مقامات پر قاری محظوظ نہیں ہوسکتا۔

مضمون شعر کے لحاظ سے یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ یہ لازمی نہیں کہ مضمون داخلی اور حقیقی جذبات سے عاری ہو، جیسا کہ اس شعر سے توہم پیدا ہوتا ہے:

مضمون کے بھی شعر اگر ہوں تو خوب ہے
کچھ ہو نہیں گئی غزلِ عاشقانہ فرض

بلکہ مضمون داخلی اور حقیقی کیفیات کے پیرایۂ اظہار کا لازمی عنصر ہوتا ہے۔ ''بالیدنِ مضمون'' ہی دراصل شاعری ہے۔ غالب کا بڑا حسین اور نہایت معنی خیز شعر ہے:

اَسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش

لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

دبیرؔ کی اکثر رباعیاں جہاں مضمون آفرینی اور نکتہ پردازی کی بہترین مثالیں ہیں وہیں ان کی ذاتی سیرت اور ان کے دل کی اعتقادی اور سچی جذباتی کیفیت کی ترجمانی بھی کرتی ہیں۔ وہ صرف ضرورتِ شاعری یا تقاضۂ مجلس کے تحت نہیں کہی گئی ہیں۔ ایسی رباعیاں کم ہیں جو محض وقتی اور فنی رعایتوں یا صرف تفنن کی خاطر سے کہی گئی ہوں۔

ہاں! دبیرؔ کے سارے کلام کی طرح ان رباعیوں میں بھی جو طرح طرح کا تفنن پایا جاتا ہے، اس میں بعض باتیں ایسی ضرور ہیں جن کی تحسین وستائش Appreciation کی توقع اس دور کے عام قاری سے نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جس علمی، فنی اور ثقافتی پس منظر اور ماحول سے دبیرؔ کا تعلق تھا اس میں ان باتوں کی فنی اہمیت بھی تھی۔ اور اس وقت یہ عمومی اور عوامی دلچسپی کی باتیں بھی تھیں۔ مثلاً جس طرح سے زیادہ سے زیادہ لفظی اور معنوی رعایتوں سے شاعر کام لیتا تھا اسی طرح الفاظ کے ابجدی اعداد کی رعایتوں سے بھی طرح طرح کی نکتہ چینیاں اور مضمون آفرینیاں کی جاتی تھیں۔ اس کی صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ استاد ذوقؔ غزل کے مطلع میں اس ابجدی رعایت سے کام لیتے ہیں:

ہفتاد دو فریق حسد کے عدد سے ہیں

اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

ذوقؔ کے دیوانِ غزلیات سے ایک اور مثال دیکھ لیجیے:

ہوئی حرفوں میں گو یک نقطہ رحمت سے سوا زحمت

مگر اعداد میں زحمت کہیں کمتر ہے رحمت سے

اب دبیرؔ کی یہ دو رباعیاں ملاحظہ فرمالیجیے۔ ظاہر ہے کہ دبیرؔ کا محورِ فکر وفن جناب سید الشہداء امام حسینؑ کی ذاتِ مبارک اور واقعہ کربلا ہے۔ اس لیے اس طرح کے تفنن میں بھی دبیرؔ کی نکتہ سنجیاں زیادہ تر اسی محور پر رہتی ہیں:

''ح'' نام ہے حق کی حمایت کے لیے
اور سین ہے سائل سے سخاوت کے لیے
ہیں نامِ حسینؑ میں بھی کیا خوب حروف
''ی'' ''ن'' ہیں تاریخِ شہادت کے لیے

•••

دو میم جو اک لفظِ محروم میں ہیں
پیوند انھیں حرفوں کے ماتم میں ہیں
ہر میم کے چالیس عدد سے یہ کھلا
ماتم کے چہل روز دو عالم میں ہیں
(''دفترِ ماتم''، ج:20،ص:70)

دبیرؔ کی رباعیوں کا کوئی انتخاب پیش کرنا اور اس پر گفتگو کرنا اس وقت میرا مقصد نہیں ہے۔ اس تقریب کلام میں خود ہی بہر تقریب ہے یعنی کہ مقدمہ ہے دبیرؔ کی رباعیات پر سیر حاصل تنقیدی بحث و بیان کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے علیحدہ مستقل کتاب درکار ہے۔ اتنی باتیں صرف بر سبیل تذکرہ یا بطورِ تشبیب لکھ دیں۔ اس وقت تو میں اپنے جذباتِ دعا کی تحریر پر مامور تھا۔ ربِّ کریم میری دعا کو بحقِ حضرت سید الشہداء علیہ السلام شرفِ قبول سے نوازے کہ بزرگ مرتبہ دانش مند ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کے حسنِ توفیق اور ان کے حسنِ اقبال و دولتِ عمر میں لازوال برکت ہو۔ وہ قابلِ مبارک باد ہیں، یہ حسنِ توفیق ان کے شاملِ حال ہے وہ ادب و دین و دانش کی خدمت میں مشغول ہیں، صالح ادب کی خدمت بھی خدمتِ دین ہے۔ رہبر معصوم کا ارشاد ہے ''اَلدِّین کُلّه ادب'' دین کُل کا کُل ادب ہے، دین ہی کلِ ادب ہے۔ میر انیسؔ یا مرزا دبیرؔ بھی وہ شعرائے ذی وقار ہیں جن کے کلام کی ادبی ارزش بھی مسلم ہے اور دینی قدر و قیمت بھی روشن ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی اپنی تعلیم اور پیشہ کے لحاظ سے میدانِ طب و جراحت کے مرد ہیں اور اپنے اقران و امثال میں فرد ہیں۔ ان کا شعبہ تخصص آزمایشاتِ طبی کا شعبہ ہے۔ علم ایک

بسیط حقیقت ہے، نہ پذیرائے تقسیم ہے نہ قابلِ حضرت، جب ذہن علمی تحقیق اور تجزیہ کی لذّت سے آشنا ہو جائے تو وہ جس بھی شعبۂ حیات کی طرف ملتفت ہوگا، اپنے مخصوص اندازِ نظر سے کام ضرور لے گا۔ بشرطیکہ اسے آزادانہ طور پر اپنا کام کرنے دیا جائے، توجہ کو مرکوز کیا جائے، ورنہ بہر حال ذہن ارادۂ قلبی کا تابع فرمان ہے، جس امر کی طرف دل راغب نہ ہوگا، ذہن بھی ملتفت نہ ہوگا۔ بارے! ڈاکٹر عابدی آزمایشاتِ طبی کے ساتھ ساتھ آزمایشاتِ ادبی کی طرف بھی راغب ہو گئے، اور ادبی تحقیق و تنقید کا انبار لگا ڈالا۔ ان کے محبوب شاعر انیس نے کہا:

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

ان کا یہ حال ہے کہ کسی بھی نادر ادبی ذخیرے کی خبر ہوئی اور وہ خوشہ چینی میں مشغول ہوئے۔ بزرگانِ سلف کے تخلیقی کارناموں کی تحقیقی بازیافت کا کام ڈاکٹر عابدی نے اتنا کر ڈالا ہے اور کر رہے ہیں کہ آئندہ نسلیں اب ان کاموں سے خوشہ چینی کیے بغیر کوئی قدم آگے نہ بڑھا سکیں گے۔

میری نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ جس طرح عربی ادب کی تاریخ میں "ادب المہجر" کے عنوان سے امریکا اور کینیڈا میں مقیم عربی ادبا، شعراء اور اصحابِ قول و قلم کے کارناموں پر تحقیقی اور تنقیدی جائزے شائع ہوئے ہیں، اگر کسی صاحبِ ذوق دیارِ توفیق نے اُردو ادب المہجر پر کچھ لکھا اور یقیناً جلد ہی لکھا جائے گا، تو ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے اپنی گوناگوں صلاحیتوں سے ان ممالک میں جتنا تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی اور ثقافتی کام اُردو والوں کے لیے کیا ہے، اُس کے ذکر کے بغیر ایسا کوئی بھی تذکرہ مکمل نہ ہو سکے گا۔

مجھے احساس ہے کہ دبیرؔ کی رباعیوں کے امتیازات اور خصوصیات پر گزشتہ سطور و صفحات میں کچھ بھی روشنی نہ ڈالی جا سکی۔ اس لیے خالصتاً بطور تبرّک یہاں پر ان کی چند رباعیاں حمد و نعت و منقبت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں:

پروانے کو دھن شمع کو لو تیری ہے
عالم میں ہر ایک کو تگ و دو تیری ہے

مصباح و نجوم و آفتاب و مہتاب
جس نور کو دیکھتا ہوں ضو تیری ہے

•••

آباد ہے سرکارِ حسینؑ ابنِ علیؑ
بیٹھے ہیں عزادارِ حسینؑ ابن علیؑ
کہتے ہیں ملک چمن کے ہر اک گوہر اشک
دُربار ہے دربارِ حسینؑ ابنِ علیؑ

•••

پروفیسر احمد علی خان
سکندر آباد

رباعیاتِ دبیرؔ: ایک جائزہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی مدتِ دراز سے اُردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ اچھے شاعر اور نثر نگار بھی ہیں۔ اس دوران انھوں نے تقریباً تین درجن کتابیں تصنیف کیں۔ گزشتہ پندرہ برسوں سے موصوف تحقیق اور تنقیدی ادب میں جو کمالات و جمالات کے جوہر دکھا رہے ہیں ان کی کوئی نظیر دُنیائے اُردو میں نہیں مل سکتی ہے۔ اس مختصر عرصہ میں درج ذیل شاہکار زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے ہیں: ''تجزیہ یادگارِ انیس''، ''مجتہدِ نظم مرزا دبیر''، ''سلکِ سلامِ دبیر''، ''طالع مہر''، ''ابواب المصائب''، ''مصحفِ فارسی دبیر''، ''مثنویاتِ دبیر''، ''کائناتِ نجم''، ''روپ کنوار کماری''، ''تعشق لکھنوی''، ''غالب دیوانِ نعت ومنقبت''، ''چوں مرگ آید''، ''رباعیاتِ دبیر''، ''سبدِ سخن''، ''کلیاتِ غالب فارسی [فارسی]''، ''رباعیاتِ انیس''، ''فیض فہمی''، ''فیض شناسی''، ''کلیاتِ سعید شہیدی''، ''امجد فہمی'' وغیرہ۔

زیرِ نظر کتاب سلسلۂ کلامِ دبیر کی ساتویں جلد ہے جو ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیق، ترتیب اور تشریح کے ساتھ 2008ء میں شائع ہوئی۔ خدا جانے ڈاکٹر صاحب نے مرزا دبیر کی اتنی کثیر التعداد رباعیات کتنی محنت و مشقت سے جمع کیں اور پھر ان کو مرتب کر کے ایک ضخیم کتاب 2008ء میں شائع کی۔ کتاب 613 صفحوں میں مضبوط جلد کے ساتھ عمدہ اور دبیز اور چکنے کاغذ پر آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس میں 1323 رباعیات مختلف عناوین میں ہیں۔ ابتدا میں چھ مضامین کی فہرست (صفحہ 3:) ہے۔ پھر اسی صفحے سے 33 تک تمام رباعیوں کے پہلے مصرعے درج ہیں۔ ہر رباعی کے ساتھ عنوان بھی ہے۔ مثلاً حمدیہ، منقبتی، ذاتی، اعتقادی اور فلسفیانہ رباعی لکھا ہوا ہے۔ صفحہ 35 میں معمول کے مطابق مختصر حالات ''رو میں ہے رخشِ عمر'' کے تحت رقم ہیں۔ اس کے بعد ''انتساب''۔ پھر (صفحہ:47-38)

علامہ سید عقیل الغروی کا پیش لفظ ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کا طویل مقدمہ (86-48) ہے۔ اس میں رباعی کی تاریخ، اوزان اور فارسی رباعی گو کا مختصر تذکرہ ہے۔
صفحہ:92 سے 121 تک ''مرزا دبیر کا زندگی نامہ''۔

رباعی کہنا تمام اصناف میں مشکل ہے۔ یہ اس کہنہ مشق شاعر کا کام ہے جس کو اُردو زبان میں ید طولیٰ حاصل ہو۔ شاعر اعظم جوشؔ ملیح آبادی مجموعۂ رباعیات ''قطرہ و قلزم'' میں رقم طراز ہیں: ''رباعی ایک بہت بڑی بلا اور نہایت جاں لیوا صنفِ کلام ہے۔ یہ کم بخت چالیس برس سے کسی بڑے سے بڑے شاعر کے سن میں آنے والی چیز نہیں۔ بات یہ ہے کہ جب تک شاعر کو بے پناہ مشاقی اور نہایت دیدہ وری کی بدولت دریا کو کوزے میں بھر لینے کا کام نہیں آتا، اس وقت تک رباعی اس کے قابو میں نہیں آتی۔ قلیل الفاظ کی وساطت سے کثیر معانی کا احاطہ کر کے چار مصروں میں ربع مسکون کے تمام تجربات، مشاہدات، تاثرات، نظریات اور افکار کا سمیٹ لینا ایک ننھے سے قطرے میں قلزم کو مقید کرنا ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے ؎

تا صد ہزار خار نہ روید از زمیں
از گل بنے گلے، بہ گلستاں نہ روید از زمیں

ڈاکٹر عابدی صاحب کی بھی یہی رائے ہے۔ فرماتے ہیں:

''رباعی ایک کٹر صنفِ شاعری ہے۔ چناں چہ اس ہزار برس کے عرصہ میں تین چار ہی فارسی رباعی کے عظیم شاعر پیدا ہوئے ہیں جن میں عمر خیام، ابوسعید ابوالخیر، عطّار اور سرمد کے نام سرفہرست ہیں۔ اگرچہ مولانا روم جو صرف اپنی مثنوی کے باعث شہرت رکھتے ہیں۔ تقریباً اٹھارہ سو رباعیات کے خالق ہیں۔ ''کلیاتِ سعدی شیرازی'' میں ایک سو ستّر سے زیادہ رباعیات نظر آتی ہیں۔ حافظ شیرازی، جامی وغیرہ کے دواوین میں رباعیات ملتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ سحابی استر آبادی جو صوفیہ دور کے ممتاز شاعر تھے۔ انھوں نے ستّر ہزار سے زیادہ رباعیات لکھیں لیکن ان کی رباعیوں کا مجموعہ الگ سے شائع نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی رباعیات

ضائع ہوگئیں۔ اور اب کئی رباعیات درسی کتابوں میں نظر آتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ فارسی کے تقریباً ہر بڑے شاعر نے کم و زیادہ رباعیات لکھیں اور اسی کا تتبع کرتے ہوئے برصغیر میں مسعود سعد سلمان لاہوری، امیر خسرو دہلوی، بوعلی قلندر اور سرمد نے رباعیات کے گلشن کو سرسبز رکھا۔ فارسی رباعی کا شہرہ آفاق شاعر عمر خیام جس کی رباعیوں کے ترجمے تقریباً دُنیا کی ہر پیش رفتہ زبان میں ہو چکے ہیں اور انگلینڈ کے شاعر فیٹز جیرالڈ کے انگریزی ترجمہ نے ان رباعیات کو فناناپذیر شہرت بخشی۔''

اب غور کرنے کا محل ہے کہ مرزا دبیر (۱۲۱۸ھ۔۱۲۹۲ھ) بارہ سال کی عمر میں ضمیر (م۔ ۱۲۷۲ھ) کے شاگرد ہوئے میں نے دبیر کے کچھ ایسے پُرانے مطبوعہ اور قلمی نسخے بھی دیکھے ہیں جو اس زمانے کے یادگار رہیں جب ان کا سن ۲۲ برس کا تھا۔ مثال میں یہ مرثیہ دیکھیے۔

''دشت جنگاہ میں جب آمد نوشاہ ہوئی''

۷۱ بند۔ منقول عنہ ۲۵ رمحرم ۱۲۴۰ھ

اس طرح کے مرثیوں میں متعدد رباعیاں ہیں جو میری نظر سے گزری ہیں۔ وہ اس وقت باکمال مرثیہ گو شعراء میں شمار کیے جاتے تھے۔ اس کا تذکرہ ''فسانۂ عجائب'' (تصنیف ۱۲۴۵ھ) میں بھی ہے۔

عابدی صاحب نے اپنے مقدمہ میں فارسی شعراء کے بعد کئی اُردو شعراء کا ذکر کیا ہے جو رباعیاں بھی لکھتے تھے۔ بقول ان کے اُردو میں سب سے زیادہ رباعیاں شاہ غمگیں دہلوی (م۔ ۱۲۶۸ھ) کی کتاب ''مکاشف اسرار'' میں موجود ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ راجہ صاحب محمود آباد کے بے مثال کتب خانے میں اس کا مخطوطہ بخط مصنف موجود ہے اس کی مختصر تفصیل بھی نوٹ کی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے ایک ہزار نو سو رباعیاں لکھی ہیں۔ (''رباعیات دبیر'')

الغرض دبیر کا یہ مجموعۂ رباعیات مرتب کر کے ڈاکٹر عابدی نے ایک عظیم تحقیقی کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے اس کے لیے جس عرق ریزی اور خوں فشانی کا مظاہرا کیا ہے اس کو صفحۂ قرطاس پر بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد

رباعیاتِ دبیر

علمی و ادبی تحقیق کے سلسلے میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی مثال اگر کسی سے دی جا سکتی ہے تو وہ صرف ڈاکٹر سید تقی عابدی ہی ہیں۔ برصغیر سے دور، بہت دور، اُردو کی نئی بستیوں میں شعر و ادب کے جو چند چراغ روشن ہیں، ان میں ڈاکٹر سید تقی عابدی ایک اہم اور امتیازی نام ہے۔ انھوں نے ایسے موضوعات پر جن پر بہت کم لکھا گیا ہے توجہ دی اور غیر معمولی تحقیق کے بعد تدوین و تالیف کر کے کئی کتابیں منظر عام پر لائیں جو شاید بہت کم سے ممکن ہوتا۔ شعر و ادب کے تعلق سے ان کے عزم و ہمت، جذبہ و شوق، لگن اور اخلاص کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے تحقیق کے دشوار گزار اور اصل اور صبر طلب مقامات کو بھی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ طے کر لیا۔ سید تقی عابدی کی تحقیقی و تدوین و تالیف کی فہرست نہایت طویل ہے۔ صرف چند کے نام ہیں۔ ''انشاء اللہ خاں انشاءؔ''، ''اظہارِ حق''، ''مجتہد نظم مرزا دبیرؔ''، ''سلک سلام دبیرؔ''، ''تجزیہ یادگار انیسؔ''، ''مصحف فارسی دبیرؔ''، ''مثنویاتِ دبیرؔ''، ''کائناتِ نجمؔ''، ''در دریائے نجفؔ''، ''تاثیر ماتمؔ''، ''تعشقؔ لکھنوی'' اور ''چوں مرگ آید'' وغیرہ۔ اوراب انھوں نے کلامِ دبیر کے سلسلے میں ''رباعیاتِ دبیرؔ'' پیش کی ہے۔ ممکن ہے مستقبل میں دبیر کی اور رباعیات کا بھی پتہ چلے لیکن ''رباعیاتِ دبیرؔ'' کا یہ مجموعہ اپنی مثال آپ ہے۔

دبیر کے پہلے سوانح نگار صفدر علی ہیں۔ انھوں نے سوانحِ ''شمس الضحیٰ'' میں اور مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں رباعیات کی تعداد نہیں بتائی ''حیاتِ دبیر'' کے مصنف ثابت لکھنوی نے تقریباً سوا دو سو رباعیات شائع کیں۔ خبیر لکھنوی نے بھی 197 لکھیں۔ فرمان لکھنوی نے اپنی تصنیف ''اُردو رباعی'' میں دبیر کی رباعیوں کی تعداد دو سو کے

لگ بھگ بتائی۔ نفیس فاطمہ نے ''دبیر سے کچھ رباعیات بھی یادگار ہیں'' لکھ دیا۔ ظاہر ہے یہ سب اندازے رہے۔ البتہ محمد زماں آزردہ نے ''دفتر ماتم'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''دفتر ماتم'' کی بیسویں جلد میں 1332 رباعیات ہیں۔ سید تقی عابدی نے مرتبہ ''رباعیاتِ دبیر'' میں 1323 رباعیات ہیں۔

تقی عابدی نے دبیر کی رباعیات پر اظہارِ خیال کرنے سے قبل اپنے مقدمہ میں ''فن رباعی گوئی'' اور اُردو (بلکہ عربی اور فارسی) میں رباعی گوئی پر نہایت جامعیت کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں علّامہ سید عقیل الغروی کا ''پیش لفظ'' بھی معلومات آفریں ہے۔ صنفِ رباعی کو عربوں کی ایجاد قرار دینے سے سید سلیمان ندوی اور امداد امام اثرؔ سے اختلاف کرتے ہوئے انھوں نے محمود شیرانی کے خیال سے اتفاق کیا ہے کہ ''رباعی کسی شخصی ایجاد کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ وہ ارتقاء یافتہ شکل ہے۔ قدیم چار بیتی کی جو بحر ہزج مربع اخرم و اخرب میں لکھی جاتی تھی۔ ان ایام میں صدر و ابتداء میں اخرب ومکفوف، اخرب وصوفور کا اختلاف جائز سمجھا جاتا تھا جو چار بیتی کے ہر مصرعہ میں کارفرما ہے۔ جس کی بنا پر پہلے مصرع کے شروع میں مفعول کے مقابلہ میں دوسرے مصرع کے شروع میں مفاعل یا مفاعلین آجاتا ہے۔ بحر ہزج عربی میں مربع الارکان مستعمل ہے جب عربی عروض فارسی اختیار کی گئی تو ضروری ہے کہ ابتداء میں اشعار ہزج کے مربع لکھے جاتے ہوں، چناں چہ رباعی بھی مربع میں لکھی گئی۔'' ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مقدمہ میں رباعی کو ایرانیوں کی ایجاد قرار دیا ہے اور اس خصوص میں کوئی 9 مستند حوالے دیے ہیں اور بعض روایتوں کا سہارا لیتے ہوئے پہلی رباعی کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ہندی میں چوپائی، سنسکرت میں چار چرن، پشتو میں چار بیتہ اور انگریزی میں Quatrain رباعی سے ملتی جلتی چیز ہے۔ سید تقی عابدی نے نہایت گہرائی اور گیرائی سے تحقیق سے کام لے کر اپنے مقدمہ کو وقیع اور اہمیت کا حامل بنا دیا ہے۔ اُردو میں رباعی کے تعلق سے تو اس مقدمہ کی اہمیت اور فزوں ہو جاتی ہے۔ اُردو میں رباعی پر یہ ایک جامع تحریر ہے۔ انھوں نے تاجدار گولکنڈہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو رباعی کا پہلا شاعر قرار دیا ہے ظاہر ہے یہ تسلیم شدہ امر ہے۔ اور پھر وجہی، سراج، ولی، میر، سودا، میر حسن وغیرہ کی رباعیات کا تفصیلی جائزہ ہے۔

ذوقؔ، داغؔ، شادؔ، جرأتؔ، مومنؔ، منیرؔ شکوہ آبادی، فراقؔ سے لے کر مہاراجہ کشن پرشاد، شادؔ کی رباعیوں کی تعداد درج کر دی ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ اُردو میں سب سے زیادہ رباعیات شاہ غمگیںؔ دہلوی نے لکھی ہیں '' جن کی تعداد 1900 ہے لیکن تقی عابدی کیفیت کے اعتبار سے دبیرؔ کی رباعیات کو افضل قرار دیتے ہیں۔ ان کے بموجب شاہ غمگیںؔ کی رباعیات دبیر کی رباعیات کے سامنے کیفیت میں بہت پائیں ہیں۔''

اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ دبیر کی رباعیات کی قدر و قیمت کا تعین کرنے میں اوروں نے تو کیا خود دبیریے کہلانے والوں نے بھی توجہ نہیں دی۔ دبیر کی رباعیات کے تعلق سے سید تقی عابدی لکھتے ہیں: '' دبیرؔ کی رباعیات میں آسان اور عام فہم تشبیہات، مکمل استعاراتی نظام، کنایات اور مجاز مرسل کی چاشنی نظر آتی ہے۔ علم بدائع کی تقریباً تمام عمدہ معنوی اور لفظی صنعتیں ان کے پاس موجود ہیں۔''

چناں چہ تقی عابدی نے صنعت سیاق الاعداد صنعت تاریخ گوئی، صنعت اعداد ایہاس، صنعت مذہب کلامی اور دیگر صنعتوں کے حوالے سے ''رباعیات دبیرؔ'' کا جائزہ لیا ہے اور وہ بھی اس رائے سے متفق ہیں کہ اگر دبیرؔ کی رباعیوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا گیا تو انھیں اُردو ادب کا سب سے بڑا رباعی گو تسلیم کرنا پڑے گا۔ انیسؔ بھی اس میدان میں ان کے حریف ثابت نہ ہوسکیں گے۔ دبیر کی استادی اور ان کی قدرت کلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے علامہ عقیل نے بھی اپنے اس موقف کا اظہار کیا ہے کہ دبیرؔ نے رباعی کے نہایت محدود عروضی چوکھٹے میں خوب خوب زور طبیعت صرف کیا۔ ان کے یہاں زبان کی پختگی، مصرعوں کی برجستگی، آہنگ و عروض کا توازن مضامین کا تنوع اور طرح طرح کا تفنن قابل دید ہے۔

قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے نہ صرف رباعیات دبیرؔ کی تحقیق، تدوین اور تہذیب کی بلکہ انھیں مختلف مضامین جیسے حمدیہ، نعتیہ، منقبتی، ذاتی، اخلاقی، سماجی، اعتقادی اور رثائی میں تقسیم کر کے مشکل الفاظ کے معنی بھی دیے ہیں اور کہیں کہیں ان کی تشریح بھی کر دی ہے۔ یہاں تک کہ رباعیات کی جدول دیتے ہوئے لکھا ہے: '' دبیرؔ اُردو کا وہ تنہا عظیم شاعر ہے جس نے اپنی رباعیات میں اتنے کثیر مضامین برتے ہیں کہ راقم نے ان مضامین سے جن کی تعداد سو سے زیادہ ہے ایک شجرہ اور جدول بنایا ہے تا کہ آسانی کے

ساتھ دبیؔر کے مضامین کی بوقلمونی کا احساس ہو سکے۔''

یہ جدول اسی زاویے سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ فوراً یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کس مضمون کے تحت رباعیات کی تعداد کتنی ہے۔ رباعیات کے اس مجموعہ کا ایک نادر پہلو یہ بھی ہے کہ سید تقی عابدی نے مرزا دبیؔر کا زندگی نامہ بھی شامل کر دیا۔ دبیؔر کے حالات زندگی...... تفصیل سے مل جاتے ہیں اور ان کی شخصیت اور شاعری پر یونی ورسٹیوں اور ان سے باہر جو کام ہوا ہے ان سے بھی دبیؔر کی زندگی تفصیل سے سامنے آتی ہے لیکن تقی عابدی نے انفرادیت کا ثبوت دیتے ہوئے دبیؔر کے حالات زندگی، ان کی شخصیت اور فن کے کئی گوشوں کو منور کر دیا ہے۔ ان کے تخلص کے تعین اور ان کے پہلے قطعہ کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ دبیؔر کا پہلا قطعہ جو انھوں نے میر ضمیر کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوتے وقت سنایا تھا یہ ہے:

کسی کا کندہ لگنے پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دُنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے

و نیز ان کی تاریخ و مقام پیدائش، ان کے جد اعلیٰ شیرازی، ان کی شاعرانہ عظمت، ان کی ذو بحرین اور ذو قافیتین مثنوی، دبیؔر کی شریکِ حیات جو انشاء اللہ خاں انشاء کی حقیقی نواسی تھیں۔ اولاد، اساتذہ، ان کی تصویر، آواز، لباس، نظام الاوقات، آدابِ محفل، حافظہ اور ان کے اخلاق و کردار۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے دبیؔر کی سلاست روی، پرہیزگاری، مسافر نوازی اور سخاوت نے صنفِ کمال کو زیادہ تر رونق دی تھی۔'' اور شادؔ عظیم آبادی کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ دوسروں کی امداد کرنا، حاجت مندوں کی حاجت کو پورا کرنا وہ عبادت تصور کرتے تھے۔ تقی عابدی نے رحم و مروت، سخاوت، مہمان نوازی، کمک و خیرات کے تعلق سے بھی دبیؔر کے کئی واقعات درج کیے ہیں۔ اسی طرح ان کی متانت، عدالت، قناعت، احترام و دل جوئی کے خصوص میں بھی بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی ادبی زندگی ان کے پہلے اور آخری مرثیے، اپنے استاد میر ضمیر سے رنجش اور پھر صفائی، ان کے پڑھنے کے انداز اور ان کے طریقہ تصنیف کے بارے میں بھی روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ''حیاتِ دبیر کے مولف ثابت لکھنوی کے بیان کردہ مرزا دبیر کی ایجادات کو شامل کتاب کرتے ہوئے انیس پر دبیر کی برتری کا پہلو نکال لیا ہے۔ یہ اوراق خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے قابل ہیں۔ انیسے اور دبیرے، کس زمانے میں نہیں رہے آج بھی ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مقدمہ میں دبیر کی شاعرانہ عظمت پر مہر لگا دی ہے لیکن وہ نہ انیسے ہیں اور دبیرے۔ انھوں نے از حد معروضیت کے ساتھ دبیر کی رباعی گوئی پر قلم اُٹھایا ہے۔ قبل ازیں انھوں نے ''تجزیہ یادگارِ انیس'' جیسی ظاہری و معنوی طور پر گراں قدر کتاب شائع کی ہے۔ جس سے ہمارے دو عظیم المرتبت شاعروں کے بارے میں ان کی معروضی فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں دبیر کی یہ تین رباعیات

آدم نے شرف خیر بشر سے پایا
رشتہ ایماں کا اس گہر سے پایا
دو میم محمدؐ سے جہاں روشن ہے
مضمون یہ دل شمس و قمر سے پایا

•••

جو قصر کرے حرص کو قیصر وہ ہے
تکیہ ہے جسے حق پہ تونگر وہ ہے
آئینہ سکندر نے بنایا تو کیا
دل جس کا ہے آئینہ سکندر وہ ہے

•••

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے
قد سرو کو گل کو رنگ و بو دیتا ہے
بیکار تشخص ہے تصنع بے سود
عزت وہی عزت ہے جو تو دیتا ہے

•••

ڈاکٹر تقی عابدی اور فیض فہمی

ڈاکٹر سید تقی عابدی دُنیا کے پانچ ملکوں میں رہتے ہیں، راولپنڈی کینٹ میں وزارت دفاع کی وہ بلڈنگ جسے سیکریٹریٹ II (ٹو) کہا جاتا ہے یا کلکتہ آفس، اس عمارت کے تھوڑا فاصلے پر بالکل راولپنڈی اسٹیٹ بینک کے سامنے شمال میں ایک پٹرول پمپ ہے جسے پانچ سڑکیں لگتی ہیں شہر میں اس پمپ کو ''پنج سڑکی پمپ'' کہا جاتا ہے، سوچتا ہوں ڈاکٹر تقی عابدی کے پانچ ملکی قیام کو کس نام سے پکارا جائے۔ ''پنج وطنی'' ''پنج دیسی'' یا پھر سید ہونے کے ناطے انھیں ''پنج تنی'' ہی رہنے دیا جائے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسے لوگ ملکوں اور قوموں کے خاموش سفیر ہوتے ہیں، آپ بھارت کے شہر امروہہ کے سادات میں سے ہیں۔ امام زین العابدین کی اولاد ہونے کے ناطے عابدی کہلاتے ہیں۔ پورا نام سید تقی حسن عابدی، تخلص تقی اور ادبی نام تقی عابدی ہے۔ شاعر ہیں، معالج، ادیب، محقق، نقاد اور مورخ بھی طبع شدہ کتابوں کی تعداد پچاس ہے انھیں ماہر اقبالیات بھی کہا جاتا ہے، غالبیات، دبیریات، انیسیات اور ماہر فیضیات بھی۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی یکم مارچ 1952ء کو بھارت کے شہر دہلی میں پیدا ہوئے آپ کے والد سید سبط نبی عابدی نظام دکن حیدر آباد کی عدالت عظمی کے جج تھے۔ تقسیم برعظیم کے بعد وہ بھارت کے سیشن جج رہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ایم بی بی ایس حیدر آباد دکن سے، ایم ایس برطانیہ سے، ایف سی اے پی امریکہ سے اور ایف آر سی پی کی سند کینیڈا سے حاصل کی، ایران کے شہر ابدان کے ایک مذہبی گھرانے کی گیتی نامی خاتون سے شادی کی، دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، بھارت کی کئی یونی ورسٹیز میں جز وقتی پڑھاتے رہے اور ایک عمر برطانیہ میں خود پڑھتے بھی رہے کینیڈا میں ماہر امراض دل بھی ہیں اور پتھالوجسٹ بھی۔

ڈاکٹر تقی عابدی کو یورپ، امریکہ، بھارت اور پاکستان کے کئی علمی ادبی سرکاری اور نیم سرکاری اداروں نے ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے ان کے حصے میں آنے والے اعزازات کی فہرست بہت طویل ہے دُنیا بھر کے اُردو کی سرپرستی کرنے والے اداروں اور تنظیموں نے ڈاکٹر تقی عابدی کو بے پناہ خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اسلام آباد کی علامہ اقبال یونی ورسٹی میں ڈاکٹر عابدی کی اقبال شناسی کے عنوان سے ایم اے کا مقالہ لکھا گیا، کراچی یونی ورسٹی میں بھی ان پر ایک ایم اے ہوا، بھارت کی دہلی یونی ورسٹی نے ڈاکٹر سید تقی عابدی پر پی ایچ ڈی کی ڈگری جاری کی، بھارت نے نشان امتیاز دیا، انیس و دبیر ایوارڈ دیئے، سال کا بہترین ایوارڈ بھی آپ کو ملا اور تاحیات کامرانیوں کے ایوارڈ کا بھی آپ ہی حق دار قرار پائے، پاکستان کے اربن بورڈ نے ایکسی لینس اور انٹرنیشنل لٹریسی کونسل نے ایوارڈ برائے تحقیق و ادب سے بہرہ ور کیا، کینیڈا اور برطانیہ کے علاوہ ایران سے ملنے والے ایوارڈ کی بھی روداد بہت طولانی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے برعظیم کے اُردو فارسی انشاء پردازوں، شاعروں، مرثیہ نگاروں اور کلاسک ادب کے معماروں اور اساتذہ پر کتابیں لکھی ہیں۔

مرزا اسلامت علی عرف مرزا دبیر پر ہی صرف سات کتابیں لکھی گئی ہیں، مرزا ببر علی حزیں جن کا تخلص شیخ ناسخ نے بدل کر انیس کر دیا تھا اور وہ میر انیس کے نام سے معروف ہوئے ان پر لکھی جانے والی کتابوں کی روداد بھی طولانی ہے، جوش ملیح آبادی، اقبال، غالب، انشاء، فراق گورکھپوری، فانی اور کئی دوسرے مشاہیر ادب پر ڈاکٹر تقی عابدی کی لکھی کتابوں کے حوالے کے بغیر اُردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ پاکستان میں ڈاکٹر تقی عابدی کے ایک نوجوان ادب شناس جناب زاہد کاظمی ہری پور میں جن کی لائبریری خطے میں احترام کا حوالہ بن چکی ہے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی ملک میں جاتے ہیں خاص طور سے ایران اور بھارت میں تو جہاں وہ اپنے لیے نایاب کتب حاصل کرتے ہیں وہیں میرے لیے بھی الگ سے باندھ لیتے ہیں، انھوں نے ڈاکٹر تقی عابدی کی ساری کی ساری کتابیں مجھے دیں جو پوری دیانت اور محنت سے لکھی بھی گئیں اور پبلشر نے خوب صورتی سے شائع بھی کیں، مگر فیض احمد فیض پر ڈاکٹر عابدی کا کام کوئی دوسرا شاید ہی اس

نوعیت اور خوب صورتی سے کر سکے گا۔ ''فیض شناسی'' اور ''فیض فہمی'' دو خوب صورت کتابیں ہیں، بڑے سائز میں آرٹ پیپر اور چار رنگوں میں طبع ''فیض شناسی'' 568 صفحات اور ''فیض فہمی'' ڈیڑھ ہزار صفحات کو محیط ہے گزشتہ روز ڈاکٹر تقی عابدی سے ٹیلی فون پر بات ہو رہی تھی تو وہ بتا رہے تھے کہ انھوں نے کبھی فیض احمد فیض کو نہیں دیکھا کہیں ملاقات نہ ہوئی بس فیض کی شاعری نے ان کا گرویدہ بنا رکھا ہے، فیض احمد فیض کی تاریخ ولادت سرکاری کاغذات کے مطابق کہیں 7 رجنوری 1911ء ہے اور کہیں 7 رجنوری 1912ء مگر ڈاکٹر عابدی نے اپنے پاکستانی دوستوں کے توسل سے سیالکوٹ بلدیہ سے ریکارڈ نکلوایا تو وہاں 13 رفروری 1911ء لکھا ہے، فروری کی مناسبت سے یہ فیض کی ولادت کا مہینہ بھی ہے ''فیض فہمی'' میں فیض احمد فیض پر لکھی جانے والی 56 کتابوں کی تفصیل بھی ہے اور دُنیا بھر کے 330 قلم کاروں کے مضامین بھی، فیض کے وہ انٹرویو جو معروف قلم کاروں اور صحافیوں نے کیے جن کے ساڑھے چار سو سوالات تھے بھی یکجا کر دیئے گئے ہیں اور یہ بہت ہی بڑی ''فیض فہمی'' ہے۔

''فیض فہمی'' میں فیض احمد فیض اور ان کی بیگم ایلس کے درمیان نکاح کے وقت ہونے والے معاہدے کا احوال بھی ہے فیض صاحب کی بارات میں ان کے سمیت تین لوگ شامل تھے، شیخ عبداللہ نے نکاح پڑھایا تھا۔ 28 راکتوبر 1941ء کو سری نگر میں منعقد ہونے والی اس تقریب کی کہانی بیگم ایلس فیض نے امرتا پریتم کو دیئے گئے اپنے پہلے انٹرویو میں بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ نکاح کے فوری بعد مشاعرہ ہوا تھا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے دُنیا بھر کے رسائل، اخبارات اور کتب سے استفادہ کر کے ''فیض فہمی'' کی تکمیل کی مگر راولپنڈی میں شائع ہونے والی 2012ء کی کتاب جسے ڈاکٹر نثار ترابی نے ترتیب دیا تھا جس میں ملک کے 37 نامی گرامی اہل قلم کے مضامین شامل ہیں اور ''فکر فیض'' کے عنوان سے منصہ شہود پر آئی تھی اس کا حوالہ نہیں دیا جا سکا شاید یہی وجہ ہے کہ تحقیق کا عمل جاری رہتا ہے اس کو جمود نہیں، مجھے ڈاکٹر تقی عابدی کی قلم کاری، انشاء پردازی، شاعری، حمد و نعت نے تو گرویدہ کیے ہوئے تھا کہ انھوں نے مجھے بتایا کہ ''وہ فیض کے کلام کے حافظ بھی ہیں اللہ پاک ان کا حامی ناصر ہو۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے دُنیا میں اُردو زبان کی ترویج کا جو بیڑہ اٹھایا ہوا ہے اور ملکوں ملکوں اپنے پرستاروں اور قارئین میں اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں یوں وہ ''فیض فہمی'' کے ساتھ ساتھ اُردو شناسی اور انسان فہمی کا خوب صورت انداز اپنائے ہوئے ہیں فیض احمد فیضؔ کا مسلک بھی انسان دوستی ہی تھا جسے ڈاکٹر تقی عابدی نے ''فیض فہمی'' کا نام دیا ہے۔

ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری
اندور

ڈاکٹر تقی عابدی کا تجدیدی کارنامہ: فیض فہمی

اُردو ادب کے عالمی شہرت یافتہ فن کاروں میں فیضؔ کا شمار ہوتا ہے۔ ترقی پسند شعراء کے ہجوم میں انھیں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ترقی پسند تحریک، جسے اُردو ادب میں تہلکہ، جوش، ولولہ اور نعرے بازی سے تعبیر کیا گیا، فیضؔ اسی سے وابستہ تھے۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود، فیضؔ کے یہاں وہ جوش، وہ ولولہ اور وہ گھن گرج موجود نہیں ہے۔ پھر بھی فیضؔ اپنے عہد کے اہم شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں......؟

اس شہرت اور مقبولیت کے پس پردہ فیضؔ کی اپنی ذاتی، شخصی صلاحیت اور اوریجنلٹی (Originality) پوشیدہ ہے۔ جس میں اُن کے امن پسندانہ مزاج کو بڑا دخل حاصل رہا ہے۔ شاید اس امن پسندانہ رویّے ہی کی بناء پر انھوں نے نرم و نازک اور ملائم لب ولہجہ اختیار کیا۔ ترقی پسندی کے ساتھ ادبی روایت کو قائم رکھا، ماضی کے نہاں خانوں میں جھانکا، حال پر نظر رکھتے ہوئے اس کا تجزیہ کیا اور مستقبل کے خواب بھی دیکھے۔

لہٰذا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ فیضؔ کی اپنی شعری کائنات ہے، جو اپنے ہم عصر شعراء سے مختلف ہے۔ ان کی شاعری جذبات، احساسات، تفکرات کا خزانہ ہے۔ غم جاناں اور غم روزگار کا آئینہ خانہ ہے، رومان اور انقلاب کا حسین سنگم ہے۔ شاعری کے مختلف ذائقے ان کے یہاں ملتے ہیں۔ مخملی، ریشمی الفاظ اور لہجے کے دھیمے پن نے، ان کے یہاں بلا کی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ یہ تاثیر اُن کے عمیق جذبات گہرے احساسات کی بدولت ہے۔ جس کی ترجمانی میں فیضؔ نے ایسے عام فہم، دلکش اور دلنشین الفاظ کا انتخاب کیا ہے، جن سے تاثرات اور تشریحات کے کئی مثبت پہلو نکلتے ہیں۔ عام فہم اور سلسبیل زبان کے استعمال کے سبب، ان کی شاعری رواں دواں معلوم ہوتی ہے۔ قاری کے دل کے تاروں کو چھیڑتے

ہوئے، اس کے احساسات کی تہوں کو پہنچ جاتی ہے۔

یہ سب اس لیے بھی ہے کہ فیضؔ نے جن لفظوں کا انتخاب کیا ہے، ان میں ایک طرح کی غنائیت اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ غالباً موسیقی دُنیا کی محبوب فنِ لطیف ہے اس لیے فیضؔ کے خیالات اور احساسات، قاری کے دل میں پیوست ہونے لگتے ہیں۔ رومان و انقلاب پسند لوگوں کی، غمِ جاناں اور غمِ روزگار کے ماروں کی، دُنیا میں کبھی کوئی کمی نہیں رہی ہے، جس کی بناء پر فیضؔ کا قاری کے جذبات اور احساسات ہم آہنگ ہونے لگتے ہیں اور فیضؔ کا قاری کے ساتھ مسلسل رشتہ قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فیضؔ کے کلام کا دُنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا تو اسے بے شمار لوگوں نے پسند کیا۔ یہ فیضؔ کی مقبولیت اور کامیابی کا بین ثبوت ہے اور اس بات کی بھی روشن دلیل ہے کہ فیضؔ کو عالمی شعراء کی صف میں کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

ان کے علاوہ فیضؔ کی مختلف جہتیں ہیں، مختلف پہلو ہیں۔ مثلاً وہ بڑے شاعر تو تھے ہی، مدرس بھی تھے، ترقی پسند تحریک کے اہم معمار تھے، فوج کے کرنل، سیاسی کارکن، ٹریڈ یونین لیڈر، براڈ کاسٹر اور ایک روشن خیال صحافی بھی تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ ایک کثیر صفات شخصیت کے تمام گوشوں کو اجاگر کیا جائے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اس ہمہ گیر کام کو انجام دینے کا عزم مصمم کیا اور کتاب ''فیضؔ فہمی'' کی شکل میں ایک قابل دید، واجب داد، لائق رشک، مناسب تقلید اور مستحق ستائش کارنامہ انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی، عالمی سطح پر ابھرنے والا، اُردو کا ایک بڑا نام ہے۔ وہ شاعر و ادیب، محقق و ناقد، ماہر رثائی ادب اور شگفتہ بیان مقرر کے روپ میں، حلقۂ علم و ادب میں، اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ ان پر گفتگو کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ مشت از خروارے ان کی علمی و ادبی خدمات کا مختصر ترین تعارفی خاکہ ذیل میں بیان کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی، سیماب صفت، متجسس، پہلودار اور نہایت سرگرم شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں ہندوستانی خمیر پوشیدہ ہے۔ وہ حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں، جو ہمارے ادب کا قدیم مرکز رہا ہے۔ یہیں سے انھوں نے ایم بی بی ایس سند پائی اور ایم ایس (برطانیہ)، ایف سی اے پی (امریکہ) ایف آر سی پی سی (کینیڈا) سے طبی

اسناد حاصل کیں۔ ہندوستان اور دیگر ممالک سے حاصل کیا ہوا علمی وطبی سرمایہ سعودی عرب، ایران، امریکہ اور فی الحال کینیڈا میں ایک طبیب کی حیثیت سے تقسیم کر رہے ہیں۔ ایک طرف جہاں وہ جسم وصحت کے طبیب ہیں، وہیں اُردو ادب کے شدید امراض کے بھی معالج ہیں۔ یہ بات کچھ کم تعجب خیز نہیں کہ بروقت ایک شخصیت میں دو مخالف اور متضاد جہتیں کس طرح موجود رہ سکتی ہیں، معالجہ کی مصروف کن زندگی میں وہ ادب کے کاموں کے لیے کس طرح وقت نکالتے ہیں اور وہ بھی شاعری، تحقیق، تنقید، تدوین، ترتیب، تالیف وغیرہ جیسے مختلف ومتضاد میدان کے لیے؟ لیکن ڈاکٹر تقی عابدی، حیرت انگیز طور پر اس عمل میں برسہابرس سے مصروف عمل ہیں۔ گزشتہ تقریباً 35 پینتیس برس میں ان کی تقریباً 40 چالیس کتابیں طباعت کی روشنائی دیکھ کر منصۂ شہود پر آ چکی ہیں اور یہ سفر جاری ہے۔

یہ سب کتابیں کئی اہم موضوعات اور اصناف کا احاطہ کرتی ہیں۔ جن میں حیات و شخصیات، فنون، کلام کے مجموعے، دیوان، فن کاروں کی شعری و ادبی خدمات، کلام کی تشریحات، نعت، منقبت، سلام، نوحہ جات، قصائد، مراثی، مثنویات، منظومات، رباعیات، خطبات، مقدمات، مقالہ جات نیز غالبیات، دبیریات، انیسیات، اقبالیات اور نجمیات (نجم آفندی) وغیرہ شامل ہیں۔ ان کو مختلف اداروں اور انجمنوں نے انھیں انعامات واعزازات سے سرفراز کیا ہے۔ ایسی ہی فیضیات پر مشتمل ایک کتاب ''فیض فہمی'' کا ذیل میں جائزہ لینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''فیض فہمی'' 1402 صفحات پر مشتمل ہے۔ اب تک فیضیات پر شائع ہونے والی کتابوں میں ہر لحاظ سے سب سے زیادہ ضخیم اور جامع کتاب ہے بلکہ انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب میں شامل 162 مضامین ومقالات کے تحت فیض کی شعری ونثری خدمات، حیات وکائنات اور مختلف جہات کے تمام تر پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

''فیض فہمی'' کے ذریعے ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض کے ان گوشوں کو تلاشنے کی کوشش کی ہے جو دھندلے رہ گئے تھے۔ انھوں نے غیر جانب دار ہو کر فیض کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کا ذکر کیا ہے اور اس عمل میں کہیں بھی جانب داری، مداحی یا قصیدہ خوانی کی حدود کو

نہیں چھوا ہے بلکہ بڑی عرق ریزی، جانفشانی، بالغ نظری اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ ''فیض فہمی'' مرتب کی ہے اور فیض کے متعلق مختلف ادوار کے محققین اور ناقدین کے مضامین ومقالات کو جمع کر کے اس طرح ترتیب دیا ہے گویا فیض کے متعلق بکھرے جواہرات کا ایک بڑا قیمتی خزانہ پیش کر دیا ہے۔

جن محققین نے فیض پر کوئی تحقیقی کام کرنے کا خواب دیکھا ہوگا، ''فیض فہمی''، صحیح معنوں میں ان تمام خوابوں کی تعبیر ہے۔ خصوصاً ان ریسرچ اسکالرس کے لیے، جو فیض پر تحقیقی کام کر رہے ہیں یا کریں گے، ان کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی کا یہ بیش بہا قیمتی تحفہ ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی زیرِ نظر تالیف، دیگر مرتب کردہ کتابوں سے مختلف اور بہتر ہے ورنہ بیشتر یہ ہوتا ہے کہ کتابوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی خاطر مرتبین حضرات اکثر کتابوں، مقدمہ، پیش لفظ، تعارف یا حرف اوّل وغیرہ عنوانات کے ذریعے کوئی مضمون تحریر کر دیتے ہیں اور دیگر اہل قلم کے مضامین ومقالات کو شامل کر کے خود صاحب کتاب بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''فیض فہمی'' دیگر مرتبہ کتابوں سے اس لیے بھی مختلف ہے کہ خود انھوں نے اس کتاب میں فیض پر تقریباً 50 مضامین سپردِ قلم کیے ہیں۔ جو تنقیدی، تحقیقی اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر ''فیض فہمی'' سے ڈاکٹر تقی عابدی کے مضامین کو علیحدہ بھی کر دیا جائے تب بھی موصوف کی فیض پر باقاعدہ ایک کتاب بن سکتی ہے۔ علاوہ اس کے موصوف نے، جن ادباء کے مضامین کو ''فیض فہمی'' میں یکجا کیا ہے، ان کے فیض پر اور بھی کئی مضامین ملتے ہیں، بلکہ چند ادباء کی فیض پر کتابیں بھی موجود ہیں لیکن جس باریک بینی کے ساتھ ڈاکٹر تقی عابدی نے مضامین کا انتخاب کیا ہے، وہ خوب سے خوب تر ہے۔ ان سب کے علاوہ اس میں فیض کا غیر مدون کلام بھی موجود ہے، جو ان کے کلیات ''نسخہ وفا'' میں بھی موجود نہیں ہے نیز فیض پر لکھے گئے مضامین ومقالات اور کتب ورسائل کی ایک طویل فہرست موجود ہے، جن سے موصوف کے وسیع مطالعے اور تحقیقی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ یقیناً ان کی مرتب کردہ مضامین ومقالات اور کتب ورسائل کی فہرست، فیض پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گی۔

فیض کو ترقی پسند تحریک کا اہم علم بردار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اپنے عہد کے بڑے شعراء

میں، ان کا شمار ہوتا ہے لیکن ان کی نثر نگاری اور خصوصاً صحافت کے متعلق اُردو ادب میں سیر حاصل گفتگو کا فقدان نظر آتا ہے۔ جب کہ فیضؔ کو صحافت سے بھی خاصہ لگاؤ تھا۔ مثال کے طور پر، جب کلکتہ میں ''اقبال چیئر'' قائم ہوئی تو سب سے پہلے فیضؔ کا ہی انتخاب کیا گیا تھا لیکن انھوں نے ادارت کو اولیت دی تھی۔ اس طرح، ان کے بعد ڈاکٹر مظفر حنفی کو فائز کیا گیا تھا۔ اس نہج پر پہنچ کر فیضؔ کی زندگی میں صحافت کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ''فیضؔ فہمی'' میں خاطر خواہ مواد دستیاب ہے اور فیضؔ نثری و صحافتی خدمات کے متعلق، جو تشنگی ہے اسے کافی حد تک دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چناں چہ ڈاکٹر تقی عابدی نے ''فیضؔ فہمی'' میں ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، جن کے بغیر ''فیضؔ شناسی'' اور ''فیضؔ فہمی'' ناگزیر ہے۔ مثلاً فیضؔ کو سمجھنے کے لیے، ان کے سیاسی افکار کو جاننا نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عابدی کا مضمون ''فیضؔ اور ایرانی انقلاب'' بڑے خاصہ کی چیز ہے۔ یہی نہیں ''فیضؔ شناسی'' کے لیے انھوں نے، اس کتاب میں فیضؔ کی بعض ایسی نادر تصاویر اور خطوط کو بھی شامل کر دیا ہے، جس کے آئینے میں فیضؔ کو زیادہ نزدیک سے دیکھنے، سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ ایسے حالات و واقعات بھی خود فیضؔ کے ذریعے سامنے آجاتے ہیں۔ جو مضامین و مقالات اور کتابوں میں نہیں ملتے۔ اس لیے کہنا مناسب ہوگا کہ واحد اس کتاب میں، کئی کتابوں کی خوبیاں اور عرق موجود ہے۔ فیضؔ کی ادبی، شعری، نثری، صحافتی خدمات، اس کی اہمیت و افادیت، زندگی کے حالات، واقعات، سیاسی، سماجی، مذہبی افکار و خیالات اور سوانح حیات کا تفصیلی مطالعہ کرنا ہو تو، اُردو ادب میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں مل سکے گی۔

واقعی ڈاکٹر تقی عابدی کا یہ بے مثال ادبی کارنامہ اُردو ادب کے سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ جس کی اُردو ادب میں یقیناً پذیرائی ہوگی۔ جس طرح فیضؔ اپنے دور سے آگے کی چیز تھے، اسی طرح ڈاکٹر تقی عابدی کا یہ کارنامہ فیضیات پر موجودہ عہد سے آگے کی چیز ہے۔ مرور ایام کے ساتھ اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ڈاکٹر رشید گل
ٹورنٹو (کینیڈا)

ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب

کا جویان علم اور صاحبان نقد و نظر کے لیے انمول تحفہ! ''فیض فہمی''

ڈاکٹر سید تقی عابدی جیسی قد آور علمی اور ادبی شخصیت پر قلم اٹھانے کی جسارت کرنا بلاشبہ ایک بہت بڑی گستاخی اور بے ادبی متصور ہوگی۔ لیکن ایسی شخصیت کی علمی، ادبی اور تحقیقی کاوش کو نہ سراہنا بھی راقم الحروف کے نزدیک بڑے درجے کی تنگ نظری اور بخیلی ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب کی فیض نوازی بشکل ''فیض فہمی'' پر رائے زنی کو اپنے خیال میں مناسب، روا اور جائز سمجھتا ہوں سب سے پہلی بات جس نے بندۂ ناچیز کو مجبور کیا کہ وہ مذکورہ کتاب اور اس کے مصنف اور محقق کے حوالے سے چند معروضات پیش کروں، وہ یہ کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کا غیر جانبدارانہ غیر متعصبانہ اور عادلانہ تبصرہ۔ محقق اور مصنف نے عہد ساز انقلابی اور رومانی شاعر کی زندگی کے ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ہر ممکن کوشش کی ہے کہ مذکورہ شاعر کی زندگی کا کوئی گوشہ یا پہلو عدم توجہی یا بے اعتنائی کا شکار نہ ہونے پائے۔ ''فیض فہمی'' کے مصنف اور ناقد نے عامی اور عالم کے ذوقِ سلیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فیض کی ذاتی زندگی اور ان کے فنِ شاعری اور نظریات کے متعلق مشاہیر عالم اور عہد حاضر کے نامور شاعروں ادیبوں اور نقادوں سے خصوصی مضامین لکھوا کر بڑی فیاضی سے حقِ فیض ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا یہی ایک وصف ہی ان کو صاحبان نقد و نظر کے ذہنوں اور دلوں میں تا قیامت مسند قدر و منزلت پر بٹھانے کے لیے کافی ہے۔

موصوف نے علاقائی و جغرافیائی حدوں، بغض اور کینہ کے اندیشوں سے اُٹھ کر بڑے ہی متوازن، مدبرانہ اور منصفانہ انداز میں مذکورہ کتاب کی اشاعت کا اہتمام کر کے اپنی علمی ادبی اور تحقیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے دورِ حاضر کے مصنفین اور

ناقدین کے لیے ایک ایسا گراں قدر اور انمول تحفہ فراہم کیا ہے۔ جو کہ نادر ہونے کے ساتھ ساتھ عدیم المثال بھی ہے۔ مذکورہ کتاب کی ضخامت، طباعت اور کتابت دیکھ کر بلا اختیار ڈاکٹر صاحب کے حسنِ ذوق، نفاست اور سخاوت کی داد دینی پڑتی ہے۔ ''فیض فہمی'' تقریباً 1400 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں کل 162 مضامین ہیں۔ مذکورہ کتاب میں شامل 48 مضامین ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کے زورِ قلم کا کہنہ ثبوت ہیں۔ انھوں نے دورِ حاضر کے نامور مصنفین، ناقدین اور شعراء کے ساتھ مل کر ''فیض فہمی'' کو نئی جہت، سمت اور معتبری عطا کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تو بلا شرکت غیرے بھی مذکورہ کتاب کو مکمل کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے باقی مشاہیر عالم کی آراء اور مضامین کو پیش کر کے اعلیٰ ظرفی اور شعور کی پختگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس کے لیے ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

فیض احمد فیضؔ کی شاعری سے ایک دُنیا فیضیاب ہوئی ہے۔ ان کی شاعری روحانیت اور انقلابیت کا حسین امتزاج ہے۔ انھوں نے اپنے اندازِ بیان سے مداحین اور ناقدین کو یکساں متاثر کیا ہے۔ ان کے بدترین ناقدین بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ فیضؔ نے دُنیائے غزل و نظم میں فارسی اور عربی کی نئی تراکیب، علامتیں اور تشبیہیں متعارف کروا کر گیسوئے غزل کی زیبائش و آرائش میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ فیضؔ کی شاعری معانی و مطالب کے ساتھ غنائیت کی ایسی لازوال دولت عطا کرتی ہے جس سے قارئین اور سامعین کی ارواح جذب و مستی اور بے خودی کے عالم میں داخل ہو جاتی ہیں۔ فیضؔ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ دورِ حاضر کے تمام نامور گلوکاروں نے ان کے کلام کو بڑے خوب صورت اور منفرد انداز میں گا کر فیضؔ کے کلام کو خواص و عام میں مقبول کیا ہے۔ بعض ناقدین کے مطابق انھوں نے مغربی دُنیا کے شعراء سے متاثر ہو کر نظمیں لکھی ہیں۔ ان پر الزام ہے کہ ان کی شاعری مغرب کے شعراء براؤننگ تھامس ہارڈی، کیٹس، آرتھر سائمن، رابرٹ فراسٹ، شیلے، بائرن اور ورڈز ورتھ سے متاثر ہے۔ کچھ ناقدین فن کا خیال ہے کہ فیضؔ صاحب کی نظم ''تنہائی'' آرتھر سائمن کے بروکن ٹرسٹ (Broken Trust) اور ہارڈی کی دی بروکن اپائنمنٹ (The Broken Appointment) کی نقالی ہے جب کہ فیضؔ کی شاعری پر میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، نظیرؔ، انیسؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، اخترؔ شیرانی کے علاوہ

خسرو، عرفی، بیدل، عربی کے ابوالقیس، ابوتمام اور ابونواس کی اندازِ شاعری کا اثر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر فیض مغربی اور مشرقی شاعروں سے متاثر ہیں اور ان کی چھاپ ان کے کلام میں نظر آتی ہے تو یہ کوئی عیب والی بات ہرگز نہیں۔ شاعر بلا تخصیص مغرب مشرق اچھے شعراء کے کلام سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دور کے حالات و واقعات علمی، ادبی اور ثقافتی تبدیلی کے اثر کو قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن فیض کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے عشقیہ وارداتوں کو زمانے کے سماجی مسائل سے منسلک کر کے پیش کیا۔ اس طرح انھوں نے اُردو کی روایتی رومانوی شاعری میں نئی روائیت کی داغ بیل ڈالی۔ جس سے اُردو شاعری کا دامن مزید وسیع ہوا اور فیض نے ایک اپنا جدا اور منفرد انداز متعارف کروایا۔ فیض نے روایتی شاعری کے کھونٹے سے بندھنے کی بجائے جدّت اور انفرادیت پیدا کر کے معانی و مطالب کو نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ فیض نے شاعری کے روایتی انداز کو بدل کر ایک نیا آہنگ اور اسلوب عطا کیا ہے اور اپنی پہچان کی ایک علیحدہ چھاپ چھوڑی ہے۔ وہ میر، سودا، غالب، اقبال، نظیر، حسرت، اختر شیرانی، خسرو، عرفی، بیدل، ابوالقیس اور ابونواس کا اثر تو قبول کرتے ہیں لیکن وہ اس اثر میں خواص و عوام کے لیے شاہکار بنا دیتے ہیں۔ قارئین اور سامعین کو شاعری کے سحر میں اس طرح جکڑ لیتے ہیں کہ ہر شخص داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

فیض کے نزدیک شاعری ایک مسلسل تجربہ ہے۔ جو وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلتا رہتا ہے۔ فیض نے اپنے اسلوب کے حوالے سے شاعرانہ تعلّی سے ضرور کام لیا ہے۔ لیکن انھوں نے کاملیت کا ہرگز دعویٰ نہیں کیا۔ کم از کم راقم الحروف کی نظر سے ایسا دعویٰ ہرگز نہیں گزرا۔ ان کے شعری مجموعات میں فنی نقائص اور اسقام موجود نہیں۔ انھوں نے اپنی اہلیہ ایلس کو لکھے گئے خطوط میں نقائص کا ذکر کیا ہے۔ میری ناقص رائے کے مطابق یہ فیض صاحب کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انھوں نے خود اس بات کا اعترافِ کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فنی عیوب اور نقائص ہر بڑے شاعر کے کلام میں موجود نہیں۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے بطور خاص فیض صاحب کی شاعری کے فنی نقائص اور اسقام پر مضمون لکھ کر یہ تاثر دیا ہے کہ وہ خوامخواہ کسی کی تعریف نہیں کرتے بلکہ مذکورہ

شخصیت کو ان کے فن کے حوالے سے پہچان کر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے غیر جانبدارانہ، منصفانہ، عادلانہ اور غیر متعصبانہ انداز میں اغلاط کی نشاندہی کر کے نہ صرف اپنی اعتباریت کا سکہ جمایا ہے بلکہ انھوں نے اُردو ادب کی گراں قدر خدمت کی ہے۔ اس کے ساتھ بے بنیاد الزامات کی بنیاد پر اور فنی تقاضوں کی کسوٹی پر کھ کر الزامات کی تردید کی ہے۔ راقم الحروف کی نظر میں فنی تقاضوں، اصولوں اور ضابطوں سے انحراف ممکن نہیں لیکن شاعری میں ندرت خیالی کو بنیاد اور اساس مانا گیا ہے۔ قافیہ آرائی پر معنویت اور غنائیت کو ترجیح دی گئی ہے۔

فیضؔ رومانی اور انقلابی شاعر تھے۔ بعض ناقدین کے نزدیک ان کی شاعری میں روایتی انقلابی شاعروں جیسی شعلہ بیانی نظر نہیں آتی لیکن فیضؔ دھیمے انداز میں انقلابیت کا پرچار کرنے والے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری دلی جذبوں میں ہیجان پیدا کر کے خون کو گرماتی ہے۔ جس کا اثر وقتی نہیں بلکہ دائمی ہوتا ہے۔ محبت اور عشق کے میدان میں بھی وہ ہمیشہ پُر امید رہتے ہیں۔ وہ اقبالؔ کی طرح فراق میں جان کھپانے کے عادی ہیں بلکہ وہ وصالِ یار کے لیے ہمیشہ تیار اور پُر امید رہتے ہیں۔ فیضؔ کی شاعری میں احساس کی شدت اور جدت اپنی تمام تر رعنائی کے ساتھ موجود ہے۔ مذکورہ بالا شعر شدت جذبات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے ؎

مقام، فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیض کی شاعری پر ان گنت شاعروں، ادیبوں، ناقدوں اور دانشوروں نے اپنے انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ ہر ایک شخص کا تبصرہ پڑھنے کے بعد قاری یہ محسوس کرنے پر مجبور ہے کہ فیضؔ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اپنی شاعرانہ، فن کارانہ اور مدبرانہ حیثیت کو اپنے ہم عصروں سے منواتا ہے۔ ان کے بدترین ناقدین بھی ان کی انفرادیت اور جدت پسندی کے قائل ہیں۔ ان کے کلام میں شعریت، تغزل اور غنائیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ فیضؔ کی رومانی اور انقلابی شاعری نے روایتی شاعری کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک ایسا وزنی پتھر پھینکا ہے۔ جس سے بحرِ ادب میں سوچ کی نئی لہریں ابھری ہیں۔ ساکت سمندر سراپا متلاطم ہو گیا ہے۔

رشید حسن خان فیضؔ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''ان کی شاعری کا بڑا حصہ اسی امور سے ان کی آئینہ داری کرتا ہے۔ رشید حسن خان نے فیضؔ کے اس مصرعہ پر کہ'' کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا'' اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فیضؔ نے حقیقت بیانی کر کے سچے اور گہرے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ کاملیت کا دعویٰ خدائے بزرگ و برتر کی ذات کے کون کر سکتا ہے۔ فیضؔ نے اعتراف حقیقت کیا ہے۔ جو کہ ان کی مضبوط شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔

ہر شاعر، فن کار، ادیب اور دانشور کی زندگی میں ایک بے نام تشنگی اور کمی موجود رہتی ہے۔ یہی تشنگی اور کمی اس کو مزید کام کرنے پر ابھارتی ہے۔ کسک، درد اور تڑپ کے بغیر جذبات نگاری ممکن نہیں۔ یہ امور اپنی عیب بینی بلکہ شاعرانہ اور فن کارانہ زندگی کا حُسن ہے۔

فیضؔ صاحب کی نجی، ذاتی اور معاشرتی زندگی کے علاوہ ان کی شاعری اور ان کے نظریات پر ''فیض فہمی'' میں سیر حاصل گفتگو ہو چکی ہے۔ ان تمام پہلوؤں اور زاویوں پر تبصرہ کرنا مقصود نہ تھا بلکہ راقم الحروف کا اولین مقصد مذکورہ کتاب کے مصنف اور محقق جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کرنا تھا۔ کیوں کہ آج کے دور میں جہاں کتاب بینی کا شوق ناپید ہو رہا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو معیاری، اعلیٰ اور فقید المثال بنانے میں بے دریغ وقت اور نقدی کے خزانے لٹائے ہیں۔ مشاہیرِ عالم سے مضامین لکھوانا، ان کو یکجا کرنا، نادر و نایاب تصاویر کو اکٹھا کرنا اور ان کو مختلف عناوین کے تحت ''فیض فہمی'' میں شامل کرنا اگرچہ کارِ ناممکن نہیں تو بھی کارِ دشوار ضرور ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے اپنی تحقیقی، علمی اور ادبی صلاحیتوں کا استعمال نہایت سلیقے اور اچھوتے انداز میں کر کے دُنیائے ادب سے وابستہ لوگوں کے لیے ایک لازوال اور باعث تقلید مثال چھوڑی ہے۔ اُردو ادب سے ان کا والہانہ عشق اور شعبۂ تحقیق و تنقید میں ان کا غیر متعصّبانہ، غیر جانبدارانہ منصفانہ اور عادلانہ انداز ان کو بلاشبہ اعلیٰ پایہ کے محقق اور ناقدین کی صف میں ممتاز مقام پر فائز کرتا ہے۔ عوام و خواص سے ''فیض فہمی'' سے فیضیاب ہونے کی پر زور سفارش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے فیضؔ کی شاعری کو سمجھنے کے لیے مددگار اصول بیان کر کے ہر ایک قاری کو کلام فیضؔ سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ فراہم کیا ہے۔ ڈاکٹر سید

تقی عابدی کی تصنیف پڑھ کر فیض کی شاعری کے متعلق کج فہمی از خود دور ہو جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دورِ حاضر کے کسی بھی شاعر، ادبی، ناقد، دانشور اور نثر نگار کا کہنہ مشق مگر منکسر المزاج محقق، صاحبِ طرز شاعر، مصنف اور نثر نگار ڈاکٹر سید تقی عابدی کی شخصیت اور علمیت سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔ ہمارے نزدیک ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب مدت مدید سے اپنی جان پر فیض کی شاعری کا قرض رکھتے تھے۔ جو انھوں نے ''فیض فہمی'' کی صورت میں نہایت فیاضی اور فراخدلی سے چکا دیا ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر سید تقی عابدی اس گراں قدر سوغات کے لیے لاکھوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہم ندیم قاسمی کے ایک شعر سے اس مضمون کو تمام نیک خواہشات کے ساتھ بند کرتے ہیں ؎

یاد آئے تیرے پیکر کے نقوش
اپنی کوتاہی فن یاد آئی

بھارت، پاکستان اور دوسرے ممالک کی تمام جامعات اور اداروں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ڈاکٹر تقی عابدی جیسے عالمانہ اور مدیرانہ شخصیت کو اُردو ادب کے شعبۂ نقد و نظر و تحقیق میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کرنے کے لیے ضرور غور و خوض کریں گے۔ وہ اس ڈگری کے جائز اور مستحق امیدوار ہیں۔

پروفیسر سیدہ جعفر

ڈاکٹر تقی عابدی اور فیض فہمی

فیض کا نام اُردو شاعری کے لیجنڈ کی حیثیت سے ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔
صدیوں دلوں کے اندر ہم بولتے رہیں گے

فیض کی استعارہ سازی، عصری حسیت اور ادبیت کے متوازن امتزاج، لب و لہجے کی نرمی، دل آسائی، ہیومنزم کی تابناکی اور انسانی زندگی کے تجربات کی کسک نے ان کی شاعری کو ایک ہمہ گیر اثر آفرینی عطا کی ہے۔ فیض کے کلام کی دلنشین رومانیت، اپنے عہد کی مزاج شناسی، لفظوں کے علامتی استعمال اور اظہار کی دردمندی نے انھیں انفرادیت عطا کی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض کے فن پر مختلف ادیبوں کے مضامین یکجا کر کے ایک ضخیم کتاب مرتب کی ہے۔ حیدرآباد میں ڈاکٹر تقی عابدی کی اس وقیع تصنیف کی رسم اجراء کے موقع پر اس ناچیز نے اپنی تقریر میں عرض کیا تھا کہ اس تصنیف کا نام ''فیض انسائیکلو پیڈیا'' ہونا چاہیے تھا، لیکن مرتب نے انکساری سے کام لے کر اسے ''فیض فہمی'' سے موسوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض کی زندگی کی تمام تفصیلات ان کے سوانحی حالات اور واقعات زندگی کا مطالعہ کرنا ہو تو اُردو ادب کے سرمائے میں اس سے بہتر کتاب نہیں ملے گی۔ فیض کی شاعری کے مختلف گوشوں پر اُردو کے صاحبِ نظر نقادوں نے اظہارِ خیال کر کے ان کے فن کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور ان کی ادبی قدر و قیمت کا اس احتساب سے اچھا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ فیض بنیادی طور پر ہیومنزم کے شاعر تھے۔ وہ رنگ و نسل، قوم و ملت اور جغرافیائی سرحدوں سے انسان کو ماوراء سمجھتے تھے۔ ذہنی تحفظات اور طبقاتی تعصّبات کو ان کے نظام فکر میں جگہ نہیں مل سکی۔ اسی وسعت قلب و نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے، تقی عابدی نے یہ گرانقدر

تصنیف پروفیسر گوپی چند نارنگ اور افتخار عارفؔ کے نام معنون کی ہے اور یہ دونوں برصغیر کے دو ملکوں ہندوستان اور پاکستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ''فیض فہمی'' میں اُردو کے اہم نقادوں کی تحریریں جمع کردی گئی ہیں اور فیضؔ کے فن پر ان کے تاثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مسعود حسین خان، گوپی چند نارنگ، احتشام حسین، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، تقی عابدی، قمر رئیس اور افتخار عارف وغیرہ کے مضامین نے اس تصنیف کی ادبی اہمیت میں مزید اضافہ کردیا ہے میں نے صرف چند نام لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے اس فہرست میں اضافہ کیا جاسکتا ہے تاکہ اس کتاب کی حقیقی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاسکے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے بڑی جستجو اور کاوش کے بعد فیضؔ کی تصویر اور ان کے متعلقین کی تصاویر جمع کی ہیں۔ 1402 صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں فیضؔ کے سوانحی حالات اور ان کے کلام کے تمام نقوش محفوظ ہوگئے ہیں۔ فیضؔ ایک شاعر اور نثر نگار ہی نہیں صحافی بھی تھے جس کی طرف اُردو والوں نے کم توجہ کی ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر احمد علی خان کا مضمون ہمیں فیضؔ کی ادبی شخصیت کی ایک نئی جہت سے متعارف کرواتا ہے۔ شعیب ہاشمی اور A Song for this day میں انگریزی میں فیضؔ کی شاعری اور ان سے اپنے روابط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں خود مرتب یعنی ڈاکٹر تقی عابدی کی 41 سے زیادہ تحریریں شامل ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے فیضؔ کی شاعری کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ فیضؔ کی شاعری کے مزاج اور ان کے طرز ترسیل کا بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے بڑی دیدہ وری اور ادبی بصیرت کے ساتھ فیضؔ کی شاعری کی مختلف خصوصیات کا جائزہ لیا اور نتیجہ خیز تجزیہ کیا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے تقی عابدی ڈاکٹر ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ وہ اتنے ادبی کارنامے کیسے انجام دے سکے اور اس کے لیے انھیں کیسے وقت ملا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی متعدد تصانیف منظر عام پر آکر اہل نظر سے داد و تحسین وصول کرچکی ہیں۔

''شہید''، ''جوشِ مودّت''، ''گلشن رویا''، ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے''، ''انشاء اللہ خاں انشاؔ''، ''رموزِ شاعری''، ''اظہارِ حق''، ''مجتہدِ نظم مرزا دبیرؔ''، ''طالعِ مہر''، ''سلکِ سلام دبیرؔ''، ''تجزیہ یادگار انیسؔ''، ''ابواب المصائب''، ''ذکرِ دُر باران''، ''عروسِ سخن''، ''مصحف فارسی دبیرؔ''، ''مثنویاتِ دبیرؔ''، ''کائناتِ نجمؔ''، ''روپ کنوار کماری''، ''دربارِ رسالتؐ''،

''فکرِ مطمئنہ''، ''خوشۂ انجم''، ''ھوالنجم''، ''تعشق لکھنوی''، ''ادبی معجزہ''، ''غالب دیوان نعت ومنقبت''، ''چوں مرگ آید''، ''رباعیاتِ دبیر''، ''سبدِ سخن''، ''کلیاتِ غالب فارسی'' [دو جلد]، ''دیوانِ غالب دہلوی'' [فارسی،] ''مطالعۂ رباعیاتِ فراق گورکھپوری''، ''اُردو کی دو شاہکار نظمیں''۔ زیرِ تصنیف ''تجزیۂ شکوہ جوابِ شکوہ فانی لافانی''، ''اقبال کے چار مصرعے''۔ تقی عابدی کی گرانقدر ادبی کاوشیں ہیں۔ ''فیض فہمی'' ان کی ادبی ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرت کی ترجمان ہے۔

یہ 37 تصانیف ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقی بصیرت اور تنقیدی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے شاعر یا ادیب کے فن کا سرسری طور پر جائزہ نہیں کیا ہے اور تاثراتی انداز اختیار کر کے اپنی سہل انکاری کا ثبوت نہیں دیا ہے بلکہ وہ فن کار کی تخلیق کا تجزیہ کر کے سائنٹفک انداز میں نتائج اخذ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اُردو کے مرکزوں سے دور رہ کر بھی ادب کی گرانقدر خدمت انجام دی ہیں۔ تقی عابدی کی کوشش یہ رہی ہے کہ کینیڈا اور امریکہ کے مختلف شہروں میں اُردو کو مقبول بنائیں، وہ ہندوستان میں شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔ حیدر آباد میں مختلف انجمنوں اور اداروں کی تقاریب میں شرکت کے لیے دور دراز کا سفر طے کر کے جنوبی ہندوستان پہنچنا آسان نہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی ایک اچھے مقرر ہیں۔ بے تکان تقریر کرنے اور سامعین کو مسحور کر دینے کا فن کوئی ان سے سیکھے۔ سامعین ڈاکٹر تقی عابدی کی تقریر سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ ان کی تقریر کے دوران سامعین کو وقت کے گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ انھیں متعدد شعر ازبر ہیں اور اپنی تقریر کے دوران برجستہ طور پر ان کا استعمال کر کے اپنی شگفتہ بیانی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

''فیض فہمی'' میں مرتب نے فیض کی زندگی اور ان کی سرگرمیوں کا کوئی گوشہ نظر انداز نہیں کیا ہے۔ فیض نے مختلف ملکوں کا سفر کیا تھا اور وہاں کی عوامی زندگی کو سیاسی تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ تمام دُنیا میں عوام اور محنت کشوں کے مسائل حل طلب ہیں، کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ سحر انصاری نے ''فیض اور فلسطین'' کے عنوان سے جو مضمون سپردِ قلم کیا ہے اس میں مصنف نے لکھا ہے کہ فیض کی شاعری اپنے عہد کے

انسانی مسائل کی ''بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ فیضؔ کے سانحہ ارتحال پر یاسر عرفات کے تاثرات ''فیضؔ میرے دوست اور جنگِ بیروت کے رفیق تھے۔'' میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ یاسر عرفات لکھتے ہیں۔ ''فیض احمد فیضؔ میرے دوست تھے اور جنگِ بیروت میں میرے رفیق تھے، اس دہکتے جہنم میں بھی ان کے چہرے کی لازوال مسکراہٹ ماند نہیں پڑی اور ان کی آنکھیں ناقابل شکست عزم و یقین سے دمکتی رہیں۔'' تقی عابدی کا مضمون ''فیضؔ اور ایرانی انقلاب'' اس سلسلے میں بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ فیضؔ نے اپنے محفوظ پیرایہ اظہار اور استعارے کی ہمہ گیر جامعیت و اثر آفرینی سے کام لے کر سیاسی حالات کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں۔ فیضؔ کی بہت سی تصویریں بھی جمع کردی گئی ہیں۔ یہ تصویریں ان کی خانگی زندگی کے مختلف رخوں کی آئینہ دار ہیں۔ ''فیضؔ فہمی'' میں فیضؔ کے بعض اہم خطوط بھی شامل ہیں جن سے ان کی شخصیت اور طرز فکر کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ تقی عابدی کا اسلوب بیان نہایت شستہ، متاثر کن، واضح اور دلآویز ہے۔ ان کی تحریروں میں فارسی الفاظ و لغات اکثر جگہ صرف ہوئے ہیں اور ان سے نثر کی معنویت اور اثر آفرینی میں اضافہ ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ ''فیضؔ فہمی'' اُردو ادب کے سرمائے میں ایک گرانقدر اضافہ ہے اور فیضؔ کی شخصیت اور ان کے فن پر ایک جامع دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تصنیف میں فیضؔ کے فن کے تمام خدوخال اپنی پوری معنویت کے ساتھ اجاگر ہوئے ہیں۔

پروفیسر سید فضل اللہ مکرم
شعبۂ اُردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی فیض فہمی

فیض احمد فیضؔ اُردو کے سب سے بڑے شاعر نہ سہی لیکن اُردو کے بڑے شاعروں میں شامل ضرور ہیں۔ فیضؔ نے کلاسکیت اور رومانیت کو کچھ اس سلیقے سے ایک ساتھ پیش کیا ہے کہ ایسی بہت کم مثالیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ غمِ جاناں کا غمِ دوراں سے گریز کا فن فیضؔ کو منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ فیضؔ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کئی جامعات میں تحقیقی مقالے تحریر کیے گئے۔ بے شمار سیمینار و سمپوزیم کا انعقاد عمل میں آیا، بحث و مباحثے ہوئے، فنی و تکنیکی گفتگو ہوئی اور فیضؔ کا فن مزید نکھرتا ہی گیا۔ ابھی فیضؔ شناسی کے مختلف مراحل جاری ہیں اور جاری رہیں گے۔

ڈاکٹر تقی عابدی اُردو کے نامور محقق اور نقاد ہیں۔ ان سے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ طب کے ڈاکٹر ہیں مگر ادب کے مریض ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ طب اور ادب دونوں کے ڈاکٹر ہیں۔ ان کی اُردو سے محبت اور اس کے فروغ کے لیے محنت بے مثال ہے۔ انھوں نے ہمیشہ سے ہی اخلاص کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ کبھی اپنی کتابوں کو فروخت نہیں کرتے ہیں اور نہ کبھی کسی ادارے سے امداد لیتے ہیں۔ دُنیا بھر کی ادبی سیاحت ان کا مشغلہ ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد پانچ درجن سے زیادہ ہے۔ انھوں نے مرثیہ خصوصاً انیسؔ، دبیرؔ، نجم آفندی کے حوالے سے خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ اقبالؔ، حالیؔ اور فیضؔ کے فن پر اپنی توانائیاں صرف کی ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کبھی بھی کسی شخصیت سے مرعوب ہو کر قلم نہیں اٹھایا ہے اور نہ مضامین میں کہیں جانب داری برتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، کھل کر لکھا اور بے لاگ لکھا اسی وجہ سے انھیں اُردو کے ممتاز محققین میں شمار کیا جاتا ہے۔

فیض احمد فیضؔ کے حوالے سے انھوں نے چالیس سے زیادہ مضامین لکھے اور

''فیض شناسی'' کا ثبوت دیا لیکن ان کی طبیعت مطمئن نہیں ہوئی۔ انھوں نے فیض پر قدیم و جدید تقریباً 121 مضامین کو یکجا کیا اور اپنے اکتالیس مضامین کو شامل کرتے ہوئے فیض پر ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا جسے دُنیا ''فیض فہمی'' کے نام سے جانتی ہے۔ فیض فہمی، چودہ سو صفحات سے زائد مشتمل کتاب 2011ء میں پاکستان سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض اور ان کے افرادِ خاندان اور دیگر احباب کے ساتھ سینکڑوں نادر و نایاب تصاویر شامل کر کے اسے ایک دلچسپ مرقع بنا دیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو پروفیسر گوپی چند نارنگ اور افتخار عارف کے نام معنون کیا ہے۔ اس پروجیکٹ کی غرض غایت بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''فیض کی سو سالہ سالگرہ کے موقع پر فیض فہمی پر یہ دستاویز اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تصنیف و تالیف کی گئی ہے تا کہ فیض کی حیات اور شخصیت کے ساتھ ساتھ اُن کی ادبی اقدار کا ہر زاویہ نظر سے جائزہ لیا جا سکے۔ ہم جانتے ہیں کہ فیض کی حیات اور ان کی شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن ہم اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ ان کی شاعری کی طرزِ فغاں اور ان کی نثر کی طرزِ بیاں پر سیر حاصل کام نہ ہو سکا بلکہ کچھ قدیم تنقیدی، تشریحی، تفسیری اور تحلیلی تحریریں تکراری صورت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔

اس کتاب میں حتیٰ المقدور اس کمی کو پوری کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارا مقصد چوں کہ ایک مستند دستاویز کی تصنیف و تالیف ہے اس لیے درجنوں جدید مضامین کے علاوہ اس میں اُن تمام مضامین کو بھی شامل کیا گیا ہے جن سے عامی اور عالم دونوں مستفید ہو سکیں اور یہ کتاب مصنفین، محققین اور اسکالرز کے لیے سودمند اور مددگار بن سکے۔ ہم نے دانستہ طور پر ''فیض فہمی'' میں اُن مضامین کو شامل نہیں کیا جن میں گزشتہ قدیم مطبوعہ مقالوں اور مضامین کے بہت سے حصوں کو قینچی اور گوند کی مدد سے کسی حوالے کے بغیر پیش کیا گیا تھا۔ ہمیں تکرار اور مضمون نگار کی تحقیر گوارا نہ تھی، کیوں کہ بہ ہر حال ''فیض فہمی'' میں وہ اصلی مضامین موجود ہیں۔

اس دفترِ فکر ونظر میں وہ مضامین بھی نظر نہیں آئیں گے جن میں ''فیضؔ شناسی'' سے زیادہ مضمون نگار کی خود شناسی
موجود تھی۔ بہ قول جمیل مظہری تھوڑی بہت خود نمائی تو فطری حسن ہے۔

بقدرِ پیمانۂ تخیل، سُرُور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا''

فیض احمد فیضؔ کی اس دستاویز کے ہر مضمون پر اظہارِ خیال ممکن نہیں ہے لیکن فہرستِ مضامین کا اندراج لازم ہے تاکہ قاری کو پتہ تو چلے کہ اس میں کون کون فیضؔ شناس شامل ہیں۔ ملاحظہ کریں۔

''فیضؔ کو کیسے نہ پڑھیں۔ ایک پس ساختیاتی رویہ'' (پروفیسر گوپی چند نارنگ)، ''فیضؔ کی انفرادیت'' (پروفیسر سید احتشام حسین)، ''فیضؔ'' (پروفیسر کلیم الدین احمد)، ''فیضؔ کی شعری اُسلوبیات۔ تسلسلِ بیان اور معنیاتی وحدت'' (پروفیسر مرزا خلیل بیگ)، ''فیضؔ کا نظریۂ سخن'' (محمد صفدر میاں)، ''فیضؔ کی شعری جہات اور تعینِ قدر کا مسئلہ'' (پروفیسر شارب ردولوی)، ''فیضؔ اور کلاسیکی غزل'' (شمس الرحمٰن فاروقی)، ''فیضؔ سے فیضؔ تک'' (پروفیسر آلِ احمد سرور)، ''فیضؔ کی نظم'' (پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی)، ''سرِ وادیِ سینا کی غزلیں'' (ڈاکٹر شان الحق حقی)، ''فیضؔ نظریات کا شاعر'' (احمد ندیم قاسمی)، ''زِنداں نامہ کا سرسری جائزہ'' (جعفر علی خان اثرؔ لکھنوی)،

Faiz Ahmad Faiz: Reminiscences (Prof. George Fischer)

''فیض احمد فیضؔ کی شاعری کا لسانی پہلو'' (ڈاکٹر نصرت چودھری)، ''کچھ ''دستِ صبا'' کے بارے میں'' (سیّد سجاد ظہیر)، ''فیض احمد فیضؔ کی شاعری'' (پروفیسر سیّدہ جعفر)، ''فیض احمد فیضؔ کی غزل گوئی'' (ڈاکٹر ضیاء الحسن)، ''فیضؔ بہ حیثیت رومانی شاعر'' (ابنِ فرید)، ''نظم گوئی میں فیض احمد فیضؔ کے امتیازات'' (پروفیسر ابو الکلام قاسمی)، ''فیض احمد فیضؔ کی شاعری'' (ظفر اقبال)، ''فیضؔ صاحب کی ایک نظم'' (ستار طاہر)، ''فیضؔ صاحب کا نظریۂ شاعری اور اس کی تطبیق'' (ڈاکٹر سیّد محمد عقیل)، ''فیضؔ کا فنِ شاعری'' (ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی)، ''فیضؔ کی شاعری کا زندہ لفظ'' (آغا سہیل)، ''دستِ صبا'' (ممتاز حسین)،

''فیض احمد فیضؔ کی شاعری'' (پروفیسر شمیم حنفی)، ''فیضؔ کی غزل'' (ڈاکٹر سلام سندیلوی)، ''غالبؔ اور فیضؔ'' (ڈاکٹر وزیر آغا)، ''توسیعِ روایت کا شاعر'' (ڈاکٹر عنوان چشتی)، ''غالبؔ، جوشؔ اور فیضؔ: تین آوازیں، تین لہجے'' (پروفیسر محمد علی صدیقی)، ''فیض احمد فیضؔ'' (ڈاکٹر مسعود حسین)، ''معتدل گرمیِ گفتار کا غزل گو'' (ڈاکٹر سلیم اختر)، ''فیض احمد فیضؔ: شخصیت اور شاعری'' (نسیم احمد عباسی)، ''فیضؔ ایک تقابلی مُطالعہ'' (پروفیسر جمیل جالبی)، ''فیضؔ کا ذہنی سفر اور سمتِ فکر'' (ڈاکٹر عتیق احمد)، ''فیضؔ کی نظریاتی شاعری: فن کے نقطۂ نظر سے'' (ظہیر صدیقی)، ''فیضؔ نقشِ فریادی کی روشنی میں'' (ڈاکٹر ابو محمد سحر)، ''فیضؔ اور جدیدیت'' (ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید)، ''فیضؔ کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام'' (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)، ''جدید اُردو شاعری میں علامت نگاری'' (ڈاکٹر تبسم کاشمیری)، ''فیض احمد فیضؔ اور روایتی شعری زبان'' (پروفیسر محمد علی صدیقی)، ''فیضؔ کی غزل'' (پروفیسر قمر رئیس)، ''سکندر علی وجد اور فیضؔ کے باہمی تعلّقات'' (پروفیسر مجید بیدار)، ''زنداں نامہ ایک تاثُّر'' (شاد عارفی)، ''سُرخ بر سیاہ'' (پروفیسر مجتبیٰ حسین)، ''فیضؔ ایک نثر نگار'' (پروفیسر سحر انصاری)، ''میزان ایک مُطالعہ'' (ڈاکٹر صلاح الدین حیدر)، ''فیضؔ کے شعری و ادبی میلانات'' (ڈاکٹر اشفاق سلیم مرزا)، ''اَدب کا ترقی پسند نظریہ'' (فیض احمد فیضؔ)، ''جوشؔ شاعرِ انقلاب کی حیثیت سے'' (فیض احمد فیضؔ)، ''محصورِ بیروت کی ایک جھلک'' (فیض احمد فیضؔ)، ''ایک یادگار تقریر'' (فیض احمد فیضؔ)، ''ایک حوصلہ مند دل کی آواز: ترجمہ: پروفیسر سحر انصاری'' (الیگزینڈر سرکوف)، ''فیض احمد فیضؔ: کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا'' (ڈاکٹر بیدار بخت)، ''فیضؔ عظیم شاعر، عظیم انسان'' (پروفیسر کرار حسین)، ''فیضؔ قرب و دُوری کا کرشمہ'' (انتظار حسین)، ''محبت کا رشتہ'' (سلیمہ ہاشمی)،

"Do you also write poetry" (Moneeza Hashmi)

''فیضؔ سے میری پہلی مُلاقات'' (صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم)، ''فیضؔ'' (مالک رام)، ''بہ یادِ فیضؔ'' (اندر کمار گجرال)، ''شاعرِ باعمل'' (علی عباس حسینی)، ''فیضؔ کی باتیں، فیضؔ کی شاعری'' (فارغ بخاری)، ''فیضؔ سے ملاقات'' (کرشن چندر)، ''فیضؔ کا آدرش'' (سید سبط حسن)، ''ہمارے فیضؔ صاحب'' (افتخار عارف)، ''لکھنؤ کی ایک رات'' (علی سردار

جعفری)، ''فیض احمد فیضؔ'' (ایلس فیض)، ''فیضؔ: شاعرِ انسانیت'' (ڈاکٹر تارا چرن رستوگی)، ''فیضؔ اور شکیب: لندن کی دِلکش یادیں'' (ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب)، ''فیضؔ کی شاعری میں محبوب کا تصور'' (کشمیری لال ذاکر)، ''بہ یادِ فیضؔ'' (قدرت اللہ شہاب)، ''سرودِ شبانہ'' (قرۃ العین حیدر)، ''فیضؔ صاحب'' (شاہد احمد دہلوی)، ''پھر نظر میں پھول مہکے'' (کنہیا لال کپور)، ''یادیں فیض احمد فیض کی'' (فقیر وحید الدین)، ''ادبی محبتیں'' (ضیا ساجد)، My understandig of Faiz (کرنل انور احمد)،

A song for this Day (Shoaib Hashmi)

''فیضؔ کا کلام موسیقی کے روپ میں'' (امین الرحمٰن)، ''نغماتِ فیضؔ'' (مرزا ظفر الحسن)، ''فیضؔ مثالی ایڈیٹر'' (آئی.ای.رحمٰن)، ''مرے دل، مرے مسافر'' ترجمہ: قرۃ العین حیدر (خالد حسین)، ''فیضؔ کی تنقیدیں: ریگ لہراتی ہوئی'' (مظہر امام)، ''مقدمہ نقشِ فریادی'' (ن.م.راشد)، ''فیضؔ: ایک پیاری، عظیم شخصیت'' ترجمہ: سید رضا کاظمی (ڈاکٹر ملک راج آنند)، ''صلیبیں مرے دریچے میں۔ ایک مطالعہ'' (ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی)، ''تاریخ اور ادب کا باہمی ربط'' (ڈاکٹر صادق نقوی)، ''فیضؔ اور ان کے غیر ملکی معاصرین'' (پروفیسر وہاب اشرفی)، ''فیضؔ اور زِنداں'' (ظفر اللہ پوشنی)، ''فیضؔ کی مقبولیت اور جیل'' (رام لعل)، ''فیضؔ کا مکمل مرثیہ اور ایک مکمل سوز'' (ڈاکٹر ہلال نقوی)، ''فلم اور ثقافت'' (فیض احمد فیضؔ)، ''فیضؔ بیتی'' (ڈاکٹر خلیق انجم)، ''فیض احمد فیضؔ'' (خواجہ احمد عباس)، ''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے'' (مشتاق احمد یوسفی)، ''کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گذرے تھا'' (مشتاق احمد یوسفی)، ''یہ جان تو آنی جانی ہے'' (شبنم شکیل)، ''فیضؔ خُوش نوا'' (ڈاکٹر سید حرمت الاکرام)، ''فیض کے بارے میں ایک گفتگو'' (عبداللہ ملک)، ''فیض احمد فیضؔ: با کمال شخصیت'' (ندیم ہاشمی)، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' (ڈاکٹر ایوب مرزا)، ''فیض: صد سالہ یومِ پیدائش'' (عابد حسن منٹو)، ''مابعد فیضیات کا سماجی، سیاسی پس منظر'' (روش ندیم)، ''لفظیاتِ فیضؔ'' (ڈاکٹر رؤف خیر)، ''فیضؔ کی شاعری میں صبا کی علامت'' (پروفیسر انیس اشفاق)، ''فیضؔ کا تنقیدی رویّہ'' (پروفیسر ارتضیٰ کریم)، ''کچھ تذکرہ، کچھ تبصرہ'' (ظ. انصاری)، ''فیض احمد فیضؔ'' (عارف نقوی)، ''شاعرِ حیات و

کائنات'' (ڈاکٹر شوکت سبزواری)، ''شخص و عکس'' (سید سجاد ظہیر)، ''حمد باری: فیض احمد فیض کی ایک نظم'' (پروفیسر فتح محمد ملک)، ''فیض اور خدا شناسی'' (محمد اعجاز خاور)، ''فیض کینیڈا میں'' (پروفیسر عبدالقوی ضیاء)، ''ٹورنٹو میں فیض کی آمد'' (عبدالرحیم انجان)، ''اُفتدگانِ خاک کا شاعر'' (قاضی جاوید)، ''فیض اور فلسطین'' (پروفیسر سحر انصاری)، ''فیض میرے دوست اور جنگ بیروت کے رفیق تھے'' (یاسر عرفات)، ''فیض ایک صحافی'' (ڈاکٹر احمد علی خان)۔

''فیض فہمی'' میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کے چالیس سے زیادہ مضامین شامل ہیں۔ عنوانات ملاحظہ کریں۔

''رو میں ہے رخشِ عمر'' فیض کا زندگی نامہ، فیض مشاہیر کی نظر میں: بیاسی ''82'' [پھولوں کا گلدستہ]، فیض کی شاعری: تشریح، تجزیہ، تبصرہ، فیض کی غزل کا مقام، کلام فیض: عربی، فارسی الفاظ اور تراکیب کا گلدستہ، فیض کی نظم کی وسعتیں، کلام فیض پر فیض کا ریویو، فیض کی دولتِ تنہائی کا جائزہ، فیض مصورِ نقوشِ قد و خالِ حُسن، فیض اور اختر شیرانی کی مشترکہ قدریں، کون بڑا؟ جوش یا فیض: ادبی محاسبہ یا گروہی مغالطہ، فیض اور بادہ و ساغر، فیض کے کلام میں غلطیاں اور اسقام: منصفانہ تجزیہ، فیض کے انٹرویوز: 28 اشخاص، 450 سوالات، فیض کی تقریظیں...... تخلیق و تنقید کی وحدت، فیض منظوم ترجمہ ''پیامِ مشرق'' تحقیقی مُطالعہ، فیض کا ادبی مناظرہ بعنوان ''پریم چند'' فیض کا عقیدہ (مستند حوالوں کی روشنی میں)، فیض کی صحت اور بیماریاں، فیض خطوط سے ہمیں کیا ملا، یادِ یارِ مہربان، فیض اور مصطفیٰ زیدی (رشتہ جو موتیوں سے ڈھکا رہا)، فیض اور نوبل پرائز، فیض بنام افتخار عارف (مفید، مختصر اور مستند دستاویز)، قصہ سازش سے اغیار کہوں یا نہ کہوں؟ فیض کا مرثیہ امام، فیض نے انٹرویو لیا، نذرانہ عقیدت، اے بسا آرزو کہ خاک شُد، فیض نے کن کتابوں کا مطالعہ کیا، فیض کے 72 ادبی نشتر، فیض کے لطیفے، فیض کی نعت، شام غربت، فیض اور ایرانی انقلاب، جو میرا تمہارا رشتہ ہے، جدول تصانیف، تخلیقات فیض پر ایک نظر، فیض پر مرتبہ کتب و رسائل، فیض پر مرتبہ مضامین کا ذخیرہ، فیض کا غیر مدوّن کلام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کتابیات کے تحت ایک فہرست بھی دی گئی ہے۔

زیرِ مطالعہ کتاب کا پہلا مضمون پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ہے، جنھوں نے پس ساختیاتی رویے کے حوالے سے چند تجاویز پیش کیں کہ فیض کو کیسے نہ پڑھا جائے۔ انھوں نے فیضؔ کی مختلف نظموں کے کلیدی الفاظ اور ان کی معنوی جہات کو روشن کیا۔ سید احتشام حسین نے ''فیضؔ کی انفرادیت'' کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''فیضؔ نے اپنے انسان دوست خیالات، زندگی میں ناانصافی اور عدمِ توازن کے خلاف اپنے صحت مند ردِ عمل اور انفرادی تجربات کو ایسے حسین شعری پیکر میں پیش کیا ہے کہ جو لوگ ان کے نصب العین کے مخالف ہیں وہ بھی آسانی سے اس کے اثر اور جادو کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔''

کلیم الدین احمد کو ایک سخت گیر نقاد مانا جاتا ہے وہ انگریزی ادب اور تنقیدی تصورات کے چشمے سے اُردو شاعری کا محاکمہ کرتے ہیں۔ انھوں نے فیضؔ پر ایک بھرپور مضمون اس وقت لکھا جب ان کے صرف دو مجموعہ کلام ''نقشِ فریادی'' اور ''دستِ صبا'' منظرِ عام پر آئے تھے۔ کلیم الدین احمد نے فیضؔ کے فنی تقاضے اور ترقی پسند تحریک کے نقطہ نظر پر بہترین رائے دی ہے وہ لکھتے ہیں:

> فیضؔ کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے ''نقشِ فریادی'' اور ''دستِ صبا'' کی دو پتلی جلدیں اور بس ان دونوں مجموعوں میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ مجھے صرف فیضؔ کی نظموں کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ فیضؔ میں دو چیزیں ہیں جو دوسرے ترقی پسند شاعروں میں نہیں ملتیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ فیضؔ کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس ہے اور وہ ان فنی تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے ترقی پسند شعراء کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس نہیں اور یہی کمی ان کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ دوسری چیز جو فیضؔ میں ملتی ہے وہ ایک قسم کا خود ضبطی ہے۔ وہ اپنے کو لیے دیے رہتے اور دوسرے باغی شاعروں کی طرح اپنے نعروں سے آسمان کو نہیں ہلاتے۔ وہ ترقی پسندی کا مطلب یہ نہیں سمجھتے کہ بیدار ہو بیدار ہو کا شور مچایا جائے۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے جائیں۔ ''تلوار اٹھا تلوار اٹھا''، ''مزدور ہیں ہم'' مزدور ہیں ہم''، ''ایشیا چھوڑ دو!، ایشیا چھوڑ دو!، ایشیا

چھوڑ دو!''، ''بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت میرا دیوتا'' اور اسی قسم کی چیزوں کی یلغار کو بہترین شاعری سمجھا جاتا ہے، ان کی آواز دھیمی ہے، وہ دبی زُبان سے بات کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ افکار و جذبات کی رَو میں نہیں جاتے۔ افکار و جذبات پر ضبط کی مُہریں لگاتے ہیں۔''
(ص:79)

ماہرلسانیات مرزا خلیل احمد بیگ نے اسلوبیات کے حوالے سے فیضؔ کی شاعری کا جائزہ لیا ہے جب کہ ممتاز نقاد پروفیسر شارب ردولوی نے فیضؔ کی شعری جہات اور تعینِ قدر کے مسئلے پر بھرپور مکالمہ قائم کیا ہے۔ انھوں نے فیضؔ کی رومانیت کو کلاسکیت کے سنگم پر بھی سوال کھڑے کیے ہیں بلکہ فیضؔ کی لفظیات، تشبیہات اور استعاراتی نظام کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ شارب ردولوی نے فیضؔ کی شعری تہذیب پر دلچسپ رائے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اوّل یہ کہ فیضؔ نے غزل کی لفظیات اور رُومانیت کو اثر آفرینی اور دلوں میں اتر جانے کا وسیلہ بنایا ہے۔
ان کے یہاں رُومانی الفاظ وتراکیب کے استعمال کا مقصد بیانِ عشق و محبت نہیں ہے بلکہ وہ صرف ایک پردہ ہے جو شعری کیف وتاثُر میں اضافہ کرتا ہے۔ دوسرے شعرا کی طرح وہ پُرشور الفاظ بھی استعمال نہیں کر سکتے تھے، لیکن وقتی تاثر کے بجائے وہ دیرپا اثر پیدا کرنا چاہتے تھے اور کسی مخصوص واقعے، سانحے یا تجربے کو وقت اور مقام time and place کی حُدود سے بلند رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے شمشیروسناں کے بجائے برگِ گُل سے کام لیا اور یہ فیضؔ کا بہت بڑا اجتہاد ہے۔ دوسرے، فیضؔ کے یہاں ایک مخصوص شعری تہذیب ہے یہ شعری تہذیب ہر عہد ساز شاعر کے یہاں ملتی ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی عظمت میں ان کی شعری تہذیب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ فیضؔ کی بھی اپنی شعری تہذیب ہے جو ان کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہی نہیں بلکہ لہو کی طرح موجزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں کہیں کوئی کُھردراپن، کسی طرح کی تلخ نوائی

یا جھنجھلاہٹ نظر نہیں آئی اور یہی سبب ہے کہ بعض جگہوں پر ان کی نظم کی زبان اور غزل کی زبان میں فرق باقی نہیں رہا ہے، مثلاً
آج بازار میں پابجولاں چلو کے، یہ بند ملاحظہ ہوں۔

چشمِ نم جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو
(ص:142)

آل احمد سرور نے ''فیضؔ سے فیضؔ تک'' کے عنوان سے ان کی منتخب نظموں کا احاطہ کیا ہے جب کہ میری استاد پروفیسر سیدہ جعفر نے فیضؔ کی شاعری کے تحت ان کی نظموں پر بحث کی ہے۔ خصوصاً ان کی تراکیب اور استعاروں پر گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ''قدیم الفاظ وتراکیب اور استعارے فیضؔ کی شاعری میں نئی حیثیت کے امین بن گئے ہیں اور یہ فیضؔ کا ایک شعری اجتہاد ہے۔ فیضؔ کی نظموں کا پورا لفظیاتی نظام اُردو کی روایتی شاعری سے مستعار ہے لیکن یہی روایتی لفظیات فیضؔ کے کلام میں اپنے سیاق وسباق اور تخلیقی استعمال کی وجہ سے نئی معنویت کا انکشاف کرتی ہے۔'' عصرِ حاضر کے مستند ومعتبر نقاد ابوالکلام قاسمی نے نظم گوئی میں فیضؔ کے امتیازات کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے فیضؔ کی مختلف نظموں کا گہرائی وگیرائی سے جائزہ لیا اور فیضؔ کے اس ذہنی وفکری تصادم کی طرف اشارہ کیا کہ فیضؔ ترقی پسند شاعر بننا چاہتے تھے مگر ان کی لفظیات، تراکیب واستعارے انھیں کسی اور سمت کی طرف لے چلتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

فیضؔ کی متذکرہ اعلیٰ اور اوسط درجے کی نظموں کے اس جائزے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مزاج کے ضبط وتوازن نے انھیں اکثر اکہرے اور سپاٹ اُسلوبِ بیان سے کس طرح محفوظ رکھا ہے۔ لہجے کے اتار

چڑھاؤ، فضا کی آفرینی کی خوابناک کیفیت، رچاؤ اور بیان کی شگفتگی نے فیض کی نظموں میں حسن و توازن اور فضا کو قائم رکھا ہے اسے اُردو کی کلاسیکی شاعری کی بُلند پایہ فنّی قدروں کے تسلسل کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ دُرست ہے کہ اپنی مخصوص لفظیات اور تراکیب کے باعث فیض کا مُطالعہ کرتے وقت جس تکرار اور یکسانیت کا احساس ہونے لگتا ہے وہ ان کی ایسی مجبوری ہے جس سے وہ ''نقشِ فریادی'' اور ''دستِ صبا'' کے بعد شاعری میں اپنے آپ کو آزاد نہ کر سکے۔ ''نقشِ فریادی'' اور ''دستِ صبا'' کی نظموں اور غزلوں میں بلاشُبہ بعض کلاسیکی شعراء بالخصوص غالب کی گونج سنائی دیتی ہے، مگر یہ بات بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ انہی دونوں مجموعۂ کلام میں فیض کی ساری شاعرانہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے آگئی تھیں، اور چوں کہ ان کے موضوعات اور تجربات کا دائرہ خاصا محدود تھا، اس لیے پیرایۂ اظہار کی رنگارنگی اور غنائیہ لہجہ یا پھر تحت البیان کے اُسلوب کے باوجود ترقی پسند شاعروں میں تو ان کا اِمتیاز قائم رہا مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ وہ اپنے بعض بلند پایہ ماعصر نظم نگاروں کے تنوع اور کینوس کی وسعت تک نہ پہنچ پائے۔'' (ص:257)

مشہورِ زمانہ مزاح نگار جناب مشتاق احمد یوسفی کا وہ مضمون بھی شاملِ تصنیف ہے جسے انھوں نے فیض کی نوے سالگرہ کی تقریب میں پڑھا تھا۔ یہ پورا مضمون ''ایسا کہاں سے لاوں کہ تجھ سا کہیں جسے'' فیض اور ان کے فن سے سچی محبت کا بے لاگ اظہار ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے مضمون میں کہیں کہیں طنز و مزاح سے کام لیا ہے لیکن سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ انھوں نے فیض کی شخصیت، ان کی شاعری کے حوالے سے نہایت مربوط و مبسوط مضمون لکھ کر اپنی تنقیدی بصیرت کو عیاں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

فیض اپنے عہد کی آواز تھے۔ ان کی آواز ان کی اپنی آواز تھی۔ اس کی گونج اتنی دور تک اور دیر تک سنائی دے گی کہ ان کا عہد ان کی آواز سے پہچانا

جائے گا۔ اس آواز نے آج کے دکھ سے نڈھال لوگوں کو کل کے لیے جینے کا حوصلہ دیا ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم نے یہ عہد دیکھا اور امید و درد میں ڈوبی ہوئی یہ آواز سنی۔ نصف صدی قبل لکھی ہوئی فیضؔ کی نظم "بول" ہمارے دور کا عہد نامہ ہے، جس کے الفاظ میں رجز خانوں کے نفسِ گرم کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ اس کے لحن میں عہدِ عتیق کی بشارتوں کا جادو و جلال گونج رہا ہے"۔ (ص:1153)

"فیضؔ فہمی" میں شامل تمام مضامین پر اظہارِ خیال کرنا اس مختصر سے تبصرے میں ممکن نہیں ہے چوں کہ ڈاکٹر تقی عابدی کے بھی چالیس سے زائد مضامین شاملِ تصنیف ہیں اس لیے ان پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مضامین میں کم و بیش فیضؔ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف حیاتِ فیضؔ کے مختلف جہات کو روشن کیا بلکہ فن کے کئی ایک پہلوؤں کو اجالا کیا ہے حتیٰ کہ فیضؔ کے لطائف کو بھی بیان کر کے ان کی شگفتہ مزاجی کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے فیضؔ کی شاعری کے حوالے سے ایک مکمل اور بھرپور مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے فیضؔ کی مکمل شاعری کو فیضؔ کی شاعری (تشریح، تجزیہ، تبصرہ) کا عنوان دیا۔ اس مضمون میں انھوں نے فیضؔ کی شاعری پر دیگر مشرق و مغربی شعراء کی جو چھاپ پڑی ہے انھیں نہایت دیانت داری سے روشن کیا۔ ان نامور شعراء میں میرؔ ہو کہ غالبؔ، انیسؔ ہو کہ اقبالؔ، حافظؔ ہو کہ خسروؔ، ابوالفیضؔ ہو کہ ابونواسؔ یا پھر براوننگ ہو کہ کیٹس یا شیلے ہو کہ ہارڈی قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے فیضؔ کے کلام کا بغور مطالعہ کیا اور اس کی روشنی میں یہ رائے دی کہ "فیضؔ نے صرف خارجی اثرات کو منظوم نہیں کیا بلکہ ان تجربوں اور مشاہدوں سے پیدا ہونے والے داخلی اور قلبی جذبات کو نظم کیا ہے جس کا اثر تند و تیز ہونے کے ساتھ ساتھ دیرپا اور بیدار رہا۔ فیضؔ کا یہی تخلیقی عمل انھیں ایک خاص مقام اور ایک خاص لہجہ عطا کرتا ہے۔ فیضؔ کے کلام میں افسردگی نہیں آرزو اور جستجو ہے۔ ان کی نظم ہو کہ غزل یا قطعہ ان سب میں جمال اور جلال کی آمیزش سے زندگی کے مسائل کی آرائش موجود ہے۔"

اُردو غزل کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ کچھ نے اسے گلے لگایا تو کسی نے اس کی گردن زنی کی وکالت کی اس کے باوجود غزل نے خود کو سنبھالا اور پروان چڑھایا۔ ترقی پسند تحریک نے نظموں کا کچھ ایسا جال بُن رکھا تھا کہ غزل کنارے ہوگئی تھی۔ اس تحریک کے بیشتر شعراء نے جدید نظمیں لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جو بات نظم میں ہے وہ غزل میں نہیں لیکن ترقی پسند شعراء، شرماتے لجاتے ہی سہی دو چار غزلیں لکھ لیا کرتے تھے کیوں کہ غزل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان شعراء میں جذبیؔ اور مجروحؔ نے غزل کو گلے لگایا اور یہ ثابت کیا کہ نظریہ اپنی جگہ اور غزل کی شان و شوکت اپنی جگہ۔ فیضؔ یوں تو نظموں کے شاعر تھے لیکن انھوں نے بھی غزلیں کہیں اور خوب کہیں۔ فیضؔ کی غزل کا ئنات اسّی بیاسی تک محدود ہے لیکن نقادوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی ''فیضؔ کی غزل کا مقام'' کے عنوان سے ان کی غزل کائنات کے حدود واربعہ متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کلاسکیت، رومانیت اور جدید غزل کی روشنی میں فیضؔ کے کلام کو چکھا اور پرکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''فیضؔ نے پرانے ساغروں میں نئی شراب پیش کی یعنی قدیم روایتی ہئیتی سانچوں اور علامتوں میں جدید موضوعات اور نئی حسّاسیت کو داخل کیا۔ فیضؔ نے غزل کو دوسرے ترقی پسند شعرا کی طرح متروک اور مسترد نہیں کیا بلکہ اسے نیا شگفتہ لہجہ دے کر عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیضؔ کی شاعری میں نظم کی طرح غزل بھی بڑی دلکش اور جاندار نُمایاں ہوگئی۔ فیضؔ کی شاعری نے اپنے عہد اور آیندہ آنے والے عہد کو ایک نمایاں جدید موثّر لہجہ دیا ہے۔ فیضؔ کے لہجے نے انسانی ذہن اور تہذیب و طریقِ شاعری میں جدید راہیں روشن کی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بیسویں صدی اور آج کی صدی کا دور اقبالؔ کے بعد فیضؔ کا دور ہی مانا جائے گا۔'' (ص:135)

ڈاکٹر تقی عابدی نے غزل کے علاوہ فیضؔ کی نظموں پر سیر حاصل تبصرہ اپنے مضمون ''فیضؔ کی نظم کی وسعتیں'' میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ تقی عابدی نے فیضؔ کے کلام میں

غلطیاں اور اسقام، میں دیانت داری کے ساتھ کلامِ فیضؔ کی کمزوریوں کو بیان کیا ہے۔ فیضؔ کی مختلف تراکیب واستعاروں کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ لفظی اور معنوی سطح پر ان میں کچھ غلط ہیں اور کچھ میں سقم ہے جیسے محبت مانگنا، شیرازۂ اسباب، شفق کی راکھ، لہکے ہوئے ایام، درد کا چاند، بے نیلِ مرام وغیرہ تراکیب مبہم ہیں اور ناپید کا قافیہ تاکید، عید وغیرہ پر اعتراض اپنی جگہ درست ہے۔ مختلف نقادوں کی جانب سے اٹھائے گئے کلامِ فیضؔ پر سوالات کا بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے جائزہ لیا ہے اور نہایت غیر جانب داری سے کسی کے اعتراض کو رد کیا ہے تو کسی کی توثیق کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''فیضؔ ایک بڑے شاعر تھے لیکن عظیم شاعر نہ تھے جن سے کوئی دبستان منسوب ہو۔ فیض احمد فیضؔ سے مربوط چند جلسوں میں اور کچھ تحریروں میں ''فیضیات'' کی اصطلاح سننے اور پڑھنے میں آئی۔ اگر یہاں فیضیات سے مراد فیضؔ کے فن اور شخصیت پر بات چیت ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر اس کا مطلب کوئی شاعری کا دبستان ہے تو یہ بات صحیح نہیں۔''

عصرِ حاضر کی سب سے بڑی دین ''تنہائی اور اس کا احساس'' ہے۔ آج ساری دُنیا گلوبل ولیج میں تبدیل ہوگئی ہے۔ معلومات اور آگہی کے بے شمار ذرائع میسر ہیں مگر ''تنہائی'' انسانی زندگی کا المیہ ہے۔ موبائل اور کمپیوٹر میں وہ اس قدر غرق ہے کہ وہ ساری دُنیا پر نظر رکھتا ہے مگر ذاتی طور پر وہ تنہائی کا شکار ہے اور یہ تنہائی ایک بین الاقوامی نفسیاتی مرض بن گیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے فیضؔ کی دولتِ تنہائی پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فیضؔ کی تنہائی میں خاص قسم کی سرشاری ہے وہ اس خلوت میں تصورِ جاناں اور غمِ دوراں کے درد کی لذت سے ہمکنار معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے فیضؔ کی کچھ نظموں سے احساسِ تنہائی اور اس کے کرب کو پیش کیا ہے۔ فیضؔ کی مشہور نظم ''تنہائی'' کا شمار اُردو کی ایک بہترین نظم میں ہوتا ہے۔ نو مصرعوں والی اس نظم میں تنہائی کے جو مختلف رنگ وروپ دکھائے گئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ نظم کے آخری دو مصرعے تنہائی اور احساسِ تنہائی کا نقطۂ عروج معلوم ہوتے ہیں۔

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

فیضؔ کی نظم ''تنہائی'' پر ڈاکٹر تقی عابدی نے نہایت بلیغ تبصرہ فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں:

یہاں دراصل خود شاعر کی قلبی واردات کا خارجی اظہار اور ابلاغ ہے۔
اس نو مصرعوں کی نظم میں مُکالمہ بندی، منظر نگاری اور خوابنا کی Dreaming ہے۔ دل اور خیال کی باہمی گفتگو خارجی ماحول میں نظم کا محور بنی ہوئی ہے۔ اس پوری نظم میں صنعتِ ایہام وابہام سے استفادہ کیا گیا ہے۔

چناں چہ ایک طرف غمِ جاناں میں معشوق کا عاشق کو انتظار ہے جو تصُورات کے ناصری در و پیکر سے محوِ سُخن ہے کہ رات گزر چکی ہے، اب کھویا ہوا معشوق نہیں آسکتا۔ فیضؔ نے آخری دو مصرعوں میں اپنے کھوئے ہوئے معشوق کے وصل کی خواہش کے کواڑوں کو مقفل کرنے کی تلقین کر لی۔ اس نظم کا دوسرا رخ کسی غمِ دوراں کی ستم رسیدہ فلک دریدہ وہ عورت ہے جو اپنا پیٹ پالنے کے لیے اپنا جسم بیچتی ہے اور اسے گاہک کا انتظار ہے۔ یہ نظم غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کا احساس لیے ہوئے ہے اور رات کی منظر نگاری نے اس میں حواسِ خمسہ کی قوتوں سے فائدہ اٹھا کر مرقّع بنا دیا۔ اس نظم میں مکالمہ نگاری روزمرہ میں اس طرح ہے جیسے کوئی بات کر رہا ہے۔'' (ص:296)

پوری کتاب ڈاکٹر تقی عابدی کی تخلیقی سوچ کا مظہر ہے۔ انھوں نے اپنے طور پر جو عنوانات طے کیے ہیں وہ ان کا تخلیقی اپروچ ہے۔ ''فیضؔ پر فیضؔ کا ریویو'' ایک دلچسپ مضمون ہے جس میں فیضؔ کی شاعری کے متعلق خود فیضؔ کے ان اقوال و بیانات کو یکجا کیا گیا ہے جو مختلف خطوط اور انٹرویوز میں بیان کیے گئے ہیں۔ فیضؔ کی شاعری کے جمالیاتی پیکر کو انھوں نے مضمون ''فیضؔ'' ''مصورِ نقوشِ قد و خالِ حسن'' میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے فیضؔ کی مختلف نظموں کے جمالیاتی پیکر کو تلاشا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی، فیضؔ کے ادبی مقام و مرتبہ کے تعین کرنے کے لیے دیگر کئی شعراء اور ان کے کلام کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ جیسے فیضؔ اور اختر شیرانیؔ، جوشؔ اور فیضؔ، فیضؔ اور

مصطفیٰ زیدی، فیضؔ اور افتخار عارف، فیضؔ اور ایرانی انقلاب حتیٰ کہ فیضؔ نے جن جن کتابوں سے روشنی حاصل کی ہے ان پر بھی ایک بھرپور مضمون تحریر کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ فیضؔ کی خطوط نگاری، فیضؔ کے لطیفے، فیضؔ کے 72 نشتر، حتیٰ کہ فیضؔ پر مرتبہ کتب و رسائل اور فیضؔ پر مرتبہ مضامین کے ذخیرے کو بھی شاملِ تصنیف کر کے ''فیضؔ فہمی'' کو فیض احمد فیضؔ پر ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا بنا دیا ہے۔ ابھی گزشتہ ہفتے پاکستان سے انھوں نے اپنی نئی کتاب ''باقیات و نادراتِ فیض احمد فیضؔ'' کی رسمِ اجرا انجام دی ہے۔ فیضؔ فیسٹول کے موقع پر اس بہترین کتاب کی رونمائی پر میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں۔ ''فیضؔ شناسی'' اور ''فیضؔ فہمی'' کے بعد ''باقیات و نادراتِ فیض احمد فیضؔ'' کی پیش کشی اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی کو فیض احمد فیضؔ سے کس قدر لگاؤ اور سچی محبت ہے اور ان کے کلام کو بین الاقوامی سطح پر پیش کرنے کے لیے وہ کیا کیا کچھ کر رہے ہیں۔ فیضؔ کو ڈاکٹر تقی عابدی جیسا سچا محقق، مخلص نقاد اور غیر جانبدار مبصر میسر آیا ہے جو فیضؔ کے چاہنے والوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔

''فیضؔ فہمی'' کی ضخامت اور معیار و مرتبہ کے لحاظ سے قارئین کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ نہایت خشوع و خضوع سے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ ذرا سی غفلت و لاپرواہی سے کتاب ہاتھوں سے چھوٹ جائے تو پیروں کی انگلیوں کا فریکچر ہونا لازم ہے۔

ڈاکٹر جاؤ لیے، کرتی مالنی وِٹھل راؤ
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو
ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد

فیض فہمی ایک تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر تقی عابدی کا نام سید تقی حسن عابدی ہے۔ تقی عابدی قلمی نام ہے۔ اور تقی تخلص ہے۔ ان کے والد سید سبط نبی عابدی منصف تھے۔ والدہ کا نام سنجیدہ بیگم تھا۔ موصوف دہلی میں یکم مارچ 1952ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور آئی ایس سی (ISC) کے بعد حیدرآباد میں ایم بی بی ایس (MBBS) اور برطانیہ سے (MS) کیا۔ ایف سی اے پی یونائیٹڈ اسٹیٹ امریکہ سے اور ایف آر سی پی کینیڈا سے ہوئے طبابت پیشہ ہونے کی وجہ سے بہت مصروف رہتے تھے۔

فیض فہمی ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض کی سو سالہ سالگرہ پر اکیسویں صدی کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر تصنیف کی ہے "فیض فہمی" ان کی تحقیق اور تنقید کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس میں ان کے بذات خود لکھے گئے 42 مضامین شامل ہیں۔ ان میں فیض کی شخصیت اور ان کی تصنیف کے ان گوشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جن پر غالباً کام کم ہوا تھا۔

"فیض فہمی" میں فیض کی غزل گوئی پر 20 مضامین کا ڈاکٹر تقی عابدی نے انتخاب کیا ہے۔ ان مضامین میں فیض کی غزلوں کے الگ الگ نظریوں کو پیش کیا گیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر تاراچرن رستوگی اور کشمیری لال ذاکر وغیرہ اہم نقادوں کے مضامین ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون "فیض کی کلاسیکی غزل" یہ مضمون پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ فیض کی شاعری میں ترقی پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور کلاسیکل غزل گو میں انفرادی اہمیت رکھتے ہیں۔ فیض نے کلاسیکی اصطلاحوں کو دوبارہ زندہ کیا۔ اور ایک نئے

0305 6406067 PDF Book Company

پیرایہ میں ان کو اپنی غزلوں میں برتا ہے اور انھیں دوبارہ مقبول کر دیا ہے۔ کیوں کہ اس دور میں یہ الفاظ ترک ہو چکے تھے۔ دار و رسن، قفس و نشیمن جیسے الفاظ پر ایک پورا رسومیاتی نظام ٹکا ہوا ہے۔ ایسے الفاظ کو فیض نے دوبارہ زندہ کیا ہے۔

فیضؔ نے جس طرح سے ان الفاظ کو استعمال کیا اپنے معنی کے اعتبار سے معتبر ہو گئے ہیں۔ فیضؔ کی غزل میں رموز و علائم کا نظام کلاسیکی شاعری کے تخلیقی شعور کی دین ہے۔ قفس، آبشار، چمن، آتش، گل، صیاد، گلچیں، صبا، باغبان، بلبل، بہار، خزاں، چارہ گر، قاتل، ناصح، محتسب، شیخ، منصور و قیس، اس طرح کے دیگر علامتی اظہار کے وسیلے ان کی غزل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ فیضؔ نے علامتوں، اشاروں، کنایوں، کی ایک نئی راہ نکالی ہے۔ ان کے یہاں تقریباً تمام علامتیں اور تمام اشارے پرانے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر انھوں نے بڑی ہی فن کاری کے ساتھ ان کے مفہوم کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ فیضؔ عموماً وہی اشارے اور علامتیں استعمال کرتے ہیں جن کا تعلق ماضی سے ہے۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ایک نئے مفہوم اور ایک نئے معنی کا لبادہ اڑھا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب بیان اور لہجے میں تمام تر قدامت کے باوجود نئے پن کا احساس زندہ ہے۔

ان کے اشعار کو پڑھنے کے بعد ہمیں واضح طور پر یہ بات پتہ چلتی ہے۔ فیضؔ کی غزلوں میں عشقیہ جذبات و احساسات اور سیاسی، سماجی شعور کی ترجمانی کے علاوہ سوز و گداز کی ایک ہلکی اور مدھم لے بھی نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں کو جب سوز و گداز اور درد بھری شاعری کے طور پر دیکھتے ہیں تو ہمیں مایوسی نہیں ہوتی بلکہ ان کے درد اور غم کے ساتھ آنسوؤں میں جگمگاتی ہوئی ایک نئی امید نظر آتی ہے۔ فیضؔ کی غزلیں سوز و گداز سے معمور ہوتی ہیں۔ ان میں غم کا پہلو ہر حال میں نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن ایک سوز و گداز، انفرادی اور اجتماعی رنج و غم کے احساسات اور قدم قدم پر مصیبتوں کے باوجود ان کے یہاں ایک امید کا امکان نظر آتا ہے۔ جو تکلیف دہ اور مشکل ترین مرحلوں میں امید کا حوصلہ دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ ان سچائیوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ جس کی زندگی اور وقت کو ضرورت ہے۔ خود ضبطی کے ساتھ بلند حوصلہ فیضؔ کا ایک نمایاں وصف ہے۔ اس سے ان کی شاعری میں انفرادیت پیدا ہوئی ہے۔

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں[1]

فیضؔ تاریکی کی اونچی اونچی دیواروں کے اس پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ آنے والے کل کے انتظار میں اپنے آج کے غم اور درد کو بھول جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اگر کہیں انھیں امید کی کوئی شمع بجھتی ہوئی نظر آتی تو انھوں نے فوراً دوسری شمع پہلے سے زیادہ اعتماد اور یقین کے ساتھ جلائی ہے۔ نئے حوصلے اور امید کی بھرپور نمائندگی کے اشعار:

بزمِ خیال میں تیرے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی[2]

•••

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں[3]

فیضؔ مشکل اور نامساعد حالات میں بھی ہمت اور حوصلہ کا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے۔ اور ہر ناکامی اور نااُمیدی کے بعد ایک نئی امید کے ساتھ اپنی جیت کا انتظار کرتے تھے۔ یہ امید بھرا لہجہ فیضؔ کی غزلوں کے ساتھ ان کی پوری شاعری میں صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ غزل کا بنیادی موضوع زمانہ قدیم سے عشق اور عاشقی رہا ہے۔ اور یہ ایک ایسا موضوع ہے جو تفصیل اور تشریح کا محتاج نہیں۔ اس میں حسن، لطف، رعنائی اس وقت آتی ہے جب اس کو رمزیہ انداز میں بیان کیا جائے۔ غزل دریا کو کوزے میں بند کرنے کا عمل کہلاتا ہے۔ جس میں شاعر کو کم سے کم جملوں میں اپنا اظہار مدّعا کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل گو شاعر کو رمزیت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی بات بلواسطہ انداز میں نہیں بتا سکتا۔ فیض کی شاعری میں رمزیت اپنے درجہ کمال تک پہنچی ہے۔ اور یہی رمزیہ پہلو ان کی عشقیہ اور سیاسی شاعری کو جاندار بنا دیتا ہے۔

زخم چھلکا کوئی، یا کوئی گل کھلا
اشک امڈے کے ابرِ بہار آ گیا[4]

فیضؔ کی غزلوں کی ایک اہم خصوصیت اس کا غیر محسوس تسلسل ہے۔ اس کی حیثیت

یوں تو کسی خیال کے لیے مسلسل اور مربوط بیان کے لیے مفید اور موزوں نہیں ہے۔ تسلسل کے وجہ سے غزل کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔

ہم پر ورش لوح و قلم کرتے رہیں گے

•••

اسباب غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے

ویرانی، دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

•••

ہاں تلخی ایام ابھی اور بڑھے گی[5]

''سروادیِ سینا'' کی غزلوں میں تسلسل کا یہ حُسن اور بھی زیادہ نکھر گیا ہے۔ فیض کی غزلوں کا ایک امتیازی وصف ان میں طنز کی شدت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل میں امکانات کی ایک وسیع دُنیا ہے۔ فیض نے بھی اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے کلام میں طنز کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ فیض کی غزلوں میں طنزیہ اشعار بکثرت موجود ہیں۔ ان میں زندگی کا حسن نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ایک طرف ادبی اور سیاسی محاذ، دوسری جانب جیل کی زندگی، امریت اور جمہوریت کشی کا ماحول کھل کر بات کہنے پر پابندی، یہ سب حالات ایسے تھے جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں اور بلخصوص غزلوں میں طنزیہ اشعار جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف

مہر اس کی ہے میزان بہ دستِ دگراں ہے[6]

اس طرح طنز کی نشتریت کے ساتھ ہی قاری کو نیا راستہ بناتے ہوئے عمل کو پورا کرنے کی سعی پیدا ہوتی ہے۔ ان اشعار کے طنز سے قاری کو اپنی غلطیوں کا اعتراف ہوتا ہے۔ تغزل کی سحر کاری غزل کی فضاء کے لیے چاشنی کا کام کرتی ہے۔ سیاسی مضامین کا بیان ہو یا ذاتی احساسات وجذبات ہر جگہ وہ تغزل کا سہارا لیتے ہیں اس طرح وہ اپنے قاری سے ذہنی طور پر بہت قریب ہو جاتے ہیں۔

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں

جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں[7]

فیضؔ نے سیاسی، معاشرتی، انقلابی مضمون میں بھی تغزل سے کام لیا ہے۔ اگر فیضؔ کی سیاسی شاعری میں تغزل کی سرمستی وسحر کاری نہ ہوتی تو شاید وہ اسی قدر دلکش اور مسحور کن نہ ہوتی۔ تغزل کے اس عظیم سرمائے نے ان کی غزلوں کو اُردو غزل میں ایک مقام دلوایا ہے۔ چناں چہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فیضؔ کی غزلوں میں وہ تمام عناصر، باریکیاں پائی جاتی ہیں جو غزل کی صنف کو معیاری بنانے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فیضؔ ایک غزل گو شاعر ہیں۔

فیضؔ کی ادبی خدمات

فیضؔ کی شاعری کے تقریباً آٹھ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ دو کلیات کے علاوہ نثری مضامین کے سات مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ انھوں نے پانچ ڈرامے تخلیق کیے ہیں اور ساتھ ہی دو فلمی گیت لکھے ہیں۔ فیضؔ کی شاعری کا آغاز 1928ء میں اخوان الصفاء کے مشاعرے میں پہلے شعر سے ہوا۔

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا[8]

اس شعر میں اور اس کی بعد کی شاعری میں ایک نوجوان انسان کے دل کی آرزو، خواہش، تڑپ اور عنفوانِ شباب کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ''نقشِ فریادی'' میں ابتدائی دور کی شاعری شامل ہے۔ اس دور کی شاعری میں رومان پرستی کی جھلک صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ فنی اعتبار سے اس میں پختگی کا اظہار نہیں ہے۔ فیضؔ درد وغم کے ماحول میں جھلسے ہوئے ہیں۔ لیکن تپ کر کندن بن گئے ہیں۔ اس آگ نے ان کا وجود ختم نہیں کیا بلکہ ان کو نایاب کر دیا۔ انھیں زندگی اور اس کے مسائل کو سلجھانے سے محبت ہے۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''فیضؔ کو آتش خانوں کی مقدس آنچ ملی ہے، مگر اس نے انھیں جھلسایا نہیں بلکہ ان کی شخصیت کو توانائی اور ان کی شاعری کو تب وتاب عطا کیا ہے۔''[9]

فیضؔ کے کلام میں حسن کاری، نغمگی اور شیرینی ہمیں میٹھی نیند نہیں عطا کرتی۔ بلکہ ہم کو مکمل طور پر جگا دیتی ہے۔ یہ چپکے چپکے ہمیں ایک خاموش عزم عطا کرتی ہے فیضؔ کی لے

میں ایک کشش ہے۔ جو قاری کو مسحور کرتی ہے۔ اور سوچ کی ایک نیا فکری زاویہ عطا کرتی ہے۔ قاری کو اپنے قول و فعل کے لیے جھنجھوڑتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک نئی کیفیت اور نیا رچاؤ ہم کو نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں (Direct) کم اور (oblg) زیادہ ہے۔ فیضؔ حالاں کہ رمز کے شاعر ہیں مگر اس کے باوجود ان کا ذہن اتنا مرتب اور فنی شعور اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ وہ نہایت واضح طور پر اپنی بات کہہ دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فیضؔ اپنا الگ اسلوب اور طرزِ ادا رکھتے ہیں۔ ان کا دھیما دھیما سلگتا ہوا لہجہ ایک اداسی کے ساتھ سامنے تو آتا ہے۔ لیکن عوام کے جذبات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ فیضؔ ترقی پسند شاعر تھے ترقی پسندی سے جڑنے کے بعد بھی ان کی شاعری میں نعرہ بازی کہیں نظر نہیں آتی۔ بے شک انھوں نے اپنی شاعری کے لیے ایک منفرد انداز اپنایا ہے۔ مگر اس کو خطیبانہ ہونے سے بچائے رکھا۔ اگر ان کے کلام کے مجموعوں کا مختصراً جائزہ لیا جائے تو انھوں نے اُردو ادب میں اپنی نادر تشبیہات اور استعارات سے گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ شاعری ہو یا نثر ہو ان کا لکھنے کا انداز منفرد ہے۔ ''نقش فریادی'' میں ایک رومان پرور نوجوان کے دلی جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔ لیکن اس میں بھی فیض کی آرٹسٹک دُنیا نظر آتی ہے۔ ''نقش فریادی'' کی نظمیں ''سوچ'' چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز، کُتے، سیاسی لیڈر کے نام فیضؔ کی ایسی نظمیں ہیں جو بیانیہ اور خطیب کھردرے لہجہ کا پتہ دیتی ہیں۔ لہجے کی تشنگی، گھلاوٹ، امیجری، بلیغ تراکیب، تشبیہوں اور استعاروں سے فیض کو ایک الگ مقام دلاتی ہیں۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں۔ وصل کی راحت کے سوٰا

اس شعر میں فیضؔ کی رومان پروری کے ساتھ ایک نیا درد و غم بھی دکھائی دیتا ہے۔

بقول عزیز احمد:

''موضوعِ سخن'، فیضؔ کی مخصوص تراکیب اور استعاروں سے بجی نظم ہے۔
جس کے یہ دو مصرعے عزیز احمد کے مطابق 1935ء بعد کی پوری نسل کا ذہنی میلان بن گئے۔

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے! جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں[11]

''نقشِ فریادی'' کے بعد فیضؔ کو اسیری کے دوران ذاتی زندگی چھوڑ کر نہایت ہی تکلیف اور غم کی زندگی گزارنا ضروری ہوگیا۔ قید کے چار سالوں کے دوران ان کی شاعری میں ایک طرح کی نغمگی پیدا ہوگئی۔ اسیری کے دوران لکھی گئی شاعری کی بہت زیادہ پذیرائی ہوئی۔ یہاں تک کہا گیا کہ اگر فیضؔ کو قید و بند کی صعوبتیں نہ جھیلنا پڑتی تو دستِ صبا میں یہ نکھار نہ پیدا ہوتا۔ ''دو آوازیں'' فیضؔ کی ایک معرکہ آزاد نظم ہے۔ یہ ایک طرح سے امید، مایوسی، شکست، اندھیرا اور اجالے کے درمیان مکالمہ نظر آتا ہے۔ ''نثار میں تیری گلیوں پر'' حب الوطنی کا درس ہے تو ''شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں'' اپنی حسن کاری سے پُر ہے۔ اس کے علاوہ ''زنداں کی ایک شام'' اور ''زنداں کی ایک صبح'' منظر نگاری کا معجزہ کہا جا سکتی ہیں۔

فیضؔ کا تیسرا مجموعہ ''زنداں نامہ''، ''دستِ صبا'' کی توسیع دکھائی دیتا ہے۔ اس کی تمام تخلیقات قید و بند کی تحریریں ہیں۔ ''ملاقات، اے روشنیوں کے شہر، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، اس مجموعے کی نظمیں ہیں۔ ملاقات ایک طویل اور علامتی نظم ہے۔ اس نظم میں یقین اعتماد، امید کی سچائی، کو فیضؔ مختلف خوب صورت الفاظ کے استعمال سے شاہکار بنا دیتے ہیں۔

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں[12]
(نظم ملاقات)

''نظم ملاقات'' کی علامتیں ان کی فنکاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس طرح ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ ایک علامتی نظم ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ فیضؔ نے ایک حادثہ کو بڑی چابکدستی سے قلم بند کر کے ایک نظم کی شکل میں

ڈھال دیا ہے۔ فیضؔ کے چوتھے مجموعے کا عنوان غالب کی تراشی ہوئی ترکیب ''دستِ تہہ سنگ'' ہے۔ ''دستِ تہہ سنگ'' میں نظمیں، غزلیں اور قطعات موجود ہیں۔ لیکن دستِ تہہ سنگ کی نظمیں غزلوں کے مقابلہ پھیکی محسوس ہوتی ہیں۔ سفرنامہ، پابجولا چلو، قید، تنہائی، ملاقات مری، رنگ ہے دل کا میرے، پاس رہو، اچھی نظمیں ہیں۔ لیکن ان میں تعمیری حسن کا فقدان پایا جاتا ہے۔ جو ان کے پچھلے مجموعوں کی نظموں کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

''سرِ وادیٔ سینا'' فیضؔ کا آخری مجموعہ کلام ہے۔ اس میں لہو کا سراغ، سرِ وادیٔ سینا، دعا، جیسی نظموں کو فیضؔ کی کامیابی کہا جاسکتا ہے۔ شامِ شہر یاراں، میرے دل مرے مسافر، سارے سخن ہمارے، (کلیات) ''نسخہ ہائے وفا کلیات'' کی شکل میں ہیں۔

فیضؔ کی نثری تخلیقات میں میزان (تنقیدی مضامین) صلیبیں میرے دریچے میں (خطوط)، متاعِ لوح و قلم، مہہ و سالِ آشنائی، انتخاب پیامِ مشرق، سفرنامہ کیوبا، ہماری قومی ثقافت وغیرہ ہیں۔ فیضؔ کے مضامین کا مجموعہ میزان میں ان کا اسلوب منفرد ہے۔ اس میں فیضؔ کے فکری زاویے صاف دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی اہمیت اس کے دیباچہ سے واضح ہو جاتی ہے۔ یہ مضامین ایک سنجیدہ اور ذمہ دار انسان کے ذہن کی پیداورا ہیں۔ اس میں ادب، معاشرے اور زندگی کے کئی مسائل پر تبصرہ ملتا ہے۔ ان مضامین کی تخلیق سے پہلے مصنف نے اس موضوع کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس پر غور وخوض کے بعد ہی اس کی تخلیق کی ہے۔ بقول سحر انصاری:

> ''روانی معانی کی موزوں نشست کا مسئلہ ہے۔ الفاظ کے خارجی تسلسل کی پیدائش نہیں، ان کی داخلی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔[۱۳]''

میزان میں فیضؔ نے تنقیدی اصطلاحات، فنی تخلیق اور تخیل اور خیالات کی شاعری جیسے موضوعات میں تخلیقی سرگرمیوں کے بعض بنیادی مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ میزان میں فیضؔ کی سادہ اور پرکشش نثر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ''صلیبیں میرے دریچہ میں'' ایک خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس میں فیضؔ کے اسلوب کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے۔ جب ہم فیضؔ کے اسلوب کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں صاف سلیس زبان آسان الفاظ کا استعمال ملتا ہے جو کہ ہر خاص و عام کی سمجھ میں آئے۔ فیض کا نظریہ یہی رہا ہے کہ نثر ایسی ہو جو بڑے بڑے علماء

کے لیے نہ ہو بلکہ تمام انسانوں کے لیے ہو۔ صلیبیں میرے دریچے میں جیل کا منظر:

"آج کل پھر جیل کی نیم بے ہوشی کا سا عالم ہے۔ دن جیسے سر کے اوپر سے گذر رہے ہیں۔ اور اکثر یاد نہیں رہتا کہ ہفتے کا کون سا دن اور مہینے کی کون سی تاریخ ہے۔ خیر یہ کیفیت بھی گذر جائے گی۔"[41]

اقتباس سے فیضؔ کی نثر کی کشش کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایک مشینی گفتگو کے بجائے ان کی تحریری اور تقریر میں سیدھے سادھے اور براہِ راست الفاظ ہوتے ہیں۔ جن میں زندگی کی حرارت، توانائی، روزمرہ تجربات اور مشاہدات کا کرب ملتا ہے۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جیسے اس میں ان کا تجربہ اتنا مکمل ہے کہ وہ اصطلاحوں سے مرعوب کرنے یا کتابی علم کے بل بوتے پر تقریر کرنے کے بجائے افہام اور تفہیم کی فضاء میں لکھتے ہیں اور بات کرتے ہیں۔ کسی بھی موضوع پر مضمون ہو اس کا آغاز کسی غیر ضروری تمہید کے بغیر ایک ایسے جملے سے کرتے ہیں جس کے بعد نفسِ موضوع شروع ہی سے قاری کے خیال کا دامن تھام لیتا ہے۔

فیضؔ کی شاعری صداقت پر مبنی ہے۔ ان کے قول و عمل میں مطابقت ہے۔ ان کا کلام ان کے حقیقی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اشتراکی نظریات کے قائل ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی قدروں کو کبھی نہیں بھولا نہ تو فیضؔ نے قدیم روایات سے ناتا توڑا، اور نہ ہی ترقی پسندی سے جڑنے کے بعد شعر کی نغمگی اور شیرینی کھو بیٹھے۔ وہ بات کے دھنی اور انسانیت کے پیامبر ہیں اور میں کے بجائے ہم کے لیے زیادہ باعمل نظر آتے ہیں۔ فیضؔ نے اُردو ادب میں اپنے کلام سے جو اضافہ کیا ہے وہ اہم ہے سو سال ہونے کے بعد بھی اس کی اہمیت ماند نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ ہر دن کے ساتھ اس کی چمک اور تیز ہوتی نظر آتی ہے۔ فیضؔ ایک اچھے نثر نگار ہیں اپنی دلکش اور سادہ پر کشش نثر کے ساتھ وہ اپنی انفرادیت منوانے میں کامیاب ہیں۔ فیضؔ کی شاعری ایک روشن مینار کا کام انجام دیتی ہے اور اُردو داں طبقہ اس روشن مینار سے فیض یاب ہوتا آ رہا ہے اور مستقبل میں فیض یاب ہوتا رہے گا۔

حواشی:

۱۔ ''فیض کی غزلوں کا امتیازی وصف: فیض ایک جائزہ'' اشفاق حسین [''فیض فہمی''، تقی عابدی، ص:158]

۲۔ ''معتدل گرمی گفتار کا غزل گو، سلیم اختر'' [فیض فہمی، ڈاکٹر تقی عابدی، ص: 376]

۳۔ ''فیض کی شاعری'' [فیض فہمی، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:106]

۴۔ ''فیض کی غزلوں کا امتیازی وصف: فیض ایک جائزہ'' اشفاق حسین [''فیض فہمی''، تقی عابدی، ص:162]

۵۔ ''فیض احمد فیض کی غزل گوئی ضیاء الحسن'' [''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:234]

۶۔ ''فیض کی غزلوں کا امتیازی وصف: فیض ایک جائزہ'' اشفاق حسین [''فیض فہمی''، تقی عابدی، ص:165]

۷۔ ''فیض احمد فیض (شخصیت اور شاعری) نسیم احمد عباسی'' [''فیض فہمی'': تقی عابدی، ص:183]

۸۔ ''فیض کا زندگی نامہ'' [''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:19]

۹۔ ''فیض سے فیض تک: آل احمد سرور'' [''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:149]

۱۰۔ ''فیض کی نظم: صدیق الرحمٰن قدوائی'' [''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:155]

۱۱۔ ''فیض احمد فیض (شخصیت اور شاعری) نسیم احمد عباسی'' [''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:382]

۱۲۔ ''زنداں نامہ کا سرسری جائزہ: جعفر علی خاں اثر لکھنوی'' [''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:175]

۱۳۔ ''صلیبیں میرے دریچے میں'' ایک مطالعہ: اشفاق احمد اعظمی'' [''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:1029]

۱۴۔ ''فیض ایک نثر نگار: سحر انصاری'' [''فیض فہمی''، ڈاکٹر تقی عابدی، ص:655]

میر ہاشم
اورنگ آباد، مہاراشٹر

فیض فہمی کے خدوخال

راہِ قیس وسنتِ منصور کے شاعر فیض احمد فیض کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر یہ غیر معمولی تحفہ، ڈاکٹر تقی عابدی نے، اُردو زبان وادب کو پیش کیا ہے جس کے لیے اُردو کے قاری کو ان کی خدمت میں مبارک باد پیش کرنی چاہیے بلکہ مشکور بھی ہونا چاہیے۔

سید تقی حسن عابدی جن کا ادبی نام صرف عابدی ہے، دہلی میں پیدا ہوئے، حیدر آباد (انڈیا) سے ایم بی بی ایس کیا، برطانیہ سے ایم ایس، امریکہ سے ایف سی اے پی، اور کینیڈا سے آر سی پی۔ کینیڈا میں اپنے پیشے سے نباہ کر رہے ہیں لیکن اُن کا قیام ہندوستان، ایران، برطانیہ اور امریکہ میں بھی رہا کرتا ہے۔ گویا وہ اِس دھرتی کے ہر ملک کو اپنا ملک سمجھتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے مریضوں کا خیال رکھتے ہیں بلکہ اُردو زبان کی خیر و عافیت بھی ان کے پیش نظر رہتی ہے جس کا ثبوت نہ صرف ان کی ادبی سرگرمیاں نہیں بلکہ یہ ضخیم کتاب ''فیض فہمی'' بھی ہے۔ وہ کوئی پچاس کتابوں کے مصنف ہیں۔

اِس کتاب میں جس کی ضخامت (۱۴۲۴) صفحات کی ہے کوئی (۱۶۲) مضامین مختلف ادیبوں، شاعروں، نقادوں، دانش وروں اور فیض کے عقیدت مندوں کے ہیں۔ خود صاحبِ کتاب کے کوئی (۴۰) مضامین ہیں۔ (۱۶۲) تصاویر کتاب کی زینت ہیں۔ اس کتاب کا انتساب دور بینی کے ساتھ ہندوستان کے نقادِ ادب پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پاکستان کے ایک غیر معمولی اہم منفرد شاعر جناب افتخار عارف کے نام کیا گیا ہے۔ ایک طرح سے یہ انتساب بالواسطہ اُردو تنقید وشاعری کے نام بھی ہے اور ہندوستان، پاکستان کے نام بھی۔

اپنے مختصر پیش لفظ میں تقی عابدی کہتے ہیں کہ فیض کی شاعری کے طرزِ فغاں اور ان کی نثر کے طرز بیان پر کوئی سیر حاصل کام اب تک نہیں ہوا ہے ہیں، اسی خلا کو پُر کرنے کے

لیے انھوں نے یہ کتاب تالیف بھی کی ہے اور تصنیف بھی۔

ابتدا میں صاحب کتاب نے ''فیضؔ کا زندگی نامہ'' مرتب کیا ہے، جس میں ماں باپ، بھائی بہن، تاریخ و مقام کی تفصیل اور ضروری باتیں ہیں۔ فیضؔ کے والد خان بہادر سلطان محمد خاں بیرسٹر تھے اور دولتِ افغانستان کے سفیر بھی رہے۔ فیضؔ کی شادی لندن نژاد جرمن خاتون ایلس کیتھرین جارج سے ہوئی۔ شیخ عبداللہ نے سری نگر میں نکاح پڑھایا۔ فیضؔ کی والدہ نے ایلس کا نام ''کلثوم'' رکھا۔ ''دستِ صبا'' کا انتساب کلثوم کے نام سے ہے۔ مسلم لاء کی رو سے طلاق کا بنیادی حق مرد کو حاصل ہے۔ لیکن یہ حق بیوی کو، کورٹ کو، قاضی یا کسی بھی تیسرے شخص کو ڈیلی گیٹ کیا جاسکتا ہے، جسے ''طلاق تفویض'' کہا گیا ہے۔ مرد اپنا یہ حق تفویض نہیں کرتا۔ فیضؔ کی ایک غیر معمولی مثال ہے، انھوں نے یہ حق بیوی کو ڈیلی گیٹ کیا تھا۔ اس طرح فیضؔ نہ صرف ایک منفرد شاعر ہیں بلکہ ایک منفرد شوہر بھی تھے۔

اس ''زندگی نامہ'' میں امرتیا پریتم کا لیا ہوا انٹرویو کا وہ حصہ بھی ہے جو ایلس سے شادی کے بارے میں ہے۔ امرتیا نے پوچھا: ''یورپ اور پچھم کا یہ ملاپ کیسا رہا؟'' اس کے جواب میں ایلس نے کہا: ''دو مختلف علیحدہ علیحدہ سرزمینوں کے مرد و زن جب شادی کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مرد کے لیے عورت کے دیس میں رہنا آسان نہیں ہے لیکن عورت مرد کے دیس میں رہ سکتی ہے۔ نئی دھرتی، نئے ماحول کو اپنانے کی اس میں توانائی ہوتی ہے۔ مختلف تہذیب کے لوگوں کی شادی آسان بات نہیں ہے۔'' یہاں مغرب کے رہنے والے نوجوانوں کے لیے یہ ایک لمحۂ فکر ہے۔

فیضؔ کی شاعری، شخصیت، نثر نگاری وغیرہ پر کوئی سو (۱۰۰) کے قریب نقادوں، ادیبوں، شاعروں، دانش وروں اور متقدر ہستیوں نے مضامین لکھے ہیں۔ صاحب کتاب تقی عابدی نے فراقؔ کے مضمون ''اُردو میں عشقیہ شاعری'' سے یہ جملہ نقل کیا ہے۔

> ''فیضؔ نے ایک نیا مدرسۂ شاعری قائم کیا ہے۔ انھوں نے جس بصیرت افروز احساس وخلوص اور فنکارانہ چابکدستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کر کے پیش کیا ہے یہ اُردو شاعری میں ایک بالکل نئی چیز ہے، نئی اور قابل قدر بھی۔''

ایک جگہ ڈاکٹر عابدی رقم طراز ہیں: ''فیضؔ کے لہجے نے انسانی ذہن اور تہذیب و طریقِ شاعری میں جدید راہیں روشن کی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بیسویں صدی اور آج کی صدی کا دور اقبالؔ کے بعد فیضؔ کا دور ہی مانا جائے گا۔''

کسی نے فیضؔ سے کہا: ''میں آپ کو اقبالؔ سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔'' تو فیضؔ نے جواب دیا: ''نہیں بھائی ایسا نہیں ہے۔ اصل میں اٹھارویں صدی کا سب سے بڑا شاعر میرؔ ہے، انیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر غالبؔ اور بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر اقبالؔ ہے۔''

حیدرآباد کے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے ایک سوال کے جواب میں فیضؔ کا کہنا تھا۔ ''صرف ہندوستان اور پاکستان ہی کیا، اس دور میں دنیا کے کئی ممالک کی قدریں ایک سی ہیں، اس لیے آج کے فنکار کو علاقائی وابستگی سے بے تعلق ہو کر، قومی حدود سے نکل کر بین الاقوامی سطح پر کردار ادا کرنا چاہیے۔'' جدیدیت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں فیضؔ نے کہا: ''جدیدیت ایک قدم پیچھے ہے، ادب اور زندگی دونوں سے، جدید شاعری میں ابلاغ کی کمی ہے۔ جس کے باعث نفسیاتی طور پر ردعمل پیدا ہی نہیں ہوتا اور شعر، شعریت اور تاثیر سے عاری ہو جاتا ہے۔ جدید شاعری دراصل Non Poeticidiam کی شاعری ہے۔''

اُن ایک سو مضمون میں جو فیضؔ پر لکھے گئے ہیں بعض نقادوں نے خلوص کے ساتھ زبان کی بعض غلطیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور بعض کوتاہیوں کی طرف اشارے کیے ہیں، بعض نے ذہنی تحفظ کے ساتھ شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے بلاکم و کاست تمام مضامین کو شریکِ کتاب کیا ہے تاکہ فیضؔ فہمی کا ہر گوشہ روشن ہو جائے۔ البتہ جناب ظفر اقبال کا مضمون ''فیض احمد فیضؔ کی شاعری'' محلِ نظر ہے۔ اُن کے خیال میں ''فیضؔ کی شاعری اور شہرت نے شاعری کے مستقبل اور قاری دونوں کا راستہ روک رکھا ہے۔ اپنی تمام تر مقبولیت اور اہمیت کے باوجود فیضؔ کی شاعری یک پرتی ہے، گہرائی مفقود ہے۔ دریافت کا عمل اور حیرت کا عنصر جو اعلیٰ شاعری کی شرطِ اول ہے، فیضؔ نے دانستہ طور پر اپنی شاعری کو اس سے محروم رکھا ہے۔'' ظفر اقبال صاحب کو اس کا اختیار حاصل ہے وہ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کریں۔ فیضؔ ہی کیا، میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کو بھی تنقید سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا

جا سکتا۔ لیکن تنقید اور تنقیص میں فرق ہے۔

محض یہ کہہ دینا کہ شاعری یک پرتی ہے۔ گہرائی مفقود ہے، دریافت کا عمل اور حیرت کا عنصر نہیں ہے، تنقید نہیں کہلائی جاسکتی۔ فیضؔ کے پاس فکر کی توانائی، لہجے کی تازگی، خیال و نظر کی وسعت، مستقبل بینی، انسان دوستی اور غم ذات و کائنات، اور دیگر خوبیاں ہیں۔ جناب ظفر اقبال نے دانستہ طور پر ان سب سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ انھوں نے بقول حضرت جوشؔ ملیح آبادی ''لفظ رنگ و بُو کو نوکِ خار سے'' چھونے کا کام انجام دیا ہے۔ عابدی صاحب نے وسیع النظری کے ساتھ تمام مضامین کو شامل کیا ہے۔ انھوں نے ''فیض فہمی'' ثبوت دیا ہے۔ ''فیض پرستی'' کا نہیں۔

''فیض فہمی'' کا ایک باب ''فیض کے انٹرویوز'' کے عنوان سے ہے۔ انٹرویوز کوئی بیس (۲۰) سال پر محیط ہیں یعنی ۱۹۶۴ء سے ۱۹۸۴ء تک۔ انٹرویو لینے والے کوئی بیس (۲۰) دانشور، شاعر، ادیب و نقاد ہیں۔ سو صفحات پر مشتمل یہ انٹرویوز خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں اور ''فیض فہمی'' کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اس کے مطالعہ سے فیضؔ کے ذہن و دل میں جھانکنے، ان کے خیالات معلوم کرنے، ان کے نظریات سے واقف ہونے اور شاعری کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر سمجھنے میں بہت کارآمد ہیں۔ مذہب کے اثرات اور اس کی ادائیوں کے بارے میں فیضؔ نے کہا: ''مذہب کی روایتوں کا اظہار دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ ایک تو صوفیوں کا طریق اظہار ہے۔ اور دوسرا رسمی انداز ہے۔ حضرت رومیؔ میرے مرشد ہیں۔'' فیضؔ کی اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؔ کی طرح فیضؔ بھی رومیؔ سے متاثر تھے۔ حضرت اقبالؔ کا شعر ہے ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

اور

اِسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومیؔ کبھی پیچ و تابِ رازیؔ

مذہب کے تعلق سے ایک اور سوال کے جواب میں فیضؔ کا کہنا تھا کہ زندگی خدا ہی

نے پیدا کی ہے۔ ساری موجودات خدا ہی کی تخلیق ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں فیضؔ نے کہا: ''جب میں جیل میں تھا تو قیدیوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم دیتا تھا۔''

ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ جو لوگ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوتے ہیں اور جو کارل مارکس کی آکنا مک نظریات کے حامی ہیں یا جو کمیونسٹ پارٹی سے قربت رکھتے ہیں وہ سب کے سب دہریئے اور ملحد ہوتے ہیں۔ فیضؔ کے ظاہر کردہ خیالات سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جانا چاہیے۔

اچھی شاعری کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے؟ اس سوال کے جواب میں فیضؔ نے کہا کہ ''خدا کی دین ہے۔ یہ صلاحیت آدمی خود پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد نظر کی وسعت ہے اور دل کی گہرائی ہے کہ اس میں کتنی جگہ ہے۔ اگر آپ اپنی ذات تک محدود رہیں تو اس میں بھی اچھی شاعری ہو سکتی ہے لیکن یہ محدود قسم کی شاعری کے لیے تین دائرے ہیں: (۱) اپنی ذات کا دائرہ، (۲) معاشرے کا دائرہ، (۳) ساری دُنیا کا دائرہ یا ہم عصر انسانی برادری کا دائرہ ماضی سے واقفیت، ہم عصر وقت کے تقاضوں سے آگاہی اور مستقبل کے بارے میں کوئی نقشہ، ان میں جس قدر وسعت ہوگی، اس کے لحاظ سے تحریروں یا تخلیقات کا معیار ہوگا اور وہی شاعر کا مقام ہوگا۔''

بہرحال مختلف اور ہمہ گیر موضوعات پر فیضؔ کے خیالات اور آئیڈیالوجی کو جاننے کے لیے یہ انٹرویوز ایک کھڑکی کھول دیتے ہیں اور جب آپ پڑھنا شروع کرتے ہیں تو ٹھہرنا یا رُکنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کا ایک باب منظوم نذرانۂ عقیدت پر مشتمل ہے، نمونتاً چند شعر

افتخار عارف : جو فیضؔ سے شرفِ استفادہ رکھتے ہیں
کچھ اہلِ درد سے نسبت زیادہ رکھتے ہیں

•••

احمد فراز : تو مجھ کو چھوڑ گیا لکھ کے ''نسخہ ہائے وفا''
میں کس طرح تجھے اے دوست بے وفا لکھوں

•••

ادا جعفری : وہ جو آبروئے چمن بھی تھا
جو نثار سر و سمن بھی تھا
جو غرورِ دار و رسن بھی تھا..... وہ چلا گیا

•••

حمید شاہین : عنانِ حرف و معانی سنبھالنے والا
متاع کرب کو نظموں میں ڈھالنے والا

•••

فارغ بخاری : تیری باتوں میں وقت کی دھڑکن
تیرے شعروں میں زندگی کا گداز

اس کتاب میں فیض سے موسوم کچھ لطیفے بھی ہیں۔

یہ کتاب رائٹرس ایسوسی ایشن لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہے اور طباعت لاہور کے پریس نے کی۔ کتاب پر کہیں قیمت درج نہیں ہے اور درج بھی کیسے ہوتی، یہ لا قیمت ہے۔ کتاب آپ کسی سے مانگ کر پڑھیے اور پھر واپس مت کیجیے۔ یہ بھی ایک طریقہ کتاب کو حاصل کرنے کا ہے۔ دوسرا طریقہ ہے۔ ''ملٹی میڈیا افیئر ز لاہور سے طلب کیجیے جس کا پتہ، فون نمبر اور موبائل نمبر کتاب پر درج ہے۔

کتاب نہایت نفیس، دبیز، خوب صورت اور قیمتی کاغذ پر شائع ہوئی ہے۔ اس سے پہلے میں نے کسی اُردو ادبی کتاب کو اتنے خوب صورت اور قیمتی کاغذ پر نہیں دیکھا، کمپوزنگ بہت عمدہ ہے۔ کتابت کی غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

پہلی فرصت میں اس کتاب کو ضرور پڑھیے اور آخری فرصت تک پڑھتے جایئے۔

تابش خانزادہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب ''فیض فہمی'' پر ایک نظر

اُردو ادب کے جس دور میں ہم پروان چڑھ رہے ہیں وہاں اُردو زبان کو ایک چیک بک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ادیب چیک کیش کرانے کے بعد حاصل کی ہوئی رقم سے پیٹ بھرتے ہے۔ کسی بھی میڈیکل ڈاکٹر کا تعلق ادب پڑھنے، یا تھوڑا بہت لکھنے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ایسے میں تقی بھائی جیسا ایک میڈیکل ڈاکٹر سامنے آتا ہے جس کا اُردو ادب سے روحانی عشق ہے اور اُردو ادب میں تحقیق اس کے جیون کا سرمایہ ہے۔ اگر یہ انسان اُردو ادب کی بجائے اپنی توجہ کسی میڈیکل ایجاد میں سرف کرتا تو بعید نہیں کہ اب تک کھرب پتی بن چکا ہوتا۔ لیکن یہ دیوانہ اپنی فرصت کا ہر لمحہ اور اپنی جیب سے پیسہ خرچ کر کے کبھی سینکڑوں صفحات پر مشتمل کتاب میں میر انیسؔ کے مرثیوں کو امام بارگاہوں سے نکال کر ادبی دنیا میں روشناس کراتا ہے، تو کبھی علامہ اقبالؔ کی بیماریوں پر ایک تحقیقاتی کتاب تصنیف کرتا ہے اور کبھی ''فیض فہمی'' کی شکل میں اُردو ادب کے خزانوں میں اپنی تحقیق کے موتی پرو کر اُردو ادب کو مالا مال کرتا ہے۔ پھر پروئے ہوئے موتیوں کی اُن مالاؤں کو اپنے دوستو اور ادبی دنیا کے نامور لوگوں کے گلے کے ہار کے طور پر بھی اپنی جیب سے خرچ کر کے تقسیم کرتا ہے۔ دنیائے اُردو ادب کے محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ۱۴۰۸ صفحات کی کتاب ''فیض فہمی'' پر نظر پڑتے ہی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اگر فیضؔ خود بھی اپنے بارے میں کچھ لکھتا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے بہتر اور اس سے جامع کتاب نہ لکھتا۔ میرے خیال میں محترم فیض احمد فیضؔ پر نہ ''فیض فہمی'' سے پہلے اور نہ ہی ''فیض فہمی'' کے بعد ایسی کامل تحقیقی تخلیق چھپنے کی کوئی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کتاب کے توسط سے فیضؔ کی ذاتی، صفاتی، ادبی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور

نظریاتی شخصیت کا جس تفصیل سے احاطہ کیا ہے اس کی نظیر اُردو ادب میں بہت کم ملتی ہے اور اس کا کریڈٹ ڈاکٹر عابدی کی فیضؔ سے محبت کے ساتھ ساتھ اُن کی تحقیقانہ صلاحیتوں کو جاتا ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف فیضؔ کی شاعری بلکہ شاعری کے شانِ نزول کو بڑی ہی تندہی سے رقم کیا گیا ہے۔

فیضؔ کی ذات یا ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقات پر کچھ کہنے سے پہلے میں اپنی تہی دامنی کا بیانگِ دہل اقرار کرتا ہوں۔ نہ میں فیضؔ فہمی کا دعویدار ہوں اور نہ فیضؔ فہمی پر اپنے الفاظ میں کچھ کہنے کا حوصلہ پاتا ہوں۔ میں اگر کچھ الفاظ لکھنے کا سزاوار ہوں بھی تو اتنا کہ میں لوگوں کو فخریہ بتاتا پھرتا ہوں کہ میں اُردو ادب کے اُس دور میں جیتا ہوں جس میں تقی عابدی نے اپنی تخلیقات کیں ہیں اور میں تقی عابدی کو ایک دوست کی حیثیت سے جانتا ہوں لیکن ان کی پہچان میرے جیسے ایک عام سے انسان کے بس سے باہر ہے۔ میرے خیال میں آج کے دور میں اُردو ادب میں تقی بھائی جیسی نظیر کہیں نہیں ہے اگر آپ کو کہیں ملے تو مجھے بتائیں۔ میں تقی بھائی کے ساتھ ان کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ پروردگارِ عالم تقی بھائی کو اور ان کی کاوشوں کو تا دیر سلامت رکھے۔

بیدار بخت
(ٹورنٹو)

تقی عابدی کی نئی کتاب "فیض فہمی"

ٹورنٹو میں اُردو داں طبقے کی آبادی اتنی ہی ہوگی جتنی ہندوستان یا پاکستان کے کسی چھوٹے سے صوبے کی۔ اس چھوٹی سی آبادی میں اُردو ادب کی خدمت کرنے کو اتنی تنظیمیں قائم ہوگئیں ہیں کہ میں تو ان کا شمار بھی بھول گیا ہوں، مگر یہیں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تن تنہا ادب میں ایسے کارنمایاں سرانجام دے رہے ہیں کہ جس کی داد ہندوستان اور پاکستان کے ادیب اور دانشور بھی دیتے ہیں۔ ان چند لوگوں میں آپ کے تقی عابدی بھی ہیں۔ میں "آپ کے" کیوں کہہ رہا ہوں، یہ تو وہ خود کہتے ہیں۔ مجھے کہنا چاہیے ہمارے تقی عابدی بھی ہیں۔ مجھے ایک غیر متعلق شعر یاد آ گیا۔ جب یاد ہی آ گیا ہے تو آپ بھی سن لیجیے۔ سید محمد جعفری بہت دن بعد ڈھاکے میں عندلیب شادانی سے ملے، جو نہ صرف فارسی کے عالم اور استاد تھے بلکہ ایک صاحب طرز شاعر بھی تھے۔ سید محمد جعفری نے ان سے مل کر یہ شعر پڑھا:

عندلیب شادانی تیرا دم غنیمت ہے
تیرے دم سے میرا دم کچھ ہی کم غنیمت ہے

میں نے ابھی کہا کہ تقی عابدی تن تنہا کارنمایاں سرانجام دیتے ہیں، یہ نہیں کہا کہ کارنمایاں خاموشی سے سرانجام دیتے ہیں، اس لیے خاموشی کا شمار ان کے عیوب میں نہیں ہوسکتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تو خاموشی سے سوتے بھی نہ ہوں گے۔ اب یہی دیکھئے نا، اگر کوئی اور فیض پر کتاب ترتیب دینا چاہتا تو فیض پر لکھے ہوئے پچیس تیس مضمون جمع کرتا اور ایک دس پندرہ صفحے کا دیباچہ لکھ کر مطمئن ہو جاتا کہ فیض کا قرض ادا ہوگیا، مگر ہمارے تقی عابدی کو تو بہ بانگ دہل تو یہ کہنا تھا کہ ع

دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

ہمارے گھر میں ایک کھانا پکانے کی انگریزی کی ضخیم کتاب ہے India Cook Book، اس کے پشتے پر کتاب کے نام کے نیچے لکھا ہے: 1.5Kg، وزن کرنے پر پتہ چلا کہ کتاب کا وزن یہی ہے۔ جب تقی عابدی نے اپنی نئی کتاب ''فیضؔ فہمی'' مجھے عطا کی تو یہ دیکھنے کے لیے کہ کتاب میں کیا کچھ چھپا ہے، میں نے پہلے ہر صفحہ کو پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ میں عام طور سے کتاب بائیں ہاتھ میں رکھ کر پڑھتا ہوں۔ کوئی چوتھائی کتاب دیکھنے کے بعد میری کلائی دکھنے لگی۔ تنگ آ کر میں رحل اٹھا لایا اور اس پر کتاب رکھ کر ورق گردانی جاری رکھی۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ India Cook Book کے پشتے پر کتاب کا وزن کیوں درج ہے۔ میرے خیال میں ''فیضؔ فہمی'' پشتے پر یا تو اس کا وزن 3Kg لکھنا چاہیے، یا یہ تنبیہ چھپنی چاہیے، ''اگر آپ کی کلائیاں نازک ہیں یا خدانخواستہ آپ کو ہرنیا کا عارضہ ہے تو یہ کتاب آپ کی صحت کے لیے مضر ہو سکتی ہے۔''

خیر یہ تو تفریح کی باتیں تھیں۔ اس کتاب کے بارے میں، میں وثوق سے کہتا ہوں اگر آپ کو فیضؔ اور ان کے کلام میں دلچسپی ہے تو آپ کے کتب خانے میں ان کے شعری مجموعوں کے علاوہ اس کتاب کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تقی عابدی نے بہت سلیقے سے فیضؔ پر لکھی ساری کتابوں کا مطالعہ کر کے مضامین کا ایسا انتخاب کیا ہے جو فیضؔ کی مدح میں بھی ہیں اور قدح میں بھی۔ فیضؔ کے بہت مصاحبے شائع ہوئے ہیں۔ ان سب کو اگر آپ ایک نشست میں پڑھنے کی کوشش کریں تو نیند آ جائے گی۔ تقی عابدی نے فیضؔ کے سارے مصاحبوں کو اس طرح جمع کیا ہے کہ تکرار خارج کر دی ہے اور موضوع کا تسلسل بھی قائم رکھا ہے۔ کوئی ایک سو صفحے کا یہ مجموعہ میں نے ابھی تک پورا نہیں پڑھا، مگر جتنا پڑھا ہے اس میں لطف آ گیا۔ تقی عابدی نے صرف مضامین جمع کر کے ہی کتاب تالیف نہیں کی، بلکہ اس میں ان کے خود کے لکھے ہوئے ۴۲ مضامین بھی ہیں، جن میں سے ایک یہ سو صفحے کا مصاحبوں کا مجموعہ بھی ہے۔

کتاب خوب صورت چھپی ہے۔ ہر صفحے پر ہلکے شنگرفی رنگ کا Watermark فیضؔ کے کئی میں سے ایک بے رنگوں کی شکل میں ہے۔ ''فیضؔ فہمی'' فیضؔ کی بے شمار رنگین اور کالی سفید تصویروں، اور بہت سی پینٹنگز سے مزین ہے۔ کتاب کی ناپ اور کتابوں سے

بڑی ہے۔ غرض یہ کہ ''فیض فہمی'' ایک کافی ٹیبل کتاب کی طرح خوب صورت ہے، مگر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسے پڑھا بھی جائے۔ کتاب اُردو ادب کی دو بڑی ہستیوں کے نام معنون ہے، ایک ہیں جناب گوپی چند نارنگ اور دوسرے جناب افتخار عارف، ہمارے لیے یہ افتخار کی بات ہے کہ گوپی چند نارنگ آج کی محفل میں جلوہ افروز ہیں۔

اسی کتاب میں تقی عابدی نے لکھا ہے۔ ''کلام خالق اور مخلوق کا ایک فرق یہ بھی ہے کہ ایک اغلاط سے پاک ہے اور دوسرا نقائص سے پُر۔'' میں نے ''فیض فہمی'' کو رحل پر تو پہلے سے ہی بٹھا دیا ہے۔ اس خیال سے کہ آپ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ میں اسے آسمانی کتاب کا درجہ دے رہا ہوں، میں اس کتاب کی کچھ ایسی صفات کا بھی ذکر کرتا چلوں، جن کا شمار میری ناقص رائے میں نقائص میں ہوسکتا ہے۔

ہماری پرانے ادب میں کتاب کے مصنف کا نام بغیر القاب و آداب کے لکھا جاتا تھا۔ یہ طریقہ انگریزی ادب میں اب بھی رائج ہے۔ خدا جانے کب سے اُردو میں یہ وتیرہ شروع ہوا ہے کہ مصنف اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر وغیرہ بھی لکھنے لگے ہیں۔ ''فیض فہمی'' میں بھی مولف کا نام ڈاکٹر سید تقی عابدی لکھا ہے۔ اگر سب نہیں جانتے کہ تقی عابدی ڈاکٹر ہیں تو صفحہ ۱۰ پر ان کے بارے میں پوری معلومات درج ہیں ''رو میں ہے رخش عمر'' کے نامناسب عنوان سے، ان میں ان کی ایک بہت سنجیدہ، بلکہ خشم گیں، تصویر بھی ہے۔ ابھی تو وہ ساٹھ سال کے بھی نہیں ہوئے، خیر سے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ رخش عمر کا ابھی سے کیا ذکر؟

''فیض فہمی'' میں تقی عابدی کا ایک بہت مفید مضمون ''فیض کے کلام میں غلطیاں اور اسقام، منصفانہ تجزیہ'' کے عنوان شامل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ان سب مضامین کو جمع کیا ہے جن میں فیض کے کلام پر اعتراض کیے گئے تھے۔ اس مضمون کے مفید ہونے کے باوجود اس کے پڑھنے میں مجھے دقت یہ ہوئی کہ میں آسانی سے اس بات کا تصفیہ نہ کرسکا کہ کون سے لفظ تقی عابدی کے ہیں اور کون سے معترضین کے۔ ہاں کہیں کہیں قوسین میں ایسے الفاظ درج ہیں جیسے ''اعتراض صحیح ہے۔'' ''سید تقی عابدی'' یا ''مقتل گا ہیں غلط۔ قتل گا ہیں ہونا چاہیے۔ تقی عابدی''

قوسین میں لکھے ہوئے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقی عابدی خود جعفر علی خاں

آثر لکھنوی ہو گئے ہوں، اس لیے کہ لہجہ مربیانہ ہو گیا ہے، اور اعتراض سے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ ''اعتراض صحیح ہے'' کی بجائے اگر یہ لکھتے کہ ''مجھے اس اعتراض سے اتفاق ہے'' تو بات وہی رہتی مگر جملے سے مربیانہ لہجہ دور ہو جاتا۔ تقی عابدی خود اپلائیڈ سائنٹسٹ ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ادب کی بات تو دور رہی سائنس کے مفروضوں کے بارے میں بھی اتنے یقین سے اظہار خیال نہیں کیا جا سکتا۔

مثال کے طور سے فیض کا یہ شعر لیتے ہیں:

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

اس شعر پر جعفر علی خاں کا اعتراض ہے: ''دکھوں کا بہت یا کم ہونا کیا؟ بہت کی جگہ کوئی بہتر لفظ ہوتا۔'' تقی عابدی اس اعتراض کو درست مانتے ہیں۔ میرے خیال سے یہ اعتراض اس لیے غلط ہے کہ لفظ ''بہت'' کے بہت معنی ہیں۔ اگر آپ مجھ سے کہیں کہ ''اگر آپ بیمار نہ ہوتے تو میں آپ کو کھانے پر بلاتا۔'' اس کے جواب میں کہتا ہوں ''میں بہت بیمار بھی نہیں ہوں'' یہاں میں نے لفظ ''بہت'' فیض کی طرح ''کچھ ایسا'' کے معنوں میں استعمال کیا۔ ورنہ ہمیں جو دکھ تھے کچھ ایسے لادوا نہ تھے۔ یہ تو روزمرہ ہے، اس میں مین میخ کیوں نکالی جائے؟ اتنے اچھے شعر کو فرسودہ قاعدوں کی رو سے کیوں رد کیا جائے؟

بر سبیل تذکرہ، ایسا لگتا ہے کہ تقی عابدی نے جعفر علی خاں کا مضمون شاہد ماہلی کی کتاب ''فیض احمد فیض، عکس اور جہتیں'' سے لیا ہے۔ اوپر لکھے ہوئے شعر کے بارے ایک ہی جملے میں جو دو غلطیاں شاہد ماہلی کی کتاب میں ہیں، وہی تقی عابدی کتاب میں بھی در آئی ہیں۔

کتاب میں غیر ضروری اضافے بھی ہیں۔ مثلاً رسمی فہرست کے بعد ایک فہرست ڈاکٹر سید تقی عابدی کے مضامین کی بھی ہے۔ اسی طرح کتاب کے آخر میں ''فیض کے مضامین کا ذخیرہ'' کے عنوان کے ذیل میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جو زیر نظر کتاب میں شامل ہیں۔ ان اندراجات سے کتاب کا حجم تو بڑھ جاتا ہے، مگر اس کی افادیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

اب جب میں نے اس کتاب کو زمینی کتاب ثابت کر دیا ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ اسے صرف طاق میں سجانے کے لیے نہیں لیں گے۔

میں صدق دل اور نہایت خلوص سے تقی عابدی کو ایسی جامع اور خوب صورت کتاب کی تصنیف و تالیف پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اب جب انھوں نے یہ سفر شروع کر ہی دیا ہے تو ان کی توجہ دو چار اور منزلوں کی طرف بھی دلاتا چلوں۔ یہ سال مجاز کا بھی ہے، جن کی پیدائش ۱۹؍اکتوبر ۱۹۱۱ء کی ہے۔ اگلا سال میراجی کا ہے، اور اس سے اگلا سردار جعفری کا، اور پھر دو سال بعد، یعنی ۱۹۱۵ء، اختر الایمان کا۔

خدا کرے کہ تقی عابدی کا قلم یونہی رواں دواں رہے۔

پروفیسر بیگ احساس

فیض فہمی

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے بحیثیت محقق اپنی ایک منفرد شناخت بنائی ہے۔ وہ مسلسل تحقیقی کام کر رہے ہیں اور اُردو تحقیق میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ان کا نیا کارنامہ ضخیم تحقیقی کتاب ''فیض فہمی'' ہے۔ اقبالؔ، انشا اللہ خاں انشاؔ، مرزا دبیر، میر انیسؔ، غالبؔ اور تعشقؔ لکھنوی کے بعد فیضؔ کی سو سالہ سالگرہ کے موقع پر انھوں نے فیضؔ کی طرف توجہ کی ہے۔ سید تقی عابدی جس موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں اس کا حق ادا کرتے ہیں۔

۱۴۲۴ صفحات کی اس کتاب میں انھوں نے فیضؔ کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے۔ فیضؔ ہمارے عہد کے ان شاعروں میں سے ہیں جن کا نام اقبالؔ کے بعد اور جوشؔ و فراقؔ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے فیضؔ کا نام ہمارے عہد کا شناخت نامہ بنتا جا رہا ہے۔ فیضؔ ان خوش قسمت شاعروں میں سے ہیں جن کی شاعری پر ان کے سینئر نقادوں نے لکھا، ہم عصر نقادوں نے لکھا اور نئی نسل کے نقادوں نے بھی لکھا اور توقع ہے ہماری آنے والی نسلیں بھی فیضؔ کی شاعری میں اپنے زمانے کی معنویت تلاش کریں گی۔

''فیض فہمی'' کو ڈاکٹر سید تقی عابدی نے پروفیسر گوپی چند نارنگ اور افتخار عارف کے نام معنون کیا ہے۔ یہ دونوں شخصیتیں فیضؔ صاحب سے کافی قریب رہ چکی ہیں اور فیض فہمی کا ثبوت اپنی علمیت کے ذریعہ فراہم کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے مختلف موضوعات پر ۱۶۲ مضامین کا انتخاب کیا جس میں خود ان کے ۴۰ مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی ان چالیس مضامین پر اپنی ایک کتاب ترتیب دے سکتے تھے لیکن ان کا مقصد فیضؔ پر ایک مکمل

کتاب پیش کرنا تھا۔ اس کتاب میں فیضؔ پر لکھے گئے تمام اہم مضامین شامل ہیں اُردو کے تقریباً مشاہیر ادب کے مضامین بلا کسی تعصب اور گروہ بندی کے صرف معیار اور افادیت کی بنیاد پر جمع کیے گئے ہیں۔ فیض احمد فیضؔ کے حالاتِ زندگی ابتدا میں اختصار کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے فیضؔ کی زندگی پر مضامین کم ہیں۔ فیضؔ کی ایلس کیتھرین جارج سے شادی کے موقع پر جو معاہدہ ترتیب دیا گیا وہ چونکاتا ہے۔ جیسے اس معاہدے کی رو سے اور متذکرہ شادی کے پیش نظر فیض احمد فیضؔ اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ ایلس کیتھرین جارج سے شادی ہو جانے کے بعد فیض احمد فیضؔ کسی صورت میں کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کریں گے۔ فیض احمد فیضؔ اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ وہ اسلامی قانون کے تحت طلاق کا حق ایلس کیتھرین جارج کو منتقل کرتے ہیں۔

''ادبی محبتیں'' (ضیا ساجد) اور ''فیضؔ بیتی'' (ڈاکٹر خلیق انجم) کے علاوہ انٹرویوز اور جیل کی زندگی سے ان کے حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ''جو میرا تمہارا رشتہ ہے۔'' (فیضؔ کے خطوط سرفراز اقبال کے نام..........''، ''دامن یوسف'' کا تار تار تجزیہ'') سید تقی عابدی سے فیضؔ کی زندگی کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ فیضؔ کے ان ۵۵ سے زیادہ خطوط کو وہی اہمیت حاصل ہے جو اقبالؔ اور مس ایما ویگے ناسٹ کے خطوط کو حاصل ہے۔ فیضؔ کے کئی انٹرویوز بھی شامل کیے گئے ہیں۔ سب سے خاص چیز فیضؔ کے ''انٹرویوز (۲۸ اشخاص، ۴۵۰ سوالات)'' ہے۔ اسے تقی عابدی نے بڑی خوب صورتی سے ترتیب دیا ہے۔ اس میں ان تمام شخصیتوں کے حوالے ہیں جنھوں نے فیضؔ سے انٹرویو لیا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اشخاص کے نام، تاریخ، روزنامہ/ جریدہ، مقام، عنوان اور ملاحظات کی وضاحت بھی کردی ہے۔ جو تحقیقی دیانت داری کا بین ثبوت ہے۔ فیضؔ نے جو تقریظیں لکھی ہیں انھیں بھی یکجا کر دیا گیا۔ ایسا کلام جو کسی مجموعے میں نہیں وہ بھی موجود ہے۔

تقی عابدی نے ''فیضؔ مشاہیر ادب کی نظر میں'' کے عنوان سے ۸۲ فنکاروں کی فیض احمد فیضؔ کے بارے میں رائے اکٹھا کی ہے۔ ادیبوں شاعروں، افسانہ نگاروں و نقادوں کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے دیے گئے ہیں۔ بریکٹ میں ''بیاسی'' ''۸۲ پھولوں کا گلدستہ'' لکھا گیا۔

لفظ ''پھولوں کا گلدستہ'' کھٹکتا ہے۔ اس طرح تقی عابدی نے ''فیض کے بہتر (۷۲) ادبی نشتر'' بھی جمع کیے ہیں۔ تقی عابدی نے یہ انفرادیت برتی کہ یہ نشتر فیض کی شاعری سے نہیں بلکہ نثر سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ''شبستان'' ڈائجسٹ کے فیض نمبر میں ۷۲ نشتر شاعری کی صورت میں ہیں۔ تقی عابدی نے کلام فیض سے عربی، فارسی الفاظ اور تراکیب کا گل دستہ بھی بنایا ہے۔ فیض کی غزل پر چھ مضامین اور نظموں پر چار مضامین اور نثر نگاری پر ایک مضمون شامل کیا گیا ہے۔ فیض کی شاعری پر دس مضامین ہیں۔ فیض پر پس ساختیاتی مضمون، ان کی انفرادیت، اسلوب، تعین قدر، نظریات، لسانی پہلو، امتیازات، رومانیت، فکر، معنیاتی نظام، علامت نگاری، روایتی انداز، ادبی میلانات، انسانیت، آدرش، غیر ملکی معاصرین، فلم اور ثقافت، جیل کی زندگی، لفظیات، تنقیدی رویہ، لطیفے اور صحافت پر مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں پر بھی علاحدہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ''نقش فریادی'' پر دو، ''دست صبا'' پر دو، ''زندان نامہ'' پر تین، ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' پر ایک، ''مرے دل مرے مسافر'' پر ایک، ''سروادیٔ سینا'' پر ایک، ''صلیبیں مرے دریچے میں'' پر ایک مضمون شامل ہے۔ فیض کا تقابل مختلف شاعروں سے بھی کیا گیا ہے۔ ایسے مضامین میں غالب اور فیض (وزیر آغا)، غالب، جوش اور فیض: تین آوازیں، تین لہجے'' (محمد علی صدیقی)، ''فیض اور اختر شیرانی کی مشترکہ قدریں'' (سید تقی عابدی)، ''کون بڑا: جوش یا فیض'' (تقی عابدی)، ''فیض اور مصطفیٰ زیدی'' (تقی عابدی) قابل ذکر ہیں۔ احمد ندیم قاسمی، مالک رام، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور انتظار حسین کے مضامین بے حد مختصر ہیں۔ لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مضمون نغماتِ فیض میں ان تمام غزل کے فنکاروں کے نغمے اور نام درج کیے گئے ہیں جنھوں نے فیض کا کلام اپنی آواز میں پیش کیا۔ فیض پر مرتبہ کتب اور رسائل کی مکمل فہرست دی گئی ہے۔ جو ایک بڑا کارنامہ ہے۔ فیض کے کس مجموعے میں کتنی غزلیں اور نظمیں وقطعات ہیں ان کے اعداد و شمار بھی موجود ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے مضامین کی ترتیب میں کون سا طریقہ اپنایا اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس میں نہ تو حروف تہجی کے اعتبار سے مضامین یا مصنّفین رکھے گئے۔ نہ موضوعات کے

اعتبار سے نہ تقدیم اور تاخیر کا خیال کیا گیا۔ ہوسکتا ہے انھوں نے مضامین کے معیار کو ملحوظ رکھا ہو۔

فیض کی صد سالہ تقاریب کے سلسلے میں بے شمار قومی و بین الاقوامی سیمینار کیے گئے۔ ان میں بیش قیمت مضامین بھی پڑھے گئے، ممکن ہے وہ کتابی صورت میں شائع بھی کیے جائیں گے۔ لیکن ان تقاریب کے موقع پر سب سے قیمتی، کارآمد اور بہترین تحفہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے پیش کیا ہے۔ جب تک اُردو باقی رہے گی ہماری نسلیں اس اہم دستاویز سے استفادہ کرتی رہیں گی۔ فیض احمد فیض کے بارے میں اس سے جامع و قیع کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی اور نہ مستقبل میں اس کی توقع ہے۔ میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر جمال نقوی

تقی عابدی کی فیض فہمی

فیض احمد فیضؔ اُردو کے وہ عظیم شاعر ہیں جنھیں غالبؔ کی طرح دنیا سے عدم توجہی کی شکایت نہیں رہی۔ کیوں کہ انھیں ان کی زندگی میں بھی بہت سی چاہتیں ملیں اور اب ان کے انتقال کے بعد بھی ادبی دنیا میں فیض صدی تقریبات اعلیٰ پیمانے پر منائی جارہی ہیں۔

فیضؔ کے پہلے مجموعۂ کلام ''نقشِ فریادی'' نے دلوں پر وہ نقش ثبت کیا، جس کی روشنی آج بھی باقی ہے۔ ۱۹۴۰ء سے آج تک ان کی شخصیت وفن کے بارے میں ہر سینئر اور جونیئر ادیب نے اپنی رائے تحریر کرنے میں فخر محسوس کیا ہے۔ ''فیض فہمی'' کے اس سفر میں سرحدیں اور رُکاوٹیں آڑے نہیں آسکیں۔ اُردو دنیا کے ہر خطے نے انھیں اپنا جانا اور یہی حال فیضؔ صاحب کا بھی تھا۔ اس لیے جہاں وہ اپنے ملک کے مزدوروں، گاڑی بانوں اور پوسٹ مینوں کے لیے فکر مند رہتے تھے، وہیں ایرانی طلبا، فلسطینی مجاہدین اور افریقیوں وغیرہ کے لیے بھی انھوں نے آواز کو بلند کیا ہے۔ اور قلم کو استعمال کیا ہے۔ اس صورت حال کو ان دو مصرعوں میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

کہیں بھی ظلم ہو، اس دل پہ چوٹ لگتی ہے
بس اس لیے کہ مرا ربط کائنات سے ہے

فیضؔ صدی تقریبات کے موقع پر جہاں ساری ادبی دنیا میں سیمینار اور کانفرنس منعقد ہوئیں، فیضؔ میلے ترتیب دیئے گئے اور ان کے فن اور شخصیت کے پس منظر میں مصوری کے مقابلے منعقد کیے گئے، وہیں ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں مصنفین نے بہت سی کتابیں بھی تصنیف وتالیف کیں، بہت سے جرائد نے خاص نمبر ترتیب دیئے اور میرے علم کے مطابق ہندوستان نے اس سلسلے میں اولیت حاصل کی، جہاں جنوری میں علی

گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک فیض عالمی سیمینار منعقد ہوا اور ایک ادارہ ''سمت'' نے بھی تقاریب کیں اور ایم ایف حسین کا بنایا ہوا فیض کلینڈر شائع کیا۔ اس کے علاوہ ایک ہندی جریدہ ''نیا پتھ'' نے ضخیم فیض نمبر شائع کیا، مگر ڈاکٹر تقی عابدی کا تصنیف و تالیف کردہ صحیفۂ ''فیض فہمی'' صوری اور معنوی کے علاوہ اپنی ضخامت کے اعتبار سے ان سب پر بھاری ہے۔ ان کے اس تحقیقی کارنامے میں ۱۶۲ مضامین شامل ہیں جن میں سے ۴۲ مضامین صرف ان کے تحریر کردہ ہیں۔ اپنے ان مضامین کے بارے میں انھوں نے تحریر کیا ہے کہ یہ وہ مضامین ہیں جن پر کام کم یا اصلاً نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے اس مصحف میں مضامین کی اصلیت، حوالوں کی صداقت، کتابت کی صحت اور طباعت کی نفاست کا خاص خیال رکھا ہے تا کہ اس خوب صورت صحیفے کو محرابِ فن میں سجا سکیں۔ اس کے باوجود کمپوزنگ کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں جس کے لیے انھوں نے متوجہ کرانے کی گزارش کی ہے تا کہ آئندہ اشاعت ان اغلاط سے پاک رہے۔

میں ہمیشہ یہ کوشش کرتا ہوں کہ جس کتاب کے بارے میں مجھے کچھ عرض کرنا ہو پہلے مکمل طور پر اس کا مطالعہ کر لیا جائے تا کہ میری کہی ہوئی بات حقیقت پر مبنی ہو مگر ۱۴۴۴ صفحات کی اس کتاب کو میں اس مختصر عرصے میں مکمل طور پر نہ پڑھ سکا۔ لیکن جتنا کچھ پڑھا، اس میں ڈاکٹر صاحب کے مضامین اور انکشافات کے علاوہ بھی بہت سے مضامین ایسے ہیں جو میری دسترس میں نہیں آسکے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے کہ ''فیض فہمی'' کی اشاعت میں ان کا مقصد ایک مستند دستاویز کی تصنیف و تالیف تھی جس سے عامی اور عالم دونوں مستفید ہوسکیں اور یہ کتاب مصنفین، محققین اور اسکالرز کے لیے سودمند اور مددگار بن سکے۔ وہ تو انھوں نے کر دکھایا ہے۔ اسی لیے جدول تصانیف میں تصانیف کی تعداد، سال اشاعت، نظموں، قطعات، گیت، غزلوں اور ان میں شامل اشعار کی تعداد بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے تراجم، ڈرامے، تقریظیں، تحریریں، تقریریں اور خطوط کی تفصیلات کے علاوہ فیض پر مرتبہ مضامین، کتب و رسائل کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

۱۴۸ کتابیات کی تفصیل دیکھ کر ان کی وقتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے مگر ان کی ۳۷

تصانیف میں سے زیادہ تر کتابیں ایسی ہی ضخامت اور تحقیقی مواد پر مشتمل ہیں جس سے ان کی اہلیت اور ادب میں ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ یقیناً فیض کی اس بات پر عمل کر رہے ہیں کہ ''ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے۔'' ہماری دعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ارادوں کو کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

پروفیسر عبدالستار رودلوی

فیض فہمی

خواتین وحضرات!

اس سے قبل کہ میں فیض یا ''فیض فہمی'' کے بارے میں کچھ کہوں، میں ڈاکٹر صاحب علی احمد شعبۂ اُردو کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انھوں نے مجھے اس یادگار تقریب میں نہ صرف شریک ہونے کا موقع دیا بلکہ صدارت اور رسم اجراء ''فیض فہمی'' کی رونمائی کی بھی عزت بخشی۔ بیسویں صدی میں اقبالؔ کے بعد فیضؔ اُردو کے مقبول ترین شاعروں میں سے ہیں، ان کی شخصیت ایک پہلودار شخصیت تھی، وہ اگرچہ بنیادی طور پر شاعر تھے، مگر اسی کے ساتھ انھیں عالمی منظرنامے میں فکری اور سیاسی اعتبار سے بھی رہنمایانہ حیثیت حاصل تھی اور ان کے ادبی اور فکری حلقۂ احباب میں انھیں اعتبار حاصل تھا، ان کے اس اعتبار نے جو پہلودار تھا، عالمی سطح پر ہماری زبان اُردو اور اس کے ادب کو بھی وقار بخشا۔

انیسویں صدی میں میرؔ اور غالبؔ اور بیسویں صدی میں اقبالؔ اور فیضؔ کی جو معنویت ہے، وہ ہندوستانی ادبیات میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور ہندوستانی ادبیات کے پس منظر میں ان کی اہمیت کو اس شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا کہ فیضؔ ہی کے ایک دوست اور کالج کے ساتھی سومناتھ صاحب نے لکھا کہ میرؔ، غالبؔ اور پھر اقبالؔ اور فیضؔ کی ہمسری ہندوستان کا کوئی دوسرا شاعر نہیں کرتا۔ میرے خیال میں مذکورہ چار ناموں کے ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور کا نام بھی شامل ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ٹیگور اپنی تمام تر شاعرانہ عظمت اور فکری بلندی کے باوجود ایک محدود علاقائی زبان کے شاعر تھے اور اقبالؔ اور فیض ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی امین اُردو کے شاعر تھے اور عام ابلاغ وترسیل Mass Communication کی زبان ہے۔ جس نے مختلف

علاقوں، مختلف تہذیبوں اور اس کے بولنے والوں میں ربط قائم کیا اور جو متحدہ اور غیر متحدہ ہندوستان کی قومیت کا استعارہ رہی ہے۔ اُردو جہاں بھی گئی متحدہ قومیت کی علامت یا Symbol تھی۔ وہ بہت سوں کی یا مادری زبان تھی یا پھر تہذیبی زبان تھی۔ اُردو شمالی ہندوستان میں عموماً مادری زبان تھی، لیکن پنجاب میں اگر یہ مادری زبان نہیں تھی تو تہذیبی یا ثانوی زبان تھی۔ پنجاب، دلّی، لکھنؤ اور عظیم آباد کے بعد اُردو کا مرکز تھا۔ اُردو کے اسی تہذیبی مرکز سے اقبالؔ اور فیضؔ دونوں کا تعلق تھا اور انھیں دو شاعروں کے حوالے سے عالمی سطح پر اُردو زبان وادب کی شناخت قائم ہوئی۔

اقبالؔ اور فیضؔ میں بہت سی مماثلتیں ہیں۔ دونوں کا تعلق پنجاب سے ہے۔ دونوں کی تعلیم انگریزی اور عربی میں ہوئی اور دونوں عربی کے استاد رہے، دونوں کی شاعری میں وطن کی محبت، تحریک آزادی کی خُوبُو اور انقلابی آہنگ ہے۔ مگر اقبالؔ بنیادی اعتبار سے نظر ساز ہیں اور فلسفیانہ مزاج رکھتے ہیں، فیضؔ نے بھی وطن کی محبت اور تحریکِ آزادی کے دھیمے سُروں میں نغمہ گاتے ہیں، لیکن اقبالؔ کی بلند آہنگی اور فلسفیانہ مزاج کے برعکس ان کی شاعری میں نرمی اور گداز ہے۔ اقبالؔ اپنے تمام تر فکری اور فنی امتیازات کے ساتھ آسمانِ ادب کے شہابِ ثاقب ہیں، اور فیضؔ، اقبالؔ سے نہ صرف کسب فیض حاصل کرتے ہیں بلکہ ان کے فکر وفلسفہ سے، ان کے فن سے عملی طور پر نہ سہی فکری طور پر متاثر ہیں۔ چنانچہ اقبالؔ کے اشفاقی کے بعد اقبالؔ پر اپنی درآئی نظم یا شخصی مرثیہ میں کہتے ہیں ؂

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں، خلق سے آباد ہوگئیں
ویران مے کدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا

اقبالؔ اپنی زندگی ہی میں لیجنڈ (Lagend) بن چکے تھے اور اقبالؔ کی شاعرانہ و فلسفیانہ عظمت کو سمجھنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، ''عالمگیر'' کا ۱۹۳۲ء اقبالؔ نمبر سے اس کا

آغاز ہوا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اقبالؔ فہمی کا یہ سلسلہ اقبالؔ کی شعریت، اس کی آفاقیت، مشرق و مغرب کے فلسفوں سے ان کے رشتے اور موضوعات میں متن کی دلکشی میں اقبالؔ فہمی کا راز پوشیدہ ہے۔ فیضؔ فہمی بھی بیسویں صدی کے ایک شاعر کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ اس سلسلے میں بمبئی سے شائع ہونے والے ضخیم رسالے ''فن اور شخصیت'' کی اپنی ایک اہمیت ہے، جس نے ۱۹۷۴ء کے قریب اپنا فیضؔ نمبر شائع کیا۔ فیضؔ پر فن اور شخصیت کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے متعدد رسائل نے اپنے خصوصی نمبروں سے فیضؔ کو خراج عقیدت پیش کیا اور اس طرح فیضؔ فہمی کا آغاز ہوا۔ ہمارے آج کے مہمان اور میرے دوست ڈاکٹر تقی عابدی کی یہ کتاب ''فیضؔ فہمی'' جس کی رونمائی ابھی کی گئی۔ اس کی تازہ تر مثال ہے۔ اس سے قبل دلّی کے رسالے ''شبستان'' کا فیضؔ نمبر بھی ایک دستاویزی تھا۔ اسی طرح میرے بزرگ اور کرم فرما ظفر الحسن صاحب نے کراچی کے ''ادارۂ غالب'' سے ''عمر گزشتہ کی کتاب'' میں ایک حصہ فیضؔ کی شاعری اور فن کے لیے مختص کیا تھا اس سلسلے کی ان کی دوسری کتاب مرزا ظفر الحسن ہی کی ایک دوسری کتاب ''خونِ دل کی کشید'' تھی۔ فیضؔ کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لیے ان کی مقبولیت کے پیش نظر شائقان اُردو ادب کی ایک بڑی تعداد ہے اور مختلف رسائل میں، اخبارات میں ہفت روزہ رسالوں میں مضامین اور گوشوں کی صورت میں مضامین کا ایک انبار ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''فیضؔ فہمی'' اس سلسلے کی ایک دستاویزی کتاب ہے۔

اُردو زبان و ادب گزشتہ نصف صدی سے ہندوستان میں سکڑتی رہی، مگر اس کی مقبولیت میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی اور اُردو کے تارکین وطن وہ جہاں بھی گئے اپنی زبان کو ساتھ لے گئے اور اس کی درس و تدریس اور ادبی سطح پر بھی اس کی مشاقیگی کرتے رہے۔ برطانیہ اس کا سب سے بڑا مرکز ہے جہاں "O" اور "A" لیول پر کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہاں اُردو ادب، شاعری، افسانہ اور تحقیق میں عام دلچسپی لی جارہی ہے۔ اُردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں محدود سطح پر ہی سہی یہ کام ہورہا ہے۔ امریکہ اور کینیڈا اس میں پیش پیش ہیں اور یہاں کی یونیورسٹیوں میں محدود زبان و ادب اور تحقیق کا اعلیٰ پیمانہ کا کام ہورہا ہے، جس کی ایک مثال ڈاکٹر تقی عابدی ہیں۔ ایک عرصہ تک حفظ الکبیر

قریشی، احمد علی، عزیز احمد اور شان الحق حقی جیسی قد آور شخصیات نے کینیڈا میں رہ کر اُردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے، تحقیق اور درس و تدریس کے سلسلہ میں ایک ممتاز شخصیت پروفیسر عبدالرحمٰن بارکر کی تھی جن کا کتب خانہ علمی و ادبی دُنیا میں بہت شہرت رکھتا تھا جو ان کے انتقال کے بعد ملیشیا میں محفوظ ہے۔ بارکر صاحب نے اکبرالدین صدیقی مرحوم کے اشتراک سے اُردو شاعری کا انتخاب مرتب کیا، اُردو ادب کی مختصر تاریخ لکھی اور غیر اُردو داں حضرات کے لیے نصابی کتابیں مرتب کیں۔ مذکورہ جن شخصیات کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ساری شخصیتیں اُردو، انگریزی اور سماجی علوم سے تعلق رکھتی تھیں، جو اُردو سے عشق کرتی تھیں اور اُردو درس و تدریس ان کی پیشہ ورانہ ذمہ داری تھی۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی حیثیت ذرا مختلف ہے، وہ پیشہ کے اعتبار سے ایک ماہرِ امراض قلب، سرجن اور Pathologist ہیں۔ اور طبی موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھتے ہیں، لیکن اپنی مادری زبان اُردو اور اس کے ادبی تہذیبی ورثے سے ان کی شفقت غیر معمولی ہے۔ اُردو زبان و ادب سے یہ دیوانگی انھیں ہر لمحہ بے چین رکھتی ہے۔ وہ اُردو کے شاعر ہیں اور بلند پایہ محقق بھی ہیں، وہ بیک وقت غالبؔ شناس بھی ہیں اور انیسؔ شناس بھی، غالبؔ کے کلیات فارسی کو انھوں نے مدون کیا ہے۔ یہ کام تجزیاتی نوعیت کا ہے، جس میں غالبؔ کے فارسی کلام کے صحیح متن کا تعین کیا گیا ہے۔ یادگارِ انیسؔ میں انیسؔ کا فکر انگیز مطالعہ ہے۔ تجمّل آفندی کا کلام دو جلدوں میں مرتب کیا ہے تعشق لکھنوی پر ان کی تحقیق و ترتیب حوالہ جاتی ہے اور ''چوں مرگ آید'' اقبالؔ کی بیماری کا سائنسی/طبی تجزیہ ہے جس نے آخر کام تمام کیا۔ مذکورہ دستاویزی کتابوں کے بعد فیضؔ صدی کے موقع پر وہ ''فیضؔ فہمی'' کے ساتھ اُردو ادب کے اُفق پر نمودار ہیں۔ اس کتاب میں اندازاً ۱۲۰ مضامین ہیں جن میں اندازاً چالیس مضامین فیض احمد فیضؔ کی شخصیات، شاعری، فن، ان کے تنقیدی شعور اور مکاتیب اور نثر نگاری پر ہیں، یہ سب جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

''اُردو ٹائمز'' کینیڈا

1997ء

معروف محقق شاعر ادیب مصنف ڈاکٹر تقی عابدی کے لیے عالمی مجاہد اُردو ایوارڈ

عالمی شہرت یافتہ معروف محقق شاعر ادیب اور مصنف ڈاکٹر تقی عابدی کو نئی دہلی میں ان کی گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف میں عالمی مجاہد اُردو ایوارڈ دیا گیا۔ یہ ایوارڈ انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وزیر محمد اشرف فاطمی نے دیا۔ اس تقریب میں محترمہ نرملا دیش پانڈے (ایم پی)، ظہیر زیدی، پروفیسر اختر نے ڈاکٹر تقی عابدی کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی نے ڈاکٹر تقی عابدی کا تفصیلی تعارف کرایا اور کہا کہ ''کینیڈا جیسی جگہ پر رہ کر آپ نے گزشتہ بیس سالوں میں تیس سے زائد علمی ادبی اور تحقیقی تصانیف دُنیائے اُردو کو پیش کی ہیں اور آپ کی ذاتی لائبریری میں دس ہزار سے زائد اُردو کی کتابیں ہیں اس طرح آپ مستقل اُردو کے لیے جدو جہد میں مصروف ہیں۔''

اس موقع پر ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''ہم دُنیا کے کسی ملک میں بھی چلے جائیں اپنی زبان اُردو اپنی تہذیب و ثقافت کو فخر کے ساتھ اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے۔'' انھوں نے کہا کہ ''یوں تو مجھے دُنیا کے کئی ملکوں سے ایوارڈ ملے ہیں لیکن یہ دہلی یعنی سلطنت اُردوئے معلّی میں ملنے والا ایوارڈ میرے لیے ایوارڈ معلّی ہے۔'' عالمی مشاعرے کی نظامت کے فرائض ساغر خیامی نے انجام دیئے اس پروگرام کی صدارت ڈاکٹر عابدی نے کی۔

عدیل صدیقی

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی شاندار ادبی محفل

معززین شہر کی شرکت

ویسے تو سید تقی عابدی صاحب میڈیکل ڈاکٹر ہیں، لیکن ان کے اندر چھپا ہوا انسان ایک اچھا شاعر، شاندار ادیب اور ایک بہترین محقق ہے اُن کی لائبریری کو دیکھنے سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ ان کی کمائی اور دولت کا بیشتر حصہ ان کتب کی خرید میں خرچ ہوتا ہے۔ ان کی لائبریری میں ایسی ایسی نادر کتب کا خزانہ ملا جو کم از کم کینیڈا میں نایاب ہے، غالؔب کے ہاتھ سے لکھے اوریجنل خطوط اور دوصد سالہ پرانی انگریزی کی ڈکشنری قابل تعریف خزانہ ہے۔ ہندو مذہب پر اُردو زبان میں 11 کتب فارسی کے نایاب نسخے اسلامی کتب شعراء کے نایاب دیوان اور خود اپنی درجنوں تصانیف ثابت کر رہی ہیں کہ ڈاکٹر تقی عابدی ہمارے دور کے غالباً سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور باشعور دانشور ہیں مجھے فخر ہے کہ میں ان کے دوستوں میں شامل ہوں۔ اتوار 23/ اکتوبر کو یہ ادبی نشست ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کے اعزاز میں منعقد کی گئی۔ محترمہ معروف شاعر جناب الطاف حسین حالؔی کی پڑپوتی ہیں۔ آپ خواجہ غلام سیدین کی بیٹی، مولانا آزاد یونیورسٹی کی سابق چانسلر اور متعدد کتابوں کی مصنفہ ہیں۔

16 سال کینیڈا میں بھی رہ چکی ہیں اور اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی البرٹا کینیڈا سے لے چکی ہیں۔ حقوق زنان کی نگہبان اپنے پردادا سے بے انتہا متاثر ہیں، جنھوں نے دوصد سال قبل ماں بہن اور بیٹیوں کے لیے بہترین شعر کہے تھے۔ محترمہ نے حالؔی کے اشعار کو نہ صرف انگریزی بلکہ رومن میں بھی شامل کیا ہے تا کہ اُردو نہ جاننے والے بھی صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکیں۔ کیوں کہ ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید ہندوستان سے ہیں اور بالی ووڈ میں

روزانہ ایک اُردو، ہندی کی فلم بنتی ہے لہٰذا اسکرپٹ اور گانے رومن میں لکھے جاتے ہیں۔

اس خوب صورت محفل میں ادیب شعراء، موسیقار، سیاستدان، کمیونٹی، رضا کاران، ناقدین اور ہر شعبہ فکر کے لوگ موجود تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے ایک سردار دوست نے اُردو میں اپنے لاہور وزٹ پر ایک خوب صورت نظم سنائی، جب کہ موسیقار سہیل رعنا نے اپنے والد کے مجموعہ کلام میں سے چند نظمیں سنائیں۔ سابق سفیر پاکستان اور ٹورنٹو کے معروف شاعر جناب کرامت غوری نے بھی خطاب کیا۔ صدارت کے لیے قونصل جنرل جناب عمران صدیقی کو چنا گیا تھا۔ جنھوں نے اپنے مختصر خطبہ صدارت میں اچھی باتیں کیں۔ اتوار تھا لہٰذا اس ادبی محفل کو بادل نخواست رات 11 بجے ختم کرنا پڑا۔ ادارہ ایسٹرن نیوز جناب تقی عابدی صاحب کو اس بہترین ادبی نشست منعقد کرنے پر اور شہر کے لگ بھگ دوسو معززین کو لذیذ طعام گرم چائے اور مسلسل دیکھ بھال کرنے پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی دوسری تصنیف

''اظہارِ حق'' کی رسم رونمائی

''اظہارِ حق'' غیر مطبوعہ مراثی فرید لکھنوی، شمالی امریکہ سے شائع ہونے والی پہلی ضخیم کتاب

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقی تدوین اور ترتیب کے بدولت میر انیسؔ کے پڑپوتے جناب سلطان صاحب فرید لکھنوی کے غیر مطبوعہ مراثی سلام اور رباعیات ایک ضخیم کتاب کی شکل میں ٹورنٹو کینیڈا سے شائع ہوئے اور گزشتہ ہفتہ اس کتاب کی رونمائی انجام پائی۔ کتاب کا پہلا نسخہ ڈاکٹر تقی عابدی نے ڈاکٹر حسن اختر کو پیش کیا اور دوسرا نسخہ ڈاکٹر حسن اختر نے خلیل الرحمٰن کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر پیش کیا۔ ''اظہارِ حق'' فرید لکھنوی کے غیر مطبوعہ 15 مراثی، 15 سلام اور 36 رباعیات کے مجموعہ کا نام ہے۔ جسے شان گرافک پریس ٹورنٹو سے شائع کیا گیا یہ ضخیم کتاب بڑے سائز پر اور 726 صفحات پر مشتمل ہے جس میں ڈاکٹر عابدی نے بڑی تفصیل سے فرید لکھنوی کے فن شاعری پر گفتگو بھی کی ہے۔ فرید لکھنوی بہارِ انیس کے آخری پھولوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ محفل میں موجود ماہرِ انیسیات اور صاحبِ تصنیف نے اس کتاب کی اہمیت پر اجمالی گفتگو کی۔

طاہر احمر
''اُردو ٹائمز''
29/ اکتوبر 2004ء

دوستی کا آبشار نیاگرا فال

ہم جب سے گزشتہ دنوں کینیڈا میں نیاگرا فال کی زیارت کر آئے ہیں۔ اس پر جلال و جمال آبشار کا کئی کروڑ ٹن پانی سنگلاخ چٹانوں سے ہمیشہ کی طرح سر ٹکراتا مچلتا گزر چکا ہوگا۔ اسی کالم میں ہم ٹورنٹو کے ایک علمی آبشار ڈاکٹر تقی عابدی سے ملاقات اور ان کے ہاں کے مشاعرہ اور ان کی نادر روزگار ریسرچ لائبریری کا بھی ذکر کریں گے۔

تو پہلے ذکر نیاگرا فال کی سیر کا...... سنئے پانی جو مظلوم کی آنکھ کا آنسو، شیشے کے گلاس کا صاف شفاف پانی، شبنم کہر بادل بھاپ اولہ، برف، گلیشیر، بارش، جھیل، سمندر اور دریا ہے، آبشار بھی ہے اور آبشار بھی نیاگرا فال۔ دریائے نیاگرا پر جب جھیل ایری کا پانی جھیل اونٹاریو میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے گرتا ہے تو وہ ایک دوقومی آبشار بن جاتا ہے۔ کروڑوں صدیوں سے گرجتا گاتا یہ پانی آہنی سنگلاخ چٹانوں کو خاطر میں لائے بغیر بڑھتا قدرت کی کشش ثقل اور طاقت کا بے حد خوب صورت اور نادر روزگار مظاہرہ ہے جسے دیکھنے کے لیے سال بھر دُنیا بھر کے سیاح کیمرے لے لے کر آتے ہیں۔ اصل میں قدرت نے انسانی آنکھ سے اعلیٰ اور بہتر کوئی کیمرہ نہیں بنایا۔ بس شرط دیکھنے والی آنکھ کی ہے۔ یہاں آکر نیاگرا فال کے گرجتے کوندتے پانی اور آہنی چٹانوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر نیچے گہرے کھڈ میں جو دوسری جھیل ہے اسے پھیلتے ہوئے دیکھ کر ارتقاء کے طوفانی سیمابی رقص کا خیال آنا کوئی مشکل بات نہیں۔ اقبالؔ کا یہ لافانی شعر شاید اس منظر کی عکاسی کر سکے کہ

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

ان گنت صدیوں سے جاری و ساری اس آبشار کی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ

دو طاقتور ملکوں امریکہ اور کینیڈا کے ساحلوں کو بیک وقت چھوتا ہوا گزرتا ہے۔ اسے امریکی اور کینیڈین سمتوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ آبشار دو ملکوں کی دوستانہ سیاحت اور جغرافیائی سائنس کی علامت یا حقیقت بن چکا ہے۔ ہم سوچتے رہے کہ اگر اس طرح کا کوئی آبشار کسی جھیل میں ایشیا یا افریقہ کے دو پڑوسی ملکوں کی سرحد پر ہوتا تو ان کے سیاسی ماہرین یا لیڈر اسے بڑی مہارت سے سیاسی بیان بازی اور دونوں ملکوں کے درمیان نفرت پھیلانے کے لیے استعمال کرتے رہتے۔ ایک ملک کے سیاسی شاطر کہتے کہ یہ آبشار اور جھیل ہماری ہے اور دوسرے ملک کے ''عوامی نمائندے'' اور لیڈر دعویٰ کرتے کہ یہ آبشار ہمارا ہے اور اگر ہم برسرِ اقتدار آئے تو ہم اسے فتح کر کے اپنے ملک کا حصہ بنا دیں گے۔ خدا کی زمین پر نیلے آسمان، تیرتے ہوئے بادلوں، پر پھیلائے ہوئے بین الاقوامی سرحدوں سے بے خبر اور بے نیاز اڑتے ہوئے پرندوں، سورج کی روشنی، ہواؤں، خوشبوؤں اور بچوں کی معصوم ہنسی کی طرح پُرکشش دو ملکی سرحدوں پر رواں دواں یہ آبشار نفرت اور جنگ کا محور بن چکا ہوتا مگر چوں کہ یہ آبشار دو عقل مند دوست ملکوں کی سرحدوں پر واقع ہے اس لیے یہ ان کی باہمی دوستی اور امن کی علامت بنا ہوا ہے۔ آج تک کبھی کسی لیڈر نے اپنے سیاسی مقصد یا قومی عزت کے لیے اس کا نام تک نہیں لیا اور اس کے برعکس یہ دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان امن، تعاون اور بھائی چارہ کا ہمہ گیر نغمہ بنا ہوا ہے۔ دوستی اور انسانیت کا نشان نیاگرا فال ہے اور اسے قریب سے دیکھنے والے امریکی بھی ہیں اور کینیڈین بھی۔ وہ یہاں آ کر تمام امن پسند سیاحوں کی طرح سیاسی سرحدی شرائط پر عمل تو کرتے ہیں لیکن ان کے چہروں پر کسی طرح کی نفرت یا غرور کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ ایک ساتھ اس آبشار کی گرجتی ہوئی طاقتور دھاروں کو دیکھتے۔ قریب کے بنچوں پر یا ریستورانوں میں بیٹھ کر گرم کافی یا چائے سامنے رکھ کر گھنٹوں نیچر کے اس لافانی حسن اور طاقت کا گرجتا ترانہ سنتے رہتے ہیں۔

کیا تیسری دُنیا کے ترقی پذیر ملکوں کے لیے اس منظر میں کوئی سبق نہیں؟ کیا ایشیا اور افریقہ کے غریب لیکن ابھرتے ہوئے ملک عقل سے اس قدر کورے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے دریاؤں، جنگلوں اور صحراؤں پر اپنا حق جمانے کے لیے نفرت، جنگ اور خوفناک ہتھیاروں کے استعمال کو ضروری سمجھتے ہیں۔ عوام کے حقوق اور ترقی کا ڈھول پیٹنے والے

لالچی سیاستدان تو ایسے آبشاروں کی طاقت اور جھیلوں کی لہروں کو اپنی انا کے لیے استعمال کرتے ہیں اور خدا کی مشترکہ زمین کے اس مشترکہ تختہ پر قبضہ جمانے کے لیے آگ اور خون کے آبشار بہاتے گراتے ہیں۔

اب ذکر ٹورنٹو کی مشہور علمی شخصیت ڈاکٹر تقی عابدی کا۔ ہم اپنے میزبان اور کزن مصباح انصاری صاحب کے ساتھ ان سے ملنے گئے تو ہم نے ڈاکٹر صاحب کے بڑے سے خوب صورت گھر میں شاعروں اور اہل ذوق کی محفل سجی ہوئی دیکھی۔ پہلے تقی عابدی صاحب نے ہمیں اپنی شاندار ریسرچ لائبریری دکھائی اور اُردو کے نادر قلمی نسخوں اور اکابرین ادب سے متعلق اپنی ریسرچ سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس لائبریری میں اکابرین اُردو مثلاً میر تقی میر، اسداللہ غالب، میر انیس اور علامہ اقبال کے ایسے قلمی نسخے ہیں جن پر اہل علم کی نظر نہیں پڑی اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی گفتگو کے دوران بتایا کہ انھوں نے اپنی وصیت میں لکھ دیا ہے کہ ان کے اس سارے علمی خزانے کو ٹورنٹو کی لائبریری کے لیے عطیہ کر دیا جائے۔ ہم کو ایسا نادر موقع کہاں بار بار ملے، اس لیے ہم تو بڑے شوق اور تجسس سے غالب، میر، اقبال، انیس اور انشاء کے قلمی نسخوں کو دیکھتے بلکہ آنکھوں سے چومتے رہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی اس پردیس میں اُردو کے ان اکابرین پر ریسرچ کا جو کام کر رہے ہیں اسی کو چراغ سے چراغ جلانا کہتے ہیں۔ وہاں کی محفل مشاعرہ کا ذکر تو اس لیے غیر ضروری ہے کہ جہاں اتنے شاعر جمع ہوں وہاں مشاعرہ ہونا تو لازمی ہے۔

سید انجم گوہر
''اُردو میگ'' ٹورنٹو
30/جون 2005ء

عظیم الشان سہ روزہ اُردو کانفرنس 2005ء

(زیر اہتمام...... ''اُردو ٹائمز'')

ٹورنٹو کینیڈا میں پرستاران اُردو ادب کا فقید المثال اجتماع

17/جون بروز ہفتہ شمالی امریکہ کینیڈا کے شہر ٹورنٹو کا تاریخ ساز دن تھا۔ اس دن اُردو ادب کے پرستاروں نے ایک نئی تاریخ رقم کی۔ اپنی زبان کی فلاح اور بقاء کے لیے گلستان اُردو میں نئے پودے لگانے کا عزم کیا اور یہ بھی عہد کیا ہم اُردو ادب کے قدیم درختوں کی حفاظت کریں گے۔ اس کی جڑوں کو سوکھنے نہیں دیں گے اور ہر اس سازش اور وار کا مردانہ وار مقابلہ کریں گے جو اُردو کے شانوں کو ختم کرنے کی ناپاک آرزو رکھتا ہے۔

میں جب ''اُردو ٹائمز'' کے بیورو چیف طارق خواجہ کے ہمراہ اپنے دیگر ادب دوست شخصیات ڈاکٹر مظفر فاروقی، منیر صدیقی، امین حیدر، حمید اللہ خان، سرمست خان، خرم، محترمہ ڈاکٹر عطیہ قادری اور محترمہ حسینی کے ہمراہ 94۔ ایسٹ پر جا رہا تھا جس کی منزل کینیڈا کا شہر ٹورنٹو تھا۔ دورانِ سفر اُردو کا مستقبل میری نگاہوں کے سامنے رہا۔ میں کبھی پرامید تو کبھی ناامید ہوتا رہا۔ ہر انسان کو اپنی ماں سے پیار ہوتا ہے اور زبان اس کی ماں ہوتی ہے۔ محبت کرنے والا فرد بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے آشیانے پر برق گرنے والی ہے تو وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس خوف کے پیچھے ایک عزم بھی کارفرما ہوتا ہے۔ یہی وہ عزم تھا جو ہمارے دلوں میں کارفرما تھا۔ 10 گھنٹے کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد شہر ٹورنٹو کا وہ ہوٹل ہماری نگاہوں کے سامنے تھا جس میں عظیم الشان سہ روزہ اُردو کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔

15 سیٹوں پر مشتمل سفید رنگ کی وین اور ''اُردو ٹائمنز'' کی پہچان کو پارک کرنے کے بعد 10/افراد پر مشتمل قافلہ ہوٹل کے مین گیٹ سے داخل ہوگیا۔ سامنے ڈاکٹر تقی عابدی اپنے مخصوص انداز سے شیروانی میں ملبوس تیز تیز چہل قدمی کررہے تھے۔ ''جلدی چلئے کانفرنس شروع ہوچکی ہے'' سب سے پہلے جو گرجدار آواز ہماری سماعتوں سے ٹکرائی وہ ڈاکٹر تقی عابدی کی تھی۔ ہمارے سامنے کمروں کے حصول کا مسئلہ درپیش تھا۔

طارق خواجہ مسلسل اس تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ہم دس افراد جس میں دو خواتین بھی شامل تھیں، کمروں کے انتظار میں تھکے ہارے کھڑے رہے۔ آخر کار ہماری حالت زار پر انتظامیہ کو رحم آہی گیا۔ اب ہمارا رُخ اپنے کمروں کی جانب تھا۔ سج دھج کر ہم سب اب اس پنڈال کی طرف چلے جہاں کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا۔ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس شروع ہوچکا تھا جس کی صدارت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کررہے تھے جو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب عہدِ حاضر میں اُردو ادب کے لیے ایک گرانقدر سرمایہ ہیں جو سرزمین اُردو ادب کو سرسبز کرنے کی حتی المقدور کوشش کررہے ہیں۔ ان کے حوصلے جوان ہیں۔ یہاں امید نہیں یقین کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اُردو پر ہمیں اپنے ایمان کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا ہم یاس زدہ ہوجائیں، کیا مسائل زندہ زبانوں کے نہیں ہوتے۔ جو زبانیں مرجاتی ہیں ان کے مسائل نہیں ہوتے۔''

سنسکرت پر کوئی عالمی کانفرنس نہیں کرتا۔ ہندوستان میں اُردو مسائل ہیں۔ پاکستان میں علاقائی اور دوسرے معاشرتی مسائل ہیں۔ مذاکرے اور کانفرنس کا مقصد سوچ بچار کرنا ہے۔ کبھی کبھی اپنے ایمان کو تازہ کرنا پڑتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی زبان پر فخر کریں۔ کیا اس زبان کی کوئی خوبی نہیں ہے، کیا ہم اس کا نوحہ پڑھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ زبان کے دروازوں پر موت کے فرشتے آتے ہیں، زبانیں نہ کسی کے پیدا کرنے سے وجود میں آتی ہیں اور نہ باتیں کسی کے ختم کرنے سے ختم ہوتی ہیں۔

اس اجلاس کے مہمان خصوصی پاکستان کے نامور محقق جو شہر کراچی سے تشریف لائے تھے۔ جناب ڈاکٹر جمیل جالبی تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے تحقیقی مضامین، مقالات اور تنقید طالبان ادب کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ محترم ڈاکٹر جمیل جالبی نے

اپنے مختصر خطبہ میں جو ارشادات کہے وہ موجودہ غیر یقینی حالات کے عکاس تھے۔ چند ایسے نکات پر روشنی ڈالی جو روزمرہ زندگی میں اُردو کے حوالے سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔
اس اجلاس کی بارعب نظامت ڈاکٹر تقی عابدی صاحب کر رہے تھے۔ تقی صاحب کی آواز پنڈال میں گونجتی رہی۔ آواز کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ چہرے کے تاثرات بھی نمایاں ہوتے تھے جن میں آنکھوں کا استعمال غالب تھا۔ اس اجلاس میں اُردو کانفرنس کے خد و خال اور تعارف کا ایک اجمالی خاکہ بھی پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمان عؔبد جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں لیکن زبان و بیان کے معاملے میں دلکش لہجہ رکھتے ہیں، نے استقبالیہ کلمات کہے۔ تقریباً تمام مہمانانِ گرامی نے اُردو کی تازہ بستیوں کو آباد کرنے کے لیے اپنے اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں نئی تجاویز پیش کیں۔

ان مقررین میں وہ نامور ہستیاں بھی موجود تھیں جو بلاشک و شبہ اپنی حیثیت میں مکمل دبستان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن کے قلم کی نوک سے ایسے عظیم اور منفرد ادبی شہ پارے تخلیق ہو چکے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ نثر و نظم دونوں اصناف سخن کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو ان قلم کاروں کی دسترس سے باہر ہو یا ان کے فہم و ادراک سے خالی ہو۔ ان شخصیات میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے علاوہ ڈاکٹر قمر رئیس، عطاء الحق قاسمی، شان الحق حقی، ڈاکٹر تقی عابدی، ڈاکٹر مظفر فاروقی، محترمہ شکیلہ رفیق، ڈاکٹر عبداللہ، منیر سامی، نیئر جہاں آپا، شاہدہ حسن، ریحانہ روحی، عزیز قریشی، علی احمد فاطمی، رضا علی عابدی، زاہد علی خان، عاشور کاظمی اور ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز شامل ہیں۔

افتتاحی اجلاس میں شکریہ کے کلمات اپنے مخصوص انداز میں جناب خلیل الرحمٰن جو ''اُردو ٹائمز'' کے پبلشر ہیں، نے ادا کیے۔ انھوں نے وقت کی ضرورتوں میں اُردو کے مقام کا ذکر کیا اور اپنے ادارے کی خدمات پیش کیں۔ خلیل الرحمٰن نے اس موقع پر پھر اپنا عزم دہرایا کہ وہ اور ان کے ساتھی ''اُردو ٹائمز'' کے زیر اہتمام اس طرح کی ادبی محفلیں سجاتے رہیں گے۔ انھوں نے تمام حاضرین اُردو کانفرنس اور دور دراز سے آئے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کا شکریہ ادا کیا۔ خلیل الرحمٰن نے ایک موقع پر ڈاکٹر تقی عابدی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''آج کی تقریب کے اصل دولہا ڈاکٹر تقی عابدی ہیں۔ اگر یہ کینیڈا میں نہیں ہوتے تو

اتنی شاندار اُردو کانفرنس کرنا ہماری بس میں نہیں تھا۔"

اُردو کانفرنس مختلف اجلاسوں پر مشتمل تھی۔ ہر اجلاس اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھے۔ اجلاس میں پڑھے گئے مقالے اور ان کی زبان فصیح و بلیغ عبارت سے مرصع تھی۔ مقالوں میں ادا کیے گئے بعض جملے نشتر کی مانند دلوں میں پیوست ہو رہے تھے۔ مقالہ نگاروں کے خیالات نے اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کو چونکا دیا۔ یہ اجلاس استقبال، تعارف توضیحات، ادبیات اور جدید روایات، غالبیات، صحافت اور عصری تقاضے، اقبالیات، نعت اور ادبیات، اُردو زبان کے ترویج اور ترسیلی مسائل، ترقی پسند تحریک کی ادبی خدمات، اُردو کی نئی بستیوں کے مسائل، اُردو فکشن، مرثیہ میں ادب کے ارتقائی اقدار، خواتین کا اُردو ادب کی ترقی میں موثر کردار پر مشتمل تھے۔ اختتامی اجلاس، محفل غزل اور محفل مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔

ہندوستان سے آئے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس جو اُردو ادب کے درخشاں ستارے کی مانند روشن اور تابناک ہیں۔ مختلف اجلاس میں ان کے ارشادات نہ صرف قابل سماعت تھے بلکہ نئی فکر اور شوق کے آئینہ دار تھے۔ انھوں نے کہا کہ "اُردو کا ماضی بہت روشن تھا۔ تخلیل کی گہرائی کی وجہ سے یہ نوعمر زبان ہے۔ دیگر زبانوں کے مقابلے میں اُردو کا حال بے حال، اُردو کا نظام انحطاط کی طرف جا رہا ہے۔ 50 سال سے زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ 62ء سے 82ء تک ثمر قند، بخارا اور تاشقند میں اُردو پڑھائی جاتی تھی۔ غیر ملکی زبانوں میں 80 فی صد طالب علم انگریزی لیتے ہیں۔ خطوں میں اُردو زبان کا بول بالا ہے۔ جرمنی اور چیکوسلوا کیہ میں جہاں اُردو پڑھائی جاتی تھی، اب مایوسی کی فضا ہے۔"

ہندوستان سے آئے ہوئے ایک اور مایہ ناز ادیب و پروفیسر علی فاطمی نے مختلف اجلاس میں صدارت اور شرکت کی۔ انھوں نے عہدِ حاضر کو اُردو کے لیے برے وقت سے تعبیر کیا۔ انھوں نے مشترکہ طور پر اُردو کے تہذیبی کردار کی حفاظت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ "اُردو کراچی اور حیدر آباد سے روٹھ گئی ہے۔ اب اس کا سفر شمالی امریکہ کے شہروں کی طرف ہے جس کی ایک مثال آج کی یہ عظیم الشان کانفرنس ہے۔ محترم نیئر جہاں جو کینیڈا میں مقیم ہیں۔ وہ مسلسل اپنے وسائل میں رہتے ہوئے اُردو کی بے لوث خدمت کر رہی ہیں۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''یہ اُردو کی آپا ہیں۔ یہ ہم سب کی آپا ہیں۔'' آپا نیّر جہاں نے کہا کہ ''جہاں تک اُردو کی ترقی اور بقاء کا تعلق ہے، ابتدا میں سب سے بڑی ذمہ داری ماں کی ہوتی ہے۔ یہ ماں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں سے اُردو میں بات چیت کرے۔ زبانیں قوموں کے درمیان پلوں کا کام کرتی ہیں۔'' انھوں نے کہا: ''جو کام ہم سب انجام دے رہے ہیں، اس کے لیے دیوانگی اور سچا عشق ضروری ہے۔'' نسیم اختر جو نیویارک سے تشریف لائی تھیں، انھوں نے ایک موقع پر کہا کہ ''تشنگی مٹانے کے لیے طوالت کبھی کبھی ضروری ہو جاتی ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''زبان کے معاملے میں میرا موقف ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز سے ملتا جلتا ہے۔ زبان صرف انہی دو صفتوں میں زندہ رہتی ہے۔ ادب کیسا پیدا ہو رہا ہے اور وہ عوام میں کتنا مقبول ہو رہا ہے۔ اچھا ادب پیدا ہو رہا ہے یا نہیں، تصنیف اور تالیف کا کام جاری ہے۔ فلموں کی دُنیا سے لے کر ماں کی گودوں تک اُردو زبان جاری ہے۔ یہ مومن کی زبان ہے، یہ یقین کی زبان ہے۔ بعض علاقوں میں انحطاط کا معاملہ ہے، بعض مقامات میں سورج کی طرح روشن ہے۔ کون جانتا ہے کہ کینیڈا میں رہنے والا ڈاکٹر تقی عابدی 20 سے 30 کتابیں لکھ دے گا۔'' علامہ اقبال کے مصرعے سے انھوں نے اپنے خیالات کا اختتام کیا۔

''پیوستہ رہ شجر سے، اُمید بہار رکھ!''

اس کے بعد تقی عابدی نے ایک عظیم شخصیت کا تعارف کرایا کہ ''ہمارے شہر کی شان، آن اور مان جناب محترم شان الحق حقی صاحب، میں نے بہت عرصے بعد جناب شان الحق حقی کو دیکھا تھا۔ میرے تصور میں جوان کی تصویر تھی وہ اس کے قطعی برعکس نظر آئے۔ ان کی کمر کا خم زمین کی طرف اور ان کی بزرگی آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب کی شان آج بھی ان کے دم سے ہے۔ خدائے بزرگ و برتر ان کی عمر دراز فرمائے اور انھیں ہمارے درمیان اس وقت تک رکھے جب تک اُردو کو ایک بار پھر ماضی جیسا مقام نہ مل جائے۔ جہاں میر و غالب اُردو کی سلطنت پر حکومت کرتے تھے۔'' محترم شان الحق حقی نے کہا کہ ''میں یہ نہیں مانتا کہ اُردو نوخیز زبان ہے۔ اُردو کے آغاز کا سرا پکڑنا آسان نہیں، قیاس زیادہ ہے۔ صدیوں کے تجربات کے نچوڑ سے محاورے سے بنتے

ہیں اور کہاوتیں وجود میں آتی ہیں۔ اب اُردو ایک ایسے مرحلے میں ہے کہ آل انڈیا کی زبانوں میں ایک زبان اُردو ہے۔ اُردو ادب کو بہت فروغ ہوا ہے۔ اُردو کئی انقلابات سے گزری ہے، اب اس پر بُرا وقت ہے، زبانیں مٹ بھی جاتی ہیں، اُردو نازک دور سے گزر رہی ہے جہاں اس کی جڑیں ہیں وہاں سے وہ اکھڑ رہی ہے۔ پاکستان میں گلی محلے میں انگلش اسکول کھل گئے ہیں۔ یہ انگریزوں نے نہیں کھولے ہم نے کھولے ہیں۔ حقائق سے گریز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کا سامنا کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس موقع پر کہا کہ ہفت روزہ ''اُردو ٹائمز'' قابل مبارک باد ہے۔ انھوں نے نئی آبادیوں میں اُردو زبان کے ورثہ کو پھیلانے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ اخلاق اور زبان فروغ پا سکے۔'' انھوں نے کہا کہ ''ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی نئی نسل میں اُردو زبان کو پھیلایا جائے۔ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے درمیان اتحاد کا فروغ ہو۔ جب دو اُردو زبان بولنے والوں کے درمیان یکجہتی اور پیار ہوگا تو ردعمل کے طور پر اُردو زبان کا بھی فروغ ہوگا۔ محبت بڑھے گی، نفرت اور دوریاں مٹ جائیں گی۔ اُردو کو بحیثیت زبان اسکول کی تعلیم میں شامل کیا جائے بصورت دیگر آپ کی تہذیب کا چراغ گل ہو جائے گا۔ اس کے لیے باعمل قیادت کی ضرورت ہے۔ خلیل الرحمٰن کا ''اُردو ٹائمز'' پورے امریکہ میں اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے سنگ میل ثابت ہوگا۔''

''اُردو ٹائمز'' کے پبلشر جناب خلیل الرحمٰن نے ایک اجلاس کے موقع پر کہا کہ ''اُردو ٹائمز، کا لندن سے بھی اجراء کیا جا رہا ہے۔ ہم انشاء اللہ 14 ر اگست کو پہلا ایڈیشن نکالیں گے۔'' انھوں نے کتابوں کی پبلشنگ کے لیے اپنی خدمات کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''ہم ایسے ادیبوں اور قلم کاروں کے ساتھ بھرپور تعاون کریں گے جو مالی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت سے محروم ہیں۔'' جناب خلیل الرحمٰن نے اُردو آن لائن سروس کا بھی اعلان کیا جس کا آغاز عنقریب کر دیا جائے گا۔

تمام اجلاس میں وقفے وقفے سے سوال و جواب کے سیشن بھی ہوتے رہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہاں اسٹیج پر نامور ادیب و شاعر موجود تھے، وہیں حاضرین میں بھی پائے کے قلم کار اور ادب نواز شخصیات موجود تھیں جنھوں نے ہر موقع پر ایسے سوالات کیے جن کے

جوابات کی اشد ضرورت تھی۔ سوال کرنے والوں میں انگلینڈ سے آئے ہوئے معروف ادیب، ناقد، استاد اور محقق ستیہ پال آنند بھی تھے۔ جنھوں نے تقریباً ہر اجلاس میں قابل قدر سوالات کیے۔ اکثر ان کے سوال جواب دینے والوں پر بھاری پڑ جاتے تھے۔ ایک موقع پر جب ڈاکٹر مظفر وارثی نے اپنے افسانے ''اساطیر'' کا ہندو مذہب کے پس منظر میں ذکر کیا تو ڈاکٹر ستیہ پال آنند ناراض ہو گئے۔ جس کا انھوں نے برملا اظہار کیا اور ڈاکٹر تقی عابدی سے اس کا جواب طلب کیا۔ ڈاکٹر تقی نے اس معاملے کو اپنی ذہانت سے حل کر دیا اور معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر مظفر وارثی اس موقع پر خاموش رہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ان کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس اس کا جواب ہو لیکن خاموش رہنا اس وقت کا تقاضا تھا۔ قارئین پوری کانفرنس اگر لمحہ بہ لمحہ رپورٹنگ کی جائے اور ہر اجلاس کی تفصیل بیان کی جائے تو اخبارات کے صفحات میں یہ صدفی صد ناممکن ہے۔ ہاں اگر اُردو کانفرنس پر ایک مختصر مجلّہ ترتیب دیا جائے تو ایسا ممکن ہے۔ میں اس رپورٹ میں چیدہ چیدہ گفتگو آپ سے قلم کی زبانی کر رہا ہوں تاکہ آپ کا اس تاریخی کانفرنس سے رابطہ ہو جائے۔ اندازے آپ خود لگا سکتے ہیں۔

جب ایک اجلاس میں ترقی پسند تحریک کی بات چلی تو اُردو تاریخ کے بہت رخ سامنے آئے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر قمر رئیس نے کی۔ انھوں نے شریک مقالہ نگاروں کی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے اپنے ارشادات میں کہا کہ ''جب معاشرے میں استحصال ہوتا ہے تو ترقی پسند تحریک کے ادیبوں اور شاعروں نے سامراج، طاغوتی طاقتوں اور گماشتوں کے خلاف قلم اٹھایا اور عوام میں شعور اور بیداری پیدا کی۔ اس دور میں جو ادب تخلیق ہوا تو ردعمل کے طور پر کتابوں کے انبار لگ گئے۔'' اس موقع پر معروف ریڈیو براڈ کاسٹر اور بے شمار سفرناموں کے مصنف قمر علی عباسی جو میرے اپنے کراچی کے باکمال ادیبوں میں شامل ہیں جن سے اس کانفرنس کے طفیل میری ملاقات ہوگئی۔ ان کی بیگم نیلوفر عباسی جن کا مشہور زمانہ کردار ''شہ زوری'' آج بھی ڈراموں کے حوالے سے مقبول ہے، ان کے ہمراہ تھیں۔ جناب قمر علی عباسی نے ایک سوال کی شکل میں اپنی گزارشات عرض کیں۔ انھوں نے کہا: ''سارا کریڈٹ آپ ترقی پسند تحریک کو نہ دیں۔ وہ شاعر اور ادیب جو ترقی پسند تحریک کا حصہ نہیں تھے، انھوں نے بھی اُردو ادب کے لیے دُنیا میں لازوال اور بے مثال کام کیا

ہے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو یہ سراسر ناانصافی ہوگی۔ ''جس پر حال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ تالیوں کی گونج نے میرا خیال ہے کہ قمر علی عباسی کو ان کے سوال کا جواب دے دیا تھا اور اب کسی جواب کی ضرورت نہیں تھی۔

اس کانفرنس میں برطانیہ سے آئے ہوئے انگریز لیکن اُردو ادب کے شہسوار ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز بھی موجود تھے جو حاضرین کے لیے ایک پیغام آگہی ہے۔ وہ اُردو زبان کے حسن کی علامت تھے۔ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز لسانیات کے پروفیسر ہیں جو بیک وقت کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں جن میں فرانسیسی، اطالوی، روسی، ہندی، نیپالی، اُردو اور فارسی شامل ہے۔ انھوں نے اس کانفرنس میں بھرپور شرکت کی اور کئی مواقع پر اپنے مقالات میں گرانقدر خیالات اور تجاویز پیش کیں۔ ڈاکٹر صاحب 17 کتابوں کے مصنف ہیں لندن یونیورسٹی میں اُردو پڑھاتے ہیں۔

اس کانفرنس میں غالبیات اور اقبالیات پر مقالہ نگاروں نے روشنی ڈالی۔ اقبالیات کے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر جمیل جالبی نے کی جب کہ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر تقی عابدی شامل ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے مقالے میں علامہ اقبالؔ سے متعلق چند نکات قابل توجہ تھے۔ ان کے 3 اشارات قابل توجہ تھے۔ وہ ڈاکٹر علامہ اقبالؔ کے قطعات کو رباعیت ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی جب 24 اوزان کے تحت علامہ اقبالؔ کے قطعات کا رباعیات کے پلڑے میں وزن کرتے ہیں ان کا نکتہ نظر ہے کہ صرف 4 قطعات رباعیت کے زمرے میں آتے ہیں باقی رباعیات نہیں قطعات ہیں۔ انھوں نے ایک پنجابی نعت کا بھی ذکر کیا جس کو علامہ نے کہا کہ ''ایسی نعت تو میں نے کبھی نہیں سنی۔'' تقی عابدی نے کہا کہ ''وہ نعت کہاں ہے۔''

اس کانفرنس میں مرثیہ میں ادب کے ارتقائی اقدار پر بھی ایک خصوصی اجلاس ہوا، اس میں بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے چونکا دیا۔ انھوں نے کہا کہ ''استاد مرزا دبیرؔ مرثیہ نگاری کے افق کا وہ عظیم ستارہ ہے جس نے ایک لاکھ 24 ہزار اشعار کہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''اس صنفِ سخن کے شاعر کے ساتھ ظلم ہوا ہے، وہ بہت بڑا شاعر ہے لیکن اُس کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کا وہ حقدار تھا۔

سید انجم گوہر
"اُردو ٹائمز" (شکاگو)
30/ جون 2005ء

ٹورنٹو میں عالمی مشاعرہ و محفل غزل

بسلسلہ سہ روزہ اُردو کانفرنس 2005ء

قارئین گزشتہ ہفتے ایک طویل رپورٹ بمعہ تصاویر اخبار کے مکمل دو صفحات پر مشتمل تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اُردو زبان کے وہ شائقین جن کی شرکت کسی بھی وجوہ سے اس عظیم الشان اُردو کانفرنس میں ممکن نہ ہوسکی، وہ ان صفحات کی ورق گردانی کر کے اپنے ذوق ادب کی تسکین کر لیں۔

میں اس کالم کے ذریعے ان تمام ادب شناس افراد کا ممنون ہوں جنھوں نے اس سہ روزہ کانفرنس کی قلمی روئیداد کو پسند کیا اور مجھے فون کر کے میری اس کاوش کو سراہا۔ گزشتہ رپورٹ میں مشاعرہ اور محفل غزل کا حال سپرد قلم نہیں کر سکا تھا۔ چناں چہ ان دو تقریبات کا کچھ حال رقم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

محفلِ غزل میں پاکستان کی غزل گائیکہ محترمہ یاسمین راشد جو میری معلومات کے مطابق امریکہ میں مقیم ہیں، محفلِ غزل کے لیے خاص طور پر ان کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان کے لباس، شکل اور بالوں کی بناوٹ سے اب تک وہ غزل سرا نہیں ہوئیں، یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ غزل یا گیت بھی خوبی سے گا سکتی ہیں۔ وہ پوپ سنگر زیادہ معلوم ہوتی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ غزل تو در کنار کبھی ایک ردیف یا قافیہ بھی ان کے پاس سے نہیں گزرا۔

کانفرنس کے پہلے دن جب کچھ وقت باقی رہ گیا تھا، ہوٹل کے ایک ہال سے طبلے کی تھاپ سنائی دی تو میں نے طارق خواجہ "اُردو ٹائمز" شکاگو کے بیورہ چیف اور کالم نگار امین حیدر سے کہا: "چلیں دیکھتے ہیں کون نغمہ سرا ہے۔" طارق خواجہ کچھ زیادہ پر شوق نہیں

تھے۔ تکلفاً ہمارے ساتھ ہولئے۔ اندر سامنے ایک ماڈرن غزل گائیکہ جن کا نام یاسمین راشد تھا، غزل کا ابتدائی راگ الاپ رہی تھیں۔ پہلے دن کچھ مشہور نغمے انھوں نے سنائے۔ جناب طبلہ نواز طبلے اور تال یعنی ڈھول کو بیک وقت بجانے کی کوشش کرتے تو کبھی سُر آگے نکل جاتا تھا تو کبھی تال کمزور پڑ جاتی تھی۔ اوپر سے ڈھول کو جب ایک چھڑی سے موصوف چھیڑتے تھے تو یوں گماں گزرتا تھا کہ جیسے ہمارے بچپن میں نوجوان روزہ دار ڈالڈا گھی کے ڈبے کو بجا کر رمضان میں سحری کے وقت صبح تڑکے اُٹھایا کرتے تھے۔ چوں کہ پہلے دن وقت محدود تھا لہٰذا چار پانچ غزلوں تک ہی نوبت پہنچی۔ دوسرے دن تو باقاعدہ غزل کی محفل تھی۔ تمام شرکاء، جو پہلے دن نہیں آسکے تھے، وہ بھی نشستوں پر براجمان تھے۔ آج قدرے بہتر غزل کا سماں تھا اور ماحول بھی، ایک گلوکار ہمارے سامنے طبلے اور ہارمونیم کے ساتھ کم آواز میں سنگت کر رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ شہنشاہِ غزل مہدی حسن دوبارہ جوان ہو کر غزل سرا ہونے والے ہیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ایک صاحب بڑے برجستہ لہجے کے معلوم ہوتے تھے۔ بشکل مہدی حسن کا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے کہ طاہر جمال ہمارے ٹورنٹو کینیڈا کے مہدی حسن ہیں جنھوں نے باقاعدہ موسیقی کی تربیت حاصل کی ہے۔ جن کے استاد جناب سہیل رعنا صاحب ہیں۔ آج یہ ان کی اجازت سے پہلی بار اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔

میں نے جب یہ تعارفی کلمات ناظم صاحب کے سنے تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا کیوں کہ جن استادِ محترم کا موصوف نے ذکر کیا تھا، آج بھی پاکستان میں وہ موسیقی کے بینارہ نور کی مانند ہیں جن سے طالبان موسیقی اپنے دلوں کو منور کر رہے ہیں۔ لازوال گیت، گانے اور قومی نغمے جو آج بھی زبان زدِ عام ہیں، ان کی دھنیں سہیل رعنا کے ذہن کی تخلیق کردہ ہیں۔ شکل مہدی حسن جیسی، استاد سہیل رعنا جیسا ہو تو یقیناً فن کار حاضرین کے دل موہ لے گا۔ طاہر جمال نے ایک پرانی بندش جو پاکستان کے نامور گلوکار سلیم رضا مرحوم نے گائی تھی، سُر اور تال پر چھیڑی جس کے بول یہ تھے۔

دل بھی کرتا ہے یاد چھپ کے
نام لیتی ہے زباں تیرا

کس سے پوچھوں میں خبر تیری
کون بتلائے گا نشاں تیرا

طاہر جمال خوب صورت آواز کے ساتھ چہرے کے تاثرات مہدی حسن کی طرح دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھنوؤں کی حرکت سُروں کے حساب سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ طاہر جمال کی مونچھیں مہدی حسن کے مقابلے میں ذرا زیادہ تھیں۔ اگر ان کو ایک باریک لائن کی صورت میں ہلکا کر لیا جاتا تو مہدی حسن سے کلی مشابہت ہو جاتی۔ اس بزم غزل میں یاسمین راشد نے طاہر جمال کا بھرپور ساتھ دیا۔ شائقین کے بے حد اصرار پر دونوں نے مشترکہ گیت گائے جو کافی پسند کیے گئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ دونوں نے اس کے باوجود کے پہلے کبھی ایک ساتھ گیت نہیں گائے تھے، گیتوں کو خوب صورتی سے پیش کیا۔

یاسمین راشد کی آواز کافی جاندار تھی لیکن ان کے ساتھ سازندوں کا وہ ملاپ نہیں دیکھا گیا جو محفل غزل کی جان ہوتا تھا لہٰذا غزل کا مکمل تاثر جو سامعین کو محو کر دیتا ہے وہ قائم نہیں ہو سکا۔ یاسمین راشد نے اپنے طور پر بڑی محنت کی اور کافی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئیں۔ طاہر جمال جنھوں نے باقاعدہ موسیقی کی تربیت حاصل کی ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اس پروگرام کے لیے باقاعدہ تیاری نہیں کی تھی۔ معروف گلوکار حبیب ولی محمد کی غزلیں انھوں نے بہت خوب صورتی سے گائیں۔ اس کے علاوہ دورِ حاضر میں میر کے جانشین کلیم عاجزؔ کی خوب صورت غزل انھوں نے ان ہی کے مخصوص ترنم میں سنائی جس کے بول تھے۔

اے میرے پیارے، اے میرے زلف پریشاں والے
تجھ کو سمجھاتے رہے چاک گریباں والے
چارہ فرما کبھی بیمار بھی ہو جاتے ہیں
درد والے کبھی بن جاتے ہیں درماں والے

میں یہاں انتہائی ادب سے منتظمین جن کے ذمہ محفل غزل کا انعقاد تھا، درخواست گزار ہوں کہ وہ اس محفل کو اور بھی خوب صورتی سے پیش کر سکتے تھے۔ چند نامور غزل گائیک کو بھی مدعو کیا جا سکتا تھا۔ سامعین میں دُنیا بھر سے آئے ہوئے شاعر و ادیب موجود تھے جو نہ صرف

غزل کے مزاج کو سمجھتے تھے بلکہ سُر اور تال سے بھی واقف تھے۔ ان کے سامنے ایک ایسا پروگرام پیش کرنے کی ضرورت تھی جس کے ذریعے اُردو زبان کا وہ حسن جو غزل کی گائیکی میں چھپا ہوا ہے، ظاہر ہو جاتا۔ اس طرح سے غزل کی شان میں اضافہ ہوتا۔ مجھے اُمید ہے کہ لندن میں ہونے والی کانفرنس میں اس غلطی کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔

قارئین تیسرے دن اختتامی اجلاس کے بعد ایک عالمی مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا مشاعرہ کافی تاخیر سے شروع ہوا۔ صدارت محترم ڈاکٹر جمیل جالبی نے کی۔ شاعروں میں مجھ حقیر فقیر کا نام بھی تھا اور شکاگو سے میرے شاعر منیر صدیقی شرر بھی شامل تھے۔ مہمان شعراء کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ اس کے علاوہ چند اور معزز شخصیات کو بھی اسٹیج پر مدعو کیا گیا۔ مشاعرے میں جو مہمان شاعر موجود تھے ان میں پاکستان سے عطاء الحق قاسمی، شاہدہ حسن، ریحانہ روحی، ہندوستان سے شاہد ماہلی، لندن سے عاشور کاظمی، ڈاکٹر ستیہ آنند پال، نسیم آفتاب اور رضا عابدی موجود تھے۔

باقی شمالی امریکہ اور کینیڈا سے جن شعراء کرام نے شرکت کی ان میں جناب حنیف اخگر، ڈاکٹر عبدالرحمان عبد، سید نسیم اختر، وکیل انصاری، تسلیم الٰہی زلفی، اسد رضوی، احمد سلمان، رشید ندیم، افتخار حیدر، نسیم سید، عابدہ کرامت، ڈاکٹر مطلوب حسین، سبطین کاظمی، کرامت غوری، منیر ارشد، گل رخ، اقبال حیدر، اسد آثر، پروین شیخ، فیاض جعفری، سلطان احمد، منیر سامی، طارق حسین، رفیع رضا، تقی عابدی، عابد جعفری، افضال نوید، ریاض زیدی، ناظم مقبول، راحیہ نسیم، حامد یزدانی، ظفر کلیم، نسیم سید، مونا شہاب، انجم تاج، فرخ شہزاد، عزیز قریشی اور اس کے علاوہ بھی کئی شعراء کرام نے اپنا کلام سنایا۔ مشاعرے کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر تقی عابدی تھے۔ جن میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک ڈکٹیٹر منتظم میں ہوتی ہیں۔ لیکن کہیں کہیں ان کے اندازے غلط بھی ثابت ہوئے جس کی ایک مثال یہ عالمی مشاعرہ بھی ہے۔ مقامی شعراء کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ کچھ دیر کے لیے حاضرین حیرت میں آ گئے۔ وہ ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر کے یہ کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر تقی عابدی اتنے بہت سارے شاعر کہاں سے لائے ہیں۔ ہم بچپن سے سنتے آئے تھے کہ شاعری ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ شاعر پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جا سکتا لیکن ٹورنٹو

میں یہ قدیم سچائیاں مغروضے معلوم ہوئے۔ آج میڈیا پر جس طرح سے گلوکار پیدا ہو رہے ہیں، مشاعروں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ میں اس بات سے بے خبر تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں مقامی شعراء اس عالمی مشاعرے میں اپنا کلام سنائیں گے اور وہ بھی 10 سے 15 اشعار پر مشتمل غزل، بعض شعراء نے اپنی طویل غزلیں ترنم سے بھی سنائیں۔ جب کوئی طویل غزل ترنم سے پڑھی جاتی تھی تو وہ قوالی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے ان شاعروں کو پڑھانے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کوئی نئی بات اور منفرد نکتہ اٹھانے میں ماہر تصور کیے جاتے ہیں۔ کئی مواقعوں پر انھوں نے اس رسم کو بڑی خوب صورتی سے نبھایا کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور بھینس بھی مر جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام شاعروں کے ناموں کی پرچیاں ایک شیشے کے مرتبان میں ڈال دیں اور ڈاکٹر جمیل جالبی پر جو صدارت کر کے یقیناً بے حال ہونے والے تھے۔ یہ ذمہ داری ڈال دی کہ وہ ایک پرچی نکالیں اور نظامت پر فائز فرد کے حوالے کر دیں تا کہ وہ خوش قسمت شاعر یا شاعرہ کا نام پکار سکے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ شاعروں کے درمیان مرتبے کا مسئلہ حل ہو گیا اور دوسرا یہ کہ سب شاعر چوکنے بیٹھے رہے کہ کب اور کسی وقت بھی ہمارا نام پکارا جا سکتا ہے ورنہ شاعر عموماً آدھے سوتے ہیں اور آدھے جاگتے ہیں اور میں نے زندگی میں ایسے شاعر بھی دیکھے ہیں جن کو اس وقت نیند سے اٹھایا گیا جب کلام پڑھنے کی ان کی باری آئی۔ لیکن نہیں صاحب، یہ اس دور کے شاعر نہیں ہیں، یہ خود بھی جاگتے ہیں اور دوسروں کو بھی زبردستی جاگنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

مشاعرہ جاری تھا۔ مہمان شاعر و شاعرات پر غنودگی طاری تھی۔ شاعرات کے میک اپ کی خوب صورتی مدھم پڑنے لگی۔ حاضرین کی تعداد میں کمی واقع ہونے لگی۔ یہ صورت حال دیکھ کر جناب ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا کہ "میری خواہش ہے کہ میں اپنا خطبہ صدارت قبل از وقت پیش کر دوں۔" بات دراصل یہ تھی کہ ڈاکٹر جمیل جالبی مشاعرہ کی صدارت کا خاصا تجربہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہی سوچا ہوگا کہ اس سے پہلے کہ ہال حاضرین سے خالی ہو جائے میں اپنا کام تو پورا کر لوں۔ خطبہ صدارت بھی اپنی نوعیت اور تحریر کے اعتبار سے معنی خیز تھا۔ اس خطبہ نے مشاعرہ کی صدارت کی قلعی کھول دی۔ جو نقشہ صاحب نے کھینچا، سن کر

مزہ آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مشاعرہ کی صدارت کو ایسی سزا قرار دیا جو بغیر جرم کے صاحب صدر کو دی جاتی ہے۔ کیوں کہ صدر سب سے پہلے کرسی صدارت پر تشریف فرما ہوتا ہے اور سب سے آخر میں اٹھتا ہے۔ صدر کو کم و بیش تمام شعراء کا کلام سننا پڑتا ہے اور ہر اچھے برے شاعر پر داد نہیں تو کم از کم سر تو ہلانا ہی پڑتا ہے اور پورے مشاعرہ کو سننا اس کی صدارتی ذمہ داری میں شامل ہے۔

شیشے کا خوب صورت مرتبان پیلے رنگ کی پرچیوں سے بھر چکا تھا۔ پرچیاں مرتبان کے گلے تک پہنچ چکی تھی۔ اندازہ لگانے والوں نے اندازہ لگایا تھا کہ مقامی شاعر اپنے میزبان ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مہمان شعراء کی حالت زار دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہر شخص کی نظر مرتبان پر تھی کہ یہ پرچیوں سے کب خالی ہوگا اور سونے پر سہاگہ کہ دوران مشاعرہ بھی کچھ مزید پرچیاں بلاتکلف مرتبان میں ڈالی جا رہی تھیں۔ تقریباً 25 سے 30 شاعر و شاعرات نے خوب دل بھر کر لمبی لمبی غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ جب مقامی شعراء نے مشاعرہ کی جوانی کو لوٹ لیا تو مشاعرہ کینیڈا کی سرحدوں سے باہر نکلا اور امریکہ میں داخل ہو گیا۔ نیویارک، واشنگٹن، مشی گن اور شکاگو کے شاعروں کا آخر کار نمبر آ ہی گیا۔ ہم بھی شاعروں کی اس لمبی قطار میں شامل تھے۔ شکاگو کے بزرگ شاعر منیر صدیقی شرر کے بعد ہمارا نمبر آیا۔ مونا شہاب جو شاعر اور افسانہ نگار ہیں، اس وقت مشاعرے کی نظامت کر رہی تھیں، مجھے جب انھوں نے شکاگو کے نوجوان شاعر کہہ کر اسٹیج پر بلایا تو میری ساری تھکن دور ہو گئی۔ میں بہت خوش ہوا اور اپنی جوانی پر ناز کرنے لگا۔ اسٹیج پر جا کر غزل سنانے سے قبل میں نے مونا شہاب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا جس پر انھوں نے کہا کہ ''معاف کیجیے میں نے پہلے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔'' میں نے جواباً عرض کیا کہ ''اب تو آپ نے دیکھ لیا......؟''

میں غزل پڑھ کر اپنی نشست پر جا لیا۔ طارق خواجہ نے میری کہنی پر ماشاءاللہ اپنے وزنی بازو کا وار کیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ واپس جانے کا اشارہ ہے۔ رات بیت چکی تھی، صبح کام کا دن تھا، شکاگو میں سب کی اپنی اپنی مصروفیات بھی تھیں اور مشاعرہ نے ویسے بھی سب کو نڈھال کر دیا تھا۔ جن کو سننے آئے تھے وہ ابھی تک خاموش اسٹیج پر اپنی باری کا انتظار کر رہے

تھے۔ ریحانہ روحی اور شاہدہ حسن کے لوگ منتظر تھے اور میں بھی چاہتا تھا کہ ریحانہ روحی کو سن کر جاؤں۔ مجھے ان کا ایک شعر ویسے بھی بہت پسند ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

خودداریوں میں حد سے گزر جانا چاہیے
عزت سے جی نہ پائیں تو مر جانا چاہیے

بہر حال یہ فیصلہ ہوا کہ اب رخت سفر باندھا جائے۔ مشاعرہ سے اٹھ کر ہم اپنے اپنے کمروں کی طرف ہو لئے، بکھرے ہوئے سامان کو یکجا کیا، سارا سامان ڈاکٹر مظفر فاروقی صاحب کے کمرے میں موجود تھا۔ اب ہمارا رخ اپنی سفید وین کی طرف تھا جو مشاعرے میں شرکت کے لیے ہمارے ساتھ آئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم سب ٹورنٹو کی سڑکوں پر تھے۔ راستے میں چائے اور کافی پینے کے لیے رکے تاکہ نیند کا غلبہ جو سب پر طاری تھا، اس کو بھگایا جائے۔

قارئین! اس مشاعرہ کے سارے پس منظر میں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا مہمان شاعر و شاعرات کو اس لیے مدعو کیا گیا تھا کہ وہ کینیڈا کے تمام میزبان شعراء کا کلام سنیں۔ اگر اتنا ہی ضروری تھا تو 3 اشعار تک شعراء کو محدود کر دیا جاتا۔ اس طرح سے مزید وقت حاصل ہو جاتا اور مشاعرے میں دلچسپی آخر وقت تک قائم رہتی۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں دہرائی جائے گی اور مشاعرہ کا اہتمام کرتے وقت اس تجربے کو سامنے رکھا جائے گا۔

بشیر بیگ (کینیڈا)

29/جون 2010ء

کینیڈا میں حیدر آباد کمیونٹی سینٹر کے قیام کا اعلان
ڈاکٹر تقی عابدی کے اعزاز میں تقریب

حیدر آباد دکن فاؤنڈیشن کینیڈا (ایچ ڈی ایف سی) کے زیر اہتمام ڈاکٹر تقی عابدی کو اُردو ادب کی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے سالانہ محفل حیدر آباد کلچرل پروگرام کا انعقاد وریلر کنونشن سینٹر میں کیا گیا۔ مذکورہ فاؤنڈیشن حیدر آباد دکن سے تعلق رکھنے والے پاکستانیوں اور بھارتیوں پر مشتمل ہے۔ اس موقع پر راقم (صدر ایچ ڈی ایف سی) نے اعلان کیا کہ ایچ ڈی ایف سی، کینیڈا میں کمیونٹی سینٹر کی تعمیر کا ارادہ رکھتی ہے، جس کے لیے مناسب جگہ کی تلاش ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''حیدر آباد دکن بھارت کا وہ شہر ہے، جہاں مشرقی و مغربی بھارت کی نمایاں ثقافتی ولسانی تہذیبوں کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''حیدر آبادی نژاد کینیڈین شان دار اور قابلِ رشک ماضی و ثقافت کے علم بردار ہیں۔ ان کی سماجی ہم آہنگی، فن کارانہ جدت، لسانی نظریے، قومیت اور ثقافتی ارتعاش کا دُنیا بھر میں کوئی مدمقابل نہیں ہے۔ یہ قابلِ فخر ورثہ ہے۔'' انھوں نے عزم کیا کہ ''نہ صرف منفرد ثقافت کو پردیس میں قائم رکھیں گے، بلکہ نئی نسل کو بھی اس کا علم بردار بنائیں گے۔'' اس موقع پر کینیڈا اور امریکہ میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے حیدر آباد نژاد کینیڈینز کو ایوارڈز سے نوازا گیا۔ جس میں ڈاکٹر تقی عابدی (اُردو)، ہارون صدیقی (صحافت)، کرم علی خان (بزنس)، صدیق برنی (سماجی خدمات)، مرزا پرویز بیگ (سماجی رابطے) سمیت رفعت عالم، محمد ایوب خان عابدی، بشیر بیگ، بونی کرومی، حیدر رسید، انجم سعید اور ذکی حسین شامل ہیں۔ پروگرام کے آخر میں کینیڈا اور امریکہ کے معروف حیدر آبادی فن کاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ تقریب کے شرکاء نے حیدر آبادی کھانوں کو بے حد پسند کیا اور موسیقی سے لطف اندوز ہوئے۔

sherosukhan.tripod.com

ڈاکٹر تقی عابدی کی رہائش گاہ پر
پروفیسر نارنگ کی خدمات کا اعتراف

2/ اگست بروز ہفتہ ڈاکٹر تقی عابدی کی رہائش گاہ پر ایک خوب صورت شام پروفیسر نارنگ کے نام پر منعقد کی گئی۔ جس میں پروفیسر نارنگ کی اُردو سرپرستی اور اُردو خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر نارنگ کی جو ساٹھ سے زیادہ کتابوں کے منصف ہیں۔ دو تین درجن کتابوں کو بھی منظرِ عام پر پیش کیا گیا۔ مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد دکن کی بنائی ہوئی ڈاکومینٹری جو نارنگ صاحب کے اُردو سفر و تجربوں پر روشنی ڈالتی ہے اسکرین پر بتلائی گئی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اُردو ادب کا جمالیاتی تعارف کر کے پروفیسر نارنگ کو اُردو دُنیا کا سب سے بڑا زندہ لیجینڈ بتایا اور ان کی لسانی، ادبی، تنقیدی شاہکار تصانیف کا حوالہ دیا۔ اُسلوبیات سے لے کر املا اور تجرباتی تنقیدات کا مختصر اور جامع تعارف کروایا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے تعارف کے بعد پروفیسر نارنگ نے اپنے خاص موثر لہجہ میں اُردو کی لسانیات، ساختیات اور اُسلوبیات پر گفتگو کی اور موجودہ دور میں اُردو کے مسائل پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد کان پاک چمبر کے چیئرمین شاہد ہاشمی نے جوان نسل کی عدم موجودگی اور اُن سے اُردو ادب کو روشناس کرانے کی اہمیت پر زور دیا۔ جس کی ڈاکٹر نارنگ نے پرزور تائید کی۔ نیہا نریش کمار نے بھی اس بات پر تشویش کا اظہار کیا۔ منیف اشعؔر صاحب نے ڈاکٹر نارنگ کی ہمہ جہتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اسے اُردو پرستاروں کے لیے مفید راستہ بتایا۔ منیف اشعؔر اور سردار علی نے انکشاف کیا کہ ٹورنٹو اور مسی ساگا میں ''بزمِ احباب'' کی جانب سے ناظم الدین مقبولؔ اُردو کی مفت تعلیم کا انتظام کر رہے ہیں۔ والدین اور بچوں کی

جانب سے بے حد تعاون ملا ہے اور تقریباً ایک سو سے زائید بچوں نے ان کلاسوں میں داخلہ لیا ہے۔ غالب اکیڈمی کے روحِ رواں اطہر رضوی صاحب نے ڈاکٹر نارنگ کی ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر تقی عابدی کے کام کی تعریف کی۔ محفل میں موجود چند اہم شخصیات میں نیشنل بنک پاکستان کے صدر رسول احمد کلیمی، پی آئی کے چیئرمین نیّر جمال، ظفر اقبال، نسرین سید، ثریا خان اور دیگر ممتاز خواتین، ڈاکٹر شرما، نریش کمار، پروفیسر منظمی، ڈاکٹر طاہر غوث، سجاد حیدر، ایڈیٹر ''آفاق''، امیر جعفری، سید فیروز، محمد عظیم، صلاح الدین، قمر خان، منور کلیمی، مشکور حسن اور ''شعروسخن'' اُردو ویب میگزین کے روحِ رواں سردار علی جو کینیڈا میں اُردو اشاعت کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں موجود تھے۔ یہ محفل اعترافِ خدمات عشائیہ کے ساتھ شروع ہو کر رات دیر گئے تک جاری رہی۔

8/مئی 1997ء

حضرت ستار وارثی کی نعتیہ شاعری حضور اکرمؐ سے والہانہ عقیدت
حرف معتبر کی تقریب رونمائی میں ڈاکٹر تقی عابدی،
شائستہ ایمن اور مامون ایمن کو خراج تحسین

عادل منصوری جدید لہجہ کا خوب صورت شاعر ہے۔حمیرا رحمان عادل منصوری کے مجموعہ کلام ''حشر کی صبح درخشاں ہو'' کی تقریب رونمائی

اُردو کے ممتاز نعت گو شاعر ستار وارثی کے تیسرے مجموعہ نعت ''حرف معتبر'' کی تعارفی تقریب گزشتہ ہفتہ پاکستان اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن اور ظفر زیدی کلچر سوسائٹی کے زیر اہتمام کولمبیا یونیورسٹی کے دی ونگ ہال میں منعقد ہوئی۔ حافظ محمد اسلم نے تلاوت کلام مجید سے تقریب کا آغاز کیا۔ ممتاز نیوز ریڈر مسرور جاوید نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ صدارت کولمبیا یونیورسٹی میں قائداعظم چیئر کے انچارج پروفیسر حسن عسکری رضوی نے کی ممتاز ادبی شخصیت سلطان محمود خان مہمان خصوصی تھے۔ اس موقع پر معروف دانشور ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''نعت گوئی شاعری میں سب سے مشکل میدان ہے کیوں کہ نعت گوئی میں احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''نعت کہنے کے لیے حضور اکرمؐ کی ذات سے والہانہ عقیدت سب سے اہم جزو ہے۔ جس سے ستار وارثی مسرت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو نعت گوئی میں آپ کا نام اہم تصور کیا جاتا ہے۔ محترمہ شائستہ ایمن نے کتاب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''ستار وارثی کی شاعری میں حب نبی کی خوشبو پھیلی ہوتی ہے وہ ایک بلند پایہ نعت گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کے رموز سے مکمل طور پر واقف تھے ان کی شاعری کا ایک ایک لفظ اس کی دلیل ہے۔ ظفر زیدی سوسائٹی کے سرپرست اور معروف دانشور، شاعر مامون ایمن نے اپنے مقالہ میں ''حرف معتبر'' میں شامل نعتوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ

''حضرت ستار وارثی نے حضور اکرمؐ کے اسمائے گرامی کے عنوان سے جو نعتیں کہی ہیں ایک عدیم المثال کام ہے۔ یقیناً انھوں نے ایک انوکھا کام کیا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''وارثی صاحب کو اُردو، فارسی اور عربی زبانوں پر دسترس حاصل تھی ان کے کلام کو پڑھ کر اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے انھوں نے ''حرف معتبر'' کو نعتیہ مجموعہ ہائے کلام میں منفرد قرار دیا۔'' اس سے قبل ڈاکٹر متین احمد، نوید گیلانی اور حمیرا رحمان نے حضرت ستار وارثی کی نعتیں پیش کیں آخر میں ستار وارثی کے صاحبزادے رئیس وارثی نے تقریب کے اختتام کا اعلان کیا۔

ڈاکٹر غال قادری
''اُردو ٹائمز'' نیویارک

ڈاکٹر تقی عابدی کی رہائش گاہ پر ادبی تقریب

ڈاکٹر فرمانؔ فتح پوری تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ محفل شعر و سخن بھی ہوئی
ڈاکٹر فرمانؔ فتح پوری نے شاعری میں عشق کے موضوع
پر دلچسپ اشعار کے حوالے سے تقریر کی

معروف شاعر ڈاکٹر تقی عابدی کے گھر لانگ آئی لینڈ میں ایک ادبی تقریب ڈاکٹر فرمانؔ فتح پوری کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر فرمانؔ فتح پوری نے شاعری میں عشق کے موضوع پر دلچسپ اشعار کے حوالے سے تقریر کی۔ انھوں نے بہت سے فارسی کے اشعار بھی پیش کیے۔ اس کے بعد ایک محفل شعر و سخن بھی ہوئی۔ جس میں ڈاکٹر فرمانؔ فتح پوری کے علاوہ حنیف اخگر، مامون ایمن، صبیحہ صبا، زاہد شیخ، زرین یاسین، عبدالرحمان عبد، فرحت زاہد، دلیل انصاری، انوار قادری، ڈاکٹر شفیق، خوشنود امروہوی اور غال قادری کے علاوہ میزبان ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنا کلام پیش کیا۔ یہ ادبی نشست رات گئے تک جاری رہی۔

نیوجرسی میں شاندار یومِ دبیرؔ

ڈاکٹر عابدی کی دبیرؔ پر چھ کتابوں کی رسمِ رونمائی

نیوجرسی کے شہر ہملٹن کے شاندار ہال روز گارڈن میں اتوار 13 رنومبر 4 بجے شام یومِ دبیرؔ کی تقریب منعقد ہوئی جس میں اُردو ادب کے ممتاز شاعر اور محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تصنیف شدہ چھ کتابیں جو عظیم شاعر مرزا سلامت علی دبیرؔ پر لکھی گئی ہیں، ان کی رونمائی کی گئی۔ ''مجتہدِ نظم مرزا اسلام علی دبیرؔ'' پر خطیب ممتاز جناب تلمیذ الحسنین صاحب نے بصیرت افروز تقریر کر کے کتاب کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ شمالی امریکہ کے مشہور شاعر باقر زیدی نے مثنویاتِ دبیرؔ پر سیر حاصل گفتگو کی۔

دبیرؔ کی نثری کتاب ''ابواب المصائب'' پر جناب محسن نقوی نے عالمانہ تبصرہ کیا۔ ''سلک سلام دبیر'' جو دبیر کے سلاموں پر مشتمل ہے، اس پر جناب شہاب کاظمی نے ادبی اور انائی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ جناب حسنین وال جی نے جو انائی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ دبیریات کی ضرورت اور ادبی اور عقیدتی خدمات پر عمدہ جائزہ لیا۔

ڈاکٹر منظور رضوی نے ڈاکٹر تقی عابدی کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے اربابِ ذوقِ ادب کی جانب سے شیلڈ پیش کی۔ جناب ڈاکٹر غضنفر جعفری نے دبیر کے غیر منقوط کلام ''طالع مہر'' پر گفتگو کرتے ہوئے اُردو ادب میں دبیر کے مقام کو بتایا۔ ''مصحف فارسی'' جو دبیر کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ اسے جناب تلمیذ الحسنین اور ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی گفتگو کا مرکز بنایا۔ اس تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر تقی عابدی نے تخلیصی نکات جو ادبی اور تحقیقی تھے پیش کیے، جن سے دبیر کی عظمت، شخصیت اور فن پر وسیع معلومات حاصل ہوئیں۔ اس خوب صورت محفل کی نظامت نیوجرسی کے ہر دلعزیز ادب نواز اور سخن دان،

جناب جعفری نقوی نے کی اور دبیر کے کلام پر روشنی ڈالی۔ جناب جعفری نقوی نے اپنی تالیف کردہ عمدہ کتاب ''علقمہ کے ساحل'' پر سے ڈاکٹر تقی عابدی کا نمونہ کلام سنایا اور اس کتاب سے احتشام کاظمی نے دبیر کا خوب صورت سلام پڑھا۔ یہ خوب صورت شام آغا شوکت جعفری کے شکریہ سے اختتام کو پہنچی اور محفل کے اختتام پر ضیافت کی گئی۔

نیویارک میں ڈاکٹر تقی عابدی کی شاہکار تصنیف ''تجزیہ یادگارِ انیسؔ'' کی پذیرائی

گزشتہ ہفتہ معصومین اسکول نیویارک میں ایک خوب صورت محفل پذیرائی منعقد کی گئی۔ جس کی صدارت نیویارک کی مشہور ادبی شخصیات اور تجربہ کار وکیل جناب ساجد جعفری نے کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی مصنف یادگار تجزیہ اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ اس تقریب پذیرائی میں نیویارک کے علمی اور شعری حلقوں سے تعلق رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ تقریب کا افتتاح جناب سعید کی تلاوت کلام پاک سے ہوا جس کے بعد جناب احتشام نقوی اور ساتھیوں نے انیسؔ کے شاہکار مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کے چند بندوں کو سوز خوانی کے ساتھ پیش کیا۔ ناظم جلسہ آغا جعفری جو معصومین اسکول کے چیئرمین بھی ہیں خطبہ نظامت میں ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب کی افادیت اوران کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور صدر ساجد جعفری، مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی اور مہمان اعزازی خلیل الرحمان کے ساتھ حجت الاسلام مولانا تلمیذ حجت الاسلام مولانا شیخ سرور اور آسٹین سے آئے ہوئے، مہمان ڈاکٹر حسن اختر کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ نیویارک کے اہل علم خاندان سے وابستہ کالم نگار اور صحافی احتشام کاظمی نے ایک پر مغز اور خوب صورت مقالہ پیش کیا جو ان کی خاص اندازِ بیان کے ساتھ ساتھ تجزیہ پر ایک ادبی دستاویز کی کیفیت کا حامل تھا۔ انھوں نے ڈاکٹر تقی عابدی کی تصنیف کو ان کا عظیم کارنامہ قرار دیا جس نے انھیں امر کر دیا۔ نیویارک کے شاعر، صحافی اور کالم نگار جناب نسیم اختر نے ایک مفصل گفتگو کی اور تجزیہ کے کئی اہم حصوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے تجزیہ کو علامہ شبلی

کے ''موازنہ انیسؔ و دبیرؔ'' کے بعد سب سے عظیم تصنیف قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ''اس کتاب میں مغربی طرز کے استفادہ اور تمام جزئیات اور لفظ بندی کی تحلیل و تشریح موجود ہے جو آج تک اس طریقے پر نہیں کی گئی تھی۔ یہ ڈاکٹر عابدی کی معجز بیانی ہے اور یہ ان کا شاہکار ہے۔ نیویارک کے صحافی، شاعر اور کالم نویس واصف حسین نے صنف مرثیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے تجزیہ کو ایک بالکل مختلف ادبی شاہکار بتایا جس سے مدتوں اُردو شعر و ادب کو مدد ملتی رہے گی۔ کتاب میں میر انیسؔ کی عظمت فن اور ان کے کلام کے محاسن کی نشاندہی انیسیات کے طالب علموں کے لیے ایک نعمت ہے۔ حجت الاسلام مولانا تلمیذ الحسنین صاحب جو ممتاز خطیب اور عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر انیسیات شمار کیے جاتے ہیں نے تقی عابدی کی شخصیت اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انیسؔ کے کلام پر ایک خوب صورت گفتگو کی اور تجزیہ کو اس صدی کی ضرورت بتائی جس سے انیسؔ شناسی کے لیے نئے دروازے کھلے ہیں۔ ممتاز کالم نگار اور شاعر وکیل انصاری نے تقی عابدی کے اس عظیم کارنامے پر مبارک پیش کرتے ہوئے تجزیہ پر ایک عمدہ گفتگو کی اور کہا کہ ''صاحب تصنیف ڈاکٹر عابدی نے اپنی مصروف زندگی میں اپنا ہر لمحہ ادب کی خدمت اور اُردو شعر و ادب کے گیسوئے پریشان کو سنوارنے میں صرف کردیئے ہیں۔''

جناب خورشید رضا زیدی جو انیسیات کے ماہر اور وسیع مطالعہ کے حامل ہیں اس کتاب کے مختلف گوشوں پر عالمانہ گفتگو کر کے اس کام کو معجز بیانی بتایا۔ نیویارک کے مشہور طبیب ڈاکٹر مصور مرزا نے صاحب تصنیف کے اس کام کو قلمی جہاد بتایا اور تجزیہ کو مرثیے کا امام باڑوں سے باہر عوام تک رسائی کا مثبت قدم بتایا۔

''اُردو ٹائمز'' کے مدیر اعلیٰ خلیل الرحمان نے محفل کی خوب صورتی اور تقی عابدی کی ادبی خدمات کو سراہا اور بتایا کہ ''صرف یہی کتاب نہیں بلکہ تقی عابدی 15 سال سے ''اُردو ٹائمز'' میں خصوصی ادبی مضامین لکھ کر شمالی امریکہ میں اُردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔''

ڈاکٹر ناظر زیدی سابق پروفیسر اُردو، فارسی پنجاب یونیورسٹی نے کلامِ انیسؔ پر مفصل روشنی ڈالی اور اپنے خاص انداز میں ثابت کیا کہ اُردو شاعری کی رونق انیسؔ کے کلام

سے باقی ہے اور انیسؔ کے ساتھ ناانصافی اُردو ادب پر ظلم ہے۔

آسٹین سے تشریف لائے ہوئے مہمان ڈاکٹر حسن اختر نے عابدی صاحب کی عرق ریزی اور گراں تصنیف کو اُردو ادب کی خوش بختی بتایا۔ تقریب میں جناب محسن نقوی صاحب مدیر ''کمیونٹی نیوز'' جو ماہر ''انیسیات'' بھی شمار کیے جاتے ہیں انگریزی اور اُردو میں تقی عابدی کی اس شاہکار تصنیف کی تعریف کرتے ہوئے اپنے خاص لہجہ میں کلامِ انیسؔ پر روشنی ڈالی اور سامعین کو محظوظ کیا۔ اس تقریب میں آغا طاہر بھائی نے بھی کلامِ انیسؔ اور تصنیف پر مثبت گفتگو کی۔

محفل کے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ''تجزیہ یادگارِ انیس'' جواب عالمی شہرت کی حامل ہے انیسؔ کے فن کی عظمت اور ان کی چار پانچ سالہ محنت کا صلہ بتایا۔ انھوں نے کہا: ''تجزیہ ایک نیا ادبی تجربہ ہے جس میں مغربی طرز کی تنقید اور فارسی کی جھلک نمایاں ہے۔ اس تجزیہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں شعر کو اکائی جان کر، پھر ہر بند کو پورے مرثیہ کو اکائی جان کر اس کی تشریح کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں Three Dimention view سہ بعدی نکات کا مطالعہ ہوا ہے۔ میر انیسؔ کے صرف ایک مرثیہ میں علم بیان کے محاسن، علم بدیع کے ضائع، روزمرہ محاورات ڈھائی ہزار سے زیادہ ہیں جسے جدول اور اشعار کے مقابل بتایا گیا ہے۔ تشبیہات کی 42 قسمیں اور ان کے امثال صرف ایک ہی مرثیہ سے دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی نے بتایا: ''اگر میر انیسؔ کے صرف ایک مرثیے میں اتنی قدرت اور خوب صورتی موجود ہے تو ان کے 213 مراثی، 113 سلام اور 586 رباعیات میں کس قدر اُردو ادب کے ارتقا کی ضمانت موجود ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس لیے میر انیسؔ کو اُردو کے ارتقا اور بقا کے لیے لازم بتایا۔ جناب صدر نے خطبہ صدارت میں تقی عابدی کی محنت اور کوششوں کو سراہا اور انیسؔ کو اُردو کا خدائے سخن بتایا۔

اس طرح یہ تقریب عشائیہ پر اختتام پذیر ہوئی۔

اکمل سید ''القرآن لائن'' لندن

لندن میں ڈاکٹر تقی عابدی کی کتب کی تقریب اجراء

اسلامک سنٹر لندن میڈاویل میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی نئی کتاب '' کائناتِ نجم'' کی تقریب اجراء منعقد ہوئی جس میں مصنف نے علامہ نجم آفندی کے حالاتِ زندگی اُن کے افسانہ، ناول نگاری، مرثیہ نگاری، سلام و نوحہ اور غیر مطبوعہ کلام کو شائع کر کے دُنیا اُردو ادب میں نیا اضافہ کیا۔ ان کو خراج پیش کرنے کے لیے برطانیہ بھر سے محقق، تنقید نگار، مصنف اور اُردو ادب سے محبت کرنے والی شخصیات نے شرکت کی۔ جن میں جناب سید عاشور کاظمی، سید صفدر علی ہمدانی، ڈاکٹر امیر زاہرہ، میرِ محفل ڈاکٹر شکیب، ڈاکٹر سہیل آغا، مظہر عباس، ڈاکٹر احسن ظفر، مولانا سید ذوالقدر رضوی، مسعود عابدی، نثار حیدر اور ڈاکٹر سید تقی عابدی نمایاں نام تھے۔

تلاوت کلام الٰہی سے تقریب کا آغاز کیا اور بعدِ تلاوت مظہر عباس نے علامہ نجم آفندی کا سلام ''شہیدِ ظلمِ غریب الدیار کیا کہنا، حسین درد کے پروردگار کیا کہنا'' پیش کیا ان کے بعد سید نثار حیدر کو ایک اور سلام کے لیے دعوت دی گئی۔ بعدِ سلام ناظم محفل نے علامہ نجم کا ایک اور ''سلام میرا حضور امام لیتا جا'' حاضرین کی نذر کیا اور خوب داد حاصل کی۔ اس تقریب میں دو مقالے بھی پڑھے گئے جن کے لیے محترمہ ڈاکٹر امیر زاہرہ، اور جناب سید صفدر علی ہمدانی کے نام پکارے گئے۔ محترمہ امیر نے ڈاکٹر تقی کو خراج پیش کرتے ہوئے اُردو ادب میں اضافہ کو سراہا اور علامہ مرحوم کی زندگی اور ان کے طرزِ تحریر پر مختصر روشنی ڈالی اور مولانا مرحوم کے مرثیہ کے اشعار بھی سامعین کی خدمت میں پیش کیے۔

بیگم ڈاکٹر امیر کے بعد مشہور مصنف، صحافی، ناقد براڈ کاسٹر، شاعر اور مرثیہ نگار جناب سید صفدر ہمدانی کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی موصوف نے جس انداز سے مولانا

اور مصنف کتاب مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی کو خراج پیش کیا یہ ان کا حصہ تھا اور اپنے مقالہ میں ان نو نکات کی جانب توجہ دلائی جو مصنف نے اپنے کو اُردو ادب کے داعی کہلانے والوں سے کیے۔ 1975ء بعدِ انتقال علامہ تجم کا کلام نہ تو کسی نے جمع کرنے کی کوشش کی اور نہ طبع ہوا اس کا سہرا جناب ڈاکٹر تقی کے سر ہے اور مولانا کو ''کائناتِ نجم'' کے وسیلے سے جو زندگی دے کر خود بھی امر ہو گئے۔

صفدر ہمدانی نے اس کتاب کو ایک تحقیقی کتاب اور آنے والے زمانوں کے لیے ایک مکمل دستاویز قرار دیتے ہوئے مزید کہا کہ ''سن 2006 میں لندن اُردو ادب کے قاری کے لیے اس لیے بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ایک تو یہ کتاب ''کائناتِ تجم'' اور دوسری وہ کتاب جو کے مرثیہ کے حوالے سے چھ برس پر محیط ایک تحقیقی کام ہے اور جس کے مصنف جناب سید عاشور کاظمی ہیں۔'' اپنے اختتامی کلمات میں چند اشعار بطور خراج جناب تجم آفندی اور ڈاکٹر تقی عابدی کی نظر کیے اور اپنے مقالے کا اختتام کیا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے تمام ادبی محفل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''کائناتِ تجم'' جو تجم شناسی کی نئی راہ مستقبل میں پیش کرے گی اس کا نتیجہ آنے والے پچاس برس پر محیط ہے اور مرثیہ لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے بھی ایک تحقیقی مشعل ثابت ہوگی۔'' ڈاکٹر صاحب نے علامہ تجم کے مرثیے کے چند بند پیش کیے اور ان کے طرز تحریر پر گفتگو کر کے مولانا کو خراج پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے علامہ تجم کی نظم ''ارے'' بھی سامعین کی نذر کی اور اس پر جو داد ان کو ملی وہ ان کا حصہ تھی۔

میرِ محفل ڈاکٹر شکیب نے علامہ تجم آفندی کے ایام زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لیے انھوں نے ان کے طرز زندگی اور ایام زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''مولانا کی زندگی ہم سب کے لیے درس اور مشعل راہ ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے بھی علامہ تجم کے شعر اربابِ محفل کی نذر کیے۔ بعد ''کائناتِ تجم'' کی رونمائی بدست مولانا ذوالقدر رضوی کی گئی اور کتاب مصنف نے مولانا کو پیش کی۔

محترمہ پروفیسر بانو مرزا نے آخر میں محترمہ روپ کنوار کماری پر ایک مقالہ پیش کیا۔ کیوں کہ اس محفل میں روپ کماری کی حیاتِ جاودانی اور کالم پر مبنی کتاب کی رونمائی بھی

تھی۔ یہ کتاب جنوری 2006ء میں ملتان سے ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق، تدوین، تنقید و تشریح کی انمول کاوش ہے۔

اس کتاب میں مختصر سوانح عمری، نعتیہ کلام، منقبتی کلام، ساقی ناموں کی جھلک، قطعات، رباعیات، سلام اور پانچ مراثی شامل ہیں۔ اختتام تقریب پر ناظمِ محفل اور منتظمِ محفل جناب کاظم مرزا نے مہمانانِ گرامی کا شکریہ ادا کیا اور چائے پیش کی گئی یوں یہ محفل اپنے اختتام پر پہنچی۔

ہم تجمؔ چار روز کے مہمان ہیں مگر
رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

25/اگست 2012ء

تقریبِ فیض فہمی نوٹنگھم (یو کے)

25/اگست بروز اتوار اہل قلم ڈاٹ کام کے زیرِ اہتمام نوٹنگھم یو کے کے مقامی ہال میں عمدہ اور سیر حاصل علمی و ادبی تقریب کے انعقاد نے ثابت کر دیا کہ بیرون ملک بسنے والے پاکستانی اُردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے کس قدر حساس اور فعال ہیں۔ تقریب فیض فہمی نوٹنگھم عیدالفطر اور 14/اگست کی خوشیوں کو یکجا کرتے ہوئے فیض احمد فیض جیسی نابغۂ روزگار ہستی پر لکھی گئی 1400 سے زائد صفحات پر مشتمل، ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) کی کتاب ''فیض فہمی'' کی رسم اجراء کرتے ہوئے مرتب کی گئی۔

یہ تقریب تین حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلا حصہ ''فیض فہمی'' پر شرکاء کا اظہارِ خیال، دوسرا حصہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا توسیعی لکچر ''کیا یہ دور فیض کا ہے'' اور تیسرا حصہ ''مشاعرہ بیادِ فیض''

تقریبِ فیض فہمی نوٹنگھم کے پہلے دو حصوں کی نظامت کے فرائض محترمہ ارم بتول قادری اور جناب شہزاد ارمان قادری نے انجام دیئے۔ دونوں ناظمین نے فیض کے فن اور شخصیت پر ''فیض فہمی'' میں سے عمدہ اقتباسات اور فیض کے اشعار کوٹ کر کے محفل میں حاضرین کا لگاؤ آخر تک برقرار رکھا۔

اس تقریب میں گفتگو کا محور فیض احمد فیض رہے جنھوں نے اپنی منفرد سوچ اور انقلابی شاعری سے ظالم کو للکار، مظلوم کو عزم و حوصلہ دیا اور سامراج کے چہرے سے نقاب نوچنے کی کوشش کرتے رہے۔ فیض اس حدیثِ نبویؐ پر نہ صرف خود عمل پیرا رہے کہ۔۔۔ مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دو۔۔۔ بلکہ دوسروں کو بھی اس پر عمل کروانے کی سر توڑ کوشش کرتے رہے۔ لینن امن ایوارڈ یافتہ فیض نے قیدیں کاٹیں، ظلم سہے مگر دکھی انسانیت کے دکھ کو اپنی شاعری میں سمیٹتے رہے۔ ایسے عظیم شاعر کے فن و شخصیت

پر لکھی گئی دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتی ہوئی جدت اور انفرادیت کی مظہر ''فیضؔ فہمی'' کے مصنف ڈاکٹر سید تقی عابدی ایسے وارثینِ قلم میں سے ہیں جو شہرت، نام و نمود یا عظمت و بلند اقبالی کے لیے نہیں بلکہ اس لیے لکھتے ہیں کہ لکھنا ان کی سرشت میں شامل ہے، ڈاکٹر تقی عابدی اس تقریب کے صاحبِ محفل جب کہ جناب طالع مہدی (چیئرمین العین آئی انٹرنیشنل ٹرسٹ) صدرِ محفل اور لختِ حسنین شاہ صاحب (چیئرمین مسلم ہینڈز) مہمان خصوصی۔ جب کہ راجہ شفیق کیانی ڈائریکٹر ریڈیو پاک سیلونا اسپین اور محترمہ صدف مرزا، صحافی و شاعرہ ڈنمارک اور ڈاکٹر ابراہیم شیخ مانچسٹر مہمان اعزازی رہے۔

صدرِ محفل جناب تالع مہدی نے کتاب کا سنہری ربن کاٹ کر اسے محفل کے سامنے پیش کیا اور اہل قلم ڈاٹ کام کی اس کاوش کو سراہتے ہوئے حاضرینِ محفل کو کتاب کی مبارک باد پیش کی۔

لختِ حسنین شاہ صاحب نے فیضؔ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ ''فیضؔ نے بات ہمیشہ غریب کی ہی کی ہے اور وہ معاشرے کے مجبور، لاچار اور محکوم لوگوں کے حق کی بات کرنے والے انسان تھے۔''

راجہ شفیق کیانی صاحب نے فیضؔ فہمی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ کتاب فیضؔ کی شخصیت کے ہر پہلو کا غیر جانبدار طریقے سے احاطہ کرتی ہوئی منصفانہ تخلیق ہے جو بلاشبہ ''فیضؔ فہمی'' ہے، فیضؔ کی مدح سرائی نہیں ہے۔

محترمہ، مہ جبین غزل انصاری نے کہا کہ ''ہم اتنے فیضؔ فہم پہلے کبھی نہیں تھے جتنا ''فیضؔ فہمی'' کی بدولت ہوئے ہیں۔''

محترمہ صدف مرزا نے فیضؔ کی مشہورِ زمانہ نظم پیش کر کے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر ابراہیم نے کتاب کو بے حد سراہا اور کہا: ''مجھ ناتواں سے یہ بوجھ تک اُٹھتا نہیں، خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اس سے فیض یاب ہو سکیں۔''

انجم اعظمی نے کیا خوب صورت کہا ہے کہ ''زندگی کی خوابیدہ کیفیتوں کا عکس فیضؔ کے مصرعوں میں ہر جگہ جھلکتا ہے۔'' (بحوالہ فیضؔ فہمی)

ڈاکٹر عابدی نے اپنے توسیعی لکچر میں انہی کیفیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ

''فیض نے بڑی خوب صورتی سے غمِ جاناں سے غمِ دوراں کا رخ کیا۔

ع : اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے

ع : خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہائے ہوئے

ع : لوٹ جاتی ہے نظر ادھر کو بھی کیا کیجیے

ڈاکٹر عابدی نے کہا کے ''اس وقت کے تنقید نگاروں نے بہت دہائی دی کہ فیض نے اچھی خاصی رومانی نظم کا مزا کرکرا کر دیا ہے۔ مگر فیض اپنے دور کے آگے کے شاعر تھے اس لیے سو سال گزر جانے کے باوجود بھی یہ دور فیض کا دور معلوم ہوتا ہے۔ فیض زندہ و جاویداں ہے۔''

بلاشبہ اُردو زبان و ادب کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی کی جانب سے ''فیض فہمی'' ایک انمول تحفہ ہے، خدا ہمیں اس کتاب سے مستفید ہونے اور ڈاکٹر صاحب کے علم و فن میں ڈھیروں برکتیں عطا فرمائے۔ آمین۔۔۔

اس تقریب میں نوٹنگھم میں درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ اور بچوں کو قرآن پاک اور اُردو زبان کی بے لوث تعلیم دینے والی محترمہ ریحانہ ملک کو پاکستانی کمیونٹی کی جانب سے اہلِ قلم بیسٹ پرفارمنس ایوارڈ بھی دیا گیا۔ لختِ حسنین شاہ صاحب نے ایوارڈ ریحانہ صاحبہ کو دیتے ہوئے کہا کہ ''نہ صرف اساتذہ بلکہ یہ والدین کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اُردو زبان و ادب اور کلچر کو اپنے بچوں میں منتقل کریں۔'' ریحانہ صاحبہ نے ان کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر والدین ایسا کرنے میں اساتذہ کی مدد کریں تو یقیناً ہمارے بچے مغرب میں پروان چڑھنے کے باوجود پاکستانی روایات و اقدار سے جڑے رہیں گے۔

محفل میں قدیر خان صاحب کی آواز اور رچاند صاحب کی میوزک کمپوزیشن میں بہترین ملی نغمے اور کلامِ فیض پیش کیا گیا جس نے محفل کا لطف دوبالا کر دیا۔

تقریب فیض فہمی کے دوسرے حصے میں کھانے کی عمدہ دعوت کے بعد مشاعرہ بیادِ فیض Creative Mind Society کے تعاون سے پیش کیا گیا جس میں ناظمین محترمہ فرزانہ نیناں نوٹنگھم اور جناب شہزاد ارمان قادری نوٹنگھم نے اپنے شاعرانہ انداز بیان اور خوب صورت کلام سے حاضرین کا دل موہ لیا۔

محفل مشاعرہ میں ارم بتول قادری جرمنی، صدف مرزا ڈنمارک، جب کہ مقامی شعراء میں گلناز کوثر، سعدیہ، مہ جبیں غزل انصاری، فاروق ساگر، اشتیاق میر، سمعیہ ناز، ڈاکٹر مختار، جاوید اقبال، نعیم حیدر، مسعود احمد نے شرکت کی۔

خصوصی شکریہ، پاک فوڈز بارگین بازار، مسلم ہینڈز اور العین آئی انٹرنیشنل ٹرسٹ اور نمائندہ جیو نیوز جناب انجم میر، اے ٹو زیڈ سی ای او جناب ظہیر عباس، اسٹیج ڈیزائنر اینڈ میڈیا منیجر جناب آفتاب برکت سنی اور تمام دوستوں کا شکریہ جنھوں نے فیض فہمی پروگرام کو کامیابی سے منعقد کروانے کے لیے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔

طارق محمود

''اردو ٹائمز'' لندن

30/ اگست 2012ء

ڈاکٹر تقی عابدی کی اُردو ادب میں خدمات نئے جریزوں کی مانند ہے۔ پروفیسر صدیق قدوائی

فیض احمد فیضؔ کو صوفیوں میں شمار کرتا ہوں، ان سے کسی کی برائی نہیں سنی: پروفیسر ڈاکٹر شاہد مہدی

فیض نے پرانے ساغروں میں نئی شراب استعمال کی ہے: ڈاکٹر تقی عابدی

''فیض فہمی'' کی تقریب رونمائی سے خطاب

اُردو زبان و ادب کے معروف محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی کی نئی کتاب ''فیض فہمی'' کی تقریب رونمائی علمی مجلس اور نہرو سنٹر کے زیرِ اہتمام پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی منائی گئی۔ تقریب سے مہمان خصوصی جامعہ ملیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر شاہد مہدی نائب صدر آئی سی سی آر نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ڈاکٹر سید تقی عابدی جس طرح میڈیکل پیشہ سے وابستہ رہ کر اُردو زبان و ادب کے لیے بڑی تندہی سے کام کر رہے ہیں ان کا یہ کردار دوسروں کے لیے ایک اعلیٰ مثال ہے۔'' انھوں نے کہا: ''ڈاکٹر تقی عابدی نے مرزا غالب اور علامہ اقبالؔ پر جو کام کیا وہ بھی انفرادیت میں بے مثال ہے۔ لیکن اب ''فیض فہمی'' کے حوالے سے انسائیکلوپیڈیا کے اسٹائل میں مختلف زمانوں کے افراد کی مختلف آراء کو اکٹھا کر دینا بذات خود ایک کارنامہ ہے۔''

پروفیسر ڈاکٹر شاہد مہدی نے کہا: ''اگر صوفی ازم ایک رویہ کا نام ہے تو میں فیض کو صوفیوں میں شمار کرتا ہوں کیوں کہ فیضؔ سے کسی کی برائی نہیں سنی۔'' تقریب کے آغاز میں

نہرو سنٹر کی ڈائریکٹر اور معروف ناول نگار سنگیتا بہادر نے نہایت دلکشی اور گلوکاری سے فیض احمد فیض کی مشہور نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' کے مصرعہ ''تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے'' پر سب کو تڑپا دیا اور محفل پر اپنی گلوکاری کا جادو جما دیا۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنی کاوش ''فیض فہمی'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا: ''مجھے ''فیض فہمی'' مرتب کرنے میں دو سال کا عرصہ لگا ہے۔ اور اس عرق ریزی سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فیض کے کلام میں جذبے کا خلوص، عمل کی خواہش اور رومانیت پائی جاتی ہے۔ فیض نے اپنی شاعری میں اُردو نظم کو نیا اشاراتی آہنگ دیا ہے۔''

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا: ''میر تقی میر، میر انیس، مرزا غالب اور علامہ اقبال اُردو کے چار عظیم، منفرد اور بڑے شاعر ہیں۔ فیض کا ان کے مقابلہ میں شمار نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ان عظیم اور بڑے شاعروں نے اپنے علم و فکر سے اُردو زبان و ادب کو نئے الفاظ و معنی اور سوچ دی ہے۔ عظیم شاعر ہمیشہ ایک نئی منفرد سوچ لاتے ہیں اور خیال میں نئی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ عظیم شاعر نئی ڈکشنری فراہم کرتے ہیں، لیکن فیض نے پرانے ساغروں میں نئی شراب استعمال کی ہے۔ اس کے کلام کو پڑھ کر لوگ لطف اُٹھاتے ہیں۔ فیض کا سفر رومان سے انقلاب تک ہوا ہے۔ حبیب جالب اور جوش ملیح آبادی نے احتجاجی شاعری کی لیکن فیض کا انداز ان سے بہتر ہے۔ حسرت موہانی، مصطفےٰ زیدی اور گلزار نے رومانی شاعری کی ان کے مقابلہ میں فیض بھی خوب ہیں۔ فیض ایسا شاعر ہے جو اُردو ادب کو بہت کچھ دے چکا ہے۔''

تقریب کے صدر پروفیسر ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی انڈین لسانیات نہرو یونیورسٹی دہلی کے چیئرمین نے کہا: ''ڈاکٹر تقی عابدی کا اُردو زبان و ادب کے لیے کام کرنا، نئے جزیرے کی طرح نمودار ہونے کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں اُردو کے نقاد تو بہت ہیں لیکن معلومات نہیں۔ ان کے تجربہ میں خوش مذاقی ہے۔ علم کا بوجھ نہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی تلاشِ ادب میں دُنیا بھر کا سفر اس طرح کرتے ہیں جس طرح ایک جاسوس اپنے مشن پر ہوتا ہے۔ وہ انوکھی چیزیں تلاش کر کے اُردو ادب کو دیتے ہیں اور ان کی کتابوں کا گیٹ اپ بھی شاہکار ہوتا ہے۔ ''فیض فہمی'' ڈاکٹر سید تقی عابدی کی بے مثال دستاویز ہے۔''

طارق محمود

''نیشن'' لندن

ستمبر 2012ء

فیض نے رومان سے انقلاب کے سفر میں اُردو ادب کو نئے رنگ دیئے: ڈاکٹر تقی عابدی

ان کے کلام میں جذبوں کا خلوص اور رومانیت ملتی ہے۔

اپنی کتاب ''فیض فہمی'' کی تقریب رونمائی سے خطاب۔

ڈاکٹر تقی نے غالب، اقبال اور فیض پر منفرد کام کیا: شاہد عباس

ڈاکٹر تقی عابدی نے اُردو ادب کو منفرد چیزیں دی ہیں: ڈاکٹر صدیق قدوائی

سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اور نائب صدر آئی سی سی آر پروفیسر ڈاکٹر شاہد مہدی نے کہا ہے کہ ''اگر صوفی ازم رویہ کا نام ہے تو میں فیض احمد فیض کو صوفیوں میں شمار کرتا ہوں کیوں کہ میں نے کبھی فیض کے منہ سے کسی کی برائی نہیں سنی۔'' وہ علمی مجلس اور نہرو سنٹر کے زیرِ اہتمام اُردو زبان کے معروف محقق ڈاکٹر تقی عابدی کی نئی کتاب ''فیض فہمی'' تقریب رونمائی سے خطاب کر رہے تھے۔ جس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے کی۔ ڈاکٹر شاہد مہدی نے مزید کہا کہ ''ڈاکٹر سید تقی عابدی جس طرح میڈیکل پیشہ سے وابستہ رہ کر اُردو زبان و ادب کے لیے بڑی تندہی سے کام کر رہے ہیں ان کا یہ کردار دوسروں کے لیے قابل تقلید مثال ہے۔'' انھوں نے کہا: ''ڈاکٹر تقی عابدی نے مرزا غالب اور علامہ اقبال پر جو کام کیا وہ بھی انفرادیت میں بے مثال ہے۔ لیکن اب ''فیض فہمی'' کے حوالے سے انسائیکلو پیڈیا کے اسٹائل میں مختلف زمانوں کے افراد کی مختلف آراء کو اکٹھا کر دینا بذات خود ایک کارنامہ ہے۔''

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنی کاوش ''فیض فہمی'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

’’مجھے ’’فیض فہمی‘‘ مرتب کرنے میں دو سال کا عرصہ لگا ہے۔ اور اس عرق ریزی سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فیضؔ کے کلام میں جذبے کا خلوص، عمل کی خواہش اور رومانیت پائی جاتی ہے۔ فیضؔ نے اپنی شاعری میں اُردو نظم کو نیا اشاراتی آہنگ دیا ہے۔‘‘

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا: ’’میر تقی میرؔ، میر انیسؔ، مرزا غالبؔ اور علامہ اقبالؔ اُردو کے چار عظیم، منفرد اور بڑے شاعر ہیں۔ فیضؔ کا ان کے مقابلہ میں شمار نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ان عظیم اور بڑے شاعروں نے اپنے علم وفکر سے اُردو زبان وادب کو نئے الفاظ ومعنی اور سوچ دی ہے۔ عظیم شاعر ہمیشہ ایک نئی منفرد سوچ لاتے ہیں اور خیال میں نئی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ عظیم شاعر نئی ڈکشنری فراہم کرتے ہیں، لیکن فیضؔ نے پرانے ساغروں میں نئی شراب استعمال کی ہے۔ اس کے کلام کو پڑھ کر لوگ لطف اُٹھاتے ہیں۔ فیضؔ کا سفر رومان سے انقلاب تک ہوا ہے۔ جیسے حبیب جالبؔ اور جوشؔ ملیح آبادی نے احتجاجی شاعری کی لیکن فیضؔ کا انداز ان سے بہتر ہے۔ حسرت موہانی، مصطفےٰ زیدی اور گلزار نے رومانی شاعری کی ان کے مقابلہ میں فیضؔ بھی خوب ہیں۔ فیضؔ ایسا شاعر ہے جو اُردو ادب کو بہت کچھ دے چکا ہے۔‘‘

تقریب کے صدر پروفیسر ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی انڈین لسانیات نہرو یونیورسٹی کے چیئرمین نے کہا کہ ’’ڈاکٹر تقی عابدی کا اُردو زبان وادب کے لیے کام کرنا نئے جزیرے کی طرح نمودار ہونے کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں اُردو کے نقاد تو بہت ہیں لیکن معلومات نہیں۔ ان کے تجربہ میں خوش مذاقی ہے۔ علم کا بوجھ نہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی تلاش ادب میں دُنیا بھر کا سفر اس طرح کرتے ہیں جس طرح ایک جاسوس اپنے مشن پر ہوتا ہے۔ وہ انوکھی چیزیں تلاش کر کے اُردو ادب کو دیتے ہیں اور ان کی کتابوں کا گیٹ اپ بھی شاہکار ہوتا ہے۔ ’’فیض فہمی‘‘ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی بے مثال دستاویز ہے۔‘‘

تقریب کے آغاز میں ڈائریکٹر نہرو سنٹر اور معروف ناول نگار سنگیتا بہادر نے اپنی خوب صورت آواز میں فیض احمد فیضؔ کی مشہور نظم ’’مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ‘‘ سنائی۔ تقریب میں ڈاکٹر جاوید شیخ، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر عبدالستار، ایوب اولیاء، ڈاکٹر محمد جاوید، صدف مرزا و دیگر علمی ادبی شخصیات ادیبوں، شاعروں نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد

13/ستمبر 2012ء

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب ''فیض فہمی'' کی لندن میں رسم اجرا

عالمی شہرت یافتہ اسکالر ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) کی شاہکار کتاب ''فیض فہمی'' کی رسم اجرا علمی مجلس لندن کے زیر اہتمام اتوار 26/اگست 2012ء کی شام نہرو سنٹر لندن میں جناب سید شاہد مہدی آئی اے ایس نائب صدر نشین انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز (آئی سی سی آر) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ جناب سید شاہد مہدی نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''فیض پر شائع ہونے والی اب تک کی ساری کتابوں میں یہ سب سے جامع کتاب ہے اور اس میں نہ صرف نئے مضامین شامل ہیں بلکہ فیض کے بارے میں مشاہیر کی بیسیوں نادر تحریریں اور فیض کی نادر تصویریں بھی اس میں شامل ہیں۔ اس موقع پر سنگیتا بہادر آئی ایف ایس ڈائریکٹر نہرو سنٹر نے اپنے مسحور کن ترنم میں فیض کا کلام سنایا۔ اس تقریب کی صدارت پدم شری ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے فرمائی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ہر کام نہ صرف قابل قدر ہوتا ہے بلکہ قابل رشک بھی ہوتا ہے۔

صدف مرزا

ممتاز محقق معروف مصنف و شاعر ڈاکٹر تقی عابدی کا دورہ یورپ

گزشتہ سال دُنیا بھر میں فیضؔ کے سال کے نام سے جانا گیا اور اس سلسلے میں یورپ بھر میں منظم طور پر فیضؔ کی تقریبات کا انعقاد کیا گیا اور فیضؔ کی شاعری کے تراجم پیش کیے گئے۔ فیضؔ کے فن اور شخصیت پر کتب تحریر کی گئیں۔ لیکن فیضؔ کی زندگی اور تمام شعبہ ہائے زندگی پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحریر کردہ ایک جامع، مفصل اور مربوط کتاب ''فیضؔ فہمی'' سال ہذا میں منظر عام پر آئی، جس نے سخن پروروں اور سخن شناسوں سے بھرپور توجہ اور مقبولیت کی سند حاصل کی۔ یہ منفرد اور نادر کتاب فیضؔ کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اسناد اور حوالہ جات کے ساتھ روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے تمام تر ابواب اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ کتاب منظم اور باضابطہ انداز میں ایک دانشور کے شب و روز کا احاطہ کرتی ہے اور اس کے فن اور شخصیت کی تفہیم تک قاری کی رہنمائی تو ضرور کرتی ہے لیکن وہ کہیں بھی شخصیت پرستی پر مائل نہیں کرتی بلکہ تمام تر ادبی دیانت داری کے ساتھ حالات و واقعات اور حقائق مربوط انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ فیضؔ کے کلام پر جو علمی و ادبی و لسانی اعتراضات کیے گئے ہیں وہ بھی صریحاً قارئین کی رسائی میں ہیں۔ بلاشبہ یہ طالب علموں اور فیضؔ پر مقالے تحریر کرنے والوں کے لیے ایک گراں قدر تحفے سے کم نہیں ہے۔

یورپ میں بھی اس کتاب کا پرشوق استقبال کیا گیا اور رسمِ اجراء کی تقریبات ہوئیں۔ اُردو کی سب سے بڑی بستی برطانیہ سے ان پروگرامز کی ابتدا ہوئی۔

بائرن کے شہر، نوٹنگھم میں بزمِ اہلِ قلم کے زیرِ اہتمام بین الاقوامی فیضؔ سیمینار کا

انعقاد کیا گیا۔ جس کے روح رواں شہزاد ارمان تھے۔ جس میں جرمنی سے ارم بتول، ڈنمارک سے صدف مرزا اور اسپین ریڈیو پاک سیلونا کے ڈائریکٹر راجہ شفیق کیانی نے خصوصی شرکت کی۔ ریڈیو پاک سیلونا کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ہر مہینے فیض اسپیشل کے نام سے ''فیض فہمی'' و ''فیض شناسی'' کے حوالے سے ایک پروگرام پیش کیا جس میں فیض کے خاندان اور احباب سے انٹرویوز کیے گئے اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی گئی۔ اسی ریڈیو سے ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب پر پہلا مفصل انٹرویو بھی پیش کیا گیا۔

راجہ شفیق کیانی نے بھی کتاب ''فیض فہمی'' پر ایک خوب صورت مضمون پیش کیا۔ ہائنڈل برگ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی طالبہ ارم بتول قادری نے ''فیض فہمی'' کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کی اور صدف مرزا نے اس کتاب کو ''فیض شناسی'' اور ''فیض فہمی'' کا ایک شاہکار قرار دیا، ایک اہم سنگ میل جس میں بے جا ستائش، بے موقع مدح سرائی یا بے ترتیب تفصیلات نہیں ہیں بلکہ ادب کے شائقین و مداحین کے لیے ایک نادر نذرانہ ہے۔

مقامی شرکاء میں مانچسٹر سے ڈاکٹر ابراہیم نے ''فیض فہمی'' پر بات کی جب کہ شامِ غزل اور مشاعرے میں برطانیہ بھر سے آئے معروف شعراء شامل تھے۔

غالباً ''فیض فہمی'' وہ کتاب ہے جس کی پذیرائی ہر شہر میں ہوئی۔ لندن میں نہرو سنٹر میں بھی ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس پر وقار تقریب کی صدارت صدیق الرحمان قدوائی نے کی۔ مہمان خصوصی جناب شاہد مہدی تھے۔ نہرو سنٹر کی ڈائریکٹر محترمہ سنگیتا بہادر نے اپنے دلکش ترنم میں فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' پیش کی۔ نظامت کے فرائض صدف مرزا نے انجام دیے جن کو گزشتہ سال فیض ٹیم یورپ کی وائس پریذیڈنٹ ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ تقریب میں دنیا بھر سے آئے دانشور بھی شامل تھے اور زندہ دلانِ لندن کی بھرپور شرکت بھی تھی۔ جن میں ڈیوڈ میتھیوز اور رضا علی عابدی، ڈاکٹر جاوید، ایوب اولیاء اور ارشد لطیف کے نام شامل ہیں۔ پروگرام کے بعد مصنف کے ساتھ بات چیت اور ان کے دستخط کے ساتھ کتاب حاصل کرنے والوں کا ذوق بھی دیدنی تھا۔

باہمی ادب و محبت کی فضا میں اس شام کا اختتام ہوا۔

طارق محمود
ہفت روزہ ''اُردو ٹائمز'' انگلینڈ

مرزا غالبؔ کی شاعری برصغیر کا اچھوتا اثاثہ ہے: ڈاکٹر سید تقی عابدی

کلامِ غالبؔ اُردو اور فارسی کی بے پناہ خدمات کر رہا ہے:
انسان کا شعور زبان سے پھوٹتا ہے
لندن یونیورسٹی اُردو سوسائٹی، اُردو تحریک عالمی کے اجلاس میں
مرزا غالبؔ کے فارسی کلام پر خصوصی خطاب

کلامِ مرزا غالبؔ برصغیر کا اچھوتا اثاثہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف علمی و ادبی شخصیت و ماہر سرجن ڈاکٹر سید تقی عابدی نے لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں اُردو سوسائٹی اور اُردو تحریک عالمی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس تقریب میں اُردو سوسائٹی سوآس اور اُردو تحریک عالمی نے انھیں اُردو ادب میں گرانقدر ریسرچ خدمت سرانجام دینے پر خصوصی طور پر خطاب کے لیے مدعو کیا تھا اور اس موقع پر انھیں اعزازی شیلڈ دی۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر عبدالغفار عزم نے کی اور نظامت اُردو سوسائٹی کے صدر عامر خاں نے سرانجام دی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا: ''کلامِ غالبؔ ذہانت و فطانت سے بھرپور ہے۔ ذہین و فطین شخص کا کلام عام لوگوں کی فہم سے بالا ہوتا ہے۔ مرزا غالبؔ کا کلام اور انداز فکر اس حد تک بلند ہے کہ نام نہاد مبصرین اس کی حد تک نہیں پہنچ سکتے۔ غالب کی تصانیف بتیس ہیں اور ان کا سخن بہت زبردست ہے۔ اس کو سمجھنے اور عرق ریزی کی ضرورت ہے۔ جب آدمی ان کے کلام کو پڑھتا اور سمجھتا ہے تو احساسات میں

جذباتی لہر دوڑ جاتی ہے۔ مرزا غالبؔ کا فارسی کے اعلیٰ ترین بزرگ ترین شعراء میں شمار ہوتا ہے اور فارسی ادبیات اور ایران میں لوگ مرزا غالبؔ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ایران میں کلامِ غالبؔ سے دلچسپی بڑھ رہی ہے اور لوگ کلامِ غالب میں اسی قدر دلچسپی لے رہے ہیں جس طرح جامیؔ، عرفیؔ، شیرازیؔ، حافظؔ، نظیریؔ، طاہر بابا نمایاں ہیں۔

''نیوز ایڈیٹر'' لندن

7/ جولائی 2018ء

کلامِ اقبالؔ انسان سے مربوط ہے لیکن انسان خود انسان کا ہی احترام نہیں کر رہا: ڈاکٹر سید تقی عابدی

پاکستانی ہائی کمشنر سید ابن عباس نے علامہ اقبال کو ان کی اسی ویں برسی کی مناسبت سے پاکستان ہائی کمیشن کے زیر اہتمام منعقدہ اقبالؔ کانفرنس میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''ہم نے اپنی غلطیوں سے علامہ اقبالؔ کو محدود کر دیا ہے حالاں کہ ان کا پیغام آفاقی ہے اُن کی شاعری میں کئی ادوار آئے ایک وقت تھا کہ انھوں نے ترانہ گایا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا

پھر انھوں نے کہا:

چین و عرب ہمارا

پھر انھوں نے مزید ایڈیشن کی

نیل کے ساحل سے تا بخاکِ کاشغر

یہ جو ادوار تھے سیکولر تھے، حالاں کہ علامہ اقبالؔ جب یہاں طالب تھے تو ان کی سوچ میں بڑی وسعت آئی۔

ہائی کمشنر سید ابن عباس نے کہا: ''آج شدید ضرورت ہے پیغام اقبالؔ کو نوجوانوں سے روشناس کرایا جائے۔'' انھوں نے کہا: ''یہ ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں اقبالیات کے ماہر اس تقریب میں شریک ہوئے، آپ نے کتابیں لکھی ہیں، آپ کے قلم میں زور ہے نوجوانوں تک پیغام پہنچانے کی ضرورت ہے کیا طریقہ اختیار کیا جائے،

گزشتہ سال قیام پاکستان کی ستر سالہ تقریبات منائی گئیں، آج تقریب سے پہلے پاکستان ہائی کمیشن میں بھی مجسمہ جناح کی رونمائی کی گئی ہے۔ اس تقریب کے لیے ڈاکٹر جاوید شیخ چیئرمین اُردو مرکز کے تعاون کا بھی شکریہ، ہمارے ہائی کمیشن کے اہلکاروں نے اس تقریب کو باوقار منعقد کرنے میں بے پناہ خدمات سرانجام دیں ہیں۔ سید ابن عباس نے کہا: ''میں اسی ماہ پاکستان واپس جارہا ہوں یہ سفارت خانہ آپ کا ہے، ہمارا رول کیئر ٹیکر کا ہوتا ہے، آپ ہی اس کے مالک ہیں، آپ کا مثبت کردار ہی پاکستان کے وقار کی ضمانت ہے، کمیونٹی نے جس طرح ہماری پذیرائی کی اس پر آپ سب کا شکر گزار ہوں، ادارے اپنی حیثیت میں اہم ہوتے ہیں قومی مفاد کے لیے قائم دائم رہنے چاہئیں۔'' ہائی کمشنر سید ابن عباس نے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''اُردو زبان و ادب کی جو خدمات سرانجام دے رہا ہے وہ بہت مثالی ہیں۔'' ڈاکٹر جاوید شیخ (اُردو مرکز) نے ہائی کمشنر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا: ''میں پچاس سال سے یہاں قیام پذیر ہوں ہم نے سید ابن عباس جیسا سفیر نہ پہلے سنا اور نہ ہی دیکھا۔'' ڈاکٹر جاوید شیخ نے کہا: ''اقبالؔ کی تعلیم مدرسہ میں ہوئی، ان کی سوچ پر مدرسہ کا اثر ہوا تعلیمات تصوف سے بھی اثر لیا، علامہ میر حسن ایک عالم تھے انھیں عربی فارسی زبان پر عبور تھا ان کی تربیت نے اقبالؔ کی شاعری کو فصاحت بخشی۔''

اقبالؔ کانفرنس کے تین سیشن ہوئے پہلے سیشن کی صدارت ہائی کمشنر سید ابن عباس، دوسرے سیشن کی صدارت ڈپٹی ہائی کمیشنر زاہد حفیظ چوہدری اور نظامت ڈاکٹر جاوید شیخ نے سرانجام دی، تیسرے سیشن میں مشاعرہ منعقد ہوا، پہلے دونوں سیشن سے خطاب کرتے ہوئے ماہرین اقبالیات پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور شعبہ اُردو کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران نے کہا: ''علامہ اقبالؔ ہمارے نمائندہ شاعر ہیں، بڑا شاعر وہ ہوتا ہے جس کے کلام میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں عہد کی آوازیں شامل ہوں۔ اقبالؔ قرآن کا شاعر ہے، اقبالؔ کا بنیادی پیغام ہے کہ انسان اللہ کا نائب بن سکے، اپنے آپ کو عشق کے پر لگا کر بیداری کرے، آج کا دور عالمگیریت کا دور ہے، ایسے دور میں کسی کے خیالات کا اندازہ لگانا مشکل ہورہا ہے، اقبالؔ نے سمجھایا فرہنگ کی بجائے اپنی اقدار سے رجوع کرنا چاہیے۔

اقبالؔ ''خودی'' کی سواری کی ہدایت کرتے ہیں۔ اقبالؔ اس تصوف کی بات کرتے ہیں جو رہبانیت اور کاہلی کی طرف نہ لے جائے اقبالؔ نے نوجوانوں کو ہدایت کی ہے جو اپنے آج ماضی سے جڑا رہے گا تبھی وہ بہتر مستقبل کی نشاندہی کر سکے گا، اُن کی نظر میں حرکت عبادت ہے، نیا دور جنم لے رہا ہے۔ جغرافیہ سے نکل کر کلمہ حق کہنا کی جرات کرنا چاہیے۔''

اُردو ادبیات کے نامور محقق سرجن ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے کہا: ''پاکستان ہائی کمیشن میں یہ ادبی قافلہ علامہ اقبالؔ کی کتاب ''بانگ درا'' کی صدا ہے، علم کا دریا بہہ رہا ہے، جدید ٹکنالوجی گھر بیٹھے علم کے پیاسوں کو میٹھا پانی پہنچا رہا ہے، کلامِ اقبالؔ انسان سے مربوط ہے لیکن آج انسان خود انسان کا ہی احترام نہیں کر رہا، اقبالؔ کا پیغام آفاقی ہے، آگے بڑھ رہا ہے، اسرار خودی میں اقبالؔ نے کہا یا رب میرے سینہ میں باخبر دل دے وہ نظر دے کہ شراب کے نشہ میں بھی جس پر سکون اور انسانیت کی تاجداری آشکار ہوا، اقبالؔ احترام آدمیت کے قائل تھے کہ اگر آپ انسان کی رنگ نسل پر درجہ بندی کریں تو انسان نہیں، آج کا انسان اپنے آپ کو نہیں پہچان رہا، اقبالؔ نے اسرار خودی میں کہا ہے کہ میری شاعری کا مقصد جدید اسلامی نظام تشکیل دینا ہے۔ اقبالؔ کا بڑا مسئلہ ہے کہ کرپشن پر کھل کر بات کرتے ہیں، اسی لیے انھوں نے کہا لقمہ حلال نہیں تو طائرِ لاہوتی کو پرواز نہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے نامور محقق اکرام چغتائی نے کہا: ''علامہ اقبالؔ کا جرمنی میں قیام اور مابعد طبیعات پر تحقیق بہت اہم ہے اس دور میں انھوں نے ہمعصر اکابرین کو جو خطوط لکھے وہ فکر اقبالؔ کی عکاسی کرتے ہیں۔'' پروفیسر افتخار ملک (باتھ یونیورسٹی) نے کہا: ''اقبالؔ نے گوئٹے، برگساںؔ، نطشے، رومیؔ، حافظ، خیام، غزالیؔ کی سوچ پر نظر رکھتے تھے، یورپ میں انڈسٹریل انقلاب کے بعد انسان دماغ رکھتا ہے، اسے سوچ وبچار پر فریڈم ہے، حضرت محمدؐ کے انتقال کے بعد اسلام فتنہ بازی کا شکار ہوا، مشرق سے منگولوں اور مغرب سے یورپی یلغار نے اسلام کو پیس کر رکھ دیا لیکن اسلام اپنی بقا اور مدافعت کرتا رہا ہے، اقبالؔ حضرت محمدؐ کے بعد صلاح الدین ایوبی کی شخصیت سے بہت متاثر تھے، انڈیا کو دہلی مسلم حکمرانوں نے بہت تحفظ دیا، سرسید نے کہا، ہمیں انگریزوں سے نہیں لڑنا، جب کہ جلال الدین افغانی نے کہا ہمیں انگریزوں سے لڑنا ہے، لیکن اقبالؔ نے دونوں کو اکٹھا کیا، اقبالؔ نیشنلزم کا داعی

نہیں، آزادی ولبرل ازم کا علمبردار ہے، اہل یورپ سے اچھی چیزیں اپنانی چاہئیں، ہمالیہ سے نئے چشمے پھوٹتے ہیں اپنی زندگی کو دیکھیں، اپنے مسائل کو سمجھیں۔

پروفیسر خواجہ اکرام الدین نہرو یونیورسٹی دہلی نے کہا: ''علامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری میں جو کردار تراشے ہیں، ہم چاہیں گے کہ نوجوان انھیں پڑھیں اور سمجھیں ''بال جبریل'' میں جب لفظ ابلیس سامنے آتا ہے تو ایک تصور سامنے آتا ہے کہ اپنی جرات انکار سے ابلیس نے اپنے آپ کو مردود کرایا، آج کی مشکلات کا حل اقبالؔ کی شاعری ہے، اقبالؔ نے جس طرح ندی نالوں پہاڑوں کا ذکر کیا ہے، وہ جذباتیت ہے مگر شاعرانہ تقاضوں کے نشیب و فراز کو سمجھانا ضروری ہے۔ اقبالؔ نے ابلیس کا فلسفہ انکار جو پیش کیا ہے، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔''

معروف براڈ کاسٹر رضا علی عابدی نے کہا: ''علامہ اقبالؔ کی نظم زندگی شمع کی صورت کر دے، ایک بچہ کی بہت خوب صورت تمنا ہے، کہیں وہ پھول بننے کی تمنا کرتا ہے اور کہیں غریبوں کی حمایت کرتا ہے کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ غریبوں کا مقدمہ شروع ہونے والا ہے۔''

اقبالیات کے ماہر پروفیسر شریف بقا نے کہا: ''علامہ اقبالؔ نے آیات قرآنی کو مدنظر رکھ کر شاعری کی ہے، ان کی شاعری میں فکر حدیث رواں، اقبالؔ نے مشرق و مغربی کے فلاسفروں کو پڑھا تھا جو چیز اچھی ہوتی اس کو اپناتے تھے۔ انسان کو اللہ نے بنایا ہے، کسی شخص کو دوسرے فرد کی توہین کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' انھوں نے کہا: ''تقریریں تو ہوتی رہتی ہیں، نوجوانوں کو مسجد کی طرف بلایا جائے اور ان کی کردار سازی کی جائے۔''

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن (دہلی) نے کہا: ''علامہ اقبالؔ نے گوئٹے کا گہری نظر سے بار بار مطالعہ کیا۔ گوئٹے کے خیالات سے متاثر ہو کر پیام مشرق لکھی، ہمیں خود اپنی نظر سے حقائق کو دیکھنا چاہیے، علامہ اقبالؔ نے سنسکرت شاعری پڑھی تھی، سنسکرت شاعری میں ندی نالوں پہاڑوں کا بار بار ذکر ہے اور اقبالؔ نے سنسکرت شاعری کا اثر لیا ہے، یورپ لادین اور معاشرہ تھا اور اقبالؔ نے اعتراف کیا ہے کہ برگسان نے مجھے دہریت سے بچایا ہے۔''

ڈاکٹر عبدالرحمان عبد (نیویارک) نے کہا: ''اقبالؔ کو سمجھنے کے لیے گوئٹے میں نہ

پھنسے رہیں، کلام اقبالؔ کو سمجھنے کے لیے مسلمان اور اسلام سے شناسا ہونا ضروری ہے، عشق اور عقل کے مابین کش مکش۔‘‘

ڈاکٹر آمنہ (لندن) نے کہا: ’’اقبالؔ نے مسجد قرطبہ کو جس عقیدت سے دیکھا ہے دراصل وہ یورپ میں اسلامی تہذیب اور مسلم کلچرل ہسٹری کی فکر مطالعہ ہے، کہ مشرق مغرب میں پل بن سکنے کا سامان تھا۔‘‘

جموں یونیورسٹی انڈیا کے پروفیسر شہاب عنایت ملک نے کہا کہ ’’علامہ اقبالؔ کی شاعری کو پڑھتے رہیں تو کچھ نہ کچھ فکر ملتی رہتی ہے۔ اقبالؔ کا کشمیر سے تعلق رہا، وہ بارہ مولا آئے کچھ عرصہ قیام کیا۔ کشمیر میں اقبالؔ کو بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے، اقبالؔ کو پاکستان تک محدود کر دینا زیادتی ہے، اقبال نے ابتداہی اس بات سے کہ اقبالؔ کا وطن ہندوستان ہے، اقبال سیکولر مائنڈ تھے، اقبالؔ کا کسی فرقہ سے تعلق نہیں تھا۔ اقبالؔ نے رام چندر جی پر خوب صورت نظم لکھی، المیہ تقسیم 1947ء کے بعد اقبالؔ کا نام لینا مشکل ہو گیا، لیکن جگن ناتھ آزاد نے اقبالؔ دریافت کیا تو اب اقبالؔ شوق سے پڑھا جانے لگا ہے۔‘‘

ڈاکٹر نصرت مہدی (بھوپال) نے کہا: ’’اقبالؔ بہت دنوں بھوپال رہے، راس مسعود سے ان کے مراسم تھے اپنے قیام کے دوران انھوں نے چودہ نظمیں لکھیں، آج وہاں اُردو اکیڈمی و اقبالؔ مرکز کے توسط سے غیر مسلم ماہرین اقبالیات کے مابین مکالمات کرائے گئے۔ تلسی داس اور اقبالؔ کا تقابلی مطالعہ ہوا، اقبالؔ ایک سوچ ہے بچے شوق سے پڑھ رہے ہیں۔‘‘

ڈاکٹر فاطمہ حسن انجمن ترقی اُردو کراچی نے کہا: ’’اقبالؔ اور تصوف کا مطالعہ بہت ضروری ہے، جب ادب مسیحائی کی روش پر چل پڑے تو ڈاکٹر تقی عابدی اس کی مثال ہیں۔‘‘

ڈپٹی ہائی کمشنر زاہد حفیظ چوہدری نے افتتاحیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ’’آپ سب کے بھروسہ پر اقبالؔ کانفرنس منعقد کی گئی اتنی بڑی تعداد میں علامہ اقبالؔ پر فکر انگیز مکالمات سننے یہ علمی تحقیق وسیع مطالعہ اور عرق ریزی کا حاصل ہے، آپ مفکرین کی علمی کاوش ہمارا اثاثہ ہے جو ہماری نوجوان نسل کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ثابت ہوگا۔‘‘

پاکستان ہائی کمیشن کی طرف سے آپ سب کا شکر گزار ہوں، فرسٹ سکریٹری منیر

احمد، فرسٹ سکریٹری آصف خان اور دیگر سفارتی اہلکار نے ہمہ وقت مہمانوں کا انتہائی خیر سگالی سے فریضہ سرانجام دیا، آخری سیشن میں مشاعرہ زیر صدارت ڈپٹی ہائی کمشنر زاہد حفیظ چوہدری منعقد ہوا۔ نظامت فیضان عارف، دردانہ انصاری نے کلام اقبال گائیکی سے پیش کیا، تقریب کے آغاز میں استقبالی کلمات سیکنڈ سکریٹری جواد اجمل اور قاری عبدالرشید نے تلاوت قرآن فرمائی۔

ناہید ادا
(برلن)
19 / جولائی 2009ء

برلن میں ڈاکٹر تقی عابدی کے ساتھ شام اور مشاعرہ

19 / جولائی 2009ء کو جرمنی کے شہر برلن میں ایک ادبی شام اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ یہ شام ''بزمِ ادب برلن'' کے صدر جناب علی حیدر وفا نے ادبی شام کا آغاز اپنے خطبہ صدارت سے کیا۔ جس میں انھوں نے برلن میں ''بزم ادب'' اور دوسری تنظیموں کی جانب سے، اب تک ہونے والی ادبی کاوشوں کی مختصر تاریخ پیش کی۔ اس کے بعد برلن کی جانی پہچانی شاعرہ ناہید آدا نے پروگرام کے آغاز میں اُردو کے مشہور شاعر، نقاد اور ماہر اقبالیات جناب ڈاکٹر تقی عابدی کو دعوتِ کلام دیا۔

کینیڈا سے تشریف لائے جناب ڈاکٹر تقی عابدی 35 تصانیف کے خالق ہیں۔ ''اقبالؔ کا فلسفہ تصوف'' ان کے مقالے کا موضوع تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت باریک بینی سے اقبالؔ کے فلسفے کا تحقیقی جائزہ پیش کیا۔

شام کے آٹھ بجے اس پروگرام کا آغاز ہوا۔ پروگرام کو دوحصوں میں منقسم کر کے ترتیب دیا گیا تھا۔ پہلے حصے میں مقالہ اور دوسرے حصے میں مشاعرہ رکھا گیا تھا۔ پروگرام کی صدارت، اُردو کے مشہور شاعر وادیب جناب عارف نقوی نے فرمائی۔

پروگرام کے دوسرے حصے میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرے میں نظامت کے فرائض ناہید ادا نے نہایت ہی خوش گوار طریقہ سے ادا کیے۔ ناہید آدا نے روایت کے مطابق سب سے پہلے اپنا کلام سنایا۔ ناہید آدا نے یہ غزل ترنم سے سنائی۔

لاش پر کس کس کی روئے اب کوئی
یہ تماشے تو یہاں ہوتے رہے

اس کے بعد سرور غزالی نے اپنا کلام پیش کیا۔ اور وہ کچھ یوں ہے ؎

دم دم پھرے ہے مست قلندر سچ ملے نہ پائے
سچ کی تلاش میں سچ کا جویا پھرتا پھرتا آئے

عشرت معین سیما برلن کی ایک ابھرتی ہوئی شاعرہ ہیں اس کے بعد انھیں دعوتِ کلام دیا گیا۔ ان کا یہ قطعہ بہت پسند کیا گیا۔

یہ چوڑیاں بھی لگیں آج مجھ کو ہتھکڑیاں
ہوائے خوں سے مہکی آج شام عید
کہاں نغمۂ شیریں زباں سے ہوں جاری
لبِ فرات سسکتی ہے آج شام عید

اس کے بعد برلن کے صاحب دیوان شاعر جناب انور ظہیر رہبر نے محفل مشاعرہ میں واہ واہ کی خوب داد وصول کی۔ ان کے اس شعر کو بہت سراہا گیا۔

پھول بننے کے لیے موتِ کلی ہے لازم
پھر بھی کلیاں ہیں کہ چپ چاپ کھِلی جاتی ہیں

اب باری تھی برلن کے محترم شاعر جناب علی حیدر وفا کی، انھوں نے اپنی خوب صورت نظم سے حاضرین مشاعرے کے دلوں کو گرما دیا۔ ان کا یہ شعر بہت سے لوگوں نے فرمائش کر کے بار بار سنا۔

شوخیِ دیدہ گلزار کہاں سے لاؤں
نغمۂ بلبل گفتار کہاں سے لاؤں

رخسار انجم صاحب برلن کے ایک نہایت منجھے ہوئے شاعر ہیں انھوں نے یہ شعر سنایا۔

تتلیوں کے بیل بوٹے دیکھنا
بے تحاشہ خواب جھوٹے دیکھنا

اس کے بعد جناب حنیف تمنا صاحب نے اپنا کلام سنایا۔

ہے عجب سلوکِ بہار اب مجھے شاخ شاخ سجا دیا
کہیں مثلِ گل کہیں غنچہ رو مجھے زخم زخم کھلا دیا

سب سے آخر میں صدر مشاعرہ جناب عارف نقوی نے اپنا کلام پیش کیا۔

یہ محفل رنگ و بو ہے یہاں ہر بات نرالی ہوتی ہے
جب شمع جلے تو لَو نکلے پروانہ جلے تو کچھ بھی نہیں

سب سے آخر میں بزم ادب کی جانب سے سرور غزالی نے تمام مہمانوں اور مشاعرے کو کامیاب بنانے میں ممدوح بزم ادب کے اراکین کا شکریہ ادا کیا۔

اس طرح یہ ایک خوب صورت اور یادگار شام اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس تقریب کے فوراً بعد تمام شعراء کرام کے لیے ایک عشائیے کا اہتمام ایک ریستوران میں کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر تقی عابدی نہایت خوش گفتار اور ذہین مقرر ہیں۔ پروگرام کے بعد دیر تک وہ سامعین کے سوالات کا جواب دیتے رہے۔ بعد میں کھانے پر بھی سوالات اور جوابات کا سلسلہ جاری رہا۔

ہائیڈل برگ (جرمنی)
20/جولائی 2009ء

جرمنی میں علامہ اقبال سے اظہارِ عقیدت کی تقریب

علامہ اقبال نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری جرمنی کے شہر میونخ کی ایک یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ لیکن آپ کا قیام ایک دوسرے خوب صورت شہر ہائیڈل برگ میں رہا جہاں سے دریائے ''نیکر'' گزرتا ہے۔ آپ اسی دریا کے کنارے ایک جگہ اکثر تشریف لے جاتے۔ آپ کی مشہور زمانہ فارسی نظم ''ایک شام'' اسی دریا کے کنارے لکھی گئی تھی۔ اس مقام پر وہ نظم ایک بڑے پتھر کی سل پر جرمن زبان میں ترجمہ کے ساتھ کندہ ہے۔ اسی شہر میں ایک سڑک کا نام بھی ''ساحل اقبال'' رکھا گیا ہے۔ جس مکان میں علامہ اقبال نے قیام کیا تھا اس پر ایک تختی بھی آویزاں کی گئی ہے۔ یہ ساری چیزیں علامہ اقبال کی عظمت کے اعتراف میں جرمن حکومت کی جانب سے کی گئی ہیں۔

جرمنی میں مقیم ایک معروف شاعر، صحافی اور ''حلقہ ادب'' جرمنی کے بانی اقبال حیدر نے علامہ اقبال سے اظہارِ عقیدت کے لیے ایک تقریب کا انعقاد کیا۔ اس پروگرام کے ایک حصہ کی خصوصیت یہ تھی کہ دریائے نیکر کے کنارے ''ساحلِ اقبال'' کے ایک گوشے میں سبزازار پر سفید چادریں بچھا کر اور تکیہ سجا کر ایک ادبی نشست ترتیب دی گئی۔ اس تقریب کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی کہ ٹورنٹو میں مقیم اُردو دُنیا کے معروف ادیب، شاعر، دانشور اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر سیّد تقی عابدی بھی وہاں شریک محفل تھے۔

تقریب کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے سید اقبال حیدر نے کہا کہ ''ادران کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ دریائے نیکر کے کنارے ایک شعری نشست کی جائے۔ اس بات پر وہ بجا طور پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ اس تقریب کا انعقاد اس وقت ممکن ہو سکا۔ ابتدا میں قاضی وحید صاحب نے علامہ اقبال کی مشہور نظم ''جواب شکوہ'' ترنم کے ساتھ سنائی۔'' مشہور صحافی

شیخ مظفر نے کہا کہ ''ہم جب بھی اپنے کسی مہمان یا بچوں کو یہاں لائیں تو علامہ اقبالؔ کے حوالے سے ان یادگار مقامات کی تفصیل بتائیں، تاکہ اپنے قومی شاعر کی عظمت ان بچوں کے دلوں میں ابھی سے پیدا ہو اور وہ فخر محسوس کریں۔''

فرینکفرٹ، جرمنی میں نیشنل بینک آف پاکستان کے جنرل منیجر شاہد اقبال نے سیّد اقبال حیدر کو اس تقریب کے انعقاد پر مبارک باد دی۔ اتنے موثر اور خوب صورت انداز سے جو یاد منائی گئی وہ ہمیشہ دلوں میں زندہ رہتی ہے۔ اس کے بعد شعراء کرام نے حکیم الامت علامہ اقبال کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

شاعروں میں سیّد اقبال (فرینکفرٹ)، شکیل چغتائی (برلن)، ہمن شاہ (پیرس)، شہزاد ارمان (ہائیڈل برگ)، ارم بتول قادری (ہائیڈل برگ)، شفیق مراد (برلن)، شاہد زیدی (ہمبرگ)، ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے سابق طالب علم ڈاکٹر فرخ بیگ اور ڈاکٹر ارشد رضوی بھی اس موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے دریائے نیکر کے کنارے کو ''ساحل اقبالؔ'' نام دینے، علامہ کی قیام گاہ پر تختی نصب کرانے اور علامہ کو جرمن زبان سکھانے والی خاتون کی تلاش اور ''ساحلِ اقبال'' پر کلامِ اقبالؔ والی سل لگوانے کی اپنی شرکت کی یادوں کو تازہ کیا۔ ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے اس بات کا ذکر کیا کہ کس طرح علامہ اقبالؔ نے جرمن شاعری اور فلسفے کا استفادہ کیا تھا۔ آپ نے علامہ اقبالؔ کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا اور اُن کی نظم ''مسجد اقصیٰ'' سنائی۔ سامعین کے پُر زور اصرار پر جناب تقی عابدی نے اپنی ایک نظم بھی سنائی۔

اس تقریب میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے طلباء کے علاوہ کئی ادبی اور سماجی شخصیات نے مثلاً جناب طارق پرویز، جناب اسد اللہ خان۔ فرخ بیگ، ڈاکٹر ارشد رضوی، چودھری محمد رفیق اور معروف شاعر شفیق مراد نے بھی شرکت کی۔ اس تقریب سے قبل ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی طالبہ ارم بتول قادری اور اُن کے بھائی نوجوان شاعر شہزاد ارمان قادری نے یونیورسٹی میں ایک تقریب کا انعقاد بھی کیا۔ تقریب کا آغاز شہزاد ارمان کی انتھک کوششوں سے بنی ایک اُردو ویب سائٹ ''اہلِ قلم ڈاٹ کام'' کی رونمائی سے ہوا۔

یہ تقریب ڈاکٹر تقی عابدی کی صدارت میں ہوئی اور مہمان خصوصی ڈاکٹر کرسٹینا تھیں۔ محفل مشاعرہ کی نظامت ارم بتول اور ثمن شاہ نے بڑے خوب صورت انداز میں کی۔ ارم بتول، شہزاد ارمان، ثمن شاہ، شفیق مراد، شاہد زیدی، شکیل چغتائی، سیّد اقبال حیدر اور ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے اپنا کلام پیش کیا۔

ہائیڈل برگ
(جرمنی)
22/جولائی 2009ء

ارم بتول اور شہزاد ارمان کے زیر اہتمام

ڈاکٹر تقی عابدی کے مبارک ہاتھوں اہلِ قلم ڈاٹ کوم کی رونمائی

تقریب کی مہمانِ خصوصی ثمن شاہ

ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی میں ایک خوب صورت تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ ارم بتول نے تقریب کا آغاز کرتے ہوئے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور ڈاکٹر تقی عابدی کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''پروگرام میں آپ کی شرکت کسی اعزاز سے کم نہیں۔'' پھر جناب ڈاکٹر تقی عابدی کو دعوت دی کہ وہ اہلِ قلم ڈاٹ کوم کی رونمائی کریں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اس خوب صورت ویب سائٹ کی رونمائی کی رسم ادا کی۔

اہلِ قلم ڈاٹ کوم کے تخلیق کار ارم بتول اور شہزاد ارمان ہیں اور اس ویب سائٹ کا مقصد اُردو ادب کی بے لوث خدمت ہے اس تقریب میں معروف شاعرہ ثمن شاہ خصوصی طور پر فرانس سے تشریف لائیں تقریب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، پہلا حصہ اہلِ قلم کی رونمائی کے حوالے سے اور دوسرے حصے میں ڈاکٹر تقی عابدی کے لیکچر جس کے لیے ڈاکٹر صاحب کو خصوصی دعوت دی گئی تھی اور ایک مختصر مشاعرہ کا اہتمام تھا اس مشاعرہ کی نظامت کے فرائض محترمہ ثمن شاہ جو کہ پروگرام کی مہمان خصوصی بھی تھیں نے انجام دیے پروگرام کے پہلے حصے کے اختتام کے بعد مہمانوں کی خاطر تواضع کی گئی، جس کے انتظامات شہزاد ارمان اور ان کی اہلیہ زیبا شہزاد نے بھرپور طریقے سے کیے مہمان نوازی کی رسم ادا ہونے

کے فوراً بعد تقریب کے دوسرے حصہ کا آغاز ثمن شاہ نے میزبانی کے فرائض سنبھالتے ہوئے کیا: ''اس مشاعرہ میں جرمنی میں مقیم شعرا کرام شہزاد ارمان، ارم بتول، شفیق مراد، اقبال حیدر، شاہد علی شاہ اور ثمن شاہ نے اپنا کلام سنا کر محفل کی رونق کو دوبالا کیا۔

آخر میں جناب ڈاکٹر تقی عابدی نے شاعر مشرق علامہ اقبالؔ پر ایک خوب صورت اور طویل معلوماتی لکچر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبالؔ کی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کے کلام پر سیر حاصل گفتگو کی۔ آخر میں ڈاکٹر تقی عابدی سے کئی حضرات نے علامہ اقبالؔ کی شخصیت کے متعلق سوالات کیے جن کے تفصیلی جواب ڈاکٹر تقی عابدی نے دے کر ہماری معلومات میں قیمتی اضافہ کیا اور اس کے بعد حاضرین کے بے حد اصرار پر ڈاکٹر تقی عابدی صاحب نے اپنی ایک خوب صورت نظم ''حسنِ مطلق'' سنائی جسے سن کر تمام لوگ بہت محظوظ ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اس یادگار تقریب کا اختتام ہوا۔

ہائیڈل برگ

4/جون 2010ء

اہلِ قلم کے زیرِ اہتمام ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اقبال سیمینار

''تذکرۂ اقبال''

اہلِ قلم ڈاٹ کام کے زیرِ اہتمام اقبال چیئر اور شریف اکیڈمی کے تعاون سے 4/جون 2010ء کو ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی کے ادارہ جنوبی ایشیاء میں ''تذکرۂ اقبال'' (Iqbal Seminer) منعقد کیا گیا، جس میں ڈنمارک سے معروف صحافی اور نکھرے ہوئے ادبی ذوق کی شاعرہ محترمہ صدف مرزا، بوخم یونیورسٹی سے پروفیسر اکلم سید اور کینیڈا سے ماہر اقبالیات دانشور اور معروف شاعر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے شرکت کی۔

سیمینار کی نظامت کے فرائض اہلِ قلم ڈاٹ کام کے چیف ایڈیٹر اور شاعر شہزاد ارمان اور ہائیڈل برگ جامعہ میں شعبہ نفسیات میں ڈاکٹریٹ کی طالبہ اور معروف شاعرہ ارم بتول قادری نے انجام دیے۔ تلاوتِ کلام پاک سے اس پروقار محفل کا آغاز ہوا اور ارم بتول قادری نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''اقبال واقعی زندہ رود ہیں اور اقبال آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں، ہر آنے والی نسل کو ان کے افکار سے نئی روشنی اور نئی زندگی ملتی ہے چناں چہ آج کا سیمینار اسی بات کی دلیل ہے۔''

اقبال چیئر پر فائز ڈاکٹر وقار شاہ نے اہلِ قلم ڈاٹ کام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی کوششوں کو سراہا، انھوں نے کہا کہ ''ہائیڈل برگ اور اقبال کے رشتے کو نظر انداز کرتے ہوئے 2003ء میں اقبال چیئر کو ہائیڈل برگ سے برلن منتقل کیا جانے والا حکومتِ پاکستان کا فیصلہ انتہائی غلط تھا، کیوں کہ ہائیڈل برگ کو پاکستان میں شہرِ اقبال کے طور پر جانا جاتا ہے۔''

محترمہ صدف مرزا نے اپنے مقالے کے موضوع ''اقبال کے مردِ مؤمن اور نطشے

کے سپر مین کا تقابلی جائزہ'' پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''اقبالؔ کا مردِ مومن تسخیر کائنات کا موجب بنتا ہے، باقی قافلے افلاک کے پیچ وخم میں الجھ کر رہ جاتے ہیں لیکن سارے زینے عبور کرتا بندۂ مومن تسخیر کائنات کے مقام پر پہنچ جاتا ہے، وہ ساکنانِ فلک کی نبضوں پر اپنی سوچ اور عمل کی انگلیاں رکھ دیتا ہے۔

پروفیسر اسلم سید نے اپنے موضوع ''اقبالؔ کے جرمن قوم کے بارے میں تاثرات'' پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''اقبالؔ، حافظؔ، رومیؔ، گوئٹے اور نطشے سے بہت متاثر تھے اور اقبالؔ وائمر میں گوئٹے کی قبر پر حاضری کو حج سمجھتے تھے، اقبالؔ نے یقیناً کہا تھا اور بالکل صحیح کہا تھا کہ نطشے کا دماغ کفر کی طرف اور دل خدا تھا۔ نطشے واقعی مجذوب تھا اور اس نے یورپ کے خیالات نظریات کو کوئی نیا فلسفہ دیئے بغیر اُدھیڑ کر دکھا دیا کہ ان میں کیا رکھا ہے۔

آخر میں شہزاد ارمان نے استاد عبدالقادر قادری کی رباعی ڈاکٹر تقی عابدی کی نذر کرتے ہوئے ؎

آداب و علوم راہ گزر میرے ہیں
منزل در منزل یہ سفر میرے ہیں
اے فن تیری رفعت کا باعث جو بنے
پرواز وہ میری ہے وہ پر میرے ہیں

دعوتِ مقالہ دی، ڈاکٹر تقی عابدی نے ''گوئٹے اور اقبالؔ کے مابین فکری اور نظریاتی مماثلت'' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ Genious اور نابغۂ روزگار لوگوں کے درمیان پہلے تو موازنہ ہو ہی نہیں سکتا جیسا کہ شعر کا ترجمہ نہیں ہوسکتا مگر ہم مجبور ہیں کہ شعر کی ترجمانی کریں، گوئٹے پر ہمارا علم محدود ہے اور ہم گوئٹے کو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا گوئٹے کے کلام کے انگریزی اور اُردو ترجمے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اگر چہ گوئٹے کا کلام جو نثر اور نظم میں چالیس ضخیم جلدوں میں جرمن میں موجود ہے اس لیے گوئٹے کے کلام کے ترجمے، تحقیق اور تنقید کی اشد ضرورت ہے۔

جہاں تک علامہ کے کلام کا تعلق ہے، علامہ کے 28000 اشعار میں سے چند اشعار لے کر اور گوئٹے کا مکان اور دیوان دیکھ کر کتاب یا مضمون لکھ کر دونوں کے موازنہ کا حق

ادا نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے عمیق مطالعے، تحقیق اور تنقید کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں ان دونوں شاعروں کے آہنگ سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے کیوں کہ دریا سے دور رہ کر دریا کے اندرونی حالات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا چناں چہ قطرے کو چاہیے کہ وہ دریا میں مل کر دریا کے رموز سے واقف ہو، دور کھڑے رہ کر دریا سے الگ رہ کر جب گفتگو کی جائے گی وہ ناقص رہے گی۔" ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ "بعض نام نہاد تنقید نگاروں نے جو سب سے بڑا ظلم کیا وہ یہ ہے کہ اپنی چھوٹی سی ذہنیت کو ان پہاڑ جیسی شخصیات پر تصرف کر کے اپنے سوچ کو ان پر تھونپا جس کی وجہ سے خود بھی کنفیوز رہے اور ہمیں بھی کنفیوز کیا، علامہ کے ایک فارسی شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا کہ "انسان کائنات میں نہیں سما سکتا کیوں کہ کائنات چھوٹی ہے لیکن کائنات انسان میں سما سکتی ہے، گوئٹے اور اقبالؔ کے مواز نے میں جو اشعار لکھے ہیں وہ تعلیٰ نہیں بلکہ یہ اقبالؔ کی حق بیانی ہے کیوں کہ اقبالؔ شرق کا نابغۂ روزگار ہے اور گوئٹے غرب کا اور دونوں کے مسائل میں یکسانگی ہے۔ ہر دونوں کے پاس آفاقیت ہے، یہاں عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کو راستہ جاتا ہے، اور دونوں کے پاس انسانیت کی معراج ہے۔"

شریف اکیڈمی کے چیف ایگزیکٹو شفیق مراد نے اہل قلم ڈاٹ کام کی ایک سالہ کارکردگی پر بھرپور روشنی ڈالی اور اکیڈمی کے تحت شائع ہونے والی کتاب "دل لہو سے بھر گیا" ڈاکٹر تقی عابدی کو پیش کی۔ اختتام پر شہزاد ارمان نے معزز اسکالرز اور وائس آف جرمنی کی شعبہ اُردو کی ڈائریکٹر محترمہ کشور مصطفیٰ، فرینکفرٹ سے تشریف لائے ہوئے معروف شاعر اور کالم نگار سید اقبال حیدر، جناب شاہد خان اور کیمرہ مین راج کمار روی، مزید اراہتمامِ ضیافت پر زیب النساء ارمان کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح یہ پروقار، خوب صورت اور تاریخی محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔

مظفر شیخ
(نمائندہ جنگ)
2010ء

ہائیڈل برگ میں علامہ اقبالؔ سے اظہار عقیدت کے لیے تقریب کا انعقاد

دریائے نیکر کی وادی میں آباد قدیم شہر ہائیڈل برگ سے جرمنی کے پاکستانیوں کو ایک خاص نسبت ہے، مفکر پاکستان، شاعر مشرق، حکیم الامت علامہ محمد اقبالؔ نے ایک سو دو سال قبل اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران ڈھائی ماہ کا عرصہ یہاں گزارا تھا۔ اگرچہ یہ وقت انتہائی مختصر تھا مگر اس دوران اقبالؔ نے جرمن زبان کی مزید سوجھ بوجھ حاصل کر کے مشہور جرمن شاعر گوئٹے اور دیگر فلسفیوں سے استفادہ کیا اور ماہرین اقبالیات کا کہنا ہے کہ جرمنی ہی میں اقبالؔ نے غور و فکر اور فلسفہ گری کے وہ مراحل طے کیے جنھوں نے ان کی آئندہ شاعری اور فکر کی جہتیں وضع کیں جس طرح اقبالؔ کی سوانح حیات میں ہائیڈل برگ میں قیام نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی طرح جرمنی سے پاکستان اور پاکستانیوں کے روابط میں اقبالؔ اور ہائیڈل برگ کا ذکر لازمی ہے۔

ہائیڈل برگ شہر نے بھی ایک سو سال قبل آنے والے مہمان کو فراموش نہیں کیا بلکہ اسے اعزاز سمجھ کر اپنی تاریخ کا حصہ بنا لیا ہے۔ دریائے نیکر کے کنارے ایک سڑک کو "ساحل اقبالؔ" کا نام دیا گیا ہے اور یہیں ایک گوشہ میں پتھر کی ایک بڑی سِل پر نیکر کے کنارے ہی لکھی گئی نظم "ایک شام" کا جرمن ترجمہ کندہ کیا گیا ہے۔ جس مکان میں اقبالؔ کا قیام رہا اس کی دیوار پر ایک یادگاری تختی آویزاں ہے۔ ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے جنوبی ایشیا انسٹی ٹیوٹ میں اقبالؔ فیلوشپ بھی قائم ہے اور دو سال قبل جرمنی میں اقبالؔ کے قیام کی سو سالہ سالگرہ کے موقعے پر ایک کانفرنس بھی منعقد کی گئی تھی۔ سیر تفریح کے لیے جرمنی آنے والے پاکستانیوں کی

بھی ہائیڈل برگ دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے اور یہاں رہنے والے پاکستانی اپنے مہمانوں کو ہائیڈل برگ کی سیر کروانے کو میزبانی کے فرائض میں شامل سمجھتے ہیں گزشتہ بدھ کو ہائیڈل برگ میں علامہ اقبالؔ کے قیام کی یاد تازہ کرنے اور ان سے اظہار عقیدت کے لیے پورے دن کا ایک پروگرام منعقد ہوا جس کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ کینیڈا میں مقیم مشہور اور ممتاز ادیب، شاعر، دانشور اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر سید تقی عابدی مہمان خصوصی تھے اور پروگرام کا ایک حصہ دریائے نیکر کے کنارے ''ساحل اقبالؔ'' کے اس گوشہ میں سبزہ زار پر ایک نشست تھی جہاں اقبالؔ کی یاد میں پتھر کی سل پر ان کی نظم کا ترجمہ کندہ ہے۔ منفرد انداز کی اس اولین تقریب کے محرک اور میزبان حلقہ ادب جرمنی کے بانی اور معروف شاعر سید اقبال حیدر تھے۔

جب کہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ میں ایک تقریب اور محفل مشاعرہ بزم اہل قلم کے زیر اہتمام ہوئی جس کا انتظام نوجوان پاکستانی طلباء اور شاعروں ارم بتول قادری اور شہزاد ارمان نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کیا تھا۔ مقامی یونیورسٹی کے سابق طلباء، شعبہ اُردو کی سربراہ ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ اور ہائیڈل برگ و دیگر شہروں سے آئے ہوئے شائقین شعر و ادب اور عقیدت مندان اقبالؔ نے دونوں پروگراموں میں بھرپور شرکت کی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے خطاب میں اقبالؔ کے علمی و فکری سفر میں جرمنی کے سفر کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ''بیگم عطیہ فیضی جو 1907ء میں اقبالؔ کے ہمراہ ہائیڈل برگ آئی تھیں اپنی یادداشتوں میں یہ شہادت دے چکے ہیں کہ یہاں پہنچتے ہی اقبالؔ کے انداز فکر میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اقبالؔ ہائیڈل برگ کی پرسکون وادی کے لہلہاتے درختوں اور گھاس کی سرسراہٹ سے بھی فیض و وجدان حاصل کر رہے تھے۔''

خود اقبالؔ نے مکتوبات میں یہاں تک لکھا کہ ''ان کی روح ہائیڈل برگ کا سفر کرتی رہے گی۔ یہیں انھوں نے عظیم جرمن فلسفی اور شاعر گوئٹے اور دوسرے فلسفیوں سے ذہنی روحانی اور فکری رشتے استوار کیے اور گوئٹے کے ہی دیوان مشرق و مغرب کے جواب میں پیام مشرق لکھی۔ ''ساحل اقبالؔ'' پر گوشہ اقبالؔ میں بیٹھے ہوئے عقیدت مندان اقبالؔ نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کے کلام اقبالؔ کے سیاق و سباق پر گفتگو ہمہ تن گوش ہو کر سنی اور اگرچہ

دریائے نیکر کے اس کنارے کا وہ سکون کاروں کی بھاری ٹریفک کے شور میں دب کر رہ گیا ہے، بعض لمحوں میں تو یوں محسوس ہوا کہ علامہ اقبالؔ کی روح ان عقیدت مندوں کے درمیان ہی موجود ہے، جس کے احترام میں لمحے لمحے کے لیے ٹریفک کا شور بھی تھم جاتا تھا۔ شاعروں سید اقبال حیدر (فرینکفرٹ)، شکیل چغتائی (برلن)، ثمن شاہ (پیرس)، شہزاد ارمان (ہائیڈل برگ)، ارم بتول قادری (ہائیڈل برگ) اور دیگر نے موقع کی مناسبت سے اقبالؔ پر ہی اپنا اپنا کلام سنایا۔ شاہد اقبال خان نے اپنی نوعیت کی یہ پہلی محفل منعقد کرنے پر سید اقبال حیدر کو مبارک باد دی اور توقع ظاہر کی کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں 60ء کی دہائی میں رہنے والے دو سابق طالب علم ڈاکٹر فرخ بیگ اور ڈاکٹر ارشد رضوی بھی اس موقع پر موجود تھے انھوں نے اسی زمانہ میں نیکر کے کنارے کو ساحل اقبالؔ کا نام دینے، اقبالؔ کے رہائشی مکان پر یادگاری تختی کی تنصیب، اقبالؔ کو جرمن زبان سکھانے والی خاتون کی تلاش اور ساحل اقبالؔ پر کلام اقبالؔ والی سل لگانے میں اپنی شرکت کی یادوں کو تازہ کیا۔ جب ڈاکٹر تقی عابدی جرمن شاعری اور فلسفے سے اقبالؔ کے استفادہ اور حصول وجدان کا ذکر کر رہے تھے اور شاعر و شاعرات اقبالؔ کے ترانے اور مدحتیں گا رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ اقبالؔ تو ڈھائی مہینے کے لیے یہاں آئے اور یہاں کے درختوں کی ہواؤں اور گھاس کی سرسراہٹ کو بھی حصول علم کا ذریعہ سمجھے لیکن کیا ہم جو اپنی زندگیاں یہاں پوری کر رہے ہیں اور ہماری جن نسلوں کو جرمنی کی یہ ہوائیں اور فضائیں گھٹی میں نصیب ہوئی ہیں اس گراں قدر موقع سے کچھ حاصل کر رہے ہیں اور کہاں تک اقبالؔ کے فکر سے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔

پاکستانیوں کو اپنی نئی نسل کو اقبالؔ سے متعارف و شناسا کرانے کے لیے ہائیڈل برگ کے ساحل اقبالؔ کا نظارہ ضرور کرانا چاہیے یہاں اقبالؔ کا نام اور پتھر پر کندہ کلام اقبالؔ ہمارے لیے صرف باعث فخر و مسرت ہی نہیں چراغ راہ بھی ہونا چاہیے۔ جرمنی میں ہر ملک اور قوم کے تارکین وطن آباد ہیں لیکن یہ اعزاز پاکستانیوں کو ہی حاصل ہے کہ ان کے ملک کا خواب دیکھنے والا بھی یہاں مہمان رہا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مستقبل کا مورخ جرمنی میں پاکستانیوں کی تاریخ مرتب کرے گا تو یہاں سب سے پہلے آنے والے پاکستانی کا نام ''محمد اقبالؔ'' ہی لکھے گا۔

ساجدہ حنا (برلن)
یکم ستمبر 2011ء

''فیض فہمی'' کی تقریب اجراء

''بزمِ ادب برلن'' کے بینر پر ڈاکٹر تقی عابدی کی تالیف کردہ کتاب ''فیض فہمی'' کا جشن اجراء اور شاندار مشاعرے کا انعقاد

''بزمِ ادب'' کے جنرل سیکریٹری سرور غزالی اس تقریب کی نظامت فرما رہے تھے۔ معتبر اور مقتدر خواتین و حضرات ہال میں موجود تھے اور ڈاکٹر تقی عابدی کی آمد کے منتظر تھے۔ اچانک مائیک پر سرور غزالی کی آواز گونجی، ''معزز خواتین و حضرات! لیجیے انتظار کا وقت ختم ہوا ہمارے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی تشریف لا چکے ہیں اور اب پروگرام شروع ہوا چاہتا ہے۔''

عابدی صاحب جب ہال میں داخل ہوئے تو تمام سامعین نے ان کا استقبال کیا۔ اسٹیج پر ''بزمِ ادب برلن'' کا بینر لگا ہوا تھا۔ ''فیض فہمی'' ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب کے اجراء کا اعلان بھی نظر آ رہا تھا۔ اور تین مہمانِ خصوصی، ڈاکٹر تقی عابدی، شمس فریدی اور فیصل نواز چوہدری کے نام نظر آ رہے تھے۔

سرور غزالی نے پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے ہندوستان سے تشریف لائے شمس فریدی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ پھر ڈاکٹر تقی عابدی اور ناروے سے آئے مہمان فیصل نواز چوہدری، ڈپٹی ہیڈ آف کونسل (سفارت خانہ پاکستان، جرمنی) جناب مظہر جاوید ''بزمِ ادب برلن'' کے صدر محترم جناب علی حیدر عابدی اسٹیج پر جلوہ افروز ہوئے۔ سرور غزالی نے جلسہ کے آغاز پر اُردو ادب میں اچھے اور غیر جانب دار نقادوں کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''تقی عابدی کی دریافت کے بعد اس کمی کا ازالہ ہو گیا ہے۔''

''بزمِ ادب برلن'' کے صدر علی حیدر عابدی نے اپنے خطبہ صدارت میں ڈاکٹر تقی عابدی کی برلن دوبارہ تشریف آوری پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ان کی دعوت پر دوبارہ برلن تشریف لائے اس پر تنظیم ''بزمِ ادب برلن'' ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہے۔

علی حیدر عابدی نے محقق، ناقد، مصنف و شاعر تقی عابدی کی علمی اور فنی کاوشوں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اور اس کے ساتھ انھوں نے ہندوستان کے جانے پہچانے شاعر شمس فریدی کا بھی تعارف کرایا اور کہا کہ ''دوسرے دور کے پروگرام میں مشاعرہ ہے، جس کی صدارت شمس فریدی صاحب کریں گے۔ ناروے سے آئے اُردو کے معروف افسانہ نگار کا تعارف کراتے ہوئے سرور غزالی سے ان کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی۔ ان کی مختصر تقریر کے بعد شمس فریدی صاحب سے، سرور غزالی نے، جنابِ تقی عابدی صاحب کی خدمت میں ''بزمِ ادب برلن'' کی جانب سے پیش کردہ سپاس نامہ پڑھنے کی درخواست کی۔ سپاس نامہ میں اختصار کے ساتھ ڈاکٹر تقی عابدی کے ادبی اور علمی تحقیق اور تنقیدی کاوشوں کو جامع طور پر بیان کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ناظمِ جلسہ نے ''فیض فہمی'' کی رسمِ اجرا کے لیے پاکستان کے ڈپٹی ہیڈ آف کمیشن، سفارت خانہ برلن، جناب مظہر جاوید صاحب سے درخواست کی۔ ''فیض فہمی'' کی رسمِ اجراء کے بعد جناب مظہر جاوید صاحب نے ایک مختصر سی تقریر میں فیض کی شاعری پر روشنی ڈالی۔ اور ڈاکٹر تقی عابدی کو ان کی کتاب پر مبارک باد دی۔

سرور غزالی نے ڈاکٹر تقی عابدی کو دعوت دی کہ وہ فیض کی شاعری پر ایک توسیعی لکچر دیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض کی شاعری پر ایک مبسوط تقریر کی اور فیض کی شاعری میں جان کیٹس، ولیم بلیک اور ورڈز ورتھ کے نمایاں رنگوں کو واضح کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر، فیض کی شاعری پر نہایت اہم باتوں پر مبنی تھی انھوں نے بتایا کہ فیض نے نہایت مختصر شاعری کی ہے، لیکن اُردو ادب میں ان کی گہری چھاپ ہے اور رہے گی۔ فیض کی شاعری کو انھوں نے رومانی شاعری کا نام دیا۔ پہلے دور کے آخر میں ستیہ پال آنند صاحب کا تہنیتی پیغام بنام ڈاکٹر تقی عابدی پڑھ کر سنایا گیا۔

چائے کے وقفے کے بعد دوسرے دور میں مشاعرے کا آغاز جناب شمس فریدی

صاحب کی صدارت میں ہوا۔ مشاعرے کا آغاز سرور غزالی نے اپنی آزاد نظم ''کن فیکون'' سے کیا۔ اس کے بعد مزاحیہ شاعر محمد ارشاد نے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد طاہرہ رباب نے اپنا کلام سنایا انھیں ہمبرگ واپس جانا تھا اس لیے ان سے مشاعرے کے شروع میں ہی ان کا کلام سن لیا گیا۔ ان کے بعد، سوشیلا حق، ناہید ادا، بزمِ ادب کے صدر علی حیدر عابدی وفا، شکیل چغتائی، عشرت معین سیما، اقبال حیدر، تقی عابدی، حنیف تمنا اور عارف نقوی نے بھی اپنا کلام سنایا۔

مشاعرے کے اختتام پر صدرِ محفل جناب شمس فریدی نے اپنا کلام پیش کیا۔ ان کی غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ایک چشمۂ سراب تھا بس اور کچھ نہ تھا
سارا سفر عذاب تھا بس اور کچھ نہ تھا

آخر میں مخصوص مہمان ڈاکٹر تقی عابدی، شمس فریدی اور فیصل نواز چوہدری کو پھولوں کے گلدستے پیش کیے گئے۔ سرور غزالی نے اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے تقریباً شب کے دس بجے بحسن خوبی مشاعرے کے اختتام کا اعلان کیا۔

تمام مہمانِ گرامی کو کھانے پر دعوت دی گئی۔ جس کا اہتمام شیرازی صاحب نے اپنے ریستوران میں کیا تھا۔

سیّد رضا حسین

13/ مارچ 2015ء

جرمنی میں دو روزہ ادبی تقریبات

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے حوالے سے دنیا بھر میں تقریبات ہوتی رہتی ہیں مگر حکیم امت کو اس انوکھے انداز سے خراجِ عقیدت پیش کرنے کا خیال جرمنی میں مقیم معروف شاعر، ادیب اور صحافی سیّد اقبال حیدر کو 9 برس پہلے آیا اور انھوں نے تقریب کے لیے دریائے نیکر کے کنارے خوب صورت پارک کے اسی گوشے کو چنا جہاں علامہ تشریف رکھتے تھے، شاعرِ مشرق کے چاہنے والے ہر سال ہونے والی اس تقریب کا انتظار شدت سے کرتے ہیں، اور اس میں شرکت کے لیے اُردو ادب کے عالمی سفیر ڈاکٹر تقی عابدی کینیڈا سے تشریف لاتے ہیں۔

ہر سال کی طرح امسال بھی ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن، جرمنی نے دو روزہ ادبی تقریبات کا آغاز سر سبز و شاداب پہاڑوں کے حصار میں بہتے ہوئے دریائے نیکر کے کنارے دلفریب مقام ''مقامِ اقبال'' سے کیا۔ حکیم الامت ڈاکٹر اقبالؔ کو اس منفرد انداز میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے جرمنی میں مقیم سفیرِ پاکستان جناب حسن جاوید، پریس کونسلر غلام حیدر برلن سے قونصل جنرل ڈاکٹر امتیاز قاضی فرینکفرٹ سے اور عالمی اُردو ادب کے سفیر ڈاکٹر تقی عابدی کینیڈا سے شریک ہوئے۔ دریائے نیکر کے کنارے ہلکی پھلکی بونداباندی نے تقریب کا حسن اور بھی دوبالا کر دیا۔ ''پیغامِ اقبالؔ اور عصری مسائل'' کے موضوع پر مقالے پڑھے گئے۔ اس موقع پر علامہ اقبالؔ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے۔ سیّد حسن جاوید، سفیرِ پاکستان نے نہایت اہم اعلان کیا کہ ان کی کوشش ہوگی کہ جرمنی میں دریائے نیکر کے کنارے علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ کی قیام گاہ کو خرید کر ''اقبالؔ میوزیم بنائیں گے مگر اس کے لیے انھیں جرمنی میں مقیم پاکستانی کمیونٹی کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ کینیڈا سے تشریف لائے ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا: ''جرمنی ہائیڈل برگ میں شاعرِ مشرق نے اپنے قیام کو زندگی

کے خوب صورت لمحات سے تعبیر کیا ہے، علامہ اقبالؔ نے اُردو ادب کو ''جاوید نامہ'' اسی دریا ئے نیکر پر بیٹھ کر ہی دیا ہے۔'' قونصل جنرل آف پاکستان ڈاکٹر امتیاز قاضی نے اس خوب صورت مقام پر علامہ اقبالؔ کی یاد منانے کی اس خوب صورت روایت پر ہیومن ویلفیئر ایسوی ایشن کے چیئرمین سید اقبال حیدر کو مبارکباد پیش کی۔

اسی سلسلے کی دوسری تقریب فرینکفرٹ کے خوب صورت ہال ''ذال باؤ'' میں ہوئی جس میں سفیرِ پاکستان سیّد حسن جاوید کی دوسری کتاب ''چائنیز سافٹ پاور کوڈ'' اور اُردو ادب کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی کے 46 ویں ادبی شہ پارے ''فیضؔ شناسی'' کی تقریب رونمائی تھی۔ کتابوں کی اس تقریب میں شرکت کے لیے فرینکفرٹ، جرمنی میں چائنا کے قونصل جنرل لی یانگ نے شرکت کی اور اپنے خطاب میں کہا کہ ''چین کا پاکستان کے ساتھ برادرانہ رشتہ قائم ہے اور ہمیشہ رہے گا۔'' انھوں نے مزید کہا کہ ''سفیر محترم عزت مآب سید حسن جاوید نے ''چائنیز سافٹ پاور کوڈ'' کتاب لکھ کر ہمارا دل جیت لیا ہے۔''

قونصل جنرل آف پاکستان ڈاکٹر امتیاز قاضی صاحب نے کہا کہ ''چائنیز سافٹ پاور کوڈ'' اور ''فیضؔ شناسی'' عالمی ادب میں خوب صورت اضافہ ہے اور ان کتابوں کے مصنفین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سفیرِ عالمی اُردو ادب ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض احمد فیضؔ کی ادبی خدمات پر تفصیلی گفتگو کی۔ تقریب کے پہلے حصے کی نظامت انتصار مہدی نے اپنے مخصوص انداز میں کی۔ تقریب رونمائی کے بعد محفلِ مشاعرہ ہوئی شعرا میں عطاءُ الرحمٰن اشرف، راجہ یوسف شفیق مراد، شازیہ نورین، طاہر عدیم، باقر زیدی، شکیل چغتائی، عاطف توقیر، سید اقبال حیدر اور ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنا کلام سنایا اور دادِ تحسین حاصل کی۔ اس تقریب میں معزز مہمانانِ گرامی میں کمرشل قونصلر رضوان صاحب، نیشنل بینک آف پاکستان کے شاہد اقبال خان پاک جرمن پریس کلب کے سلیم بٹ، پی پی پی کے رہنما سجاد نقوی، ہر دل عزیز سماجی شخصیت پرویز اختر کے علاوہ چوہدری محمد رفیق، عاصم علی، خاور علی، راشد غوری، مسرور باجوہ، ڈاکٹر لائق علی، اقبال خان، ثقلین نقوی، رانا بشیر، مشہود عارف، ریاض خان کے علاوہ کثیر تعداد میں پاکستانیوں نے شرکت کی، تقریب کے اختتام پر نقیبِ محفل اور میزبان سیّد اقبال حیدر نے معزز مہمانوں اور تقریب میں شریک شعرائے کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح یہ پُر وقار تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

سید رضا حسین (فرینکفرٹ)
روزنامہ ''اودھ نامہ'' لکھنؤ
27/ستمبر 2016ء

ہائیڈل برگ میں دریائے نیکر کے کنارے محفلِ مشاعرہ

''ہائیڈل برگ'' جرمنی کا وہ خوب صورت شہر ہے جسے علامہ محمد اقبال نے جرمنی میں اپنے قیام کے لیے چنا، اور وہیں قیام کیا، انتہائی دلکش، خوب صورت ہرے بھرے پہاڑوں کے درمیان آباد شہر ہائیڈل برگ میں علامہ صاحب کا گھر آج بھی ان کے اُس دور کے زیرِ استعمال فرنیچر کے ساتھ موجود ہے اور جرمن آثار قدیمہ کی وزارت نے اس کے مرکزی دروازے پر علامہ محمد اقبال کے نام کی تختی آویزاں کر رکھی ہے اور دریائے نیکر کے کنارے ایک سڑک کو ''اقبال اُوفر'' کے نام دے کر جرمن حکومت نے عظیم فلاسفر علامہ اقبال کو شہر ہائیڈل برگ کا ہمیشہ کے لیے حصہ بنا دیا ہے۔ دریا کے اسی کنارے پر پارک میں علامہ اقبال کی ایک نظم ڈیڑھ میٹر اونچی ''پتھر کی سل'' پر جرمن زبان میں ترجمے کے ساتھ موجود ہے، جو ہر گزرنے والے کو شاعرِ مشرق کی یاد دلاتی ہے۔ پچھلے کئی برسوں کی طرح سال 2012 کی نشست میں کینیڈا سے تشریف لائے اُردو دُنیا کی عظیم شخصیت ڈاکٹر تقی عابدی نے دریا کے اس کنارے کو ''مقامِ اقبال'' کا نام دیا اور اب دُنیائے ادب میں دریا کا یہ کنارا ''مقامِ اقبال'' کے نام ہی سے جانا جاتا ہے۔ ہیومن ویلفیئر ایسوی ایشن جرمنی نے پچھلے 9 سال کے تواتر سے امسال بھی دریا کے کنارے ہری بھری گھاس کے مخملیں لان کو سفید چاندنی اور گاؤ تکیوں سے سجا کر 13 ویں فرشی نشست کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر تقی عابدی، مہمان خصوصی جناب ندیم احمد (قونصل جنرل آف پاکستان) علامہ اسمٰعیل بخاری اور مہمانان اعزازی ڈاکٹر مصباح الرحمٰن (ریسرچ اسکالر گوئٹے یونیورسٹی، فرینکفرٹ) ڈاکٹر حسنین بخاری (ایرفورٹ یونیورسٹی) کے علاوہ جرمنی کے معروف شعراء اور کثیر تعداد میں سامعین نے شرکت کی۔ یہ نشست شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کی یاد میں

منائی گئی جس میں ''پیغامِ اقبالؔ اور عصری مسائل'' کے موضوع پر گفتگو ہوئی اور پھر بھر پور شاعری کی محفل بجی۔ اسی سلسلے کی دوسری نشست شام 5 بجے فرینکفرٹ میں مولانا الطاف حسین حالیؔ کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں ہوئی جس میں شاعر، ادیب، دانشور جناب ڈاکٹر تقی عابدی کے تازہ تین ادبی شہ پارں ''کلیاتِ حالیؔ''، ''حالیؔ فہمی''، ''مسدس حالیؔ'' کی رسم اجرا ہوئی اور مولانا الطاف حسین حالیؔ کی اُردو ادب کے لیے لازوال خدمات پر ڈاکٹر تقی عابدی، جناب ندیم احمد، جناب ڈاکٹر مصباح الرحمٰن، جناب ڈاکٹر حسنین بخاری نے تفصیلی گفتگو کی۔ بعد ازاں شعرائے کرام نے اپنے کلام سے محفل کو چار چاند لگا دئے۔ ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن جرمنی کے روحِ رواں سید اقبال حیدر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ جرمنی میں اسی طرح اُردو ادب کے لیے خدمات سرانجام دیتے رہیں گے تاکہ ہماری آئندہ نسلوں کو یہ ادبی سرمایہ منتقل ہو سکے۔''

روزنامہ ''جنگ''

21/اگست 2017ء

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؔ کی یاد میں ادبی نشست

ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن جرمنی نے پچھلے برسوں کے تواتر سے امسال بھی دریا کے کنارے ہرے بھری گھاس کے مخملیں لان کو سفید چاندنی اور گاؤتکیوں سے سجا کر 13ویں فرشی نشست کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر تقی عابدی، مہمان خصوصی جناب علامہ اسمٰعیل بخاری تھے۔ یہ نشست شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؔ کی یاد میں منائی گئی۔ جس میں ''شاعرِ مشرق'' کے حوالے سے ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مخصوص انداز میں افکارِ اقبالؔ پر گفتگو کی اور شاعری کی محفل بجی، شرکاء میں انتصار مہدی، شعیر مہدی، مدبر آسان، پرویز زیدی، مظفر زیدی، ڈاکٹر وسیم، صلاح الدین، ڈاکٹر ارشد رضوی معروف صحافی، منور علی اور دیگر نے شرکت کی۔ ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن جرمنی کے روحِ رواں سید اقبال حیدر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ جرمنی میں اسی طرح اُردو ادب کے لیے خدمات سرانجام دیتے رہیں گے تاکہ ہماری آئندہ نسلوں کو یہ سرمایہ منتقل ہو سکے۔''

سید رضا حسین (فرینکفرٹ)
25/ اگست 2017ء

''دیوانِ سلام و کلام انیسؔ'' کی رسم اجراء

اقبالؔ اور گوئٹےؔ کے افکار پر عالمی کانفرنس

مغرب اور مشرق کے درِ شہوار گوئٹے اور اقبالؔ

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؔ اور مغرب کے معروف مفکر، دانشور، شاعر گوئٹےؔ کے افکار پر معلوماتی وادبی کانفرنس کا اہتمام ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن جرمنی نے فرینکفرٹ میں کیا، جس کی صدارت قونصل جنرل ندیم احمد نے کی، کینیڈا سے تشریف لائے سفیر اُردو ادب ڈاکٹر تقی عابدی اور کمرشل قونصلر خولجہ فرخ نعیم مہمانانِ خصوصی تھے۔ تقریب کے پہلے حصہ میں موضوع تھا ''مغرب اور مشرق کے درِ شہوار گوئٹےؔ اور اقبالؔ'' گوئٹےؔ اور اقبالؔ کے افکار پر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے تقریب کے میزبان اور نقیب محفل سید اقبال حیدر نے کہا: ''گوئٹے مشرق کے حافظؔ اور اقبالؔ مغرب کے گوئٹے کے مداح تھے، ''دیوانِ حافظ'' کا جرمنی ترجمہ ہوا، جو گوئٹے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ''دیوانِ حافظؔ'' کا مطالعہ گوئٹے کو مشرق کی طرف کھینچ کر لے گیا۔ مگر یہ گوئٹے کی ذہنی ہجرت تھی، جسمانی نہیں، جس طرح مغرب کے گوئٹے نے حافظؔ سے سیکھا اسی طرح مشرق کے اقبالؔ نے مغرب کے گوئٹے سے استفادہ کیا۔''

تقی عابدی نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا: ''گوئٹےؔ کی 82 سالہ زندگی اور اقبالؔ 61 سال کی زندگی اس طرح اقبالؔ 24 سال چھوٹے اور اقبالؔ 1907ء میں جرمنی آئے، لیکن برسوں پہلے پیام مشرق میں غالبؔ کو مخاطب کر کے گوئٹے پر بات کرتے ہیں، کہ وائمر کی خاک نے، گوئٹے کے کلام نے ہم جیسوں کی آنکھوں میں روشنی پیدا کی۔ اس سے ظاہر

ہوا کہ پیر مشرق نے بہت کچھ شاعر مغرب سے حاصل کیا، اقبالؔ نے اپنی مختلف کتابوں میں پانچ چھ جگہ گوئٹے کا ذکر کیا ہے، گوئٹے نے نپولین وغیرہ کے حملوں اور قتل و غارت سے پریشان ہوکر گوئٹے لکھتا ہے کہ ''چلو مشرق کے گلشن کی سیر کریں، جہاں پر انسانیت ہے، جہاں پر تہذیب ہے، جہاں پر آسودگی ہے اور جہاں پر انسانی قدریں ہیں، مشرق کے لیے ایسی گفتگو کسی مغربی ادیب نے نہیں کی۔'' اقبالؔ اپنے اور گوئٹے کے لیے کہتے ہیں: ''ہم دونوں دانائے ضمیر کائنات ہیں، کہکشاؤں کے راز کے راز داں ہیں، ہم دونوں حیات اور ممات کی عظیم شخصیتیں ہیں، ہم دونوں کے خیالات خنجر کی طرح لوگوں کے دلوں میں اُتر جاتے ہیں، گوئٹے برہنہ طور پر شعر کہتا ہے اس کا خنجر عریاں ہے میں لفظ بستوں میں اپنا پیغام آپ تک پہنچاتا ہوں۔ ہم دونوں اس دُنیا کے راز کے در شہوار ہیں۔''

معروف صحافی عرفان خان نے اپنی گفتگو میں کہا: ''جرمنی میں اقبالؔ اور فکر اقبالؔ کو زندہ رکھنے کا بیڑہ سید اقبال حیدر نے اُٹھا رکھا ہے آپ ہر سال اس سلسلے میں ادبی تقریبات منعقد کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ اور گوئٹے کی فکری ہم آہنگی میں گوئٹے کی اسلام پسندی اور اسلام میں دلچسپی اقبالؔ کے لیے گوئٹے کی طرف متوجہ ہونے کی اہم ترین وجہ تھی۔ گوئٹے نے اپنی شاعری میں خدا کی وحدانیت اور پیغمبرؐ سے انسیت کا اظہار بھی جا بجا کیا ہے۔''

قونصل جنرل ندیم احمد نے صدارتی خطبہ میں کانفرنس کے میزبان سید اقبال حیدر کا شکریہ ادا کیا کہ وہ دیارِ غیر میں ادبی شمع جلائے اُردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ نے مزید کہا: ''گوئٹے اور اقبالؔ دونوں تاریخ میں فلسفے ادب کے حوالے سے بڑے نام ہیں دونوں کو کھوج اور تلاش ایک ہی چیز کی تھی اور وہ تھی انسانی خواہشات اور انسانی ضمیر، ان اہم موضوعات دونوں نے نثر اور نظم پر کھل کر اظہار خیال کیا، مگر منزل دونوں کی ایک ہی تھی۔ مشرق کا روحانیت اور محسوسات کی طرف زیادہ رجحان اور مغرب جسمانی خواہشات اور روز مرہ کی عملی زندگی کی طرف توجہ دیتا ہے۔'' کمرشل کونسلر خواجہ فرخ نعیم نے کہا کہ ''انھیں جرمنی میں کسی تقریب میں پہلی مرتبہ شرکت کا اتفاق ہوا ہے اور اس بات پر بے پناہ مسرت ہوئی کہ یہاں اُردو ادب کے لیے اس خوب صورت انداز میں کام ہو رہا ہے اور اس کے لیے اقبال حیدر صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ معروف بزنس مین اور سماجی شخصیت پرویز

اختر نے کہا: ''ہیومین ویلفیئر ایسوسی ایشن نے ہمیشہ کی طرح ایک خوب صورت ادبی محفل سجائی، مجھے اُمید ہے اس کے روحِ رواں دیارِ غیر میں علم و ادب کی شمع اسی طرح جلائے رکھیں گے۔ تقریب کا دوسرا حصہ محفل مشاعرہ تھا اس سے پہلے سفیر اُردو ادب ڈاکٹر تقی عابدی کی 568 صفحات پر مشتمل کتاب ''دیوانِ سلام وکلامِ انیس'' کی رسم اجراء چیئرمین ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن سید اقبال حیدر اور قونصل جنرل آف پاکستان ندیم احمد کے ہاتھوں ہوئی۔ محفل مشاعرہ میں جرمنی کے معروف شعراء میں عطاء الرحمٰن اشرف، اسحاق ساجد، ارشاد ہاشمی، مدبر آسان، سید اقبال حیدر، طاہر مجید اور ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنا کلام سنایا، معززین شہر میں سید وجیہ الحسن جعفری، ڈاکٹر لائق علی، مقصود حیدر شاہ، ڈاکٹر ضیاء، ڈاکٹر مصباح الرحمٰن، پرویز زیدی، فخر خان، مظفر زیدی، منور علی شاہد، نذر حسین، حماد رضوی طاہر ملک، دانیال رضا، محمود علی خان، فیصل خان کے علاوہ کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی، آفتاب کرنسی کی طرف سے سید ثقلین نقوی نے سنیکس اور ڈرنکس سے مہمانوں کی تواضع کی۔ آخر میں تقریب کے میزبان سید اقبال حیدر نے تمام مہمانوں اور شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

اقبال حیدر (ہائیڈل برگ، جرمنی)

22/جو 2022ء

جرمنی میں دریائے نیکر کے ''مقام اقبالؔ'' پر شاعر مشرق کی یاد میں تقریب، شاندار خراج عقیدت

ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن جرمنی نے دوروزہ ادبی تقریبات کا آغاز سرسبز وشاداب پہاڑوں کے حصار میں بہتے ہوئے دریائے نیکر کے کنارے دلفریب ''مقام اقبالؔ'' سے کیا۔ حکیم الامت شاعر مشرق ڈاکٹر اقبالؒ کو منفرد انداز میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے پروفیسر ڈاکٹر اسلم سیّد اور عالمی اُردو ادب کے سفیر ڈاکٹر تقی عابدی کینیڈا سے شریک ہوئے، دریائے نیکر کے کنارے 37 درجہ حرارت کی گرمی بھی پروگرام کی خوب صورتی وحسن کو کم نہ کرسکی، ''علامہ اقبالؔ اور گوئٹے'' کے موضوع پر مقالے پڑھے گئے۔

اس موقع پر علامہ اقبالؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا: ''جرمنی ہائیڈل برگ میں شاعرِ مشرق نے اپنے قیام کو زندگی کے خوب صورت لمحات سے تعبیر کیا، علامہ اقبالؒ نے اُردو ادب کو ''جاوید نامہ'' اسی دریائے نیکر کے کنارے بیٹھ کر دیا، ہائیڈل برگ ٹاؤن کی کلچرل ونگ کی اعلیٰ عہدیدار کلاؤڈیا کراماچک اور کونسلر وسیم بٹ نے اس خوب صورت مقام پر علامہ اقبالؔ کی یاد منانے کی روایت پر ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن کے چیئرمین سید اقبال حیدر کو مبارکباد پیش کی اور یقین دلایا کہ ہائیڈل برگ سٹی انتظامیہ ان کی ادبی سرگرمیوں پر ہمیشہ حوصلہ افزائی کرے گی۔ روحیل بیگ نے گوئٹے اور اقبالؔ کی شخصیات کا ادبی تعارف پیش کیا۔

پاکستان سے آئے شاعر حسنین بخاری نے علامہ اقبالؔ کی نسبت سے تقریب کے انعقاد کو لائق تحسین قرار دیا۔ پروفیسر ڈاکٹر اسلم سید نے ڈاکٹر اقبالؒ کی شخصیت کے مختلف

پہلوؤں پر اظہار خیال کیا، خاص طور پر ان کے ہائیڈل برگ میں گذرے ہوئے ایام کی خوشگوار یادوں اور ان کے اثرات پر روشنی ڈالی۔ تقریب میں تین کتابوں کی تقریب رونمائی کی گئی۔ صحافی روحیل بیگ کی 223 صفحات کی کتاب ''کالم کہانی'' ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے ساؤتھ ایسٹ شعبے کے پروفیسر ڈاکٹر ہارڈر، طاہرہ رباب کی کتاب ''عرفان کتاب مکنون'' پروفیسر اسلم سید اور مولانا مرزا محمد اطہر مرحوم کی 252 صفحات پر مشتمل کتاب ''حیات اطہر بہ زبان اطہر'' کی رونمائی بدست ڈاکٹر تقی عابدی ہوئی۔ پروگرام کے روح رواں سید اقبال حیدر نے تینوں کتابوں کو عالمی ادب میں خوب صورت اضافہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کتابوں کے مصنفین مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تقریب رونمائی کے بعد محفل مشاعرہ ہوئی، شعرا میں نقیب محفل تقریب کے میزبان سید اقبال نے اپنے اشعار سے کیا، ان کے بعد حیدر نقوی باقر زیدی، عدنان محسن (پاکستان)، ڈاکٹر فیصل کمال حیدری (پاکستان) طاہرہ رباب، حسنین بخاری (پاکستان)، ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) نے اپنا کلام سنایا اور سامعین سے دادِ تحسین حاصل کی۔ تقریب میں کثیر تعداد میں محبانِ اُردو اور محبان علامہ اقبالؒ نے شرکت کی اور دریا کے کنارے گھنے درختوں کے سائے تلے ایشین سنیکس سے وطن کی یاد تازہ کی۔ تقریب کے اختتام پر نقیب محفل اور میزبان سیّد اقبال حیدر نے معزز مہمانوں اور تقریب میں شریک شعرائے کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

واضح رہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے حوالے سے دُنیا بھر میں تقریبات ہوتی رہتی ہیں مگر اس انداز سے خراج عقیدت پیش کرنے کا خیال جرمنی میں مقیم شاعر، ادیب اور صحافی سیّد اقبال حیدر کو 13 برس پہلے آیا اور انھوں نے تقریب کے لیے دریائے نیکر کے کنارے خوب صورت پارک کے اسی گوشے کو چُنا جہاں علامہ تشریف رکھتے تھے، شاعرِ مشرق کے جرمنی ہی نہیں یورپ بھر کے چاہنے والے ہائیڈل برگ میں ہر سال ہونے والی اس منفرد تقریب کا انتظار شدت سے کرتے ہیں۔

خصوصی رپورٹ

2008ء

تہران میں ڈاکٹر تقی عابدی کی "کلیاتِ غالبؔ فارسی" کی تقاریب

"سازمان فرہنگ وہنر کے جلسہ میں سفیر بھارت اور پاکستان نے کتاب کی رونمائی کی۔"

تہران کی معروف پبلشنگ کے کمپنی کے چیئرمین ڈاکٹر امیری نے ڈاکٹر سید تقی عابدی مقیم کینیڈا کی تحقیق، تدوین اور مرتبہ شاہکار کتاب "کلیاتِ غالبؔ فارسی" کو ایران میں پہلی بار بڑی تعداد میں شائع کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی مرتبہ "کلیاتِ غالبؔ فارسی" کو 2008ء میں غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی نے بڑے خاص طریقے پر شائع کیا ہے۔ اس کلیات میں تقی عابدی کی فارسی شاعری پر بسیط اُردو مقدمہ بھی شامل ہے۔ امیری پبلشر نے کلیات میں موجود مقدمہ اور دوسری اُردو تحریروں کو فارسی میں ترجمہ کر کے کلیاتِ غالبؔ ایک ہی جلد کے (900) صفحات پر بڑے دیدہ زیب طریقہ پر شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی رونمائی وزارت فرہنگ وہنر کی سرپرستی میں پاکستان اور بھارت کے سفیروں نے انجام دی۔ ایران میں موجودہ ماہر غالبیات استاد محمد حسن حائری جن کی دو کتابیں "دیوانِ غزلیات غالبؔ" اور "سومناتِ خیال" (قصائد غالبؔ) منظر عام پر آچکی ہیں، ڈاکٹر عابدی کی تدوینی کلیات فارسی اور اس کے بسیط مقدمہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "اس عظیم اور عمدہ کام سے غالبؔ شناسی کی راہیں مکمل طور پر کھل چکی ہیں۔" مقدمہ میں ڈاکٹر عابدی نے غالب کے کلام اور فن کے ہر زاویہ پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو غالبؔ کی فارسی شاعری کی تفہیم کا سنگ میل قرار دیا۔ ڈاکٹر حائری نے اپنی عالمانہ گفتگو میں غالبؔ دہلوی کی شخصیت اور شاعری پر بھی عمدہ مقالہ پڑھا جسے بہت سراہا گیا۔

خصوصی رپورٹ

17/اگست 2008ء

''تہران میں ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف''

سازمان فرہنگ اور ارتباطات کے عالمانہ جلسہ کی مختصر روداد

تہران 17/اگست شام کے چھ بجے سازمان فرہنگ اور ارتباطات کی جانب سے، سازمان کے کانفرنس ہال میں ایک خوب صورت علمی محفل ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں برگزار کی گئی، جس میں سب سے پہلے سازمان فرہنگ اور ارتباطات کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر سلیمانی نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے تفصیل سے ڈاکٹر عابدی کی فارسی ادبی خدمات خصوصی طور پر ''کلیاتِ غالب فارسی'' اور ان کے توسط سے فارسی شعر و ادب کا برصغیر میں تعارف کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر سلیمانی نے ہند و پاک اور ایران کا علمی، تہذیبی اور ثقافتی رشتہ جو فارسی ادبیات کے ذریعہ صدیوں سے جڑا ہے محکم اور غیر فانی بتایا۔

ڈاکٹر حسن حائری ماہر غالبیات نے غالب کی شخصیت اور فارسی شاعری پر بھرپور گفتگو کی موصوف نے ڈاکٹر عابدی کی مرتبہ ''کلیاتِ غالب فارسی'' اور اس کے مقدمہ پر بھی سیر حاصل بات چیت کر کے کلیات کو غالب شناسی کا سنگ میل قرار دیا۔ اس علمی محفل میں یونیورسٹی کے اساتذہ، شعراء ادیب اور بڑی علمی شخصیات کے علاوہ ڈاکٹر حسین مظفری، ڈاکٹر نجفی، ڈاکٹر زرارعی، ڈاکٹر حسن مظفری وغیرہ شامل تھے۔

اس تقریب کا کلیدی خطبہ ڈاکٹر تقی عابدی نے فارسی میں دیا، اور انھوں نے کوئی پون گھنٹے تک غالب کی فارسی شاعری کے مختصر گوشوں پر دلچسپ اور خوب صورت گفتگو کی جو پسند کی گئی۔ اس تقریب کے دوران ''کلیاتِ غالب فارسی'' کی رونمائی ہند و پاک کے سفیروں نے انجام دی۔ یہ خوب صورت محفل افطار کی ضیافت پر ختم ہوئی۔

یونیورسٹی تہران (ایران)
25/اگست 2008ء

ممتاز شاعر و ادیب ڈاکٹر سید تقی عابدی نے دانش گاہ تہران کے دانش کدہ زبانہا ادبیات خارجی شعبہ اُردو زبان و ادب کا دورہ کیا

25/اگست کو ڈاکٹر سید تقی عابدی نے شعبہ اُردو، دانش گاہ تہران کا دورہ کیا۔ ان کی آمد پر صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر علی بیات نے اپنی اور دیگر اساتذہ کی طرف سے دلی خوشی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر بیات نے شعبے کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ تہران میں اُردو زبان و ادب کی ترقی و توسیع کے لیے شعبے کے اساتذہ ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہم جہانِ اُردو کہ سربرآوردہ دانشوروں اور اسکالروں کی فکری و علمی تعاون اور مشوروں کا استقبال کرتے ہیں۔ اس کے بعد، ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کے اور شعبے کے دیگر اساتذہ کے درمیان مختلف موضوعات پر پُر مغز اور علمی مباحثے ہوئے۔ اس وقت شعبے کی استاد محترمہ ڈاکٹر وفا یزدان منش اور ڈاکٹر علی کاووسی نژاد نے مولانا حالیؔ، مولانا شبلی اور سر سید احمد خان کی علمی خدمات کے بارے میں ان سے استفسار کیا، جس پر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کے بعد دیگر اساتذہ کے ساتھ میں لائبریری کا دورہ کرتے ہوئے، ڈاکٹر صاحب نے اپنی دس کتابیں تحفتہً چیف لائبریرین کی خدمت میں پیش کیں۔ نیز انھوں نے یہ کہا کہ کینیڈا سے اپنی ذاتی لائبریری سے چند علمی و ادبی کتابیں ارسال فرمائیں گے۔ خاص طور پر نقوش کے وہ شمارے جو شعبے کی لائبریری میں موجود نہیں ہیں۔

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی اُردو ادب کے ممتاز محقق اور معروف ادیب ہیں جب کہ ان کا پیشہ طبابت ہے۔ وہ ہر وقت اُردو زبان و ادب کی تشہیر، توسیع اور ترقی کے لیے مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ اب تک ان کی درجنوں کتابیں منظر عام پر آ چکی۔ ان کی کتابوں میں سے ''فیض شناسی''، ''فیض فہمی''، ''دیوانِ رباعیاتِ انیس''، ''تجزیہ یادگارِ مرثیہ''، ''کلیات غالب فارسی'' [2 جلدیں]، ''اقبال کے عرفانی زاویے'' اور ''مرزا دبیر'' پر کئی کتابیں قابل ذکر ہیں۔

شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف تہران کا 1991ء میں افتتاح ہوا ہے اور اس وقت سے اب تک ہر سال کم از کم 20 ایرانی نوجوان بی اے آنرز اُردو زبان و ادب کے لیے داخلہ لیتے ہیں، نیز اس شعبے میں 2008ء سے سالانہ 6 طلباء و طالبات ایم اے اُردو زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

تہران میں سفیرِ پاکستان ایم بی عباسی نے ''کلیاتِ غالب فارسی'' کی رونمائی کی

تہران میں مقیم پاکستانی سفیر ہز ایکسیلنسی جناب ایم بی عباسی اور مسز عباسی نے ایمبیسڈر ہاؤس میں ڈاکٹر تقی عابدی کے اعزاز میں ایک عالیشان تقریب منعقد کی، جس میں ایک بڑی تعداد میں پاکستانی اور ایرانی ادبی اور سیاسی عہدیدار شامل تھے۔ سفیر محترم جناب عباسی نے افطار کی ضیافت کے بعد اس پر شکوہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی ادبی کاوشوں کی تعریف کی اور ''کلیات غالب فارسی'' کو ان کی جانب سے عظیم تحفہ قرار دیا۔

سفیر محترم جناب عباسی نے ''کلیاتِ غالب فارسی'' غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی مطبوعہ دو جلدوں کی رونمائی کی جب کہ مسز عباسی نے ''کلیاتِ غالب فارسی'' مطبوعہ تہران کی نقاب کشائی کی۔ اس تقریب میں ایران کے سفیر مقیم اسلام آباد ماشاء اللہ شاکری بھی شریک تھے۔ ڈاکٹر شاکری نے غالب کی فارسی غزل پڑھ کر محفل میں خاص سماں باندھ دیا۔ ڈاکٹر شاکری اور ادارہ فرہنگ وہنر کے ڈائریکٹر جنرل جناب حسن مظفری نے بڑی تفصیل سے برصغیر میں فارسی شعر وادب کا تذکرہ کیا جسے بہت پسند کیا گیا۔ اس تقریب کے بعد ایرانی ٹی وی سحر کے اراکین نے ڈاکٹر تقی عابدی، جناب سفیر پاکستان محترم عباسی، سفیر محترم ایران، ڈاکٹر شاکری اور ڈائریکٹر جناب مظفری سے ڈاکٹر تقی عابدی کی خدمات اور کلیاتِ غالب کے بارے میں تفصیلی پروگرام ریکارڈ کیے۔

تہران میں سفیرِ بھارت ڈاکٹر سنجے سنگھ نے ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کی رونمائی کی

تہران میں مقیم بھارت کے سفیر ہزایکسیلنسی ڈاکٹر سنجے سنگھ نے ڈاکٹر تقی عابدی کی شاہکار کتاب ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کی ایک عظیم الشان تقریب میں رونمائی کی۔ سفیرِ بھارت نے ڈاکٹر تقی عابدی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ''ڈاکٹر عابدی کا یہ کارنامہ غالب شناسی کا اہم اور یادگار کام ہے۔'' انھوں نے یہ بھی کہا کہ ''فارسی شاعری سے ایشیائی ممالک کے درمیان جن میں فارسی پڑھی اور سمجھی جاتی ہے ادبی، ثقافتی اور تہذیبی روابط کو مزید تقویت حاصل ہوسکتی ہے۔

افتخار راغبؔ
(جنرل سکریٹری: بزمِ اُردو قطر)
12 ر دسمبر 2014ء

قطر کی قدیم ترین اُردو ادبی تنظیم ''بزمِ اُردو قطر'' کے زیرِ اہتمام

بارہواں عالمی سیمینار بعنوان ''فیضؔ سیمینار''

اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے قطر میں 1959ء سے سرگرم عمل قطر کی قدیم ترین اُردو ادبی تنظیم بزمِ اُردو قطر نے 12 ر دسمبر 2014ء بروز جمعہ سات بجے شب علامہ ابن حجر لائبریری فریق بن عمران کے وسیع ہال میں بارہواں عالمی سیمینار برائے فیض شناسی ''فیضؔ سیمینار'' کا انعقاد بہت اہتمام سے کیا۔ موجودہ دور میں کینیڈا میں مقیم عالمی شہرت کے حامل ممتاز دانشور، محقق، ادیب اور شاعر جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام فیض احمد فیضؔ کی شاعری پر ایک معتبر و مستند حوالہ پوری اُردو دُنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ''فیضؔ شناسی'' اور ''فیضؔ فہمی'' کے نام ضخیم کتابیں لکھ کر نہ صرف فیض احمد فیضؔ کی شاعری کی تفہیم و ترسیل کی ہے بلکہ اس حوالے سے پوری دُنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی کی صدارت میں منعقد اس عالمی سیمینار میں ہندوستان سے تشریف لائے خوش فکر شاعر و ادیب جناب ملک العزیز کا تب کرسی مہمان خصوصی پر جلوہ افروز ہوئے۔ جب کہ بزمِ اُردو قطر کے سرپرست اور بزم علیگ سے وابستہ معروف شخصیت جناب ظفر صدیقی نے مہمانِ اعزازی کی نشست کو رونق بخشی۔ نظامت کے فرائض انڈیا اُردو سوسائٹی کے نائب صدر اور قطر کے معروف صاحب طرز شاعر جناب عتیق انظرؔ نے انتہائی عمدگی کے ساتھ انجام دیئے۔ تلاوتِ کلام اللہ کی سعادت خوش لحن طالب علم عزیزم عبداللہ نے حاصل کی۔

بزمِ اُردو قطر کے صدر اور قطر کے معروف شاعر و ادیب جناب محمد رفیق شادؔ آکولوی

نے بزمِ اُردو قطر کا مختصر تعارف اور خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تشریف آوری بزمِ اُردو قطر کے لیے خوش بختی کی بات ہے۔ قطر کے باذوق اور تعلیم یافتہ منتخب الانتخاب سامعین کے لیے بھی ڈاکٹر تقی عابدی کی فیض احمد فیض پر گفتگو سے استفادہ کرنے اور اُن کی شاعری سے محظوظ ہونے کا یہ ایک نادر موقع ہے جسے لوگ برسوں یاد رکھیں گے۔"

فیض احمد فیض کا نام شعر و ادب کی دُنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ بیسویں صدی کی اُردو شاعری میں علامہ محمد اقبال کے بعد جو نام اُبھر کر سامنے آئے اُن میں نمایاں ترین نام فیض احمد فیض کا ہے۔ اُردو ادب کے بہت سے ناقدین کے نزدیک فیض احمد فیض، غالب اور اقبال کے بعد اُردو کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ میر، غالب اور اقبال کے بعد جو داد و تحسین اور عوامی مقبولیت ان کے حصے میں آئی وہ شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوئی۔ سن تیس کے عشرے میں شروع ہونے والی اُن کی شاعری سن اسّی کی دہائی تک جاری رہی اور یوں اُن کے کلام نے نصف صدی کا عرصہ اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ فیض نے شاعری شروع کی تو اس وقت بہت سے قد آور شعراء موجود تھے جن کے درمیان خود کو منوانا آسان کام نہ تھا۔ جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا۔ لیکن فیض کے منفرد انداز نے انھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ان کی شعری تصانیف میں "نقشِ فریادی"، "دستِ صبا"، "زنداں نامہ"، "دستِ تہہِ سنگ"، "سرِ وادیِ سینا"، "شامِ شہرِ یاراں"، "میرے دل میرے مسافر" اور "نسخہ ہائے وفا" ہیں۔ فیض کی شاعری میں جمال، محبت، ہجر، وفا کے ساتھ ساتھ معاشرتی نشیب و فراز کے گہرے اثرات کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ فیض احمد فیض تقسیم ہند سے قبل 13 رفروری کو 1911ء میں سیال کوٹ کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم سیال کوٹ میں حاصل کی۔ آپ نے اسکول ہی میں فارسی اور عربی زبان بھی سیکھی۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور انگلش میں ایم اے کیا۔ بعد میں آپ نے اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں بھی ایم اے کیا۔

فیض احمد فیض پر منعقد اِس عالمی سیمینار میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے انتہائی معلوماتی

اور اہم مقالہ بعنوان ''فیض کی شاعری کی ادبی معنویت'' پیش کیا۔ جس میں آپ نے فیض کے کلام کی ادبی معنویت اور اکیسویں صدی میں اس کی اہمیت کو مدلّل انداز میں پیش کیا جسے سوا سو سے زیادہ معتبر اور خوش ذوق سامعتوں نے یکسوئی کے ساتھ سماعت کیا اور اہم نکتوں پر تالیوں کی گونج سے اپنی بھرپور پسندیدگی کا ثبوت دیتے رہے۔ ''فیض شناسی'' اور ''فیض فہمی'' کے عنوان سے ڈاکٹر تقی عابدی کی ضخیم کتابوں نے فیض احمد فیض کی شاعری کی تفہیم کے لیے ساری دُنیا میں مقبولیت حاصل کی ہے جو موصوف کی چالیس منفرد و معیاری تصنیفات میں شامل ہیں۔

آپ نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے جب کہا کہ ''دبیر کے ایک لاکھ بیس ہزار اشعار، انیس کے بیاسی ہزار اشعار، میر کے اڑتیس ہزار اشعار، اقبال کے اٹھائیں ہزار اشعار، غالب کے چودہ ہزار اشعار اور نظیر کے آٹھ ہزار مطبوعہ اشعار ہیں جب کہ فیض کے پاس صرف اٹھارہ سو اشعار ہیں۔ پچپن سالہ فیض کے شعری دور میں صرف ستر غزلیں ہیں جن میں کل چار سو پینسٹھ اشعار ہیں۔ اس کے باوجود فیض اپنی الگ پہچان بنانے میں انتہائی کامیاب نظر آتے ہیں۔ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ فیض نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ

ہم نے جو طرزِ فغاں کی تھی قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض کی مشہور نظم

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

پر بھرپور گفتگو کی اور نظم کی مختلف خوبیوں کو احسن طریقے سے اُجاگر کیا۔ آپ نے فیض کی زندگی کے مختلف واقعات کا ذکر کیا اور ان واقعات سے متاثر ہو کر کہی گئی نظموں پر بھی عالمانہ گفتگو فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ ''فیض کے پاس احساس کی شدت، جذبوں کا خلوص اور عمل کی خواہش بہت نمایاں ہے۔ فیض نے قطرے میں دجلہ دیکھا بھی ہے

اور دکھایا بھی ہے۔ فیضؔ نے انسانیت کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔" آپ نے کہا کہ "شاعر کی اہمیت و عظمت وقت بتاتا ہے۔ بہت سارے شاعروں کے مجموعۂ کلام کا جنازہ شاعر کے جنازے کے ساتھ ہی اُٹھ جاتا ہے لیکن فیضؔ اکیسویں صدی میں بھی اُسی آن بان کے ساتھ زندہ رہے گا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے فیضؔ کے پہلے شعر اور موت سے چند گھنٹے قبل کہے آخری شعر کے ذکر کے ساتھ متعدد اشعار اور نظموں پر گفتگو کی جس میں مندرجہ ذیل مشہورِ زمانہ اشعار بھی شامل تھے۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

•••

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

•••

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

•••

وہ جب بھی کرتے ہیں اِس نطق ولب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

•••

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض احمد فیضؔ پر سیمینار منعقد کرنے پر بزمِ اُردو قطر کے ذمہ داران و اراکین کو مبارک باد پیش کی اور کہا کہ "ایسی محفلیں سجائی جاتی رہنی چاہئیں۔ جس میں باذوق سامعین کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان مہیا ہوتا رہے۔ آپ نے بزمِ اُردو قطر کا شکریہ بھی ادا کیا اور فیضؔ کی مندرجہ ذیل نظم کو پیش کر کے اپنی گفتگو کا اختتام کیا۔

کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے

•••

جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے

•••

ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا کچھ کام کیا

•••

کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام اُلجھتا رہا

•••

پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

بزمِ اُردو قطر نے اس سے پہلے گیارہ عالمی سیمینار منعقد کیے ہیں جن میر سیمینار 1991ء، اقبال سیمینار 1992ء، غالب سیمینار 1993ء، افسانہ سیمینار 1994ء، امیر خسرو سیمینار 1995ء، میر انیس سیمینار 1996ء، اکبر الہ آبادی سیمینار 2003ء، حالی سیمینار 2006ء، ذوق سیمینار 2007ء، نظیر اکبر آبادی سیمینار 2009ء اور ظفر سیمینار 2011ء شامل ہیں۔ بزمِ اُردو قطر کے سیمیناروں میں ہندوستان سے گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر خلیق انجم، جوگندر پال، عبدالستار دلوی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر عقیل رضوی، ساغر خیامی، ڈاکٹر تابش مہدی، خورشید اکبر، ڈاکٹر کلیم عاجز، ڈاکٹر محبوب راہی، ابراہیم اشک اور ڈاکٹر کوثر مظہری اور پاکستان سے ڈاکٹر سلیم اختر، اصغر سودائی، شہزاد احمد، انتظار حسین، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر جیلانی کامران، ڈاکٹر اسد اریب، ڈاکٹر ہلال نقوی، سرفراز شاہد، نوید حیدر ہاشمی، محترمہ صوفیہ بیدار، لیاقت علی عاصم، انجم سلیمی،

محترمہ صدفؔ اور سعود عثمانی صاحبان کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

بزمِ اُردو قطر نے بارہویں عالمی سیمینار یعنی فیضؔ سیمینار میں کینیڈا سے ڈاکٹر سید تقی عابدی کو دعوت دے کر اور ان کی ''فیضؔ فہمی'' اور ''فیضؔ شناسی'' سے قطر کے محبانِ اُردو ادب کو مستفیض کر کے ایک نئی مثال قائم کی ہے۔ اس موقع پر بزمِ اُردو قطر کی جانب سے ڈاکٹر تقی عابدی اور جناب ملک العزیز کاتب کو اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف میں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس سیمینار کے انعقاد میں بزمِ اُردو قطر کے چیئرمین جناب ڈاکٹر فیصل حنیف خیالؔ، صدر جناب محمد رفیق شادا کولوی، جنرل سکریٹری جناب افتخار راغبؔ کے ساتھ دیگر ذمہ داران وارا کین کے علاوہ سرپرست و پروگرام کوارڈینیٹر جناب نصیر احمد کاتب نے بہت اہم رول ادا کیا۔ سیمینار سے قبل حیدرآبادی اسپائسز ریسٹورینٹ کی جانب سے شاندار عشائیہ کا انتظام تھا جسے حاضرین نے خوب ذوق وشوق کے ساتھ نوش فرمایا۔ بزمِ اُردو قطر نے حیدرآبادی اسپائسز ریسٹورینٹ کے ذمہ دار جناب محمد یاور حسین صاحب کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ قطر میں اُردو داں حلقے کی علمی وادبی تشنگی کو بجھانے کے لیے اور اُردو ادب کے قدآور ادیب وشاعر علامہ شبلی نعمانی کی ادبی خدمات کے مختلف گوشوں کو منوّر کرنے کے لیے بزمِ اُردو قطر نے ایک مثالی و پروقار عالمی سیمینار 2015ء میں منعقد کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ جو انشاء اللہ قطر کی اُردو ادبی تاریخ میں ایک یادگار سیمینار ہوگا۔

صدرِ مجلس کے علاوہ مہمان خصوصی جناب ملک العزیز اور مہمانِ اعزازی جناب ظفرؔ صدیقی نے خوشی کا اظہار کیا اور بزمِ اُردو قطر کو مبارکباد پیش کی اور ذمہ داران کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار کے بعد بزمِ اُردو قطر کا شاندار سالانہ مشاعرہ 2014ء بھی منعقد ہوا جس میں صدرِ مشاعرہ ڈاکٹر تقی عابدی اور مہمانِ خصوصی جناب ملک العزیز کاتب کے علاوہ قطر کے منتخب ومعیاری شعرائے کرام نے شرکت کی جن میں شاعرِ خلیج جلیلؔ نظامی، عتیق انظر، محمد رفیق شادا کولوی، فرتاشؔ سید، افتخار راغبؔ، روئیسؔ ممتاز اور وزیر احمد وزیر کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ مشاعرے کی تفصیلی رپورٹ جلدی ہی پیش کی جائے گی۔

سوا سو سے زیادہ معزز سامعین نے سیمینار میں شرکت کی اور استفادہ کیا۔ جن میں بزمِ اُردو قطر کے سرپرست سید عبدالحیٔ ومولانا عبدالغفار ونصیر احمد کاتب، چیئرمین

ڈاکٹر فیصل حنیف خیالؔ، صدر محمد رفیق شادؔ اکولوی، نائب صدر فیروز خان، جنرل سکریٹری افتخار راغب، خازن محمد غفران صدیقی، میڈیا سکریٹری روئیس ممتاز، رابطہ سکریٹری وزیر احمد وزیرؔ، اراکین میں افسر عاصمی و عبدالمجید، سید آصف حسین اور خالد حسین، انڈیا اُردو سوسائٹی کے صدر جلیلؔ نظامی، حلقہ ادبِ اسلامی قطر کے صدر خلیل احمد، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صدیقی ندوی، انڈین ایسوسی ایشن فار بہار اینڈ جھارکھنڈ کے صدر فاروق احمد و جنرل سکریٹری علیم اختر و جاوید عالم و شمس الحق آزاد و شفیق احمد و حامد رضا و سراج الحق، عدنان خان، پی ای سی کے استاد و نامور شاعر فرتاش سید کے علاوہ ڈاکٹر توصیف ہاشمی، نجم الحسن خان، رحمت اللہ ندوی، اشفاق احمد، اکرام الدین، ابو سعید ندوی، قیام الدین، شمس الرحمٰن صدیقی، سیف اللہ محمدی، فخر الدین رازی، محمد غوث، احتشام الدین ندوی، فیاض بخاری، عبدالحکیم، وحید احمد، محمد اشفاق، سراج، حامد علی، شمس الدین رحیمی، سرفراز نواز، ذوالفقار ابراہیم، عبدالباسط، ندیم حسین، محمد حسین خان، بہاء الدین ندوی، عمران فراحی، قاصد خان، عبدالسلام خان، ایم ایم پاشا، مختار احمد، انیس الرحمٰن، عتیق الرحمٰن، فیض الرحمٰن اقدس، افروز عالم، محمد زرار خان، محمد ضمیر، اشفاق الرحمٰن، عبداللہ، قاضی عبدالرشید، ولی محمد، ابوبکر زبیر، سرفراز الحق، محمد راشد، باسط بیگ، محمد ارشد، عبدالشکور، شیخ یاسین، جمیل احمد اور جمال الدین صاحبان کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

مرثیہ عدم تشدد کا داعی ہے

اُردو ادب میں شاعری کا اصل محور مرثیہ ہے

جامعہ کراچی شعبہ اُردو کے تحت عالمی سیمینار

مرثیہ موجودہ دور کے درد کا درماں بن سکتا ہے:

ڈاکٹر تقی عابدی، سحر انصاری اور دیگر کا خطاب

کسی بھی واقعہ کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے انسانیت کے کتنے رخ روشن کیے۔ انسانی تاریخ مہیب حادثات کو بھولنے میں چنداں سستی نہیں دکھاتی۔ البتہ انسانیت کے لیے جاں دینے والے کا غم دائمی غم بن جاتا ہے۔ واقعہ کربلا کے پس منظر میں ''مرثیہ'' ایک فصیح و بلیغ استعارہ بن گیا ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ مرثیہ میں ایسے ہی زندہ لوگ ملتے ہیں جو بظاہر سانس لیتے لوگوں کے مردہ ذہنوں کو جلا بخشتے ہیں اور اس کی آبیاری کرتے ہیں۔ چناں چہ مرثیہ کو کسی خاص فرقہ سے منسوب کر کے اس کی جاگیر بنا دینا اس اہم صنف کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اُردو ادب میں اخلاقی شاعری کا اصل محور مرثیہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار ایک روزہ بین الاقوامی سیمینار بعنوان ''اُردو مرثیہ- ادب عالیہ'' میں ممتاز مقررین ڈاکٹر تقی عابدی، سحر انصاری، ہلال نقوی، پروفیسر ظفر اقبال اور ڈاکٹر شمس الدین نے کیا۔ جس کا اہتمام جامعہ کراچی کے شعبہ اُردو کی جانب سے کیا گیا تھا۔ تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) نے اپنے کلیدی خطاب میں مرزا انیس و دبیر نگاری پر گہری روشنی ڈالتے ہوئے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''قابل توجہ امر تنقید نگاروں کا غیر محتاط رویہ ہے جس کی وجہ سے ادب کا ایک جامع حصہ قاری کی نظروں

سے اوجھل ہے۔ مرثیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ موجودہ دور کے درد کا درماں بن سکتا
ہے۔ مرثیہ عدم تشدد کا داعی ہے، شرکاء محفل نے اس امر کی توجہ دلائی کہ اُردو رسم الخط شدید
عدم تحفظ کا شکار ہے۔ جامعات کے اُردو شعبہ جات کو اس طرف توجہ رکھنی چاہیے۔ پروفیسر
سحر انصاری نے مرثیہ کو خالصتاً اُردو کی ایجاد قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''یہ صنف کہیں سے
مستعار لی ہوئی نہیں ہے اس لیے اس کی حفاظت بھی ہمارا ہی کام ہے۔''

اسرار زیدی

ہفت روزہ ''اخبارِ جہاں'' پاکستان
15 تا 21/ مارچ 2004ء

رثائی ادب و شاعری کا ارتقاء انیسؔ و دبیرؔ کی تخلیقات سے ہوا

یادگارِ دبیرؔ سیمینار میں تین کتابوں کی تقریب پذیرائی

اس بار جس تقریب کا ذکر مقصود ہے، وہ اس اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں کینیڈا میں مقیم معروف محقق اور شاعر ڈاکٹر تقی عابدی کی تین کتب ایک ہی بلند پایہ مرثیہ نگار شخصیت مرزا سلامت علی دبیرؔ کی زندگی اور فن کے مختلف پہلوؤں کا انتہائی ناقدانہ اور محققانہ طور پر جائزہ لیا گیا تھا۔ ان کتب میں عنوان کے حوالے سے ''مجتہد نظم مرزا دبیرؔ''، ''سلک سلام دبیر'' اور ''طالع مہر'' شامل ہیں۔ تینوں کتب حال میں ہی لاہور کے ایک ناشر نے شائع کی ہیں۔

تینوں کتب کی تقریب پذیرائی عالمی مجلس ادب کے زیر اہتمام ایک مقامی ریسٹورنٹ میں انعقاد پذیر ہوئی۔ تقریب کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے کی جب کہ متعلقہ موضوع پر اظہار خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر سلیم اختر، سید وحید الحسن ہاشمی، شہزاد احمد، مشکور حسین یاد، احمد عقیل روبی، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور ڈاکٹر اجمل نیازی تھے۔ طاہر ناصر علی، نردوش ترابی، علی رضا کاظمی، رفعت عباس اور آصف اقبال مغل نے مرزا دبیر کو منظوم خراج عقیدت پیش کی۔ نظامت ڈاکٹر شبیہ الحسن نے کی۔

اس امر کا ذکر بھی یہاں غیر ضروری نہ ہوگا کہ ڈاکٹر تقی عابدی کی ایک کتاب مرزا دبیرؔ کی شخصیت اور فن سے عبارت ہے، جس کا عنوان ''مجتہد نظم مرزا دبیرؔ'' ہے۔ دوسری

کتاب جس کا عنوان ''سلکِ سلامِ دبیرؔ''، ممتاز مرثیہ نگار کے سلاموں پر مشتمل ہے۔ تیسری کتاب ''طالعِ مہر'' میں مرزا دبیرؔ کا غیر منقوط کلام شامل کیا گیا ہے۔

اپنے صدارتی کلمات میں ڈاکٹر خواجہ زکریا نے متعلقہ موضوع کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''تنقیدی اور تحقیقی سطح پر ہمیں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ سے سب سے پہلے شبلی نعمانی نے ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' لکھ کر متعارف کرایا۔ اس موازنہ میں مولانا شبلی نے جو بنیادی بات کہی تھی، وہ یہ تھی کہ میر انیسؔ آمد کے اور مرزا دبیرؔ آورد کے شاعر ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ ''اس کے بعد دونوں ممتاز مرثیہ نگاروں کے حوالے سے جو مباحث ہوئے یا مضمون تحریر کیے گئے، ان کا محرک ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' میں ہے تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر دو مرثیہ نگار انتہائی زود گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔''

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ زکریا نے کہا کہ ''شبلی نعمانی کا ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' اپنی جگہ تاہم موجودہ دور میں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ان عظیم المرتبت مرثیہ نگاروں کا جدید تناظر میں مطالعہ کیا جائے۔ ادب کا ایک عام طالب علم میر انیسؔ کے بارے میں تو کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتا ہے تاہم مرزا سلامت علی دبیرؔ کی شخصیت اور فن سے ان کی واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے۔''

صاحبِ صدارت نے کتابوں کے مصنف ڈاکٹر تقی عابدی کو ان کی کارکردگی پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''انھوں نے اپنی ان کتب کے ذریعے مرزا دبیرؔ کو ہمارے سامنے ایک نئے زاویے سے پیش کیا ہے۔ موصوف خود ایک ہمہ جہت شاعر اور محقق ہیں۔ انھوں نے قبل ازیں میر انیسؔ اور علامہ اقبالؔ کے بارے میں تحقیقی مضامین تحریر کیے اور متعدد کتب تصنیف کی ہیں۔ ذاتی سطح پر مجھے قوی امید ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی کی یہ کتابیں علمی و ادبی حلقوں میں بطورِ خاص پذیرائی حاصل کریں گی اور ان کے توسط سے دبیر شناسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی۔''

پروفیسر احمد عقیل روبی نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''اُردو شاعری بالخصوص مرثیہ و سلام نگاری میں مرزا سلامت علی دبیرؔ کی حیثیت مسلمہ ہے۔ یہ امر بڑا حیرت انگیز ہے کہ بیشتر لوگ میر انیسؔ کے مقابلے میں مرزا دبیرؔ کو لاتے ہیں جب کہ یہ حقیقت ہے

موٴخرالذکر خود بھی میر انیسؔ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ دبیرؔ کی یہ بڑی عظمت ہے کہ انھوں نے میر انیسؔ کی وفات کے بعد یہ کہہ کر مرثیہ لکھنا چھوڑ دیا کہ انیسؔ کی وفات کے بعد مرثیہ لکھنے کا لطف نہیں رہا۔''

ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے تھی کہ رثائی ادب وشاعری کا ارتقاء انیسؔ و دبیرؔ کی تخلیقات سے ہوا۔ دونوں نے بے شمار بلند پایہ مرثیے، سلام، منقبت اور رباعیات تخلیق کی ہیں۔ جو ہماری شعری تاریخ کا بڑا اہم جزو ہیں۔ مرزا دبیرؔ تو اس قدر قادر الکلام شاعر تھے کہ انھوں نے متعدد مرثیے ایسے تخلیق کیے جن میں نقطوں والا کوئی لفظ شامل نہیں کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر تقی نے ان مرثیوں کو بھی یکجا کر کے بڑا اہم کام کیا ہے۔

دیگر مقررین نے بھی کم وبیش ان خیالات کا اظہار کیا کہ ''انیسؔ و دبیرؔ محض مرثیہ نگاری ہی نہیں، شاعری کے دو روشن ستارے ہیں، جو آج ہی نہیں، آنے والے ادوار میں بھی فروزاں رہیں گے۔ نیز یہ کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے دور دراز کے ملک میں رہتے ہوئے مرزا دبیرؔ کا کلام جمع کر کے اور ان کی شخصیت کے بارے میں تفصیلات فراہم کر کے ایک ناقابل فراموش کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ موصوف نے مرزا دبیر اور ان کی پوری شاعری کا نئے سرے سے جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مرحلے پر تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''انھوں نے مرزا دبیر پر جو کام کیا ہے، وہ ان کی کئی برس کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔'' انھوں نے بتایا کہ ''ان تین کتابوں کے علاوہ بھی دبیرؔ کے مراثی اور فکر وفن کے موضوعات پر متعدد کتب تحریر کی ہیں، جو انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آجائیں گی۔'' انھوں نے کہا کہ ''اُردو شاعری میں مرزا دبیرؔ کو بے حد اہم مقام حاصل ہے لیکن مولانا شبلی سے لے کر موجودہ ناقدین سب نے ان سے اغماض برتا ہے۔''

اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''مرزا دبیرؔ نے تمام دوسرے مرثیہ نگاروں سے زیادہ مرثیے کہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے۔ یہاں تک کہ اس میدان میں انھوں نے نظیرؔ اکبر آبادی جیسے شاعر کو پیچھے چھوڑ دیا۔'' آخر میں ڈاکٹر تقی عابدی نے مقررین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں

نے اتنی پذیرائی کی ہے۔

یہ امر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ عالمی مجلس ادب اور اظہار سنز کے اشتراک سے مرزا دبیر کے بارے میں ڈاکٹر تقی عابدی کی کتب کی جو تقریب منعقد کی گئی ہے، وہ "یادگار دبیر سیمینار" کے نام سے موسوم کی گئی ہے اور اس امر کا قوی امکان ہے کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

ہفت روزہ ''فیملی'' پاکستان

17 تا 23 اپریل 2005ء

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتابوں کی رونمائی اور مرزا دبیرؔ پر سیمینار

گزشتہ دنوں عالمی مجلس ادب پاکستان کے زیر اہتمام مقامی ہوٹل میں اُردو مرثیے کے بے مثال شاعر مرزا سلامت علی دبیرؔ کی شخصیت وفن پر ایک یادگار سیمینار منعقد ہوا۔ اس موقع پر نامور محقق ڈاکٹر تقی عابدی کی دبیرؔ کے حوالے سے مرتب کردہ تین کتب ''ابواب المصائب''، ''مصحف فارسی'' اور ''مثنویاتِ دبیرؔ'' کی رونمائی بھی ہوئی۔ سیمینار کی صدارت معروف افسانہ نگار انتظار حسین نے کی۔ جب کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی اور ڈاکٹر سلیم اختر مہمانان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی اور پروفیسر عبدالکریم خالد نے سیمینار میں اپنے مقالات پیش کیے۔ دیگر اظہار خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اور عرفی ہاشمی شامل تھے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ''مثنویاتِ دبیرؔ'' پر لکھے گئے اپنے مضمون میں دبیرؔ کی مثنویوں کا جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ ''اُردو مثنویوں کی کتابوں اور تذکروں میں اب تک دبیرؔ کی تین مثنویوں کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید تقی عابدی نے تحقیق سے دبیرؔ کی مزید پانچ مثنویوں کو دریافت کیا ہے۔ جن میں دبیرؔ کا ایک غیر مطبوعہ مخطوطہ بھی شامل ہے۔ جو دبیرؔ کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ان کی یہ کاوش لائق تحسین ہے کہ انھوں نے دبیرؔ کو ایک مرثیہ نگار کے علاوہ ایک اہم مثنوی نگار کے طور پر بھی متعارف کرایا ہے۔''

پروفیسر عبدالکریم خالد نے ''ایک عظیم تحقیقی کارنامہ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی بنیادی طور پر طب کے پیشے سے منسلک ہیں، طبّی

تحقیق کے شعبے میں امریکہ و برطانیہ اور کینیڈا سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ اس وقت وہ کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں ایک پیتھالوجسٹ اور فزیشن کے طور پر معروف ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اپنی مصروف ترین زندگی میں انھوں نے ایک ضابطے کے تحت قابل لحاظ اوقات ادبی تحقیق کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔ اُردو کے ادبی اور لسانی مراکز سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر تن تنہا وہ کام سرانجام دے رہے ہیں جو ہمارے یہاں مستقل ادارے بھی انجام نہیں دے پاتے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کا اہم موضوع انیسؔ اور دبیرؔ ہیں۔

گزشتہ دو برس کے دوران دبیرؔ پر ان کی چھ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اس وقت وہ دبیرؔ کے مرثیوں کو جمع کرنے اور ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔" انھوں نے کہا کہ" دبیر کی نثری تصنیف "ابواب المصائب" 180 سال قبل لکھی گئی نادر و نایاب کتاب ہے۔ جسے ڈاکٹر سید تقی عابدی نے دریافت کر کے فرہنگ کے حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کتاب کو انیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں لکھی جانے والی اُردو نثر کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مقدمے میں کتاب کے موضوع اور اسلوب پر نہایت شستہ اور مبسوط پیرائے میں جو عالمانہ بحث کی ہے وہ تحقیق اور تنقید دونوں میں اعلیٰ معیار قائم کرتی ہے۔ "مصحف فارسی" کا ذکر کرتے ہوئے عبدالکریم خالد نے کہا کہ" اس کتاب میں مرزا دبیرؔ کی فارسی رباعیات، قطعات، سلام، مخمسات اور مسدسات کے علاوہ ان کے غیر مطبوعہ نثری رسائل اور مکتوبات بھی شامل ہیں جو دبیرؔ کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے مخطوطوں کی شکل میں ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنی فارسی دانی کے جوہر دکھائے ہیں۔

سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر اجمل نیازی نے کہا کہ" ڈاکٹر سید تقی عابدی محنت اور ریاضت پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا یہ تحقیقی کام اُردو زبان و ادب کی اتنی بڑی خدمت ہے جس کی موجودہ دور میں کوئی مثال نہیں ملتی۔" انھوں نے کہا کہ" ڈاکٹر سید تقی عابدی انسانوں کے مسیحا ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کے بھی مسیحا ہیں۔"

عرفی ہاشمی نے کہا کہ" ہمیں جدید دور کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادب کے فروغ و اشاعت کے لیے کمپیوٹر ٹکنالوجی کو استعمال میں لانا چاہیے تاکہ ہم پوری دُنیا میں اُردو

ادب کو متعارف کرا سکیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر سید تقی عابدی کی محنت اور محققانہ جستجو قابل تعریف ہے۔" عام طور پر غیر ممالک سے پاکستان آنے والے ادبا، شعری مجموعے لے کر آتے ہیں۔ لیکن وہ پہلے شخص ہیں جو بھاری بھر کم تحقیقی کتابوں کے ساتھ پاکستان آئے۔"

سیمینار کے صدر انتظار حسین نے کہا کہ "میر انیسؔ کے مقابلے میں دبیر کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ شبلی کے "موازنہ انیسؔ و دبیرؔ" کے بعد ہمارے ناقدین کی زیادہ توجہ انیسؔ کی طرف رہی اور مرزا دبیر ذہنوں سے محو ہوتے چلے گئے۔"

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے دبیرؔ پر اوپر تلے چھ کتابیں مرتب کر کے دبیر کو نئے سرے سے زندہ کر دیا ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ ڈاکٹر تقی عابدی جلد ہی دبیرؔ کے مرثیوں کو بھی منظر عام پر لائیں گے اور دبیرؔ شناسی کے تمام مراحل طے کر لیں گے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ممتاز شاعر اور ناقد ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے انجام دیے۔ اس موقع پر انھوں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تفصیلی تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب کی پاکستان آمد پر ان کی شاندار انداز میں پذیرائی ہوئی ہے۔ ان کے اعزاز میں بہت سی تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ جی سی یونیورسٹی لاہور اور اُردو سائنس بورڈ میں انھوں نے ادب کی موجودہ صورت حال پر خصوصی لیکچرز دیے۔ ایک نشست پروفیسر مشکور حسین یاد کے گھر میں منعقد ہوئی جس میں شہر کے چیدہ ادیبوں نے شرکت کی۔ لاہور کے ادیبوں سے ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جس سے ان کے ادبی اور تحقیقی کام سے متعارف ہونے میں مدد ملی۔

روزنامہ ''امروز''، ''جسارت''، ''نوائے وقت''، ''کراچی''، ''امن''، ''قومی اخبار''، ''خبریں''، ''جنگ''، ''ایوننگ اسپیشل''

24/جنوری 2006ء

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیق و تدوین ''کائناتِ نجم'' کی تقریب اجراء

پاک و ہند کے مشہور محقق و مصنف ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیق و تدوین ''کائناتِ نجم'' کی تقریب اجراء 26/جنوری 2006ء بروز جمعرات 7 بجے شام بمقام کلب ہاؤس (کے بی سی اے) عقب سوک سینٹر حسن اسکوائر کراچی میں منعقد کی جارہی تقریب کے مہمان خصوصی (سابق وائس چانسلر جامعہ کراچی) ڈاکٹر جمیل جالبی جب کہ تقریب کی صدارت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کریں گے، اس موقع پر کتاب کے مصنف ڈاکٹر سید تقی عابدی خصوصی خطاب کریں گے، تقریب میں پروفیسر شاہدہ حسن، تاجدار عادل، ڈاکٹر بلال نقوی، ڈاکٹر سلمان ترابی اور پروفیسر سحر انصاری اظہارِ خیال کریں گے۔ جب کہ تلاوت سید اکبر شاہ، نظامت حسنین، انجم، سلام نجم، سید اکبر شاہ نقوی پڑھیں گے۔ سید محمد رضوی، سید اظہر حسنین اور مسعود جعفری نے تمام اہل ادب اور شخصیات سے شرکت کی استدعا کی ہے۔

روزنامہ ''جناح''، ''مساوات''، ''نوائے وقت''، ''اوصاف'' لاہور

16-30 دسمبر 2008ء

پاکستان میں اُردو کو قومی اور سرکاری زبان کا درجہ جائے: تقی عابدی

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا اُردو زبان وادب پر خصوصی لکچر

شعبہ اُردو یونیورسٹی آف ایجوکیشن لوئر مال کیمپس لاہور کے زیر اہتمام کینیڈا سے تشریف لائے معروف محقق اور ناقد ڈاکٹر سید تقی عابدی کے خصوصی لکچر کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر منعقدہ تقریب کی صدارت ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے کی۔ ماہر لسانیات، محقق، ناقد اور صدر شعبہ اُردو ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے مہمان خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ''ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اُردو کے مراکز سے دور بیٹھ کر تحقیق وتنقید کا جو کام تنہا سرانجام دیا ہے وہ ادارے بھی مل کر نہیں کر سکتے اور ان کی تیس سے زیادہ کتب ان کی ذہانت کی عکاس ہیں۔'' ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ''اُردو زبان ادب، بین الاقوامی تناظر میں'' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے پاکستان سے باہر اُردو و ادب کی تازہ ترین صورت حال پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ''اُردو کے مقابلے میں ہندی زبان زیادہ ترقی کر رہی ہے۔ اگر ہم نے پاکستان میں اُردو کو ایک قومی اور سرکاری زبان کے طور پر قبول نہ کیا تو پھر پاکستان سے باہر بھی اُردو بولنے والا نہیں ملے گا۔'' ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنے صدارتی خطاب میں موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اُردو زبان وادب کے طالب علموں پر زور دیا کہ وہ اُردو زبان کو ہر سطح پر رائج کرنے کے لیے اسے درست طور پر سیکھیں اور اس کے فروغ کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کریں۔ انھوں نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی ایک ہشت پہلو نگینہ ہیں اور انھوں نے بے شمار موضوعات پر تحقیقی وتنقیدی کام کیا ہے۔'' آخر میں ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے معزز مہمانوں کی خدمت میں تحائف پیش کیے۔ اساتذہ اور طلباء وطالبات کی ایک کثیر تعداد نے اس لکچر میں شرکت فرمائی۔

روزنامہ ''جناح''، ''نوائے وقت''، ''انصاف''، ''اساس''، ''انصاف''، ''آواز''، ''آج کل''، ''سماء''، ''آواز''، ''جناح''، ''مساوات'' لاہور

26/دسمبر 2008ء

مرزا سلامت علی دبیرؔ کی یاد میں انٹرنیشنل سیمینار

اُردو کی حقیقی تفہیم کے لیے دبیرؔ کے کلام سے استفادہ کرنا ہوگا

عالمی مجلس ادب پاکستان اور پیک لٹریری سوسائٹی کی جانب سے گزشتہ روز مرزا سلامت علی دبیرؔ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ایک یادگار انٹرنیشنل سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر سلیم اختر نے کی جب کہ امجد اسلام امجدؔ مہمان خصوصی تھے۔ کینیڈا سے معروف محقق اور ناقد ڈاکٹر تقی عابدی اور امریکہ سے وکیل انصاری خصوصی طور پر تشریف لائے تھے۔ عالمی مجلس ادب کے چیئرمین ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے کہا کہ ''عصر حاضر میں ہم نے ہر اس تخلیق کار کو فراموش کر دیا ہے جو شعر و ادب کا اہم ترین ستون رہا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''دبیر کا مقام انیسؔ سے بھی بلند ہے کہ انھوں نے شعر و ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔'' ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے افتتاحی کلمات میں کہا کہ ''دبیر فہمی کی آج بے حد ضرورت ہے کیوں کہ ہم اپنی حقیقی تہذیب و ثقافت سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔'' امجد اسلام امجدؔ نے کہا کہ ''آج دبیر شناسی کی زیادہ ضرورت ہے اور تقی عابدی نے مرزا دبیر کے حوالے جو کام کیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔'' وکیل انصاری نے کہا کہ ''پوری دُنیا میں اُردو بولنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ لہٰذا اُردو کی حقیقی تفہیم کے لیے بھی ہمیں دبیر کے کلام سے کماحقہ، استفادہ کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''دبیر اُردو زبان کا ایک بہت بڑا شاعر ہے اور اس کی ہر جہت قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔'' انھوں نے دبیر کی رباعیات کے حوالے سے بعض اہم نکات پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر ان کی دبیر شناسی کے حوالے سے ساتویں کتاب ''رباعیاتِ دبیر'' کا افتتاح بدست ڈاکٹر سلیم اختر کیا گیا۔

تقریب کے صدر ڈاکٹر سلیم نے کہا کہ ''دبیرؔ کے مقام و مرتبے کو شبلی نعمانی کی تنقید نے کمزور کیا۔'' انھوں نے کہا کہ ''شبلی ایک ناقد سے زیادہ مؤرخ تھے۔ لہٰذا انھوں نے مرثیے کی سلطنت پر میر انیسؔ کو تاج پہنا کر بٹھا دیا۔'' انھوں نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی نے دبیرؔ فہمی اور دبیر شناسی کا حق کا ادا کر دیا ہے۔''

پروفیسر آصف وٹو، مدثر نعیم اور اسد بخاری نے مرزا دبیرؔ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے گفتگو کی۔ آخر میں پیک لٹریری سوسائٹی کے کنوینر اور عالمی مجلس ادب کے چیئر مین ڈاکٹر شبیہ الحسن نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور تحائف پیش کیے۔ مختلف علمی و ادبی انجمنوں کے اراکین اور مختلف رسائل کے مدیران نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کو تحائف پیش کیے۔ حاضرین کی ایک بہت بڑی تعداد نے اس پر وقار تقریب میں شرکت کی۔

11/مارچ 2017ء

غالبؔ اور اقبالؔ کے افکار آفاقیت کے حامل ہیں: ڈاکٹر سید تقی عابدی

شعبہ اُردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور کے زیر اہتمام پاکستان اسٹڈیز سنٹر، قائد اعظم کیمپس یونیورسٹی میں کینیڈا میں مقیم معروف محقق، ناقد اور شاعر ڈاکٹر سید تقی عابدی کے خصوصی لکچر کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب کی صدارت پرنسپل اورینٹل کالج و ڈین کلیۂ علوم شرقیہ پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری نے کی، جب کہ مہمان اعزاز سابق صدرِ شعبہ اُردو پنجاب یونیورسٹی اور معروف ماہر اقبالیات پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تھے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ضیاء الحسن نے کیے۔ صدرِ شعبہ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر ظفر معین ناصر کا شکریہ ادا کیا۔ جنھوں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کے لکچر کے انعقاد کی اجازت دی اور مالی وسائل بھی فراہم کیے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے لکچر بعنوان ''غالبؔ سے اقبالؔ تک'' میں اُردو شاعری کی روایت، بیدلؔ کے غالبؔ پر اثرات، علی گڑھ تحریک، غالبؔ کی شاعری کے آفاقی عناصر کے علاوہ اقبالؔ کے تصورِ خودی اور فکرِ اقبالؔ کے تناظر میں تحریک پاکستان سے قیام پاکستان تک کے سفر پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ''پرانے شاعر آفاقی طرزِ احساس کے حامل ہوئے ہیں اور ان کی شاعری، روایت اور عصری شعور کی روشنی سے مستقبل کو منور کرتی ہے۔ تقریب کے مہمان اعزاز معروف ماہر اقبالیات پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کو عصرِ حاضر کا منفرد اقبال شناس قرار دیتے ہوئے ان کی تحقیقی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

تقریب کے اختتام پر پروفیسر ڈاکٹر محمد فخرالحق نوری نے اپنے صدارتی کلمات میں غالبؔ اور اقبالؔ کی فکر کو تہذیبی اثاثہ قرار دیا اور چند اہم نکات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے شعبہ اُردو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے خصوصی لکچر کی دعوت قبول کی۔ انھوں نے بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ظفر معین ناصر علمی و ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ انھوں نے کامیاب تقریب کے انعقاد پر صدر شعبہ اُردو اور شعبہ کی ادبی تنظیم ''انجمنِ اُردو'' کے اراکین کو مبارک باد پیش کی۔

25/جون 2018ء

ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی خدمات کا اعتراف

شعبہ اُردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور میں کینیڈا میں مقیم معروف محقق، ناقد، مورخ اور شاعر ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی و ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایم فل کی سطح کے دو مقالے مکمل کیے گئے۔ پہلا مقالہ شعبہ اُردو کی ریسرچ اسکالر سحرش افتخار نے ''ڈاکٹر سید تقی عابدی بطور حالی شناس'' اور دوسرا مقالہ محمد عدنان نے ''ڈاکٹر سید تقی عابدی بطور فیض احمد فیضؔ'' کے موضوع پر تحریر کیا۔ مذکورہ مقالات پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران، چیئر مین شعبہ اُردو کی نگرانی میں مکمل ہوئے۔

عزیز حیدر
پندرہ روزہ ''حدیثِ دل'' دہلی
شمارہ: اپریل 2005ء

رثائی ادب کی ایک شام

اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک ہی شاعر کی بیک وقت چھ کتابوں کی رسم اجرا پہلے کبھی انجام نہیں دی گئی اور وہ بھی ایک ہی ادیب و محقق کی ترتیب و تدوین کی ہوئی۔ یہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا کارنامہ ہے۔ وہ تقریباً ہر سال ہندوستان آتے ہیں اور کوئی نہ کوئی ادبی تحفہ ضرور ساتھ لاتے ہیں۔ اس بار وہ چھ ایسے بیش بہا ادبی تحفے اپنے ساتھ لائیں گے، اس کی امید نہ تھی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر گوپی چند نارنگ (چیئرمین ساہتیہ اکادمی) نے ''حدیث دل ٹرسٹ'' کی جانب سے 21 /مارچ کو غالبؔ اکادمی نئی دہلی میں منعقد ''رثائی ادب کی ایک شام'' میں اپنے صدارتی کلمات میں کیا۔ دہلی اُردو اکادمی کے تعاون سے منعقدہ اس پروگرام میں مرزا دبیر سے متعلق چھ کتابوں ''ابواب المصائب''، ''مثنویات دبیر''، ''مصحفِ فارسی مرزا دبیر''، ''مجتہدِ نظم مرزا دبیر''، ''طالع مہر'' (غیر منقوط کلام کا مجموعہ) اور ''سلک سلام دبیر'' رونمائی ہوئی۔

جناب سید شاہد مہدی (سابق شیخ الجامعہ)، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر صادق (دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر فضل امام رضوی (الہ آباد)، پروفیسر زماں آزردہ (کشمیر یونیورسٹی)، جناب اطہر رضوی (کینیڈا)، جناب رضا علی عابدی (لندن)، جناب وکیل انصاری (امریکہ)، جناب امجد اسلام امجدؔ (لاہور)، جناب شینؔ کاف نظام (جودھ پور)، ڈاکٹر فقیر محمد بھٹی (لندن) اور ڈاکٹر عظیم امروہوی نے اپنے اپنے انداز میں ڈاکٹر تقی عابدی کی اُردو زبان و ادب کی خدمات کو عدیم المثال قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''انھوں نے تحقیق و تدوین کو عصری تقاضوں کے اعتبار سے نئی جہت عطا کی ہے اور نئے امکانات سے ہمکنار کیا ہے۔'' ان لوگوں نے کینیڈا میں ان کی ذاتی لائبریری کا ذکر کرتے

ہوئے بتایا کہ ''اتنی بڑی ذاتی لائبریری شاید ہی کہیں اور موجود ہو جس میں چودہ سو قلمی نسخے اور مخطوطات موجود ہیں۔''

محترمہ ڈاکٹر عالیہ امام (پاکستان) نے اپنے شگفتہ لب ولہجہ اور مترنم انداز و آواز میں ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقی خدمات کو نا قابل مثال قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اسی طرح کے اور ادبی نوادر سے وہ اُردو زبان و ادب کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

سید محمود نقوی نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا کہ ''جوش ملیح آبادی نے ڈاکٹر عالیہ امام کو تحریر کی شہزادی اور فیض احمد فیض نے طوطی پاکستان کے خطاب سے نوازا تھا لیکن آج محترمہ کی تقریر سن کر انھیں ملکہ تقریر کہنے کو جی چاہتا ہے۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی تحقیقی و تحریری مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ''اکثر ان کی راتیں اپنی ذاتی لائبریری ہی میں گزرتی ہیں اور روزانہ بارہ چودہ گھنٹے وہ لکھنے پڑھنے میں ضرور صرف کرتے ہیں۔'' جناب عبدالمنان طرزی اور جناب متین امروہوی نے منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ اس موقع پر شرکائے جلسہ میں سے دس افراد کو قرعہ اندازی کے ذریعہ ڈاکٹر تقی عابدی کی مرتبہ کتابوں کے سیٹ دیے گئے۔ باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو دہلی اُردو اکادمی کے سکریٹری جناب مرغوب عابدی نے اکادمی کی تازہ مطبوعات پیش کیں۔ ''حدیث دل ٹرسٹ'' کی طرف سے تمام حاضرین کو گوپی ناتھ امن مرحوم کے منقبتی کلام کا مجموعہ ''سیل عقیدت'' بطور تحفہ پیش کیا گیا اور عشائیہ کے ساتھ جلسہ بڑی کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ ''تحریکِ وطن'' مراد آباد

24 / مارچ 2005ء

جنت نشاں میں کینیڈا کے مصنف ڈاکٹر تقی کی تین کتابوں کا افتتاح

کینیڈا کے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ایک ساتھ تین کتابوں کا افتتاح آج سابق وزیر حافظ محمد صدیق نے کیا۔ موصولہ اطلاع کے مطابق سر سید ایجوکیشنل ٹرسٹ اور جنت نشاں اسکول کی مشترکہ قیادت میں آج پیر غیب میں واقع جنت نشاں اسکول میں ایک خوب صورت تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں خاص طور سے اس وقت کینیڈا میں رہنے والے ڈاکٹر تقی کی تصنیفات ''مثنویاتِ دبیر''، ''مصحف فارسی دبیر'' اور ''ابواب المصائب'' کا افتتاح سابق وزیر اور سینئر کانگریسی لیڈر حافظ محمد صدیق و معروف مصنفہ ڈاکٹر ظل ہما نے مشترکہ طور پر کیا۔ اُردو میں لکھی ان کتابوں کی طباعت شاہد پبلی کیشنز، دہلی نے کی۔ اس موقعہ پر حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر سید تقی نے کہا کہ ''انھیں اس بات کا فخر ہے کہ انھوں نے اُردو میں کتابیں لکھی ہیں۔'' انھوں نے اپیل کی کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اُردو میں کتب لکھیں اور اُردو کو ترقی دینے کے لیے کوشش کریں۔''

انھوں نے کہا کہ ''اُردو کے چاہنے اور بولنے والے پوری دُنیا میں ہیں جو اُردو کو بلند کرے گا اس کا مرتبہ بھی بلند ہوگا۔ اس دوران ڈاکٹر ظل ہما، ڈاکٹر محمد شاہد، حبیب الرحمٰن راعینی، ناصر منصوری، عتیق احمد، قمر اقبال وغیرہ نے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی صدارت حافظ محمد صدیق نے کی۔ جب کہ نظامت کے فرائض جاوید رشید عامر ایڈوکیٹ نے ادا کیے۔ پروگرام میں مذمل حسین، انصار حیدر، سہیل بوبی، ڈاکٹر محبوب، مبشر حسین، ندیم منصوری، محمد وسیم وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ ''لشکر''، لکھنؤ

24 رمئی 2005ء

مشہور ادیب ڈاکٹر تقی عابدی کی ہندوستان آمد

اُردو کے مشہور و معروف نقاد محقق اور ادیب ڈاکٹر سید تقی عابدی ہندوستان کے دورے پر ہیں۔ آج وہ ریاستی راجدھانی پہنچے۔ جہاں ان کا استقبال اتر پردیش وقف بورڈ کے ممبر علی اکبر ایڈوکیٹ نے کیا۔ تقی عابدی کینیڈا میں مقیم ہیں اور پیشے سے دل کے سرجن ہیں لیکن ان کو اُردو ادب میں بلند مقام حاصل ہے اور اپنے دور کے مشہور مرثیہ نگار میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ کے مراثی پر تقریباً دس کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور حیدر آباد، برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا میں میڈیکل سائنسز کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ڈاکٹر عابدی کا ذوق شاعری اور ادبی تحقیقات ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں متعدد کتابیں سپرد قلم کی ہیں اور زندگی کا بڑا حصہ تصنیف و تالیف میں گزارا ہے۔ ڈاکٹر عابدی ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک اور کینیڈا میں قیام کر چکے ہیں۔ جہاں انھوں نے انسانوں کی خدمت کے علاوہ ادب کی بھی خدمت کی ہے۔ ڈاکٹر عابدی کی مشہور کتابوں میں ''شہید''، ''جوشِ مودّت''، ''گلشنِ رویا''، ''اقبالؔ کے عرفانی زاویے''، ''انشاء اللہ خان انشاءؔ''، ''رموزِ شاعری''، ''اظہارِ حق''، ''مجتہدِ نظم مرزا دبیرؔ''، ''طالعِ مہر''، ''تجزیہ یادگارِ انیسؔ''، ''مصحف فارسی دبیرؔ''، ''تجزیہ شکوہ جواب شکوہ''، ''رباعیات دبیرؔ''، ''فانیؔ شناسی'' اور دیگر کتابیں تحریر کی ہیں۔ اپنے دو روزہ قیام میں ڈاکٹر عابدی یہاں مصنویات دبیرؔ کی رونمائی کے سلسلے میں آئے ہیں۔

روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی

31/جنوری 2006ء

امروہہ

ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''کائناتِ نجم'' کا اجرا

یہاں حسن آرا ٹرسٹ دہلی کے زیر اہتمام کوٹھی کمال امروہوی دربار شاہ ولایت میں صبح ''کلیاتِ نجم'' جو ''کائنات نجم'' کے نام سے عالمی شہرت یافتہ محقق و ادیب ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) کی تحقیق و تدوین اور تنقید ہے کی رسم اجرا بدست پروفیسر منظر عباس نقوی سابق صدر شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ادا کی گئی۔ جلسے کی صدارت مولانا ڈاکٹر سید محمد سیادت سابق صدر شعبۂ اُردو، ہندو پی جی کالج امروہہ نے کی اور نظامت کے فرائض علی نقوی نے انجام دیئے۔ جلسے کا آغاز مولانا سید احسن اختر سروش نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ سلیم امروہوی (جدہ) نے نعت پیش کی اور اکرام نوگانوی نے کلام نجم آفندی پیش کیا۔ پنڈت بھوونیش کمار بھون نے ڈاکٹر تقی عابدی کی خدمات کو اپنے قطعات میں سراہا۔

ڈاکٹر عظیم امروہوی نے ڈاکٹر تقی عابدی کا تعارف پیش کرتے ہوئے عصر حاضر کے محقق اعظم قرار دیا۔ جب کہ نجم آفندی کی ہمہ جہت شخصیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھیں جدید مرثیہ کا ممتاز شاعر اور اہم ستون بتایا۔ ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی اور مولانا شہوار حسین امام جمعہ مراد آباد نے نجم کے نوحوں پر مقالے پیش کیے اور انھیں انقلابی اور تبلیغی نوحہ کا بانی قرار دیا۔ کامریڈ شوق امروہوی نے سہیل آفندی پسر علامہ نجم آفندی کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سید شمیم ہادی (پاکستان) اور منظور امروہوی (ممبئی) نے شرکت کی۔ پروفیسر منظر عباس نقوی نے ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ کام یقیناً تاریخ ساز ہے۔'' صدر جلسہ ڈاکٹر محمد سیادت نے علامہ نجم آفندی کو بنیادی طور پر غزل کا شاعر بتایا اور ان کی نوحہ گوئی پر خاص طور سے اظہار خیال کیا۔ ٹرسٹ کے بانی اور آرگنائزنگ سکریٹری کمال حیدر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
روزنامہ "سیاست" حیدرآباد
11 رفروری 2006ء

کائناتِ تجمّل

شاعر اہلبیت حضرت تجمّل آفندی اُردو کے ان شعراء میں ہیں۔ اُردو تنقید نے جن کا حق ادا نہیں کیا اور جو اپنی بے نیازی، شہرت گریزی، استغناء اور خودداری کے باعث وہ مقام نہیں پا سکے جس کا وہ استحقاق رکھتے تھے۔ تجمّل آگرہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم یہیں پائی اور بعد ازاں اپنے طور پر شعر و ادب کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا۔ وہ اُردو فارسی اور ہندی اچھی طرح جانتے تھے۔ انگریزی میں بھی خاصا ورک تھا۔ ریلوے ملازمت کے سلسلہ میں دہلی، کالکا اور غازی پور میں رہے۔ تحریک ترک موالات سے متاثر ہوکر ملازمت ترک کردی اور تھوڑی مدت کے لیے ردولی میں کاشتکاری کی اور جونیئر پرنس معظم جاہ شجیع کے دربار سے بھی منسلک رہے۔ بارہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ انھیں اپنے دور کے نامور اساتذہ کی صحبتوں سے فیض اُٹھانے کا موقع ملا۔ ناصر الملت نے تجمّل آفندی کو "شاعر اہلبیت" کا خطاب دیا۔ ہم عصر شعراء میں حالیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، حسرتؔ موہانی، صفیؔ لکھنوی، آرزوؔ لکھنوی ہیں تو ہم عمر شعراء میں فانیؔ، جوشؔ، صدقؔ جائسی، یگانہؔ، سیمابؔ، مہذبؔ لکھنوی اور مہدآل رضا۔ تجمّل کی تصانیت کی تعداد 50 کے قریب بتائی جاتی ہے۔ طالب علمی کے دور ہی سے قوم پرستانہ جذبات کے حامل تھے۔ زیادہ تر کھدر کا استعمال کرتے۔ ریلوے ملازمت تو ترک کرہی دی تھی۔ کسی وجہ سے پرنس کی ملازمت سے بھی سبکدوشی اختیار کی۔ اپنے طور پر ماہنامہ "مشورہ" جاری کیا جو زیادہ چل نہ سکا۔ فارغ البالی نے جلد ہی رخصت چاہی اور تجمّل مالی پریشانیوں سے دوچار ہوئے۔

1953ء میں والدہ اور 1958ء میں اہلیہ کے انتقال نے جذباتی طور پر پریشان کردیا۔ اعصاب میں تناؤ، لاغری، کم خوابی اور ضعف کے علاوہ آخری عمر میں معدہ، جگر،

قلب کی بیماریوں رعشہ اور ثقلِ سماعت سے دو چار رہے۔ بھائی اور بیٹوں نے پاکستان کا رخ کیا اور یہ بھی مجبور ہو کر اپریل 1971ء میں ترکِ وطن کر کے کراچی پہنچے اور 21ر دسمبر 1975ء کو کراچی میں مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

تجمّم نے اپنی تصانیف کی ترتیب و اشاعت پر کم توجہ دی۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ 1917ء میں شائع ہوا اور آخری مجموعہ ''لہو قطرہ قطرہ'' اُن کے انتقال کے چار سال بعد 1979ء میں۔ ان کے کئی مجموعوں کی اشاعت کے سامان نہیں ہو سکے۔ انھوں نے خود نوشت لکھنی شروع کی تھی جو نامکمل رہی اور اس کی اشاعت بھی نہ ہوئی۔ ان کے مضامین کا مجموعہ نوشت ترتیب ہی نہیں دیا گیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی اُردو کی اپنی بستیوں سے دور ایک نئی بستی کینیڈا میں قیام پذیر ہیں اور طبابت کی خدمات انجام دیتے ہیں تعجب ہوتا ہے کہ انھیں اپنی مصروفیات کے باوجود اتنا وقت کہاں سے ملتا ہے کہ وہ تحقیق، تدوین اور تنقید کی دُنیا میں مصروف رہتے ہیں۔ اب تو انھوں نے ممتاز محققین کی صف میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ تقی عابدی کی تا حال کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ''شہید''، ''جوشِ مودّت''، ''گلشنِ رویا''، ''تجزیہ یادگارِ انیس''، ''ابواب المصائب''، ''ذکرِ دُرباران''، ''عروسِ سخن''، ''مصحفِ فارسی دبیر''، ''مثنویاتِ دبیر''...... یہ وہ کتابیں ہیں جنھوں نے نامور اہلِ علم اصحاب سے داد ستائش وصول کی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی زیرِ تالیف کتابوں میں ''تجزیہ شکوہ جواب شکوہ''، ''رباعیاتِ دبیر''، ''فانی شناسی''، ''مصحف تاریخ گوئی''، ''روپ کنوار کماری'' اور ''تعشق لکھنوی'' ہیں۔ اس دوران ان کی قابلِ مطالعہ اور اہم تحقیق ''کائناتِ تجمّم'' ہے۔ ''کائناتِ تجمّم'' واقعی کائناتِ نجم ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے حضرت تجمّم کی کل غزلوں رباعیات، قطعات، نعت شریف، قصائد، سلام، نوحوں اور متفرقات کے علاوہ مرثیوں اور ہندی کلام کو یکجا کر دیا ہے۔ ''کائناتِ تجمّم'' میں یہی نہیں کہ تجمّم کا سارا کلام محفوظ کر دیا گیا ہے بلکہ ان کی حیات، شخصیت اور فن کے بارے میں اکابرین کے رشحاتِ قلم بھی شامل ہیں۔ سید العلماء مولانا علی تقی نقوی، جناب ضیاء الحسن مولوی، ڈاکٹر محمد حسن فاروقی، شمشاد حسین رضوی، سید ہاشم رضا، علامہ سید ضمیر اختر نقوی، کسریٰ منہاس، سید معز الدین قادری ملتانی، جناب قدر عریضی اور ڈاکٹر فاطمہ تشبیر جیسے لکھنے والوں نے علامہ تجمّم آفندی کے مزاج اور فن پر روشنی

ڈالی ہے۔ غزل کے باب میں تقی عابدی، اختر انصاری، اکبر آبادی اور سید نواز حسن زیدی کے مضامین ہیں تو پروفیسر احتشام حسین، پروین شاکر، پروفیسر کمال الدین ہمدانی اور افضل حسین نقوی کی تحریریں بھی جو کہ تجم نے فن کے کئی پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔

تقی عابدی نے جس توجہ، محنت، اہتمام اور سلیقہ کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ ''کائناتِ تجم'' نہایت دیدہ زیب اور ضخیم، دو جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ جس کی رسم اجراء انجام دیتے ہوئے حضرت تجم کے فرزند علامہ سہیل آفندی نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی نے کئی سال کی محنت کے بعد یہ کام مکمل کیا ہے۔ انھوں نے علامہ تجم کے کئی اشعار کو جو عام طور پر نہیں ملتے تحقیق کر کے اس میں شامل کر دیا ہے۔'' وہ اس تقریب رسم اجراء کی صدارت فرما رہے تھے۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ تھے، پروفیسر نارنگ نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ''تقی عابدی جو کام کر رہے ہیں اس کی طرف اشارے کیے جا چکے ہیں۔ علامہ تجم آفندی شاعر اہل بیت اور شاعر رسالتؐ ہیں۔ انھیں اپنے آپ پر اعتماد تھا اس لیے اپنے زمانے میں ناقدری کے باوجود آج ان کی قدر ہو رہی ہے۔'' تقی عابدی نے بتایا کہ 13-12 ہزار اشعار ہونے کے باوجود انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔ نارنگ صاحب نے کہا کہ ''اگر زمانہ نظر انداز نہیں کرے گا تو ہمارے محققین اور ناقدین کیا کریں گے۔ زمانہ بڑی شخصیتوں کے ساتھ ہمیشہ ناقدری کرتا ہے۔ ایسے شعراء زمانے سے متصادم ہوتے ہیں۔ علامہ تجم آفندی نے اپنا کلام شائع نہیں کیا وہ زمانے سے متصادم بھی نہیں ہوئے لیکن آج ان کو ان کا مقام مل رہا ہے۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی گراں قدر تحقیق ''کائناتِ تجم'' کے بارے میں کہا کہ یہ اُردو کا حادثہ ہوا کہ ''کائناتِ تجم'' ترتیب دی گئی۔ انھوں نے کہا کہ ''کائناتِ تجم'' کے 65 فیصد اشعار غیر مطبوعہ ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب کینیڈا میں ترتیب دی۔ تقی عابدی نے بتایا کہ اقبالؔ اور جوشؔ سے پہلے 1913-1912ء میں سرمایہ داری کے خلاف پہلی آواز تجم نے بلند کی۔ وطن پرستی، تجم کی رگ رگ میں سموئی ہوئی تھی۔ تجم سوشلسٹ خیالات کے حامل تھے انھوں نے کہا کہ اسلام انسان دوستی کا نام ہے لیکن اسلام کو دہشت گردی کے لیے بدنام کیا جاتا ہے جب کہ واقعہ یہ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ''کائناتِ تجم'' کی اشاعت کا مقصد تجم

شناسی کو عام کرنا اور اُردو کے دامن کو وسیع کرنا ہے۔ ڈاکٹر ریاض فاطمہ تشبیر نے جنھوں نے علامہ تجم آفندی کی شخصیت اور فن پر تحقیق کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ تجم کی شاعرانہ عظمت پر اظہارِ خیال کیا۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ ''تنقید نے تجم کی طرف توجہ نہیں دی، لیکن تقی عابدی نے تحقیق سے کام لے کر ان کے سارے کارناموں کو محفوظ کر دیا ہے۔'' شارب ردولوی نے کہا کہ ''تجم نے مرثیہ میں داخلی تبدیلی کی کوشش کی۔ کربلائی جنگ مظلوم اور ظالم کی جنگ تھی۔ جوش نے اس جنگ کو ایک نیا رُخ دیا اور اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہندوستانی عوام کو غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے راغب کیا۔ تجم بھی شہادت امام حسینؑ کے پیچھے جو فلسفہ ہے اسی کو پیش کرتے ہیں۔'' علامہ اعجاز فرخ نے اپنی سحر انگیز تقریر میں تجم کی شاعری کی خوبیوں پر روشنی ڈالی اور تجم کی شخصیت کے بارے میں دل موہ لینے والے پیرایہ میں اظہارِ خیال کیا۔ جناب حمایت علی شاعرؔ نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی نے انیسؔ پر تاریخی کام کیا ہے۔ تجم صاحب بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔''

انھوں نے اُردو شاعری کو نئی فکر دی۔ ان کی شاعری میں انقلابی عمل ملتا ہے۔ جو زمانہ سے باخبری اور تاریخی تسلسل کو ذہن میں رکھنے سے آتا ہے۔ جناب امجد اسلام امجد نے کہا کہ ''کائناتِ تجم'' ایک گراں بہا تحقیقی کام ہے اُردو ادب میں ایسے کام کم ہی ہوئے ہیں۔ جناب خلیل الرحمٰن نے ''کائناتِ تجم'' کی ستائش کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی سے خواہش کی کہ وہ اپنے کاموں کو جاری رکھیں اور اُردو تحقیق میں نئے چراغ روشن کرتے رہیں۔ پروفیسر صادق نقوی نے کہا کہ ''علامہ تجم کو شاعر اہل بیت کا خطاب آگرہ نے دیا۔ علامہ تجم نے شاعری کو روزگار کا ذریعہ بنایا اور نہ مذہب کو حصولِ دُنیا کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو بھی ایسی ہی تربیت دی۔ علامہ تجم گزر گئے اور اُردو کی رثائی شاعری میں ''تجمیت'' باقی ہے۔ مذہبی اور رثائی شاعری میں تجم کا مقام اہم ہے۔ جناب آغا محمد حسین نے تجم کی رباعی گوئی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھیں غیر معمولی مفکر قرار دیا۔''

پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ ''آج جس کتاب کی رسم اجراء انجام دی گئی ہے وہ اُردو ادب میں ایک مستقل اضافہ ہے۔ ان دو جلدوں پر تحقیق اور تنقید کا عمل جاری رہے گا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تجم آفندی کی شخصیت اور شاعری ہماری تنقید کا اہم موضوع ثابت ہوگی۔'' پروفیسر

قمر رئیس نے کہا کہ ''رثائی ادب میں عظیم شاعری کے امکانات موجود ہیں۔ عالمی ادب کے سرمایہ کو سامنے رکھ کر مراثی کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔'' پروفیسر صادق نقوی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے اور آخر میں شکریہ ادا کیا۔ محبوب حسین جگر ہال، احاطہ روزنامہ ''سیاست'' میں منعقدہ اس تقریب میں دیگر اصحاب اور صاحبان ذوق کے علاوہ عالمی اُردو کانفرنس میں بیرونِ حیدرآباد اور بیرونِ ہند سے شرکت کے لیے آئے گئی مندوبین نے شرکت کی۔

''ٹائمز میگ'' ٹورنٹو

15 / جون 2006ء

''جشن مجاہدین اُردو'' کے عنوان حسن آرا ٹرسٹ کے زیراہتمام عالمی مشاعرہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) کو شاندار تقریب میں عالمی مجاہد اُردو ایوارڈ سے نوازا گیا

نئی دہلی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم میں جناب احمد فراز پاکستان کی صدارت میں ایک عالمی مشاعرہ منعقد ہوا۔ ''جشنِ مجاہدین اُردو'' عنوان سے ہونے والے اس پروگرام میں عالمی شہرت کے مالک محقق اعظم ماہر رثائی ادب ڈاکٹر تقی عابدی کینیڈا کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حسن آرا ٹرسٹ کی جانب سے عالمی مجاہد اُردو ایوارڈ بدست جناب محمد اشرف فاطمی، وزیر ایچ آر ڈی حکومت ہند پیش کیا گیا۔ محترمہ نرملا دیش پانڈے ایم پی، جناب ظہیر امروہوی نے ڈاکٹر تقی عابدی کا تفصیلی تعارف کرایا اور کہا کہ ''کینیڈا جیسی جگہ پر رہ کر آپ نے گزشتہ بیس سال میں تیس سے زیادہ علمی ادبی اور تحقیقی گرانقدر تصانیف اُردو کو پیش کی ہیں اور وہاں آپ کی لائبریری میں دس ہزار سے زیادہ اُردو کتابیں ہیں اس طرح آپ مستقل اُردو کے لیے جدوجہد میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی تقریر میں کہا: ''ہم کہیں اور چلے جائیں اپنی زبان اُردو اپنی تہذیب اور ثقافت کو فخر کے ساتھ اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ''ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے..... '' آپ نے مزید کہا کہ ''مجھے دُنیا کے مختلف ممالک سے ایوارڈ ملے ہیں لیکن یہ دہلی یعنی سلطنت اُردو معلیٰ میں ملنے والا ایوارڈ میرے لیے ایوارڈ معلیٰ ہے۔''

عالمی مشاعرے کی نظامت کے فرائض ساغر خیامی نے انجام دیے چند شعراء کے

منتخب اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

اس سے پہلے کہ بے وفا ہو جائیں
کیوں نہ اے دوست ہم جدا ہو جائیں
بندگی ہم نے چھوڑ دی ہے فراز
کیا کریں لوگ جب خدا ہو جائیں
(احمد فراز، پاکستان)

بھٹکے ہوئے منزل پہ پہنچ جائیں گے خود ہی
رستوں سے اگر راہ نماؤں کو ہٹا دو
لوگوں میں فقط عیب نظر آتے ہیں جس کو
اس کو بھی کبھی آئینہ خانے میں بٹھا دو
(ڈاکٹر تقی عابدی، کینیڈا)

فصل جنوں کے باب میں ہم نے جو بھی کہانی لکھی ہے
منظر نامہ بیرونی ہے دسر بات ہماری اپنی ہے
اپنے دیس سے آنے والے دیس کا کچھ احوال سنا
خوف کی چادر اوڑھے بیٹھی کی حالت کیسی ہے
(عاشور کاظمی، لندن)

نئی دہلی یہاں حسن آرا ٹرسٹ کی جانب سے ''جشن مجاہدین اُردو'' عنوان سے عالمی مشاعرہ 20رمئی کو منعقد ہوا تھا اس کا دوسرا اجلاس عالمی بزم نعت ومنقبت اور نوحہِ اسلام عنوان سے 22رمئی کو فائن آرٹ آڈیٹوریم جامعہ ملیہ میں سات بجے شام منعقد ہوا۔ اس اجلاس کو عالمی شہرت کے مالک شاعرِ رثائی ادب ریحان اعظمی پاکستان کے نام منسوب کیا گیا تھا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب عاشور کاظمی لندن نے شرکت فرمائی افتتاح جناب احمد فراز پاکستان نے کیا اور صدارت کے فرائض جناب ڈاکٹر تقی عابدی کینیڈا نے انجام دیئے اور نظامت ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کی۔ مولانا سید جلال حیدر صاحب قبلہ نے تلاوت کلام پاک سے کیا اس کے بعد مہمانوں کا استقبال جناب ندیم عباس زیدی نے کیا۔

شعرا کے کلام کا انتخاب مندرجہ ذیل ہے احمد فراز صاحب نے پہلے نعت پیش کی۔
میرے ضمیر نے قاتل کو نہیں بخشا، میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے، اس کے بعد سلام پیش کیا۔

حسن تجھ کو کہیں کیا سلام ہم جیسے
کہ تو عظیم ہے ننگ و نام ہم جیسے
خطیب شہر کا مسلک ہے بیعت سلطاں
ترے لہو کو کریں گے سلام ہم جیسے

•••

ہوتے رہیں گے ہاتھ قلم یا علیؑ مدد
جھکنے نہ دیں گے حق کا علم یا علیؑ مدد
بارود کے دہانے پہ بیٹھی ہوئی یہ قوم
تاریخ کر رہی ہے رقم یا علیؑ مدد

•••

بے یقینی کے دھندلکوں میں ہے امت تیری
آج تو کل سے بھی زیادہ ہے ضرورت تیری
(عاشور کاظمی، لندن)

بدل گیا ہے مقدر تیرے حوالے سے
دعا جو آئی ہے لب پر ترے حوالے سے
ترے وسیلے سے ہم نے خدا کو پہچانا
سمجھ میں آئے پیمبر تیرے حوالے سے
(ہمایوں ظفر زیدی، مسقط)

نکلے تھے ہم خلوص کا اک آئینہ لیے
لوگوں نے اپنے ہاتھ میں پتھر اٹھا لیے
(ڈاکٹر ماجد دیوبندی)

خون انسان کا بہنے سے جو خوش ہوتا ہے
نام اس کا کہیں مودی کہیں بش ہوتا ہے
(شکیل حسن شمسی)

قہقہے دے رہے ہیں داد اس کی
غم چھپانا بھی غم گساری ہے
(متین امروہوی)

باغ اُردو میں قدم رکھ ہی نہیں سکتی خزاں
نہ سہی میرؔ مگر دبدبۂ میرؔ تو ہے
(نایاب دہلوی)

تمہاری قسمت اک ایسا دن ہے کہ شام جس کی کبھی نہ ہوگی
ہماری قسمت اک ایسی شب ہے کہ جس کی کوئی سحر نہیں ہے
(سلیم امروہوی)

جو اپنے ہاتھ میں محلات کی کنجی نہیں رکھتا
وہ اپنے پاس جینے کے لیے کچھ بھی نہیں رکھتا
(محمد مہران)

دل ان کے جو نام کر رہے ہو
تم خود کو عام کر رہے ہو
(پیمبر نقوی)

اس موقع پر مشہور پاکستانی غزل کی سنگر محترمہ گلشن آراء سید نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ بے حد کامیابی کے بعد مشاعرے کا اختتام ہوا اور آخر میں کمال حیدر نے شعراء سامعین غیر ملکی مہمانان کے شکریہ کے ساتھ آئی سی سی آر اور صوفی فاؤنڈیشن اُردو شعراء ادبا اور دیگر شعبوں میں اُردو کی خدمت کرنے والے گزشتہ 700 سال میں ہونے والی شخصیت کی شاندار تصاویر کی نمائش بھی کی گئی جسے بہت پسند کیا گیا، کیوں کہ صدر دروازے سے ہی دونوں جانب قدآور تصاویر آویزاں تھیں اور پھر ہاؤس میں چاروں جانب اہلِ اُردو کی

تصاویر مع اشعار اور جشن ولادت وفات لگی ہوئی تھیں۔ تصاویر کی نمائش کا افتتاح غیر ملکی شعراء نے شمع روشن کر کے کیا۔

شکستہ خواب جیسا ہوگیا ہوں
لٹے اسباب جیسا ہوگیا ہوں
ضرورت ہی نہیں جس کی کسی کو
ادب آداب جیسا ہوگیا ہوں
(ڈاکٹر ریحان اعظمی، پاکستان)

آگہی ایسی ملی دیدار والے ہوگئے
آپ کی صحبت میں سب کردار والے ہوگئے
سر پہ جن کے تاج تھا ہاتھوں میں اب کشکول ہے
در بدر رہتے تھے جو دربار والے ہوگئے
(خالد فریدی، سعودی عرب)

آپ ایٹم کو توڑ سکتے ہیں رخ ہواؤں کا موڑ سکتے ہیں
قتل و غارت گری و ظلم ستم کیا یہ عادات چھوڑ سکتے ہیں
(ڈاکٹر اقبال مرزا، لندن)

خون روئے گا عمر بھر بے حد دیکھ مجھے وفا نہ کر بے حد
ایک عالم تھا منتظر جن کا ان کی قسمت میں تھا سفر بے حد
(ظفر زیدی، مسقط)

آئین تو ہم روز بدل سکتے ہیں اخلاق میں ترمیم نہیں ہوسکتی
ہم روز نئے ملک بنا سکتے ہیں تہذیب کی تقسیم نہیں ہوسکتی
(پنڈت آنند موہن گلزار زتشی دہلوی)

بولی بیوی اپنے شوہر سے زندگی کیوں عذاب کرتے ہیں
غیر کرتے ہیں حسن کا دیدار آپ میک اپ خراب کرتے ہیں
(ساغر خیامی)

کبھی بھی چھوڑ کے اپنی زمیں نہیں جاتے
ہمیں بلاتی ہے دُنیا نہیں جاتے
مہاجرین سے اچھے تو پرندے ہیں
شکار ہوتے ہیں لیکن کبھی نہیں جاتے

(منور رعنا)

عاشقی بھی دوستو کیا شاعری سنگیت تھی
راگ توڑی جانے کیا تھا جانے کیا گاتے رہے
زندگی بھر عشق کا اظہار کرنے کے لیے
وہ بھی ہکلاتے رہے اور ہم بھی ہکلاتے رہے

(پاپولر میرٹھی)

کچھ پہلوؤں کو میری نظر دیکھتی نہ تھی
دُنیا بری تو تھی مگر اتنی بری نہ تھی

(مخمور سعیدی)

رہنا آتا نہیں زمیں پہ جنھیں
بات کرتے ہیں آسمانوں کی

(پروفیسر انوپ سنگھ ناداںؔ)

شاعری شوق نہیں میرا امیروں کی طرح
میرے اشعار بھی ہوتے ہیں فقیروں کی طرح

(ڈاکٹر مدھر ما سنگھ)

سنورتے ہیں وہ دیکھ کر آئینے کو
سنور جائیں تو آئینہ دیکھتا ہے

(فیاضؔ فاروقی)

عجب طرح کی ہے اُردو زبان کی خوشبو
جو بولتا ہے وہی عطردان لگتا ہے
(ڈاکٹر عظیم امروہوی)

کون کہتا ہے کہ بادیدہ غم ملتے ہیں
مسکرا کر غم حالات سے ہم ملتے ہیں
(شیاما سنگھ صبا)

نئی فضا نئی رسم وفا نکلتی ہے
جہاں قیام کریں کربلا نکلتی ہے
(ڈاکٹر ناشر نقوی)

یاعلیؑ کہہ کے ہر اک بزم سجا دیتا ہوں
سونے والوں کو بہرحال جگا دیتا ہوں

• • •

تجھ سے رشتہ کرلیا ہے سارے رشتے توڑ کر
خاک پا چن لی تری ہیرے، جواہر چھوڑ کر
یہ محمدؐ کا اثر ہاتھ میں شبیرؑ کے
رکھ دیا بیعت کے پنجے کو ابد تک موڑ کر
(ڈاکٹر تقی عابدی، کینیڈا)

زلف و آبرو نہیں اوصاف حمیدہ لکھو
جیسا قرآن نے سمجھا انھیں ویسا لکھو
چاند لکھنا ہے تو نعلین محمدؐ لکھو
کیوں بھلا چاند کو ان کا رخ زیبا لکھو
ذکر جس چھت کے تلے سید ابرارؐ کا ہو
اس کو پھر چھت نہ کہو گنبد خضراء لکھو
(ڈاکٹر ریحان اعظمی، پاکستان)

حمد خدا صفات نبیؐ جرأت حسینؑ
الفاظ سارے تیر تھے زینبؑ کمان تھی
جب سر قلم ہوئے تو زبانیں بھی سوگئیں
زینبؑ ہر اک شہید کی گویا زبان تھی
(ڈاکٹر اقبال مرزا، لندن)

پھر دل نے کیے نعت محمدؐ کے ارادے
یارب میرے تخیل کو احرام پہنا دے
(نایاب دہلوی)

زندگی کی راہوں میں رہبری ضروری ہے
تیرگی مٹانے کو روشنی ضروری ہے
طے نہیں ہوا بیعت پار ہوگئی تیری
اے یزید تجھ کو خودکشی ضروری ہے
(سلیم امروہوی)

آخر میں کمال حیدر جنرل سکریٹری ٹرسٹ نے سب کا شکریہ ادا کیا اور تمام مہمانان وسامعین نے نذر میں شرکت فرمائی، گیارہ بجے پوری کامیابی کے بعد اجلاس عالمی اور یادگار پروگرام کا اختیام ہوا۔

روزنامہ ''قومی آواز'' نئی دہلی

16/دسمبر 2006ء

غالبؔ کی شخصیت اور فکر میں ہندوستانیت رچی بسی تھی: ارجن سنگھ

سالانہ غالبؔ تقسیم انعامات تقریب میں مرکزی وزیر انسانی وسائل کا اظہار خیال

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کو اپنے دور کا منفرد اور عظیم و مقبول شاعر اور مفکر قرار دیتے ہوئے مرکزی وزیر انسانی وسائل مسٹر ارجن سنگھ نے آج کہا کہ ''غالبؔ کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ انھوں نے سماج کے ہر طبقہ کے ساتھ اپنے خیالات کو جوڑا تھا جس کا اثر آج بھی ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''ہندوستانیت غالبؔ کی شخصیت میں رچی بسی تھی۔ اور وہ اپنی زندگی میں بھی کچھ کم مقبول نہیں تھے۔'' مسٹر ارجن سنگھ نے کہا کہ ''غالبؔ فارسی کے بھی بڑے ادیب تھے جو ہمارے کئی پڑوسی ملکوں کی زبان ہے۔ ایران، افغانستان، ازبکستان جہاں بھی فارسی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے وہاں غالبؔ بھی ہندوستان کے سفیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے سالانہ غالبؔ انعامات تقسیم کی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے مسٹر ارجن سنگھ نے کہا کہ ''غالبؔ پر بہت کام ہوا پھر بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ ہم اس عظیم شخصیت کا حق پوری طرح ادا کر چکے ہیں یا نہیں۔''

قبل ازیں انھوں نے اُردو تحقیق و تنقید کے لیے پروفیسر حامدی کاشمیری کا غالبؔ انعام 2006ء علالت کی وجہ سے ان کی غیر موجودگی میں غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی کو پیش کیا۔ ان کے بعد فارسی تحقیق و تنقید کے لیے پروفیسر کبیر احمد جائسی کو اُردو نثر کے لیے پروفیسر اسلم پرویز کو، اُردو شاعری کے لیے بلراج کومل کو، علمی خدمات و سائنس کے لیے اظہار اثر کو، اُردو ڈرامہ کے لیے شاہد انور کو، اور مجموعی خدمات کے لیے

علیم صبا نویدی کو پیش کیے۔

ایوان غالبؔ آڈیٹوریم میں منعقدہ تقریب کی صدارت ہریانہ کے گورنر پروفیسر اے آر قدوائی نے کی۔ اس موقع پر مسٹر ارجن سنگھ نے غالب انسٹی ٹیوٹ کی چار کتابوں ''غالبؔ اور رام پور''، ''غالبؔ کے منتخب فارسی مکتوبات''، ''تفہیم غالبؔ'' [شمس الرحمٰن فاروقی] اور ''غالب نامہ'' کے علاوہ ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''غالبؔ دیوانِ نعت ومنقبت'' کا اجراء بھی کیا۔ بعدازیں پاکستان کی معروف گلوکارہ گلشن آراء سید نے غالبؔ کا کلام پیش کیا۔ اس تقریب میں ملک کے معروف اسکالر، صوفی، ادباء، شعراء نے شرکت کی۔ جن میں پاکستان سے آئے ہوئے مرزا حامد بیگ، اصغر علی سید، ہالینڈ سے اسد مفتی، کینیڈا سے آئے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم، کشمیری لال ذاکر، خواجہ حسن ثانی نظامی، صدیق الرحمٰن قدوائی، محمد شفیع قریشی، ایس. اے. ایچ عابدی، پروفیسر علی احمد فاطمی، جسٹس بدر دریز احمد، پروفیسر نذیر احمد، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، ہمایوں ظفر زیدی، خورشید اکرم، انجم عثمانی، انیس امروہوی، عزیز برنی، اسد رضا، نسیم گنگوہی، نگار عظیم وغیرہ شامل تھے۔ کل سے ایوان غالبؔ میں دوروزہ بین الاقوامی غالب سیمینار منعقد ہوگا اور کل شام 6 بجے عالمی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

ممتاز عالم رضوی

روزنامہ ''ہندوستان ایکسپریس'' دہلی

17/دسمبر 2006ء

غالبؔ کو سمجھنے کے لیے ان کے لہجہ سے واقفیت ضروری ہے

سالانہ بین الاقوامی غالبؔ سیمینار میں معروف ادیب تقی عابدی کا اظہارِ خیال

''غالبؔ کو سمجھنے کے لیے ان کے لہجہ سے واقفیت ضروری ہے۔ میں کیا سمجھ رہا ہوں یہ اہم نہیں ہے، بلکہ غالبؔ کیا سمجھا رہا ہے یہ زیادہ اہم ہے۔'' ان خیالات کا اظہار کینیڈا کے معروف ادیب و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی نے کیا۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے منعقدہ سالانہ بین الاقوامی سیمینار بہ موضوع ''بیسویں صدی کا تخلیقی ذہن اور غالبؔ'' کے دوسرے روز دوسرے اجلاس کو خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنا مقالہ ''غالبؔ کا نعتیہ طرزِ بیان اور موجودہ عہد'' پیش کرتے ہوئے مزید کہا کہ ''صرف تاثراتی تنقید سے غالب کی تفہیم ممکن نہیں ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''غالبؔ جب شعر خلق کرتا ہے تو بہت ساری صنعتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ میں غالب کے ایک وکیل کی حیثیت سے یہ پوچھتا ہوں کہ آخر غالبؔ کی نعتیہ شاعری پر گفتگو کیوں نہیں کی گئی، صرف اس لیے کہ وہ شرابی تھے۔ کیا اس وجہ سے نعت کے 281 اشعار نظر انداز کر دیے جائیں گے۔'' انھوں نے کہا کہ ''برصغیر میں افلاک کی سیر کرنے والا اگر کوئی شاعر ہے تو وہ صرف غالبؔ ہے۔''

پہلے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ممتاز افسانہ نگار جوگیندر پال نے کہا کہ ''مجھے لگتا ہے کہ آج کے فکشن سے غالبؔ کا گہرا تعلق ہے۔ بڑا لکھنے والا کسی طبقہ، کسی ملک، کسی ایک عہد کے لیے نہیں ہوتا اور غالبؔ ایسا ہی فن کار ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''بڑے شاعر کی کوئی شرح نہیں ہوتی۔'' انھوں نے کہا کہ ''بڑا لکھنے والا اپنے طور پر آپ کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔''

ڈاکٹر مصحف اقبال توصیفی نے اپنا مقالہ ''غالب میرا عہد میری شاعری'' پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''بیسویں صدی میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ غالبؔ کی دین ہے۔ غالب نے

نیا آسمان اور نئے افق دیے ہیں۔ غالبؔ کے امکانات کی دُنیا اور تعبیرات کا جو نقشہ ہے اس سے میں کیا، آنے والی نسلیں بھی فیضیاب ہوتی رہیں گی۔"

پروفیسر شمیم حنفی نے اپنا مقالہ "غالبؔ اور غالبؔ کی دلّی" پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ "غالب کے یہاں آپ بیتی اور شہر بیتی دونوں ہیں، وہ آپ بیتی شاعری کے ذریعہ اور شہر بیتی خطوط کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک ساتھ کئی عہد سانس لیتے ہیں۔ وہ کبھی ایک سمت تو کبھی کئی سمتوں میں سفر کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ دہلی کی اچھی اور بری دونوں تصویر بناتے ہیں۔ غالبؔ وہ ہیں جس نے نئی بیداری کا خیر مقدم کیا۔"

ڈاکٹر حسن عباس نے کہا کہ "غالب نئے عہد کا پہلا شاعر بھی تھا اور اپنے عہد کا آخری شاعر بھی۔" صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسن نے کہا کہ "ان پڑھے گئے تمام مقالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ کے یہاں کس قدر تضادات ہیں اور یہی تضادات غالبؔ کا کمال اور کمال فن ہے۔ انھیں کو ملا کر ایک عظیم شخصیت بنتی ہے اور یہ تضادات ایک وحدت بن جاتی ہے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر سید امیر حسن عابدی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر نذیر احمد نے جب کہ دوسرے، تیسرے اور چوتھے اجلاس کی صدارت میں پروفیسر محمد حسن، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، سید شریف الحسن نقوی، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر اسلم پرویز وغیرہ شامل ہیں۔ جب کہ مقالہ نگاروں میں افسر رہبین، ڈاکٹر سرور الہدیٰ، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر اصغر ندیم سید، ڈاکٹر خالد جاوید، اقبال مجید، زبیر رضوی اور علیم صبا نویدی شامل ہیں۔ مقالوں سے اندازہ ہوا کہ سیمینار اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر اشفاق عارفی اور ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیے۔ اس سلسلے کی کڑی میں شام کو ایک عالمی مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ملک اور بیرون ملک کے استاد اور ممتاز شاعروں نے اپنے کلام پیش کیے۔

ف۔س۔اعجاز
ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ
23/دسمبر 2006ء

کلکتہ میں سید تقی عابدی کی کتاب ''غالبؔ دیوانِ نعت و منقبت'' کا اجرا

ماہنامہ ''انشاء'' کے زیر اہتمام پریس کلب کولکاتہ میں پہلی بار ہفتہ 23/دسمبر کو ایک اُردو کتاب ''غالبؔ دیوانِ نعت و منقبت'' کا اجرا ہوا جس کے مصنف کینیڈا کے دانشور و محقق سید تقی عابدی ہیں۔ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کے زیر صدارت رسم اجرا مغربی بنگال اسمبلی کے اسپیکر جناب ہاشم عبدالحلیم نے انجام دی۔ مہمانانِ خصوصی جناب کوکب میرزا اور محترمہ شہناز نبی تھے۔

مدیر ''انشاء'' ف۔س۔اعجاز نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ تقریب کے شرکا کو گلدستے پیش کیے جانے کے بعد ف۔س۔اعجاز نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تعارف پیش کیا۔ موصوف دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک معزز مجسٹریٹ تھے۔ حیدرآباد سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد برطانیہ سے ایم۔ایس، امریکہ سے ایف سی اے پی اور کینیڈا سے ایف آر سی پی مکمل کی۔ آپ اونٹاریو، کینیڈا میں مقیم ہیں۔ شاعری، ادبی تحقیق و تنقید ان کا ذوق اور رثائی ادب میں ان کی مہارت قابل داد ہے۔ دبیر کے مرثیوں کا مقام و مرتبہ انھوں نے کافی بلند کیا ہے۔ علامہ نجم آفندی کے بارے میں ''کائناتِ نجم'' دو جلدوں میں شائع کی ہے۔ اس کے علاوہ انیسؔ، اقبالؔ، انشاء کے ادب پر وافر تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ آپ تیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔

ف۔س۔اعجاز نے غالبؔ کے سفر کلکتہ کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے سید تقی عابدی کے ''غالبؔ دیوانِ نعت و منقبت'' کے پس منظر اور معنویت کو روشن کیا۔ انھوں نے کہا کہ

''غالبؔ کی فارسی اور اُردو نعتوں اور منقبتوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے اور غالبؔ کے پسندیدہ شہر کلکتہ میں اہم ترین ادبی و علمی شخصیتوں کی موجودگی میں اس کا اجرا کلکتہ والوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔'' ف.س.اعجاز نے کہا کہ ''800 صفحات کے ''غالبؔ دیوانِ نعت ومنقبت'' کی چند جلدیں ہمیں تین دن قبل ڈاک سے موصول ہوئیں۔ اجرا کے پروگرام کی تیاری پیشتر کی جا چکی تھی۔ سید تقی عابدی کل کلکتہ پہنچے تو اپنا تازہ ترین مجموعۂ مضامین ''سبدِ سخن'' بھی ساتھ لیتے آئے۔ اور آج ان دونوں وقیع کتابوں کا اجرا مغربی بنگال اسمبلی کے اسپیکر عزت مآب ہاشم عبدالحلیم صاحب کے مبارک ہاتھوں سے انجام پائے گا۔ رسم اجرا سے قبل ف.س.اعجاز نے تقی عابدی کی کتاب ''کائناتِ نجم'' سے علامہ نجم آفندی کی غالبؔ سے منسوب مندرجہ ذیل دو رباعیاں پڑھیں:

کیوں کر نہ کریں ہم احترامِ غالبؔ
کچھ کم ہے یہ حاصلِ کلامِ غالب
دُنیا کے ہر اک ملک ہر اک ملّت میں
تبلیغ ہے اُردو کی بنامِ غالبؔ

•••

مدت سے ہیں ہم مدح سرائے غالبؔ
دل میں ہے ہر اہل دل کے جائے غالب
یورپ میں بھی ہے آج ہماری تقلید
پہنچی ہے کہاں کہاں نوائے غالبؔ

جناب ہاشم عبدالحلیم نے دونوں کتابوں کا اجرا فرمایا۔ اجرا کے بعد انھوں نے اُردو سے اپنی نسبت بڑی سچائی سے بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''جسے اُردو سے واقفیت نہیں وہ بڑا بدنصیب ہے۔ اُردو زبان ایک بے حد شیریں اور موثر زبان ہے۔ جو لوگ اسے صرف مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ یہ زبان ہر مذہب کے ماننے والوں کی زبان ہے۔'' اسپیکر صاحب نے کہا کہ ''ایران سوسائٹی'' سے میری خاندانی وابستگی ہے چناں چہ ادبی علوم کے شعبے میری توجہ کے دائرے سے باہر نہیں ہیں۔ البتہ میری بیوی اُردو

اخبارات، کتابیں اور رسالے پڑھتی ہیں۔ اور اپنے مطالعہ کا علم مجھے سونپ دیتی ہیں۔ مجھے سید تقی عابدی اور سید یحییٰ نشیط جیسے ادیب کی کلکتہ آمد پر اور ان کے درمیان اپنی موجودگی پر بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ عابدی صاحب کا ''غالب دیوانِ نعت و منقبت'' میں نے اچھی طرح دیکھا ہے۔ اور ان کی اس عالمانہ تحقیق کی قدر آنکنے میں مجھے وقت نہیں لگا۔ اس سلسلے کو کلکتہ کے عالموں، اُردو اکادمی اور یونیورسٹی کو آگے بڑھانا چاہیے۔ میں چاہوں گا کہ عابدی صاحب دوبارہ جب کلکتہ تشریف لائیں تو یہاں ان کا قیام کچھ دراز ہوتا کہ ہمیں ان کی خاص پذیرائی کا موقع حاصل ہو۔'' ہاشم صاحب نے کہا: ''میں کینیڈا ان کے شہر بھی کبھی جاتا ہوں۔ اگلے دورے میں وہاں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو مجھے خوشی ہوگی۔'' ہاشم صاحب نے کہا: ''کلکتہ میں اُردو رسائل و ادب کی رفتار اب پہلے سے تیز ہوگئی ہے اور ماہنامہ ''انشاء'' کا اس میں بڑا حصہ ہے۔''

اس موقع پر مہمان خصوصی سابق پروفیسر، شعبۂ انگریزی، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ڈاکٹر کوکب میرزا نے کہا کہ ''تقی عابدی صاحب نے 30 کتابیں لکھی ہیں اور یہ ان کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ اب سے دس بارہ سال قبل تقی عابدی صاحب سے لوگ واقف نہ تھے لیکن آج انھیں سب جانتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی کتابیں ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ عابدی صاحب کی سات آٹھ کتابیں ان کے پاس ہیں جن کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ ان کے مقام و مرتبہ سے آشنا ہو پائے ہیں۔ ان کی ہر کتاب آج کل کی ایک پی. ایچ. ڈی کتاب پر بھاری کہی جائے گی۔ اور اتنی ساری کارآمد کتابوں کا مصنف کلکتہ میں یقیناً بڑی پذیرائی کا مستحق ہے۔ ''غالب دیوانِ نعت و منقبت'' تقی عابدی کا ایسا منفرد کارنامہ ہے جس پر کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے انھیں اعزازی ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی جائے تو یہ بہت اچھی بات ہوگی۔'' میرزا صاحب نے کہا کہ ''جس طرح دیگر یونیورسٹیوں میں ایسے بڑے کارنامے انجام دینے والوں کو اعزازی ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کرنے کی گنجائش ہے اس طرح کلکتہ یونیورسٹی میں بھی ہونی چاہیے۔'' انھوں نے محترمہ شہناز نبی سابق صدر شعبۂ اُردو کلکتہ یونیورسٹی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

میرزا صاحب کے گھر میں شادی کا ماحول تھا، پچھلے روز ان کے فرزند کی شادی

انجام پائی تھی۔ اس کے باوجود مدیر ''انشاء'' کی دعوت اور تقی عابدی صاحب کی کتاب نے انھیں شریکِ بزم ہونے پر مجبور کر دیا جس کے لیے مدیر ''انشاء'' نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ میرزا صاحب نواب واجد علی شاہ کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ستیہ جیت رے کی فلم ''شطرنج کے کھلاڑی'' کی اسکرپٹ کے سلسلے میں ان کی خدمت فلم میں اکناج کی گئی ہے۔

شاعرہ، نقاد اور ڈرامہ نگار سابق صدر شعبۂ اُردو کلکتہ یونیورسٹی ڈاکٹر شہناز نبی (موجودہ وائس چیئر پرسن مغربی بنگال اُردو اکاڈمی) کئی کتابوں کی مصنف ہیں جن میں سے ایک کتاب غالبؔ کے سفر کلکتہ کے بارے میں ہے۔ انھوں نے تقی عابدی صاحب کی کتاب ''غالبؔ دیوانِ نعت و منقبت'' کے محاسن اور انفرادیت اور موضوعی اولیت پر انھیں دلی مبارک باد پیش کرتے ہوئے میرزا صاحب کی اعزازی ڈی لٹ کی تجویز پر کہا کہ ''اس بارے میں پہلے سے ہماری یونیورسٹی کے ضابطے کا ہمیں علم نہیں ہے۔ ایسی کوئی نظیر ہمارے سامنے نہیں ہے۔ اس بارے میں یونیورسٹی کے اصولوں کا پتہ لگانے کے بعد ہی ایسی کسی تجویز پر عمل درآمد کے سلسلے میں کچھ کہا جا سکتا ہے۔'' شہناز نے کہا کہ روز نئی کتابیں نکلتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر کتاب کا ہمیں علم ہو یا ہم نے ہر کتاب دیکھی ہو۔ لیکن تقی عابدی صاحب کی یہ کتاب واقعی ایسی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ علمی استفادہ کیا جا سکے۔ یہ اپنے موضوع پر اچھوتی کتاب ہے۔''

ف. س. اعجاز نے نعت، منقبت، قصیدہ وغیرہ اصناف کی تعریف پیش کرتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی کہ ہومر، درجل، ملٹن، گوئٹے، دانتے، رومیؔ، فردوسیؔ، حافظ شیرازی، سعدیؔ، کالی داس، تلسی داس، سورداس وغیرہ کا ادب اعلیٰ اور ارفع ترین ادب قرار دیا جاتا ہے جب کہ وہ مذہب سے جڑا ہوا ہے۔ اسی طرح انیسؔ، اقبالؔ اور دبیر کی شاعری یہ ثابت کرتی ہے کہ ادب کا مذہب سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ گوتم بدھ، رام چندر جی، سری کرشن، ابراہیمؑ، عیسیٰؑ اور تمام ادیانِ عالم کے پیشواؤں سے منسوب ادبی شاہکار ملتے ہیں۔ اسی طرح پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ سے عشق کا اظہار نعتوں اور مناجاتوں میں ہوتا ہے۔ صنفِ مرثیہ پر پچھلے چند سالوں میں بڑا کام ہوا ہے، لیکن نعت کو تحقیق و تنقید کے موضوع کے طور پر ابھی شناخت کیا جا رہا ہے۔ اس کام کی ابتدا جن کے ہاتھوں ہو رہی ہے ان میں سے دو

حضرات آج ہمارے مہمان ہوئے ہیں۔ سید یحییٰ نشیط جن کی اس موضوع پر ایک کتاب پاکستان سے شائع ہونے والے صبیح رحمانی کے جریدہ ''نعت رنگ'' نے شائع کی۔ اور دوسری شخصیت تقی عابدی صاحب کی ہے۔ یہ لوگ نعت کی تاریخی اور سائنسی حیثیت متعین کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔ ف.س. اعجاز نے کہا کہ ''نعت کہنے کے لیے مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے، جس طرح بھجن لکھنے کے لیے ہندو ہونا ضروری نہیں ہے، لیکن ہر دو صورت میں متعلقہ مذہب کی قدروں کے لیے دل میں احترام ہونا لازمی ہے۔ ف.س. اعجاز نے ''غالب دیوانِ نعت و منقبت'' پر ایک مختصر مضمون بھی سنایا۔ مضمون میں غالب کے دینی مسلک کو جس طرح وہ عابدی صاحب کی کتاب میں اُجاگر ہوا ہے واضح کیا گیا۔

اس کے بعد مصنف سید تقی عابدی نے اپنی کتاب کا نظریہ مفصل اور مدلل بیان کیا۔ ان کے مباحث کے تنوع اور تاریخ سے ان مباحث کی ہم رشتگیکی کیفیت نے سامعین کو اچھی طرح باندھ لیا۔ ان کی عالمانہ تقریر نے انھیں بے حد متاثر کیا۔ ف.س. اعجاز کے مضمون پر روشنی ڈالتے ہوئے تقی عابدی نے غالب کے پانچ نعتیہ اُردو اشعار کی تشریح اس ڈھنگ سے کی کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ مثنوی ''ابرِ گہر بار'' پر بھی موصوف نے روشنی ڈالی۔ غالب کے حضرت علیؓ سے عشق کے مختلف پہلوؤں اور اس عشق کی حقیقت کا غیر رسمی عقلی جائزہ تقی عابدی نے پیش کیا۔

عابدی صاحب کی تقریر کے بعد ف.س. اعجاز نے چند باتوں کی طرف سامعین کی توجہ دلائی۔ پہلی بات یہ کہ غالب کی عظمت ہر دور میں ان کے فن پر لوگوں کے اختلاف رائے کی وجہ سے ہے۔ اس سے ادب میں اختلاف رائے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ چناں چہ تقی عابدی نے بھی اپنے اختلافی آرا کے ذریعہ غالب کے مسلک کی مختلف جہات کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری بات یہ کہ مغرب سے اب تک کئی شعرا اور افسانہ نگار کلکتہ میں ہمارے مہمان ہو چکے ہیں۔ سید تقی عابدی مغرب سے آئے پہلے نقاد و محقق ہیں جنھیں کلکتہ کا مہمان ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اور یہ ہمارے لیے اہم اور پر مسرت بات ہے۔

ف.س. اعجاز نے ڈاکٹر یحییٰ نشیط کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ ''یہ بات آج کے دور

میں کچھ ناقابل یقین اور مثالی سی ہے کہ یحییٰ صاحب نے مجھ خاکسار ادب پر برسوں کی ریاضت سے ایک ضخیم کتاب لکھی، جو 2003ء میں شائع ہوئی۔ لیکن دیکھیے ان سے میری پہلی ملاقات کل ہوئی جب یہ کلکتہ تشریف لائے۔ خلوص اور یگانگت کے اس تعلق پر بھلا کون نہ فدا ہوگا۔ سید تقی عابدی کے فن کے اثبات کے لیے میری دانست میں یحییٰ نشیط سے زیادہ موزوں کوئی نہ تھا اور تقی عابدی خود ان کے قدر دان ہیں۔ اس لیے میں نے انھیں مہاراشٹر کے ایک دور دراز مقام جلگاؤں سے مدعو کیا، جہاں یہ شہروں کے شور اور آلائش سے بچ رہ کر ادب کی تنظیم میں مشغول رہتے ہیں اور صوفیانہ گزر بسر کرتے ہیں۔ ان کا تنقید و تحقیق کا اختصاص کچھ بھی ہو لیکن ان کے موضوعاتِ تحریر بہت متنوع ہیں۔

آخر میں صدر جلسہ کی حیثیت سے سید یحییٰ نشیط نے سامعین سے خطاب فرمایا۔ گرچہ وہ ایک مضمون لکھ کر لائے تھے لیکن انھوں نے اپنے نکات اپنی تقریر میں ہی روشن کردیے۔ انھوں نے تقی عابدی کو غالبؔ کا تقدیسی اصناف پر سارا کلام ''غالب دیوانِ نعت ومنقبت'' میں یکجا کرنے پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے کتاب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا: عابدی صاحب نے دعاء کے ذیل میں ایک مناجات دو فاتحہ، دعائے صباح اور دعائے حضرت سجادؑ کے فارسی ترجمے کا ذکر کیا ہے۔ حضرت سجاد امام زین العابدینؑ کی دعاء کا منظوم ترجمہ جو غالبؔ کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے بڑا موثر اور رقت انگیز ہے۔ یہ وہ امام ہیں جن کے فقر کے سامنے سطوتِ خسروی بھی ماند پڑ گئی تھی۔ یہ وہ امام ہیں جن کے متعلق فرزدق نے ہشام بن عبدالملک کو کہا تھا۔

''یہ اللہ کے بندوں میں سے بہترین کی اولاد ہے۔ یہ متقی پاک صاف اور سردار ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کے قدم کو سارا مکہ جانتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کو بیت اللہ جانتا ہے۔ اس کو حل وحرم پہچانتے ہیں۔ یہ وہ شخص ہے کہ جب حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے اس کے قریب جائے تو حجر اسود کا کونہ اس کے ہاتھوں کا استعلام کرے (یعنی ہاتھوں کو بوسہ دے)۔ یہ وہ شخص ہے جو شرم کی وجہ سے اپنی آنکھ نیچی رکھتا ہے اور ساری دُنیا اس کی عظمت اور ہیبت سے آنکھ نیچی رکھتی ہے۔''

''یہی حضرت زین العابدینؑ احرام باندھتے وقت ''لبیک'' اس خوف سے نہیں کہتے

کہ کہیں جواب میں بارگاہ ایزدی سے ''لا لبیک'' کی صدا نہ آجائے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی ظاہری حالت میں خوف خداوندی کا یہ عالم ہو تو دعاء کی کیفیت میں آپ کی رقت وزاری کا کیا عالم رہتا ہوگا۔ غالبؔ نے حضرت سجادؑ کی ایسی ہی ایک تضرع آمیز دعا کو فارسی میں منتقل کیا ہے، جس میں جذب و اضطراب اور عجز و انکسار کے علاوہ بندے کی بے بسی و بے کسی نمایاں ہوتی ہے۔ حضرت علیؑ سے منسوب دعاء ''دعائے صباح'' کا منظوم ترجمہ بھی خوب ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے نہایت اہتمام سے اس قدیم نسخے کی عکس ریز کاپی کالی داس گپتا کے مضمون کے ساتھ کتاب میں شامل کر لی ہے۔''

یحییٰ نشیط نے کہا کہ ''تقی عابدی صاحب نے غالبؔ کی نعتیہ غزل کا تجزیہ بھی خوب کیا ہے۔ اس نعت میں عقیدت رسول تغزل کی چلمن سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ باقی نعتوں میں غالبؔ کا عشقِ رسول نمایاں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس ضمن میں یہ اولین کوشش ہے کہ آپ نے غالبؔ کی منقبتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ منقبت سے متعلق بعض اصطلاحات کی وضاحت بھی اگر ضمناً اس میں ہو جاتی تو سونے پر سہاگا ہو جاتا۔ مثلاً ''اہل بیت'' اثنا عشری نظام، یوم غدیر، نادِ علی، کرم اللہ وجہہ، انگشتری علی، شیر خدا وغیرہ کہ ان میں سے بعض کا استعمال بلاتی کے معراج نامے جیسے قدیم معراج ناموں میں بھی ہوا ہے، اور منظوم سیرت رسولؐ میں بھی۔ عام قاری ہی نہیں بلکہ بعض اساتذہ بھی ان کے معنی و مفاہیم سے لاعلم ہیں۔ کتاب کے اولین صفحات میں غالبؔ سے متعلق چند مضامین بھی انتہائی معلومات افزا ہیں۔ کلکتہ میں یہ تقریب یادگار رہی۔

روزنامہ ''رہنمائے دکن''، ''سیاست''، ''اعتماد نیوز'' حیدرآباد
28/دسمبر 2006ء

اُردو زبان، تہذیب وثقافت کا عظیم خزانہ

مولانا آزاد یونیورسٹی میں ''غالبؔ شاعر زیست'' سیمینار
ڈاکٹر سی نارائن ریڈی اور دوسروں کا خطاب

ڈاکٹر سی نارائن ریڈی سابق وائس چانسلر تیلگو یونیورسٹی نے کہا کہ ''ہمیں اپنی شناخت کی برقراری کے لیے اپنی زبان کو زندہ رکھنا ہوگا۔ اُردو زبان تہذیب وثقافت کا عظیم خزانہ ہے۔ مرزا غالبؔ کے گزرنے کے اتنے برسوں کے باوجود وہ اپنی شاعری کے ذریعہ ہمیشہ زندہ ہیں۔ اس لیے وہ مرزا غالبؔ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بجائے خراج تحسین پیش کررہے ہیں۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی میں مرزا غالب کے 210ویں یوم ولادت کے موقع پر ''غالبؔ شاعر زیست'' کے عنوان پر پہلے ایک روزہ بین الاقوامی سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات بتائی۔ جس کی صدارت پروفیسر اے. ایم. پٹھان وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے کی۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے کہا کہ ''ہندوستانی زبانیں آج عجیب ماحول سے دو چار ہیں۔ ہندوستانیوں نے ضرور آزادی حاصل کرلی لیکن یہ آزادی صرف سیاسی آزادی ہے۔ تہذیب وتمدن زبان اور ادب کے زمرے میں ابھی آزادی نہیں ملی۔ ابھی بھی ہم انگریزی کے آنچل سے بندھے ہیں۔''

ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے مرزا غالبؔ کو خراج پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''اس دور کے شعراء شاہی درباروں میں تعریفوں کے پل باندھتے نظر آتے تھے، لیکن غالبؔ اس سے دور تھے۔ ان کا اپنا گھر بھی نہیں تھا لیکن وہ تمام اُردو والوں کے دلوں میں رہتے ہیں۔'' پروفیسر اے. ایم. پٹھان وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے اس موقع پر ڈاکٹر

سید تقی عابدی (کینیڈا) کی جانب سے تیار کردہ ''غالبؔ دیوانِ نعت ومنقبت'' کی رسم اجراء انجام دی اور اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اُردو یونیورسٹی میں لکچرس کے علاوہ پہلی مرتبہ سیمینار منعقد کیا جارہا ہے جو مرزا غالبؔ کی 210 ویں ولادت کے موقع پر انھیں خراج ہے۔ اس موقع پر انھوں نے مؤلف ''غالب دیوانِ نعت ومنقبت'' سے اپیل کی کہ ان کے پاس اضافی قلمی مخطوطات ہوں تو وہ اسے اُردو یونیورسٹی کے میوزیم کو عطیہ دیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اس کے جواب میں اعلان کیا کہ ''ان کے پاس مخطوطات کے اگر اضافی نسخے ہوئے تو وہ اسے اُردو یونیورسٹی کو عطیہ کردیں گے۔''

انھوں نے بتایا کہ ''ٹورنٹو (کینیڈا) میں ان کی شخصی لائبریری میں تقریباً 15 ہزار کتب اور 2 ہزار سے زائد قلمی مخطوطات موجود ہیں اور ان کی وصیت کے مطابق ان کے مرنے کے 12 گھنٹوں کے اندر ساری کتابیں اور مخطوطات ٹورنٹو لائبریری کو منتقل کردی جائیں گی۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کی اُردو سے وابستگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''اُردو کسی مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ برصغیر کی زبان ہے اسے مذہب کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ ابتداء میں پروفیسر ایس. اے. وہاب قیصر کنٹرولر امتحانات یونیورسٹی نے خیر مقدمی تقریر کی اور مہمان ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کا تعارف کروایا۔ تقریب میں پروفیسر قمر رئیس نائب صدر نشین دہلی اُردو اکادمی، جناب طالب خوندمیری، ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ، ڈاکٹر فاطمہ پروین، ڈاکٹر مسرت جہاں، جناب رحیم الدین کمال کے علاوہ اساتذہ اور طلبہ کی کثیر تعداد موجود تھی۔

روزنامہ ''اعتماد'' حیدرآباد
27/دسمبر2006ء

رسم الخط کی تبدیلی سے
اُردو کے معدوم ہوجانے کا اندیشہ

نئی نسل کو اُردو سکھانے میں اس کی بقا مضمر، مولانا آزاد یونیورسٹی میں ڈاکٹر تقی عابدی کا توسیعی لکچر

اُردو تہذیب سے وابستہ افراد کسی ملک یا تمدن تک محدود نہیں، اُردو داں چاہے کسی ممالک سے تعلق رکھتے ہوں لیکن اجنبی ممالک میں جب وہ اُردو کے نام پر جمع ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے قریب ہوجاتے ہیں۔ صرف شمالی امریکہ بشمول کینیڈا میں 25 لاکھ افراد اُردو داں ہیں جہاں پر تقریباً 50 اُردو اخبارات، رسائل اور جرائد شائع ہوتے ہیں۔ مشہور اُردو اسکالر ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے آج مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی میں ''اُردو کی نئی بستیاں'' کے عنوان پر توسیعی لکچر دیتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا جس کی صدارت پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے کی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے لکچر میں بتایا کہ آزادی کے بعد بعض گوشوں کی جانب سے اُردو کو صرف 50 سال کی مہمان کہا گیا تھا لیکن یونیسکو کے مطابق اُردو آج دُنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے۔ تقریباً ایک سو برس سے قبل سے اُردو والوں کی نئی بستیاں بسنا شروع ہوئیں۔ ایک سو دس برس قبل لندن میں اُردو کی پہلی نئی بستی وجود میں آئی تھی جس کے بعد یورپ کے مختلف ممالک مشرق وسطی کے بعد یہ آج امریکہ میں اپنے قدم مضبوط کرچکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''برصغیر میں زندگی گزارنے کے لیے اُردو بولنا ضروری ہے جب کہ مغربی ممالک میں اُردو کے بغیر زندہ رہا جاسکتا ہے۔ لیکن ان ممالک میں اُردو سے ذوق وشوق پیدا کرنے

کے لیے مختلف سرگرمیوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ شمالی امریکہ و کینیڈا میں ہر سال 400 یا 500 اُردو مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ پروفیسر تقی عابدی نے کہا کہ ''مشاعرے جو پہلے ادبی دانش گاہ ہوتے تھے اب صرف تماشہ گاہ بن گئے ہیں۔ اس کے ذریعہ اب اُردو کی خدمت نہیں بلکہ شہرت پرستی اور خودنمائی زیادہ ہو رہی ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''اُردو کی نئی بستیوں میں اُردو زبان خطبات جمعہ، میلاد کے جلسوں اور عزاداری کی محفلوں سے بھی فروغ پارہی ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''جدید وسائل جیسے انفارمیشن ٹکنالوجی کے ذریعہ ہم اس کے فروغ کے لیے کام کریں تو زبان کو فروغ حاصل ہوگا۔'' انھوں نے کہا کہ ''اُردو کو مادری زبان کہنے والوں کا فریضہ ہے کہ وہ صرف اپنے بچوں کو اُردو سکھانے کا تہیہ کرلیں تو یہ زبان زوال پذیر نہیں ہوگی۔'' اُردو کے درخشاں ماضی پر نظر ڈالتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ''1800ء میں ٹیپو سلطان کی پہلی شہادت کی سال گرہ کی خوشی میں انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی تھی اور جان گل کرسٹ نے اس کالج کا نصاب تیار کیا تھا جس میں 75 فیصد اُردو کی کتابیں تھیں۔ اس وقت ہندی کا وجود نہیں تھا۔'' انھوں نے بتایا کہ ''ہندی کی پہلی کتاب پریم ساگر جس کے مصنف للولال جی تھے شائع ہوئی تھی۔ 1860ء میں بنارس میں ہندی کو فروغ دینے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔'' مہاتما گاندھی نے 1918ء میں کہا تھا کہ ''ملک میں قومی زبان ہندوستانی ہوگی جو اُردو اور ہندی دونوں پر مشتمل ہوگی لیکن بعد میں اس کی مخالفت کرتے ہوئے 1952ء میں ہندی کو قومی زبان قرار دیا گیا اور گزشتہ 50 برسوں میں ہندی نے اس قدر تیزی سے ترقی کی ہے کہ اقوام متحدہ کے مطابق ہندی دُنیا بھر میں 7واں مقام رکھتی ہے جب کہ اُردو کو 22واں مقام دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو بولنے والوں نے مادری زبان کے زمرہ میں مراٹھی، پنجابی، سندھی وغیرہ زبانیں لکھ دیں۔'' انھوں نے کہا کہ ''اُردو اپنے ممالک میں بیگانوں کی طرح رہ رہی ہے جب کہ ایران جیسے ملک میں سڑکوں کے نام تک فارسی کی سرکردہ شخصیتوں کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے بتایا کہ ''ایم اے اُردو اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں جتنی ہندوستان میں دی جاتی ہیں اتنی پاکستان میں بھی نہیں دی جاتیں۔ اس کا مستقبل درخشاں ہے لیکن اُردو والے اُردو کی بنیادی سطح کو مضبوط بنانے کے بجائے اس کی بالائی سطح کو

سنوارنے میں لگے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ''اُردو ادب میں جتنا سرمایہ موجود ہے اتنا انگریزی ادب میں بھی نہیں ہے لیکن اُردو والوں میں باہمی ارتباط نہ ہونے سے اس کی جامع ترقی نہیں ہورہی ہے۔ پروفیسر تقی عابدی نے اُردو کے دانشوروں پر زور دیا کہ وہ اُردو حروف تہجی کے سلسلہ میں ایک پروٹوکول ترتیب دیں کوئی اُردو کے 51 اور کوئی 53 حروف بتاتا ہے جب کہ انگریزی اور عربی کے حروف کی تعداد کسی سے بھی دریافت کرلیں تمام ایک ہی بتائیں گے۔ انھوں نے تمام دانشوروں کو جمع ہوکر اُردو کے حروف تہجی کی تعداد طئے کرنے کا مشورہ دیا۔'' انھوں نے کہا کہ اُردو رسم الخط کی حفاظت نہایت ضروری ہے کیوں کہ رسم الخط اُردو کا چہرہ ہے۔'' انھوں نے اُردو کی 700 سالہ تاریخ کے حوالے سے کہا کہ ''اُردو رسم الخط کو تبدیل کردیا گیا تو یہ معدوم ہوکر رہ جائے گی۔ رسم الخط کی تبدیلی سے تمام علوم جیسے نحو، صرف، تشبیہات اور تعلیقات بدل جائیں گے۔'' انھوں نے کہا کہ ''اُردو زبان کے حروف تہجی کی صوتیات (فونکس) پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ نئی نسل کو حروف کے بجائے صوتیات کے ذریعہ اگر تعلیم دی جائے تو بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔''

انھوں نے نئی نسل کو اُردو کی محافظ قرار دیا اور کہا کہ ''آنے والی نسل کو اُردو سکھانا اُردو کی بقا ہے۔'' انھوں نے اُردو حروف تہجی پر سیمینار منعقد کرنے کا بھی مشورہ دیا اور اُردو کے مختلف سیمیناروں اور ورکشاپس میں نوجوانوں کو موقع دینے کی وکالت کی۔

پروفیسر اے. ایم. پٹھان وائس چانسلر یونیورسٹی نے کہا کہ ''جب تک ہندوستان زندہ ہے اُردو زندہ ہے۔ یہ زبان ختم نہیں ہوسکتی۔'' انھوں نے اُردو کی ترقی کے لیے اسے انفارمیشن ٹکنالوجی سے مربوط کرنے پر زور دیا اور بتایا کہ یونیورسٹی کے تحت اُردو اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس میں اُردو اور انفارمیشن ٹکنالوجی پر کام کا آغاز ہوگیا ہے۔'' اس موقع پر پروفیسر ایس. اے. وہاب قیصر کنٹرولر امتحانات بھی موجود تھے۔

روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد

30/ دسمبر 2006ء

''مرثیے کی شعریات''
عنوان پر ڈاکٹر تقی عابدی کا توسیعی لکچر

اُردو میں صنف مرثیے کو فارسی کے وسیلے سے ترقی حاصل ہوئی۔ اس خیال کا اظہار ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں ''مرثیے کی شعریات'' پر اپنے توسیعی خطبے کے دوران کیا۔ پروفیسر ایس اے وہاب قیصر کنٹرولر امتحانات وانچارج ڈائریکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم نے صدارت کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''ایک کامیاب مرثیہ نگار جذبات واحساسات کو تصوف کی اصطلاحوں میں سمو کر کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ مرثیہ شاعری کے حقیقی وصف سے مربوط ہو جاتا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''اُردو شاعری کا تقریباً پچاس فیصد حصہ مرثیے پر محیط ہے۔'' ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''اُردو مرثیے نے عربی اور فارسی مرثیے سے بالواسطہ استفادہ کرتے ہوئے اپنی ترقی وفروغ کا سفر طے کیا ہے۔''

ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''شاعری چوں کہ محاکات یا جذبات نگاری کا نام ہے، لہٰذا ایک کامیاب مرثیہ نگار جذبات نگاری کے ذریعہ اپنے اشعار کو اتنا پُر اثر بنادیتا ہے کہ وہ آفاقی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔'' اس توسیعی خطبہ کے دوران ڈاکٹر عابدی نے کئی ایک نمائندہ مرثیے نگاروں کے بند بطور مثال پیش کرتے ہوئے جذبات واحساسات کی مختلف قسموں کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر عابدی نے مرزا دبیر کے مرثیے ''جب پریشان ہوئی مولا جماعت رن میں'' میں بارہ استعاراتی نظام کا تفصیل سے ذکر کیا۔

پروفیسر ایس اے وہاب قیصر، کنٹرولر امتحانات وانچارج ڈائریکٹر نظامت

فاصلاتی تعلیم نے اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر تقی عابدی کے توسیعی خطبے کو فکر انگیز اور عالمانہ قرار دیتے ہوئے اُن کی علمی، ادبی اور اُردو خدمات کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔ پروفیسر وہاب نے کہا کہ ''ڈاکٹر عابدی صلہ وستائش کی تمنا سے بے نیاز اُردو کے ایک عظیم مجاہد اور خدمت گزار کی حیثیت سے دُنیا بھر میں سرزمین دکن کے پرچم کو بلند کرنے میں شبانہ روز مصروف ہیں۔''

ڈاکٹر نکہت جہاں، لکچرر نظامت فاصلاتی تعلیم نے کارروائی چلائی اور اس پروگرام کے کنویر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشدؔ، انچارج شعبہ تعلقات عامہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے ڈاکٹر عابدی سے یونیورسٹی کے سہ روزہ پروگراموں میں شرکت کے لیے اظہار تشکر کیا۔ اس توسیعی خطبہ میں موجود حاضرین بالخصوص طلباء اسکالرس نے ڈاکٹر عابدی سے مرثیے کی شعریات کے مختلف پہلوؤں پر استفسارات کیے جس کے ڈاکٹر عابدی نے سیر حاصل اور اطمینان بخش جوابات بھی دیئے۔

روزنامہ ''پندار'' پٹنہ

14/دسمبر 2007ء

علامہ اقبالؔ کا ''جاوید نامہ'' انسان سازی کا شاہکار ہے

خدا بخش لائبریری میں سید تقی عابدی کا توسیعی خطبہ

خدا بخش لائبریری میں ٹورنٹو (کینیڈا) سے تشریف لائے مشہور اسکالر سید تقی عابدی نے 13/دسمبر 2007ء کی شام ساڑھے پانچ بجے ''علامہ اقبالؔ، جاوید نامہ اور انسانی اقدار'' کے موضوع پر ایک پُر مغز توسیعی خطبہ پیش کیا۔ اس تقریب کی صدارت معروف ادیب و شاعر پروفیسر لطف الرحمٰن، سابق وزیر اقلیتی فلاح حکومت بہار نے فرمائی۔ ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈائریکٹر خدا بخش لائبریری نے مقررین و سامعین کا والہانہ استقبال کرتے ہوئے آج کے خطبہ کے موضوع اور مقرر کی شخصیت سے لوگوں کو متعارف کرایا۔

انھوں نے فرمایا کہ ''سید تقی عابدی اُردو فارسی کے بڑے عالم ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے مطالعے کا خاص موضوع علامہ اقبالؔ کی شخصیت اور ان کی تصانیف رہی ہیں۔'' انھوں نے آگے کہا کہ ''علامہ اقبالؔ کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے۔ ان کا پیغام عالم انسانیت کے نام ہے۔'' انھوں نے اپنی تخلیقات میں انسانیت کے اقدار کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔

سید تقی عابدی نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ ''علامہ اقبالؔ کا'' جاوید نامہ'' انسان سازی کا شاہکار ہے۔ یہ علامہ کا اہم منظوم کلام ہے۔ جس کی طرف خاص طور پر نوجوانوں کو دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اس میں دُنیا کے تمام مذاہب مثلاً مسیحیت، یہودیت، ہندو دھرم اور اسلام وغیرہ کا خصوصی ذکر ہے۔ اس تمثیلی نظم میں ایک دعوت ہے۔ جس کے ذریعہ ایک انسان کو دوسرے انسان کی قدر کرنے کی طرف بلایا گیا ہے۔ اس میں علامہ اقبالؔ نے مولانا روم کے ساتھ مختلف سیاروں کی سیر کرایا ہے۔ گویا یہ علامہ اقبالؔ کا معراج نامہ ہے۔

اس میں الغفر ان/ ابوالعلا المعری، فتوحات مکیہ/ ابن عربی اور ڈیوائن کمیڈی سے خصوصی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس میں غالب کے معراج نامہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

''جاوید نامہ'' میں علامہ اقبال نے وشوامتر کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ مختلف ادیان کے اکابر کو مختلف سیاروں پر رکھا ہے مثلاً فلک قمر پر وشوامتر کو رکھا ہے۔ جنھیں انھوں نے جہان دوست کا خطاب دیا ہے۔ وشوامتر کے سوالوں کے جواب میں علامہ نے کہا کہ ''علم الموت کے بارے میں بندہ زیادہ جانتا ہے۔'' اس طرح کی مختلف مثالوں سے انھوں نے علامہ اقبال کی تصانیف میں ''جاوید نامہ'' کی اہمیت کو واضح کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر لطف الرحمٰن نے اپنے صدارتی کلمات میں علامہ اقبال کی گوناگوں صفات کا ذکر کیا۔ علامہ اقبال کے پیغام کو انسانیت کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے انھوں نے علامہ اقبال کے چیدہ چیدہ اشعار سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اخیر میں ڈائریکٹر خدا بخش لائبریری ڈاکٹر امتیاز احمد نے مقررین و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ ''منصف''، ''رہنمائے دکن'' حیدرآباد

9/ مارچ 2009ء

غالبؔ شناسی، فارسی اشعار کے مطالعہ کے بغیر ناممکن

اُردو یونیورسٹی میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کا توسیعی لکچر

''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کی رسم اجراء

غالبؔ شناسی غالبؔ کے فارسی اشعار کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ غالبؔ ایک عظیم لغت گو شاعر بھی تھے۔ فارسی کلام ''مثنوی ابر گہر بار'' میں شامل ''معراج نامہ'' کو نعت گوئی کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز دانشور اور اسکالر ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی میں آج ''غالبؔ ایک لافانی شاعر'' کے موضوع پر توسیعی لکچر کے دوران کیا۔ مرکز برائے اُردو زبان، ادب ثقافت کے زیر اہتمام کانفرنس ہال میں منعقدہ لکچر کی صدارت پروفیسر کے. آر. اقبال احمد، پرو وائس چانسلر وانچارج وائس چانسلر نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر تقی عابدی کی تصنیف ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے سیر حاصل لکچر میں غالبؔ کی فارسی شاعری کے اُن پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی جن سے اہل اُردو بڑی حد تک ناآشنا ہیں۔ انھوں نے غالبؔ کی فارسی شاعری کے اعلیٰ معیار اور گہرائی کا حوالہ دیتے ہوئے ریمارک کیا کہ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس عظیم شاعر کی شہرت و شناخت اس کی شاعری کے ایک چھوٹے سے جز ''دیوان غالبؔ'' (اُردو) سے مربوط کردی گئی ہے۔ غالبؔ شناسی چوں کہ غالبؔ کے فارسی اشعار کے مطالعہ کے بغیر ادھوری ہے، اپنے مطالعہ کو اُردو شاعری تک محدود رکھتے ہوئے کیا: ''ہم غالبؔ کے ساتھ انصاف کر رہے ہیں؟''

ڈاکٹر تقی عابدی نے بتایا کہ ''غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی کی خواہش پر انھوں نے

''کلیاتِ غالب فارسی'' مرتب کی ہے، جو 11337 اشعار پر مشتمل ہے۔'' 250 صفحات پر مشتمل ڈاکٹر عابدی کا تحریر کردہ مقدمہ بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب اور اقبال کا فارسی کلام ان کے اُردو کلام سے زیادہ بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے خود اپنے اُردو کلام کے کئی اشعار مسترد کردیے تھے۔ غالب کو اپنی فارسی شاعری پر بجا طور پر فخر تھا۔ غالب کے لیے فارسی اشعار کی سند، ایرانی شعرا تھے۔ انھوں نے زبان دانی کے معاملے میں ایرانی شاعروں کی تقلید تو کی لیکن فکری طور پر اپنی ایک جداگانہ شناخت بنائی۔ فارسی کلام ''مثنوی ابرِ گہربار'' میں شامل معراج نامہ 281 اشعار پر مشتمل ہے جو نعتیہ شاعری میں کسی شاہکار سے کم نہیں۔ ممتاز اسکالر نے جو دیارِ مغرب میں اُردو کی شمع روشن ہوئے ہیں، لکچر کے ابتدا میں کہا کہ ''مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کی ساری دُنیا میں دھوم ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''اُردو تہذیب کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ایک بڑا چیلنج ہے۔ جس سے پروفیسر اے. ایم. پٹھان اور ان کے ساتھی نہایت خوش اسلوبی سے نمٹ رہے ہیں۔'' ڈاکٹر سید تقی عابدی نے لکچر کے اختتام پر شرکاء کے سوالات کے اطمینان بخش جواب بھی دیے۔ پروفیسر کے. آر. اقبال احمد نے اپنی صدارتی تقریر میں غالب کے فارسی کلام کو یکجا کرنے کی ضرورت ظاہر کی اور کہا کہ ''برصغیر کی فارسی نگاری کے ارتقاء میں غالب کا ایک خاص مقام ہے۔'' انھوں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تصنیف ''کلیاتِ غالب فارسی'' کو غالبیات میں ایک اہم اضافہ قرار دیا۔ ابتدا میں پروفیسر ٹی. وی. کٹی منی، ڈین اسکول آف لینگویجز نے خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، انچارج ڈائریکٹر مرکز برائے اُردو زبان نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر ایس. اے. وہاب، انچارج رجسٹرار سی. ایم. ایشوریا، فینانس آفیسر، پروفیسر ایس. رحمت اللہ، پروفیسر خدیجہ بیگم، پروفیسر خالد سعید، پروفیسر ریحانہ سلطان، پروفیسر فاطمہ بیگم، پروفیسر آمنہ کشور، ڈاکٹر عباس خان، ڈاکٹر شاہدہ، ڈاکٹر نکہت جہاں، ڈاکٹر ابوالکلام، مہیش کمار ویراگی، ڈاکٹر عصمت جہاں، ڈاکٹر طارق مسعودی، ڈاکٹر محمود عالم، جنید ذاکر، ڈاکٹر شاہد نوخیز اور دوسرے موجود تھے۔

روزنامہ ''سیاست''، ''رہنمائے دکن'' حیدرآباد

1رنومبر 2009ء

معرفت خداوندی اور حب رسولؐ، علامہ اقبالؔ کے فلسفۂ عشق کا نچوڑ

معرفت خداوندی اور حب رسولؐ، علامہ اقبالؔ کے فلسفۂ عشق کا نچوڑ ہے۔ شاعر مشرق نے عشق کے نچوڑ کا اسی راستے کی نشاندہی کی ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید تقی عابدی، ممتاز دانشور محقق نے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی میں ''اقبالؔ کا فلسفۂ عشق'' کے موضوع پر توسیعی خطبہ کے دوران کیا۔ مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت نے کانفرنس ہال میں اس کا اہتمام کیا تھا۔ پروفیسر کے. آر. اقبال احمد، وائس چانسلر انچارج نے صدارت کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ''عشق کا راستہ حضرت محمدؐ سے ہوتا ہوا خالق کائنات تک پہنچا ہے۔ عشق ایک عربی لفظ ہے جس کا نہ تو قرآن میں ذکر ہے اور نہ احادیث مبارکہ میں اس کا حوالہ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے ''حب'' (محبت) کے لفظ کا استعمال کیا ہے۔ عشق کا فلسفہ بڑا پیچیدہ اور مشکل ہے۔ علامہ اقبالؔ کے اُردو اور فارسی کلام کا اگر مطالعہ کریں تو جملہ 33 مقامات پر عشق کا تذکرہ ملے گا۔ جب کہ مولانا جلال الدین رومیؔ کے کلام میں جس سے علامہ اقبالؔ نے تحریک حاصل کی تھی۔ یہ تذکرہ صرف 5 مقامات پر ہے۔'' ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ اقبالؔ کی شاعری میں عشق رسولؐ کے وجدان کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''اُردو یا فارسی میں علامہ اقبالؔ سے بہتر نعتیہ اشعار کا ملنا مشکل ہے۔'' فلسفۂ عشق و مستی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''محبوب کے لائق ہونے کے لیے مادی کثافتوں سے دور ہونا ضروری ہے۔ مولانا رومیؔ کے فکر و فلسفہ نے برصغیر کے

شعرا پر گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ ان شاعروں کے پیمانوں میں مولانا رومؔ کے ساغروں سے انڈیلی گئی عشق کی شراب ہے۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے نشاندہی کی کہ ''دکنیات میں فلسفۂ عشق و معرفت پر تحقیق اور مطالعہ کی زبردست گنجائش اور ضرورت ہے۔ حیدر آباد میں یہ کام بخوبی انجام دیا جاسکتا ہے۔''

ابتداء میں پروفیسر اقبال احمد نے ڈاکٹر عابدی کو عالمی سطح پر ''اُردو کا مبلغ'' قرار دیا اور کہا کہ ''اس زبان سے بے پناہ محبت ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ کینیڈا سے پابندی کے ساتھ حیدر آباد آتے ہیں۔''

پروفیسر ایس۔اے۔ وہاب مہمان اعزازی نے کہا کہ ''اقبالؔ کی شاعری میں فلسفۂ عشق کا وسیع کینوس ہے۔ جس کے مطالعہ کے لیے گہرائی کے ساتھ گیرائی کی ضرورت ہے۔''

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد ڈپٹی ڈائریکٹر وانچاوج نے مہمان کا تعارف اور مرکز کی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کیا۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین اسسٹنٹ پروفیسر تعلیم نسواں نے خیر مقدم کیا اور دلچسپ انداز میں کارروائی چلائی۔

روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی

26/مارچ 2010ء

اخوت کا درس دینے والے دین کو دہشت گردی سے جوڑنا غلط: ڈاکٹر عابدی

ورلڈ پیس کانفرنس میں عزیز برنی کو امن اعزاز سے نوازا گیا

حضرت محمد مصطفیؐ کے یومِ ولادت کے سلسلے میں امروہہ کے عزاخانہ دانشمندان میں ورلڈ پیس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر ''راشٹریہ سہارا'' کے گروپ ایڈیٹر عزیز برنی کو ان کی صحافتی خدمات کے سلسلے میں پیس ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کی غیر موجودگی میں یہ ایوارڈ سہارا کے سینئر صحافی شکیل شمسی نے وصول کیا۔ اس موقع پر ناظم جلسہ نیر جلالپوری نے عزیز برنی کی صحافت اور طرز تحریر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''انھوں نے جرأت مندی کے ساتھ سچ بیان کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ اگر قائم رہے تو اس ملک کی تصویر بدل سکتی ہے۔''

اس موقع پر مشہور تعلیم کے میدان میں گراں قدر خدمات کے لیے تیرتھنکر یونیورسٹی کے چانسلر سریش جین صاحب کو بھی ایوارڈ دیا گیا۔ پروگرام کی صدارت امریکہ سے آئے ہوئے مہمان جناب علی ابن الحسین باقری نے کی۔ سیمینار کا اہتمام امام حسینؑ پیس فاؤنڈیشن نے کیا تھا۔

اس موقع پر ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'' کے عنوان سے ایک سیمینار بھی منعقد ہوا، جس میں شکیل شمسی، سابق مرکزی وزیر عارف محمد خاں اور ڈاکٹر تقی عابدی نے مقالات پیش کیے۔ شکیل شمسی نے ''آنحضورؐ اور ہم'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے کہا کہ ''اگر مسلمان ممالک اپنے رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے تو ان کو

ایک دوسرے سے خطرہ محسوس نہ ہوتا اور وہ اپنی حفاظت کے لیے ہتھیاروں کی بیساکھیاں تلاش نہ کرتے۔"

عارف محمد خاں نے اپنے مقالے میں کہا کہ "ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ آنحضور کی تعلیمات پر عمل کرے اور کسی مسلمان کو اس بات کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنے سے کمتر یا پست سمجھے یا لوگوں میں تفرقہ پھیلائے۔" انھوں نے کہا کہ "اسلام میں بلندی کا مطلب ہے تقویٰ اختیار کرنا۔" انھوں نے کہا کہ "تقویٰ کے ایک معنی خدا شناسی بھی بیان کیے گئے جو انھیں زیادہ بہتر لگتے ہیں۔"

کینیڈا سے آئے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مقالے میں کہا کہ "کردار سازی، اخلاق اور اخوت کا درس دینے والے دین کو دہشت گردی کا الزام دینا سراسر ناانصافی ہے۔" انھوں نے کہا کہ "اسلام کی تعلیمات پر عمل درآمد کرنے والے لوگ دلوں کو توڑنے کا نہیں بلکہ جوڑنے کا کام کرتے ہیں۔" انھوں نے علامہ اقبالؔ کے اشعار کی روشنی میں عشقِ رسولؐ کے موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی۔ سیمینار کے اختتام پر مہمان خصوصی اور سابق ممبر پارلیمنٹ عبیداللہ خاں اعظمی نے حضورؐ کے سیرت طیبہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ "آج پوری دُنیا میں مسلمان اگر پریشانیوں میں مبتلا ہیں تو اس کی ایک ہی وجہ ہے مسلمان اسلامی تعلیمات کو بھولتے جا رہے ہیں۔" انھوں نے کہا: "حضور اکرمؐ نے کوڑا پھینکنے والی عورت کی عیادت کر کے ہم کو یہ تعلیم دی کہ ہمیں اپنے دشمن کے ساتھ کیسا عمل کرنا چاہیے۔ لیکن ہم اپنے دشمن تو کیا اپنے دوست کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کر پاتے۔"

پروگرام میں بڑی تعداد میں علماء اور زعما نے شرکت کی۔ اس موقع پر امام حسینؑ فاؤنڈیشن کی سالانہ کتاب کا اجرا بھی ہوا اور فیروز کمال عباسی کی جانب سے سب ہی لوگوں کو مومنٹو پیش کیا گیا۔

اسد رضا

روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی

27/مارچ 2010ء

مرثیہ اور غزل اُردو کی زندگی کے ضامن ہیں

رثائی ادب کے ماہر معروف ناقد و محقق

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا اظہارِ خیال

37 سے زائد کتب کے مصنف، معروف ناقد و محقق ڈاکٹر تقی عابدی حال ہی میں کینیڈا سے تشریف لائے تو روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کے نمائندہ سے گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ''وہ ہندوستان میں اُردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ جب تک مجالس میں مراثی اور نوحے نیز ادبی تقاریب میں غزلیں پڑھی جاتی رہیں گی، تب تک اُردو زبان وادب کا مستقبل تابناک ہی رہے گا۔''

ڈاکٹر عابدی کے الفاظ میں ''مرثیہ اور غزل اُردو کی زندگی کی ضمانت ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب مراثی اور مرزا اسد اللہ خاں غالب اور مرزا دبیر کے بارے میں ضخیم اور فکر انگیز کتب کے مصنف ہیں۔ لہٰذا ان سے جب رثائی ادب کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ''مرثیہ ایسی صنفِ سخن ہے جو اسلام کے امن وسلامتی کے چہرے کو واضح کرتی ہے۔ قرآن کریم، احادیث اور تاریخ اسلام اس بات کے شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے کسی پر حملہ نہیں کیا بلکہ دفاع کیا اور مرثیہ اس حقیقت کا عکاس ہے کہ اسلام سلامتی کا مذہب ہے۔ غیر مسلموں نے بھی مرثیہ کہے ہیں۔ جن کی تعداد 1500 سے زائد ہے اس لیے مرثیہ ادب عالیہ کا جز لاینفک ہے۔ لہٰذا اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رثائی ادب بڑے پیمانے پر نصاب کا حصہ بننا چاہیے۔''

ایک اور سوال کے جواب میں ڈاکٹر تقی عابدی نے زور دے کر کہا کہ ''مرثیہ میں

اعلیٰ اخلاقی، ادبی اور مذہبی اقدار ہیں اور یہ اقدار کسی مخصوص فرقہ کے لیے نہیں ہیں، بلکہ تمام مسالک اور مذاہب کے لیے ہیں۔ اگرچہ عابدی صاحب ایم بی بی ایس، ایم ایس، ایف سی اے پی اور ایف آر سی پی ہیں لیکن انھوں نے ادب کے ڈاکٹروں کے مقابلہ میں زیادہ گہرائی اور گیرائی سے ناقدانہ محققانہ کارنامے انجام دیے ہیں۔''

ڈاکٹر تقی عابدی کا یہ فکر انگیز قول ملاحظہ فرمائیں، وہ کہتے ہیں ''مرثیہ زندگی کا آئین بھی اور آئینہ بھی'' تقی عابدی نے روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کی اُردو اشاعتوں کی بھی تعریف کی۔ انھوں نے بتایا کہ کینیڈا، امریکہ، برطانیہ، جرمنی، سعودی عرب، یو اے ای وغیرہ میں بھی اُردو زبان و ادب ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان نئی اُردو بستیوں سے بھی اچھے شاعر، مرثیہ گو، ادب اور ناقد و محقق ابھرے ہیں۔

ماہنامہ ''حکیم الامت'' سری نگر

جون 2010ء

حکیم الامت کی پانچویں سالگرہ

ماہنامہ ''حکیم الامت'' سری نگر کی پانچویں سالگرہ کی تقریبات پر اُردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) ''حکیم الامت'' کے پہلے ایوارڈ کے لیے چیف ایڈیٹر پروفیسر اکبر حیدری کی دعوت پر 30رمئی 2010ء بروز یکشنبہ کو ہوا کے دوش پر وادی کشمیر کی گل زمین پروارد ہوئے۔

اگلے روز 31رمئی 2010ء دوشنبہ 3 بجے ہوٹل سلور اسٹار کا خوب صورت اور بے مثال ہال ''حکیم الامت'' کے ثابت قدم پروانوں سے جھوم رہا تھا اور دوسری طرف رنگ برنگی قمقموں سے بقعۂ نور بن رہا تھا۔ اسی اثنا میں سنٹرل یونیورسٹی کشمیر کے وائس چانسلر عالی جناب پروفیسر عبدالواحد قریشی تشریف لائے اور تمام پروانے سروقد کی طرح استادہ ہوکر تعظیم وتکریم بجالائے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ظفر حیدری نے جناب قریشی صاحب، ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر اکبر حیدری، ڈاکٹر شاہد ماہلی (ڈائریکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی) اور مہمان ذی وقار ڈاکٹر شاہ فیصل (جنھوں نے حال ہی میں ہندوستان بھر کے انتظامی سروس (IAS) کی قابلیت کا کوہ نور کا تاج اپنے سر پر رکھوا کے فخر ہندوستان کا امتیاز حاصل کرلیا) سے گزارش کی کہ وہ اسٹیج پر تشریف لانے کی زحمت کریں۔

جلسے کی کارروائی کا آغاز موقعہ اور محل کی مناسبت سے انجینئر سید شاہ نواز حسین صاحب نے قرآن مجید کی تلاوت سے کیا۔ تلاوت کے بعد پروفیسر اکبر حیدری نے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کا تعارف شاندار الفاظ میں کرایا۔ بعد ازاں صدر محترم عالی جناب پروفیسر عبدالواحد قریشی نے ڈاکٹر عابدی صاحب کو ''حکیم الامت'' کے پہلے ایوارڈ (توصیفی سند) اور خلعت فاخرہ کے اعزازات سے نوازا۔ اور ساتھ ہی قریشی

صاحب نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تازہ ترین اور نئی تحقیقی اور تنقیدی کتاب ''کلیاتِ غالبؔ فارسی'' مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی رسم رونمائی بھی انجام دی۔ ڈاکٹر شاہد ماہلی صاحب نے اپنی مختصر تقریر میں عابدی صاحب کی مسلسل محنت شاقہ اور غالبؔ شناسی کی تعریفیں کیں۔

چوں کہ جناب وائس چانسلر صاحب نئی یونیورسٹی کے انتظامی کاموں میں بے حد مصروف تھے اس لیے انھوں نے جلسے کے اختتام سے قبل ہی معرکہ آراء خطبہ صدارت پیش کیا۔ قریشی صاحب نے ''حکیم الامت'' کی تعریفیں کرتے ہوئے فرمایا کہ ''حکیم الامت ملک کا لاجواب اور بے باک ادبی رسالہ ہے جو گزشتہ پانچ برسوں سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔'' قریشی صاحب نے اور باتوں کے علاوہ میڈیا کے غیر ذمہ دارانہ کردار پر بھی اظہارِ خیال کیا کہ صحافت کا معیار کشمیر میں گرتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب کے بارے میں پروفیسر واحد نے کہا کہ ''مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ جلسہ ہٰذا میں فنِ طب کے ماہر جو کثیر التعداد تصانیف کے مصنف ہیں، کینیڈا سے تشریف لائے ہیں۔ میں اُن کے مضامین ''حکیم الامت'' میں دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور اُن سے غائبانہ متعارف بھی ہو چکا ہوں، لیکن آج اُن کو وادیٔ گل پوش میں دیکھ کر میری خوشیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ جب ہماری یونیورسٹی میں درس و تدریس کا کام شروع ہوگا تو ڈاکٹر صاحب کو یہاں آنے کی زحمت دیں گے۔''

خطبہ وائس چانسلر صاحب کے بعد تقریب کے روحِ رواں ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب نے انیسیات کے موضوع پر طویل تقریر سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ وہ ایک گھنٹے سے زیادہ اپنی زبانِ خوش بیاں سے پھول برساتے رہے اور ''حکیم الامت'' کے ستارے ہمہ تن گوش بن کر سنتے رہے۔

ڈاکٹر سید تقی کی بصیرت افروز تقریر کے بعد مہمان ذی وقار ڈاکٹر شاہ فیصل جو بالکل نوجوان ہیں، ڈائس پر تشریف لائے اور اُردو زبان سے دلچسپی اور اس کے فروغ و ترقی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ سامعین یہ سن کر خوش ہوئے کہ IAS کے امتحان میں اُردو اُن کا اختیاری مضمون تھا۔

ڈاکٹر شاہ فیصل کی تقریر کے بعد چائے نوشی ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً 6 بجے شعری نشست کا آغاز زیر صدارت ڈاکٹر شاہد ماہلی ہوا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اس میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور اپنے منفرد انداز بیاں میں اشعار کہہ کر سامعین کے دل جیت لیے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر سید محمد رضا صاحب نے انجام دیے۔ درج ذیل شعراء نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ جناب شبیر آذر، جناب اشرف عادلؔ، ڈاکٹر اشرف اثاری، جناب سلطان الحق شہیدیؔ، محترمہ رخسانہ جبین اور جناب ہمدم کشمیری۔ (کلام کا انتظار ہے)

ساڑھے سات بجے ڈاکٹر ظفر حیدری کے اظہار تشکر کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

ناندیڑ (مہاراشٹر)
5/جنوری 2011ء

ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) کی 5/جنوری کو ناندیڑ آمد

یشونت کالج کی بزمِ اُردو کی افتتاحی تقریب میں شرکت
اور اُردو کے ادبی مسائل پر تقریر

عالمی شہرت یافتہ شاعر و نقاد ڈاکٹر سید تقی عابدی بروز بدھ 5/جنوری کو دوپہر 12 بجے ناندیڑ پہنچ رہے ہیں۔ وہ اس دن یشونت کالج ناندیڑ کی بزمِ اُردو کی افتتاحی تقریب میں شرکت کریں گے اور اُردو کے ادبی مسائل، اقبالؔ اور غالبؔ کے فن پر تقریر کریں گے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ایڈیٹر ''ورقِ تازہ'' سے فون پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ یشونت کالج کے پرنسپل اور صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر سید شجاعت علی کی دعوت پر ناندیڑ آرہے ہیں۔ وہ 5/جنوری کو صبح حیدرآباد سے چلیں گے اور دوپہر 12/بجے تک ناندیڑ پہنچیں گے۔

افتتاحی تقریب کے بعد کالج کے مشاعرہ میں بھی شرکت کریں گے۔ یکم مارچ 1952ء کو دہلی میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر عابدی اس وقت کینیڈا میں قیام پذیر ہیں اور پیشہ سے ڈاکٹر ہیں۔ وہ اسکاربوروج ہاسپٹل (ON M1W 3W3) کینیڈا میں ایسوسی ایٹ پتھالوجسٹ ہیں۔ وہ دُنیا کے 30 ممالک میں Internist اور Cardiologist کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے 1975ء میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے MBBS کی ڈگری حاصل کی۔ 1978ء میں گلاسگو (برطانیہ) سے .M.Sc، (Pathologist) کیا۔ وہ ایک ڈاکٹر (طبیب) ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اُردو کے ایک اسکالر، شاعر، ادیب اور نقاد کی حیثیت سے عالم گیر شہرت حاصل

کر چکے ہیں۔ انھوں نے اُردو زبان و ادب کے مختلف موضوعات پر 30 سے زائد کتابیں تحریر کی ہیں جنھیں اُردو حلقوں میں کافی پسند کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں پاکستان، ہندوستان اور کینیڈا سے شائع ہوئی ہیں۔ ان کی چند مصروف کتابیں یہ ہیں: ''ابواب المصائب'' (میرزا دبیر)، ''اقبال کے عرفانی زاویے''، ''مثنویاتِ دبیر''، ''ھوالنجم''، ''مصحفِ تغزل''، ''روشنِ انقلاب''، ''رموزِ شاعری''، ''اظہارِ حق''، ''روپ کنوار کماری''، ''سبدِ سخن''، ''طالع مہر''، ''دربارِ رسالت''، ''خوشۂ انجم''، ''شہید''، ''انشاء اللہ خاں انشاؔ''، ''عروسِ سخن''، ''ذکرِ درباران''۔

روزنامہ ''ورق تازہ'' ناندیڑ

6/جنوری 2011ء

اُردو کو مسلمان بنانے کی کوشش مت کیجیے،
اُردو کو 400 ملین افراد سمجھتے ہیں: ڈاکٹر تقی عابدی

یشونت مہاودیالیہ کی بزمِ اُردو کی افتتاحی تقریب میں مضطر مجاز،
ڈاکٹر بیگ احساس، فاطمہ پروین کا خطاب، شعری نشست کا انعقاد

عالمگیر شہرت کے حامل اُردو کے شاعر، ادیب، نقاد اور دانشور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے پُر اعتماد لہجہ میں کہا کہ ''اُردو کو مسلمان بنانے کی کوشش مت کیجیے کیوں کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اُردو کو دُنیا کے 400 ملین افراد سمجھتے ہیں۔ اُردو دُنیا کی 6 ویں زبان ہے اس کو کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی اگر ہم اُردو والے یہ طے کرلیں کہ ہم اپنا ہر کام اُردو میں کریں گے جس طرح دیگر زبان بولنے والی قومیں کرتی ہیں۔ وہ آج شہر کے یشونت مہاودیالیہ کی بزمِ اُردو کا رسمی طور پر افتتاح کرنے کے بعد ایک جلسہ سے خطاب کررہے تھے۔ کالج لائبریری کے کانفرنس ہال میں دوپہر ڈھائی بجے منعقدہ جلسہ کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اے۔ این۔ جادھو نے کی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی (ٹورنٹو، کینیڈا)، اُردو کے معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر مضطر مجاز (حیدرآباد)، اُردو جدید افسانہ کی معتبر آواز ڈاکٹر بیگ احساس (صدر شعبہ اُردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی) محترمہ فاطمہ پروین (صدر شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)، ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد پروفیسر نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد) اور محمد تقی ایڈیٹر ''ورق تازہ'' ناندیڑ تھے۔ جلسہ کا آغاز محمد الیاس کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ 38 سے زائد اُردو کتب کے مصنف ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی کلیدی تقریر میں کہا کہ

''جب اُردو میں طاقت پیدا ہوگی تو وہ خود بخو د روٹی روزی سے جڑ جائے گی۔ اُردو کی جڑیں دکن میں پیوست ہیں۔ اُردو کے قواعد کا اسی سرزمین سے تعلق ہے۔ اُردو شاعری نے صرف 250 سالوں میں ترقی کی ہے جو دوسری زبانیں 700 سالوں میں نہیں کر سکیں۔ دُنیا کے سامنے مرزا غالبؔ کی غزلیں اور میر انیسؔ کے مرثیے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ یہ معیاری ادب کا حصہ ہیں۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے خصوصیت سے مرثیہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اُردو کی 40 فیصد شاعری مرثیہ پر مشتمل ہے۔ مرثیہ میں میر انیسؔ نے بات کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ مرثیوں کو امام باڑوں میں دفن نہ کیا جائے بلکہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھایا جائے۔ مرثیہ میں محاسنِ زبان ملیں گے۔ الطاف حسین حالیؔ مصلحِ اُردو تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ ''اُردو کا زوال مرثیہ سے روگردانی بھی ہے۔ 70 ہزار سے زائد اُردو میں دینی کتب موجود ہیں۔ قرآن مجید کے سب سے زیادہ 95 سے لگ بھگ تراجم اُردو میں ہی ہوتے ہیں کسی اور زبان میں نہیں۔ اُردو دل کو چھو لینے والی زبان ہے۔

یہ سب تمہارا کرم ہے آقاؐ

کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے

یہ مصرعہ دل پر اثر کر جاتا ہے۔ اُردو زبان کو زندہ رکھنے کا کام اُردو والوں کا ہے۔ حکومت پر الزام دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اپنی دوکانوں کے بورڈ اُردو میں لگائیں طلباء کو صحیح ادبی راستہ دکھائیں۔'' ڈاکٹر تقی عابدی نے اس بات پر خصوصیت سے زور دیا کہ ''اُردو کو مسلمان بنانے کی کوشش مت کیجیے۔ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی چاہیے کہ وہ اُردو کے کسی مذہب کا یقین نہ کریں۔'' انھوں نے بتایا کہ ''اُردو کے چار بڑے شاعر میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، میر انیسؔ اور علامہ اقبالؔ ہیں۔ غالبؔ کے دو دیوان ہیں ایک اُردو اور ایک فارسی میں۔ اُردو دیوان 1800 اشعار اور فارسی دیوان 12000 اشعار پر مشتمل ہے۔ غالبؔ کی فارسی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔''

ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''اُردو کا بڑا شاعر فیض ہے۔ ان کی پیدائش 13 رفروری 1911ء میں ہوئی تھی۔ 13 رفروری 2011ء میں 100 سال مکمل ہو رہے ہیں۔ اُردو

والے فیض کی صدی منائیں۔''

ڈاکٹر مضطر مجاز نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''عبرانی زبان یہودیوں کی مادری زبان ہے۔ جس کا یہودی 5 ہزار سال سے تحفظ کرتے آئے ہیں۔ ان کے یہاں عبرانی زبان سیکھنا ایک مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے ہم کو بھی چاہیے کہ ہم اُردو کو ذریعہ تعلیم بنائیں۔ اپنی مادری زبان اُردو میں بچوں کو ابتدائی تعلیم دلوائیں۔''

محترمہ فاطمہ پروین نے ہندوستان میں اُردو کی ترقی پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کی ابتداء میں پروفیسر ڈاکٹر محمد شجاعت علی نے ڈاکٹر عابدی کا اور پروفیسر انیس قمر نے ڈاکٹر مضطر مجاز کا خوب صورت انداز میں تعارف کروایا۔ پروگرام کی نظامت کالج کی طالبات صفورہ گلناز اور منہاج بیگم نے بحسن وخوبی انجام دی۔ تمام مہمانوں کی گل پوشی، شال اور مومنٹو سے استقبال کیا گیا۔ افتتاحی تقریب کے بعد شعری نشست کا آغاز ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے کی۔ ڈاکٹر عابدی، ڈاکٹر مضطر مجاز، ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی، فیروز رشید اور عبدالسمیع صدیقی نے اپنے شعری کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ دونوں پروگراموں میں طلباء طالبات اور معزز شہریان کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ "سیاست"، "رہنمائے دکن" حیدرآباد

5/جنوری 2011ء

"فیض فہمی" کے لیے وسعت النظری کے ساتھ مطالعہ ضروری

ڈاکٹر تقی عابدی کا "گواہ" توسیعی لکچر،

انقلابی شاعر کی زندگی کے مخفی گوشوں پر روشنی

فیض احمد فیض کی شخصیت اور ان کے کلام کو سمجھنے کے لیے وسیع النظری مطالعہ کی ضرورت ہے۔ فیض خاموش طبع اور ان پر کی جانے والی تنقیدوں کو نظر انداز کرنے والی شخصیت کے حامل تھے۔ انھیں چند ترقی پسند شعراء محض اس لیے اپنی تنقیدوں کے ذریعہ نشانہ بناتے رہے کیوں کہ فیض کی شاعری میں شعلہ فشانی، نعرہ بازی اور اشتعال انگیزی نہیں ہے۔ فیض اپنی شاعری کے آتش گل سے شعلہ فشانی کرتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار کانفرنس ہال، ہوٹل گرانڈ پلازا، ناملی میں ڈاکٹر تقی عابدی، ممتاز ادیب و نقاد ہفت روزہ "گواہ" کے زیرِ اہتمام توسیعی لکچر بعنوان "کیا یہ فیض کی صدی ہے؟" سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔

اس موقع پر شہ نشین پر ڈاکٹر سید ضیاء الدین احمد شکیب صدر تقریب، جناب ظفر جاوید، جناب افتخار شریف، جناب فاضل حسین پرویز اور ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد موجود تھے۔ جب کہ شرکاء میں ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والی نامور ہستیاں موجود تھیں۔ جن میں ڈاکٹر یوسف اعظمی، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر فاطمہ پروین، وائس پرنسپل آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی، جناب شریف اسلم، جناب صلاح الدین نیر، جناب ضیاء الدین نیر، جناب مضطر مجاز، جناب اعجاز احمد خان صدر خاک طیبہ ٹرسٹ، خاتون شاعرہ تسنیم جوہر وغیرہ نے شرکت کی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ "فیض کی شاعری اور ان کی فکر

میں ترقی پسند عناصر موجود ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ ''فیضؔ پر صرف ترقی پسند شاعر ہونے کا الزام غلط ہے انھوں نے حمد، نعت، مناجات بھی لکھیں۔ فیضؔ پر بہت زیادہ مظالم ڈھائے گئے۔''

ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''ان کی نظر میں فیض احمد فیضؔ کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں کے تین گروپ ہیں ایک گروپ ترقی پسند شعراء اور مصنفین کا ہے جو فیضؔ کے کلام سے حوصلہ افزائی حاصل کرتے ہیں اور اس کی ہمیشہ ستائش کرتے ہیں۔ دوسرا گروپ ایسا ہے جو ہمیشہ فیضؔ کے کلام پر تنقیدیں کرتا رہا ہے اور تیسرا گروپ فیضؔ کے کلام کی عمدہ باتوں کو پسند کرتا ہے اور دوسری غیر اہم باتوں کو نظر انداز کرتا ہے۔''

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ ''یہ صدی فیضؔ کی صدی ہے کیوں کہ وہ اپنے دور کے ایک منفرد شاعر گزرے ہیں۔'' ڈاکٹر سید تقی عابدی نے مختلف نقاد کا نام لیتے ہوئے کہا کہ ''یہ ایک المیہ ہے کہ اُردو ادب کے نقاد اس زبان کے ممتاز شعراء کے کلام کو مغرب کے شعراء کے کلام سے تقابل کرتے ہیں۔ فیضؔ کی نظموں کو بھی انگریزی شعرا کی نظموں کا چربہ قرار دیتے ہیں جن میں ان کی مشہور نظم ''تنہائی'' بھی شامل ہے جب کہ یہ غیر منصفانہ علم ہے۔''

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب نے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''فیض ایک نرم گفتار اور منکسر المزاج شخصیت کے حامل تھے وہ ایک رجائیت پسندی اور شب زندہ دار شاعر تھے۔'' انھوں نے کہا کہ ''فیض احمد فیضؔ کئی مرتبہ حیدرآباد کا دورہ بھی کیے تھے۔''

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ''ان کی خدمات اور ان کا کام غیر معمولی ہے۔'' اس تقریب سے جناب ظفر جاوید اور افتخار شریف این آر آئی نے بھی خطاب کیا۔ جناب سید فاضل حسین پرویز ایڈیٹر ہفت روزہ ''گواہ'' نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تعارف کروایا۔ ڈاکٹر شجاعت علی راشد ڈپٹی ڈائریکٹر مولانا آزاد اُردو یونیورسٹی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اس موقع پر جناب ظفر جاوید کو صدر نشین انڈین چیاپٹر اسلامی

ڈیولپمنٹ بینک جدہ نامزد کیے جانے پر ''گواہ'' کی جانب سے تہنیت پیش کی گئی۔ ''گواہ'' کی جانب سے تمام مہمانوں کی شال پوشی کی گئی اور انھیں مومنٹو بھی پیش کیا گیا۔ ممتاز گلوکار رکن الدین اور خان اطہر نے فیضؔ کا کلام ساز پر پیش کیا۔ ''گواہ'' اور میڈیا پلس کی جانب سے محمد رفیق، شکیل مرزا، محمد عبدالرشید جنید نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد

18/مارچ 2011ء

اُردو کی بقاء کے لیے بچوں کو اُردو تعلیم سے آراستہ کرنے پر زور

''اکیسویں صدی میں اُردو کے عصری تقاضے''

کے عنوان پر ڈاکٹر تقی عابدی کا لکچر

ممتاز محقق، دانشور و نقاد ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے اُردو جاننے والوں پر زور دیا کہ ''وہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے ساتھ اُردو کی بنیادی تعلیم دینے کا انتظام کریں یا وہ خود پڑھائیں تاکہ اس کے ذریعہ آنے والی نسلوں تک اُردو زبان کو پہنچایا جاسکے۔''

ڈاکٹر سید تقی عابدی آج ہوٹل گرانڈ پلازہ میں منعقدہ ''اکیسویں صدی میں اُردو کے عصری تقاضے'' کے موضوع پر توسیعی لکچر دے رہے تھے۔ یہ توسیعی لکچر مولانا آزاد کلب حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ''اپنے بچوں کو اُردو تعلیم کا بندوبست کرانے کے لیے حکومت سے فریاد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اُردو جاننے والے اساتذہ اپنے محلوں میں بچوں کو اُردو کی تعلیم دیں۔'' انھوں نے کہا کہ ''اُردو جو ہماری مادری زبان ہے اس میں مذہبی معلومات کے علاوہ دیگر معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔ والدین اگر اپنے بچوں کو اُردو تعلیم سے واقف کریں گے تو یہ زبان بول چال کے بجائے پڑھنے، لکھنے والی زبان بن جائے گی۔ اس سلسلہ میں والدین کو اپنے گھروں پر اُردو اخبار اور جرائد منگوانے کا انتظام کرنا پڑے گا تاکہ اس کے ذریعہ معصوم بچوں میں اُردو کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو۔'' انھوں نے کہا کہ ''اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق دُنیا میں 400 ملین لوگ اُردو جانتے ہیں، دُنیا میں اُردو کا 27 واں مقام ہے جب کہ دُنیا میں ہندی زبان کو چھٹواں مقام حاصل ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''50 سال کے دوران ملک میں ہندی جس

تیزی سے پروان چڑھی ہے اس طرح اُردو کو فروغ حاصل نہیں ہوا۔" انھوں نے کہا کہ "امریکہ میں اُردو کو زبردست فروغ حاصل ہو رہا ہے، نیویارک سے 29 سے زیادہ اُردو ہفتہ وار، ٹورنٹو میں 20 ہفتہ وار اور جنوبی امریکہ سے درجنوں جرائد اور ہفتہ وار شائع ہو رہے ہیں۔" انھوں نے کہا کہ "ہندوستان کی بہ نسبت امریکہ میں والدین اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلانے کے لیے زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ مدارس میں پڑھنے والے 25 فیصد طلباء اتوار کو اسکول میں دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں جب کہ ہندوستان میں دینی تعلیم حاصل کرنے والے اسکولی طلباء کی تعداد صرف 15 فیصد ہے۔" انھوں نے کہا کہ "ان دینی مدارس میں اُردو پڑھانے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔" انھوں نے اُردو جاننے والوں پر زور دیا کہ "وہ مشاعروں اور دیگر پروگراموں میں نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کریں۔"

نامور مزاح نگار پدم شری ڈاکٹر مجتبیٰ حسین نے کہا کہ "آزادی سے قبل ملک میں اُردو زبان کی ٹکر کی کوئی دوسری زبان نہیں تھی۔ اس زبان نے ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے اہم رول ادا کیا تھا۔ 50 سال کے دوران یہ زبان پیچھے چلی گئی، ملک کے آزاد ہونے کے بعد اب اس کا کوئی علاقہ نہیں رہا۔" انھوں نے کہا کہ "جس ریاست اور علاقے کے عوام اس زبان سے محبت کریں گے یہ زبان وہاں زندہ رہے گی۔" انھوں نے کہا کہ "پچھلے 50 سال کے دوران اُردو کے زوال پر ہم کو توجہ دے کر زبان کے فروغ کے لیے کام کرنا پڑے گا۔"

صدر شعبۂ اُردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی پروفیسر بیگ احساس نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تعارف کرایا۔ ایڈیٹر ہفت روزہ "گواہ" سید فاضل حسین پرویز نے خیر مقدمی تقریر کی۔ صدر کلب ڈپٹی ڈائریکٹر سی پی ڈی یو ایم ٹی مانو حیدرآباد ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد نے کارروائی چلائی۔ رکن کلب اسلم پرویز نے شکریہ ادا کیا۔

''عالمی سہارا'' نئی دہلی
13/اگست 2011ء

''فیض فہمی'' کے عنوان سے مذاکرہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ''فیض فہمی'' کے عنوان سے ایک مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا، جس میں کینیڈا سے آئے ممتاز ماہر سرطان اور اُردو اسکالر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''فیض علامتی شاعری کا ایک مکمل شاعر ہے۔ جدید شاعری میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے اور انھوں نے الفاظ وخیال کے پرانے ساغر کو نئی شراب عطا کی ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''فیض کی شاعری میں مغربی ومشرقی شاعری کا حسین امتزاج ملتا ہے جس میں رومان بھی ہے اور عشق وانقلاب بھی۔'' ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''وہ صحت کے طبیب اور ادب کے مریض ہیں۔'' مظلوم شعراء کے ساتھ ہوئی زیادتیوں اور ان کی قابل ستائش کاوشوں کو منظر عام پر لانا ان کا اصل موضوع ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''مرثیوں کو امام باڑوں میں دفن کر دیا گیا ہے جب کہ یہ نعت کا سب سے بڑا خزینہ ہیں۔''

شعبہ اُردو کے سربراہ پروفیسر محمد زاہد نے مہمان خصوصی جناب تقی عابدی کا مختصر تعارف پیش کرنے کے ساتھ ہی ان کے علمی وتنقیدی کارناموں پر بھی روشنی ڈالی۔ صدر مجلس پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے سید تقی عابدی کی کتاب ''فیض فہمی'' کا اجراء کیا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے سید تقی کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ان کے تحقیقی کاموں کی ستائش کی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شاہد ماہلی نے بھی تقریب سے خطاب کیا۔ نظامت ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی نے کی۔

سید وقار الدین قادری (چیف ایڈیٹر)
روزنامہ "رہنمائے دکن" حیدر آباد
30/ اگست 2011ء

کلام فیضؔ علامتی شاعری کا شاہکار

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا لکچر

4/ ستمبر کو بدست پروفیسر محمد میاں "فیضؔ فہمی"

1424 صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب کی رسم اجرائی

مولانا آزاد کلب حیدر آباد کے زیر اہتمام فیضؔ صدی تقاریب کے سلسلہ میں اتوار 4/ ستمبر کو شام 7 بجے "کلام فیضؔ" ۔ علامتی شاعری کا شاہکار" پر ممتاز محقق ادیب شاعر دانشور و ناقد ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) کے توسیعی لکچر کانفرنس ہال، ہوٹل گرانٹ پلازا، متصل حج ہاؤس، نامپلی حیدر آباد میں انعقاد عمل میں لایا جارہا ہے۔ نامور ماہر تعلیم و مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں اس تقریب کے مہمان خصوصی ہوں گے۔

ممتاز مورخ دانشور و نقاد ڈاکٹر سید ضیاء الدین احمد شکیبؔ (لندن) اس تقریب کی صدارت کریں گے۔ مہمان خصوصی پروفیسر محمد میاں اس موقع پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کی مرتبہ 1424 صفحات پر مشتمل انتہائی ضخیم کتاب "فیضؔ فہمی" کی رسم اجرا انجام دیں گے۔ کنوینر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، بانی و صدر کلب، ڈپٹی ڈائریکٹر سی پی ڈی یو ایم ٹی، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے بموجب ملٹی میڈیا افیرس لاہور پاکستان سے باتصویر ملٹی کلر میں شائع کی گئی۔ اپنی نوعیت کی اس منفرد کتاب میں صرف ڈاکٹر سید تقی عابدی ہی کے فیضؔ کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر 42 منتخبہ مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر فاطمہ بیگم

پروین، وائس پرنسل کالج آف آرٹس، عثمانیہ یونیورسٹی اور پروفیسر بیگ احساس، صدر شعبۂ اُردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، ڈاکٹر عابدی کا تعارف اور ''فیضؔ فہمی'' کا مختصر جائزہ پیش کریں گے۔

پروفیسر ریحانہ سلطانہ ڈائریکٹر مرکز برائے مطالعات نسواں، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی ورکن عاملہ کلب استقبالیہ کلمات پیش کریں گی۔ اس خصوصی توسیعی لکچر و رسم اجراء تقریب کے آغاز سے قبل شام 6:15 بجے سے مدعوین کے لیے چائے نوشی کا نظم رہے گا اور 7 بجے پروگرام کا آغاز ہوگا۔ کنوینر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد نے تمام مدعوین بالخصوص ادبا، شعرا، اسکالرس اور پرستاران فیضؔ وتقی سے پابندی وقت شرکت کی پر خلوص خواہش کی ہے۔ دعوت ناموں اور مزید تفصیلات کے لیے فون نمبر 9346258762 پر ربط قائم کیا جاسکتا ہے۔

روز نامہ ''سیاست'' حیدر آباد
26ر ستمبر 2011ء

فیض کسی ایک نظریہ کے حامی نہیں بلکہ عوامی انقلاب کے طرف دار تھے

ڈاکٹر تقی عابدی کے ضخیم کتاب ''فیض فہمی'' کی رسم اجرائی، ضیاء الدین شکیب، مجتبیٰ حسین اور دیگر کا خطاب

فیض احمد فیض حقوق و آزادی کے نقیب اور مظلوموں و محروموں کے طرف دار تھے۔ وہ کسی ایک نظریہ کے انقلاب کے حامی نہیں بلکہ عوامی انقلاب کے خواہاں تھے، یہی وجہ تھی کہ ان کے حمدیہ، نعتیہ و منقبتی کلام میں بھی حق پرستی کے ساتھ ساتھ مظلومیت کا ذکر ملتا ہے۔ فیض کا لہجہ ور جحان حق بیان کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ کلام پیش نہ کرنے کے باوجود جید شعراء کی صف میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار مختلف دانشوران ادب نے آج یہاں ہوٹل گرانڈ پلازہ میں ڈاکٹر تقی عابدی کی ضخیم کتاب ''فیض فہمی'' رسم اجرائی تقریب و توسیعی لکچر میں کی جس کا اہتمام مولانا آزاد کلب نے کیا تھا۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے کیا۔ اس موقع پر توسیعی خطبہ دیتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''فیض احمد فیض پر بہت سا کام کرنا باقی ہے۔ فیض شناسی پر اب تک جتنا کام ہوا ہے اس میں فیض شناسی سے زیادہ خود نمائی نظر آئی ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''فلسفہ کا سب سے بڑا شاعر سر محمد اقبالؔ ہے۔ ''جاوید نامہ'' کے 1892 اشعار ایسے ہیں جنھیں سمجھنے کی ہم نے کوشش نہیں کی ہے۔ ''جاوید نامہ'' جو تمثیلی معراج نامہ ہے پوری دُنیا کو سر محمد اقبالؔ نے ایک چیلنج کے طور پر دیا ہے جس سے ہم نا آشنا ہے۔''

انھوں نے کہا کہ ''اقبالؔ اور فیضؔ دونوں ہی سیال کوٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان

کے استاذ ایک ہی ہیں۔" انھوں نے کہا کہ "اقبالؔ کی ڈکشن کی توسیع کے بعض زاویوں کا نام فیضؔ ہے۔" انھوں نے کہا کہ "فیضؔ غزل کے صرف 480 اشعار پر زندہ وتابندہ رہے اس کی وجہ کیا ہے؟ فیضؔ نے 55 سالہ ریاضت میں صرف 70 غزلیں کہی اور اتنی مقبولیت حاصل کی اس کی وجہ کیا تھی؟ ان کی شہرت ومقبولیت کی وجہ ان کا فن، کمال، شاعری ہے۔"

انھوں نے کہا کہ "فیضؔ نے اُردو ادب کا نیا لہجہ اور منفرد علامتوں کا سلسلہ دیا ہے۔" انھوں نے فیض احمد فیضؔ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ "علامتی طریقہ، تبصرہ وتفسیر کا جو ہنر فیضؔ کے پاس ہے وہ انھیں سب سے منفرد بناتا ہے۔ ان کے کلام میں عزم، استقامت وارادہ ملتا ہے۔" انھوں نے کہا کہ "مزاحمتی واحتیاطی شاعری میں احساس جوش مارتا ہے مگر اس شاعری کا احساس جلد ہی ختم ہو جاتا ہے اس کے برخلاف فیضؔ کی شاعری میں عزم واستقلال ملتا ہے جس کے نقوش دیرپا قائم رہتے ہیں۔"

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ "فیضؔ نے نہ عشق اپنے ہاتھ سے جانے دیا اور نہ ہی سماج کے درد کو بھولے۔ فیضؔ نے رقیب کو اُردو ادب میں گنجائش فراہم کی ہے جس کا اُردو ادب میں فقدان پایا جاتا ہے۔" انھوں نے کہا کہ "جس ملا نے علامہ اقبال پر کفر کا فتویٰ جاری کیا تھا۔ انھوں نے ہی فیضؔ کے خلاف بھی کفر کا فتویٰ جاری کیا تھا۔ اقبالؔ مظلوم تھے اس لیے ان پر کفر کے فتویٰ پر ہنگامہ نہیں ہوا مگر 1959ء میں جب فیضؔ پر کفر کا فتویٰ جاری کیا گیا تو موچی دروازہ لاہور میں 40,000 مزدوروں اور پرستارانِ فیضؔ نے جلسہ کیا، چوں کہ فیضؔ عوامی شاعر تھے۔" انھوں نے کہا کہ "فیضؔ کے حمد، نعت، مناجات اور مرثیہ میں بھی مظلومیت کے پہلو کو اجاگر کیا اور حق پرستی کا مظاہرہ کیا۔ فیضؔ کا کمال ترسیل وابلاغ بہت پختہ تھا اسی لیے ان کا کلام عام آدمی کو بہت جلد متاثر کرلیا کرتا تھا۔ وہ اسلامی یا کمیونسٹ انقلاب کے حامی نہیں بلکہ عوامی انقلاب کے طرف دار تھے۔ اسلام سے زیادہ بہتر کون مظلوم کی طرف داری کرتا ہے۔"

ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے اپنا صدارتی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "فیضؔ میں باز آفرینی کی صلاحیت غیر معمولی تھی۔" انھوں نے کہا کہ "ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض احمد فیضؔ پر کتاب شائع کرتے ہوئے فیضؔ کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتے ہوئے ان پر کام کرنے کی

راہیں کھولی ہیں۔" انھوں نے فیض کے کلام کا سائنسی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور اپنے مضامین کو پیش کیا ہے اور اپنے مضامین کے علاوہ دیگر دانشورانِ ادب کے مضامین کو پیش کیا ہے۔ جن تک عام لوگوں کی رسائی نہیں تھی۔ فیض کسی کے خلاف ردِعمل و نفرت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ پاکستان سے برطانیہ آنے کے بعد ان کے ساتھ رہنے کا انھیں موقع ملا جس سے ان کی شخصیت اور کلام کو سمجھنے میں بھی مدد ملی۔ انھوں نے کہا کہ "فیض کے کلام و شخصیت کے جن پہلوؤں پر ابھی تک کام نہیں ہوا ہے اس کا ہمیں اس کتاب سے پتہ چلا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فیض پر چلائے گئے مقدمہ کی فائیل کو بھی منظرِ عام پر لایا جائے۔"

جناب مجتبیٰ حسین نے کہا کہ "طب کے جو ڈاکٹر ہوتے ہیں وہ بیماریوں کو پھیلنے سے روکتے ہیں مگر جو ادب کے ڈاکٹر ہوتے ہیں وہ بیماریوں کو پھیلاتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی جو پیشہ کے اعتبار سے طب کے ڈاکٹر ہیں ادب میں بھی بڑی حد تک دخیل ہیں مگر انھوں نے ایک ایسے دور میں جہاں غلط فہمیوں، خوش فہمیوں اور تلنگانہ فہمیوں کا دور دورہ ہے۔ "فیض فہمی" کا کام کیا ہے۔"

انھوں نے بتایا کہ "فیض احمد فیض اپنا کلام ایسا پڑھتے تھے جیسے وہ کسی دشمن کا کلام پڑھ رہے ہوں مگر ان کے کلام کو مہدی حسن اور نور جہاں نے بڑے ہی خوب صورت پیرائے میں پیش کیا ہے اور اب ڈاکٹر تقی عابدی نے "فیض فہمی" کا انداز اختیار کیا ہے۔ فیض اگر آج ہوتے تو ڈاکٹر عابدی کی "فیض فہمی" سے فیض بھی فیضیاب ہوتے۔"

پروفیسر سیدہ جعفر نے کہا کہ "فیض فہمی، ایک وقیع اور گرانقدر مرصع ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی جیسی علم دوست اور ادب نواز شخصیت کے نام سے وابستہ ہونے پر سرزمین حیدرآباد ناز کرتی رہے گی۔ اس کتاب کو انھوں نے اپنی سادگی کی بناء پر "فیض فہمی" کا نام دیا ہے جب کہ اس کو فیض انسائیکلوپیڈیا کہا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی تحقیق و کاوشوں کے ساتھ ساتھ مختلف دانشوروں، نقادوں، ادیبوں، انشاء پردازوں کے مضامین کو شامل کرتے ہوئے فیض کے مختلف گوشوں اور زاویوں کو منظرِ عام پر لائے ہیں۔ یہ کتاب تحقیق و ترتیب کا بہترین امتزاج ہے۔"

قبل ازیں پروفیسر فاطمہ پروین نے ڈاکٹر تقی عابدی کی ادبی خدمات کا جامع و

مبسوط احاطہ کیا۔ پروفیسر ریحانہ سلطانہ نے خطبہ استقبالیہ دیا۔ پروفیسر بیگ احساس نے ''فیض فہمی'' پر تبصرہ پیش کیا۔ اس موقع پر کنوینر اجلاس ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا پیام پڑھ کر سنایا جس میں وائس چانسلر نے ڈاکٹر تقی عابدی کو دو سالہ معیاد کے لیے اُردو یونیورسٹی کا وزیٹنگ پروفیسر مقرر کرنے کا اعلان کیا گیا۔

روزنامہ ''رہنمائے دکن'' حیدرآباد

27/ستمبر 2011ء

فیض کی شاعری منفرد ترسیلی نظام اور امیجری کا شاہکار

''فیض فہمی'' کی بدست پروفیسر سیدہ جعفر رسم رونمائی مقررین کی مخاطبت

فیض کو جس چیز نے فیض بنایا ہے وہ ان کا فن ان کی شاعری اور امیجری ہے۔ ایسی امیجری اُردو میں بہت کم ملتی ہے۔ فیض علامتی شاعری کا ایک مکمل شاعر ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید تقی عابدی ممتاز محقق، ادیب، شاعر دانشور و ناقد (کینیڈا) نے ''کلام فیض علامتی شاعری کا شاہکار'' موضوع پر اپنے توسیعی خطبہ کے دوران کیا جس کا انعقاد فیض صدی تقاریب کے سلسلے میں مولانا آزاد کلب حیدرآباد کے زیر اہتمام کانفرنس ہال ہوٹل گرانڈ پلازا متصل حج ہاؤس حیدرآباد عمل میں لایا گیا تھا۔ ممتاز مورخ دانشور و نقاد ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب نے اس تقریب کی صدارت کی جب کہ پروفیسر سیدہ جعفر سابق صدر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ و حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے بحیثیت مہمان خصوصی اور پدم شری پروفیسر مجتبیٰ حسین نے بحیثیت مہمان اعزازی اس تقریب میں شرکت کی۔ سلسلہ خطاب جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''فیض نے حمد ہو کہ نعت، منقبت ہو کہ مرثیہ، ہر صنف میں اپنے فن کو انتہائی منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''فیض کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنا ایک علیحدہ ترسیلی نظام رکھتے ہیں۔ جس کے باعث ان کی شاعری میں ترسیل و ابلاغ مسئلہ بآسانی حل ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''فیض کے کلام میں غنائیت بھری ہوئی ہے۔ لیکن فیض ایک جرأت مند شاعر ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ ''جہاں فیض ''مجھ سے پہلی سی محبت نہ مانگ'' کے ذریعہ اپنے لہجہ کا تعارف کرواتے ہیں وہیں غم جاناں و غم دوراں کو بھی اپنی

شاعری کے بہترین علامات کے ذریعہ پیش کیا اور اس دوراہے پر فیضؔ نے اپنی زندگی اور فن کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بنا دیا۔'' انھوں نے کہا کہ ''فیضؔ نے 55 سال میں صرف 70 غزلیں کہی ہیں جب کہ باقیات فیضؔ میں ان کے کلام کو پوری طرح سے شامل ہی نہیں کیا گیا ہے۔'' ڈاکٹر عابدی نے فیضؔ کی مختلف نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ ''فیضؔ نے اپنے مرثیہ کے صرف 72 مصرعوں میں علامتی شاعری کا ایک منفرد اسلوب پیش کیا ہے۔''

محترمہ لیتا روی نے کلام فیضؔ پیش کرتے ہوئے اپنی نوعیت کی انتہائی سادہ مگر پر اثر تقریب کا آغاز کیا۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر سیدہ جعفر نے اس موقع پر ملٹی میڈیا افیرس لاہور پاکستان کی جانب سے شائع کی جانے والی ڈاکٹر عابدی کی مرتبہ 1424 صفحات پر محیط ہمہ رنگین بالتصویر کتاب ''فیضؔ فہمی'' کی رسم رونمائی انجام دینے کے بعد اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''فیضؔ فہمی'' ڈاکٹر عابدی کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ لہٰذا اس کتاب کا نام فیضؔ انسائیکلوپیڈیا بھی ہوسکتا ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے ڈاکٹر عابدی کو بیک وقت ایک نامور طبیب اور ماہر اُردو ادیب ہونے پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے۔ اس یقین کا اظہار کیا کہ ''فیضؔ پر ڈاکٹر عابدی کی یہ کتاب نسل نو کے لیے تحقیق و تنقید کے نئے باب کھولے گی۔ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین شکیب نے اپنے صدارتی خطاب میں فیضؔ کے ساتھ گزارے ہوئے ایام کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہا کہ ''فیضؔ صدی کا سال منانے کے لیے ہمارے ہاں وہ ساز و سامان نہیں تھا، لیکن ''فیضؔ فہمی'' کی اشاعت کے ذریعہ ڈاکٹر عابدی نے فیضؔ صدی تقاریب اور فیض شناسوں کو ایک نایاب تحفہ دیا۔'' انھوں نے کہا کہ ''فیضؔ انتہائی نرم مزاج تھے۔ انھوں نے کسی کے خلاف نفرت کا اظہار نہیں کیا۔''

ڈاکٹر شکیب نے کہا کہ ''فیضؔ پر ابھی بہت کام باقی ہے لہٰذا ڈاکٹر عابدی ''فیضؔ فہمی'' کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کو دو جلدوں میں تقسیم کرتے ہوئے فیضؔ صدی تقاریب کے ضمن میں سال بھر منعقد کیے جانے والے پروگراموں کی روداد کو بھی ایک کتاب میں شامل کرسکتے ہیں کیوں کہ ڈاکٹر عابدی سائنٹفک نظریات کے ساتھ اپنی تحقیقی و تنقیدی

تخلیقات کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ مہمان اعزازی پدم شری پروفیسر مجتبیٰ حسین نے اپنے خطاب میں کہا کہ ''ڈاکٹر عابدی جو بھی کام کرتے ہیں کمال کا کام کرتے ہیں۔'' پروفیسر مجتبیٰ حسین نے کہا کہ ''اگر آج فیضؔ زندہ ہوتے تو تقی عابدی سے اپنے اشعار سن کر ''فیض فہمی'' سے وہ بھی مستفید ہوتے۔'' پروفیسر مجتبیٰ حسین نے کہا کہ ''حیرت اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر عابدی اکیلے ہی یہ سارے کام اس حسن وخوبی سے انجام دیتے ہیں کہ ان کی کاوشوں کو سراہا نہ جائے تو یہ ادبی بددیانتی ہوگی۔''

پروفیسر بیگ احساس صدر شعبۂ اُردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے ''فیض فہمی'' کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''فیض احمد فیضؔ'' پر اتنی جامع کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی مستقبل میں اس کی امید ہے۔

پروفیسر فاطمہ پروین وائس پرنسپل کالج آف آرٹس جامعہ عثمانیہ نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تعارف اور ''فیض فہمی'' کا جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیقات میں ان کی ذاتی دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان کا خون جگر شامل ہوتا ہے۔ ابتداء میں پروفیسر ریحانہ سلطانہ نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے مولانا آزاد کلب حیدرآباد کے قیام کے اغراض ومقاصد اوران کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا۔

جناب سید فاضل حسین پرویز ایڈیٹر ''گواہ'' نے اس موقع پر ہفت روزہ ''گواہ کے زیر اہتمام 11رفروری کو حیدرآباد میں منعقدہ فیضؔ صدی کی پہلی تقریب کی روداد پر مبنی CD ڈاکٹر تقی عابدی کو پیش کی۔

پروفیسر ریحانہ سلطانہ، جناب عباس خان لائبریرین انچارج مانو، ڈاکٹر نکہت جہاں ایسوسی ایٹ پروفیسر مانو، جناب محمد مجاہد علی پروڈیوسر، انسٹرکشنل میڈیا سنٹر مانو اور ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم نے مہمانوں کو نذرانہ گل پیش کیے۔ ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد ڈپٹی ڈائرکٹر سی پی ڈی یو ایم ٹی مانو و بانی صدر کلب نے وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی پروفیسر محمد میاں کی جانب سے ڈاکٹر عابدی کو اُردو یونیورسٹی کا اعزازی وزیٹنگ پروفیسر بنائے جانے کے سلسلے میں پروفیسر محمد میاں کا پیام مبارک پیش کیا۔ نظامت کی اور کلمات تشکر پیش کیے۔ اس تقریب میں پرستارانِ فیض احمد فیضؔ اور تقی عابدی کی ایک بڑی

تعداد موجود تھی۔ اس موقع پر ڈاکٹر عابدی نے حاضرین کے استفسارات کے بھی تشفی بخش جوابات دیئے۔ جناب رحیم الدین کمال، جناب منظور الامین، ڈاکٹر حبیب نثار، ڈاکٹر میر محبوب حسین، ڈاکٹر شیخ سلیم، ڈاکٹر اسلم پرویز، جناب صلاح الدین نیر، جناب علی ظہیر اور نمائندہ اساتذہ و اسکالرس بھی اس تقریب میں شریک تھے۔ جناب حمید المظفر نے اس موقع پر اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جانب سے شائع کردہ منتخبہ کتابیں ڈاکٹر عابدی کو تحفۃً پیش کیں۔

روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد

27/ستمبر 2011ء

اُردو کی ترقی و ترویج کے لیے
ڈاکٹر سید تقی عابدی کی خدمات کا اعتراف

مولانا آزاد اُردو یونیورسٹی کے اعزازی وزیٹنگ پروفیسر مقرر کرنے کا فیصلہ

وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی پروفیسر محمد میاں نے ممتاز محقق، ادیب، شاعر و نقاد ڈاکٹر سید تقی عابدی کو دُنیا بھر کی اُردو کی نئی بستیوں میں ہندوستان کے سفیر اُردو کی حیثیت سے اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے کی جانے والی انتھک کاوشوں کے اعتراف میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا اعزازی وزیٹنگ پروفیسر مقرر کیا ہے۔ مولانا آزاد کلب حیدرآباد کے زیر اہتمام یہاں منعقدہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی بین الاقوامی ایوارڈ یافتہ کتاب ''فیض فہمی'' کی تقریب رسم اجرائی و توسیعی لکچر ''کلام فیض: علامتی شاعری کا شاہکار'' کے موقع پر کلب کے بانی صدر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، ڈپٹی ڈائریکٹر، مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذہ اُردو ذریعہ تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد نے وائس چانسلر یونیورسٹی پروفیسر محمد میاں کی جانب سے ارسال کردہ پیام کو سناتے ہوئے یہ اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی دُنیائے اُردو میں ناقابل فراموش خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں دو سال کے لیے اُردو یونیورسٹی کا اعزازی وزیٹنگ پروفیسر مقرر کیا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے آپ جیسے بے لوث محبّ اُردو کی اُردو دُنیا میں اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے کی جانے والی ناقابل نظر انداز غیر معمولی خدمات کے پیش نظر دو سال کی میعاد کے لیے آپ کو اُردو یونیورسٹی کا اعزازی وزیٹنگ

پروفیسر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اُردو یونیورسٹی کے مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذہ اُردو ذریعہ تعلیم کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں کے احکامات اور ان کی ہدایت کے مطابق جب یہ اعلان کیا تو تقریب میں موجود بے شمار پرستارانِ تقی عابدی نے تالیوں کی گونج میں اس کا خیر مقدم کیا۔ کرسی صدارت پر موجود ڈاکٹر سید ضیاء الدین احمد شکیب اور مہمان اعزازی نامور مزاح نگار و کالم نویس پدم شری پروفیسر مجتبیٰ حسین اور پروفیسر سیدہ جعفر سابق صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ و حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے بھی جو اس تقریب کی مہمان خصوصی تھیں، پروفیسر محمد میاں کے اس اقدام کی ستائش کرتے ہوئے اسے ایک فال نیک قرار دیا اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کو مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد کے مطابق ڈاکٹر سید تقی عابدی کے آئندہ دورہ حیدرآباد کے موقع پر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں ڈاکٹر سید تقی عابدی کو احکامات تقرری پیش کریں گے۔

نئی دہلی

دسمبر 2011ء

منیزہ ہاشمی اور ڈاکٹر تقی عابدی کا جے این یو میں استقبالیہ

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں معروف و مشہور شاعر اور ترقی پسند تحریک کے روح رواں فیض احمد فیضؔ کی صاحبزادی منیزہ ہاشمی اور معروف اسکالر ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) کی ہندوستان آمد پر انھیں یونیورسٹی کے زبانوں کے مرکز میں بعنوان ''فیض اور ان کی وراثت'' ایک استقبالیہ دیا گیا۔ اپنی خیر مقدمی تقریر میں فارسی زبان کے استاد ڈاکٹر اخلاق آہنؔ نے کہا کہ ''فیضؔ نے فکر کی مختلف جہات کو متاثر کیا اور عہد جدید کے بڑے شعراء ادباء کی عظمت کی بنیاد یہ ہے کہ ان کی تخلیقی جڑیں ہماری تہذیبی روایات میں پیوست ہیں۔

شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کی ڈاکٹر ارجمند آرا نے اپنی تقریر کے دوران فیضؔ کی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے وابستگی اور موجودہ بحران میں فیضؔ کی بازگشت کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اسی یونیورسٹی کے استاد پروفیسر علی جاوید نے یونیورسٹی میں فیض احمد فیضؔ کی آمد پر ہوئے ایک تاریخی مشاعرے کا ذکر کیا جس میں جگہ نہ ملنے کے باعث عالمی شہرت یافتہ مصور مرحوم مقبول فدا حسین نے کئی گھنٹے کھڑے ہو کر اس مشاعرے کو سنا تھا۔ معروف اسکالر ڈاکٹر تقی عابدی نے فیضؔ کے حوالے سے نوجوانوں سے اپیل کہ فیضؔ کو ہمیں اکیسویں صدی میں ان کے تمام عملی اور جدوجہد سے بھرپور کارناموں کے ساتھ لے جانا ہے، البتہ انھوں نے فیضؔ پر اُردو ادب میں تنقید کے نئے پہلوؤں کی جانب فقدان کا بھی اشارہ کیا۔

مہمانِ خصوصی محترمہ منیزہ ہاشمی نے فیض احمد فیضؔ سے وابستہ اپنے بچپن کے بہت سے واقعات کا ذکر کیا۔ بتایا کہ ''فیضؔ نے ہمیں کبھی بھی زندگی کے کسی بھی نشیب و فراز پر ہمت نہ ہارنے کا حوصلہ عطا کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے پاکستان میں فیضؔ گھر کے قیام سے متعلق جانکاری بھی سامعین کو فراہم کی اور اسے دیکھنے کی دعوت بھی دی۔''

صدر جلسہ پروفیسر شاہد حسین نے کہا کہ ''فیض احمد فیض کی یادوں کے نقوش جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے درودیوار پر نمایاں ہیں اور جس قدر اس یونیورسٹی میں انھیں پڑھا اور گایا جاتا ہے، اتنا کسی اور کو نہیں۔ فیض کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ بعد میں انھوں نے تمام حاضرین اور مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کیا۔

جلسے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر منتظر قائمی نے انجام دیا۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر گوبند پرساد، پروفیسر بٹولا، ڈاکٹر دیویندر چوبے، ڈاکٹر عمر رضا، سمر پانڈے، پرکاش کمار رے، خوشحال سنگھ، ڈاکٹر عبیدالغفار، ڈاکٹر محمد عمر، ارشد جمال، شیلیش سنگھ، عامر نیاز، محمد احسان، محمد شارد، شبیر عالم، ڈاکٹر مرتضیٰ علی اطہر، ڈاکٹر محمد ہادی رہبر کے علاوہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے اساتذہ وطلبا نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

فیضؔ کے اشعار سے ان کے طرف دار اور مخالف دونوں محظوظ اور مستفید ہوتے تھے: ڈاکٹر تقی عابدی

فیضؔ نے فکر کی مختلف جہات کو متاثر کیا اور عہد جدید کے بڑے شعراء ادباء کی عظمت کی بنیاد یہ ہے کہ ان کی تخلیقی جڑیں ہماری تہذیبی روایات میں پیوست ہیں۔ یہ بات جواہر لعل یونیورسٹی میں فارسی زبان کے استاد ڈاکٹر اخلاق آہنؔ نے فیض احمد فیضؔ کی صاحبزادی منیزہ ہاشمی کی ہندوستان آمد پر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں زبانوں کے مرکز میں ''فیض اور ان کی وراثت'' کے عنوان سے منعقدہ استقبالیہ تقریب میں خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہی۔ دہلی یونیورسٹی کے استاد پروفیسر علی جاوید نے یونیورسٹی میں فیض احمد فیضؔ کی آمد پر ہوئے ایک تاریخی مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''اس مشاعرہ میں اتنا مجمع تھا جس میں جگہ نہ ملنے کے باعث معروف مصور مرحوم مقبول فدا حسین نے کئی گھنٹے کھڑے ہو کر اس مشاعرے کو سنا تھا۔'' کینیڈا کے معروف اسکالر ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''فیضؔ کے اشعار سے ان کے طرف دار اور ان کے مخالف دونوں محظوظ اور مستفید ہوتے تھے۔ فیضؔ شعر کو کوزے میں مضمون کے سمندر کو نہ صرف سمو دیتے ہیں بلکہ اس میں تلاطم بھی پیدا کر دیتے ہیں۔'' فیضؔ کے حوالے سے نوجوانوں سے اپیل کرتے ہوئے ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''فیضؔ کو ہمیں اکیسویں صدی میں ان کے تمام عملی اور جدوجہد سے بھرپور کارناموں کے ساتھ لے جانا ہے، البتہ انھوں نے فیضؔ پر اُردو ادب میں تنقید کے نئے پہلوؤں کی جانب فقدان کا بھی اشارہ کیا۔

مہمانِ خصوصی منیزہ ہاشمی نے اپنے والد فیض احمد فیضؔ سے وابستہ اپنے بچپن کے

بہت سے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''فیضؔ نے ہمیں زندگی کے ہر محاذ پر ہمت نہ ہارنے کا حوصلہ عطا کیا۔'' انھوں نے پاکستان میں فیض گھر کے قیام کے تعلق سے سامعین کو معلومات فراہم کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ سب لوگ فیضؔ کے گھر کو دیکھنے کے لیے پاکستان آئیں۔''

صدر جلسہ پروفیسر شاہد حسین نے کہا کہ ''فیض احمد فیضؔ کو جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے بے پناہ لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی یادوں کے نقوش یونیورسٹی کے در و دیوار پر نمایاں ہیں اور جس قدر اس یونیورسٹی میں انھیں پڑھا اور گایا جاتا ہے، اتنا کسی اور کو نہیں۔ اس کے علاوہ شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی میں استاد ڈاکٹر ارجمند آراء نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر منتظر قائمی نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر گوبند پرساد، پروفیسر بٹولا، ڈاکٹر دیویندر چوبے، ڈاکٹر عمر رضا، سمر پانڈے، پرکاش کمار رے، خوشحال سنگھ، ڈاکٹر عبیدالغفار، ڈاکٹر محمد عمر، ارشد جمال، شیلیش سنگھ، عامر نیاز، محمد احسان، محمد شارد، شبیر عالم، ڈاکٹر مرتضیٰ علی اطہر، ڈاکٹر محمد ہادی رہبرؔ کے علاوہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے اساتذہ و طلبا نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

خصال مہدی

نئی دہلی

23/دسمبر 2011ء

فیض اگر ایران میں ہوتے تو ان پر ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہوتیں

غالب انسٹی ٹیوٹ میں ''مزاحمتی ادب کی جمالیات اور فیض'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں مقررین کا اظہارِ خیال

میں صحت کا طبیب اور ادب کا مریض ہوں۔ یہ بات غالب انسٹی ٹیوٹ میں ''مزاحمتی ادب کی جمالیات اور فیض'' کے موضوع پر منعقدہ ''بین الاقوامی غالب سیمینار'' میں کینیڈا کے معروف اسکالر ڈاکٹر تقی عابدی نے کہی۔ انھوں نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''فیض فہمی'' کے تعلق سے کہا کہ ''کتاب تیار ہونے تک فیض کے 700 سے زیادہ مقالے آئے ہیں اور اس طرح فیض کے اوپر 80 سال میں 700 مقالے لکھے گئے۔'' انھوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ''چار سو ملین لوگوں کی زبان والے فیض پر ساٹھ یا ستر کتابیں لکھی گئیں۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''فیض جیسا شاعر اگر ایران میں ہوتا تو آج ان پر تین ہزار سے زائد کتابیں لکھی جا چکی ہوتیں۔'' مزاحمتی ادب کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ ''مزاحمتی شاعری کی بات کی جائے تو مزاحمتی اشعار سب سے زیادہ فیض کے مرثیوں میں نظر آئیں گے، مرثیہ صرف امام باڑوں کی جاگیر نہیں ہے۔ بلکہ مرثیہ سے فکری اور موضوعاتی وابستگی سامنے آتی ہے، مرثیہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کا نام ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''فیض کی سب سے بڑا شاعر ہونے کی یہی وجہ ہے کہ فیض کی زبان سے لوگوں نے احتجاج کا طریقہ سیکھا۔ فیض جیسے عظیم شاعر نے ہمیں لہجہ دیا۔ فیض کی خاصیت ہے کہ

انھوں نے کبھی غصہ کو ظاہر نہیں کیا انھوں نے ہمیشہ جلال کو جمال کی صورت میں پیش کیا، لوگ فیضؔ کی زبان دانی میں رہ گئے، جب کہ فیضؔ نے بڑی عمدگی کے ساتھ پوری شاعری کو پیش کیا ہے۔ اس سے قبل سیمینار کا پہلا اجلاس انجمن ترقی اُردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کی صدارت میں شروع ہوا۔ جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے لندن کے معروف اسکالر اور ''صدا'' میگزین کے ایڈیٹر ڈاکٹر اقبال مرزا نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر علی جاوید، پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر لطف الرحمان اور پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے مقالے پڑھے۔ اس اجلاس میں زماں آزردہ کا مقالہ اس اعتبار سے اہمیت کا حامل رہا کہ انھوں نے فیضؔ کی شاعری کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جس پر عام طور سے اہل علم کی کم نظر پڑتی ہے۔ پروفیسر آزردہ نے اپنے مقالے میں ان اسلامی تعلیمات کا ذکر کیا جن تعلیمات کا اثر فیضؔ اور اقبالؔ کی شاعری میں بخوبی نظر آتا ہے۔

پروفیسر لطف الرحمان نے فیضؔ اور اقبالؔ کی شاعری کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ دونوں کی شاعری میں کافی مماثلت ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''ہمیں فیضؔ کی احتجاجی شاعری کے ساتھ ساتھ جوشؔ کی مزاحمتی شاعری کو بھی یاد کرنا چاہیے۔'' اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت فیض احمد فیضؔ کی صاحبزادی منیزہ ہاشمی نے کی، اور نظامت اشفاق عارفی نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر تقی عابدی بھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں تین مقالے پیش کیے گئے۔ اپنی صدارتی تقریر میں فیضؔ کی صاحبزادی منیزہ ہاشمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''فیضؔ تمام زندگی انسانوں کے درمیان کی دوری کو ختم کرنے میں کوشاں رہے۔ اسی لیے اگر لوگ فیضؔ کے کلام کا بغور مطالعہ کریں تو ہر روز نئی فکر سامنے آئے گی۔'' انھوں نے فیضؔ کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''انھوں نے کبھی اپنے آپ کو 'میں' نہیں کہا وہ جب بھی کسی سے بات کرتے تھے تو ''ہم'' کہہ کر بات کرتے تھے۔'' اس اجلاس کے مقالہ نگاروں میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد کے پروفیسر وہاب قیصر، پاکستان کے معروف ادیب و دانشور ڈاکٹر اصغر ندیم سید اور انتظار حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح تیسرا اجلاس پروفیسر صادق کی صدارت میں

شروع ہوا جس کی نظامت ڈاکٹر شعیب رضا خاں نے کی۔

ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے اپنے مقالے میں کہا کہ ''فیض کی زندگی پاکستان اور بیروت کے اسلامی معاشرہ میں زیادہ گزری اسی لیے اثرات ان کی شاعری پر بھی نظر آتے ہیں۔'' اس کے علاوہ ڈاکٹر کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر ثروت خان، ڈاکٹر ارجمند آرا نے اپنے مقالے پیش کیے۔ چوتھے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر کشمیری لال ذاکر نے کی اور نظامت ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے کی۔ اس میں پروفیسر راجندر کمار اور پروفیسر مرلی منوہر نے ہندی ادب میں فیض کی مقبولیت کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''فیض جتنا اُردو والوں کے لیے مقبول ہیں اتنا ہی ہندی والوں کے لیے ہیں۔'' اجلاس کے اختتام کے بعد ایوان غالب کے آڈیٹوریم میں عالمی مشاعرہ کا باقاعدگی کے ساتھ آغاز ہوا۔ جس میں ملک و بیرون ملک کے شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔

پروگرام میں ڈاکٹر مولا بخش، لئیق رضوی، جاوید رحمانی، سلیم امروہوی، مفتی افروز عالم، خواجہ حسن ثانی نظامی، عابد سہیل، دھرم ویر، امیر احمد، فائز شکار پوری، ڈاکٹر منتظر قائمی، محمد ہادی رہبر اور شمیم اختر کے علاوہ اُردو کے متعدد اسکالر موجود تھے۔

نئی دہلی 2011ء

فیضؔ نے ہندو پاک کے درمیان پل کا کام کیا

گزشتہ دنوں ایوان غالب انسٹی ٹیوٹ اور قومی اُردو کونسل کے تعاون سے منعقدہ سیمینار میں ڈاکٹر کرن سنگھ نے کہا کہ ''فیضؔ کو ہم لوگ اتنا ہی مانتے ہیں جتنا پاکستان کے لوگ، کیوں کہ فیضؔ نے دونوں کے درمیان ایک پل کا کام کیا ہے۔'' انھوں نے مزید کہا کہ ''فیضؔ کسی ایک ملک کے نہیں ہیں بلکہ وہ پوری دنیا کے لیے قابل احترام ہیں اسی لیے فیضؔ کی صدی پوری دنیا میں منائی جارہی ہے۔'' انھوں نے مزید کہا کہ ''اُردو زبان بہت ہی خوب صورت زبان ہے اور یہ پوری دنیا کی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''ہندو پاک کے تعلقات کبھی سازگار ہوتے ہیں، کبھی ناساز، لیکن بہرحال ادبی حلقوں کے تعلقات کبھی خراب نہیں ہوتے ہیں۔'' پروفیسر نامور سنگھ نے کہا کہ ''فیضؔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔'' ہندوستان میں یا تو رابندر ناتھ ٹیگور کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی یا پھر فیضؔ کو۔'' فیض احمد فیضؔ کی صاحبزادی منیزہ ہاشمی نے کہا کہ ''میرے والد فیضؔ کو ہندوستان میں ایک نئے زاویہ سے دیکھا جاتا ہے۔'' انھوں نے بتایا کہ فیضؔ کے کلام کو ابھی دو سال قبل ہی سنجیدگی سے پڑھنا شروع کیا اور جب جب ان کا کلام پڑھتی ہوں اس میں نئے نئے زاویہ، معنی اور مفاہم سامنے آتے ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ ''ہندوستان میں فیضؔ پر بہت کام ہورہا ہے اور پاکستان میں بھی یہ سال فیضؔ کے نام سے منایا گیا ہے۔'' اس موقع پر ملک کی مختلف ادبی شخصیات نے شرکت کی۔

محمد نقی شاداب (الہ آباد)
2012ء

فیضؔ نے اپنی شاعری کی زمین کو گنگا کی زمین سے زرخیز کیا ہے: ڈاکٹر تقی عابدی

پروفیسر اعجاز حسین ایوارڈ برائے 2012ء سے نوازے گئے ڈاکٹر عابدی

ادب و تحقیق پر مشتمل 37 رکتابوں کے مصنف مجاہد ادب ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) نے ''پروفیسر اعجاز حسین'' کی اعزازی تقریب میں تقریباً 60 منٹ فیض احمد فیضؔ کی شاعری اور شخصیت پر یادگاری خطبہ کے طور پر روشنی ڈالی۔ ہوٹل ولاس لائنس میں اراکین ادبی انجمن کارواں کی جانب سے منعقد پروگرام کی صدارت خواجہ معین الدین چشتی لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر انیسؔ انصاری نے کی۔ خصوصی مہمان کی حیثیت سے شریک ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) نے اپنے بلیغ خطاب میں کہا کہ ''فیضؔ 21 ویں صدی کے سب سے بڑے شاعر تھے، ان کا لہجہ سب سے منفرد تھا، انھوں نے اپنی شاعری میں جس لہجے کا استعمال کیا ہے اسے آپ جدید لب و لہجے کا نام دے سکتے ہیں۔'' اور انھوں نے کہا: ''میں نے صرف فیضؔ پر تین کتابیں لکھیں ہیں۔ ''فیضؔ شناسی''، ''فیضؔ فہمی'' اور ''باقیاتِ فیضؔ'' جس میں 1700 مضمون لکھے گئے ہیں۔ فیضؔ نے نظموں کے علاوہ 63 سال میں صرف 70 غزلیں کہیں جس کا ایک ایک شعر بیش قیمت ہے اور ہزاروں معنیٰ سے پُر ہے۔ فیضؔ نے جہاں عشقیہ شاعری کی ہے وہیں انقلاب کی طرف بھی سفر کیا ہے۔ فیضؔ کی رومانی شاعری ہو انقلابی بے مثال ہے۔''

مسٹر تقی عابدی نے کہا: ''فیضؔ کا لہجہ صبح آزادی میں دیکھئے جو انھوں نے 1949ء میں لکھی۔ فیضؔ کی شاعری کے اثرات دیرینہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ فیضؔ علامات میں

بات کرتے تھے، فیضؔ اشاروں میں بات کرتے تھے اور کنایوں میں بات کرتے تھے۔ ان کا لہجہ گفتگو میں بھی بہت ہی نرم ہوتا تھا اور انتہائی معنی خیز بھی۔'' ڈاکٹر تقی نے کہا: ''جیسے غالب کے قد سے سارے شاعر نیچے تھے ویسے ہی فیضؔ کے قد سے بھی عہدِ نو میں سارے شاعر نیچے ہیں۔ فیضؔ نے گنگا سے اپنی شاعری کی زمین کو زرخیز کیا ہے۔ انھوں نے مرثیہ بھی کہا ہے 72 مصرعوں کا ان کا مرثیہ یعنی 36 شعر وہ بھی اپنے آپ میں بے مثال ہیں۔''

انھوں نے اس موقعہ پر ترقی پسند کے حوالے سے بھی گفتگو کی کہا کہ ''ترقی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن تحریک ابھی باقی ہے۔ ایران کے انقلاب کو بھی اپنی گفتگو کا محور بنایا۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر تقی عابدی کو پروفیسر اعجاز حسین ایوارڈ 2012ء سے بھی نوازا گیا۔ صدارتی کلمات میں ڈاکٹر انیس نے کہا کہ ''ہندوستان کے ہر اس شعر پر بات ہونی چاہیے جنھوں نے ہندوستانی زبان میں کام کیا ہے۔'' انھوں نے کہا: ''بے شک اُردو کو عروج بام تک پہنچانے میں فیضؔ کا بڑا ہاتھ تھا، بے شک فیضؔ ایک بڑے انسان تھے ان کا کردار بہت بڑا تھا۔ لیکن ان کے ساتھ ملک محمد جائسی اور کبیر داس کو بھی یاد کرنا ہمارا فرض ہے۔'' اُردو کے حوالے سے انھوں نے کہا: ''اُردو کی ترقی تب ہی ممکن ہے جب ہم اُردو کو ٹکنالوجی سے جوڑیں گے۔''

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی نے فیضؔ کے بارے جو میں انکشافات کیے ہیں وہ واقعی میں قابل رشک ہیں۔ پروفیسر جعفر رضا نے پروفیسر اعجاز پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے تقی عابدی کی تخلیق کردہ تصنیف ''فیضؔ شناسی'' کی۔ ستائش کی استقبالیہ پیش کیا حسن نقوی نے ڈاکٹر فاضل ہاشمی نے پروفیسر اعجاز حسین کا تعارف پیش کیا اور نظامت کے فرائض بحسن خوبی انجام دیے۔ شرکاء میں مولانا ابوالقاسم، کامریڈ ضیاالحق، پروفیسر نوشابہ سردار، پروفیسر صالحہ رشید، سید علی حیدر، ڈاکٹر قمرالحسن صدیقی، احمد حسنین، ڈاکٹر اشفاق، ڈاکٹر نغمہ جائسی، محمد عسکری، ڈاکٹر قمر عابدی، ڈاکٹر فخرالکریم، چودھری ابن النصیر، سبط حسن، ڈاکٹر شاہ نواز عالم، سید امین اختر، سید مددگار حسین رضوی، خورشید نقوی، عزادار حسین، شانہ رضوی اور ڈاکٹر ارشد جعفری کے علاوہ شہر کے تمام ادباء وشاعر موجود رہے۔

حیدرآباد
31/اکتوبر 2012ء

مرثیہ کی شاعری میں اعلیٰ اخلاقی اور انسانی معیارات کا عظیم ذخیرہ

جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اُردو میں ڈاکٹر تقی عابدی کا خطاب

اُردو شعروادب کی دُنیا میں مرثیہ ایک ایسی صنف شاعری ہے، جس میں اعلیٰ انسانی اقدار اور اخلاقی معیارات کا اسّی فیصد ذخیرہ موجود ہے۔ اُردو مرثیہ کا مطالعہ آج کے انسانی مسائل کے تناظر میں کیا جائے تو ساری انسانیت کی بقاء ممکن ہے کیوں کہ دورِ حاضر کا انسان مادی طور پر جس بلندی پر پہنچ چکا ہے اتنا ہی اخلاقی طور پر پستی کا شکار ہے، جس کا تدارک اعلیٰ ادبیات کی توضیح و تشریح کے ذریعہ ممکن ہے۔ ان خیالات کا اظہار کینیڈا سے آئے ہوئے مہمان اور طبیب مستند ڈاکٹر تقی عابدی شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ کی جانب سے منعقد توسیعی خطبہ کے دوران کررہے تھے۔ جب کہ پروفیسر ایس سدرشن راؤ پرنسپل آرٹس کالج نے صدارت کی اور آرٹس کالج کا مومنٹو پیش کرکے مہمان کا استقبال کیا۔

ڈاکٹر تقی عابدی طلباء اور اساتذہ سے ''میر انیسؔ کے کلام میں انسانی اقدار'' کے عنوان سے مخاطب تھے۔ انھوں نے عصری تناظر میں کلامِ انیسؔ کے مطالعہ کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ ''ادب کی ایسی خدمت کا کام مادر جامعہ عثمانیہ کے سپوت ہی انجام دے سکتے ہیں۔'' انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں اپنی تعلیم اور ادب سے لگاؤ پر روشنی ڈالتے ہوئے طلباء پر واضح کیا کہ ''وہ خوش نصیب ہیں کہ انھیں جامعہ عثمانیہ میں درس حاصل کرنے کا موقع دستیاب ہوا۔'' اس توسیعی خطبہ کا آغاز پروفیسر مجید بیدار کے افتتاحی کلمات سے ہوا، جس میں انھوں نے میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور نجمؔ آفندی کی جدید تناظر میں بازیافت کی ستائش

کرتے ہوئے یہ کارنامہ انجام دینے پر ڈاکٹر تقی عابدی کو مبارک باد پیش کی۔

پروفیسر فاطمہ بیگم صدر شعبہ اُردو نے مہمان کا استقبال کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ڈاکٹر محمد ضیاء الدین شکیب نے اپنے خطاب میں ڈاکٹر تقی عابدی کی ہمہ جہت شخصیت اور مسلسل ادبی کام جاری رکھنے پر انھیں مبارک باد پیش کی اور ان کی خطابت اور طرز تحریر میں موجود عصری حسیت کی ستائش کی۔ اس توسیعی خطبہ میں عربی، فارسی اسلامک اسٹڈیز اور دوسرے شعبہ جات کے اساتذہ اور طلباء نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ ''صحافت''، ''راشٹریہ سہارا''
نئی دہلی
17/دسمبر 2012ء

ڈاکٹر تقی عابدی کو یونائیٹڈ اکنامک فورم کی جانب سے استقبالیہ

کینیڈا میں مقیم معروف ادیب، شاعر اور مصنف ڈاکٹر سید تقی عابدی کی دہلی آمد پر یونائیٹڈ اکنامک فورم کی جانب سے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں ایک استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر فورم کے سرپرست ڈاکٹر ایس. فاروق نے ڈاکٹر عابدی کو شال پہنا کر ان کا استقبال کیا۔ ساتھ ہی اس بات پر اظہارِ تشکر کیا کہ ڈاکٹر عابدی نے فورم کی تقریب میں شرکت کر کے اپنی علمی و ادبی گفتگو سے حاضرین کے علم میں اضافہ کیا۔ پروگرام میں فورم کے صدر اور ایمس کے سابق ڈین پروفیسر ایم. فاروق، نائب صدر آصف اعظمی، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی کے علاوہ آندھرا بینک کے چیف منیجر جاوید اقبال، راشد حامدی، نعمان انور، فیصل امین الاسلام، مدثر عالم، غضنفر الٰہی، محمد مسرور عالم وغیرہ بطور خاص موجود تھے۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے شاہد ماہلی نے کہا کہ ''ڈاکٹر عابدی اپنے علم و دانش کی وجہ سے صرف کینیڈا کے ٹورنٹو شہر تک محدود نہیں ہیں بلکہ جہاں جہاں بھی اُردو کے چاہنے والے ہیں وہاں ان کے نام لیوا موجود ہیں وہ اُردو کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ تازہ تصنیف ''فیضِ فہمی'' ڈاکٹر عابدی کی علمی و ادبی صلاحیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔''

پروفیسر ایم. فاروق نے تقی عابدی کی تشریف آوری کو نیک فال بتاتے ہوئے کہا کہ ''یہ ہمارے لیے خوش قسمتی کی بات ہے کہ وہ ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہمیں ان سے سیکھنے کا موقع ملے گا۔'' تقی عابدی نے اعزاز کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ

’’پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے قطب شاہ پر ایک کتابچہ تحریر کیا تھا اور اب جب کہ ان کی عمر 50 سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ 41 کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ ان میں حال ہی میں شائع ’’فیض فہمی‘‘ بھی ہے۔‘‘ انھوں نے بتایا کہ ’’فی الحال وہ شاعر مشرق علامہ اقبالؔ کے جاوید نامے پر کام کر رہے ہیں امکان ہے کہ آئندہ ایک سال میں یہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔‘‘

روزنامہ ''انقلاب''، نئی دہلی

19/دسمبر 2012ء

جے این یو میں فیضؔ میموریل لکچر کا انعقاد

ڈاکٹر تقی عابدی نے ''غالبؔ کی فارسی شاعری'' پر خصوصی لکچر دیا

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف لینگویج لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز میں سینٹر آف انڈین لینگویجز کے زیر اہتمام تیسرے فیضؔ میموریل لکچر بعنوان ''غالبؔ کی فارسی شاعری'' کا انعقاد کیا گیا۔ خصوصی لکچر کے لیے ہند نژاد، ڈاکٹر تقی عابدی مقیم حال کینیڈا مدعو تھے۔ پروگرام کے کنوینر پروفیسر معین الدین جینابڑے نے صدر جلسہ پروفیسر اسلم اصلاحی کا تعارف کرایا اور پروفیسر مظہر مہدی نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''غالبؔ ایک نابغۂ روزگار شاعر تھے۔ انھیں بلا تکلف دُنیا کے عظیم شعراء کی جماعت میں رکھا جاسکتا ہے۔ غالبؔ کی اُردو شاعری کی طرح ان کی فارسی شاعری بھی عظیم ہے۔ غالبؔ کی فارسی شاعری فقط تفکر کی نہیں، جذبے کی بھی شاعری ہے۔ ان کی فارسی شاعری میں بھی جذبات و احساسات کے تقریباً وہ تمام مضامین پائے جاتے ہیں جن مضامین سے ان کی اُردو شاعری مملو ہے۔ غالبؔ کی شاعری میں مضمون و الفاظ کی حسین آمیزش ہے۔ ان کی شاعری کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں قدیم و مستعمل موضوعات بھی جدت ادا اور طرفگی خیال کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ غالبؔ کی فارسی شاعری کا جائزہ لیتے وقت ان کی غزل کو فوقیت دی جاتی ہے۔ تنقید کا زیادہ تر انحصار ان کی غزل گوئی پر رہا ہے۔ ضرورت ان کے عقائد پر نظر مرکوز کرنے کی ہے۔'' انھوں نے اپنے خطبے میں غالبؔ کی غزلیات کے علاوہ ان کی مثنویوں اور نعت و حمد کا بھی جائزہ لیا۔ ان کی

تحقیق کے مطابق غالبؔ کی مثنویوں کی تعداد بارہ نہیں بلکہ پندرہ ہے۔ شعر گوئی آسان ہے۔ سخن فہمی مشکل ہے۔'' پروفیسر اسلم اصلاحی نے اپنے صدارتی خطبے میں اس بات پر زور دیا کہ غالبؔ کے کلام کا مکمل طور پر جائزہ لیا جانا چاہیے۔ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ غالبؔ جائزے کے ایسے بہت سے پہلو ہیں جو تجزیے کے مستحق ہیں۔ پروفیسر محمد شاہد حسین نے، صدر اور حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر پروفیسر انور پاشا، ڈاکٹر آصف زہری، ڈاکٹر شفیع ایوب، ڈاکٹر سجاد اختر، ڈاکٹر ہادی سرمدی، ڈاکٹر مخمور صدری، خلیق الزماں اور متعدد طلبہ وطالبات شریک ہوئے۔

نئی دہلی

19 / دسمبر 2012ء

ڈاکٹر تقی عابدی کا توسیعی لکچر
''غالبؔ کے فارسی نثری کلام کی طلسم آرائی''

جس طرح غالبؔ کی نظم اپنا جواب آپ ہے، اسی طرح غالبؔ کی نثر بھی لاجواب ہے
جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کے زیر اہتمام ٹیگور ہال، دیار میر تقی میرؔ میں ''غالبؔ کی فارسی شاعری میں طلسماتی کیفیت'' کے عنوان سے ڈاکٹر تقی عابدی کا اظہار خیال

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کے زیر اہتمام ٹیگور ہال، دیار میر تقی میرؔ میں ایک توسیعی خطبہ ''غالبؔ کی فارسی شاعری میں طلسماتی کیفیت'' کے عنوان سے منعقد ہوا۔ خطبہ کے مقرر خاص ممتاز ادیب و محقق ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) نے کہا کہ ''جس طرح غالبؔ کی نظم اپنا جواب آپ ہے اسی طرح غالبؔ کی نثر بھی لاجواب ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''غالبؔ کے فارسی اشعار اور اُردو خطوط پر کافی کام ہوا ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ غالبؔ کے فارسی خطوط پر ابھی تک کام نہیں ہو سکا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''غالبؔ نے اپنا پہلا فارسی خط انگریز حکمران کو لکھا تھا۔ اس کے بعد 1849ء میں اُردو خطوط نگاری کی۔ ہمارے فارسی اسکالرس کو چاہیے کہ غالبؔ کو اچھی طرح پڑھیں اور اس پر تحقیق کریں۔''

پروگرام کے مہمان خصوصی پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ ''آج کے موضوع کے لیے ڈاکٹر عابدی کا انتخاب شعبۂ فارسی کا حسن نظر تھا میں اس حسن انتخاب کے لیے شعبۂ فارسی کو مبارک باد دیتا ہوں۔'' موصوف نے غالبؔ کے فارسی شاعری کے حوالہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''غالبؔ کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ جس کا ذکر غالبؔ نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔'' آخر میں صدر شعبہ پروفیسر عراق رضا زیدی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم توسیعی خطبات کے لیے عام طور سے ان موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں

جو ہمارے ورس کا حصہ ہوتے ہیں تا کہ اس طرح کے خطباب سے ہمارے عزیز طلبا استفادہ کر سکیں۔ کیوں کہ غالبؔ ہمارے کورس کا حصہ ہے۔ لہٰذا آج کا موضوع ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ اس لیے ہم نے اس موضوع کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی کا انتخاب کیا۔ پروگرام کا آغاز سید کوثر جعفری کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جب کہ نظامت کے فرائض شعبۂ فارسی میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے انجام دیے۔ شرکاء میں ڈاکٹر احمد عائی، ڈپٹی کلچرل کونسلر سفارت جمہوری اسلامی ایران نئی دہلی، ڈاکٹر عالیہ، ڈاکٹر لورا، ڈاکٹر راشیدا قزاکستان، شعبۂ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر خالد محمود، پروفیسر قمر غفار، پروفیسر محمد اقبال، ڈاکٹر عبدالحلیم، ڈاکٹر کے کے کوشک، ڈاکٹر طاہر حسین کاظمی، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، اسرار جامعی، حکیم غلام مہدی راز، ڈاکٹر محمد عباس، ڈاکٹر عمران اندلیب، ڈاکٹر انیسہ خاتون، ڈاکٹر زہرا خاتون، ڈاکٹر شائستہ تبسم، ڈاکٹر سرفراز احمد، ڈاکٹر محسن علی، ڈاکٹر حسین الزماں عابدی، مہدی باقر اور یاسر عباس قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر شعبہ جات سے اساتذہ طلباء نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

خصال مہدی

روزنامہ ''انقلاب'' نئی دہلی

22/دسمبر 2012ء

مرزا غالبؔ اُردو شاعری کا سر سبز پھول: ڈاکٹر تقی عابدی

غالبؔ ہماری شاعری کا سر سبز پھول ہے۔ غالبؔ برصغیر کا سب سے پہلا ترقی پسند شاعر ہے۔ ان خیالات کا اظہار کینیڈا کے معروف اسکالر ڈاکٹر تقی عابدی نے غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایوان غالبؔ میں ''ہمارا کلاسیکی ادب اور ترقی پسند تنقید'' کے موضوع پر منعقدہ غالبؔ سیمینار کی افتتاحی تقریب میں کیا۔ اس موقع پر خواجہ حسن ثانی نظامی، عطاء الحق قاسمی، جسٹس بدر دریز احمد، ڈاکٹر پرویز احمد، عابد سہیل نے بھی بطور خاص شرکت کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے سیمینار کے تعلق سے کہا کہ ''مجھے اُمید ہے کہ اگلے دو روز میں یہاں ادب کا ایسا دریا بہے گا جس سے ہر خاص و عام سیراب ہوگا۔'' اس سے قبل افتتاحی تقریر میں انسٹی ٹیوٹ کے سیکریٹری پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے کہا کہ ''غالبؔ سیمینار ہر سال تازے عنوانات اور مختلف موضوعات پر منعقد کیا جاتا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''غالبؔ کے نام سے منعقد ہونے والے سیمینار میں اتنی وسعت ہے کہ ہم جن موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں وہ غالبؔ کے خواب و خیال سے ملتے ہیں۔'' پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے غالبؔ انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ افسر ڈاکٹر رضا حیدر نے انسٹی ٹیوٹ میں جاری سرگرمیوں کی تفصیلی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ سیمینار ہر سال غالبؔ کے نام سے ہوتا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہونے والے پروگراموں میں ملک و بیرون ملک کے متعدد ادباء اور شعراء شرکت کر چکے ہیں۔'' اس کے علاوہ عابد سہیلؔ، پاکستان کے ڈاکٹر عطاء الحق قاسمی نے بھی اظہار خیال کیا۔

تقریری سلسلہ کے بعد غالبؔ انعامات کی تقسیم عمل میں آئی۔ جس میں دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے پروفیسر عتیق اللہ کو برائے اُردو تحقیق و تنقید ''فخر الدین علی احمد

غالبؔ انعام 2012ء''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کی پروفیسر آزرمی دخت صفوی کو برائے فارسی تحقیق وتنقید ''فخرالدین علی احمد غالبؔ انعام 2012ء''معروف شاعر کرشن کمار طور کو برائے اُردو شاعری ''غالبؔ انعام 2012ء''، پٹنہ یونیورسٹی کے سابق صدر پدم شری پروفیسر کلیم عاجزؔ کو برائے مجموعی ادبی خدمات ''غالبؔ انعام 2012ء''، ڈرامہ نگار پروفیسر نورالعین علی کو برائے اُردو ڈرامہ ''ہم سب غالبؔ انعام 2012ء'' اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اُردو کے سابق صدر پروفیسر محمد ذاکر کسی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکے تو ان کا برائے اُردو نثر غالبؔ انعام، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی نے حاصل کیا۔

پروگرام میں علی گڑھ کے معروف مصور سرفراز زیدی کے ذریعہ غالبؔ کے اشعار کے پس منظر میں بنائی گئی تصاویر کی نمائش بھی کی گئی۔ اس موقع پر پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر صادق، پروفیسر شریف حسین قاسمی، شفیع قریشی، ڈاکٹر یوسف عامر، اصغر ندیم سید، شریف الحسن نقوی، سابیال جی، افتخارالزماں، جاوید رحمانی، پروفیسر بلقیس حسینی، پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر سہیل انور، عرفان احمد، سلیم امروہوی، ڈاکٹر قمر عالم، پروفیسر انیس اشفاق، ڈاکٹر سرور الہدیٰ، ڈاکٹر خالد مبشر، خواجہ محمد نظامی کے علاوہ بہت سی سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔

آخر میں ڈائریکٹر شاہد ماہلی نے تمام حاضرین اور مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

زبیر قریشی
روزنامہ ''صحافت'' نئی دہلی
23/دسمبر 2012ء

ایک ہمہ جہت شخصیت تھے فیضؔ: ڈاکٹر تقی عابدی

غالبؔ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیرِ اہتمام بین الاقوامی غالبؔ سیمینار میں ''ہمارا کلاسیکی ادب اور ترقی پسند تنقید'' کے موضوع پر ہند اور بیرونِ ہند سے آئے ہوئے مقالہ نگاروں نے عنوان کی مناسبت سے اپنے مقالے پیش کیے۔ پہلے اجلاس میں ڈاکٹر خالد اشرف نے اپنے مقالے جس کا عنوان تھا ''ڈاکٹر قمر رئیس فکشن کی تنقید'' کے حوالے سے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا۔ ڈاکٹر یعقوب یاور، ڈاکٹر اصغر ندیم سید وغیرہ نے اپنے مقالوں کے ذریعے ادب، کلاسیکی ادب اور ترقی پسند تنقید اور دیگر موضوعات پر معلوماتی مقالے پیش کر کے اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ پاکستان کی نامور ادیبہ کشور ناہید نے اپنے صدارتی کلمات میں مقالوں کی بابت اظہارِ خیال کرتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا۔ سید مہدی نے اپنے مقالے ''ہمارا کلاسیکی ادب اور ترقی پسند تنقید'' پیش کیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی اور ڈاکٹر اصغر ندیم سید نے انجام دی۔ ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر تقی عابدی وغیرہ نے اپنے مقالوں کے ذریعے ترقی پسند تنقید نگاری اور نظریۂ فیض کے علاوہ ترقی پسند نظریات کا تشکیلی دور اور عطاء الحق قاسمی نے ''کلاسیکی شاعری اور ترقی پسند'' جیسے موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''فیضؔ ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں اور چند لوگ فیضؔ کو تنقید نگار قبول نہیں کرتے۔'' انھوں نے فیضؔ کے نثری اور شعری کلام پر بھی اظہارِ خیال کیا۔ اسی اجلاس کے تیسرے دور میں بحیثیت صدر پروفیسر اسلم پرویز اور مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی موجود تھے۔

ڈاکٹر ارجمند آرا کے مقالہ کا عنوان تھا ''ترقی پسند تنقید کی فکری بنیادیں'' انھوں نے

اپنے مقالے میں بیسویں اور چالیسویں دہائی میں ترقی پسند تحریک کا پس منظر پیش کیا جس میں جدوجہد آزادی، غربت اور ناخواندگی کے لیے جدوجہد شامل تھی۔ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی، قاضی عبدالرحمٰن اعظمی کے علاوہ پروفیسر ابن کنول، پروفیسر ظہورالدین، پروفیسر نیجر پانڈے، کشمیری لال ذاکر، پروفیسر زماں آزردہ نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ جس کی صدارت شاہد مہدی، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر اسلم پرویز، عابد سہیل وغیرہ نے نبھائی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر ندیم احمد اور ڈاکٹر ارشد عزیز نے انجام دی۔

سیمینار کے بعد عالمی مشاعرہ کا بھی انعقاد کیا گیا۔ جس میں ڈاکٹر اقبال مرزا، ڈاکٹر سید تقی عابدی، اقبال حیدر، کشمیری لال ذاکر، شکیل اعظمی، شاہد ماہلی کے علاوہ دیگر شعرا اور شاعرات نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ پروگرام میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے اُردو ادب نوازوں کے علاوہ فاروق ارگلی، اے. رحمان، سید شریف الحسن نقوی، محمد ادریس، شفیع دہلوی، اسد میاں، اقبال مسعود فاروقی وغیرہ موجود تھے۔ شاہد ماہلی ڈائریکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ نے تمام شعرا اور شاعرات کے علاوہ تمام سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ "سیاست" حیدرآباد

28/دسمبر 2012ء

میر انیسؔ کا کلام امام باڑوں میں دفن کر دیا گیا

"دیوانِ رباعیات انیسؔ" کی رسم اجراء تقریب

پروفیسر محمد میاں اور تقی عابدی کا خطاب

اُردو ادب کے زوال کی اہم وجہ یہ ہے کہ مرثیوں کو امام باڑوں میں دفن کر دیا گیا۔ مرثیہ حسن یوسف ہے۔ مرثیہ میں وہ اوصاف ہیں کہ وہ تہذیبی سطح پر پڑھائی جاسکتی ہے۔ صنف مرثیہ کے ذریعے اُردو ادب کی بہترین خدمات کی جاسکتی ہیں جس صنف میں سب سے زیادہ اشعار کہے گئے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید تقی عابدی ممتاز محقق و دانشور نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے "کلام انیسؔ میں ادبی اور اخلاقی اقدار" کے زیر عنوان اپنے خطاب میں کیا۔ مولانا آزاد کلب حیدرآباد کے زیر اہتمام ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیقی کتاب "دیوانِ رباعیات انیسؔ" کی رسم اجراء تقریب 26/دسمبر کو ہوٹل انمول کانٹی نینٹل روبرو سکریٹریٹ کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ "میر انیسؔ کے 213 مرثیے کی تحقیق میں نے کی۔ میر انیسؔ نے تقریباً 82 ہزار اشعار کہے ان کے کلام میں 8 تا 12 فیصد بین کا حصہ ہوتا ہے باقی ادب ہے۔ انھوں نے کہا کہ "میر انیس نے بہت سی رباعیاں فی البدیہہ کہی ہیں۔ "دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ" کی رسم اجراء بدست پروفیسر محمد میاں وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی عمل میں آئی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ "تقی عابدی کی کتاب کی رسم اجراء کرتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے میں نے تقی عابدی کی لائبریری کینیڈا میں دیکھی اور جتنی کتابیں میں نے وہاں ادب کے موضوع پر ان کی ذاتی لائبریری میں دیکھی وہ کسی دوسرے شخص کی ذاتی لائبریری میں نہیں ہیں۔ اگر وہ

کچھ کتابیں ہماری یونیورسٹی کی لائبریری کے لیے دیں تو ہماری لائبریری کے اسٹاک میں ایک خوش آئند اضافہ ہوگا۔" انھوں نے کہا کہ "میں نے انیس اور دبیر کو اسکول میں پڑھا تھا۔لیکن آج بھی ان کی شاعری کو نہایت عظیم شاعری تصور کرتا ہوں۔" انھوں نے یہ بات بھی کہی کہ "تحقیق کبھی مکمل نہیں ہوتی اور اگر وہ مکمل ہوگئی تو تحقیق ختم ہو جاتی ہے۔تنقید سے تحقیق کی راہیں ہموار ہوتی ہیں لیکن تنقید تہذیب کے دائرے میں ہونی چاہیے اور تنقید برائے اصلاح ہونی چاہیے۔"

پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے ڈاکٹر تقی عابدی کا تعارف پیش کیا۔مبصرین میں پروفیسر بیگ احساس اور پروفیسر فاطمہ پروین شامل تھے۔ پروفیسر بیگ احساس نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ سوچا جاتا ہے کہ بڑے شاعروں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ تو میر انیس پر اور نہ ہی دبیر پر بہت وقیع کام نہیں ہوا ہے۔ میر انیس واحد شاعر ہیں جن کے خاندان میں آٹھ نسلوں تک خاندان در خاندان شاعر پیدا ہوتے رہے۔" انھوں نے کہا کہ "تقی عابدی نے ایرانیوں کو رباعی کا موجد قرار دیا ہے۔"

پروفیسر فاطمہ پروین نے کہا کہ "تقی عابدی نے اس روایت کو برقرار رکھا ہے جسے محی الدین قادری زور نے قائم کیا تھا۔" انھوں نے کہا کہ "دیوانِ رباعیاتِ انیس" کے ایک ایک صفحہ پر وہ کاوش اور کوشش نظر آتی ہے جو تقی عابدی کی دیدہ ریزی، محنت اور مشاقی کی غمازی کرتی ہے۔

انھوں نے تقی عابدی کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ انھوں نے اپنی کتاب میں غواصی کی رباعیوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مہمان اعزازی پروفیسر اشرف رفیع نے کہا کہ "انیس کا تعلق حیدرآباد سے بھی گہرا رہا ہے۔" 1857ء کے بعد جب لکھنؤ کے حالات بدلے تو تہور حسین نے انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی وہ گلبرگہ تک ٹرین میں آئے (اس وقت صرف گلبرگہ تک ٹرین کی سہولت تھی) اور وہاں سے ٹانگہ میں سفر کر کے دس روز کے بعد حیدرآباد پہنچے اور محرم کے موقع پر جو مرثیہ پڑھا وہ 168 بند پر مشتمل تھا۔"

پدم شری مجتبیٰ حسین نے صدارت کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے اپنے خیالات کا

اظہار کر کے محفل کو قہقہہ زار بنا ڈالا۔ انھوں نے کہا کہ ''میں اب تک تقی عابدی کی تقریر کے سحر میں گم ہوں جس طرح یہ کام کرتے ہیں میں دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہوں۔ طب اور ادب کا جو سلسلہ تقی عابدی نے ملایا وہ لائق تعریف ہے۔ بلکہ انھوں نے اپنے کام کے ذریعہ ادب کے کئی ڈاکٹروں کی چھٹی کر دی ہے۔ کام کرنے کا جو بل بوتا ان کے اندر ہے وہ حیرت انگیز ہے۔''

نظامت کے فرائض کنوینر جلسہ ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد بانی وصدر کلب ڈپٹی ڈائریکٹر سی پی ڈی یو ایم ٹی، مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی نے بخوبی انجام دیے۔ کنوینر جلسہ کے شکریہ پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔ قرعہ اندازی کے ذریعے دس افراد کے درمیان ''دیوانِ رباعیاتِ انیس'' کی تقسیم عمل میں آئی۔

حیدرآباد

29/دسمبر 2012ء

ڈاکٹر تقی عابدی کو پروقار
ایوارڈ ''میر تقی میرؔ'' کے لیے نامزد کیا گیا

امریکن فیڈریشن آف مسلم آف انڈین اوریجن (AFMI) کے اکیسویں افتتاحی کنونشن کے دوران اعلان کیا گیا کہ اس سال کا پروقار ایوارڈ ''میر تقی میرؔ'' کینیڈا میں مقیم معروف دانشور، ناقد، ادیب اور شاعر ڈاکٹر تقی عابدی کو دیا جائے گا۔ اس کنونشن کی مہمان خصوصی، حیدرآباد میں امریکہ کے کاؤنسل جنرل، کیترین دھنائی تھیں۔ دوسرے شرکاء میں جناب وجاہت حبیب اللہ، چیئرمین اقلیتی کمیشن (سابقہ جسٹس MSA صدیقی، چیئرمین نیشنل اقلیتی کمیشن ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنس، اور آندھرا پردیش کے سابقہ وزیر جناب شبیر علی وغیرہ تھے۔

''میر تقی میرؔ'' ایوارڈ ہر سال ایسے شخص کو دیا جاتا ہے جو اُردو ادب کے لیے غیر معمولی کام سرانجام دے۔ کینیڈا میں مقیم معروف دانشور، ناقد، ادیب اور شاعر ڈاکٹر تقی عابدی کا انتخاب ان کی بیش بہا خدمات کے اعتراف میں کیا گیا ہے۔ آپ کی سابقہ کئی شعراء پر تحقیقات مستند مانی جاتی ہیں۔ مغربی ممالک میں اُردو کے فعال دانشور، ادیب اور محقق مانے جاتے ہیں۔ آپ تین درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔

سابق میں یہ ایوارڈ جناب شمس الرحمان فاروقی، جناب مجتبیٰ حسین اور گلزار دہلوی کو دیا گیا تھا۔

"حکیم الامت" سری نگر
لکھنؤ

اُردو مراثی میں کتاب اخلاق کا ہر درس موجود ہے: ڈاکٹر تقی عابدی

ادارہ حکیم الامت کے تحت "اُردو تہذیب اور مرثیہ" موضوع پر کانفرنس

ادارہ "حکیم الامت" سری نگر کے تحت شیعہ کالج، وکٹوریہ اسٹریٹ میں "اُردو تہذیب اور مرثیہ" عنوان پر مرثیہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اُردو، عربی، فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ممتاز شاعر انیس انصاری (آئی اے ایس) کی صدارت میں ہونے والی اس مرثیہ کانفرنس کے مہمان خصوصی آل انڈیا میرؔ اکادمی کے صدر مظفر احمد لاری تھے۔

کینیڈا سے آئے مشہور محقق اور ناقد ڈاکٹر سید تقی عابدی نے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "تہذیب مرثیہ ہی خالص ترین اُردو تہذیب ہے۔ اُردو مراثی میں کتاب اخلاق کا ہر درس موجود ہے۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیر منبر پر بیٹھ کر تہذیب اسلامی کا درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔" انھوں نے مختلف اشعار سناتے ہوئے صبر، قناعت، شجاعت، ہمدردی اور انسانی جذبات کی عکاسی کے بہترین نمونے پیش کیے اور کہا کہ "اگر کوئی صنف یہ بتاتی ہے کہ اسلام محبت، امن اور آشتی کا مذہب ہے تو اس میں مرثیہ سر فہرست ہے۔"

تقی عابدی نے کہا کہ "اُردو کے ساتھ ناانصافی کے لیے حکومتیں اور اغیار نہیں بلکہ ہم خود ذمہ دار ہیں۔" یونیسکو کے مطابق 400 ملین افراد اُردو زبان سمجھ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے زبانوں کی فہرست میں اُردو کو چھٹے مقام پر ہونا چاہیے لیکن افسوس ہے کہ وہ 36 ویں مقام پر ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ ہم نے اپنی زبان اُردو نہ لکھ کر کہیں پنجابی، کہیں سندھی تو

کہیں دوسری کوئی زبان لکھائی ہے۔"

انھوں نے کہا کہ "اُردو تہذیب سے اُردو مرثیہ کو نکالنا بھی ہماری بدبختی ہے۔ مرثیہ پر آج بہت کم کام ہو رہا ہے اور اسے امام باڑوں میں دفن کر دیا گیا ہے۔ جب کہ مراثی ادبی شاہکار ہیں۔"

اس سے قبل پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ "اُردو مرثیہ صرف ایک صنف نہیں بلکہ ایک تہذیبی علامت ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اس میں موجود نہ ہو۔ یہ اُردو کی سب سے طاقتور صنفِ سخن ہے۔ اُردو تہذیب اور مرثیہ کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔"

لکھنؤ یونیورسٹی شعبۂ اُردو کے صدر انیس اشفاق نے کہا کہ "مرثیہ کے تہذیبی جہات ہی اُردو تہذیب ہے۔ مکمل انسانی اقدار کے ساتھ مکمل انسانی تہذیب اگر کسی شاعر کے یہاں ملتی ہے تو وہ میر انیسؔ ہیں۔"

ادارہ "حکیم الامت" کے چیئرمین و ماہنامہ "حکیم الامت" کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر اکبر حیدری نے ڈاکٹر تقی عابدی کا تعارف کرایا۔ کانفرنس کے صدر انیس انصاری نے اس موقع پر "حکیم الامت" کے محرم نمبر کا اجراء کیا۔ مہمان خصوصی مظفر احمد لاری نے اعلان کیا کہ "وہ میر اکادمی کو پھر سے فعال کرتے ہوئے جلد ہی کوئی پروگرام منعقد کریں گے۔" اس موقع پر علامہ مجیب احمد صدیقی، عزم گونڈوی، راج کمل، گیتا برگ گل ملیح آبادنے بھی اپنے خیالات ظاہر کیے۔ پروگرام کی نظامت "حکیم الامت" کے ایڈیٹر ظفر حیدری نے کی۔

عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس دہلی دسمبر 2012ء

افتتاح: نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری

صدارت: پروفیسر گوپی چند نارنگ، کلیدی خطبہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی

انجمن ترقی اُردو دہلی کے زیر اہتمام غالبؔ انسٹی ٹیوٹ اور نیشنل کونسل برائے فروغ اُردو کے تعاون سے ایک تین روزہ عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس غالبؔ آڈیٹوریم ایوان غالب نئی دہلی میں عظیم الشان طریقے پر 28، 29 اور 30/دسمبر 2012ء کو منعقد کی گئی۔ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس 28/دسمبر شام 6 بجے برگزار ہوا۔ جس کا افتتاح عزت مآب جناب محمد حامد انصاری نائب صدر جمہوریہ ہند نے کیا۔ اس جلسہ کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کلیدی خطبہ دیا۔ نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری نے کہا کہ ''مرثیہ ہماری نایاب میراث ہے۔ عدم تشدد جو آج ایک اہم فلسفہ اور صلح و امن کا اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے وہ حسینؑ ابن علیؑ کے کردار سے نمایاں ہے۔'' شبلی نعمانی کے موازنہ انیسؔ و دبیرؔ کی حکایت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ''مرثیہ بغیر قلبی لگاؤ کے نہ لکھا جاسکتا ہے اور نہ سنا جاسکتا ہے۔ اُردو مرثیہ اُردو شاعری کی اہم صنف سخن ہی نہیں بلکہ اس کے پیغام سے یہ بھی درس حاصل ہوتا ہے کہ اگر حق ساتھ ہو تو عدم تشدد سے نبرد آزما ہوا جاسکتا ہے۔ نائب صدر جمہوریہ ہند نے کہا کہ ''رثائی ادب نے اُردو کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے اور اُردو مرثیہ نے امام حسینؑ کے امن کے پیغام کی تشہیر کی ہے۔''

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے استقبالیہ کلمات میں عالمی مرثیہ کانفرنس کا خیر مقدم کرتے ہوئے بتلایا کہ بڑی طویل مدت کے بعد یہ عمدہ مرثیہ کانفرنس غالب انسٹی

ٹیوٹ کے تعاون سے برگزار ہو رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''مرثیہ ایک عظیم ادبی اور ثقافتی روایت ہے، مرثیہ اُردو ادب کی قدروں کا خزانہ ہے جس سے ہمارے قومی کلچر کو فروغ ہوتا ہے۔'' کینیڈا سے آئے ہوئے نامور محقق ناقد اور شاعر ڈاکٹر تقی عابدی نے مرثیہ پر کلیدی خطبہ دیا جسے سراہا گیا۔ ڈاکٹر عابدی نے اُردو مرثیہ کی تاریخ اور اس کے مقام کا تعین کرتے ہوئے بتایا کہ ''اُردو شاعری کا تقریباً ایک تہائی حصہ اسی صنفِ سخن میں ہے۔ قدیم اُردو کی پہلی منظوم کتاب ''نوسرہار'' بھی واقعہ کربلا کا منظوم کلام ہے۔ مرثیہ صرف امام باڑوں تک محدود نہ ہونا چاہیے اس کو مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹی کے نصاب میں رکھ کر اس کی ادبی اور اخلاقی اقدار سے زبان اور سماج کو ترقی دی جاسکتی ہے۔ مرثیہ حسن یوسف ہے اس کو بازار مصر ہی نہیں بلکہ بازار جہاں میں پیش ہونا چاہیے۔ شاید اسی لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا: ''اُردو ادب کی جانب سے غالبؔ کی غزلیں اور انیسؔ کے مرثیے دُنیائے ادب کو تحفہ میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔'' اُردو مرثیہ دراصل انیسؔ اور دبیرؔ کے کلام کا دوسرا نام ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے بتایا کہ ''بین اگرچہ مرثیہ کا ضروری اور لازمی جزو ہے لیکن اس کے متن میں آزادی حریت عزت نفس اور احترام حقوق بشر کا پرچار ہے۔ آج ہم کو مرثیہ کی ضرورت ہے اس کے افکار مطالب ضابطہ اخلاق اس کی خوش عہدی خوش کرداری کی ضرورت ہے جو اس کے اعلیٰ کرداروں میں پائی جاتی ہے۔ انیسؔ اور دبیرؔ نے اخلاقی اقدار کو جو عالم گیر اور آفاقی نوعیت کی تھیں اور اس زمانے کا معاشرہ جن سے بے بہرہ تھا عوام کے صرف ذہن نشین ہی نہیں کیا بلکہ اپنے فن کے کمال سے عملی کرنے کی بھی کوششیں کیں۔'' ڈاکٹر عابدی نے مزید کہا کہ ''مرثیہ کسی خاص فرقہ کی جاگیر نہیں مرثیہ سے روگردانی اُردو ادب سے منہ موڑنے کے معنی ہیں۔''

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ ''میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے مرثیوں کے ذریعے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی اخلاقی اور آزادی کی قدروں کو اجاگر کیا ہے اور واقعۂ کربلا کی عربی برگزیدہ شخصیتوں کو ہمارے کلچر میں قابل تقلید بنادیا ہے۔ واقعۂ کربلا اُردو ادب کا استعارہ ہے جو حق کی حمایت اور ظلم وزور، جبر کی مخالفت بن کر رہ گیا ہے۔

مہمانِ ذی وقار سابق گورنر جھارکھنڈ جناب سید سبطِ رضی صاحب نے اُردو مرثیہ کی وسعت اس کی گیرائی اور گہرائی پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ ''اُردو کو جو بین الاقوامی مقام حاصل ہوا وہ صرف مرثیہ کی بدولت تھا۔'' اُردو مرثیہ سے عدم دلچسپی اور اس کے ساتھ عدم تعاون کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ''برصغیر میں رثائی ادب ایک ایسے دریا کے مانند ہے جس کا روز بروز پانی کم ہوتا جارہا ہے جو اُردو ادب کی کشت اور آبیاری کے لیے تشویش کا باعث ہے۔''

افتتاحی اجلاس کے صدر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ ''مرثیہ اُردو شاعری کی اہم صنفِ سخن ہی نہیں بلکہ اُردو مرثیہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی قدروں کا نقیب بھی ہے۔ اُردو مرثیہ کی ترویج اور تشہیر دراصل اُردو ادب کی ہی خدمت ہے۔ اُردو مرثیہ میں ہندوستانی سماج اور یہاں کے کلچر کے نقوش نے اسے ایک غیر فانی صنف بنادیا۔ کربلا اب صرف مرثیوں کی روایات یا حکایات تک محدود نہ رہا بلکہ یہ اُردو ادب اور شاعری میں ظلم و رور، جبر کے خلاف امن اور حریت کا استعارہ بن گیا۔

آخیر میں شاہد ماہلی نے جو غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر بھی ہیں اس پروگرام کے نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے مہمانان اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی جنھوں نے مہمانوں کے تعارف کے ساتھ ساتھ مرثیہ کانفرنس سے مربوط عمدہ اُردو مرثیہ کے اشعار بھی سنا کر محفل میں چار چاند لگا دیے۔ اس اجلاس کے اختتام پر دلّی کے مشہور استاد اقبال احمد خان نے اپنے مخصوص انداز میں سوز خوانی اور سلام خوانی کی، پھر چیئرمین وقف بورڈ بہار جناب محسن علی معصومی نے تحت اللفظ میں مرثیہ خوانی خاص دلکش اور پرتاثر انداز میں کی۔

جلسے میں بڑی تعداد میں سامعین موجود تھے۔ جلسے میں شامل افراد میں پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر آزرمی دخت، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر عراق رضا زیدی، پنڈت گلزار دہلوی، ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر مہتاب نقوی، ڈاکٹر فاضل ہاشمی، پروفیسر محمد رضا مولوی، پروفیسر ناشر نقوی، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، ڈاکٹر عابد حسین

حیدری، ڈاکٹر شجاعت علی، ڈاکٹر نگینہ جبین، ڈاکٹر عظیم امروہوی، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، احسن ہاشمی، اشفاق عارفی، محمد محسن نقوی، علیم الدین اسعدی، سلیم امروہوی، خصال مہدی، ممتاز عالم، ڈاکٹر علی جاوید اور اقبال مرزا شامل تھے۔

دوسرے دن بروز ہفتہ 29 / دسمبر 2012ء ٹھیک سوا دس بجے صبح پہلے اجلاس کا آغاز ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت ادارہ تحقیقات فارسی علی گڑھ کی ڈائریکٹر پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی تھے۔ ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے نظامت کی۔ اس اجلاس میں تین مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر مولا بخش نے پیش کیا جس میں انیسؔ کے مرثیوں کے مطالعہ کا جائزہ ماحولیاتی تنقید کے تحت کیا گیا۔ دوسرا مقالہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر فاضل ہاشمی نے مرثیہ اور ادب عالیہ کے زیرِ عنوان انیسؔ کی شعریات میں اخلاقیات سماجیات اور جمالیات کی نمائندگی کو پیش کیا۔ تیسرا مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فارسی پروفیسر عراق رضا زیدی کا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔ انھوں نے کلامِ دبیر میں علم نجوم کی اصطلاحات اور علم نجوم کے عمل دخل پر پُر مغز گفتگو کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی نے تینوں مقالوں پر اجمالی گفتگو کی اور آخیر میں پروفیسر آزرمی دخت نے مقالوں پر گفتگو کرکے مرثیہ کے عصرِ حاضر کے مسائل پر بھی گفتگو کی۔ اس اجلاس کے فوری بعد دوسرے اجلاس کا آغاز ہوا جس کی صدارت کینیڈا سے آئے ہوئے محقق و ناقد اور شاعر ڈاکٹر تقی عابدی نے کی اور ڈاکٹر اقبال مرزا مہمان خصوصی رہے۔ اس اجلاس میں چار مقالے پڑھے گئے۔ اس اجلاس کی رپورٹنگ کرتے ہوئے روزنامہ ''انقلاب'' کے معروف رپورٹر خصال مہدی نے لکھا:

عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس کے دوسرے دن الٰہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے پروفیسر علی احمد فاطمی نے ''مرثیہ کی جمالیات'' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''بڑی شاعری روایتی تصورات کو بدل دیتی ہے اور مرثیہ اس لیے بڑی شاعری ہے کیوں کہ مرثیہ نے ادب یا شاعری میں پائے جانے والے روایتی تصورات کو بدل دیا۔'' انھوں نے کہا کہ ''انیسؔ کا دبستان حرکت و عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ شجاعت و قربانی دُنیا کے بڑے موضوع تھے اور ہیں۔ کربلا زندگی سے عبارت، آگہی سے عبارت ہے، اقدار و ایثار سے عبارت

ہے، مرثیہ لسانی جمالیات سے زیادہ انسانی جمالیات سے تعلق رکھتا ہے۔'' گریہ کی قدر و قیمت کے تعلق سے پروفیسر فاطمی نے کہا کہ ''گریہ، پیدائش سے لے کر موت تک راہ نجات ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''مرثیہ میں انسان ہی نہیں انسانی معاشرہ کی جمالیات دکھائی دیتی ہے۔'' رام پور رضا لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے کہا کہ ''مرثیہ کو ہندوستان کی زمین بڑی راس آئی جو شاہکار اُردو مرثیہ کی شکل میں سامنے آئے اس کی مثال دُنیا کی مانی ہوئی زبانوں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور انگریزی میں نہیں ملتی۔ عجیب بات ہے کہ جو خراج عقیدت اُردو مرثیہ نے امام حسینؑ کو ہندوستان میں پیش کیا وہ عالم اسلام میں بولی جانے والی زبانیں عربی، فارسی، ترکی اور دری وغیرہ بھی نہ پیش کر سکیں۔ پروفیسر عزیز نے کہا کہ ''ہندوستان میں واقعہ کربلا اور اُردو مرثیہ اس قدر توجہ کا مرکز بنا کہ ہندو دانشور اور شعرا جن کی اپنی تاریخ میں کربلا جیسا واقعہ تھا ہی نہیں انھوں نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر سینکڑوں مرثیے کہے۔ عزیز الدین حسین نے استاد قمر جلالوی کی فن مرثیہ گوئی پر بھی تفصیلی گفتگو کی۔ پٹیالہ یونیورسٹی کے پروفیسر ناشر نقوی نے اُردو مرثیہ معنویت، روایت اور روہیل کھنڈ کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ ''کسی برگزیدہ شخصیت کے وصال کے بعد، اس کے صالح اور قابل تقلید کردار اور پیغام کی منظوم تشہیر و تبلیغ کو مرثیہ کہتے ہیں۔'' اس کے علاوہ پروفیسر عتیق اللہ نے انیسؔ اور شعری روایات اور ڈاکٹر خالد علوی نے بھی اپنے مقالے میں شبلیؔ کی تنقید پر اعتراض کیا۔

صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر تقی عابدی نے مقالہ نگاروں کے مقالوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''مرثیہ کے تنقید کے میدان میں بھی ادبی دہشت گردی پائی جاتی ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے کلام کے تقابل کے چکر میں بہت سے لوگوں نے ادبی دہشت پھیلائی ہے وہ اس طرح کہ شعر کسی شاعر کا کسی اور شاعر سے منسوب کر دیا۔'' انھوں نے کہا کہ ''مرثیہ کسی فرقہ کی جائیداد نہیں ہے۔ مرثیہ جمالیات کا پورا مرقعہ ہے مراثی اُردو کی فرہنگ ہیں اور میر انیسؔ محاوروں کے شہنشاہ ہیں۔'' اس کے علاوہ انھوں نے اُردو مرثیہ کی صورت حال کے علاوہ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور بیسویں صدی کے مرثیہ نگاروں کی مرثیہ نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی اور

مہمان خصوصی کی حیثیت سے رضا لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر عزیز الدین موجود تھے۔ ڈاکٹر تبسم صابر، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر محمد رضا موسوی نے مقالات پیش کیے۔ نظامت عابد حسین حیدری نے کی۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے ڈاکٹر عابدی کی شاہکار تصنیف ''تجزیہ یادگارِ مرثیہ: جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' پر ایک تنقیدی اور تجلیلی مقالہ پیش کیا۔

چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر زماں آزردہ نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر آزرمی دخت صفوی موجود تھیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد شجاعت علی نے انجام دیئے۔ اس اجلاس میں محترمہ سفینہ بیگم، ڈاکٹر سہیل انور، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، ڈاکٹر عظیم امروہوی اور ڈاکٹر حسن عباس نے مقالات پیش کیے۔ کانفرنس کے کنوینر ڈاکٹر رضا حیدر نے اعلان کیا کہ ''بہت جلد ہی تمام مقالات کتابی شکل میں منظر عام پر لائے جائیں گے۔'' چائے کے مختصر وقفے کے بعد سلام، سوز خوانی اور تحت اللفظ مرثیہ خوانی کا دور شروع ہوا۔ سوز خوانی کے بعد جناب متین امروہوی، ڈاکٹر تاجدار حسین زیدی، معین شاداب، کوثر زیدی کیرانوی اور سلیم امروہوی نے سلام سنائے۔ پھر سید محسن علی معصومی نے اپنے مخصوص انداز میں مرثیے کے کچھ بند پیش کیے جنھیں پسند کیا گیا۔ آخیر میں سابق گورنر جھارکھنڈ سید سبط رضی صاحب نے تحت اللفظ میں مرثیہ پڑھا جسے عمدہ پڑھت میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس مرثیہ خوانی کو پسند اور سراہا گیا۔ ایک اچھی تعداد رات دیر گئے مجلس مرثیہ میں موجود رہی۔ مرثیہ کانفرنس کے تیسرے اور آخری روز بروز اتوار ٹھیک ساڑھے دس بجے پانچواں اجلاس شروع ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر تقی عابدی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر زماں آزردہ موجود تھے۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ممتاز عالم نے انجام دیئے۔ ڈاکٹر ممتاز عالم نے استقبالیہ کلمات میں گزشتہ دن کی گفتگو اور پر مغز حقائق کے بارے میں دلچسپ گفتگو کر کے یہ بتایا کہ ان حقائق کو صرف کانفرنسوں کے کمروں میں قید رکھنا نہیں چاہیے بلکہ عوام تک پہنچانا ضروری ہے۔ انھوں نے تقی عابدی کے بیان کی تائید میں کہا کہ ''سو سال قبل اُردو ترقی بورڈ بنایا گیا اور اب اُردو تحفظ بورڈ کی ضرورت لاحق ہے اور مرثیہ سے غفلت بھی اس زوال میں شامل ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''مرثیہ کو اس کا صحیح مقام

دینا اُردو ادب کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔"
پہلا مقالہ ڈاکٹر نگینہ جبیں کا تھا جنھوں نے مرثیہ کے تدریسی مسائل پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر محمد شجاعت علی اور ڈاکٹر علی جاوید نے بھی مقالات پیش کیے۔ خصوصاً ڈاکٹر علی جاوید نے اس بات پر زور دیا کہ ہم جدید مسائل کے تناظر میں بھی مرثیہ کو دیکھ سکتے ہیں۔ نظامت ڈاکٹر ممتاز عالم نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی نے کی اور لندن سے تشریف لائے ماہنامہ "صدا" کے ایڈیٹر اقبال مرزا مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر آزرمی دخت صفوی، پروفیسر زماں آزردہ اور ڈاکٹر تقی عابدی نے مقالات پیش کیے۔ تمام مقالات عالمانہ اور پرمغز تھے۔ خصوصاً ڈاکٹر تقی عابدی نے انیسؔ کی جذبات نگاری پر عمدہ مقالہ پڑھا اور ان غیر مطبوعہ مراثی پر بھی گفتگو کی جواب تک چھپ نہیں سکے اور وہ اُردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ "اُردو ادب کی یہی صنف ہے جس میں انسانیت، اخوت، حریت، بھائی چارگی، محبت اور بین الملکی کا تصور بڑی خوب صورتی کے ساتھ موجود ہے۔ نظامت ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کی۔

تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عظیم امروہوی موجود تھے۔ ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر اقبال مرزا اور پروفیسر وہاج الدین علوی نے مقالات پیش کیے۔ نظامت پروفیسر ناشر نقوی نے کی۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی اور ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر انیس اشفاق اور جناب شاہد ماہلی نے تینوں دن سیمینار پر سیر حاصل گفتگو کی۔ نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔ ملک میں اپنی نوعیت کے اس پہلے سیمینار میں 40 سے زائد اسکالرز نے مرثیہ کی ہر جہت پر اپنے قیمتی مقالات پیش کیے اور سیمینار کی کامیابی پر شاہد ماہلی اور ڈاکٹر رضا حیدر کو مبارک باد پیش کی۔ شب میں بزم سوز خوانی، سلام اور مرثیہ خوانی کے تحت غلام سجاد نے سوز خوانی کی۔ شعرا اکرام نے سلام پیش کیا۔

جن میں گلزار دہلوی، عظیم امروہوی، دھرمیندر ناتھ، مہدی رضا اور خصال مہدی شامل تھے۔ معروف مرثیہ خواں ڈاکٹر ارشاد حسن معصومی نے میر انیسؔ کا خاص مرثیہ اپنے

مخصوص انداز میں پڑھا جسے تحسین و آفرین کے نعروں سے سراہا گیا۔ وائس چیئر مین آئی سی سی آر جناب شاہد مہدی نے میر انیس کا شاہکار مرثیہ پڑھ کر سامعین کو محفوظ کیا۔ موصوف کا تحت اللفظ مرثیہ کا اندازِ بیان منفرد اور موثر ہے۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر تقی عابدی کی جدید تصنیف و تالیف ''رباعیاتِ انیس'' اسکالرس اور ادیبوں کو تحفہ میں پیش کی گئی۔ حسنین امروہوی کے مطبوعہ مراثی حسن علم کا اجرا عمل میں آیا۔ کانفرنس کے پہلے دن مرثیوں کی کتابوں کی نمائش بھی کی گئی۔ کانفرنس میں روزنامہ ''انقلاب'' کے مدیر اعلیٰ شکیل شمسی اور روزنامہ ''سہارا'' کے مدیر اعلیٰ اسد رضا بھی شامل تھے۔ ''چوتھی دُنیا'' کی مدیرہ وسیم راشد، ''صحافت'' کے ایڈیٹر کے علاوہ ڈاکٹر ادریس احمد، فاروق ارگلی، ایم رحمان سمیت دوسری علمی، ادبی، سماجی اور ثقافتی شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ ''انقلاب'' نئی دہلی

28-30 دسمبر 2012ء

مرثیہ کی تدریس کے مسائل حل کرنے کی ضرورت

انجمن ترقی اُردو دہلی شاخ کے زیر اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ سہ روزہ عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس اختتام پذیر

اُردو مرثیہ نگاری کی تاریخ، فن، تنقید، اہمیت و افادیت اور عصری معنویت پر کارآمد بحث و مباحثہ کے ساتھ اس جانب بھی توجہ مبذول کرائی گئی کہ اس کی قرأت اور تدریس کے مسائل کس طرح حل کیے جائیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تدریسی خدمات انجام دینے والے اساتذہ نے مرثیہ کی تدریس کے موجودہ مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''جس طرح غزل، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور دیگر اصناف پر یونیورسٹیوں میں ریفریشر کورس کرائے جاتے ہیں اسی طرح مرثیہ پر بھی ریفریشر کورس ہونا چاہیے۔''

ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر زماں آزردہ، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر نگینہ جبیں، ڈاکٹر عابد حیدری اور ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی وغیرہ نے اس مسئلہ پر بطور خاص سیر حاصل گفتگو کی۔ جب کہ دیگر اجلاس میں مرثیہ نگاری پر مقالات پیش کیے گئے۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی شاخ کے زیر اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ سہ روزہ عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس اتوار کو اختتام پذیر ہوا۔

کانفرنس کے آخری دن کے پہلے اجلاس کی صدارت کینیڈا سے تشریف لائے مشہور ادیب و دانشور ڈاکٹر تقی عابدی نے کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر زماں آزردہ موجود تھے۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر نگینہ جبیں کا تھا جنھوں نے مرثیہ کے تدریسی مسائل پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر محمد شجاعت علی اور ڈاکٹر علی جاوید نے بھی مقالات پیش کیے۔ خصوصاً ڈاکٹر علی جاوید نے اس بات پر زور دیا کہ ہم جدید مسائل کے تناظر

میں بھی مرثیہ کو دیکھ سکتے ہیں۔ نظامت ڈاکٹر ممتاز عالم نے کی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی نے کی اور لندن سے تشریف لائے ماہنامہ "صدا" کے ایڈیٹر اقبال مرزا مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر آزرمی دخت صفوی، پروفیسر زماں آزردہ، ڈاکٹر تقی عابدی نے مقالات پیش کیے۔ تمام مقالات عالمانہ اور پُر مغز تھے۔ خصوصاً ڈاکٹر تقی عابدی نے اُن غیر مطبوعہ مراثی پر بھی گفتگو کی جو اب تک چھپ نہیں سکے اور وہ اُردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ "اُردو ادب کی یہی صنف ہے جس میں انسانیت، اخوت، حریت، بھائی چارگی، محبت اور بین الملکی کا تصور بڑی خوب صورتی کے ساتھ موجود ہے۔" نظامت ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کی۔

تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق نے کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عظیم امروہوی موجود تھے۔ ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر اقبال مرزا اور پروفیسر وہاج الدین علوی نے مقالات پیش کیے۔ نظامت پروفیسر ناشر نقوی نے کی۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی، اور ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر انیس اشفاق اور جناب شاہد ماہلی نے تینوں دن کے سیمینار پر سیر حاصل گفتگو کی۔ نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔ ملک میں اپنی نوعیت کے اس پہلے سیمینار میں 40 سے زائد اسکالرز نے مرثیہ کی ہر جہت پر اپنے قیمتی مقالات پیش کیے اور سیمینار کی کامیابی پر شاہد ماہلی اور ڈاکٹر رضا حیدر کو مبارک باد پیش کی۔ شب میں بزم سوز خوانی، سلام اور مرثیہ خوانی کے تحت غلام سجاد نے سوز خوانی کی۔ شعرا کرام نے سلام پیش کیا اور معروف مرثیہ خواں ڈاکٹر ارشاد حسن معصومی نے میر انیس کا مرثیہ اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا۔ دوسرا مرثیہ جامعہ ملیہ کے سابق وائس چانسلر شاہد مہدی نے پڑھا۔ سیمینار میں بڑی تعداد میں ملک اور بیرونِ ملک کے اسکالرز اساتذہ، طلبہ کے علاوہ مختلف علوم وفنون کے افراد موجود تھے۔

زبیر قریشی
نئی دہلی
30/دسمبر 2012ء

نوعیت اور اہمیت کے باعث مرثیہ ہر دور میں مقبول

مرثیہ ہر دور میں نوعیت اور اہمیت کے باعث نہ صرف ہند بلکہ بیرونِ ہند میں بھی مقبول ہوا ہے۔ مرثیہ نگاروں میں انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیوں کو جو معراج عطا کی ہے وہ اگر چہ کسی اور مرثیہ نگاروں میں کم ہی نظر آتی ہے۔ البتہ زمانۂ قدیم سے لے کر زبان جدید تک مختلف شعراء نے اپنے اصنافِ سخن میں مرثیہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ اسی کے پیش نظر انجمن ترقی اُردو (دہلی) کے زیر اہتمام ایوانِ غالب میں ''عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس'' کے دوسرے دن کا پہلے اجلاس میں جس کی صدارت ادارہ تحقیقات فارسی، علی گڑھ کی ڈائریکٹر پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کی۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے کینیڈا سے آئے معروف محقق و دانشور ڈاکٹر تقی عابدی موجود تھے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر مولیٰ بخش، ڈاکٹر فاضل ہاشمی اور پروفیسر عراق رضا زیدی نے مقالات پیش کیے۔ تینوں مقالات معنی اور مواد کے اعتبار سے عالمانہ اور پر مغز تھے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی گفتگو میں اُردو مرثیہ کی موجودہ صورت حال کے علاوہ میر انیسؔ، مرزا دبیر اور بیسویں صدی کے مرثیہ نگاروں کی مرثیہ نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے کی۔

دوسرے اجلاس میں بطور صدارت ڈاکٹر تقی عابدی نے فریضہ انجام دیا اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر اقبال مرزا موجود تھے۔ اس اجلاس میں پروفیسر ناشر نقوی، ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر عزیز الدین، پروفیسر علی احمد فاطمی اور پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے رضا لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر عزیز الدین موجود تھے۔ اس اجلاس میں

ڈاکٹر تبسم صابر، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، پروفیسر ابنِ کنول اور پروفیسر محمد رضا موسوی نے مقالات پیش کیے۔ نظامت کا فریضہ عابد حسین حیدری نے انجام دیا۔

سیمینار کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر زماں آزردہ نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر آزرمی دخت صفوی موجود تھیں۔ اس اجلاس میں محترمہ سفینہ بیگم، ڈاکٹر سہیل انور، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، ڈاکٹر عظیم امروہوی اور ڈاکٹر حسن عباس نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کے نظامت کا فریضہ ڈاکٹر محمد شجاعت علی نے انجام دیا۔ عالمی مرثیہ کانفرنس کے پہلے دن جتنے بھی مقالے پڑھے گئے۔ وہ نہایت ہی عالمانہ اور موضوع کے اعتبار سے بے حد اہم تھے۔ اس کانفرس میں ملک اور بیرونِ ملک کے اسکالرز اساتذہ، طلبہ کے علاوہ مختلف علوم وفنون کے افراد موجود تھے۔ شب میں سوز خوانی، سلام اور مرثیہ خوانی کا بھی اہتمام کیا گیا۔ جس میں اہم شعراء نے سوز خوانی اور مرثیہ خواں حضرات نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ دوسرے دن کے عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس میں نہ صرف دہلی بلکہ بیرون دہلی سے کثیر تعداد میں اُردو شعراء، ادیب واساتذہ طلبا نے شرکت کی۔

روزنامہ ''ہمارا سماج''، دہلی
30/دسمبر 2012ء

عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس کا انعقاد

مرثیے کو جدید مسائل کے تناظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے

انجمن ترقی اُردو دلّی شاخ کے زیرِ اہتمام عالمی اُردو مرثیہ کانفرنس کے آخری دن کے پہلے اجلاس کی صدارت کینیڈا سے تشریف لائے مشہور ادیب و دانشور ڈاکٹر تقی عابدی نے کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر زماں آزردہ موجود تھے۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ ڈاکٹر نگینہ جبیں کا تھا۔ جنھوں نے مرثیے کے تدریسی مسائل پر گفتگو کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر محمد شجاعت علی اور ڈاکٹر علی جاوید نے بھی مقالات پیش کیے۔ خصوصاً ڈاکٹر علی جاوید نے اس بات پر زور دیا کہ ہم جدید مسائل کے تناظر میں بھی مرثیے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر ممتاز عالم نے انجام دیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جناب شاہد ماہلی نے کی اور لندن سے تشریف لائے ماہنامہ ''صدا'' کے ایڈیٹر جناب اقبال مرزا مہمانِ خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ اس اجلاس میں پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر آزرمی دخت صفوی، پروفیسر زماں آزردہ، اور ڈاکٹر تقی عابدی نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کے تمام مقالات نہایت ہی عالمانہ اور پُرمغز تھے۔ خصوصاً ڈاکٹر تقی عابدی نے اُن غیر مطبوعہ مراثی پر بھی گفتگو کی جو اب تک چھپ نہیں سکے اور وہ اُردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ اُردو ادب کی یہی صنف ہے جس میں انسانیت، اخوت، حریت، بھائی چارگی، محبت اور بین الملکی کا تصور بڑی خوب صورتی کے ساتھ موجود ہے۔ اِس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر عظیم امروہوی نے انجام دیا۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس

اشفاق نے کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عظیم امروہوی موجود تھے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر اقبال مرزا اور پروفیسر وہاج الدین علوی نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ پروفیسر ناشر نقوی نے انجام دیا۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی اور ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر انیس اشفاق اور جناب شاہد ماہلی نے تینوں دن کے سیمینار پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اختتامی اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر رضا حیدر نے انجام دیا۔ ملک میں اپنی نوعیت کے اس پہلے سیمینار میں 40 سے زائد اسکالرز نے مرثیہ کی ہر جہت پر اپنے قیمتی مقالات پیش کیے اور سیمینار کی کامیابی پر جناب شاہد ماہلی اور ڈاکٹر رضا حیدر کو مبارک باد پیش کی۔ شب میں بزم سوز خوانی، سلام اور مرثیہ خوانی کے تحت جناب غلام سجاد نے سوز خوانی کی۔

محمد اطہر

روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی

30/دسمبر 2012ء

مرثیہ پر کسی خاص فرقہ کی اجارہ داری نہیں

عالمی اُردو کانفرنس کے دوسرے دن محققین اور دانشوروں کا اظہارِ خیال

مرثیہ کسی خاص فرقہ کی جائیداد نہیں۔ آج ادب میں الفاظ کو نرم بنانے اور تحریر میں گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ اُردو خود مسلمان نہیں بلکہ مسلمانوں کی کئی زبانوں میں سے ایک ہے۔ ان خیالات کا اظہار کینیڈا کے معروف ادیب ڈاکٹر تقی عابدی نے ایوان غالب میں عالمی مرثیہ کانفرنس کے مختلف اجلاس میں بطور مہمان خصوصی اور صدارتی خطاب میں کیا۔ پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کہا کہ ''اُردو کی بقا و تحفظ کے لیے نئی نسل کو اُردو بمع اس کی رسم الخط کے سکھانے ضرورت ہے۔'' اس موقع پر پروفیسر علی احمد فاطمی نے ''مرثیہ کی جمالیات'' موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''مرثیہ آج بھی زندہ ہے اگرچہ اس کے تنقید مردہ ہوگئی ہے۔ معروف ناقد و شاعر پروفیسر عتیق اللہ نے ''انیس اور شعری روایات'' کے موضوع پر اپنے مقالہ میں کہا کہ ''اُردو ادب میں روایت اور انفرادیت میں ابھی تک کوئی فرق اور واضح تصور قائم نہیں کیا جاسکا ہے۔'' اس کے علاوہ رضا لائبریری رام پور کے ڈائریکٹر پروفیسر عزیز الدین حسین نے ''استاد قمر جلال پوری کے فن مرثیہ گوئی میں نمایاں کارنامہ'' کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے عربی اور فارسی ادب کے نصاب میں مرثیہ کو شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر خالد علوی نے ''تنقید مرثیہ کی نارسائیاں اور مرزا دبیر'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا جب کہ پروفیسر ناشر نقوی نے اپنے منظوم مقالہ میں مرثیہ کی تاریخ بیان کی۔

پہلے اجلاس کے مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی تھے جب کہ نظامت کے فرائض

جھارکھنڈ یونیورسٹی میں استاد ڈاکٹر حسن مثنیٰ رضوی نے انجام دیے۔ پروفیسر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر مولا بخش اور ڈاکٹر فاضل اے. ہاشمی نے مقالے پڑھے۔ دوسرے اجلاس کے صدر ڈاکٹر تقی عابدی اور مہمان خصوصی لندن کے معروف ادیب ڈاکٹر اقبال رضا تھے جب کہ نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔

سیمینار کے تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی اس کے مہمانِ خصوصی رضا لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر عزیز الدین حسین تھے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر تبسم صابر، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر محمد رضا موسوی نے مقالات پیش کیے جب کہ نظامت عابد حسین حیدری نے کی۔ سیمینار کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر زماں آزردہ نے کی۔ سفینہ بیگم، ڈاکٹر سہیل انور، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، ڈاکٹر عظیم امروہوی اور ڈاکٹر حسن عباس نے مقالات پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر محمد شجاعت علی نے کی۔ آخر میں سوز خوانی، سلام اور مرثیہ خوانی کا بھی اہتمام کیا گیا۔

sherosokhan.net

2012ء

اُردو تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

سرحدوں کے پار جہاں اور بھی ہے

قومی اُردو کونسل میں اُردو کے سفیروں کو استقبالیہ

اُردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا حوالہ ہی نہیں بلکہ آج عالمی سطح پر ترسیل و ابلاغ کے ذرائع جو مہیا کر رہی ہے اس کے پیش نظر اس کا کردار عالمی سطح پر ابھرا ہے۔ اپنی محبوبیت کی بنا پر آج یہ زبان جاننے والوں تک ہی محدود نہیں بلکہ ان حلقوں تک بھی اپنی مقبولیت کا لوہا منوا رہی ہے جو اُردو سے نابلد ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ آج اُردو نے مشرق وسطیٰ سے لے کر یورپ اور امریکہ تک اپنے پرستاروں کی ایسی بساط بچھائی ہے کہ تحریر و تقریر کے نئے نئے امکانات روشن ہوتے جا رہے ہیں۔

اُردو کی نئی بستیوں میں بڑے پیمانے پر مختلف یونیورسٹیوں، اداروں اور بے شمار انجمنوں اداروں کے ذریعے تخلیق، تحقیق اور تنقید سے متعلق قابل قدر کارنامے آئے دن سامنے آ رہے ہیں۔ جن کی اہمیت کے پیش نظر قومی اُردو کونسل کی یہ کوشش رہی ہے کہ دُنیا میں جہاں جہاں اُردو کے علمی و ادبی کارناموں کو فروغ مل رہا ہے وہاں کے اہل قلم جب ہندوستان میں کسی عنوان سے تشریف لاتے ہیں تو انھیں کونسل کی جانب سے استقبالیہ دینے کی سعادت حاصل کی جائے۔ آج کی محفل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کونسل میں تشریف لائے غیر ملکی مہمانوں کا استقبال کونسل کے وائس چیئرمین جناب وسیم بریلوی نے گلدستہ پیش کر کے کیا۔ اس محفل کی صدارت پاکستان سے تشریف لائے ضیاء الدین یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پیرزادہ قاسم نے کی۔

خوشی کی بات ہے اس خاص محفل میں کونسل کی دعوت پر اُردو کے مایۂ ناز ادیب، محقق دانشور، شاعر و ڈاکٹر تقی عابدی جو کینیڈا میں عرصہ دراز سے اُردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں کونسل میں تشریف لائے۔ آج کی اس خاص محفل میں ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''دیوانِ رباعیات انیسؔ'' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اس موقع پر کہا کہ ''میں صحت کا طبیب اور ادب کا مریض ہوں۔'' انھوں نے اپنی کتاب ''دیوانِ رباعیات انیسؔ'' کا تعارف پیش کیا۔

اس تقریب کے مہمان خصوصی ہندوستانی عدلیہ کی عظیم شخصیت جناب جسٹس مارکنڈے کاٹجو تھے، جن کی جرأت مندانہ صداقت پسندی پورے ہندوستان میں روشنی پھیلا رہی ہے۔ ہندوستانی ثقافت، سانجھا سنسکرتی اور سب سے بڑی بات اُردو کی حوصلہ مند وکالت نے انھیں ہندوستانی معاشرے میں ایک اہم مقام دیا ہے۔ جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے کہا کہ ''اُردو شاعری دل کے حالات کی سچی ترجمان ہے۔''

بڑے فخر کی بات ہے کہ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، اُردو شعری روایت کا نہایت ہی محترم اور منفرد نام ہے کراچی یونیورسٹی میں وائس چانسلر رہے۔ ان دنوں ضیاء الدین یونیورسٹی، کراچی کے وائس چانسلر ہیں، سائنس کے استاد رہے۔ مگر برصغیر کے معتبر ترین شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے کونسل کی کارکردگی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ''اُردو زبان کو عالمی سطح پر متعارف کرانے میں کونسل کا بڑا رول رہا ہے۔'' تقی عابدی کی ادب کے تئیں خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''تقی عابدی صاحب آج رول ماڈل ہیں اور مختلف میدانوں میں اپنی خدمات کا پرچم بلند کیا ہے۔''

فرحت شہزاد کا بنیادی طور پر تعلق کراچی پاکستان سے ہے مگر گزشتہ کئی دہائیوں سے اُردو کے شعری منظرنامے کو امریکہ میں رہ کر اپنی فکری عظمتوں سے جگمگا رہے ہیں کئی مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں اور اہل نظر سے داد پا چکے ہیں۔

اُردو بنیادی طور پر ہندوستانی زبان ہے یہاں کے سیاسی، سماجی، ثقافتی پس منظر میں شعری اور تخلیقی سفر جاری رہتا ہے، اب کیوں کہ اُردو کے حوالے سے پوری دُنیا میں نئی بستیاں بس گئی ہیں کہ ہندوستان سے مختلف معاشروں میں رہ کر اُردو تخلیق وہاں کے کون کون

سے مقامی اثرات قبول کر رہی ہے؟ عالمی سطح پر اُردو، اُردو تخلیق کاروں کی سوچوں میں وہ وجہ امتیاز بنتی ہے۔ ان کا جائزہ لیا جانا چاہیے اور عالمی سطح پر اُردو تخلیق کن نئے تیوروں سے آشنا ہو رہی ہے اس کی تفصیل یہاں کے اُردو داں حلقے تک پہنچنا چاہیے۔

تقریب کے آخر میں قومی اُردو کونسل کے وائس چیئر مین جناب وسیم بریلوی نے تقی عابدی کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا اور کہا کہ ''اُردو تحریر، تقریر، تحقیق کی چلتی پھرتی خوشبو کا نام تقی عابدی ہے۔'' انھوں نے کونسل کی جانب سے سبھی مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کیا۔

آج کی اس خاص محفل میں جن اُردو داں حضرات نے شرکت کی اُن کے نام اس طرح ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ابن کنول،، ڈاکٹر شاہد ماہلی، جناب فیروز بخت، جناب حافظ مطلوب کریم، جناب آصف اعظمی، جناب فرید احمد، جناب ایم فاروق انجینئر، شیخ علیم الدین اسعدی، جناب راشد حامدی، پروفیسر شہپر رسول، جناب انیس اعظمی، جناب اقبال مسعود، ڈاکٹر مشتاق، جناب ایم اے عالمگیر کے علاوہ قومی اُردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر جناب نسیم احمد اور کونسل کے عملے نے بھی شرکت کی۔

میر انیسؔ کی رباعیات کو نئے زاویہ سے دیکھنے کی کوشش

ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ'' کا اجراء

عالمی شہرت یافتہ ادیب، ناقد، معالج ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) کی چالیسویں کتاب ''دیوانِ رباعیاتِ انیسؔ'' کا اجراء آج یہاں شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کے مسعود حسن رضوی ہال میں عمل میں آیا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نائب صدر ڈاکٹر کلب صادق نے کتاب کا اجراء کرنے کے بعد اپنے خطاب میں اس کتاب کو ڈاکٹر تقی عابدی کا عظیم کارنامہ قرار دیتے ہوئے ان کو مبارک باد پیش کی اور بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔ سبکدوش جسٹس حیدر عباس رضا کی صدارت میں ہونے والی اس تقریب کی نظامت شعبۂ اُردو کے استاد ڈاکٹر عباس رضا نیر نے کی۔ پروفیسر شارب ردولوی نے ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''ڈاکٹر عابدی نے ادب کا سائنسی تجزیہ کیا ہے۔ آج ان جیسا ناقد اور مدوّن نہیں ہے۔ انھوں نے میر انیسؔ کی تمام رباعیات کی تدوین کے ساتھ ہی اس کی موضوعاتی تقسیم بھی کی ہے۔ اُردو ادب خصوصاً رثائی ادب کے لیے ان کی خدمات قابل تحسین ہیں۔'' جسٹس حیدر عباس رضا نے میر انیسؔ کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''انیس و فردوسیؔ کا تقابلی مطالعہ ہونا چاہیے۔''

معروف صحافی اور ادیب شاہنواز قریشی نے کہا کہ ''ڈاکٹر تقی عابدی کو صرف رثائی ادب تک محدود نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے فیض احمد فیضؔ، فراق گورکھپوری، علامہ اقبالؔ اور مرزا غالبؔ وغیرہ پر بہت کام کیا ہے۔'' شاہنواز قریشی نے کہا کہ ''میر انیسؔ کی غزلوں پر بھی کام ہونا چاہیے۔''

پروفیسر انیس اشفاق نے صنف رباعی میں لکھنؤ کی مرکزیت اور ڈاکٹر تقی عابدی کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ''ڈاکٹر عابدی نے انیسؔ کی رباعیات کو نئے زاویہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ انیسؔ کے تمام مراثی کی طباعت کرنے جارہے ہیں۔ یہ اُردو زبان کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس موقع پر لکھنؤ کی تہذیبی اہمیت، یہاں کی شعری روایات اور میر انیسؔ کی شاعرانہ عظمت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ ''ابھی تک میر انیسؔ کو محض 10 فیصد ہی دریافت کیا جاسکا ہے۔ میر انیسؔ کی رباعیات کی تعداد 579 ہے جب کہ فارسی کے عظیم شاعر خیامؔ نے صرف 179 رباعیات ہی لکھی ہیں۔ ہم لوگ میر انیس کی رباعیات کی عظمت سے ناآشنا ہیں، ان کو اہم مقام اور مرتبہ دلانے کے لیے کافی ہیں۔'' بنارس ہندو یونیورسٹی شعبۂ اُردو کی سابق صدر پروفیسر قمر جہاں اور ڈاکٹر جعفر عسکری نے بھی اظہار خیال کیا۔ خانوادۂ انیس کے فرد علی احمد دانش نے ''رباعیاتِ انیس کی مرحلہ وار اشاعت'' موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ تقریب میں ٹیکساس یونیورسٹی کے پروفیسر اکبر حیدری، ڈاکٹر احمد عباس ردولوی، نواب جعفر میر عبداللہ، اطہر نبی، افسانہ نگار ارشاد امروہوی، عائشہ صدیقی، ڈاکٹر تقی علی عابدی، حیدر نواب جعفری، قمر گونڈوی اور اسرار سید سمیت ادیبوں، شاعروں، معززین شہر اور طلبہ وطالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

23/مارچ 2013ء

جشن فیض احمد فیضؔ صدی تقریب میں سید تقی عابدی اور انجینئر عبدالقدیر کی شرکت

تمل ناڈو اُردو رابطہ کمیٹی کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے جشن فیض احمد فیضؔ صدی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے تمل ناڈو میں تحریک اُردو کی متحرک شخصیت اور کمیٹی کے صدر ملک العزیز نے ریاست تمل ناڈو کے اُردو داں طبقہ سے اصرار کیا کہ وہ اُردو کو زندہ رکھنے کے لیے خود بھی اُردو زبان سے جڑے رہیں، اور اپنے بچوں اور نوجوانوں کو بھی اُردو زبان سے جڑے رہنے کے لیے ان کو بھی اُردو رسم الخط سکھائیں، تاکہ تمل ناڈو میں اُردو زبان اپنی آب وتاب کے ساتھ زندہ رہ سکے، انھوں نے مزید کہا کہ ''اب قومی اُردو کونسل کے آن لائن اُردو لرننگ پروگرام شروع ہونے کے بعد ہم یہ بہانہ نہیں کرسکتے کہ اُردو زبان سیکھنا وقت طلب کام ہے، آج کل ہماری نوجوان نسل ویسے تو کئی گھنٹے انٹرنیٹ پر گزارتی ہے، ایسے میں ہماری نوجوان نسل اگر اُردو زبان سیکھنے کے لیے ایک یا دو گھنٹے صرف کریں گے تو ان کے لیے نہ صرف ان کا وقت مفید گزرے گا بلکہ وہ ایک عظیم زبان اور ثقافت سے آشنا ہو جائیں گے۔'' انھوں نے غیر اُردو داں طبقہ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ''کس طرح وہ لوگ اپنی زبان کی بقاء کے لیے اپنی جانیں تک قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں، ایسے میں کیا ہم روزانہ ایک دو گھنٹے اپنی زبان کے لیے نہیں دے سکتے؟''

ملک العزیز نے اس تقریب میں اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ ایک عالمی اُردو سیمینار منعقد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جس کے لیے انھوں نے عوام کے تمام طبقات سے دامے درمے سخنے تعاون کی گزارش کی، جشن فیض احمد فیضؔ صدی

تقریب میں کینیڈا سے تشریف لائے مشہور ادیب و شاعر سید تقی عابدی نے فیض احمد فیض کی شاعری کے متنوع پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے فیض کے متعلق کئی غلط فہمیوں کو رفع کیا، تقریب میں شامل مشہور ادیب علیم صبا نویدی نے بھی فیض پر ایک وقیع مضمون سامعین کی نذر کیا، جس کے بعد بیدر کرناٹک سے تشریف لائے مشہور شاہین پی یو کالج کے جنرل سکریٹری عبدالقدیر صاحب کو اُردو ذریعہ تعلیم کے ساتھ زبان اور تعلیم کو فروغ دینے پر ان کی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے۔ ''امتیاز اُردو'' ایوارڈ برائے 2012ء سے نوازا گیا، تمل ناڈو اُردو رابطہ کمیٹی ہر سال اُردو کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو امتیاز اُردو ایوارڈ دیتی آرہی ہے، قبل ازیں یہ ایوارڈ دوبئی کے مشہور عرب شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق اور کینیڈا کے نامور ادیب و شاعر ڈاکٹر سید تقی عابدی کو دیا جا چکا ہے، انجینئر عبدالقدیر نے ایوارڈ قبول کرتے ہوئے، اپنے تعلیم کے طریقہء کار سے سامعین کو واقف کرایا، جس کو سن کر سامعین کافی متاثر ہوئے، جلسہ کے بعد ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا، جس میں ڈاکٹر تقی عابدی کے علاوہ بنگلور سے آئے ہوئے شاعر اختر علوی اور کئی مقامی شعراء نے اپنے کلام سے محظوظ کیا، مشاعرہ کی صدارت تمل ناڈو کے نامور شاعر و ادیب علیم صبا نویدی نے کی، اس تقریب میں کافی تعداد میں سامعین اور محبانِ اُردو نے شرکت کی۔

ہفتہ وار ''گواہ'' حیدرآباد

28/ مارچ 2013ء

کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اعظم کیمپس پونہ میں تقی عابدی کا خطاب

شہر پونہ اعظم کیمپس عصری تعلیم کا ایک شاندار گہوارہ ہے۔ جو اُردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے بھی مسلسل سرگرم عمل رہتا ہے۔ اسی سلسلے میں مورخہ 12/ مارچ 2013ء کو ڈاکٹر اے۔آر۔ شیخ اسمبلی ہال میں توسیعی خطبہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ماہر غالبیات، ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ''کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور'' کے عنوان پر سامعین سے مخاطب کیا۔ بیرون پونہ سے بھی کئی علمی و ادبی ہستیوں نے اپنی آمد سے اس پروگرام کو یادگار بنایا۔ جلسے کا آغاز تلاوت قرآن سے ہوا۔ ناندیڑ سے تشریف لائے ڈاکٹر محمد شجاعت علی کامل نے تقی عابدی صاحب کا تعارف پیش کیا۔ منور پیر بھائی (چیئرمین، حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ) نے حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے اعظم کیمپس کی خدمات پر مختصر روشنی ڈالی ساتھ ہی جلسے کی اہمیت اور غالبؔ کے حالاتِ زندگی، اُن کی آفاقی شاعری اور خطوط نویسی پر بات چیت کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ڈائس پر موجود مہمانان، پرستارانِ اُردو اور معزز شخصیات سے مخاطب ہوتے ہوئے غالبؔ کے اندازِ بیان کو نہایت مسحور کن انداز میں پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''غالبؔ بے شک ایک مشکل پسند شاعر تھے اور اپنی بات کو ایسے انداز میں بیان کرتے تھے کہ اس کی وسعت اور کشادگی کو پانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ ممتاز پیر بھائی نے غالبؔ کا کلام پُرسوز آواز میں پیش کیا۔

روزنامہ ''صحافت'' دہلی

6/ستمبر 2013ء

رسم الخط کی ترویج اُردو کا سب سے بڑا مسئلہ

کونسل نے ساری دُنیا سے اُردو پرستاروں کو جمع کر کے عظیم کارنامہ انجام دیا: تقی عابدی

اُردو رسم الخط کی ترویج و تربیت آج اُردو زبان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس شاندار زبان کو نئی ٹکنالوجی سے جوڑنے میں قومی اُردو کونسل نے بے حد اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ صحیح معنوں میں آج دُنیا میں اُردو کو فروغ دینے والا سب سے بڑا ادارہ بن چکا ہے۔

ان خیالات کا اظہار بین الاقوامی اُردو کانفرنس کے دوسرے دن کے اجلاس میں کیا گیا۔ یہ کانفرنس نہ صرف کونسل کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے بلکہ اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں بھی اسے سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ ''اکیسویں صدی میں اُردو: فروغ اور امکان'' کے موضوع پر قومی اُردو کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے ذریعہ منعقد کی گئی۔ بین الاقوامی کانفرنس میں آج پہلے سیشن کا موضوع اُردو کے فروغ میں سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کا کردار تھا، جس میں نسیم عارفی، خوشتر نورانی اور پروفیسر عبدالحق نے اپنے وقیع مقالات پیش کیے۔ اس سیشن میں کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کونسل کی تمام کارگزاریوں پر مشتمل ایک پاور پوائنٹ پریزینٹیشن پیش کیا۔ پاکستان کے معروف کالم نگار جناب عطاء الحق قاسمی نے کونسل کی خدمات کی ستائش کی اور کہا کہ ''کونسل واقعی اُردو کی خدمت کر رہی ہے۔'' انجمن ترقی اُردو کے جنرل سکریٹری جناب اطہر فاروقی نے انجمن ترقی اُردو ہند کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے انجمن کے دائرہ کار کی توسیع پر زور دیا۔ ڈاکٹر ظفر محمود نے اپنے مقالے میں ہندوستانی آئین کی مختلف دفعات کا حوالہ دیتے ہوئے ملک میں اُردو کی صورت حال بیان کی اور ملکی و عالمی سطح پر اُردو کے فروغ کا ایک منظم و

مربوط لائحہ عمل مرتب کرنے کی درخواست کی۔ انھوں نے حکومت کی اسکیموں کا جائزہ لیا اور کہا کہ ''اُردو والوں کو بھی اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے کہ خود اُردو کے فروغ کی کتنی سنجیدہ کوششیں کر رہے ہیں۔'' اس اجلاس میں معروف ادیب جناب غلام نبی خیالؔ نے جموں کشمیر کے وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ کا کونسل کی اس کانفرنس کے لیے خصوصی پیغام بھی پڑھ کر سنایا۔ اپنے پیغام میں وزیر اعلیٰ نے کونسل کی ستائش کرتے ہوئے کانفرنس کی کامیابی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ مجلس صدارت میں شامل سابق مرکزی وزیر مملکت جناب علی اشرف فاطمی نے صدارتی کلمات میں کہا کہ ''اُردو ہندوستان کی ملٹی نیشنل زبان ہے، اسے عالمی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ قومی اُردو کونسل کو بنیادی تعلیم پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے اور اس ادارے کو انٹرمیڈیٹ کی سطح پر سی بی ایس ای کے اُردو اسکولوں کے قیام کی سمت میں کوششیں کرنی چاہئیں۔''

مجلس صدارت کے رکن جناب وبھوتی نرائن رائے نے کہا کہ ''اُردو اور ہندی کا غم ایک جیسا ہے، ہمیں مل جل کر ان زبانوں کے فروغ کی کوششیں کرنی ہوں گی۔ ہندوستان اُردو کے بغیر سیکولر ہو ہی نہیں سکتا۔'' جناب ولی رحمانی نے صدارتی کلمات میں کہا کہ ''جمہوریت میں زبان کی سب سے بڑی قیمت ہے اگر سرکار ہماری بات نہیں سنے گی تو ہم مضبوطی سے اپنا احتجاج درج کرائیں گے۔ حکومتوں کے کندھوں پر زبانیں چلا کرتی ہیں، زندہ نہیں رہتیں۔'' کونسل کے وائس چیئرمین اور مجلس صدارت کے رکن پروفیسر وسیم بریلوی نے مختصراً اس سیشن میں پڑھے گئے 6 مقالوں کا جائزہ لیا اور کہا کہ ''ان مقالوں میں دردمندی تھی اور ہمیں اُردو کے فروغ کی سمت میں مزید سنجیدہ کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔'' سیمینار کے دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں ڈاکٹر تقی عابدی، عطاء الحق قاسمی، پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر وسیم بریلوی شامل تھے۔ نظامت پروفیسر ابن کنول نے کی۔

اجلاس کا موضوع تھا، ''اُردو کا عالمی تناظر تہذیب و ادب کے حوالے سے'' سیشن کا پہلا مقالہ ماریشس کے ڈاکٹر احمد رحمت علی نے پڑھا۔ انھوں نے ماریشس میں اُردو زبان و ادب کی تعلیم و تربیت پر اظہار خیال کیا۔ قاہرہ سے آئے ڈاکٹر احمد محمد احمد عبدالرحمٰن نے اپنے وقیع مقالے میں خلیجی ممالک میں اُردو کے استعمال پر روشنی ڈالی اور

یہ بتایا کہ وہاں عرب لوگ بھی اپنی بات چیت میں اُردو کے ڈھیروں الفاظ استعمال کرتے ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ ''مصر ہی نہیں بلکہ تمام خلیجی ممالک میں اُردو کا مستقبل روشن ہے۔ اس سمت میں یہاں کے اداروں کو وہاں کی درس گاہوں میں کتابوں کی فراہمی کو یقینی بنانا چاہیے۔''

پاکستان کی مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائریکٹر اور معروف ادیب و ناقد ڈاکٹر تحسین فراقی نے مجلس ترقی ادب لاہور کی خدمات پر گفتگو کی اور کہا کہ ''مجلس نے ادب کے ساتھ دیگر موضوعات پر ہزاروں کتابیں شائع کی ہیں۔'' پاکستان کے معروف کالم نگار عطاء الحق قاسمی نے اپنے شگفتہ انداز میں برصغیر میں اُردو کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی۔ ماسکو سے تشریف لائیں ڈاکٹر لڈمیلا واسلیوا نے روس میں اُردو زبان کے آغاز و ارتقا پر اظہارِ خیال کیا۔

استنبول کے ڈاکٹر خلیل طوقار نے ترکی میں اُردو کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ''زبان کو ختم کرنے کے کئی مجرب نسخے ہیں جنھیں آج برصغیر میں آزمایا جارہا ہے۔ اس سمت توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مجلس صدارت کے رکن معروف ناقد و محقق ڈاکٹر تقی عابدی نے پڑھے گئے مقالوں پر مختصراً اظہارِ خیال کرتے ہوئے اُردو کی تاریخ پر خوب صورت نثریہ شاعری کی اور اُردو کے رسم الخط کے تحفظ، بنیادی تعلیم، اُردو کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے، اُردو ریڈرشپ کی توسیع اور اُردو کتابوں کو اغلاط سے پاک کرنے کے لیے اُردو میں پروف ریڈنگ کورس وضع کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے کونسل کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ''قومی اُردو کونسل نے ساری دُنیا سے اُردو پرستاروں کو جمع کر کے عظیم کارنامہ انجام دیا ہے تاکہ یہ اسکالرس یہاں بیٹھ کر اُردو کی ترقی کی سمت میں غور و خوض کرسکیں۔ دوسرے اجلاس کے اختتام کے بعد بین الاقوامی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر وسیم بریلوی، مظفر حنفی، فرحت شہزاد، عطاء الحق قاسمی، محمد علوی، ڈاکٹر زبیر، عزیز نبیل، ڈاکٹر نسیم نکہت، انور جلال پوری، راحت اندوری، جاوید اختر، تقی عابدی، جلیل نظامی، سریندر شجر، مہتاب عالم اور نواز دیوبندی وغیرہ نے اپنے خوب صورت کلام سے محفلِ مشاعروں کو رونق بخشی۔

وسیم افتخار انصاری
ماہنامہ ''اُردو ہلچل'' اندور
اکتوبر 2013ء

اندور میں ''فیض شناسی''
کا اجرا توسیعی خطبہ، سیمینار اور مشاعرہ

اندور میں رشید اندوری، عزیز اندوری اور جاوید عرشی ایسی شخصیات ہیں جو وقتاً فوقتاً ادبی و شعری تقاریب منعقد کرتی رہتی ہیں۔ جس سے اندور کے ادبی تعارف میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن کچھ ایسی یادگار محافل اور مجالس بھی ہوتی ہیں جو نہ صرف شہر کی ادبی تاریخ کو مالا مال کرتی ہیں بلکہ اُردو ادب میں بھی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ایک ایسی ہی یادگار، تاریخی تقریب فیض احمد فیض کی شخصیت کو لے کر اندور میں منعقد ہوئی۔

شہر اندور کی فعال ادبی انجمن بزمِ عرشی کے زیرِ اہتمام 7 رستمبر 2013ء بروز سنیچر شام 8 بجے اندور پریس کلب ہال میں معروف شاعر و ناقد رشید اندوری کے التماس پر، کینیڈا سے تشریف لائے عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب محقق و ناقد، ماہرِ رثائی ادب و فیضیات، ڈاکٹر سید تقی عابدی کے اعزاز میں، پروفیسر خلیل احمد صدیقی مشیر کی صدارت میں، ایک عظیم الشان توسیعی خطبہ، سیمینار اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں شہر اور بیرونِ شہر کی مشہور و معروف شخصیات نے شرکت کی۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی اور اندور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر اے اے عباسی نے شمع افروزی کی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیقی و تنقیدی تالیف ''فیض شناسی'' کا اجراء ہوا۔ تقریب کی ابتدا خدا کی حمد و ثنا کے بعد حافظ رفیق محسن نے فیض کے پانچ اشعار پر مشتمل فارسی نعت کو پہلی دفعہ دلکش ترنم اور مدھ بھری آواز میں اس طرح پیش کیا کہ محفل میں لوگ مسرور ہو گئے۔

کتاب کی رسمِ اجراء کے بعد، صاحبِ اعزاز ڈاکٹر سید تقی عابدی نے فیض احمد فیض کی حیات، شخصیت، عہد، فن اور شاعری پر توسیعی خطاب فرمایا، انھوں نے فیض کو سیاسی، سماجی، تاریخی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے ادب کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت بتلایا، موصوف کا اندازِ تکلم اس قدر شیریں، شگفتہ اور مؤثر تھا کہ محفل ان کی عالمانہ گفتگو سے محظوظ ہوگئی۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے توسیعی خطاب کے بعد عالمی مشاعرے اور سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت پروفیسر خلیل نے کی، مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر تقی عابدی نے کی، کہانی کار، محقق، ناقد پروفیسر مختار شمیم (سابق پرنسپل، گورنمنٹ پی جی کالج) نے ''فیض شناسی'' پر تنقیدی تحقیقی باریک بینی کے ساتھ پُر مغز مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر عزیز اندوری نے بھی اندور کے ادب پر گفتگو فرمائی۔ پروفیسر اے۔اے۔عباسی نے اپنے علی گڑھ تعلیم کے دوران فیض کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے فیض کی یادوں کو تازہ کیا۔ ان کے بعد سیمینار کے صدر پروفیسر خلیل احمد صدیقی مشیر نے پیش کیے گئے مقالات پر بڑی گہرائی و گیرائی کے ساتھ منصفانہ تبصرہ کیا۔ انھوں نے پروفیسر مختار شمیم کے مقالے کو بہترین مقالہ قرار دیا۔ سیمینار کی نظامت کے فرائض رشید اندوری نے بحسن وخوبی انجام دیئے۔ جس کے بارے میں صدر سیمینار نے بھی اعتراف کیا کہ اگر کسی تقریب کامیاب بنانا ہو تو ناظم اچھا ہونا چاہیے یوں بھی ساری تقاریب کے اہتمام اور کامیابی کا سہرا رشید اندوری کے سر ہے۔

سیمینار کے بعد ادبی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت ڈاکٹر سید تقی عابدی اور نظامت فریاد بہادر نے کی۔ جس میں اندور کے علاوہ برہانپور، بھوپال اور دہلی سے تشریف لائے شعراء نے شرکت کی۔ نوح عالم، حافظ محسن، خلیل آتش، احمد نثار، ڈاکٹر جلیل، اسحاق اثر، فریاد بہادر، قیصر عزیز، عشرت واحد، جاوید عرشی، نعیم راشد، نصیر انصاری، پروفیسر مختار شمیم، رشید اندوری اور صدرِ مشاعرہ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے کلام سے عوام کو محظوظ فرمایا۔

اندور میں یہ ایسا پہلا موقع تھا کہ عوام نے دیر رات تک اتنا طویل نثری پروگرام سماعت کیا ہو اور اس کے بعد حیرت انگیز طور پر مشاعرہ بھی کامیاب رہا ہو۔ واقعی جاوید عرشی اور خصوصاً رشید اندوری مبارک باد کے مستحق ہیں۔

15/دسمبر 2013ء

شعبہ اُردو تلنگانہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام اُردو فیسٹیول کا انعقاد

ڈاکٹر تقی عابدی کا لکچر اور بین کلیاتی ادبی مقابلے

ڈاکٹر اطہر سلطانہ صدر شعبہ اُردو کا بیان

ڈاکٹر اطہر سلطانہ صدر شعبہ اُردو تلنگانہ یونیورسٹی و ڈاکٹر موسیٰ اقبال اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو کے صحافتی بیان کے مطابق شعبہ اُردو تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد کے زیر اہتمام 23 اور 24 دسمبر کو دو روزہ اُردو فیسٹیول کا یونیورسٹی کیمپس ڈچپلی نظام آباد میں انعقاد عمل میں آرہا ہے۔ اس اُردو فیسٹیول کی افتتاحی تقریب میں کینیڈا سے آئے ممتاز محقق ادیب ناقد و دانشور ڈاکٹر تقی عابدی کا خصوصی لکچر ہوگا۔ اور شہر نظام آباد سے تعلق رکھنے والے اُردو میڈیم ڈگری اور پی جی طلبا و طالبات کے لیے بین کلیاتی ادبی مقابلوں کا انعقاد عمل میں آئے گا۔ 23 دسمبر کو صبح 10 بجے اُردو فیسٹیول کی افتتاحی تقریب سیمینار ہال کمپیوٹر سائینس اینڈ انجینئرنگ بلڈنگ تلنگانہ یونیورسٹی میں منعقد ہوگی۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر ایم دھرما راج پرنسپل یونیورسٹی کالج تلنگانہ یونیورسٹی کریں گے۔ ڈاکٹر اطہر سلطانہ صدر شعبہ اُردو کی خیر مقدمی تقریر ہوگی۔ پروفیسر محمد اکبر علی خان وائس چانسلر تلنگانہ یونیورسٹی، ڈاکٹر سید تقی عابدی کینیڈا، پروفیسر آر لمبادری رجسٹرار اور پروفیسر ایس اے شکور ڈائریکٹر سکریٹری اُردو اکیڈمی اے پی مہمان خصوصی ہوں گے۔ جب کہ جناب طاہر بن ہمدان صدر ضلع کانگریس کمیٹی اور ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد ایسوسی ایٹ پروفیسر مانو مہمانان اعزازی ہوں گے۔ افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کتاب ''فیض شناسی'' کا رسم اجرا پروفیسر اکبر علی خان وائس چانسلر انجام دیں گے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد طلباء کے لیے ادبی مقابلے منعقد ہوں گے۔ پہلے دن تحریری مقابلہ، تقریری مقابلہ، ادبی کوئز منعقد ہوگا۔ تحریری مقابلے کے لیے عنوانات ''کیا تعلیم صرف ملازمت کے لیے ہونی چاہیے۔ موجودہ

دور میں خواتین کا تحفظ۔ اور موجودہ دور میں سماجی پستی اور ہماری ذمہ داریاں رکھے گئے ہیں۔ تقریری مقابلے کے لیے عنوانات اُردو سے روزگار کے مواقع مسائل اور امکانات، لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم اور ملازمت کے مسائل اور اعلیٰ تعلیم اور اخلاقی اقدار رکھے گئے ہیں۔ ان مقابلوں کے لیے طلباء انفرادی طور پر شرکت کر سکتے ہیں۔ طلباء اپنے نام کالج کے اُردو لکچرر کے ہاں پیش کریں۔

دوسرے دن نظم خوانی اقبال کی نظموں سے انتخاب اور بیت بازی کے مقابلے منعقد ہوں گے اور اسی دن جلسہ تقسیم انعامات عمل میں آئے گا۔ بیت بازی اور ادبی کوئز کے لیے کالج سے دو ٹیمیں حصہ لے سکتی ہیں۔ ان ادبی مقابلوں کے لئے مختلف کالجوں کے لکچررس کو کنوینرس بنایا گیا ہے۔ تحریری مقابلوں کے کنوینر ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اُردو گری راج گورنمنٹ کالج سیدہ نشاط فاطمہ ریسرچ اسکالر شریک کنوینر، تقریری مقابلوں کے لیے عبدالرحمٰن داؤدی لیکچرر اُردو بودھن کنوینر اور آفرین سلطانہ متعلم ایم اے اُردو سال اول شریک کنوینر، ادبی کوئز مقابلوں کے لیے ڈاکٹر محمد ناظم علی پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ کنوینر اور اسماء بیگم متعلم سال ایم اے سال دوم شریک کنوینر، نظم خوانی کے لیے ڈاکٹر گل رعنا اسسٹنٹ پروفیسر کنوینر اور شمیم سلطانہ لکچرر اُردو ویمنس ڈگری کالج نظام آباد شریک کنوینر اور بیت بازی کے لیے ڈاکٹر موسیٰ اقبال کنوینر اور افتخار فہد ریسرچ اسکالر شریک کنوینر ہوں گے۔ ان مقابلوں کے سرپرست اعلیٰ پروفیسر ایم دھرم اراج، کوآرڈینیٹر ڈاکٹر اطہر سلطانہ اور جنرل کنوینر ڈاکٹر موسیٰ اقبال نے تمام ڈگری اور پی جی اُردو میڈیم طلبا وطالبات سے کثیر تعداد میں شرکت کرنے اور اُردو فیسٹیول 2013 کو کامیاب بنانے کی اپیل کی ہے۔

3/مارچ 2014ء

غالب انسٹی ٹیوٹ میں
پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب پر مذاکرہ

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ''شامِ شہریاراں'' کے موقع پر ممتاز ادیب و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اہم کتاب ''غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات'' پر ایک اہم مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو اُن کی اس تاریخی کتاب پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ''نارنگ صاحب نے اس کتاب میں غالبیات کے تعلق سے ہر صفحے میں نئی بات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے قبل بھی غالبیات پر بے شمار تنقیدیں لکھی گئیں لیکن پروفیسر نارنگ کے اس علمی کام کو تحقیق وتنقید کی دُنیا میں ہمیشہ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔'' اس جلسے کے مہمانِ خصوصی کینیڈا کے معروف ادیب و دانشور ڈاکٹر تقی عابدی نے فرمایا کہ ''یہ کتاب بے پناہ خصوصیات کی حامل ہے اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر صفحہ غالب سے مربوط ہے۔'' پروفیسر نارنگ نے اس کتاب میں غالب کے سومناتی خیال پر بھی گفتگو کی ہے جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ نارنگ صاحب نے اس کتاب میں 21 ابواب قائم کیے ہیں اور اس کا ہر باب فکر انگیز اور معنی خیز ہے۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے یہ بھی فرمایا کہ ''اس کتاب کا فارسی میں بھی ترجمہ ہونا چاہیے تاکہ ایرانی حضرات بھی اس علمی تحفے سے مستفید ہوسکیں۔'' ممتاز ناقد پروفیسر عتیق اللہ نے فرمایا کہ ''پروفیسر نارنگ نے اس کتاب میں اپنی روشن دماغی کا ثبوت دیا ہے۔'' انھوں نے

غالبؔ کے ہر شعر کو چیلنج کی طرح قبول کیا ہے اور اُس کی عالمانہ تعبیر پیش کی ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری ادبی دُنیا میں یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت سے جانی جارہی ہے۔'' الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر علی احمد فاطمی نے فرمایا کہ'' نارنگ صاحب نے اپنی اس کتاب میں غالبؔ کے اشعار کی نئی توجیہات پیش کی ہے جسے پڑھ کر ہمارا دماغ روشن ہوجاتا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے شونیتا کے فلسفے کو غالبؔ کی شاعری سے جس طرح مربوط کیا ہے اُس سے اس کتاب کی وقعت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کتاب کو لکھ کر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنا شمار اہم غالبؔ شناسوں میں کرالیا ہے۔

پروفیسر شافع قدوائی نے فرمایا کہ'' پروفیسر نارنگ نے اس کتاب میں غالبؔ کو نئے طریقے سے دریافت کیا ہے۔ غالبؔ نے اپنے کلام میں جس نئی شعریات کو وضع کیا آپ نے اس کتاب میں اُس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ فلسفہ شونیتا پر بھی جس عالمانہ طریقے سے آپ نے گفتگو کی ہے اس سے پہلے اُردو دُنیا میں اس انداز سے کسی نے گفتگو نہیں کی تھی۔''

نظام صدیقی نے فرمایا کہ'' کتاب کے ہر باب میں پروفیسر نارنگ نے غالبؔ کے اشعار کی جس عالمانہ انداز میں شرح پیش کی ہے اس سے یہ کتاب غالبیات کی دُنیا میں سنگِ میل کی حیثیت کی حامل ہوگئی ہے۔''

عالمی اُردو ٹرسٹ کے چیئرمین جناب اے رحمان نے کہا کہ'' ہماری ادبی دُنیا میں غالبیات کے تعلق سے اتنی اہم اور معنی خیز کتاب کم ہی لکھی گئی ہیں۔'' آپ نے یہ بھی فرمایا کہ'' پروفیسر نارنگ نے شونیتا کے ساتھ ساتھ جدلیاتی وضع کو مفکرانہ انداز میں واضح کیا ہے۔''

ساہتیہ اکادمی کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے فرمایا کہ'' حالیؔ کی ''یادگارِ غالبؔ'' کے بعد اگر کسی کتاب نے ہمارے دل و دماغ کو متاثر کیا ہے تو وہ نارنگ صاحب کی موجودہ کتاب ہے۔ یہ کتاب اکیسویں صدی کی اُن شہرہ آفاق کتابوں میں سے ایک ہے جس کا ہر صفحہ مصنف کے عالمانہ افکار کی ترجمانی کررہا ہے۔ نوجوان ناقد ڈاکٹر مولیٰ بخش نے فرمایا کہ'' پروفیسر نارنگ نے اس کتاب میں ہندستان کی پوری تاریخ اور فلسفے

کے تناظر میں غالبؔ کی شاعری کو دیکھا ہے۔ موجودہ دور میں اس کتاب کی اس لیے بھی اہمیت ہے کہ جہاں ہر طرف ظلم و تشدد کا ماحول گرم ہے وہیں یہ کتاب ہمیں روشنی بھی عطا کر رہی ہے۔"

ڈاکٹر راشد انور راشد نے کہا کہ "پروفیسر نارنگ نے اس کتاب میں غالبیات کے چھپے ہوئے اُن گوشوں پر گفتگو کی ہے جس پر ابھی تک کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔"

جلسے کی نظامت کرتے ہوئے غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے ابتدا میں کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ "اس کتاب کا ہر صفحہ اور ہر لفظ غالبیات کی ایک نئی بازیافت ہے اس کتاب کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ مصنف نے غالبؔ کے اُردو اشعار کے ساتھ ساتھ فارسی اشعار پر بھی عالمانہ گفتگو کی ہے اور فارسی کے بڑے شعرا فردوسیؔ، رومیؔ اور بیدلؔ کے تناظر میں غالبؔ کے کلام کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس مذاکرے کی خاص بات یہ بھی تھی کہ اس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ خود موجود تھے اور انھوں نے اس مذاکرے کے لیے غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ مجھ پر ایک قرض تھا جو میں نے ادا کر دیا۔ اس لیے کہ غالبؔ کو سمجھنا آسان نہیں ہے، غالب پر لکھتے ہوئے میں ہمیشہ ڈرتا ہوں کہ ممکن ہے حق ادا نہ ہو سکے۔" آپ نے یہ بھی کہا کہ "غالب پر سب سے زیادہ لکھا گیا اور سب سے کم غالبؔ کو سمجھا گیا۔ غالبؔ کی شاعری کو پڑھ کر ہندوستان کی تہذیب و تاریخ کا علم ہوتا ہے کیوں کہ غالبؔ کے کلام کی جڑیں اس ملک کے تمام مذاہب کی جڑوں سے ملی ہوئی تھیں۔ غالبؔ کی شاعری شعریت سے بھرپور ہے جس کو حالی نے بھی نیرنگی نظر کہا ہے۔"

مجلس فروغ اُردو ادب دوحہ، قطر کے چیئرمین محمد عتیق نے بھی اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب شاہد ماہلی نے تمام سامعین اور مقررین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نارنگ صاحب کو اُن کی معرکۃ الآرا کتاب پر مبارک باد پیش کی۔ چار گھنٹے تک چلنے والے اس تاریخی مذاکرے میں دلّی اُردو اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی، محمد شمیم، ڈاکٹر سرورالہدیٰ، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، ڈاکٹر سہیل انور، ڈاکٹر ادریس احمد، اقبال مسعود فاروقی، محسن تشی کے علاوہ بڑی تعداد میں اہل علم موجود تھے۔

ڈاکٹر سید تقی عابدی
روزنامہ ''اعتماد'' حیدرآباد
14 / جولائی 2014ء

سعیدؔ شہیدی صدی تقاریب

سعیدؔ شہیدی کی موجِ غزل طوفان سے ساحل تک

سعیدؔ کی غزلوں میں قدیم روایتی مضامین ساحل طوفان اور سفینہ نئے نئے مطالب سے پیش کیے گئے ہیں۔ سعیدؔ نے پرانی بوتلوں میں نئی شراب بھری ہے۔ اُردو شاعری میں ان کے پاس کلاسیک مضامین پر اشعار کی کمی نہیں اس کے باوجود سعید کا تقریباً ہر شعر ندرت بیان اور جدید طرز کا حامل ہے جو ان کی وسعت فکری، اور تخیل کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے جس سے ان کے شعر میں گیرائی اور گہرائی پیدا ہوگئی ہے۔ لٹریچر میں عموماً طوفان کو مزاحم اور رقیب بنا کر ساحل کو مددگار اور دوست و مہربان بنا کر مضمون نگاری کی گئی ہے۔ سفینہ ایک ایسا وسیلہ ہے جو طوفان سے نجات دے کر ساحل تک پہنچا تا ہے لیکن ساحل کی طرح ضمانت کا حامل نہیں، وہ بھی ڈوب سکتا ہے اور کبھی کنارے لگ سکتا ہے۔

سعیدؔ نے طوفان سے مقابلے کو انسان کی قدرت اور برتری بتا کر اسے منفی نہیں بلکہ مثبت آزمائشی قدر بتایا ہے۔

خدا حافظ تمہارا اہلِ ساحل
مجھے انجام طوفاں دیکھنا ہے

•••

ابھی کیوں لاؤں کشتی سوئے ساحل
ابھی تو زور طوفاں دیکھنا ہے

•••

قدموں میں آجائے گا ساحل
طوفان سے ٹکراتے رہیے

•••

مری دیوانگی پر اہل ساحل مسکراتے ہیں
سفینہ اپنا طوفاں کے مقابل لے کے آیا ہوں

•••

وہ خود ہی لے کے جائے گا ساحل تک آپ کو
طوفاں کے رخ پہ اپنا سفینہ بڑھائیے

•••

یہ طوفاں کیا بنالے گا یہ موجیں کیا بگاڑیں گی
کہ میں نظروں میں اپنے آپ ساحل لے کے آیا ہوں

•••

سفینہ وہ نہیں جو لوٹ آئے ساحل پر
سفینہ وہ ہے جو طوفاں کا رخ بدلنے لگے

کیا ان شعروں میں خودی کی بلندی کی تعلیم نہیں، کیا ان شعروں میں حوادث اور مشکلات سے مقابلہ کرنے کا آدرش نہیں، کیا ان مضامین میں قنوطیت کے برخلاف رجائیت نہیں، کیا ترقی پسندی کی لہران اشعار کے پڑھنے سے رگوں میں نہیں دوڑتی۔ پھر کیوں سعید کی غزل کوصرف روایتی غزل کے گل وبلبل کے شاعر کے حساب میں رکھا گیا؟ زندگی صرف آرام اور عیش پرستی کا نام نہیں، زندگی میں خوشی اور سکون کم دردو آلام اور غم زیادہ ہے۔ اچھی شاعری انسان کو ان معرکوں میں کامیاب ہونے کی ترغیب اور تربیت کرتی ہے جس طرح حق پر لڑتے ہوئے جان دینا جوانمردی اور جاویدانہ حیات ہے اسی طرح اگر طوفان کے جبر وظلم سے سفینہ ڈوب بھی جائے تو اس شکست میں جیت ہے۔ یہاں بربادی نہیں آبادی ہے۔ کچھ شعران مطالب کے یہ ہیں:

اپنی مرضی سے ڈبویا ہے سفینہ میں نے
کبھی طوفان کا احسان اٹھایا ہی نہیں

•••

بچ کہ کیوں آئے کنارے پہ سعید
ڈوب جاتے تو بہت اچھا تھا

•••

جس نے خود طوفاں میں کشتی ڈال دی
اس کے دل میں حسرتِ ساحل کہاں

•••

ساحل بھی اپنا طوفاں بھی اپنا
اب پار اتریں یا ڈوب جائیں

•••

طوفانوں کو جس نے پالا
وہ کیا جانے ساحل کیا ہے

•••

گرداب بلا کا تجھے اندازہ ہو کیسے
جب تیرا سفینہ ہی بھنور تک نہیں پہنچا

•••

نذر طوفاں جب سفینہ ہوگیا
مطمئں یارانِ ساحل ہوگئے

•••

ہمارا سفینہ بھی ڈوبا ہے یاں
ہمارا بھی کچھ حق ہے طوفان پر

زندگی میں سکون عیش و آرامش عارضی ہے جس طرح طوفان سے پہلے فضاؤں میں

خاموشی اور سکوت چھا جاتا ہے اُسی طرح ظاہری خوشی کے بعد غم اور مشکلات کا موسم شروع ہوتا ہے۔ اس لیے خدائے سخن میر انیسؔ نے فرمایا تھا:

کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیسؔ
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

سعیدؔ ذیل کے اشعار میں بتا رہے ہیں کہ دُنیا میں ہر شے مستقل نہیں رہتی۔ انسان سوائے خدا کے کسی دوسری چیز پر بھروسہ نہیں کرسکتا۔ ہر خوشی غم میں اور ہر تاریکی روشنی میں بدل سکتی ہے جس کے لیے انسان کو تیار رہنا چاہیے اور یہی ایک کامیاب زندگی کا راز ہے۔

طلب گارانِ ساحل یاد رکھیں
لبِ ساحل بھی کشتی ڈوبتی ہے

•••

تھا نگاہوں کے سامنے ساحل
کس جگہ جا کے ناؤ ڈوبی ہے

•••

بچا کے لائے ہیں کشتی کو ہم کنارے تک
یہاں بھی شورشِ طوفاں ہے دیکھئے کیا ہو

•••

آپ ساحل سے نہ طوفاں کا تماشا دیکھیں
یہی طوفاں کبھی ساحل تلک آسکتا ہے

•••

سن لیں سارے اہلِ ساحل
طوفانوں کی بات چھڑی ہے

سعیدؔ انہی اشاروں میں عشق مجازی کا چٹخارہ بھی بھر دیتے ہیں۔

مجھے ڈوبنا بھی نہ ہو جائے مشکل
کنارے پہ آنے کی زحمت نہ کیجے

مسکراتے ہوئے کنارے پر
ڈوب جانے کی بات کرتے ہو

•••

یہ طوفاں یہ تلاطم صرف میری زندگی تک ہے
اگر میں غرق ہو جاؤں تو بیڑا پار ہو جائے

جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے خالق کو پہچانا، حدیث مبارک ہے۔ انسان اپنی فضیلت اور مقام سے آگاہ نہیں۔ وہ نائب اللہ ہے اور مختار و مجبور کے درمیان اپنی تقدیر بنانے والا موجود ہے۔ علامہ اقبالؔ مقام انسان کے بارے میں کہتے ہیں کہ "اس پانچ چھ فٹ کے انسان میں ساری کائنات آسانی کے ساتھ سما سکتی ہے لیکن اتنی وسیع کائنات میں انسان پوری طرح سے سما نہیں سکتا یہ کائنات اس کے لیے چھوٹی ہے:

آنچہ در عالم نگنجد آدم است
آنچہ در آدم نگنجد عالم است

وہ شاعری جو انسان کو اس کی باطنی طاقتوں سے روشناس کرتی ہے آفاقی شاعری ہے۔ کبھی کہتے ہیں:

ساحل سے ہیں محوِ تماشا
طوفاں سے ٹکرانے والے

•••

آج وہ محوِ تماشا ہے لبِ ساحل سے
موڑ سکتا تھا جو کل تک رخِ طوفانِ حیات

•••

پھیر دیتا ہے کبھی بپھرے ہوئے طوفاں کا رُخ
اب تماشہ دیکھنے ساحل تک آیا ہے کوئی

اس مختصر تحریر کو ہم سعیدؔ کے ان شعروں پر تمام کرتے ہیں جس کے باطنی معنی انسان کو کوشش عزم اور محنت و مشقت کا درس دیتے ہیں:

ڈوبنے والے کو طوفاں سے بچانے کے لیے
کس قدر گہرا ہے دریا نہیں دیکھا جاتا

•••

تجھ کو موجوں کے تھپیڑوں کا ہو کیا اندازہ
تو نے ساحل سے سفینہ کو بڑھایا ہی نہیں

روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد

22/ستمبر 2014ء

اُردو زبان، ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت

نظام آباد میں بین الاقوامی سیمینار: ڈاکٹر تقی عابدی

کا ویڈیو کانفرنس کے ذریعہ خطاب، دیگر دانشوروں کی بھی شرکت

اُردو زبان ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اس زبان نے ہندوستان میں شاندار تہذیبی روایات قائم کی ہیں۔ جس سے ملک میں مذہبی رواداری، آپسی بھائی چارہ، اتحاد، محبت، خلوص، ہمدردی جیسے جذبات پروان چڑھے ہیں۔ اُردو کی شعری ونثری اصناف میں امیر خسرو، قلی قطب شاہ، ولی میر و غالب، انیس، حالی، جوش و فراق، امجد، اقبال، پریم چند وغیرہ نے جو شاندار تہذیبی روایات اور اقدار کا خزانہ چھوڑا ہے اس سے عصر حاضر کے اقدار سے عاری سماج اور تہذیبوں کے ٹکراؤ والے ماحول میں روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور مستقبل میں بھی اپنی تہذیبی شناخت برقرار رکھنے اور اس سے دوسروں کو مستفید کرنے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار محقق و ناقد ماہر اقبالیات و انیسیات ڈاکٹر تقی عابدی نے گری راج گورنمنٹ کالج نظام آباد میں قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان اور شعبہ اُردو کے زیر اہتمام منعقدہ ایک روزہ قومی و بین الاقوامی اُردو سیمینار سے بذریعے ویڈیو کانفرنس براہ راست کینیڈا سے اپنے خطاب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''آج سماج میں عورتوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں اور انسانی زندگی سے جس طرح اقدار نکل رہے ہیں اس کے تدارک کے لیے اُردو کے شاندار تہذیبی ورثے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔''

انھوں نے کہا کہ ''مستقبل میں اُردو کے فروغ کے لیے مادری زبان میں بچوں کی تعلیم اور اُردو کو روزگار سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ اس ایک روزہ سیمینار کا موضوع اُردو

ادب تہذیبی قدریں ماضی حال اور مستقبل تھا۔" اس سیمینار میں پروفیسر خالد سعید انچارج ڈائریکٹر مرکز برائے اُردو زبان تہذیب و ثقافت مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور کلیدی خطبہ دیا جس میں انھوں نے کہا کہ "تہذیبوں کے بننے میں جغرافیائی حالات، زبان، لباس اور رہن سہن اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اُردو زبان و ادب میں اخلاق اور اقدار پر مبنی باتیں ہیں جن سے موجودہ حالات میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔" انھوں نے سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کو ٹیکنالوجی کے استعمال کے ساتھ شاندار اُردو سیمینار کے انعقاد پر مبارک باد دی اور کہا کہ "ویڈیو کانفرنس کے ذریعے دُنیا کے کسی بھی حصے سے دانشوروں کے لکچر منعقد کرنے کا تجربہ دوسروں کو بھی سیکھنا چاہیے۔ اُردو والوں کے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ عصری ٹیکنالوجی کے ذریعے لکچر منعقد کیا گیا۔" سیمینار کی نظامت کے فرائض محمد عابد علی لیکچرر کامرس واکیڈیمک کوآرڈینیٹر نے انجام دی۔ سیمینار کا آغاز محمد عبدالسلام قمر کی دعائیہ نظم سے ہوا۔ پروجیکٹر پر اقبال کی نظم بچے کی دعا پیش کی گئی۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی نے سیمینار میں شرکت کے لیے آئے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی نے سیمینار کا خطبہ استقبالیہ دیا جس میں انھوں نے سیمینار کی منظوری کے لیے قومی اُردو کونسل برائے فروغ اُردو زبان اور اس کے ڈائریکٹر خواجہ اکرام سے اظہار تشکر کیا اور کہا کہ "کالج کے پرنسپل پروفیسر ایس لمبا گوڑ نے فروغ اُردو کے پروگراموں کی منظوری دیتے ہوئے اپنے محبِ اُردو کا ثبوت دیا ہے۔" ڈاکٹر معید جاوید صدر شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے خطاب میں کہا کہ "والدین اور اساتذہ مل کر بچوں کی اخلاقی تربیت کریں۔ انگریزی تہذیب نے جو اثرات ہندوستان والوں پر ڈالے تھے ان سے آج بھی ہندوستانی قوم آزاد نہیں ہو سکی۔ جب کہ اُردو زبان نے تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ قدریں ہمارے لیے چھوڑی ہیں۔"

ڈاکٹر فضل اللہ مکرم نے کہا کہ "تہذیبیں بنتی بگڑتی ہیں۔ تہذیب کی تعمیر میں زبان کا اہم رول ہوتا ہے اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں اُردو زبان نے اتحاد و بھائی چارے کے فروغ کا رول ادا کیا ہے۔"

ڈاکٹر فاضل حسین پرویز مدیر "گواہ" حیدرآباد نے اپنے خطاب میں موجودہ دور

میں صحافتی اقدار کی پامالی پر اظہار افسوس کیا اور نوجوان نسل کو پیشہ صحافت اختیار کرنے اور صحافتی اقدار کے تحفظ پر زور دیا۔ پروفیسر ایس لمبا گوڑ نے کامیاب سیمینار کے انعقاد پر ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی اور ان کے رفقاء کو مبارک باد پیش کی اور دیگر لیکچررس کو بھی اس طرح کی کوشش کرنے پر زور دیا انھوں نے کہا کہ ''اُردو ادب سے سماج میں خوش گوار تبدیلی آئی ہے اس طرح کے سیمینار کے انعقاد سے ملک میں تہذیبی اقدار کو پروان چڑھانے میں مدد ملے گی۔ سید مجیب علی ڈائریکٹر کریسنٹ گروپ آف اسکولس نظام آباد نے اپنے خطاب میں کہا کہ ''اقبالؔ کی شاعری تہذیبی قدروں کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔''

جناب محمد عبدالعزیز ماہر تعلیم و این آر آئی نے کہا: ''ملک میں آئے دن ہونے والے شرمسار واقعات اور صنف نازک پر ہونے والے حملے ہماری اقدار کی گراوٹ کا نتیجہ ہیں۔'' جناب طارق انصاری ڈائریکٹر گوتمی کالج نظام آباد نے کہا کہ ''اُردو کے فروغ کے لیے موجودہ حکومت سنجیدہ ہے اور تلنگانہ میں اُردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے لیے وہ حکومت سے نمائندگی کریں گے۔'' انھوں نے نظام آباد میں بین الاقوامی اُردو سیمینار کے انعقاد کے لیے ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی و دیگر کو مبارک باد پیش کی۔ جناب محمد نصیرالدین سابق صدر شعبہ تاریخ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کلچر شائستگی اور نفاست سے پیدا ہوتا ہے یہ معاشرے سے تعلق رکھتا ہے کلچر داخلی پہلو ہے اور تہذیب خارجی پہلو سے تعلق رکھتی ہے۔ تعلیم گاہ دراصل تربیت گاہ ہے لہٰذا تعلیم کے ذریعے تہذیب اقدار طلباء وطالبات میں پیدا کیے جائیں۔ جناب جمیل نظام آبادی، ڈاکٹر صفدر عسکری پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج آرمور نے بھی سیمینار سے خطاب کیا۔ سیمینار میں پیش کردہ مقالوں پر مبنی سوونیر اور ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کی تیسری تصنیف سائینس نامہ کی رسم اجراء پرنسپل کالج اور مہمانوں کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ پرنسپل کالج اور سیمینار کے منتظمین کی جانب سے تمام مہمانوں اور ریاض تنہاؔ، جمیل نظام آبادی، مجید صاحب نیشنل بک ڈپو کو تہنیت پیش کی گئی۔ ظہرانے کے بعد ملک بھر کی مختلف جامعات سے آئے ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ نے مقالے پیش کیے۔ اہم مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر محمد عزیز سہیل، سراج انصاری، جے محمد شفیع، محمد احتشام الحسن، محمد عبدالقدوس، شیخ فہیم اللہ، گل رعنا، ڈاکٹر مسرور سلطانہ، ڈاکٹر حمیرہ، ناہیدہ بیگم آمنہ آفرین

وغیرہ شامل تھے۔

پڑھے گئے مقالوں پر اجلاس کے صدر پروفیسر خالد سعید اور ڈاکٹر فضل اللہ مکرم نے تبصرہ کیا۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کنوینر سیمینار نے تمام مہمانوں اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار کے انتظامات میں محمد عابد علی، سید حسیب الرحمٰن، محمد مبین الدین، محمد عبدالبصیر، ڈاکٹر محمد عبدالرفیق، شیخ اکبر باشاہ، غلام مصطفیٰ اور دیگر نے تعاون کیا۔

روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' حیدرآباد
26/اکتوبر 2014ء

حقوق انسانی کی پاسداری توکل پر یقین کے بغیر ناممکن

کلام انیس میں حقوق انسانی کی پاسداری پر
ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) کا توسیعی لکچر

میر انیس نے ادب کے تمام گوشوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اسی لیے ان کے مرثیوں میں بھی فطری شاعری اپنی تمام تر حسیت کے ساتھ جلوہ افروز نظر آتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ایم. ایم. تقی خان نے ادارہ شعر و حکمت اور مولانا آزاد کلب حیدرآباد کے زیراہتمام اُردو ہال حیدرآباد میں منعقدہ ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) کے توسیعی لکچر ''کلام انیس میں انسانی حقوق کی پاسداری'' کے موقع پر اپنے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ قبل ازیں ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبۂ اُردو گری راج گورنمنٹ ڈگری کالج نظام آباد کی قرأت کلام پاک اور کنوینر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، ڈپٹی ڈائریکٹر، سی پی ڈی یو ایم ٹی، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے استقبالیہ کلمات سے اس توسیعی لکچر کا آغاز ہوا۔

پروفیسر تقی خان نے کہا کہ ''انیس اور دبیر نے مرثیہ کو ایک نئی جہت اور زندگی عطا کی ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''میں ایک سائنسداں ہوں اور ڈاکٹر تقی عابدی ایک طبیب لیکن اُردو کی چاشنی اور رنگینی نے ہم دونوں کو اس زبان سے جڑنے کی راہ ہموار کی ہے۔'' انھوں نے ڈاکٹر عابدی کے توسیعی لکچر کو انتہائی مقصدی اور پرمغز قرار دیا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ ''میر انیس کے بیاسی ہزار مطبوعہ اشعار موجود ہیں جب کہ ''کلام انیس'' شاعری کے تمام اصناف پر محیط ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''میر انیس کے مرثیہ ہر سال پچیس ہزار مقامات

پر کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ پڑھے جاتے ہیں۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ''مرثیہ اُردو ادب کی پینتیس فیصد شاعری پر مشتمل ہے۔ اسی وجہ سے یہ اُردو کے ادب عالیہ میں شامل ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''حقوق انسانی کے متعلق انیسؔ کی شاعری میں کئی اشعار ملتے ہیں اور حقوق انسانی کی پاسداری اپنے مقصد پر قائم رہتے ہوئے اس کا حصول ہے۔'' ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ ''انسانی حقوق کی پاسداری توکل پر یقین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''حقوق انسانی درحقیقت انسانی اقدار سے مربوط ہے لہٰذا اسے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔'' انھوں نے کہا کہ ''تصوف ہی انسانی حقوق کی پاسداری کرتا ہے۔''

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ ''میر انیسؔ نے پند و نصائح سے گریز کرتے ہوئے راست طور پر حقوق انسانی کی پاسداری کو مختلف انداز سے موضوع بحث بنایا ہے۔'' مہمان اعزازی پروفیسر بیگ احساس نے کہا کہ ''ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحقیق خالص ہوتی ہے وہ مبالغہ آرائی سے گریز پر یقین رکھتے ہیں۔ انیسؔ و دبیر اور مرثیہ ان کا خصوصی میدان ہے۔'' پروفیسر بیگ نے کہا کہ ''ڈاکٹر عابدی نے اپنی منفرد تحقیق اور علمی صلاحیتوں کے باعث دُنیا کے مختلف ممالک میں اُردو کے ایک مستند محقق کی حیثیت سے اپنی ایک علیحدہ شناخت قائم کرلی ہے۔'' کنوینر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد کے کلمات تشکر پر لکچر کا اختتام عمل میں آیا۔ ناظم اجلاس ڈاکٹر اسلم پرویز نے پروفیسر ایم۔ایم تقی خان پروفیسر بیگ احساس اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کا تعارف پیش کیا اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس توسیعی لکچر میں محبانِ اُردو اسکالرس اساتذہ اور پرستاران انیسؔ اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کی کثیر تعداد شریک تھی۔

روز نامہ ''رہنمائے دکن''، ''صحافی دکن'' حیدر آباد

30/ اکتوبر 2014ء

فلسفۂ شہادت عبد اور معبود کے عشق حقیقی کا ترجمان

''کلامِ اقبالؔ اور فلسفۂ شہادت'' پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کا خطاب

علّامہ اقبالؔ نے اپنے فارسی اور اُردو کلام کے ذریعہ شہادت عظمیٰ کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے وہ رہتی دُنیا تک خاندان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و مرتبت کو انسانیت سے روشناس کروانے کے لیے شاید ہی اپنا ثانی پیدا کر سکے گا۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے اُردو ہال حمایت نگر حیدر آباد میں محفلِ اقبال شناسی کے زیر اہتمام منعقدہ توسیعی لکچر ''کلامِ اقبالؔ اور فلسفۂ شہادت'' سے اپنے خطاب کے دوران کیا۔

قبل ازیں ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کی تلاوت کلام پاک اور کنوینر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، ڈپٹی ڈائریکٹر، سی پی ڈی یو ایم ٹی مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے استقبالیہ کلمات سے اس مقصدی لکچر کا آغاز ہوا۔ جناب غلام یزدانی سینئر ایڈوکیٹ کنوینر محفلِ اقبالؔ شناسی و صدر انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش نے اس لکچر کی صدارت کی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کہا کہ ''اقبالؔ نے اپنے کلام کے ذریعہ شہادت عظمیٰ کا منظر نامہ اُجاگر کرتے ہوئے حق و باطل کے معرکہ میں حق کی برتری کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ساری انسانیت اس سے مستفید ہوتی رہے گی۔ ڈاکٹر عابدی نے فلسفۂ شہادت کو انسانی عظمت کی معراج سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ ''عبد اور معبود کے حقیقی عشق کو اقبالؔ نے فلسفۂ شہادت سے مربوط کرتے ہوئے انسان سازی کی اہمیت کو بھی بیان کیا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ ''بی بی مریم کی عظمت صرف

ایک رشتہ کے باعث ہے جب کہ شہزادی کونینؑ کی نسبت چار طرح سے ہے۔''

ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ'' اقبالؔ نے محورِ عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہوئے فلسفۂ عشق کو فلسفۂ شہادت سے مربوط کیا ہے۔ انھوں نے عشق حقیقی کے ذریعہ عبد و معبود کے رشتہ میں پیش آنے والی کش مکش کو بیان کرتے ہوئے نتیجہ کے طور پر شہادت عظمیٰ پر اپنی بات کو تمام کیا ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ'' اقبالؔ کو شاعری میں فلسفیانہ گفتگو پر ملکہ حاصل ہے۔ اسی لیے انھوں نے شہادت کو مقصدیت میں کامیابی قرار دیتے ہوئے مقام شبیرؑ کو حقیقت عبدی سے تعبیر کیا ہے۔'' انھوں نے کہا کہ'' یہ فلسفہ دراصل شہادت کے اسرار ہیں، اسی لیے اس فلسفہ کو منطق کے ذریعہ رد نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر اقبالؔ نے فلسفۂ شہادت کو آدمیت اور انسان سازی سے جوڑتے ہوئے شہادت عظمیٰ کو حرارت ایمانی کا نقطۂ آغاز قرار دیا۔'' انھوں نے کہا کہ'' شہادت حسینؑ کے بیان کے ذریعہ اقبالؔ نے نفس کی پاکیزگی اور آزادیٔ حریت کے مظاہر کو پیش کیا ہے۔ اسی لیے فلسفۂ شہادت منزلت شہید اور عبد و عبدہ پر محیط ہے۔ مہمان اعزازی پروفیسر فاطمہ بیگم پروین، سابق وائس پرنسپل وصدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کے لکچر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ'' ڈاکٹر عابدی جسم کے ساتھ روح کی بھی آبیاری کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ اسی لیے وہ اپنے فکر انگیز خیالات کے ذریعہ پاکیزگی جسم و روح کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے نام کی مناسبت سے محفل کو ایک گھنٹے تک عبادت میں مصروف رکھا اور اسلام کا پہلا رکن بھی عبادت ہے۔ لہٰذا نواسۂ رسول نے سجدے میں سر کٹاتے ہوئے رہتی دُنیا تک کے لیے نماز کی حقیقت کا نقش مرتسم کیا ہے۔''

صدر اجلاس جناب غلام یزدانی ایڈوکیٹ نے اپنے صدارتی خطاب میں محافل اقبال شناسی کی روز افزوں بڑھتی ہوئی مقبولیت پر روشنی ڈالی اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کے توسیعی لکچر کو انتہائی مقصدی اور علمیت سے پُر قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ'' محفلِ اقبالؔ شناسی گزشتہ تقریباً اٹھارہ برس سے مختلف موضوعات پر خصوصی لکچرس کا اہتمام کرتی آرہی ہے۔ لیکن اقبالؔ کے فلسفۂ شہادت پر پہلی مرتبہ ایک انتہائی پُر مغز لکچر کے ذریعہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے حاضرین کو اس بابت غور و خوص کی نئی راہوں سے روشناس کروایا ہے۔ انھوں

نے کہا کہ ”محفلِ اقبال شناسی کی خصوصی نشستوں کی شہرت ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے بعد اب ویب سائٹ کی بدولت دُنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر رہی ہیں۔“

اس موقع پر ڈاکٹر یوسف اعظمی، ڈاکٹر رؤف خیر اور دیگر شرکاء نے ڈاکٹر سید تقی عابدی سے استفسارات بھی کیے۔ کنوینر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، ڈپٹی ڈائریکٹر، سی پی ڈی یو ایم ٹی، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے کلمات تشکر پر اس مقصدی لکچر کا اختتام عمل میں آیا جس میں ممتاز ادباء، شعراء، طلبا اور اسکالرس کے علاوہ خواتین و حضرات کی کثیر تعداد شریک تھی۔

J. S. Ifthekhar
Telangana Today
January 05, 2020

A doctor with incurable passion

Dr Taqi Abedi's love for Urdu literature knows no bounds and can be seen in the 62 books he has written so far

He is a doctor alright but in him dwells a writer. After a busy day in the hospital, he retires into his study during night and loses all track of time. A kind of unwinding for him. That's Dr Taqi Hassan Abedi for you. A physician whose true calling is writing. With him medicine and literature seem to share a kind of synergy. There is no conflict of interest between his profession and passion. In fact, being a writer has helped Dr Abedi in his work as a physician.

What does it mean to be a doctor and a writer at the same time? "Reading and writing have broadened my perspective of life," says the Hyderabad-born Canadian physician. Love for literature made him more empathic and caring towards his patients. The most surprising thing is that this doctor-writer has done more for the promotion and propagation of Urdu than any university professor. The sheer number of books written by him – 62 till date – is a pointer to his infatuation with Urdu literature.

Diagnosing ailments of others comes easy to him but his own malady eludes a remedy. He is a doctor with an incurable passion for Urdu. No, it's not a case of physician heal thyself. He is smitten with the love of Urdu poetry. And his obsession grows by the day. Dr Abedi loves to introduce himself as 'Peshe se tabeeb, Urdu ka vakeel and adab ka mareez'. The last two attributes stand out like the

porcupine's quills. He never tires of championing the cause of Urdu nor hides his maddening love with literature. While living in dayaar-e-gair (outside the sub-continent), he has done yeomen service to Urdu by introducing its well known as also little known writers to the world. His scholarly works on Mirza Ghalib, Allama Iqbal, Mir Anees, Faiz Ahmed Faiz, Altaf Hussain Hali, Amjad, Sayeed Shahidi are matchless. Besides adding a critical body of work to Urdu literature, they offer new vistas of understanding about these poets.

A man of many parts – doctor, poet, critic, author – all rolled into one, Dr Abedi has bagged several awards, including the 'Life Time Achievement award' from the Doha-based Urdu language literary organisation, Majlis-e-Frogh-e-Urdu Adab. He has also secured the Fakhre-e-Urdu International award, Urdu Markaz International, Los Angles, Writer of the year award, Eastern News Canada, Award for Distinguished services and contribution to Urdu literature, Aligarh University Alumni, New York, Allama Iqbal Award of Excellence, Canada, besides awards from Sahitiya Academy, UP (Sahitya Akademi???).

Having obtained his Bachelor's Degree in medicine from Osmania University, Dr Abedi served in Iran, England, US and is presently working in a hospital at Ontario, Canada. His dalliance with Urdu poetry began right from his student days and it has taken him to different parts of the world where he delivers talks to packed audience. Early in life he was seduced by books and his fascination continues. His library has a staggering 14,000 books, a good number in English and Persian.

Dr Abedi has a great affinity towards Ghalib and Iqbal and is inspired by the latter's philosophy of action, courage and self-reliance. He says:

Khud roshni phailegee muhabbat ki zameen par
Iqbal aur Rumi ke kutch ashaar suna do

He is known more as an expert in Iqbaliat and Ghalibiat besides being an authority on Anees, Dabeer and Faiz. While his major work comprises critical analysis of these poets, he has also written two books of poetry – Gulshan-e-Roya and Josh-e-Mawadat. Sample some of his verses:

Sahil pe khade ho ke tamasha nahin karte
Hum doobti kashti ka nazara nahin karte
Toofan se lada dete hain jo apna safeena
Sahil ko kabhi apna kinara nahin karte

Sublimity of thought is central to his poetry. He expresses his ideas in the poignant ways of Anees and sometimes adopts the philosophical tone of Iqbal. The following verses mirror the realities of the present times where marauders masquerade as honourable men.

Aaj haivan-sifat pahne hain insani naqab
Aaj har haath main rehti hai tamaddun ki kitab
Bhatke huye manzil pe pahunch jayenge khud hi
Raston se agar rahnumaon ko hata do
Logon main fakhat ayeb nazar aate hain jisko
Iss ko bhi kabhi aiyna khane main bitha do

Dr Abedi's nazm Husn-e-Mutlaq is one of his most acclaimed poems. Characterised by sensual imagery, it paints a vivid portrait of beauty in all its dimensions. Here, the poet tries to see beauty in everything and from different angles. A mesmerising spell takes hold as one reads this poem.

Husn se dekho to har cheez haseen hoti hai
Husn se hat kar har ek cheez asar khoti hai
Husn ahsas main rehta hai jawani main nahin
Nasha hai khoon main angoor ke pani main nahin
Husn jab jheel main palta hai kanwal banta hai
Husn jab sher main dhalta hai ghazal banta hai

Dr Abedi has penned many naaths in praise of the Prophet of Islam. A popular naath which can be heard at religious gatherings is:

Woh jis ke liye mehfil-e-konain sajee hai

Firdaus-e-bareen jis ke waseelay se banee hai
Woh Hashmee Makkee Madanee ul Arabee hai
Woh mera Nabi mera Nabi mera Nabi hai
Woh mera Nabi hai

Dr Abedi has done encyclopaedic work on Mir Anees, Mirza Dabeer, Mirza Ghalib, Altaf Hussain Hali, Allama Iqbal and Faiz Ahmed Faiz. He has thrown light on many undisclosed aspects of these master bards. His books – Tajzia-e-Yadgar Anees, Rubayat-e-Dabeer, Kulliyat-e-Ghalib, Inshaallha Khan Insha, Faiz Fahmi, Faiz Shinasi, Iqbal Kay Irfani Zaweye and Choon Marg Ayed – are a must-read for research scholars.

In the last mentioned book, Dr Abedi makes a mention of various ailments that afflicted Allama Iqbal and impacted his life. These details he has extracted from the letters written by the 'Poet of East' himself. The doctor in him comes to the aid of Dr Abedi in explaining the diseases.

A strong votary of Urdu, Dr Abedi feels it is the best remedy to unite hearts in the present troubled times. No other Indian language has the capacity to integrate people like Urdu since it is an embodiment of composite cultures. "Urdu is one of the several languages of Muslims but the language itself is not Muslim," he says.

Urdu is definitely spoken by Muslims but it is more Hindustani in nature, embracing diverse traditions. Therefore, its preservation and propagation is the responsibility of everyone and not just Muslims alone. Quoting TS Eliot, he says any language which has rich classical literature wouldn't perish. If Urdu dies, it would be an irreparable loss for the country as a whole.

Dr Abedi refers to the beautiful way Bihari Lal Mushtaq, a student of Mirza Ghalib, captured the syncretic culture in this couplet. What is unique about this little known verse is that the numerical value (Abjad notations) of both Jamuna and Zam-Zam are the same – 94.

Hum hain Hindu, tum Musalman donon baham ek hain
Jis tarha aadad Jamuna wo Zam-Zam ek hain

(I'm a Hindu, you a Muslim, together we are one
Like the numerical of Jamuna and Zam Zam are one)

For Dr Abedi, Urdu is not just a lingua franca but a beautiful flower vase representing different faiths. It has the mohabbat (love) of Hyderabad in it, nazakat (elegance) of Lucknow, saqafat (culture) of Delhi, sajawat (embellishment) of Agra, saadat (fortune) of Sindh, zakawat (knowledge) of Bengal and latafat (tenderness) of Kashmir.

Zafar Hyderi
Sri Nagar
"New Hope" V.:3, No.:6
Nov-Dec-2002

Tajzia Yadgar-e-Anis

'Authors', remarked Schopenhauer, 'may be divided into falling stars, planets and fixed stars: the first have a momentary effect: the second a much longer duration; and the third are unchangeable possess their own light, and shine for all time'. In my individual opinion, Dr. Syed Taqi Abedi, by virtue of his work. deserves to be placed in the third category of authors as defined by Schopenhauer.

Dr. Abedi, the learned author of the book "Tajzia Yadgar-e-Anis" deserves genuine applause on this latest venture of his. Judging by the subject mater and the range it covers, this book ought to have taken a decade or so in its preparation and arrangement of the material. But it was for the tremendous labour of the author that, within a couple of years, it is shaped out in the form of a book.

The fact is that in the past too, attempts were made to present the works of Mir Anis in the sub-continent. Allama Shibli Nomani's venture "Muazana Anis-o-Dabeer", can be broached as the best example in this direction, which appeared some 100 years ago. In contrast to Shibli's book, which dealt with numerous "Marsias" of Mir Anis, Dr. Abedi's entire book is based on only one 'Marsia' of Mir Anis,

Jab Qata Ki Masafat-e-Shab Aftab Ne

(The sun had run his journey o'er the night),

In which the author has analysed and discussed about one hundred qualities and beauties of this 'Marsia'. Dr. Abedi, indeed, is the first person who has analysed one single "Marsia" of Mir Anis with such creativity. It is, beyond doubt, a great achievement which is unmatched and unrivalled. Unique as this book is, it is supplemented by another work of paramount importance, the translation of the 'Marsia' in English by David Mathews, and in Arabic by Maulana Syed Ali Naqvi.

The book is based on 14 chapters. Three chapters (i.e., 11th, 12th and 13th) are of extra ordinary importance. In these chapters, the author has thoroughly analysed the fore mentioned "Marsia" from the book "Shahkar-e-Anis", by Prof. Masood Hasan Razvi Adeeb. Prof. Rizvi's book has 197 sixtains and all the sixtains have been beautifully and creatively analysed and incorporated in the book. Moreover, Dr. Abedi has arrived at his own coinages. But his most remark able contribution is the ingenuity of form, because no form as such was known to exist before.

It will not be out of place to mention here that in addition to the analysis of 197 sixtains of the "Marsia", the book provides a detailed study of the life of Mir Anis in chapter one. According to the author, the title "Khuda-e-Sukhan" has been used for two great poets - Mir Taqi Mir and Mir Anis. The former used "Ghazal" as a medium of expression, whereas the latter selected 'Marsia and made martyrdom of Imam Hussain (AS) his subject. It was from his ancestors that Mir Anis has inherited the legacy of poetics and, therefore, he was justified in making a well-founded claim:

Panchvein Pusht a Shabbir Ki Maddhai Mein

(In Shabbir's adoration, mine is the fifth generation)

The real greatness of the poetry of Mir Anis lies in his mastery of language. He enjoyed such a perfect command over the language that he very easily couched into words not only the profoundest thoughts but even the sublimest of feelings. The depth of his thought, coupled with his limitless capacity to evoke feelings, indeed lent such a dignity to his poetry which no other Urdu poet has so far been able to create.

Mir Anis has the power of expressing one and the same thing in manifold ways. He was wellversed in the art of expanding and compressing a passage. He had such a rich and inexhaustible stock of words which no other poet of Urdu, nor probably any poet in any other language, appears to have possessed. The poetry of Anis is conspicuously marked by the characteristics of simplicity, elegance and eloquence. These qualities are not only abundantly clear in his work but are the very essence of his poetry. So glaring are these characteristics that they do not escape the attention of a reader, provided he or she has a taste for culture.

Besides, the poetry of Mir Anis, Dr. Abedi has also tried to trace the minute details of the life of Anis like his appearance, costume, punctuality, sensitivity, behaviour and habits, first and last "Majlis" (sermons), prayers, illness and death. The last few years of Anis' life were disturbed by the turbulent political events. During his visit to Azimabad, he fell ill. When illness took a serious turn, he rushed back to Lucknow. He was ill for about a month and, at the age of 73, he breathed his last in 1874 A. D. The following couplet of Mirza Dabeer reveals not only the

exact year of his death, but it is also the best tribute to the person who had been his life-long rival:

"Aasman Bay Mah-e-Kamil
Sidrah Bay Rooh-ul-Ameen
Toor-e-Seena Bay Kaleem-ul-lah
Mimber Bay Anis"

(Poor is the sky without the full moon,
And empyrean without Gabriel, is meaningless,
Nothing is the Mount Toor, without Moses,
And pulpit without Anis, is worthless).

Further, there is a chapter (2), which deals with some of the eminent personalities having had a direct or indirect relationship with 'Marsia' and Mir Anis. They include Ghalib, Nasik, Dabeer, Azad, Hali, Shibli, Chakbast, Jost etc. and contemporary figures like Prof. Akbar Hyderi, Prof. Gopi Chand Narang. Dr. Nayyer Masood, Dr. Hilal Naqvi and many more. Dr. Taqi Abedi has discussed and presented everything in the most objective way.

Prof. Akbar Hyderi, has written the foreword of the book. According to him, Dr. Abedi has done utmost justice to the meaning of the words, expressions phrases, metaphors and similes of the 'Marsia' - an art of creativity, which is beyond the reach of others. In this connection he says:

Jauhari Bhi is Tarha Mooti Piro Sakta Nahin

"Tajzia Yadgar-e-Anis" is a scholarly work in which the analysis is the "Marsia" of Mir Anis is nothing short of a miracle. Dr. Abedi has accomplished this task most successfully and has endeavored to introduce the poet in the most befitting manner. The formidable, challenging and learned author of the book has left no stone unturned to

make it lucid, analytic and upto date. According to the author, it is unfortunate that when the world is going to celebrate the 200th birth anniversary of Mir Anis, much work has not been done on the art of Mir Anis. There are certain areas of the poetry of Anis, which are still to be unearthed.

But, Dr. Abedi's venture is doubtlessly a research work of high quality. It is indeed a work of exceptional merit. It is not only a valuable contribution to Urdu literature but an innovation, a model. Dr. Abedi has authored many books, which include 'Shaheed' (1982), 'Josh-e-Muwaddat' (1999), 'Ramooz-e-Shairi' (2000), 'Iqbal Ke Irfani Zavai'(2001) and many more. Presently he is working on yet another project on Mir Anis.

Born on March 1, 1952 at Delhi, he did his MBBS from Hyderabad and later MS from Britain. Dr. Abedi is a widely travelled person. He has visited many American and European countries. Presently, he is residing at Toronto (Canada). As already mentioned by profession he is a doctor, with an excellent taste for Urdu literature. He is also gifted with the talent of composing poetry.

As far as the publication of the book is concerned, it is in itself a unique publication. It has 816 multi-coloured pages printed on imported art paper. The size of the book is 29 x 23 Cms, weighting about 3 Kgs. The matter of each page of the book is enclosed in a multi-coloured border resembling Iranian Paper Machie. The price of the book is Rs. 750/-, which is quite reasonable considering the quality of its printing. In other words the book has made Dr. Taqi Abedi immortal.

Intizar Hussain
Daily Dawn (Karachi)
February 29, 2004

Three research books on Dabir

In my previous column, I had complained that since long Mirza Dabir's marsiya were not available to the readers and that one had to be a researcher to have access to them. Just after that I received three volumes consisting of a variety from Dabir's writing- "Mujtahid-i-nazim Mirza Dabir", "Silk-i-salam-i-abedi" and "Tala-i-mehr".

These Volumes, which have been published by Izhar sons, Urdu Bazar, Lahore have been compiled after much research by Dr. Syed Taqi Abedi. The Inaugural ceremony, where these volumes were presented, was held last week in a befitting manner A number of Scholars and critics paid homage to the great marsiya writer More interesting was the paper read by Aqil Rubi, who had tried to judge Anis and Dabir's Marsiya in the Background of the epics by Homer and Virgil. He picked up similar situations. From Anis and Dabir on the one hand, and from Homer's iliad on the other, and showed how Similar was their depiction of various situations.

The chief guest was Syed Taqi Abedi, who had reached here with his research work on Dabir and was on his way to Delhi, where the Sahitya Academy, has chalked out an ambitious Programme to celebrate a combined 200th birth anniversary of Anis and Dabir.

Dr. Taqi Abedi is already known to us as a research Scholar, more particularly with reference to his researching

study of one selected marsiya of Anis presented in a Well-decorated volume. But, perhaps, he is more devoted to Dabir. He seems bent upon digging out all that Dabir has written in verse as well as prose. He intends to present them in a Series of 22 volumes. The above-mentioned three volumes may be seen as part of that series.

"Mujtahid-i-Nazm Mirza Dabir" is the introductory volume where we find the outcome of Taqi abedi's research on the life and personality of the poet this biographical account carries with it a selection from Dabir's writing The other volume "Silk-i-salam-i-Dabir" is a collection of his salams. The third, "Tala-i-mehr" introduces us to Dabir's experimentations. It is a collection of marsiyay and salams in which he has experimented with what is called "Ghair Manqoot".

But I wonder why the esteemed scholar has chosen to start this series with volumes containing Dabir Salams and experimental verse. These volumes deserved to be published in the concluding volumes. What we want in the first instance are the marsiyay, which is Dabir's main work. This may not be taken as an attempt to minimize the importance and worth of Dabir's salams and experimental verse. It is just to show that our priorities should be correct.

On the basis of his research, Dr. Abedi has made some astounding assertions in favour of Dabir. His first assertions is that Dabir is the most prolific Urdu poet with 120,000 couplets to his credit. No other poet in Urdu has been able to do so. In the field of marsiya, too, he is most prolific with 675 pieces to his credit. It is a record, leaving all other marsiya writers far behind.

Dr. Abedi has also claimed that Dabir has to his 1334 rubaiyat, a number unsurpassed by any other poet.

Speaking in this vein, he has used a number of superlatives for Dabir. But the most astounding one is in respect of the number of words used by him. Dr. Abedi has asserted that of all the Urdu poets, Dabir has used the largest number of words in his marsiyay. Our research scholars had given this credit to Nazir Akbarabadi, Dr. Abedi has refuted this claim.

The same kind of claim he has made in respect of "Ghair Manqoot'' or undotted verse. Insha Allah Khan is supposed to be the most prolific in this kind of experimentation. In prose, too, he made this experimentation. His long Short story, "Silk-i-Gauhar", has been written in undotted prose. But Dr. Abedi Claims that Dabir has surpassed Insha in this field.

Dr. Abedi has also talked about his prose writings. Which are all in Persian. He has in particular referred to "Risala-i-Dabir''. It is a sort of critical writing. Here, he is seen discussing critically the genre of the marsiya, keeping in view its form as well as its subject matter.

The release of three volumes on Dabir on the occasion of his 200th birth anniversary is a good start. Let us hope that the volumes containing his marsiyay will soon follow.

Intizar Husain
Daily Dawn (Karachi)
April 17, 2005

A Tribute to Dabir

A Research scholar with three newly compiled volumes of Mirza Dabir arrived last week in Lahore. He was warmly welcomed and was much lauded for this valuable work in the inaugural function of these volumes. The next day he proceeded to Lucknow via Delhi for the purposes of the research in hand.

This was his second visit after a lapse of about one year. The three volumes he had brought with him in the last visit was the first instalment of the long series of Dabir's volumes he has planned to bring out The scholar is Syed Taqi Abedi, who professionally is a medical practitioner, living in Canada and is busy in his research work on Dabir. His deep involvement in this work of research may well be read as a sign of hope for Dabir, who since long was consigned to oblivion. To be more explicit, should we now expect a revival of Dabir? Perhaps yes. Perhaps the process has begun.

This history of literature offers instances of poets, who after remaining for long in oblivion tooth and nail for the clamed attracted attention of some scholar possessed with a searching eye. He retrieved all the verses lost to us and re-interpreted them in accordance with the sensibility of his times. And lo, the poet stands revived. Perhaps Dabir in his recession to oblivion was waiting for some such scholar. He has at last found one such soul.

But how did Dabir recede into oblivion? He at one time dominated the scene of marsiya and was held in high esteem as a great master in the field of marsiya writing. He was at his peak, as a marsiya writer when Mir Anis made his appearance. His meteoric rise in the field soon seemed posing a challenge to Dabir's authority in marsiya writing.

The two poets were polite enough to restrain themselves from challenging each other openly. But their disciples and devotees lacked that kind of restraint. They soon were divided into two camps better, known as 'Dabiriyai' and 'Anisiyai', each ready to fight with tooth and nail for the claimed superior position of his master

At a later stage, Maulana Shibli's book Mawazna-i-Anis-o-Dabir imparted a literary dimension to this fight. Maulana though not a Lucknavi, behaved on this occasion typically like Lucknovis, who had been very fond of cock fighting. His comparative study of the two poets gives the impression of being a cock-fight.

But we should not be oblivious to the positive contribution made by Shibli's Mawazna. It imparted a literary respectability to marsiyas, which hitherto was treated as the kind of verse meant to serve solely the purposes of Majlis-i-Aza. By discussing it according to the laws laid down for judging poetry, Shibli got it released from the confines of Imambara and elevated it to the level where it is reckoned among accepted forms of poetry. But unfortunately he did it at the cost of Dabir. Indeed Muwazna did not go unchallenged.

Dabir did have his defenders. But they were hardly a match to Maulana Shibli who was an acknowledged scholar and a literary authority. Hardly any of the defenders

had the ability to make a critical study of Dabir's marsiyas and determine their literary worth. In the absence of such a study, Shibli's judgments on Dabir were readily accepted in the literary circles. What added to this situation was the non-availability of Dabir's works. Syed Taqi Abedi holds his relatives and disciples responsible for this as none of them cared for the publication of his works. Consequently, Dabir gradually receded into oblivion.

It is only in recent years that some scholars interested in marsiya have paid attention do Dabir. Foremost among them is Syed Taqi Abedi, who is engaged more seriously in his research on Dabir. He in fact had started with his research on Mir Anis. He concentrated his research on one of his marsiyas and presented it along with his research in a deluxe volume. But after that he solely devoted himself to the research on Dabir. As stated above, the three volumes published last year were the first instalment of the proposed long series consisting of Dabir's writings. The three volumes brought out now are the second instalment. These three volumes are:

"Masnaviat-i-Dabir"

"Abwabul Masaib"

"Mushaf-i-Farsi"

All these three volumes, like the previous ones, consist of Dabir's miscellaneous writing other than marsiyas, which have been dug out after much research. The first is a collection of his newly discovered masnavis written on different religious themes. On the basis of these masnavis Dabir, claims Abedi, deserves to be counted among distinguished masnavi writers of Urdu.

The next volume "Abwabul Masaib" is prose writing of Dabir, which has been unearthed after much research. Here, is a narration of the tragic events of Karbala under the title quoted above.

The third is a collection of his verses in Persian.

These volumes will be followed by a series of volumes consisting of marsiyas, which, according to the research of Taqi Abedi, are 675 in number. This number also includes his unpublished marsiyas.

Khalid Hasan
Daily "Times" US Based
March 04, 2007

Remembering Iqbal in Washington

Iqbal will have been dead exactly 70 Years this year, but one tends to think of him in terms of the immediate rather than the distant. And he continues to be remembered with affection. But affection tinged with a sense of awe because of the tremendous power and sweep of his genius.

Faiz called him the "sweet-voiced wanderer who transformed wildernesses into living cities and abandoned taverns into halls of good cheer". Whos "song lives. Like a lamp that the blowing wind cannot put out, like a candle that lives on beyond the morning.

It was here in Washington the other day that Iqbal's memory was invoked at a small gathering. Courtesy Abul Hasan Naghmi. Radio Pakistan Lahore's once famous Bhai Jan. He had taken advantage of the presence in town of Syed Taqi Abedi, an Indian-Canadian physician, who has written a book on Iqbal's ailments based on his research, the poet's letters being the primary source.

Iqbal was not a well man. Especially in his last years. Over the course of his life he suffered from one thing or another. Ironically, his genes were good though because there was longevity in his family. According to Dr. Abedi, Iqbal should havé lived at least for another 20 years. And had Iqbal been born in the latter part of the last century than in the latter part of the one before, modern medicine would

not have let him die seven months short of his 61st birthday.

One thing is clear. Iqbal did not like doctors and, as he writes in one of his letters, he is like a child who hates to drink the bitter medicines that are given to him. He had little faith in allopathic medicine and much preferred the herbal and traditional kind. He was a great believer in the efficacy of what the famous Hakim Nabeena of Delhi, under whose treatment he remained for many years, prescribed he also had himself seen by the celebrated Hakim Ajmal Khan.

But Iqbal's various ailments were beyond the ken of traditional healers and, as Dr. Abedi shows, for over 30 years those who attended on him included Dr. Mathura Das of Lahore, Dr. Abdul basit of Bhopal, Dr. Muhammad Yusuf, Dr. Abdul Qayyum, Dr. Jamiat Singh and Lahore's famous German Physician Dr. Seltzer.

Dr. Abedi has gone through, 1,450 of Iqbal's letters and found 251 of them descriptive of the various diseases and ailments that assailed him for a good part of his life. Especially, the final pain-filled years Iqbal was a great believer in the development of traditional Islamic medicine and hoped that it would undergo some revolutionary change.

Dr. Abedi, who has practiced medicine for 30 years, is wonderstruck at the calm and confident way in which Iqbal received news of the presence of a tumour in his chest after an X-ray examination performed by on Dr. Dick, a Lahore radiologist. A few hours after Niazi asking him to have a word with Hakim Nabeena. Two hours before his death, he refused to take an opium-based painkiller saying

he did not wish to die in a half-conscious or unconscious state. Only a few hours before the end, Iqbal spent time discussing with the woman principal of an Islamic school in Lahore the best way to bring the message of the Quran to her students.

A list of Iqbal's ailments worked out by Dr. Abedi makes chilling reading. A lesser man would have given up and succumbed to them much earlier. He had heart and renal disease, gout, immature cataract, liver congestion, bronchial asthma, shortness of breath, laryngitis and oral problems that dogged him all his life. In the last two years, his voice kept getting progressively hoarse. And yet this titan packed more into his 60 years than it would take others centuries to even comprehend, much less express in undying verse and prose.

Dr. Abedi is indeed a remarkable man. Married to an Iranian, who does not speak a word of Urdu, as don't their children, he converses with them in Farsi, while he writes his books of which there are many, in Urdu. Before Dr. Abedi spoke about Iqbal, the host Naghmi recalled that 35 years ago when he came to Washington, there weren`t many in this town who were interested in Urdu. But an entire generation of Pakistanis had grown up here since. Which was divided into two groups. One understood a bit of Urdu, while the other could speak Urdu but was unable to read it. They wrote Urdu in Roman letters.

If the practice grew, as it is likely to, we would like Turkey where thousands of books written in the Arabic script lie in libraries with no readers. To that can add that some of the more with-it of our Pakistan youth not only cannot read Urdu but are quite prove it. I cannot help

quoting Faiz, who once said that you do not know your own language. You will remain ignorant of other languages too.

Dr. Abedi said Urdu is becoming an "aural Language" whereas it should be a language of the eyes. There are 600 million people in the world who understand Urdu but the Urdu script is slowly dying. India, for instance, I can narrate from my own experience that in the entire city of Lucknow, I could find only one sign in Urdu-and that too was a crumbling one which said that the place where it hung use to be the site of the famous Maktaba Nawal Kishore. I looked for a bookshop that would sell Urdu books but all I found was a small place with a couple of hundred used books that were coming apart.

Dr. Abedi, to whom I return described himself "a physician by profession and a patient of the Urdu language by choice". He said on no other poet has more books been written than on Iqbal. He listed the number at 4,500, compared with Ghalib (1,600) Mir (350) and Anis (225). He also said that the largest number of commentaries on the Quran were to be found in Urdu.

Dr. Abedi said Iqbal smoked a huqqa for years at least and in Europe he must have smoking cigarettes. He wasn't much for exercise and preferred to recline on a bed to read and converse. He was simple in his eating habits and would talk whatever was brought to him. Once, the story goes, someone said to him, "Dr.Sahib, whenever I've had the pleasure of breaking bread with you, it is always cauliflower and meat. That must be your favourite dish." Not really, "Iqbal replied, "but that is all Al-Bux knows how to cook." What a man!

Intizar Hussain
Daily Dawn (Karachi)
February 15, 2006

In search of Roop Kunwar Kumari

I have before me a collection of Munqabats and marsiyas composed by Roop Kunvar Kumari. It may be seen as a new kind of Bhakti poetry where two religious sensibilities appear mixing in each other the way sugar dissolves in the milk.

But who was Roop Kunvar Kumari. Did she really exist or is she just a figment of popular imagination nurtured by the Indo-Muslim culture.

This devotional poetry came as a pleasant surprise for Muharram mourners, who were all praise for Roop Kumari. The circles of marsiya writers felt intrigued wondering who this Hindu lady is. So many among them just refused to believe that there was ever such a soul. Late Nasim Amrohvi was foremost in expressing his disbelief in this respect. When his attention was drawn to a marsiya believed to have been written by her, he promptly replied that Roop Kumari is an imaginary being while the marsiya referred to has in fact been written by her so-called ustad Fazal Rasool.

But the researchers in the field of marsiya were not going to be misled by such verdicts based more on whims than on any convincing proof. They remained seriously engaged in their research, determined to solve the mystery of this controversial figure. Their researches bore fruit as they succeeded, through a gradual process, in finding

proofs of the actual existence of such a Hindu female marsiya writer.

And now Dr Syed Taqi Hassan Abedi has come out with the fruitful results of his own research. He tells us about the hand written manuscripts of Roop Kumari's marsiyas and Munqabats and allied papers which he has dug out from his own store of books and manuscripts. He talks of a manuscript containing Roop Kumari's five marsiyas along with a few salams, qitats, and mukhammas, most of whom, say about 60 per cent, written in her own hand-writing. And he adds that a few of these writings bear the evidence of correction made by Fazal Rasool. In addition these researched papers include a number of letters written by Fazal Rasool. On the basis of these newly dug out manuscripts, Dr Taqi has brought out a collection of Roop Kumari's devotional verse. Along with her marsiyas and munqabats, we find here a brief biographical account of her, a survey of her works, and a discussion with reference to the writings of scholars in this respect.

Dr Taqi has expressed his unhappiness at the attitude of those marsiya writers and scholars who helped in creating an atmosphere of doubt about the physical existence of Roop Kumari. He, in particular, has condemned the attitude of late Nasim Amrohvi, who, according to him, passed his verdict without caring to make some enquiry before giving air to his disbelief.

If Roop Kumari provoked a sense of curiosity and suspicion in the circle of marsiya writers and scholars, it was perhaps for the reason that she was perhaps the first Hindu female attempting to write marsiya and expressing her ardent devotion to Hazrat Ali and Imam Husain,

otherwise we have in Urdu a long tradition of marsiyas written by Hindu poets. We can also trace this trend in Punjabi, which provides one such example in the form of a bara-masa written with reference to Karbala by Milkhi Ram.

Kalidas Gupta Raza, who himself made some attempts in the form of marsiya, had tried to compile an account of Hindu marsiya writers. I have before me Dr Zamir Akhtar's "Nawadirat-i-marsiya Nigari" where he talks of a fine marsiya, Dayari-i-Sham Main Jab Qaidiyon Kauu Sham Hui written by Raja Chandu Lal Shadan. Mirza Jafar Husain in his book Qadeem Lucknow ki Akhri Bahar tells us about two Hindu taziadars Munshi Sarjoo Prashad Nigam and Ramji Mal, who had themselves composed marsiyas to be recited on the occasion of their tazia procession.

But Roop Kumari appears standing distinguished from all these Hindu marsiya writers. And it is not simply because of her being a female, which provoked a curiosity mixed with a sense of attraction about her. It is rather the peculiarity of her devotion to the personalities of Hazrat Ali and Imam Husain and its expression in an individualities way, which imparts to her marsiyas a flavour very different from the one we find in Muslim poets' marsiyas and in her co-religionists' marsiyas. This peculiarity may be defined in terms of her Bhakti sensibility, which she has inherited from her own religious tradition.

Hindu writers in general when writing marsiya try to identify themselves completely with that mode of devotional feeling and its allied expression which is associated with marsiya and which bears the stamp of Arab

Iranian Islamic culture with a mix of Indian sensibility, Roop Kumari is seen disowning her Hindu beliefs which a Hindu marsiya writer will not like to do. But, at the same time, she stubbornly sticks to what she has received and absorbed on a cultural level from her Hindu tradition. So she sees no harm in expressing her devotion to Imams in terms borrowed from her Hindu background. Rather she relishes in calling Hazrat Ali a riṣhi, or a devote or simply maharaj and saying Najaf Hamaray Liyai Harduar-au-Kashi Hai.

So we see in her marsiyas an intermixture of two cultural idioms pointing out to an intermixture of two cultural sensibilities.

Dr. Qaisar Abbas
University of North Texas,
U.S.

"Faiz Fehmi" Documenting The Legacy of Faiz and his work

Title: Faiz Fehmi, Tehqiq o Tanqeed
Editor: Dr. Syed Taqi Abedi
Year of Publication: 2011
Pages: 1,403
Publisher: Multimedia Affairs, Lahore

Recently I had a chance to meet the last survivor of the famous Rawalpindi Conspiracy Case Zafarullah Poshni in Dallas who was also incarcerated with Faiz Ahmed Faiz. Recollecting the memories of the days he spent with Faiz in confinement, he told me that while most of the inmates showed their psychological rage and stress at times, Faiz was always respectable to others and never lost his temper. The only time Faiz looked miserable, he said "silently smoking cigarette, walking back and forth" when he was creating poetry.

Zafarullah Poshni was part of this extraordinary group of individuals who always cared for the miseries of common folks and struggled peacefully for their rights. Dr. Syed Taqi Abedi has documented history and life of this legendary poet of the 20th century in his new book "Faiz Fehmi."

In launching the book in Canada recently, Dr. Gopi Chand Narang rightfully declared the book as Magnum-Opus. Published by Multi Media Affairs in Lahore, the

book is an astonishing anthology of articles, research papers, interviews, personal accounts of his friends and family members, photographs and illustrations on the life and work of Faiz. A voluminous work of over 1400 pages with color printing and the fine paper quality adorned with a leather cover, the book surpasses all other publications on Faiz in its quality, content and finesse.

Although some of the articles are reproduction of published materials, most are new, based on contemporary topics. In fact, the editor claims in the preface "This document has been published to meet the demands of the 21st century so we can view his life and work from every possible perspective. We know that so much has been written on the poet and his life but we are also aware that there is a lot to write on the lament of his verse and the narrative of his prose." It is in this context that the book attempts to fill this huge gap.

The editor also tried to keep up with the quality saying "We have consciously avoided "cut-and-paste" articles using published materials without citations as we did not want to demean these writers."

The anthology includes articles of stalwarts of Urdu literature from across the world. The list includes Gopi Chand Narang, Syed Ahtesham Hussain, Kaleemuddin Ahmed, Mirza Khalil Baig, Safder Meer, Sharib Ridolvi, Shamsurrehman Farooqi, Al-e Ahmed Saroor, Shanul Haq Haqqi, Ahmed Nadim Qasmi, Syed Sajjad Zaheer, Ziaul Hasan, Zafar Iqbal, Abul Lais Siddiqi, Wazir Agha, Mohammad Ali Siddiqi, Jamil Jalibi, Qamar Rais, Mujtaba Hussain, Sahar Ansari, Karrar Hussain, Intizar Hussain, Sufi Ghulam Mustafa Tabbasssum, Mlik Raam, Ali Abbas

Hussaini, Indar Kumar Gajral, Kirishn Chandr, Fariqh Bukhari, Syed Sibte Hasan, Iftikhar Arif, Ali Sardar Jafri, Qudratullah Shahab, Knahiya Laal Kapur, Mirza Zafarul Hasan, I.A. Rehman, Noon Meem Rashid, Hilal Naqvi, Sadiq Naqvi, Khwaja Ahmed Abbas, Mushtaq Ahmed Yousfi, Abullah Malik, Fateh Mohammad Malik and lot more.

Articles of several English and Russian writers such as George Fisher, Alexander Surikov, Lyudmala Vasilyeva and world leaders like Yasser Arafat embellish the book. A unique section includes personal accounts of family members of Faiz include articles of his wife Alice Faiz, two daughters, Saleema Hashmi and Muneeza Hashmi, and his son in-law Shoab Hashmi.

The book also includes five articles by Faiz himself on a variety of topics such as the progressive literary ideology, Josh as a revolutionary poet, films and culture, Beirut under the Israeli attack and his speech at the Lenin Peace Award ceremony.

Of the 162 articles on the poet, about one third (42) are written by the editor himself, Dr. Taqi Abedi. Contentwise, the book has about 30 articles on the poet's life, interviews and personal accounts of his friends while 132 articles on critical reviews of his poetry and work.

Zafarullah Poshni is also represented in the book through his article "Faiz or Zindan" (Faiz and Prison). He ends the article with glowing tributes to Faiz and Sajjad Zaheer: "I learned a lot from both of these and the knowledge I gained from them during confinement made the rest of my life a real ecstasy and delight."

Faiz Fehmi is a milestone work in trying to disseminate the same knowledge and ecstasy to a wide range of readers.

Qaisar Abbas
Pakistaniaat: A Journal of Pakistan Studies
Vol. 5, No. 1 (2013)

"FAIZ FEHMI"
Understanding Faiz with Style

"Faiz Fehmi, Tehqiq o Tanqeed"
Dr. Syed Taqi Abedi,
Ed. Pages 1403.
Lahore: Multimedia Affairs, 2011.

In an event in Dallas a couple of months ago, I had a rare chance to meet the last survivor of the famous Rawalpindi Conspiracy Case, Zafarullah Poshni, who was also incarcerated with Faiz Ahmed Faiz in 1950.

Recollecting the memories of the days he spent with Faiz in confinement, he discussed with me his up front and honest recollection of the days he spent in jail with Faiz. He said he was the youngest of all inmates who were confined in the famous Rawalpindi Conspiracy Case and Faiz saheb was always kind and caring to him. While most of the people in jail could not control their rage as a result of psychological distress in confinement, Faiz was always cool, well mannered, and respectful to others, he recalled.

"At times when Faiz looked miserable, silently smoking cigarettes walking back and forth, thinking and writing, we knew a poem was in the making and we started planning for a Mushaira" he said, "and those were the most precious moments of our internment."

Speaking in the event organized to honor him that evening, he said, technically there was no legal justification for a conspiracy case against us. The group met at the residence of General Akbar to discuss the possibility of a coup but the plan was rejected as it was not realistic and practical. The government, on the other hand, using some people as witness, by hook or by crook, tried to prove in the court that a conspiracy to stage a coup was hatched.

Comparing 2011 to the 1950s, he said, intolerance is creeping in our society to the extent that bigotry has replaced civility and violence has taken over common sense in our society. As the last survivor of the Rawalpindi conspiracy case, Zaffarullah Poshni, still in good health at his age, represents an extraordinary Qaisar Abbas group of individuals who cared about the miseries of people and struggled for their rights through a peaceful movement.

Zafarullah Poshni is also represented in the new book "Faiz Fehmi" with his article "Faiz or Zindan" (Faiz and the Prison). He concludes the article with paying glowing tributes to Faiz and Sajjad Zaheer, his friend: "I learned a lot from both of these and the knowledge I gained from them during confinement made the rest of my life a real ecstasy and delight."

In this new book, Dr. Syed Taqi Abedi, the editor, has documented life, legacy and poetry of the same legendary poet of the 20th century who was part of the socalled "Conspiracy" group.

Published by the Multi Media Affairs in Lahore, the book is an astonishing anthology of articles, research papers, interviews, personal memories of his friends, and family members, and photographs and illustrations on his

life and work. A voluminous work of over 1,400 pages with color printing and the fine paper quality, adorned with a leather cover, the book surpasses all other publications on Faiz in its quality, content and finesse.

In an era where you rarely see quality publications on the poet, the new book looks like an unexpected gift to Urdu literature and Faiz lovers. Although some of the articles are reproduction of published materials, most are new on contemporary topics. In fact, the editor claims in the preface:

"This document has been published to meet the demands of the 21st century so we can view his life and work from every possible perspective. We know that so much has been written on the poet and his life but we are also aware that there is a lot to write on the lament of his verse and the narrative of his prose."

It is in this context that the book attempts to fill a huge gap of quality work on Faiz and his poetic discourse. The editor also tried to keep up with the quality saying:

"We have consciously avoided 'cut-and-paste' articles using published materials without citations as we did not want to demean these writers."

The anthology includes articles of stalwarts of Urdu literature from across the world including India, Pakistan, Russia, England, Canada, the United States and other countries. Articles of several English and Russian writers such as George Fisher, Alexander Surikov, Lyudmala Vasilyeva and world leaders like Yasser Arafat also embellish the book.

The list includes Gopi Chand Narang, Syed Ahtesham Hussain, Kaleemuddin Ahmed, Mirza Khalil

Baig, Sharib Ridolvi, Shamsurrehman Farooqi, Al-e Ahmed Saroor, Mlik Raam, Ali Abbas Hussaini, Indar Kumar Gajral, Kirishn Chandr, Knahiya Laal Kapur, Ali Sardar Jafri and Syed Sajjad Zaheer from India.

A number of writers from Pakistan are also represented such as Shanul Haq Haqqi, Ahmed Nadim Qasmi, Ziaul Hasan, Zafar Iqbal, Abul Lais Siddiqi, Wazir Agha, Mohammad Ali Siddiqi, Jamil Jalibi, Qamar Rais, Mujtaba Hussain, Sahar Ansari, Karrar Hussain, Intizar Hussain, Sufi Ghulam Mustafa Tabbasssum, Fariqh Bukhari, Syed Sibte Hasan, Iftikhar Arif, Qudratullah Shahab, Mirza Zafarul Hasan, I.A. Rehman, Noon Meem Rashid, Hilal Naqvi, Sadiq Naqvi, Khwaja Ahmed Abbas, Mushtaq Ahmed Yousfi, Abullah Malik, Fateh Mohammad Malik and Safder Meer, to mention a few.

A unique section has been devoted to personal reflections of family members of Faiz including articles of his wife Alice Faiz, two daughters, Saleema Hashmi and Muneeza Hashmi, and his son in-law Shoab Hashmi.

The book also includes five articles by Faiz himself on a variety of topics including the progressive literary ideology, Josh as a revolutionary poet, films and culture, Beirut under the Israeli attack when Faiz was there, and his speech at the Lenin Peace Award ceremony in Moscow which was in Urdu.

Of the 162 articles on the poet, about one third (42) are written by the editor himself, Dr. Taqi Abedi. Thematically, the book has about 30 articles on the poet's life, interviews and personal memories of his friends while 132 articles are critical reviews of his poetry and work.

Unfortunately, the book is a limited edition not for sale which might be disappointing for a large number of readers. But the good news is the editor intends to publish a paperback edition to make it available to everyone, as he told me. Because of its huge size, however, the book might be published in the following three thematic volumes:

1. Volume I with new and unpublished articles.
2. Volume II on poet's life and memories of his families and friends with illustrations and pictures.
3. Volume III with all previously published articles. Publishing these volumes on paperback will make them more accessible and affordable to common readers and researchers everywhere. In launching the book in Canada, Gopi Chand Narang declared "Faiz Fehmi" as magnum opus of Urdu literature, a rare and unprecedented work of art. Without any doubt it is a milestone work for which the editor, who spent a huge amount of funds from his own pocket to publish it, deserves recognition and felicitation.

J. S. Ifthekhar
Hyderabad
November 18, 2018

A poet who defies definition

Saeed Shaheedi, poet of 'Barq-o-Aashiyan', excelled in all genres of poetry. A tribute to the prolific writer

There is no dearth of poets in Hyderabad. But, he remains a cut above the rest. You can rock to his romantic ghazals and also sob to his soulful dirges. That's Saeed Shaheedi for you. A poet who defies definition.

A prolific writer, Saeed has left his stamp in all genres of Urdu poetry – Ghazal, Qasida (panegyric), Naath (eulogy of the Prophet), Manqabat (sufi devotional poem), Rubai (quatrain), Munajaat (supplication), Salam (salutation), Marsia (elegy) and Noha (lamentation). He carved out a special niche for himself as versifier of Ahl-e-Bait. His devotional poetry written in praise of the Prophet's family is a big draw during the Muharram mourning sessions. Saeed is equally popular for his ghazals where he is at his best depicting the feelings of love and bereavement.

Born Mir Abid Ali, he is known by the nom de plume Saeed. During his lifetime, he figured among the show stealers. His style of rendition apart, the profundity of thought, the pungent freshness, poignancy and music in his verses cast a Mesmerizing spell. The effect is much the same even now as the poet himself remarked once:

Jab bhi mehfil main chidi meri ghazal
Sari mehfil ko tadapta dekha

(Whenever my ghazal is recited/ The entire assemblage is seen in spasm)

What is unique about this *Shayer-e-Deccan* is that he could express exquisite sentiments with beauty, ardour and pathos in short *beher* (meter). His lyrical power is extraordinarily versatile and renders the whole gamut of human emotions with consummate felicity. Most of his ghazals betray a nostalgic longing for the beloved. Sample these verses:

Kaise sukoon paoon tujhe dekhne ke baad
Ab kya ghazal sunaoon tujhe dekhne ke baad
Teri nigah-e-mast ne maqmoor kar diya
Kya maikadh ko jaoon tujhe dekhne ke baad

His ghazals are distinctive and moving. Using elegant vocabulary and metaphorical allusions, Saeed is able to express different shades of feelings while adhering to rhyme and meter. See how in this ghazal he plays on words and emotions which he alone could do.

Kis ko pane ki baat karte ho
Hosh udane ki baat karte ho
Jam khali laga ke honton ko
Ladkhadane ki baat karte ho

Known as poet of 'Barq-o-Aashiyan', Saeed's *shayeri* is full of references to lightning and nest. He employs these metaphors superbly in different contexts to depict the ravages suffered by a hapless lover at the hands of the beloved and to cock a snook at destiny.

Barq ke liye kya kya zahmaten uthata hoon
Aashiyan ke jalte hi aashiyan banata hoon
Aashiyane ki bunyad rakh ker Saeed
Barq ka housla azmate hain hum

It is difficult to gauge the depth of his poetry as he mastered the art of expressing difficult situations in an easy way. The agony of Karbala, the most poignant chapter in Islamic history, has a bearing on his poetry. No wonder his verses have the sensation of smouldering embers. But, they don't scorch the readers and listeners – rather bestow the

warmth of life upon them. Saeed surely is one of a kind. This is best summed up in his own words:

Ghalib nahin main phir bhi Saeed itna kahoonga
Har ek se hat kar mera andaze bayan hai

Poetry runs in his genes with his father, Mir Mehdi Ali, being a poet himself. Saeed gave a hint of his brilliance when he took part in the annual *mushaira* held at Nizam College as a student. Those present, including the then Prime Minister Maharaja Kishan Prasad, couldn't miss the great poet in the making.

Mubtalaye zulf ghabrate nahin
Khelte hain khaid mein zanjeer se

Though Saeed worked in the Excise Department, he remained a poet at heart. He was bestowed the title of *said-us-shora* and travelled widely addressing poetic sessions both within and outside the country. His poems were regularly broadcast from All India Radio and BBC. Perhaps, Saeed had an inkling of his fame and said it in a subtle way in this couplet:

Aankhen khul jaayengi zamane ki
Meri aankhen to bund hone do

There could be no better tribute to this master poet than publication of his complete works. Another great son of the soil, Dr Syed Taqi Abedi, deserves compliments for bringing out the *Kuliyat-e-Saeed* Shaheedi to mark his birth centenary celebrations held on January 23, 2018. A collector's issue, the 759-page tome contains all the 3,869 verses composed by him along with the views of top writers.

J. S. Ifthekhar
Hyderabad
November 25, 2018

Gulzar enriches Urdu with Triveni

Urdu poetry is now richer by a new genre, Triveni. The credit goes to filmmaker and lyricist Gulzar.

A poetic unit of three verses, Triveni packs a punch in the last line by turning around the meaning expressed in the first two verses.

Gulzar, who has mastered the art of writing the Triveni, regaled the audience the other day at the Maulana Azad National Urdu University (Manuu).

What was billed a seminar turned into a mushaira with the renowned poet holding everyone spellbound with his three-liners. Right from Vice-Chancellor Aslam Parvaiz to professors and students, Gulzar's recital swept everyone off their feet.

A book penned by Canada-based Hyderabadi scholar Dr Syed Taqi Abidi, Gulzar ki Taqleeqi Sinf, Triveni, Tashreeh o Tajziya was released on the occasion.

Three-line poetry is not new to Urdu language.

There are various forms like the musallu, the haiku, tikoni, salees and the tipai where an idea is expressed in three lines. But Triveni differs in that it's free from the restrictions of radeef and qafia (rhyming).

The thought expressed in the first two lines takes a new twist when the third line is read.

For the last few years, Gulzar has been writing Trivenis on subjects as varied as love, the calamities of life, social milieu and moral values.

The best part of Gulzar's shayeri is that one doesn't need to consult a dictionary. His poetry is simple and down

to earth. What's more, he doesn't hesitate to borrow commonly used English words.

Asked why he named his three-line verse Triveni, Gulzar said the first two verses meet like the Ganga and the Jamuna and complete a thought and an emotion. But beneath these streams runs another river, the Saraswati, which is apparently hidden. He likens the Triveni's third line to the Saraswati which makes a world of difference.

Sample this triveni:

Samne aye mere, dekha mujhe, baat bhi ki
Muskuraye bhi purani kisi pehchan ki khatir

Kal ka akhbar tha, bas dekh liya, rakh bhi diya

(You come before me, acknowledge me, and even talk to me your smile reveals our long acquaintance Like yesterday's newspaper, read and discarded)

At a time when Urdu readership is dwindling, Gulzar remains its face. In his own inimitable way, he is trying to keep the flickering flame burning. He wants the language to be made simpler for Hindi readers. He superbly captures the dilemma facing Urdu thus:

Badi aristocracy hai zaban main
Faqeeri mein nawabi ka maza deti hai Urdu

Dr. Mohd. Zafar Hyderi
Sri Nagar

Continued from Editor's Desk

The learned author deserves genuine applause for publishing this book. Judging by the subject matter and the range it covers, this book ought to have taken a decade or so in its preparation and arrangement of the material. But it was for the tremendous labour of the author that, within a couple of years, it was shaped out in the form of a book. It has 816 colour pages printed on high quality art paper. The size of the book is 29x23cms, weighing about 3Kgs. The matter of each page of the book is enclosed in a colour border resembeling Iranian Paper Machie.

In the past too, attempts were made to present the works of Mir Anis a great Marsia (Elegy) poet in the subcontinent. Allama Shibli Nomani's venture "Muazana Anis o Dabeer", can be broached as the best example in this direction, which appeared some 100 years ago. In contrast to Shibli's book, which deals with numerous 'Marsias' of Mir Anis, Dr Abedi's entire book is based on only one Marsia of Anis....

Jab Qata Ki Masafat e Shab Aftab Ne

(The sun had run its journey o'er the night) in which the learned author has analysed and discussed about one hundred qualities and beauties of the said Marsia. Dr Abedi, indeed, is the first person who has analysed one single Marsia of Anis with such creativity. It is, beyond doubt, a great achievement which is unmatched and unrivalled. Unique as this book is, it is supplemented by

another work of paramount importance, the translation of the said Marsia in English by David Mathews and in Arabic by Syedul Ullema Maulana Syed Ali Naqi un Naqvi

The book is based on 14 chapters. Three chapters (i.e. 11th, 12th and 13th) are of extra ordinary importance. In these chapters, the author has thoroughly analysed the fore mentioned Marsia from the book "Shahkar e Anis", by Prof Masood Hasan Rizvi Adeeb. Prof Rizvi's book has 197 sixtains and all the sixtains have been beautifully and creatively analysed and incorporated in the book. Moreover, Dr Abedi has arrived at his own coinages. But his most remarkable contrbution is the ingenuity of form, because no form as such was known to exist before.

It will not be out of place to mention here that in addition to the analysis of 197 sixtains of the Marsia, the book provides a detailed study of the life of Mir Anis in chapter one. According to the author, the title "Khuda e Sukhan" has been used for only two great poets: Mir Taqi Mir and Mir Anis. The former used 'Ghazal' as a medium of expression, whereas the latter selected 'Marsia' and made martyrdom of Imam Husain(as) his subject. It was from his ancestors that Mir Anis has inherited the legacy of poetics and, therefore, he was justified in making a well-founded claim:

Panchvein Pusht hai Shabbir ki maddahi mein

(In Shabbir's adoration, mine is the fifth generation).

According to the author, the real greatness of the poetry of Mir Anis lies in his mastery of language. He enjoyed such a perfect command over the language that he very easily couched into words not only the profoundest thoughts but even the sublimest of feelings. The depth of

his thought, coupled with his limitless capacity to evoke feelings, indeed lent such a dignity to his poetry which no other Urdu poet has so far been able to create. Mir Anis has the power of expressing one and the same thing in manifold ways. He was well versed in the art of expanding and compressing a passage. He had such a rich and inexhaustible stock of words which no other poet of Urdu, nor probably any poet in any other language, appears to have possessed. Anis himself claims:

Guldasta e mana ko naye dhang se baandhun
Ek phool ka mazmoon ho to sau rang se baandhun

The poetry of Anis is conspicuously marked by the characteristics of simplicity, elegance and eloquence. These qualities are not only abundantly clear in his work but are the very essence of his poetry. So glaring are these characteristics that they do not escape the attention of a reader, provided he or she has a taste for culture.

Besides the poetry of Mir Anis, Dr Taqi Abedi has also tried to trace the minute details of the life of Anis like appearance, costume, punctuality, sensitivity, behaviour and habits, first and last "Majlis", prayers, illness and death. The last few years of Anis's life were disturbed by the turbulent political events. During his visit to Azimabad, he fell ill. When illness took a serious turn, he rushed back to Lucknow. He was ill for about a month and at the age of 73, he breathed his last in 1874 AD. The following couplet of Mirza Dabeer reveals not only the exact year of his death, but it is also the best tribute to the person who had been his life-long rival:

Asman bay Mah e Kamil
Sidrah bay Rooh ul Ameen

Toor e Seena bay Kaleem ul Lah
Mimber bay Anis

(Poor is the sky without the full moon, and empyrean without Gabreil, is meaningless, Nothing is the Mount Toor, without Moses, And pulpit without Anis, is worthless)

Further, there is a chapter (2), which deals with some of the eminent personalities having had direct or indirect association with Marsia and Mir Anis. They include Ghalib, Nasik, Dabeer, Azad, Hali, Shibli, Chakbast, Josh etc. and contemporary figures like Prof Akbar Hyderi, Prof Gopichand Narang, Dr Nayyer Masood, Prof Sharib Rudaulvi, Prof Fazal Imam, Dr Hilal Naqvi and many more. Dr Taqi Abedi has discussed and presented everything in the most objective way.

Prof Akbar Hyderi Kashmiri has written the foreword of the book. According to him, Dr Abedi has done utmost justice to the meaning of the words, expressions, phrases, metaphors and similes of the Marsai-an art of creativity, which is beyond the reach of others. In this connection he says:

Jauhari bhi is tarha mooti piro sakta nahien

Undoubtedly, "Tajzia Yadgaar e Anis" is a scholarly work of Dr Syed Taqi Abedi. He has accomplished this task most successfully and has endeavored to introduce the Poet in the most befitting manner. Last but not the least. It is pertinent to mention here that in this special issue, the said book has also been reviewed by Akbar Hyderi Kashmiri, Baqar Zaidi and Abdur Rehman Abd. Besides, the other books of Dr Abedi which have been reviewed in this very special issue include "Ghalib: Diwan Naat o

Manqabat'', "Rubaiyaat e Anis & Dabeer", "Chun Marg Ayed", "Faiz Fehmi", "Amjad Fehmi", "Hali Fehmi", "Kuliyaat e Hali", "Insha Ullah Khan Insha", "Kuliyaat e Saeed Shahidi," "Gulshan e Roya", "Kainat Najam", "Roop Kumari", "Tajzia Yadgar Anis", etc. In a nutshell this issue is a treasure of knowledge.

Dr. Syed Taqi Abedi
October 29, 2021

"The Visionary outlook of Allama Iqbal's teachings in the modern era"

In the 21st century's Global village, where people of different Creed, Culture and colour are living together, the message of the poet of east, the Islamic thinker, Allama Iqbal enlighten the human and in particular the Muslim mind as he put the visionary light on the exaltedness of human being in the Universe.

In the so-called civilized culture, the thought development Promotes my way in the highway concept, there is no respect for others because they are either unaware of the greatness of the human beings or they do not want to interact with the truth.

Iqbal said, "Manliness is to respect the Man, you have to know the right placement of Man."

آدمیت احترام آدمی

باخبر شو از مقام آدمی

If you consider 37 yourself a civilized person then, you have to respect the other human beings, because the status of this supreme Creation, so called Man is loftier than the heavens, that for the roots of the culture are engraved in the respect of the human beings.

برتر از گردوں مقام آدم است

اصل تہذیب احترام آدم است

Iqbal said I have seen the man with no vision had fallen prostrate at the feet of the Rulers, have you ever saw a dog prostrate for other, in fact the supreme creation is fallen so low in moral values.

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد

گوہری داشت ولی نذر قباد و جم کرد

یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است

من ندیدم کہ سگی پیش سگی سر خم کرد

The Man the supreme creation, the only vicegerent of God, on the earth, for whom God said in Quran, "Verily we have made subservient to you Whatever is in the earth and in the skies", Iqbal love and teaches power, success through refining oneself with the inner power of "Quran, and the teachings of the holy prophet, Iqbal said it is unwise to change yourselves to the prescribed worldly ways, you should Change the world on your terms and bring it to your way by power and conquer.

حدیث بی خبراں است بہ زمانہ بساز

زمانہ با تو نسازد تو بہ زمانہ ستیز

Iqbal emphasizes conquering the world with obedience, obligations and hard work and he ask the Muslims to become finest human beings in the world.

He said the dusty marble by its adaptation in a building Construction is Taj Mahal, the scattered sounds when travel the music instruments produce Cosmic melody.

Iqbal is the post of conviction, he sees in ilm (knowledge of Sharia) The action (عمل) and in the action she look upon the obedience (اخلاص) and finally in the obedience the conviction (یقین) as he narrates in his famous verse" The conviction of the individuals which builds the society and that is the only action which shapes the destiny.

یقیں افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے

یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیر ملت ہے

When Iqbal noticed the downfall of the Muslims in the world, in the same as "Rumi saw in his times, he said" Like Rumi I call upon The Muslims to Join The good work of existence to demolish the destructive forces emits from both inner and outer environment,

چون رومی در حرم دادم اذاں من

ازاو آموختم اسرارِ جاں من

بہ دورِ فتنۂ عصر کہن او

بہ دورِ فتنۂ عصرِ دوراں من

Iqbal's message to the modern world is to get Enlighted by the light of "Noore Mubeen the Quran for which they have to read and understand as it was revealed on their chests.

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

As long as the Quran is not revealed upon your soul neither Razi nor Kashaf can solve the riddles. Iqbal's core teachings include the love and faithfulness to Prophet Mohammad (PBH), he addressed to Muslims of you are faithful to prophet then God will be yours.

ع: کی محمدؐ سے وفا تو نے ہم تیرے ہیں

These tributes of Iqbal aspirations not only Enlighted the soul, the inner core of Muslim umma but also act as a spiritual catalyst in divine concept. Iqbal prescribes continuous hard work, struggle and truth to achieve the divine love.

تباؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے

یہ ہے نہایت اندیشہ وکمالِ جنوں

Iqbal is not happy in today's world where Muslims are idol bearer as he has to spread the doctrine of the Allah.

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مجھے ہے حکمِ اذاں لاالٰہ الااللہ

Although the Muslim congregation held idols in their sleeves, I have been instructed to declare "There is no god but the God."

He is asking "Be Like Ibrahim, the God intoxicated and demolish every old idol house"

باش مانند خلیل اللہ مست هر کہن بت خانہ را باید شکست

Iqbal encourage us to follow the steps of Ibrahim to achieve the success, if someone adopt the faith of Ibrahim, the fire can change itself. to a garden fall of followers.

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا

آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

Iqbal designated himself as the poet of tomorrow means, poet of new generation. He prayed to Allah to spread the light of his vision.

خدایا آرزو میری یہی ہے

مرا نورِ بصیرت عام کردے

Iqbal wants to lead The Umma as he pointed out in his verse that I will lead tierd worn-out my Caravan in the dark night where my sighs will emit and my breath will Spark flames.

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو

شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

Iqbal says in this turmoil of cultures make Rumi your guide and, on the path, you may granted the ardour and compassion, because Rumi separates "Kernel from the shell, and he is steadfast in the true parts of the Beloved

پیر رومیؔ را رفیقِ راہ ساز   تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

زانکہ رومیؔ مغز را داند ز پوست   پائے او محکم فتد در کوئی دوست

Iqbal is asking us to get on to the day-to-day struggle because a nation cannot face the future boldly if it does not control its destiny today.

وہ قوم نہیں لایقِ ہنگامۂ فردا

جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں

I will end this visionary outlook with a Verse of Iqbal where he uses metaphorically The "SAJDAH" an exalted performance of obedience, if it is done with conviction, love and total subjugation to the God.

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی ہے

اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

That (Sajdah) prostration which brought tremors to the soul of the earth; The pulpit (Mincher) and the niche long for it.

Hasan Abidi
Daily Dawn (Karachi)
February 18, 2004

A novel marsia collection

"Izhar-i-Haq" a volume, comprising unpublished elegies of the late Sultan Saheb Fareed, a marsia poet coming from the elan of Mir Anis, was launched under the aegis of the Idarae Tahzeeb-o-Tarveege Marsia at the NIPA auditorium on Monday.

Dr Syed Taqi Abedi, a Canada-based intellectual and researcher, also a physician, who researched, edited and compiled the hand-written elegies found in decaying condition, spoke with a zest on the elegies of Sultan Saheb Fareed and the Lucknow of the early decades of the last century. As Mr Abedi had arrived with his three other research publications about another marsia poet, Mirza Dabeer, an equally important contemporary of Mir Anis, he spoke on the Dabeer's merits and invaluable contribution to Urdu poetry.

Marsia, Dr Abedi said, was not just the poetry of sorrow, "It encompasses the whole life," he emphatically argued while denying the critics who considered marsia as simply "religious poetry."

Talking about Sultan Saheb Fareed, he said, about 70 per cent of his 'Kalaam' was missing. In the later part of his life, he had stopped composing marsia, reacting against the jealousies of lesser people in Lucknow, Dr Abedi said, adding that whatever could be found in the family treasure was the most precious.

Sultan Saheb Fareed's illustrious son Dr Iftekhar Ahmad, a botanist and also based in Canada, commenting on the merits of the marsia collection, admired Dr Abedi's efforts and pointed out some lapses in the compilation,

mainly the omission of the efforts made by Dr Ahmad's elder brother in preserving the manuscripts.

The present volume carries fifteen elegies, thirteen Salams and twenty five Rubaiat.

Giving his views on Mirza Dabeer, Dr Abedi said he was the most 'victimized' poet of his time, maligned and abused by many. He had to his credit the largest number of couplets, while his command over various experiences of life and study of nature was amazing, he added.

He informed that the bicentennial celebrations of Mirza Dabeer were going to be held in India.

Dr Farman Fatehpuri spoke highly about Dr Abedi and also admired Dr Iftekhar Ahmad. He suggested that a small portion of selected elegies might be published for lay readers, at a low price, to make the genre popular.

Dr Hilal Naqvi of the Idara, in his welcome address, briefly referred to the evolution of marsia in Urdu.

Dr Mohammad Raza Kazmi presented his critique on the elegies of Fareed. Prof Saher Ansari called it a "monumental work," Dr Abedi had done at the age of 55, and suggested that a history of Urdu marsia should also be compiled.

Dr. Hasanain Walji
October 30, 2004

Dr Taqi Abedi in Dallas on Saturday Oct. 30

Dr Taqi Abedi is literary legend in our Community and an internationally acclaimed poet, who hardly needs an introduction.

His visits to Dallas have always been inspirational. Once again he will be visiting us on Oct 30/31. He will preside as Guest of Honor at the IILM Fundraiser on Saturday evening.

In addition to his magnus opus on Mir Anees, called "Yadgar-e-Anis", he has authored some 17 books and will be presenting some selections from them on Saturday. Some of the titles are:

"Josh-e-maodat", "Gulshan-e-Roya", "Iqbal Kay Irfani Zaweye", "Inshaullah Khan Insha", "Ramooz-e-Shaere", "Izhar-e-Haq", "Mirza Dabir", "Taleh Mehr", "Abwabul Masaeb", "Silk-e- Sakam-e-Dabir", "Aroos-e-Sukhan".

He will also have some rare marsiya manuscripts for display during his time here and Mumineen will be able to obtain his CDs during the evening. At the same time our own local legend, RAZALI will be presenting, by popular request, a special compilation of "SHIKWA JAWAB-E-SHIKWA" by Allama Iqbal during the evening. There will also be poetry recitals in Arabic and Farsi.

Ayub Khan
The Milli Gazette Online
July 1-15, 2005

International Urdu Conference in Toronto

Urdu is not a threatened language but is alive and well, proclaimed Dr. Gopi Chand Narang, noted critic and president of Indian Academy of Letters, at a three day International Urdu Conference held in Toronto from June 17-19. He said that the organization of such conferences in North America proves that Urdu will continue to flourish in the future. He said Urdu should not be restricted to the Muslims alone but should be promoted as a universal language.

The conference, organized by the Urdu Times, was attended by well-known poets, writers, and journalists from India, Pakistan, UK, France, and Canada. Sessions were held on Literature and Modern Trends, Iqbal studies, Ghalib studies, Urdu Media's new challenges, Religious poetry, and Women's Urdu Literature.

Speaking at the conference Zahid Ali Khan, editor in chief of Siasat Daily, Hyderabad, said every year more than 50,000 students from Urdu schools drop out in the state of Andhra Pradesh alone never to return to studies. He said it is vital that the students remain in schools and that the schools' standards should be raised to meet modern challenges. He appealed to the attendees to sponsor at least one student in a year. Khalil ur Rahman, publisher of the New York based Urdu times, announced that he will sponsor the publication of quality Urdu works and that an international jury will select the submitted works.

The conference resolved that immediate measures need to be taken to protect the Urdu script in its present

form. Dr. Taqi Abedi, convener of the conference, said the Perso-Arabic script is not the clothing but the skin itself of Urdu language and that no compromises should be made on it. The conference resolved to form an international committee to solve issues relating to the count of the Urdu alphabet and the teaching of Urdu in Sunday Islamic schools in North America. The attendees appealed to the Indian and Pakistani governments to ease travel restrictions on poets, writers and other literary figures.

The conference closed with a Mushaira attended by over 1500 people. Dr. Jamil Jalibi, Dr. Shan ul Haq Haqqi, Dr.David Matthews, Dr. Peerzada Qasim, Wakil Ansari, Mona Shahab and other national and international poets took part in it. Another International Urdu Conference is being held in Hyderabad this November.

Daily Patrika
(Allahabad)
January 19, 2006

"Kainat-e-Najm" to be released on Jan. 20

"Kainat-e-Najm" the latest literary creation of the renowned Urdu litterateur Dr. Taqi Abedi would be released on Jan. 20 at the Vijayanagaram Hall of Allahabad University. The book "Kainat-e-Najm" concerns with the literary achievements of the renowned poet Allama Najm Afridi.

In the book releasing function, several scholars, legal luminaries would be present. The programme would be presided over by Mr. Justice Barkat Ali Zaidi. The main speakers would include S.M. Akil Rizvi, Prof. Shams-ur-Rehman Farooqi and Prof. A.A. Fatmi. Even Dr. Taqi Abedi would also grace the occasion who would remain in Allahabad city only for ten hours.

"Kainat-e-Najm" is the literary creation containing Ghazals, Marsia, Qata, Nauhas and Salam of Allama Najm Afridi.

Mr. Taqi Abedi holds a special place in Urdu literature. In spite being a medical practitioner, his literary services are commendable.

Daily Patrika
(Allahabad)
January 21, 2006

Book release function of "Kainat-e-Najm" held

At a glorious function was held at Vijayanagaram Hall, Science Faculty, Allahabad University, the latest book of Canadian poet Indian origin Dr. Taqi Abedi entitled "Kainat-e-Najm" was released by the senior-most Prof of Allahabad University Prof Janak Pandey. The Judge of Allahabad High Court Mr. Justice Barkat Zaidi was the chief guest. Former head of the Urdu department, Allahabad University, Prof. S.M. Aqil Rizvi, presided the function. Prof. Shamsur Rahman Farooqi and Prof. Ahmad Fatimi was the chief Orator. A research scholar of Allahabad University Fazil Hashmi conducted proceedings who was also the convener of largely attended programme. Dr. Taqi Abedi himself was present who stayed only for 10 hours in Allahabad.

Speaking as chief guest Mr Justice B.A. Zaidi said that nowadays the literary interest of the masses is on decline. Under these circumstances Dr. Taqi Abedi will must get prayed for his continuous research work. I pray to God for long life of Dr. Abedi so that new books may come into existence. Looking very happy with his warm welcome Dr. Taqi Abedi said that this is his 15th research book and is divided in to two parts. There are 195 Ghazals, 596 Rubaiyat, 485 Quataat, 106 Salaams, 4 Marciyas and 144 Nawhas in these volumes. There are 12792 lines in these books in all. There are Ziyarats and Nath Shants init. Allama Najm Afandi born in 1893 in UP and later migrated to Hyderabad. He died in 1975. He was a revolutionary poet in these books and I have collected the poems related

to framers, labourers and patriots, Releasing the book Prof. Janak Pandey was in all prays for Dr. Taqi Abedi Prof. Pandey specially praised the poems "Qaidi Ka Raag" and "Mazdoor Ki Awaz". Earlier Dr. Fazil Hashmi welcomed the chief guest and other dignitaries and promised to organized such literary functions in future.

The persons present among those include Prof. Fazle Imam Rizvi, Prof. Abdul Hamid, Prof. Raza Hasnain, Prof. Atiya Nishat, Prof. Ali Ahmad Fatimi. Prof. Naushaba Sardar. Principal Ahmad Hasnain, Zafar Abbas Farman Naqvi, Dr. Sabnam Hamid. Sayyed Azadar Hussain, Dr. Fakhrul Kanm, Aslam Allahabadi, Ramz Allahabadi, Banar Naqvi and others. A micro Mushaira of only 30 minutes was also organized It was conducted by Najeeb Allahabadi.

Daily Hindustan Times
(Allahabad)
January 20, 2006

"Kainat-e-Najm" released

The latest book of Canadian poet of Indian origin, Dr Taqi Abedi, titled "Kainat-e-Najm" was released by Prof Janak Pandey of Allahabad University at a glittering function at Vijayanagaram Hall, Faculty of Science, AU.

Justice Barkat Ali Zaidi of the Allahabad High Court was the chief guest while former head of the Department of Urdu, AU, Prof S.M. Aquil Rizwi, presided over the function.

Renowned Urdu writer Prof Shamsur Rahman Farooqi and Prof Ali Ahmad Fatimi were the chief orators.

Speaking on the occasion, Justice Zaidi said literary interest of the masses was on the decline these days. Under these circumstances, Dr Taqi Abedi must be praised for his continuous research work.

Dr Abedi said this was his 15th research book and was divided in two parts. The volumes included 195 ghazals, 596 rubaiyat, 485 quataat, 106 salaams, 4 marciyas and 144 nawhas.

In these books, Dr Abedi has collected the poems related to farmers, labourers and patriots.
Prof Pandey specially praised the poems "Qaidi ka Raag" and "Mazdoor ki Awaaz". Earlier, Dr Fazil Hashmi, who conducted the programme, welcomed the chief guest and other dignitaries at the function.

Among those present on the occasion included Prof Fazle Imam Rizvi, Prof Abdul Hamid, Prof Raza Hasnain, Prof Atiya Nishat, Prof Ali Ahmad Fatimi, Prof Naushaba Sardar, Dr Shabnam Hamid, Sayyed Azadar Hussain, Dr Fakhrul Karim, Dr Aslam Allahabadi, Ramz Allahabadi,

Ahmad Hasnain, Zafar Abbas, Farman Naqvi, Baqar Naqvi and others.

A 30-minute mushaira was also organized on the occasion, which was conducted by Najib Allahabadi.

M. A. Qudoos
Khaleej Times (Dubai)
May 24, 2006

Urdu poetry book of late Najm Afandi launched

A 1,800-page Urdu poetry book, Kayanat-e-Najm (The Universe of Najm), a collection of some 13,000 verses of poetry about the Holy Prophet (peace be upon him) and members of his family by famous poet late Najm Afandi of Agra, India, was launched at a literary programme here on Monday.

The book, compiled by a Canada-based Urdu scholar, Dr Syed Taqi Abedi, was launched by Yasub Abbas, who had specially flown in from Lucknow to preside over the programme.

Introducing the book, Taqi said that it took him nearly three years to collect the verses of Najm, who died in Karachi in 1975 while visiting his daughter. Unfortunately, his verses were not fully preserved by family members.

Taqi said that some 65 per cent of the verses included in Kayanat-e-Najm were not published earlier. Reading verses to explain the variety of Najm's poetry, Taqi said that it included naats, nohay, manqabat, salaams, qaseedas, rubaiyat, and ghazals.

Speaking about Najm's manqabats, Taqi said that the poet was an inventor of the modern style of manqabats. His style was followed by the young poets of his time. Taqi said that Najm also revolutionised the style of nohas.

Taqi said that Najm was among the first Urdu poets to raise voice through his simple poetry against the rich and in support of the poor. He lamented that Najm was not recognised in his lifetime and died a poor man.

Taqi said that so far 10 collections of Najm's work had been published in India and Pakistan. All of them are being made available on a web site.

Kayanat-e-Najm was first launched in Hyderabad, India, in January 2006 by Najm's son, Sohail, who is also a poet.

Iqbal Haider from Germany said that some 50 per cent of Najm's work was lost because it was not preserved or published in time by the many literary organisations which receive heavy grants to promote Urdu literature. Safdar Ali read verses on the occasion.

After launching the book, Yasub praised Taqi's efforts in compiling the book. He said that Taqi is well known all over the world for his research, specially on Mir Anees and Mirza Dabeer. "Taqi's books are not for sale. Kayanat-e-Najm is a valuable gift to Urdu literature and we should benefit from it," Yasub said.

Another book, a compilation by Taqi of the work of Roop Kumari, who hailed from a Kashmiri Pandit family, was also launched on the occasion. Her verses included hamd, naat, saqi nama, and bhagti poetry. Najm had been a teacher (Ustad) of Kumari for some time.

Hindustan Times
(Allahbad)
December 20, 2006

AU V-C releases book on Ghalib

Allahabad University Vice-Chancellor Prof Rajen Harsh Released 'Ghalib–Diwan-e-Na'at-e-Manqabat' a book by Dr Syed Taqi Abedi of Canada in the presence of renowned Urdu scholars at AU's Vizianagaram Hall on Tuesday. Vice chairmen of national council for promotion of Urdu language Prof. Shamsur Rehman Faruqi presided over the function.

Prof. Harshe said that the book was a sincere effort of Dr. Abedi and added that the students should follow the example set forth by Dr. Abedi in the field of literature. Prof. SR Farooqi said that the book was a treat for Urdu Poets and praised the efforts Dr. Abedi in exploring several expects of life reflected in the Ghalib's writings.

Uttar Pradesh Rajarshi Tandon Open University Vice-Chancellor Prof. KNS Yadav, Head of AUs Medieval and Modern History Department Prof. NR Farooqi and AU registrar Firdous A Wani also graced the occasion. A number of renowned Urdu scholars and students were also present.

Daily Patrika
(Allahabad)
December 20, 2006

Ghalib-Diwan-e-na`at-o-Manqabat relased.

Ghalib did wonders in religious writings too: Prof Harshe

'Mirza Ghalib who is known for love and beauty-based poems and couplets, had gifted priceless repository to generation in the form of Naat and religious rhymes' said vice chancellor of Allahabad university Prof RG Harshe while releasing the book "Ghalib-Divan-e-na`at-o-manqabat" in a glittering function held at Vijayanagaram Hall on Tuesday.

He said that though, he had not gone through the literature of Ghalib, but on the basis of interaction with eminent writer and poet Gulzar, it could be said that Ghalib not only did wonders in urdu poetry but also made remarkable contribution in religious writings He further released the book title "Ghalib-Diwan-e-na`at-o-manqabat" written by Canada based NRI author and medical practitioner Dr. Syed Taqi Abedi.

The function was presided over by Prof. Shamsur Rahman Farooqi, Vice-Chairman, National Council for Promotion of Urdu language. Dr. Syed Taqi Abedi (Canada) who was chief guest on the occasion said that despite his medical profession, he tried to unveil the hidden faces of Mirza Ghalib.

He further mentioned that literature of the country act as bond for the person staying in other part of the globe. The guest of honour was Prof N.R. Farooqi Dean, College Development Council; and Prof. K.N. yadav Vice

Chancellor; UP Rajrashi Tandon Open University Mr. Firoous A Want, Registrar also released a book titled "Shand-e-Sakt". He said that literature teaches us about the existing Garage-Vemun tradition in the country.

Daily Dawn (Karachi)
May 3, 2009

The art of Rubai

In certain cases one may offer some plausible explanation for it. But generally one wonders why a poet is consigned to the dustbin of history and why after long years he attracts the attention of researchers and at their hands regains his lost reputation.

At least in the case of Mirza Dabeer we can offer an explanation and say that it was because of Maulana Shibli's comparative study of Anees and Dabeer published in 1906 that poor Mirza Dabeer suffered a setback.

Of course, even after the publication of Shibli's views, thanks to the soz khwans and marsiya khawans, Dabeer remained popular in the circles of the mourners. But in the world of literature Maulana Shibli's harsh judgment went unchallenged.

The poet speedily fell into oblivion and remained so for more than half a century. It was only in 1975 after the death centenary of Mir Anees a few literary journals cared to remember his 100th year of death and brought out special editions paying homage to this great master of Urdu marsiya.

That may be seen as the beginning of an attempt on the part of researchers and critics to get rid of the influence of Shibli's dismissive verdict about Dabeer.

Prof Karrar Husain, in his article published in Mah-i-Naus Dabeer Number (Sept/Oct 1975) emphasised the need to revise our attitude towards Dabeer. We should, he said, go back to him and read his works anew with care.

This statement was indicative of a changing attitude towards Dabeer. And as the century came to a close we saw

a newly emerged scholar engaged in digging up the lost writings of Dabeer.

He was Dr Syed Taghi Abedi, who, after doing some research work on marsiya writers in general, gradually devoted himself to researching Dabeer alone. His painstaking effort slowly and gradually started to bear fruit.

He was able to dig out enough material, which he carefully sorted out and compiled in separate volumes. The latest is the seventh volume published by Shahid Publications, New Delhi, under the title Rubaiyat Dabeer.

It is perhaps for the first time that we have such a big volume of Urdu rubaiyat which is of 612 pages.

In his introductory article Dr Abedi has talked about this short form of poetry providing us precious information about its origin, its technicalities and its favourite themes in the light of his research.

This introductory article is preceded by a foreword by Allama Aqeel-ul-Gharvi, who is of the opinion that compared to Anees, Mirza Dabeer is more prolific and appears better placed in the field of rubai.

Dr Abedi has carefully compiled these rubaiyat, classifying them in accordance with the themes they deal with. As enumerated by him, the total number of rubaiyat he has been able to collect and present in this volume is 1323, of which 40 have been written in Persian.

According to Abedi's research a poet known as Shah Ghamgeen is credited with writing 1,800 rubaiyat, the largest number written by any poet in Urdu. Dabeer is second only to him.

In fact, the rubai has not been very popular in Urdu. The reason, as explained by Dr Abedi, is that it is a difficult form of poetic expression and is a challenge to the poetic capability of a poet. He has to say all what he intends to say in just four lines.

The fourth is the decisive line. It comes as a test for the poet, who has to prove in one line that he has

something extraordinarily precious to say.

It should come as a final word of wisdom. And only a few poets have been able to succeed in this regard.

Persian poetic tradition has in its fold poets who have come to be acknowledged as the most accomplished writers of rubai. Omar Khayyam's Rubaiyat, when translated, or rather recreated in English by Fitzgerald, won international fame.

In Urdu, of all the poets, the two marsiya writers Anees and Dabeer have come out as the two most accomplished rubai writers.

e-mail (Toronto)
From: Mohammed Ayub Ali Khan
Sent: Tuesday, August 18, 2009 2:59 PM
To: Mazin Khan
Subject: Fw:

Dr. Taqi Abedi, Kader Khan to collaborate for the promotion of Urdu

August 13, 2009-Noted Toronto based author and Urdu scholar Dr. Taqi Abedi has extended his full support to the initiative taken by Mr. Kader Khan to promote Urdu language and literature in the West and elsewhere. The veteran film actor recently visited Dr. Taqi Abedi's expansive library in Newmarket, Ontario and exchanged ideas for further collaboration.

Mr. Khan appreciated Dr. Taqi Abedi's scholarly efforts and and congratulated him for his impressive collection of books which number more than ten thousand.

Mr. Kader Khan would be returning to Toronto soon to work on this project.

The dynamic partnership between the two is a promising start and productive results can be expected towards the promotion of the Urdu cause.

Intizar Husain
Daily Dawn (Karachi)
September 06, 2009

Persian Legacy

Dr Taqi Abedi had taken a start as a research scholar solely devoted to the study of Urdu marsiya. His first noticeable venture was the study of a selected marsiya by Mir Anis, which he published along with its English translation by David Mathews in a deluxe edition under the title "Tajziya Yadgar-i-Anis".

But soon he realised that more than Anis, Mirza Dabeer stands in need of research and study as he thinks he has been badly neglected by the scholars and the critics since the time when Shibli's "Mawazana-i-Anis-o-Dabeer" was published. With this realisation he now devoted himself to a hectic research and study of the writings of Dabeer.

He had planned to bring out all his writings along with his marsiyas in several volumes. A number of volumes have already appeared, the latest being the one consisting of his rubaiyat.

However, while still engaged in the study of Dabeer, he perhaps developed a feeling that he should not confine himself to marsiya alone. With this realisation he turned to other poets, more particularly Ghalib, in an attempt to expand the scope of his research.

In the case of Ghalib, Dr Taqi has brought out two compilations in quick succession which speak of his deep study in the field of Ghalibiyat.

In 1906 he had published his research work on Ghalib's devotional poetry in Persian and Urdu compiled under the title "Ghalib Diwan-i-Naat-o-Munqabat".

Now just after two years he has been able to bring out a collection of Ghalib's Persian verses compiled in two volumes along with his new research on those verses.

As is known to us, Ghalib attached much importance to his Persian poetry. But, ironically, his readers differed with him. They held him in high esteem and regarded him as a great poet on the basis of his Urdu poetry.

His Urdu Diwan has been among the best sellers of Urdu literature.

It has been a great source of inspiration for singers, who sung his Urdu ghazals and played a great part in popularising him, more particularly in India. To top it all, researchers and critics too concentrated more on his Urdu verses than on his Persian poetry.

But now it seems that the popularity of Ghalib's Urdu verses has reached its saturation point. Ghalib lovers are now showing signs of turning to his Persian verses with the curiosity to know about his achievements in that language.

The Ghalib Institute in Delhi is perhaps the first to realise this changing trend. It has taken the lead to bring out Ghalib's Persian works one after the other.

It has already brought out his collection of Persian masnavis along with their translations in Urdu by Zoe Ansari. The 11 masnavis included in the collection are followed by a few more poems in the form of naat, munqabat, and munajat.

Now the Institute has brought out Ghalib's collected works in Persian in two big volumes covering 1399 pages. In fact, his Persian verses are far more in number than his Urdu verses. The compiler, Syed Taqi Abedi, has collected and compiled these verses after much research.

The collection is preceded by a long article, in which Abedi has exhaustively discussed Ghalib's Persian poetry. Apart from ghazal, Syed Abedi has also cared to talk about other forms employed by Ghalib.

Perhaps he has concentrated more on his "Mairaj Nama" which he has discussed in the background of Persian mairaj namas. He has in particular referred to Iqbal's "Javaid Nama". He thinks that Iqbal may have drawn inspiration from this poem.

"Divan-i-Naat-o-Munqabat" too appears to be the outcome of Dr Abedi's strenuous research. The text is preceded by a long preface in which he has discussed Ghalib's devotional poetry.

So now we have with us Ghalib's Persian poetry brought out in different volumes after a great deal of research and after being studied in a new way.

Peerzada Salman
Daily Dawn (Karachi)
October 28, 2009

Scholars highlight marsia`s status in Urdu literature

Scholars highlighted the finer points of marsia writing and its elevated position in Urdu literature at a seminar titled "Marsia aur adab-i-aali", organised by the Urdu department of Karachi University in its arts auditorium on Tuesday.

Former chairman of the Urdu department Dr Waqar Ahmed Rizvi presided over the event.

The seminar began with the welcome address by the current chairman of the Urdu department, Dr Zafar Iqbal, to the participants and audience of the programme. Introducing the seminar's topic, he said marsia-writing was an important part of Urdu literature.

Dr Iqbal said that since Lucknow's culture was no longer in vogue, modern linguistic trends must be kept in mind while writing marsias. He said that non-serious criticism of marsia-writing was another matter that needed to be looked into.

Dr Taqi Abedi, who is settled in Canada, was the keynote speaker. His impassioned talk kept the audience glued to their seats. Dr Abedi spoke at length on the subject and quoted many a couplet and stanza from Mir Anees and Mirza Dabeer, eliciting applause from the audience.

Tracing the history of elegiac verse, Dr Abedi said Sohrab's mother wrote a marsia after her son was murdered; Amir Khusrau composed one on Multan's destruction; Umrao Qais dabbled in it too. All of this indicated that there was a rich tradition available to us.

He said in Urdu literature marsia revolves around the tragedy of Karbala. He lamented that this form of writing had not been given its due status, and told the audience that Mir Taqi Mir wrote more than 34 marsias, and Mir Anees over 213.

Dr Abedi said marsia-writing contained many essential elements of nearly all poetic genres - it had ghazal's sonority, masnavi's flow and even certain elements of an epic poem. He severely criticised those who never took such poetry with the seriousness it deserved.

In this regard, Dr Abedi quoted Altaf Husain Hali's "Muqaddama-i-Sher-o-Shaeri" in which the author had attached great importance to the genre. This made him pose a question "Why haven't experts on the subject followed that line and why haven't institutions done enough to undertake research on the topic?"

Dr Abedi claimed that Mir Anees and Mirza Dabeer had used more words in Urdu poetry than any other poet. He said Nazir Akbarabadi had written 8,500 couplets, whereas Dabeer's tally was 120,000, and Anees's 86,000.

Dr Abedi educated the students present in the auditorium on the poetic tools employed in poetry, and praised Anees and Dabeer's remarkable use of metaphors and similes.

He talked about one of Dabeer's marsias in which the poet had come up with seven metaphoric arrangements, without making them clash with one another. He said it was disheartening to know that marsia-writing was associated with only one religious order, and added that since the genre had been ignored by scholars, the institution of Imambargah had kept it alive.

Dr Abedi also spoke on the moral lessons marsia embodied, which was why its message was relevant in modern times and would remain relevant for all times to come.

Dr Sahib was unhappy with Shibli Nomani's thesis "Muwazna-i-Anees-o-Dabeer", saying Shibli had done grave injustice to Dabeer in it. Dr Shamsuddin, dean of the arts faculty, thanked the scholars and students who had gathered to take part in the seminar.

Dr Shabihul Hasan's paper was read out by the Urdu department's teacher Rahat Afshan because he could not make it to the seminar. The essay pivoted around the high moral values spread through marsia-writing. The genre originated in the subcontinent, and once Lucknow was the hub of all cultural activities in India. Then times changed, and so did literary trends.

Anees and Dabeer belonged to the Lucknow tradition. The 20th century saw the disintegration of society, and uncertainty was rife in every sphere of life. It also had its effect on literature. The marsia writers who came after Anees and Dabeer helped connect poetry to society rather than individuals. Iqbal, Safi Lucknavi, Ali Sardar Jaffery, Josh Malihabadi and Jamil Mazhari brought into the genre the issues that concerned them; Naseem Amrohvi experimented with its structure. And contemporary marsia writers brought forth political and social issues.

Dr Hilal Naqvi's paper carried profundity that everybody sensed and learned from.

He said the history of mankind was full of gory incidents. Writers tried and expressed it in their own way, but very seldom truth was represented the way it should.

He also lamented that marsia-writing had been limited to only one section of society. He said when the young ones studied it, they moved away from the genre because it was portrayed as the kind of poetry in which dead people were discussed, while ghazal was defined as conversing with a (beloved) woman and qasida was known as a poetic piece written in praise of somebody.

Dr Naqvi asked why the culture of keeping one's head high in the face of adversity was not encouraged in our society. He said man's relation with other men, with the universe and with God was the basis of marsia.

He illustrated the point by saying that today cloning, computers and nuclear technology dazzled our eyes. Man was being de-linked from civilisation and culture, and his mind was getting increasingly wayward. People were being killed in the name of religion. In such a situation marsia-writing could help mitigate the problem.

Speaking on the subject Prof Sahar Ansari said marsia had all the attributes of sublime or great literature. Karbala was a bouquet of metaphors, so much so that it had now become a metaphor itself.

He claimed that Urdu marsia had originated from Urdu poetry. He said the tussle between good and evil existed from the very beginning. Just like thesis and antithesis resulted in synthesis, Karbala too was a synthesis. He praised Mir Anees and Mirza Dabeer's intelligent use of words and said marsia-writing contained elements of epic poetry.

After the papers were read, a question-answer session was held in which Urdu department students put quite a few questions, mainly to Dr Taqi Abedi.

دائیں سے بائیں: مسعود مرزا، بیکل اتساہی، جاوید رضا، شبنم رومانی اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: نامعلوم، ضمیر جعفری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری،
ڈاکٹر عبدالرحمان عبد، نامعلوم اور پوڈیم پر تقی عابدی

دائیں سے بائیں: رضا علی عابدی، تقی عابدی اور ولی عالم شاہین

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، احمد فراز، علی اکبر

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، مظفر شکوہ اور اکبر حیدر آبادی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، مظفر شکوہ، اکبر حیدر آبادی،
خمار بارہ بنکوی، صفوت علی اور ڈاکٹر عبدالرحمان عبد

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، نامعلوم، خمار بارہ بنکوی، آغا بابر زاہد شیخ، فرحت سلطانہ

دائیں سے بائیں: صفوت علی، نامعلوم، تقی عابدی، خمار بارہ بنکوی، آغا بابر

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ساقی فاروقی اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، شوکت جعفری، ڈاکٹر جاوید اقبال، نامعلوم

دائیں سے بائیں: مسرور جاوید، شبنم رومانی، تقی عابدی، ڈاکٹر عبدالرحمان عبد

دائیں سے بائیں (استادہ) حمیرا رحمان، شمیم سلمان، سلمان ظفر، تقی عابدی، صفوت علی، نامعلوم اور فرحت زاہد، (دوسری صف بیٹھے ہوئے) دائیں سے بائیں: نامعلوم، نامعلوم، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ساقی فاروقی، (تیسری صف) دائیں سے بائیں: ڈاکٹر عبدالرحمان عبد، نامعلوم، رئیس وارثی

دائیں سے بائیں: جعفری، نا معلوم، ساجد، تقی عابدی، حمایت علی شاعر، بیگم حمایت علی،
بیگم شوکت، شوکت اور علی مومن، (بیٹھے ہوئے) خورشید

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، عروج زیدی اور ضمیر جعفری

تقی عابدی اور عقیل جعفری

دائیں سے بائیں: شکیل سندوزی، نوید، نامعلوم، سلیم، اقبال، احمد علی، اظہر، اظہر الحق، تقی، محبوب حسین

دائیں سے بائیں (استادہ) تقی عابدی، نوید، اظہر عباس، احمد علی
(بیٹھے ہوئے) محبوب حسین، شکیل سندوزی اور اظہر الحق

دائیں سے بائیں: حسن رضوی، شکیل آزاد، تقی عابدی، خلش، باقر زیدی، نسیم فروغ، کلیم، مولانا، عابد جعفری

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، حفیظ تائب، ڈاکٹر عبدالرحمان عبد

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر عبدالرحمان، نامعلوم، حفیظ تائب،
شبیہ الحسن، شہزاد انجم، پروفیسر صدیق اور تقی عابدی

حنیف اخگر اور تقی عابدی
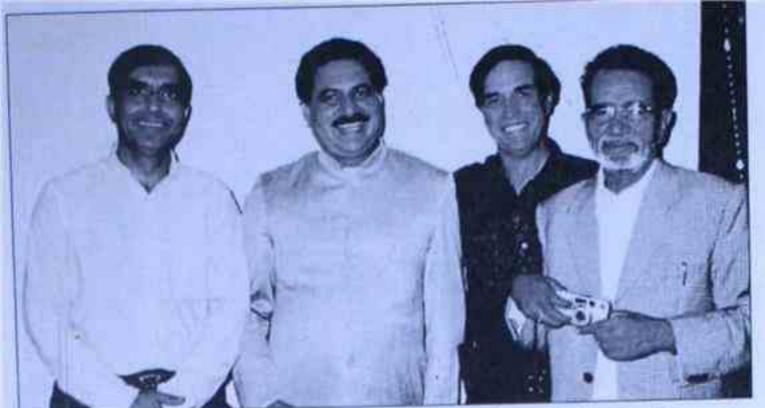
دائیں سے بائیں: لاس اینجلس میں عبدالرحمان، انور خواجہ، تقی عابدی، تابش خانزاد

کرامت گردیزی اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، شان الحق حقی، عروج زیدی
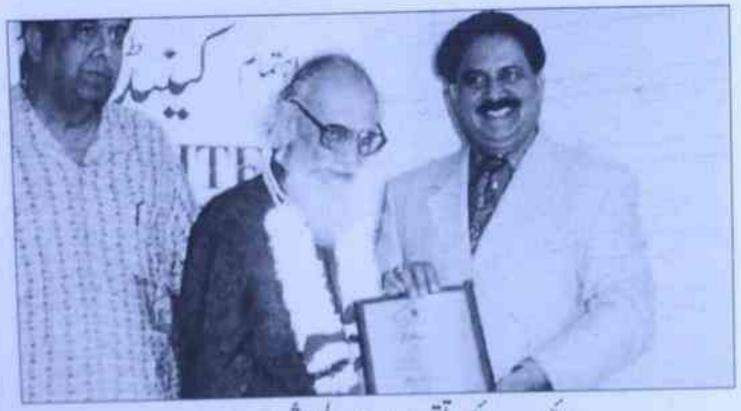
دائیں سے بائیں: امجد اسلام امجد، ڈاکٹر عبدالرحمان عبد، تقی عابدی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری
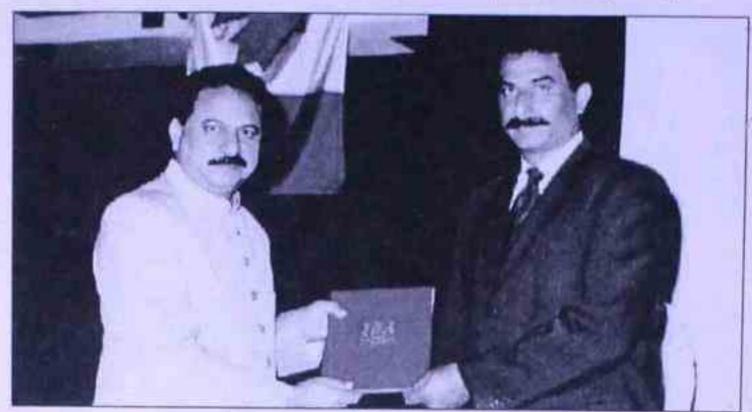
غالب اقبال اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: شمیم رجز، تقی عابدی اور سہیل عمر

دائیں سے بائیں: شجاع کامل، حیدر رضا، ضیاالدین شکیب، تقی عابدی، نامعلوم

سرفراز احمد اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: اقبال، شاکر، سلیم، نوید، تقی اور احمد

دائیں سے بائیں: (استادہ) اشفاق حسین، مہر سلطانہ، افتخار حیدر، تقی عابدی، اطہر رضوی
(بیٹھے ہوئے) ہلال نقوی، اکبر حیدری، مشکور حسین، انیس اشفاق

ڈاکٹر عبدالجلیل اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: ناصر شمسی، جاوید اقبال، تقی عابدی، رشید صدیقی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، ریاض، وجیے، پیرزادہ قاسم، وسیم بریلوی

دائیں سے بائیں: مسرور جاوید، نامعلوم، حامد امروہوی، نور امروہوی، نامعلوم، حنیف اخگر، نامعلوم، تقی عابدی، نامعلوم

دائیں سے بائیں: اطہر رضوی، تقی عابدی، حنیف اشعر اور ولی عالم شاہین

دائیں سے بائیں: رضا علی عابدی، تقی عابدی، گوندل، اطہر رضوی

دائیں سے بائیں: مہدی، تقی اور سرفراز

دائیں سے بائیں: سبزواری، تقی عابدی، پاپولر میرٹھی

دائیں سے بائیں: سردار علی، تقی عابدی اور ڈاکٹر جمیل جالبی

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، تقی عابدی، انوار احمد، وکیل انصاری، نامعلوم

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، خلیق انجم، خان صاحب

دائیں سے بائیں: وائس چانسلر یونی ورسٹی، تقی عابدی اور عمر انصاری

دائیں سے بائیں: نامعلوم، عابدی نوگانوی، تقی عابدی، عقیل جعفری

دائیں سے بائیں: نامعلوم، خلیل الرحمان، تقی عابدی، پروفیسر صدیق

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، مشکور حسین، ثریا، اطہر رضوی اور لدمیلا واسی لیوا

دائیں سے بائیں: نامعلوم، اطہر رضوی، ڈیوڈ میتھیوز، تقی عابدی، لدمیلا واسی لیوا، خان، عطاءاللہ قاسمی

دائیں سے بائیں: محمود نقوی، مہدی، تقی عابدی، وکیل انصاری

دائیں سے بائیں: نامعلوم، ہما، تقی عابدی، شاہد حسین

دائیں سے بائیں: وقارالدین، شاہد حسین، تقی عابدی، نامعلوم، ہما

دائیں سے بائیں: مسرور جاوید، باقر زیدی، تقی عابدی اور عارفہ

الہ آباد یونی ورسٹی کے وی سی تعشق لکھنوی کی رونمائی کرتے ہوئے۔
رجسٹرار ادونی، ''چوں مرگ آید'' کی رونمائی کرتے ہوئے۔
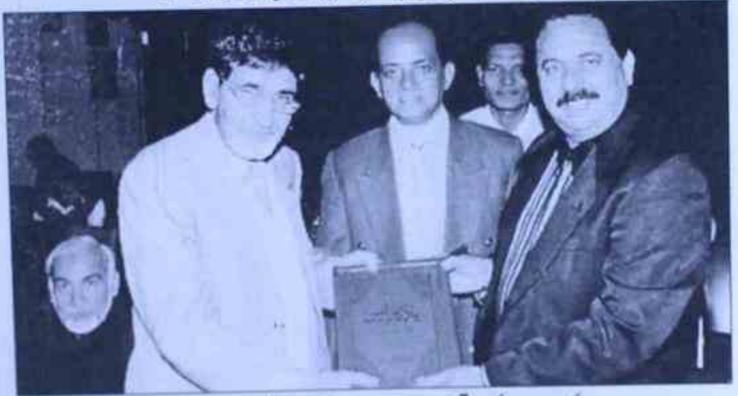
دائیں سے بائیں: تقی عابدی، پروفیسر علی احمد فاطمی، زماں آزردہ
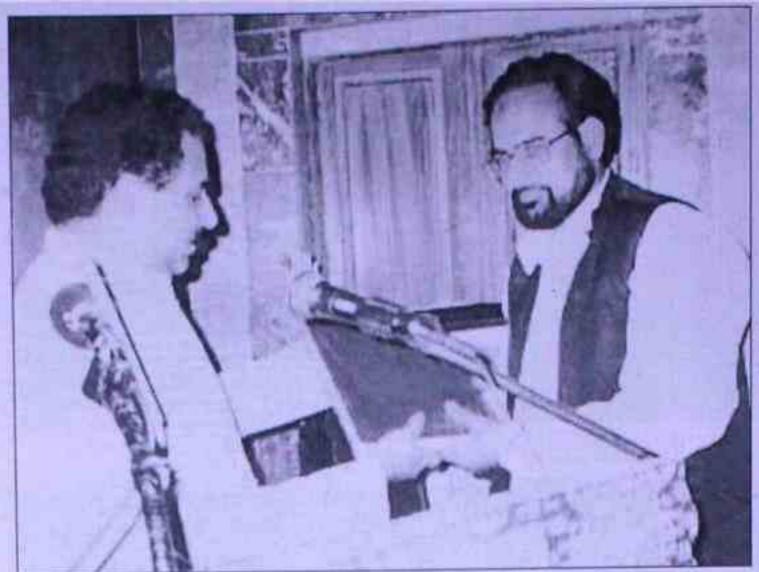
تیر اسعدی اور تقی عابدی

پروفیسر علی احمد فاطمی اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، لدمیلا واسی لیوا، ڈیوڈ میتھیوز اور مہر سلطانہ

وکیل انصاری اور ف.س. اعجاز کے ساتھ

دائیں سے بائیں: بریلوی، تقی عابدی، عبدالرحمان، اکبر حیدری، ہلال نقوی، ڈیوڈ میتھیوز،
شان الحق حقی، ڈاکٹر نارنگ، مشکور حسن، باقر زیدی، انیس اشفاق، مشکور حسین اور اطہر رضوی

دائیں سے بائیں: نسیم فروغ، ڈیوڈ میتھیوز، لدمیلا واسی لیوا اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: انیس اشفاق، تقی عابدی، ڈیوڈ میتھیوز، لدمیلا واسی لیوا اور جمال قادری
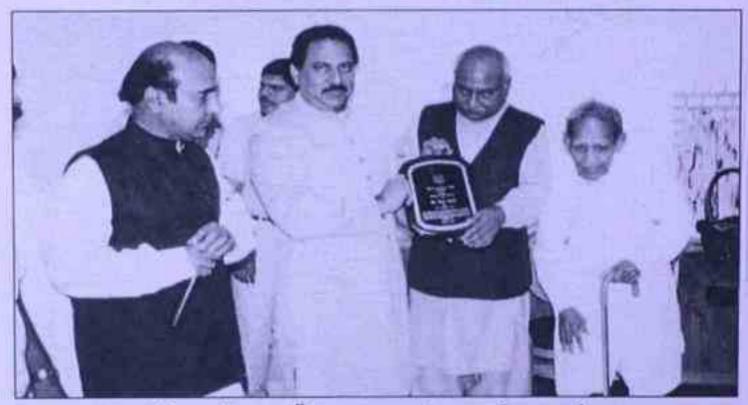
دائیں سے بائیں: سید علی رضا، باقر زیدی، تقی عابدی، نسیم فروغ

سابق وزیراعظم ہند آئی. کے. گجرال کے ساتھ

"تجزیہ یادگارِ انیس" کی رونمائی
بدست سابق وزیراعظم ہند آئی. کے. گجرال، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور تقی عابدی

شجو صراف اپنی کتاب پیش کر رہے ہیں

''یادگارِ انیس'' کی رونمائی بدست سابق پریزیڈنٹ پاکستان، نامعلوم، ملک صاحب، تقی عابدی

شہزاد انجم کے ساتھ

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، شبیہ الحسن اور شہزاد انجم

تقی عابدی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری

دائیں سے بائیں بلال نقوی، کاظمی، تقی عابدی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، افتخار احمد اور سحر انصاری

دائیں سے بائیں: بلال نقوی، کاظمی، تقی عابدی

دائیں سے بائیں (ایستادہ): مسعود خان، نامعلوم
(بیٹھے ہوئے) نظام الدین مقبول، تقی عابدی، شان الحق حقی، منیف اشعر، عابد جعفری
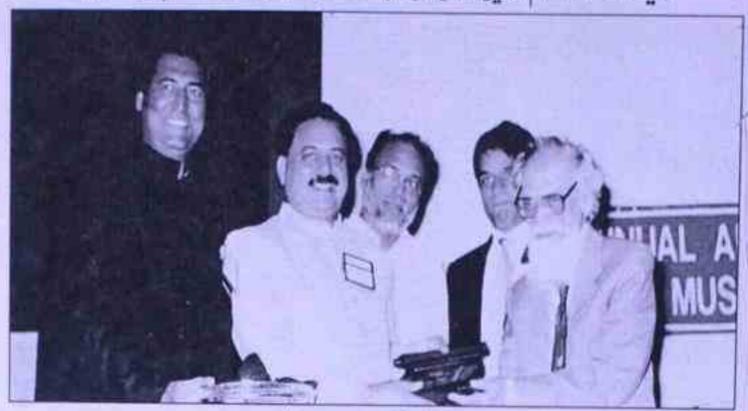
دائیں سے بائیں: شان الحق حقی، عابد جعفری، تقی عابدی، مسعود خان

وزیر آغا کے ساتھ

دائیں سے بائیں: حامد امروہوی، حنیف اخگر، نورامروہوی، تقی عابدی

جعفری نقوی کے ساتھ

انتظار حسین کے ساتھ

یاسر خالد کے ساتھ

سعادت سعید کے ساتھ

شاہد مہدی کے ساتھ

ٹورنٹو کے میر (Mayor) کے ساتھ

دائیں سے بائیں: کیول دھیر، تقی عابدی، ڈاکٹر نارنگ

دائیں سے بائیں: زیدی، اشفاق حسین اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، گوندل، خلیق انجم

باقر زیدی کے ساتھ

تقی عابدی اپنے میں آفس میں
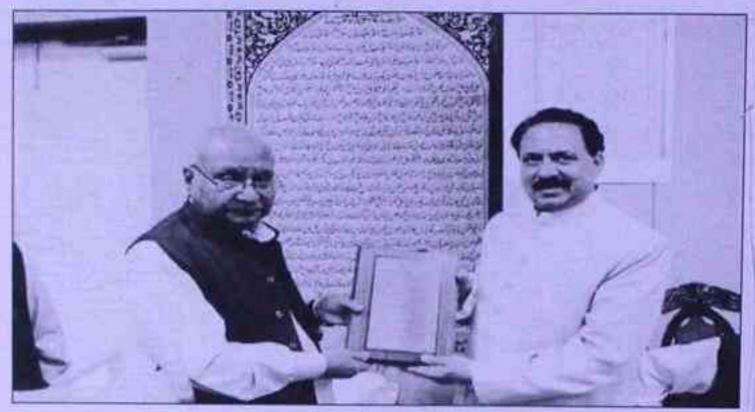
دائیں سے بائیں: حمایت علی شاعر، نامعلوم، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پیرزادہ قاسم اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، انتظار حسین، سلیم اختر، شبیہ الحسن

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، حمایت علی شاعر، سلیم اختر، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
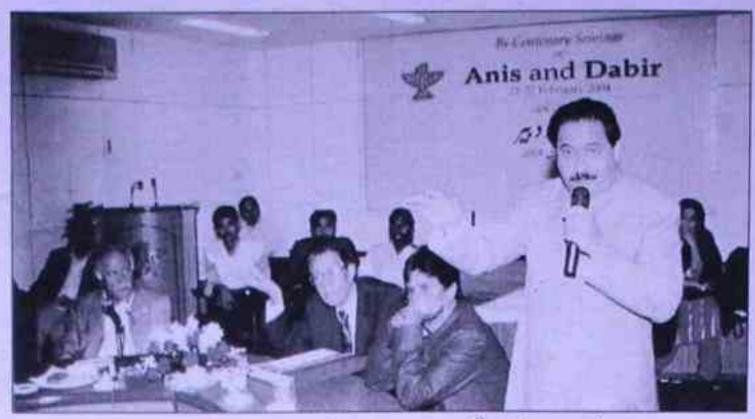
دائیں سے بائیں: تقی عابدی، نا معلوم، مشکور حسین، رضا علی عابدی

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر نارنگ، شارب ردولوی، تقی عابدی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر نارنگ

مولانا جواد صادق، تقی عابدی، نامعلوم

شارب ردولوی کے ساتھ

دائیں سے بائیں: مراد آباد کے مدرسے میں پرنسپل کے ساتھ

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، مہر سلطانہ، ضمیر جعفری، علوی، نامعلوم

طرزی صاحب کے ساتھ

پریمی رومانی اور تقی عابدی "عالمی میراث" کی رونمائی کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، مرغوب عابدی اور ریاض نوگانوی

حیدرآباد ٹنڈو (پاکستان) میں بیگ صاحب کے ساتھ

دائیں سے بائیں: عالیہ امام، نیّرآپا، سفیر پاکستان، گوپی چند، گلزار دہلوی، تقی عابدی

گوندل کے ساتھ

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، وکیل انصاری، تقی عابدی، جم کیری گن

وکیل انصاری کے ساتھ

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، صادق اور ڈاکٹر نارنگ

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، صادق، گوپی چند، عالیہ امام، شاہد مہدی، شین کاف نظام

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، صادق، عالیہ امام، محمود نقوی، شین کاف نظام

دائیں سے بائیں: اکبر حیدری، مولانا اطہر لکھنوی، تقی عابدی، نیر مسعود

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سہیل آفندی، ڈاکٹر قمر رئیس

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، جاوید، شارب ردولوی، حمایت علی شاعر، ڈاکٹر نارنگ، سہیل آفندی

دائیں سے بائیں: مولانا کلب صادق، اکبر حیدری، تقی عابدی، نیر مسعود
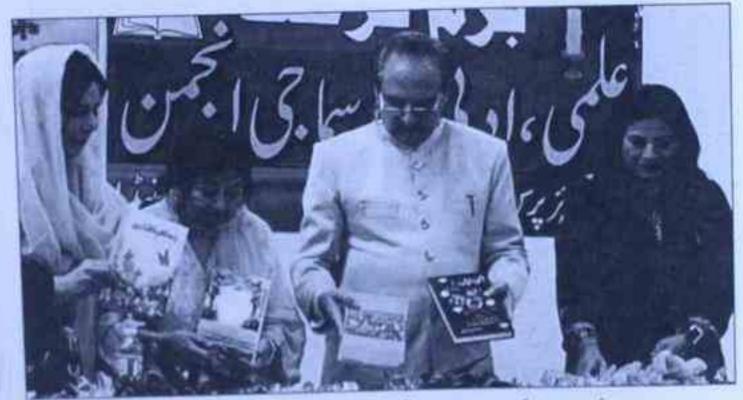
دائیں سے بائیں: تقی گلبر گوئی، تقی عابدی، جاوید

دائیں سے بائیں: نسرین سید، تقی عابدی، منور جہاں و فرحت شجاعت

دائیں سے بائیں: عقیل رضوی، جج الہ آباد، فاضل احسن ہاشمی، وی سی الہ آباد یونی ورسٹی، تقی عابدی
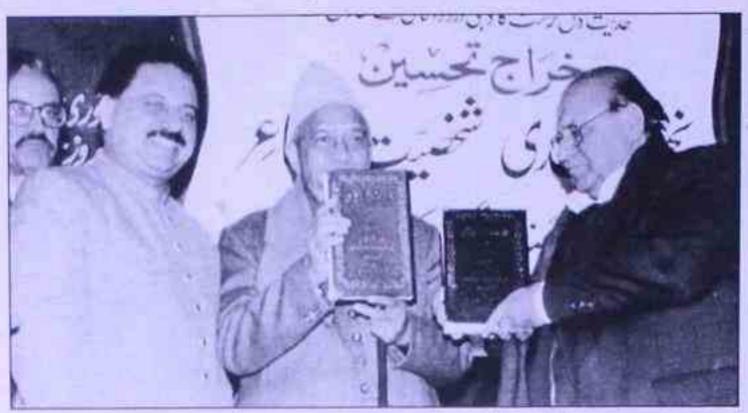
دائیں سے بائیں: ڈاکٹر نارنگ، خواجہ حسن نظامی، تقی عابدی

دائیں سے بائیں: گلزار دہلوی، عظیم امروہوی، خلیل الرحمان، تقی عابدی

دائیں سے بائیں: نامعلوم، تقی عابدی، ہلال نقوی

''کائناتِ نجم'' کی رونمائی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ساتھ
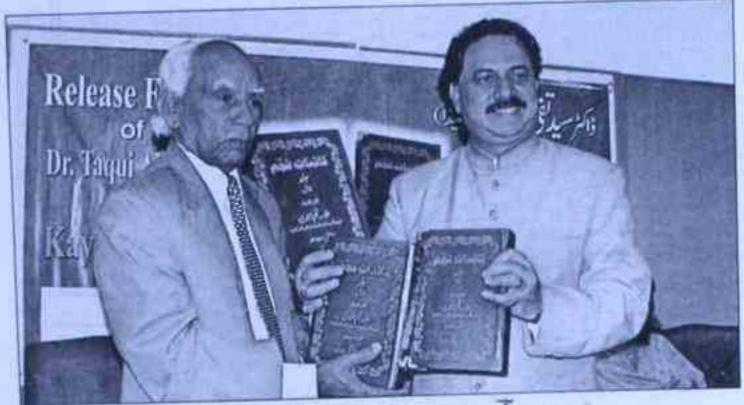
دائیں سے بائیں: شاہدہ حسن، سحر انصاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، شاہدہ حسن، سحر انصاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نا معلوم

دائیں سے بائیں: اطہر حسنین، حمید رضوی، تقی عابدی، نواسے نجم آفندی، نا معلوم

افتخار صاحب رپوٹر
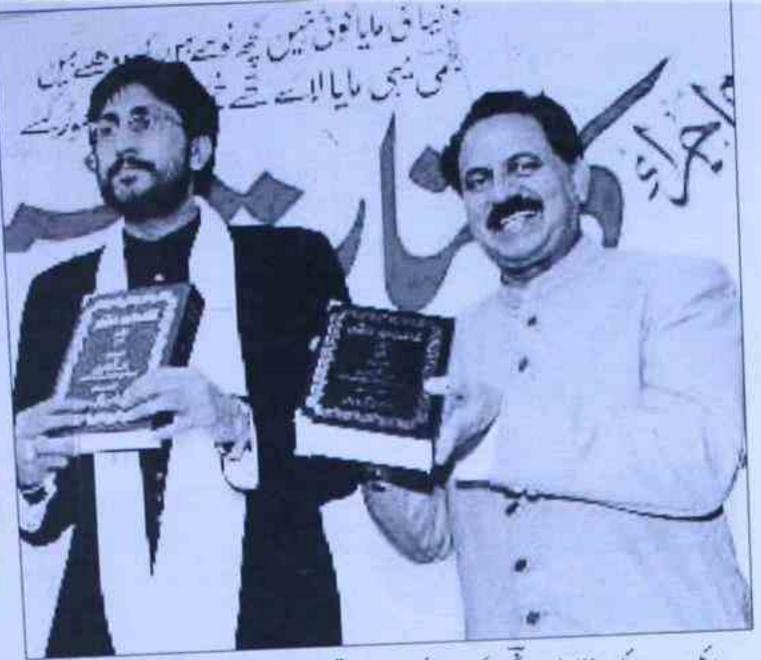
دائیں سے بائیں: ''کائناتِ تجسم'' کی رونمائی دوبئی میں، تقی عابدی اور مولانا یعسوب عباس لکھنوی
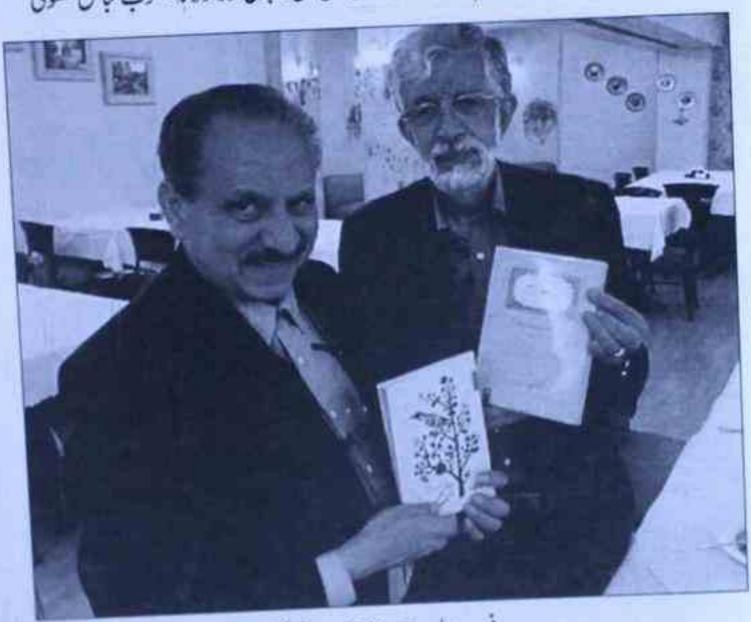
پروفیسر عادل نے اپنی کتابیں پیش کی

دائیں سے بائیں: طرزی، تقی عابدی، عاشور کاظمی، احمد فراز، ریحان اعظمی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، احمد فراز اور وزیر فاطمی

محمد خان استقبال کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: عظیم امروہوی، تقی عابدی، ریحان اعظمی
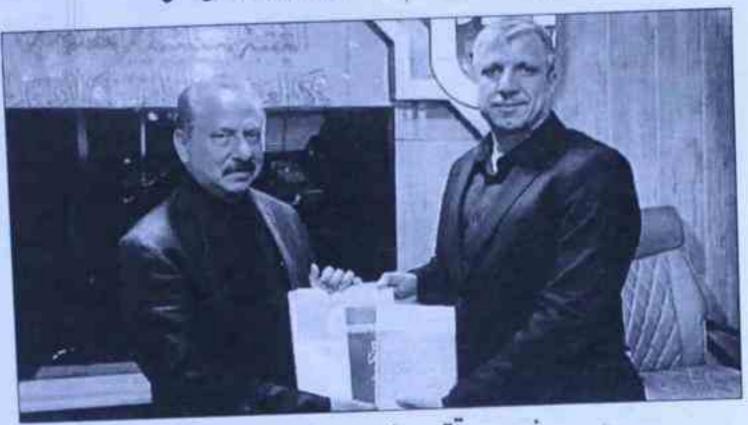
پروفیسر موسوی، تقی عابدی کو کتابیں پیش کرتے ہوئے

حیدرآباد ایسوسی ایشن ٹورنٹو

دائیں سے بائیں: میر (Mayor) مسی ساگا، بشیر بیگ، تقی عابدی، ایوب پٹھان

عالمی مشاعرے ایوان غالب میں تقی عابدی

''دیوانِ نعت منقبت غالبؒ'' کی رونمائی

دائیں سے بائیں: ارجن سنگھ، قریشی، امیر حسن عابدی اور تقی عابدی

عمر انصاری، تقی عابدی

''دیوانِ نعت منقبت غالب'' کی رونمائی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، نامعلوم، یحییٰ نشیط، کوکب مرزا، نامعلوم، ف۔س۔اعجاز

رونمائی ''دیوانِ نعت منقبت غالب''، دائیں سے بائیں: تقی عابدی، بنگال اسپیکر ہاشم عبدالحلیم اور یحییٰ نشیط

دائیں سے بائیں: عاشور کاظمی، تقی عابدی، عظیم امروہوی، نیّر جلال پوری

دائیں سے بائیں: عبدالجلیل، تقی عابدی، عبدالوہاب

تقی عابدی صاحب سامعین سے خطاب کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: گورنر اے آر قدوائی، امیر حسن عابدی، تقی عابدی، گلزار دہلوی، صدیق الرحمٰن قدوائی

تقی عابدی افتتاحی خطبہ

دائیں سے بائیں: ندیم سید، عبدالجلیل، ڈاکٹر نارنگ، تقی عابدی، نامعلوم

دائیں سے بائیں: ثریا، نذیر، تقی عابدی، صدف، نامعلوم، عارف نقوی

نذیر ساحل کے ساتھ

دائیں سے بائیں: صحافی، تقی عابدی، عبدالجلیل پٹھان

دائیں سے بائیں: درخشاں، شکیلہ رفیق، عبدالجلیل، تقی عابدی، کرامت غوری، پرویز سامی

دائیں سے بائیں: وکیل انصاری، نامعلوم، ندیم سید، تقی عابدی، عبدالجلیل، ڈاکٹر نارنگ، خلیل الرحمان
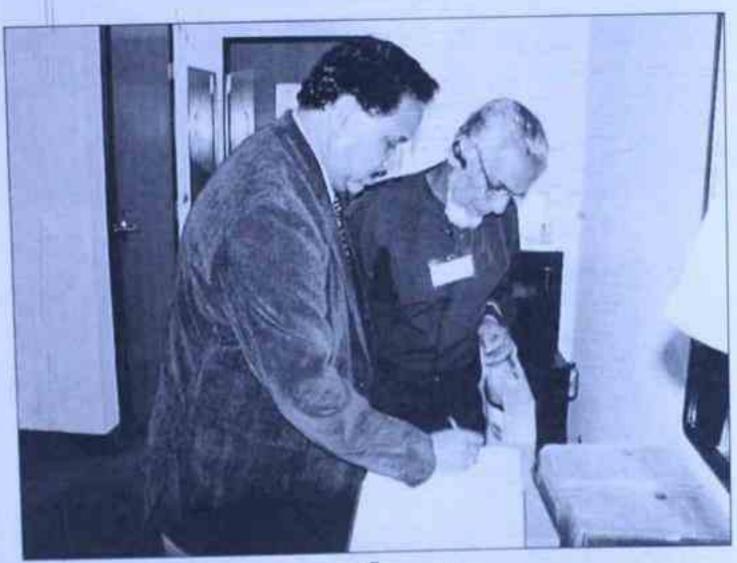
محمد خان اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر باری، معصوما عابدی، گیتی عابدی اور تقی عابدی

ٹورنٹو میں ایوارڈ لیتے ہوئے
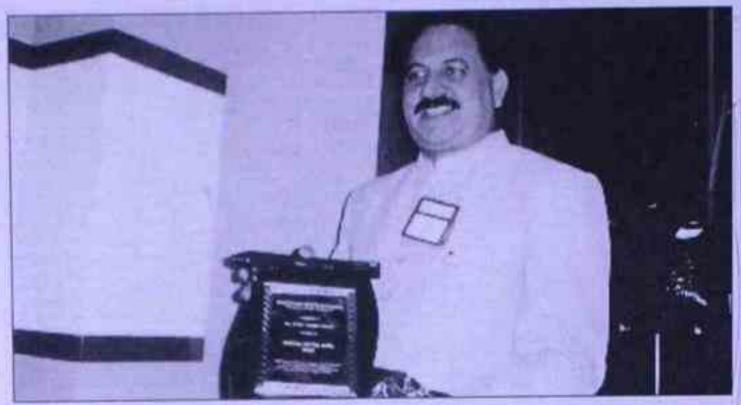
دائیں سے بائیں: ڈاکٹر عبدالرحمان عبد، گیتی عابدی، تقی عابدی، تابش خان زاد، انور خواجہ

دائیں سے بائیں: نیرّ آپا، تقی عابدی، مہر سلطانہ، گیتی عابدی، نامعلوم

''چوں مرگ آمد'' اور ''تعشق لکھنوی'' کی رسم رونمائی

دائیں سے بائیں: انیس اشفاق، وائس چانسلر یونی ورسٹی، تقی عابدی، عمر انصاری، نامعلوم

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، نامعلوم، ڈاکٹر تارنگ، مشکور حسین

عالمی مشاعرہ پڑھتے ہوئے
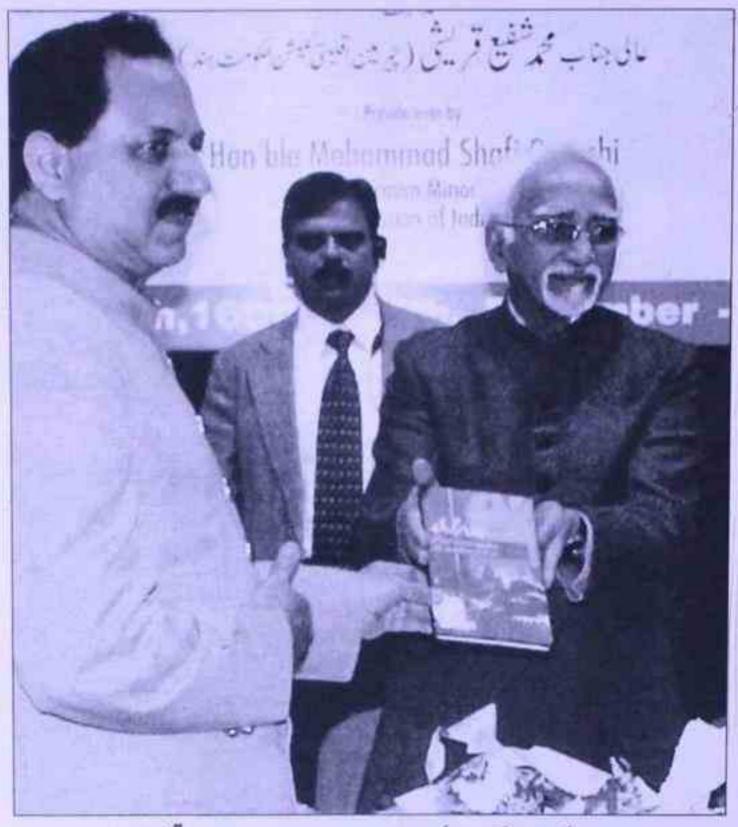
''چوں مرگ آمد'' کی رونمائی، نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری، تقی عابدی

نیویارک میں ڈاکٹر عبدالباری، علی گڑھ المنائی ایوارڈ پیش کرتے ہوئے، ڈاکٹر حیدر کے ساتھ
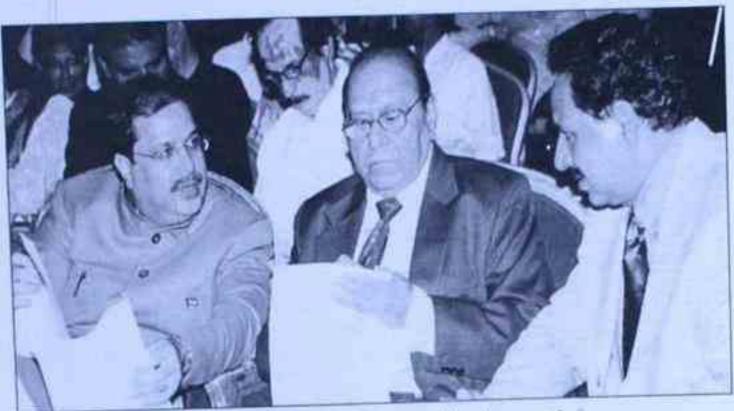
دائیں سے بائیں: تقی عابدی، ڈاکٹر نارنگ، اوصاف سعید

دائیں سے بائیں: رویا عابدی، گیتی اور تقی عابدی

رونمائی "دیوان فارسی غالب"

دائیں سے بائیں: شاہدہ عباسی، حسن حائری، تقی عابدی، رئیس سازمان اور سفیر انڈیا سنجے سنگھ

دائیں سے بائیں: شاہدہ عباسی اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، رئیس سازمان اور سفیر انڈیا سنجے سنگھ

"کلامِ انیس" کی رونمائی، دائیں سے بائیں: میم افضل، فاروق ارگلی اور تقی عابدی
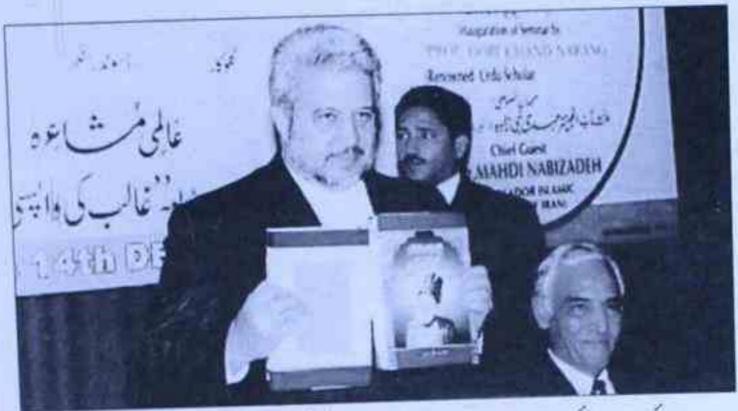
دائیں سے بائیں: سفیرِ ایران نبی زادہ "کلیاتِ غالبؔ فارسی" کی رونمائی کرتے ہوئے

نبی زادہ اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، تجمل حسین اور محمد شاہ

عالمی مشاعرہ پڑھتے ہوئے

دائیں سے بائیں: محمد شاہ، نور امروہوی، حامد امروہوی، نا معلوم، حنیف اخگر، نا معلوم، تقی عابدی

حیدرآباد میں ڈاکٹر جاوید اور پروفیسر مجید بیدار کے ساتھ

دائیں سے بائیں: ہمن شاہ، تقی عابدی، ارم قادری

مرثیہ کانفرنس کراچی یونی ورسٹی، دائیں سے بائیں: نامعلوم، ڈاکٹر ظفر اور تقی عابدی
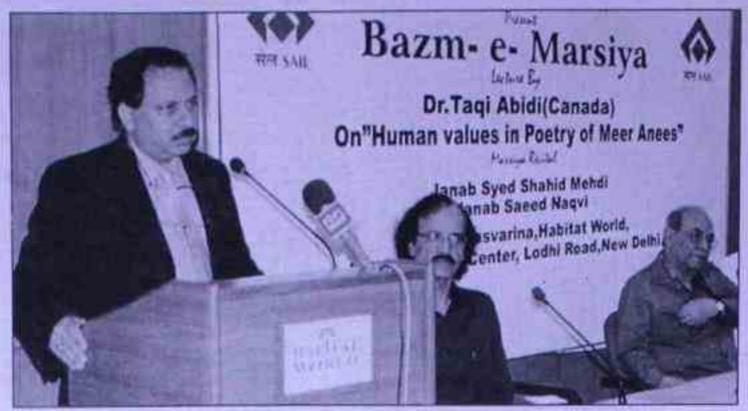
دائیں سے بائیں: شاہد مہدی، عظیم امروہوی، تقی عابدی

دائیں سے بائیں: گلشن کھنہ، تقی عابدی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
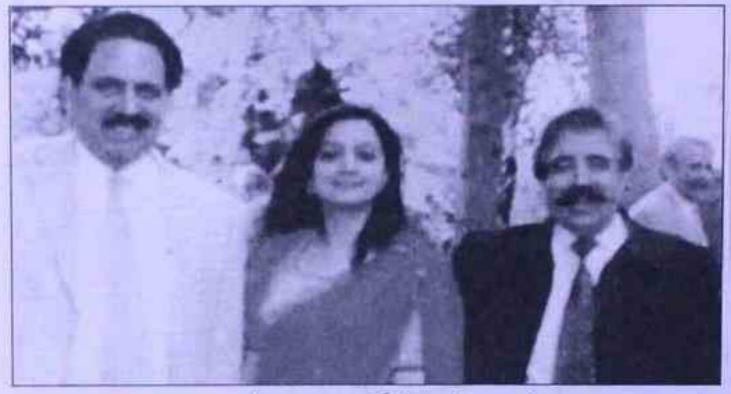
دائیں سے بائیں: پرنس شکیل، ارم بتول اور تقی عابدی

''دیوانِ غالب'' کی رونمائی، دائیں سے بائیں: تقی عابدی، وی سی کشمیر یونی ورسٹی، اکبر حیدری

حسنین وال جی، تقی عابدی

نورامروہوی، تقی عابدی

(سپاس نامہ لیتے ہوئے) دائیں سے بائیں: اکبر حیدری، تقی عابدی، وی سی کشمیر یونی ورسٹی اور ظفر حیدری

دائیں سے بائیں: نذیر، تقی عابدی، صدف مرزا، عارف نقوی

ہائیڈل برگ میں

دائیں سے بائیں: زیبا، ارم قادری، تقی عابدی، شہزاد ارمان اور صدف مرزا

دائیں سے بائیں: اقبال حیدر، نا معلوم، تقی عابدی اور شکیل خان

ایرانی فرہنگ کے رئیس کے ساتھ

دائیں سے بائیں: کیانی، شہزاد، تقی عابدی، شفیق مراد

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، ابوالحسن نغمی، بیگم یاسمین نغمی، ستیہ پال آنند اور مونا شہاب

"جشن گلزار" جموں یونی ورسٹی، دائیں سے بائیں: تقی عابدی، ڈاکٹر شہاب ملک،
جناب گلزار صاحب، وائس چانسلر منوج دھر اور ڈاکٹر شہناز قادری

دائیں سے بائیں: عمر فاروق، تقی عابدی، عارف نقوی

دائیں سے بائیں: نذیر، تقی عابدی، عارف نقوی، صدف مرزا

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، گلزار دہلوی کے ساتھ

خواجہ معین الدین چشتی میں علمائے ایران اور وائس چانسلر ماہ رخ مرزا کے ساتھ

زہرا جبیں اور ڈاکٹر گوپی چند کے ساتھ
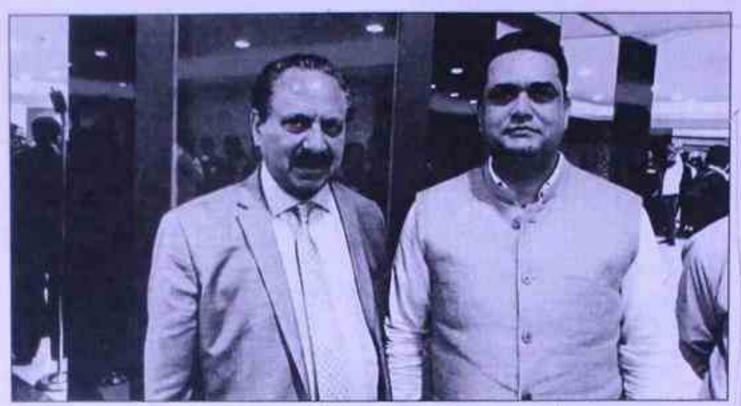
دہلی میں NCPUL کے چیئرمین ڈاکٹر شاہد اختر کے ساتھ

نیویارک میں ڈاکٹر گوندل، ڈاکٹر آفتاب چودھری اور ڈاکٹر فریدہ چودھری
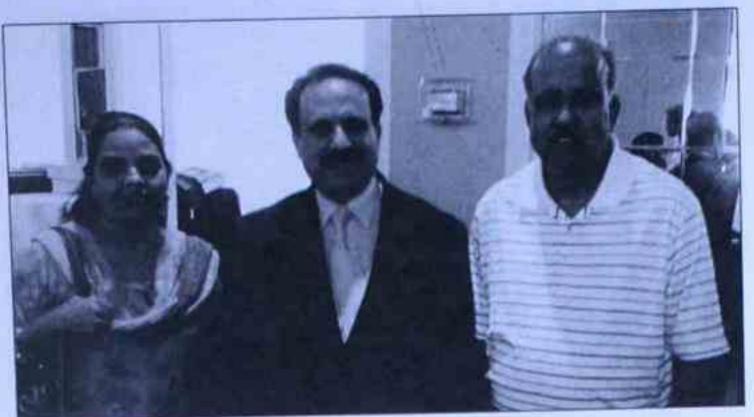
ہیوسٹن میں پروفیسر جعفری اور عشرت آفرین کے ساتھ

استنبول کانفرنس میں پروفیسر خولجہ اکرام الدین، عروج راج پوت، لدمیلا واسی لیوا کے ساتھ

معروف نعت گو صبیح الدین رحمانی کے ساتھ
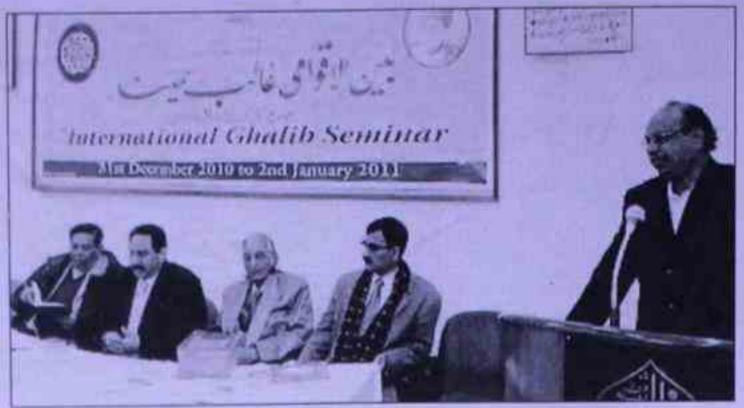
دائیں سے بائیں: ڈاکٹر شجاع کامل، حیدر رضا، کمال صدیقی، تقی عابدی، شاہد ماہلی

تقی عابدی عالمی مشاعرے میں کلام سناتے ہوئے

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر شجاعت، بیگ احساس، نامعلوم، فاطمہ پروین، ضیاء الدین، تقی عابدی

فیض صدی کی پہلی تقریب، تقی عابدی، ضیاالدین شکیب صاحب

دائیں سے بائیں: نامعلوم، تقی عابدی، پروفیسر تقی خان، بیگ احساس اور شجاعت راشد

سرپرست اقبال اکاڈمی حیدرآباد وکیل غلام یزدانی کے ساتھ
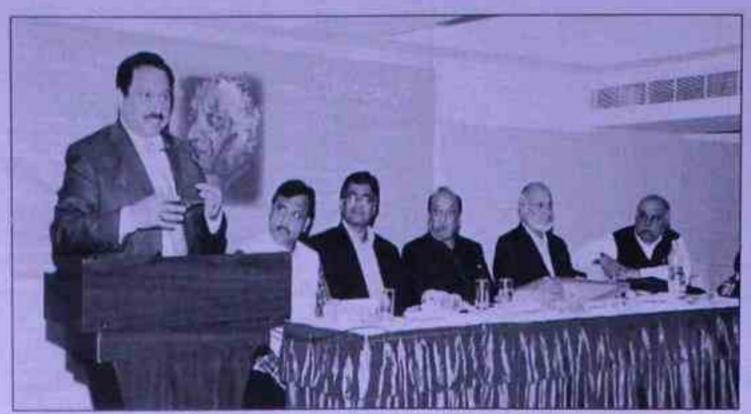
ضیاء الدین شکیب، ڈاکٹر شجاعت راشد اور تقی عابدی کے ساتھ

ڈاکٹر فاطمہ پروین اور ضیاء الدین شکیب

کلکتہ گرلس کالج میں توسیعی لکچر، پروفیسر نعیم انیس

جوبلی ہلیز حیدر آباد میں عثمانیہ یونی ورسٹی کی 90 سالہ تقریب
دائیں سے بائیں: تقی عابدی، شکیب، وائس چانسلر عثمانیہ یونی ورسٹی، ڈاکٹر منان اور انصاری

پونہ میں اُردو کانفرنس، ستار رودلوی اور صاحب کے ساتھ

اعظم کیمپس، دائیں سے بائیں: ممتاز پیر بھائی، منور پیر بھائی،
تقی عابدی، عابدہ انعام دار، ڈاکٹر شجاع علی کامل، واحد لاساز

ڈاکٹر فاضل حسین کے ساتھ
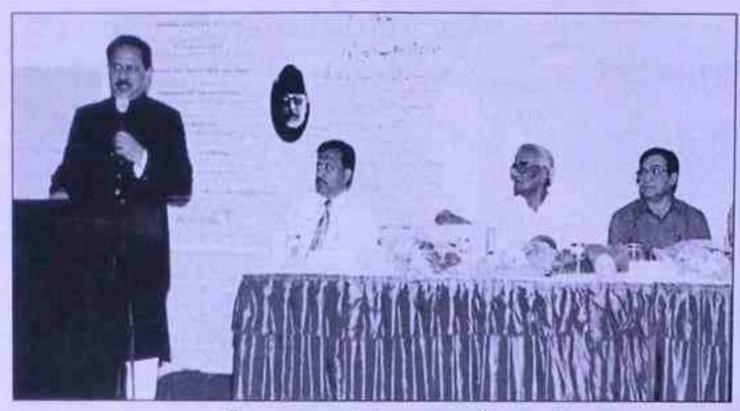
دائیں سے بائیں: نامعلوم، مجتبیٰ حسین، شجاعت اور تقی عابدی
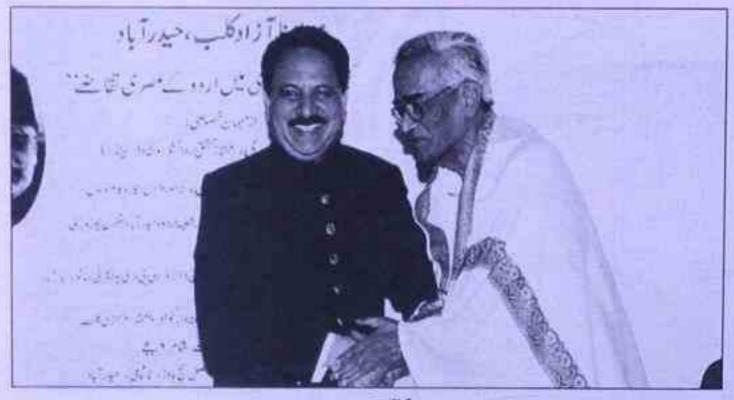
پدم شری مجتبیٰ حسین کے ساتھ

وائس چانسلر عثمانیہ یونی ورسٹی راؤ، تقی عابدی کو ایوارڈ پیش کرتے ہوئے

خواجہ معین الدین چشتی یونی ورسٹی میں وائس چانسلر ماہ رخ مرزا تقی عابدی کا استقبال کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: قمر سلطانہ، محمدی آپا، تقی عابدی، مجتبیٰ حسین، اصغر عابدی، سرفراز

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور خالد عرفان کے ساتھ

ابوالکلام قاسمی رونمائی ''فیض فہمی'' کرتے ہوئے، شاہد ماہلی موجود ہیں

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، پیرزادہ قاسم، جسٹس کاٹجو، وسیم بریلوی

دائیں سے بائیں: فاروق، احمد فاطمی، تقی عابدی، پاشا، ایم پی

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر نارنگ، وکیل انصاری، ڈاکٹر منیزہ ہاشمی، تقی عابدی، گیتی عابدی

اُردو کانفرنس نیویارک کی شمع روشن کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر عبدالرحمان، ڈاکٹر نارنگ، ڈاکٹر منیزہ ہاشمی، وکیل انصاری، تقی عابدی

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر صادق، ڈیوڈ میتھیوز، ڈاکٹر منیزہ ہاشمی، ڈاکٹر نارنگ، تقی عابدی

NCPUL کے جلسہ کا افتتاح، پروفیسر شیخ عقیل، تقی عابدی، نامعلوم، چیئرمین ڈاکٹر شاہد اختر اور منسٹر

NCPUL کا ایوارڈ لیتے ہوئے

جموں یونی ورسٹی میں، دائیں سے بائیں: پروفیسر ریاض احمد، ڈاکٹر شہناز قادری، ڈاکٹر عنایت ملک، نامعلوم، وی سی شرما، تقی عابدی

سفیر محترم قطر اور محمد عتیق کے ساتھ

لاس اینجلس مشاعرے میں ایوارڈ حاصل کرنے سے پہلے، افتخار عارف اور تقی عابدی

دوحہ مشاعرے میں پیرزادہ قاسم کے ساتھ

دوحہ میں "فیض فہمی" کی رونمائی

دائیں سے بائیں: بخاری، سفیرِ ہند، سفیرِ پاکستان، عزت مآب شیخ، محمد عتیق، تقی عابدی

کونسل جنرل غالب اقبال کے ساتھ
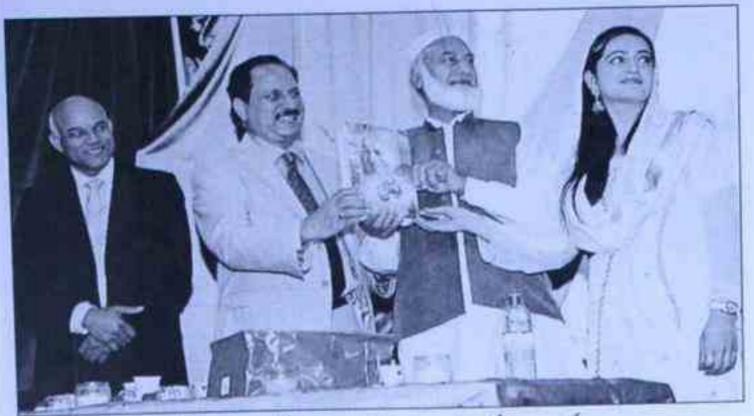
دائیں سے بائیں: ارم بتول، خان صاحب، تقی عابدی، کیانی

دائیں سے بائیں: فرزانہ خان، ارم بتول، مہ جبین، صدف مرزا، محمود، تقی عابدی

انگلینڈ کے مشاعرے میں

ٹورنٹو میں سردار علی پینٹنگ پیش کر رہے ہیں

اظہار کا مشاعرہ

دائیں سے بائیں: رحمان خاور، ذکیہ غزل اور تقی عابدی
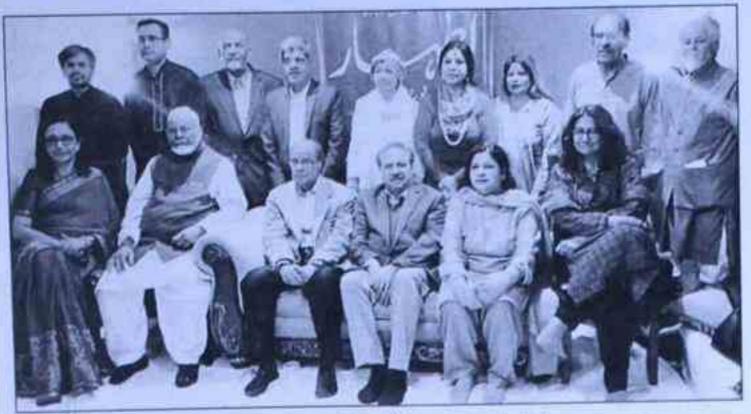
محفل شعر، ٹورنٹو، رہائش گاہ ذکیہ غزل (اظہار)

تقی عابدی الخوئی نیویارک میں

APNA مشاعرہ فلوریڈا، امریکا

دائیں سے بائیں: کشور ناہید، ندیم سید، تقی عابدی، شاہد ماہلی

غالب اکاڈمی: رونمائی "فیض فہمی"

اسلام آباد یونی ورسٹی میں اعظم خان، نا معلوم، وائس چانسلر یونی ورسٹی اور تقی عابدی

کربلا میں نوحہ پڑھتے ہوئے
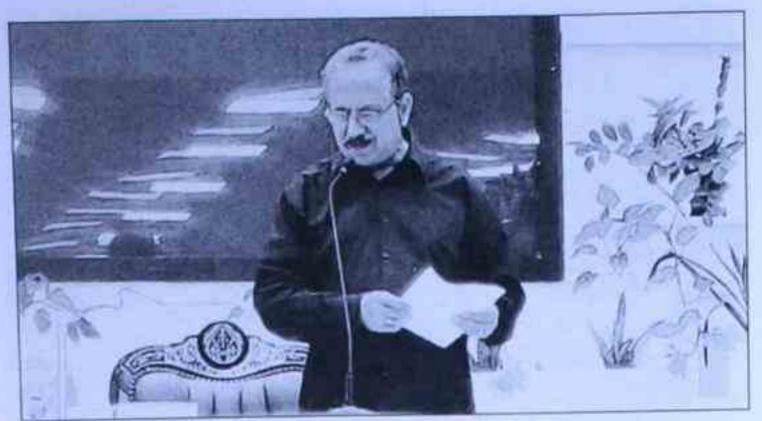
جموں یونی ورسٹی میں، دائیں سے بائیں: ڈاکٹر عنایت ملک، رجسٹرار، گلزار، تقی عابدی، خالد

دائیں سے بائیں: کوکب مرزا، تقی عابدی، نامعلوم، فرزند اعجاز، ف۔س۔ اعجاز

لندن، انگلینڈ میں ''فیض فہمی'' کی رونمائی
دائیں سے بائیں: تقی عابدی، شاہد مہدی، قدوائی، ڈائریکٹر نہرو سنٹر

نہرو سنٹر لندن میں، پروفیسر قدوائی

تقی عابدی، ڈاکٹر جاوید کے ساتھ

صدف مرزا کے ساتھ

دائیں سے بائیں: سعادت سعید، شاہد مہدی، تقی عابدی، رضا علی عابدی

دائیں سے بائیں: پیارے ہتیش، ڈاکٹر شہاب ملک، تقی عابدی، وی سی شرما، صفیر افرا ہیم اور علی جاوید
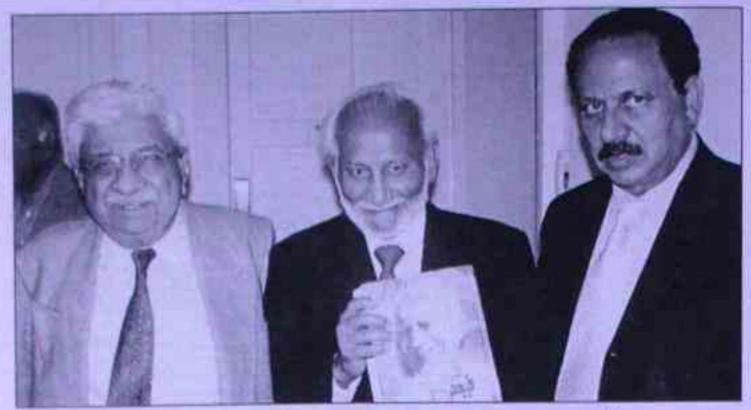
تقی عابدی، عزم صاحب اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کے ساتھ
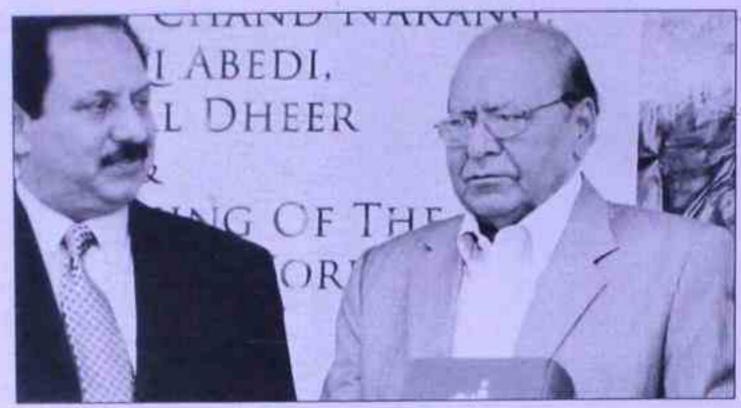
ڈاکٹر نارنگ صاحب کے ساتھ

نہرو سنٹر میں دوستوں کے ساتھ
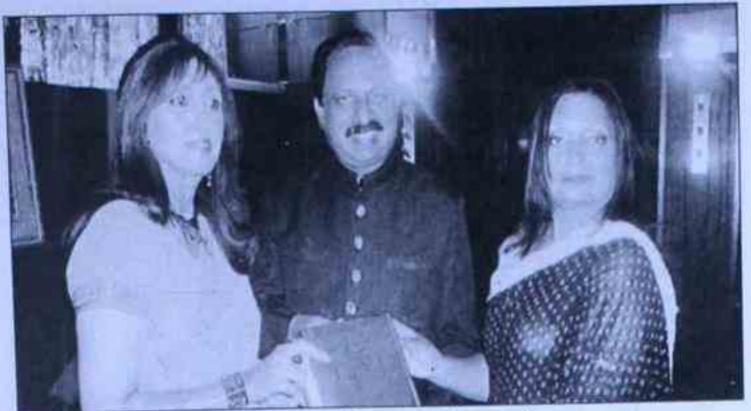
دائیں سے بائیں: ثمن شاہ، تقی عابدی، نامعلوم

برلن جرمنی میں مشاعرہ: حیدر علی عابدی کے ساتھ

جرمنی میں ادبی محفل، حیدر عابدی کے ساتھ

اورنگ آباد میں ٹی وی انٹرویو دیتے ہوئے، سرفراز عابدی کے ساتھ

عطااللہ قاسمی اور پروفیسر علی احمد فاطمی کے ساتھ

ڈاکٹر صادق حیدرآبادی کے ساتھ

دائیں سے بائیں: نسیم فریس، بیگ احساس، نامعلوم،
مجتبیٰ حسین، وائس چانسلر محمد میاں، تقی عابدی، ڈاکٹر فاطمہ پروین، ڈاکٹر شجاعت راشد

تقریب رباعیات انیس،
دائیں سے بائیں: بیگ احساس، سیدہ جعفر، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر فاطمہ پروین، تقی عابدی

صدیقی صاحب کو کتاب پیش کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، محمد میاں، مجتبیٰ حسین

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، تقی گلبرگوئی، سلطان بھائی، مصطفی موسوی
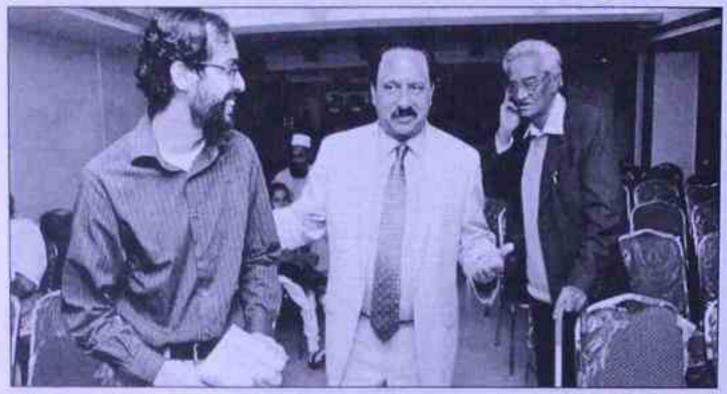
مجتبیٰ حسین اور ایوب پٹھان کے ساتھ

وائس چانسلر مانو محمد میاں کے ساتھ
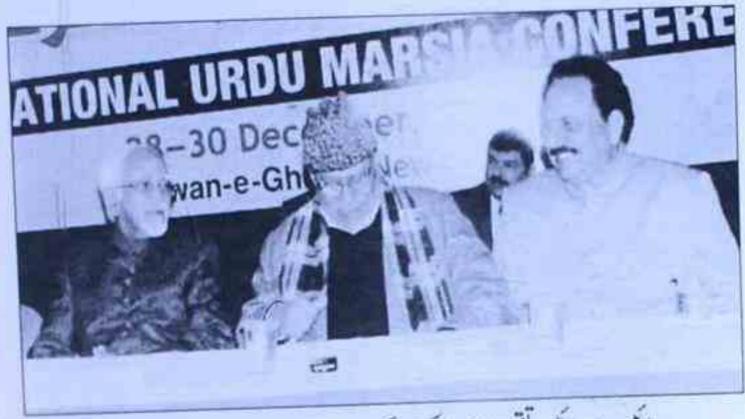
دائیں سے بائیں: تقی عابدی، ڈاکٹر نارنگ، نائب صدر جمہوریہ ہند حامد انصاری

حیدر رضا کے ساتھ

دائیں سے بائیں: حامد انصاری، گورنر رضی صاحب، قدوائی، شاہد ماہلی، حیدر رضا، تقی عابدی

دائیں سے بائیں: آزرمی دخت، نامعلوم، تقی عابدی

دائیں سے بائیں: انیس اشفاق، شاہد ماہلی، نامعلوم، آزرمی دخت، آزردہ، تقی عابدی، علی جاوید

حیدرآباد میں ڈاکٹر شکور اور دوستوں کے ساتھ

''فیض شناسی'' رونمائی، بدست وائس چانسلر نظام آباد

دائیں سے بائیں: منسٹر کانگریس، وسیم بریلوی، تقی عابدی، وزیر خارجہ ہند سلمان خورشید

دائیں سے بائیں: وسیم بریلوی، عبدالحق، عطاالحق قاسمی، تقی عابدی، ابن کنول
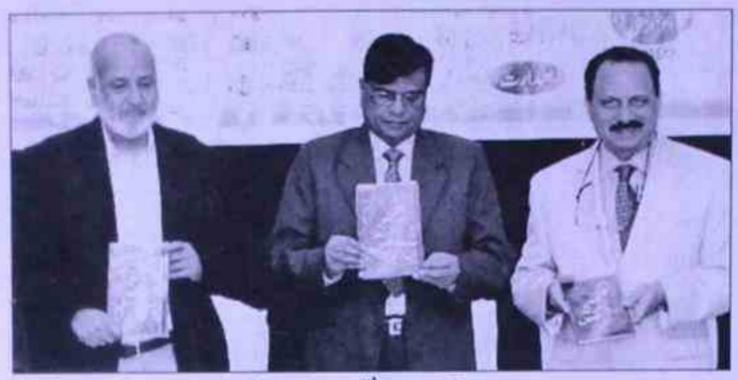
''اُردو کی دو شاہکار نظمیں'' کی رونمائی
دائیں سے بائیں: تقی عابدی، وائس چانسلر محمد میاں، ضیاالدین شکیب
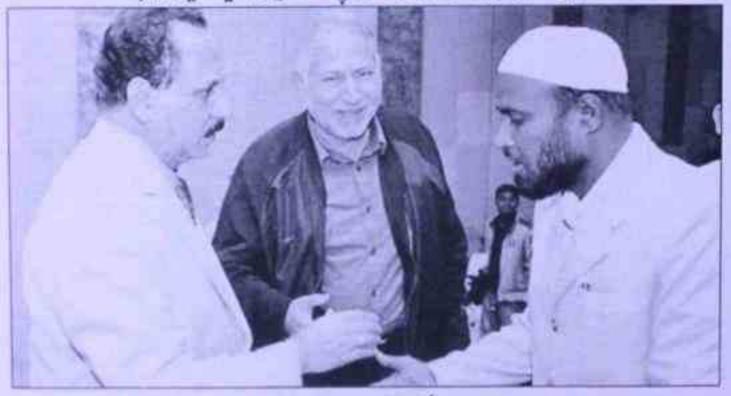
نظیر عابدی کے ہمراہ

مضطر مجاز، نظیر عابدی اور دوستوں کے ساتھ

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، شجاعت راشد، پروفیسر فضل اللہ مکرم
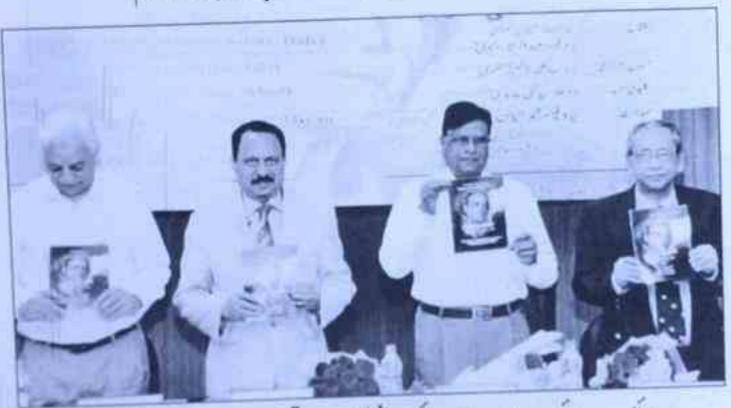
دائیں سے بائیں: ستار ردولوی، وائس چانسلر محمد میاں، تقی عابدی، پرو وائس چانسلر مانو

سردار جعفری کے بیٹے حکمت کی فیملی کے ساتھ

سردار جعفری کے بیٹے حکمت کے ساتھ

پرویز جعفری سے ایوارڈ لیتے ہوئے۔ (ہیوسٹن امریکہ)

مشاعرے کی شمع روشن کرتے ہوئے، دائیں سے بائیں: شاہد ماہلی، مضطر مجاز، تقی عابدی، حیدر رضا

دائیں سے بائیں: مجتبیٰ حسین، تقی عابدی، امجد اسلام، شمیم، اعظم کولی

دریائے نیکر کے کنارے
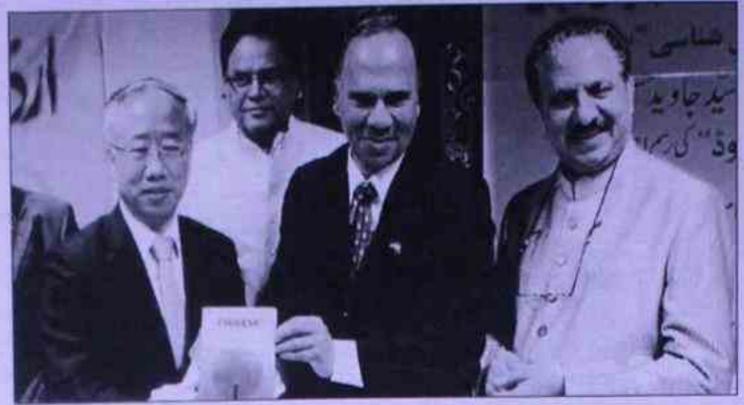
دائیں سے بائیں: تقی عابدی، سفیر محترم، اقبال حیدر، چینی سفیر

دائیں سے بائیں: افتخار حیدر، گولو صاحب،
ڈاکٹر عبدالرحمان عبد، تقی عابدی، نعمان بخاری، کرامت غوری، منیف اشعر

اقبال سیمینار میں مندوبین کے ساتھ
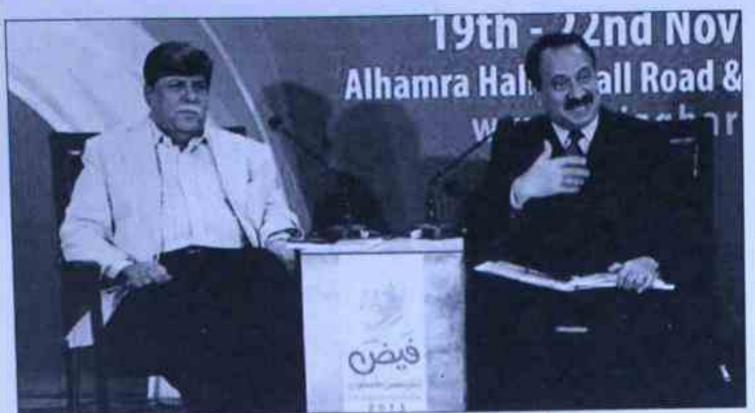
فیض میلہ لاہور، ندیم سید سے گفتگو کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، شاہد کامران، فتح محمد ملک، وائس چانسلر صدیقی، انوار احمد، نامعلوم

دائیں سے بائیں: اوپن یونی ورسٹی اقبال اسلام آباد کے وائس چانسلر صدیقی کے ساتھ
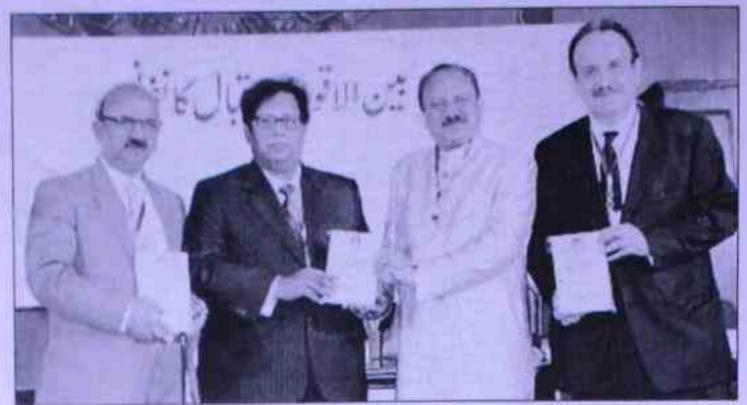
دائیں سے بائیں: منیب اقبال، تقی عابدی، شاہد کامران، صدیقی

دائیں سے بائیں: مایا، علامہ اقبال کے نواسے میاں صاحب، منیب اقبال، عمر

اورینٹل کالج لاہور میں اساتذہ کے ساتھ

اقبال سیمینار، تقی عابدی دوحہ کے اُردو دوستوں کے ساتھ

اقبال سیمینار دوحہ

اقبال سیمینار دوحہ

فرینکفرٹ جرمنی میں مشاعرہ، دائیں سے بائیں: اقبال حیدر، تقی عابدی، کونسل محترم

ویلفیئر ہیومن ایسوسی ایشن محفل مشاعرہ فرینکفرٹ، دائیں سے بائیں: تقی عابدی، اقبال حیدر، کونسل محترم

باصر کاظمی کے ساتھ

داغ دہلوی سیمینار، مانو حیدرآباد، دائیں سے بائیں: تقی عابدی، وی سی پرویز، شمیم حنفی، پروفیسر نسیم

بین الاقوامی اقبال کانفرنس، دائیں سے بائیں: شاہد کامران، تقی عابدی، وی سی صدیقی

کانفرنس ساہتیہ اکادمی، دہلی، دائیں سے بائیں: ڈاکٹر نارنگ، راو، تقی عابدی

کانفرنس ساہتیہ اکادمی، دائیں سے بائیں: ڈاکٹر نارنگ، تقی عابدی، راؤ

ساہتیہ لٹریری فورم،

دائیں سے بائیں: مونارما، ڈاکٹر سیدہ سیدین، ڈاکٹر نارنگ، تقی عابدی، راؤ، چندر بھان خیال، صمد

رونمائی ''کلیاتِ حالؔی''

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر اطہر فاروقی، ڈاکٹر توحیدی، پروفیسر خواجہ اکرام الدین، تقی عابدی

تقی عابدی اساتذہ کو کتابیں پیش کرتے ہوئے
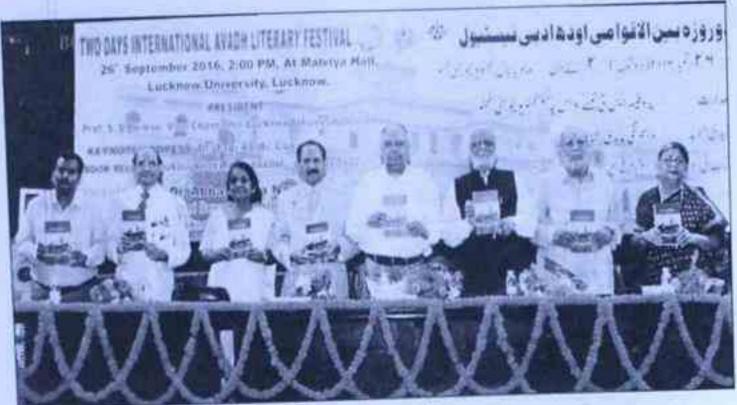
بین الاقوامی اودھ ادبی فیسٹیول

رونمائی ''مسدس حالیؔ'' ''کلیات حالیؔ اور حالیؔ''
دائیں سے بائیں: انیس اشفاق، تقی عابدی، اشرفی، وی سی معین الدین چشتی، خان صاحب

جموں وائس چانسلر منوج دھر کے ساتھ
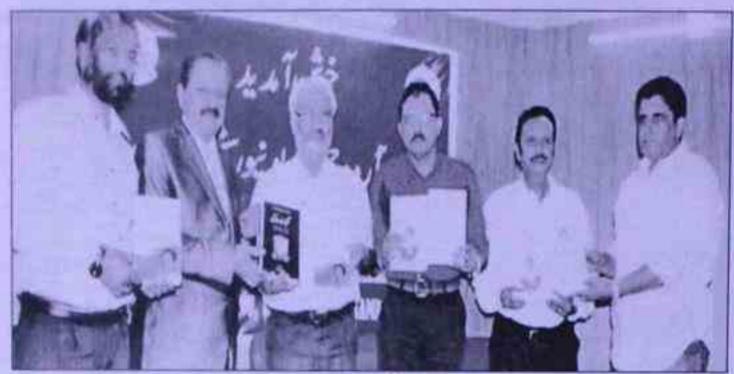
تقی عابدی کی کتابوں کی رونمائی، سابق وائس چانسلر شرما کر رہے ہیں۔ دائیں سے بائیں:
پروفیسر ریاض احمد، فضل الرحمان، ڈاکٹر شہاب ملک، وی سی شرما، تقی عابدی، پروفیسر خواجہ اکرام

تقی عابدی جموں یونی ورسٹی میں اساتذہ کے ساتھ

ٹورنٹو میں پیرفاروقی کے ساتھ

ظفر بنگش اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: نواز دیوبندی، ظل الرحمان، تقی عابدی، نامعلوم اور صبیحہ سنبھل (علی گڑھ میوزیم میں)

ورجینا امریکا میں ابوالحسن نغمی کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: ماجد دیو بندی، سیدہ حمید، تقی عابدی، اختر الواسع، نا معلوم، پروفیسر اختر

دائیں سے بائیں: عراق زیدی، تقی عابدی، کمال امروہوی، نا معلوم

توسیعی لکچر، دائیں سے بائیں: شفیع ایوبی، پروفیسر خواجہ اکرام، انور پاشا اور تقی عابدی

ماجد دیوبندی ساتھ
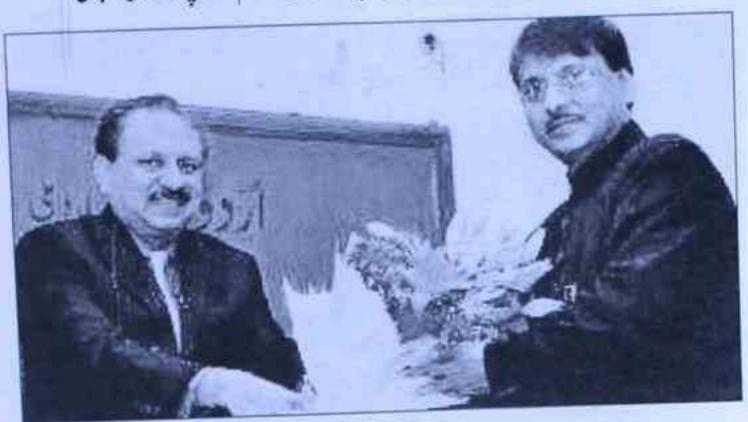
اقبال توسیعی خطبہ، ارکان اُردو اکادمی دہلی کے ساتھ

تقریب شاداں اندوری میں خطبہ پیش کرتے ہوئے
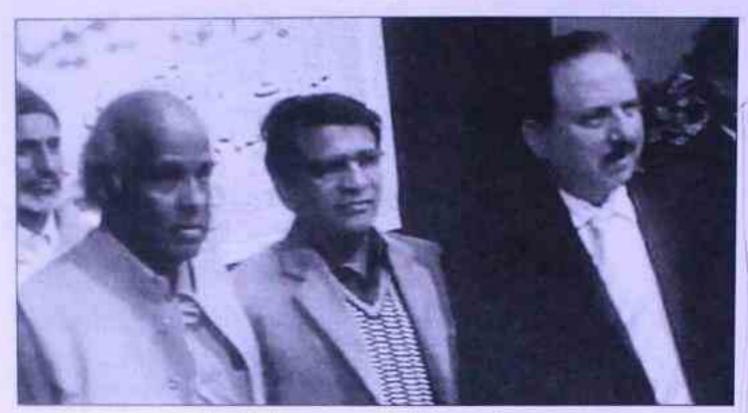
مشاعرہ شاداں اندوری میں راحت اندوری کے ساتھ

شاداں انوری سیمینار اندور، دائیں سے بائیں: فرزند راشد اندوری، نا معلوم، تقی عابدی، رشد اندوری

پونا اعظم کیمپس میں توسیعی خطبہ

منور پیر بھائی، ممتاز منور، تقی عابدی، نامعلوم، مشتاق

راسک متھرا منڈل پونا، دائیں سے بائیں: منور پیر بھائی، راسک چیئرمین، تقی عابدی، ممتاز پیر بھائی

اعظم کیمپس پونا، دائیں سے بائیں: مشتاق، ممتاز منور، منور پیر بھائی، تقی عابدی، عابدہ انعام دار

توسیعی لکچر، متھر امنڈل پونا، دائیں سے بائیں: منور پیر بھائی، چیئرمین راسک، ممتاز پیر بھائی، تقی عابدی

دائیں سے بائیں: پروفیسر خواجہ اکرام، چیئرمین ویسٹ بنگال، تقی عابدی

کلکتہ کے غالب سیمینار میں ایرانی ماہرین غالبؔ کے ساتھ

کلکتہ کے غالب سیمینار اختر صاحب اور پروفیسر خواجہ اکرام کے ساتھ

انٹیگرل یونی ورسٹی کے وائس چانسلر سید وسیم اختر کے ساتھ

انٹیگرل یونی ورسٹی کے کتب خانے میں، لائبریرین، خان صاحب، اور سید وسیم اختر کے ساتھ

انٹیگرل یونی ورسٹی لائبریرین میں قرآنی نسخہ دیکھتے ہوئے

چودھری چرن سنگھ یونی ورسٹی، میرٹھ

دائیں سے بائیں: نامعلوم، شاداب، جمشید پوری، نامعلوم، پروفیسر خواجہ اکرام

ڈاکٹر رکن الدین اسکالر کے ساتھ

Inaugral Ceremony

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، وی سی وسیم اختر، وی سی علی گڑھ یونی ورسٹی
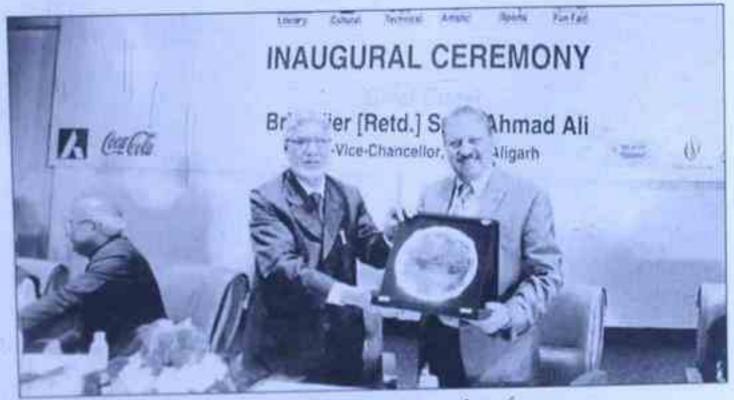
وائس چانسلر سے ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے

شاہد کامران سے ایوارڈ لیتے ہوئے

یاسر خالد اور وائس چانسلر کے ساتھ

مسز کامران، یاسر خالد اور انوار احمد کے ساتھ

ڈاریکٹر اقبال اکاڈمی سے کتاب لیتے ہوئے

ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے، ڈاکٹر رفیع ہاشمی، ڈاکٹر نوری، تقی عابدی اور ڈاکٹر محمد کامران

یوسفی لکچر کے بعد اسلام آباد کی نمل یونی ورسٹی کے لکچر ہال میں

ویمن یونی ورسٹی اسلام آباد، دائیں سے بائیں: ڈاکٹر فرحت جبین صدر شعبہ اُردو اور دیگر ارکان کے ساتھ

کراچی میں آغا طالب کو "سلام و کلام انیس" پیش کرتے ہوئے
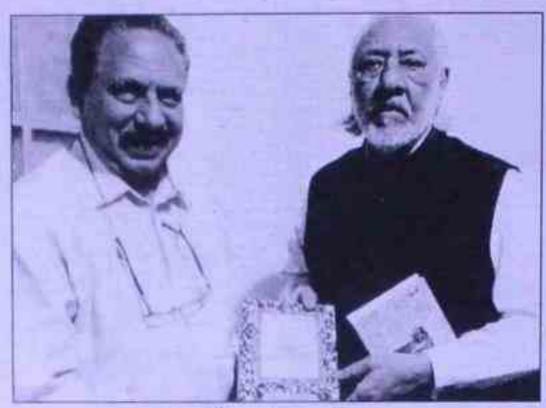
شکاگو میں، رونمائی کتاب، اُردو انسٹیٹیوٹ

دائیں سے بائیں: نیر جلال پوری، امین حیدر، تقی عابدی، صادق، غازی عابد

مشاعرہ بیاد فاروقی شکاگو، تقی عابدی امین حیدر کے ساتھ

ریحانہ قمر کے ساتھ، لاس اینجلس
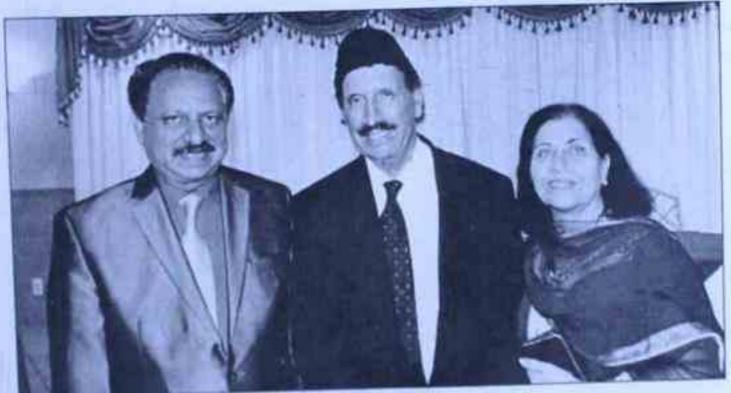
انور خواجہ اوران کی بیگم، لاس اینجلس میں
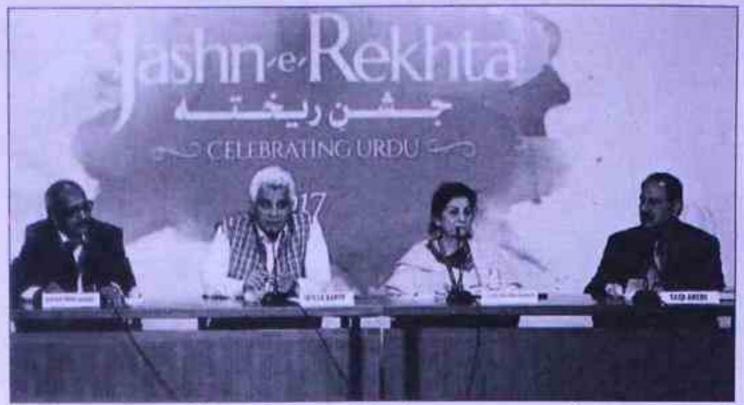
جشن ریختہ، غالب مذاکرہ، دائیں سے بائیں: تقی عابدی، سیدہ حمید، ارتضٰی کریم اور صفدر امام

ٹورنٹو: ناظم مقبول کا ''سفرنامہ غالب کے دیس میں'' رونمائی
دائیں سے بائیں: کونسل عمران صدیقی، تقی عابدی، ناظم الدین مقبول
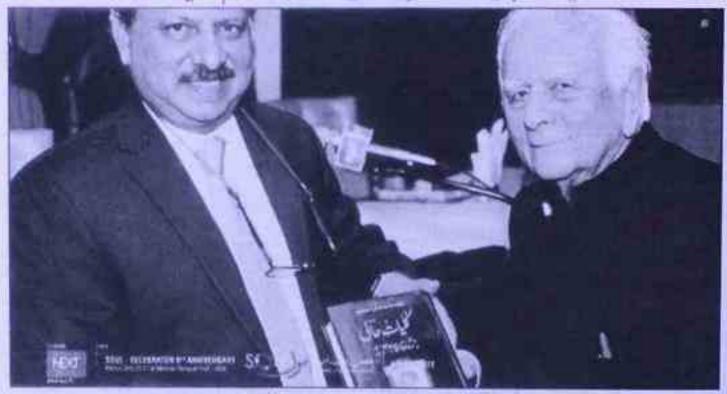
سول کے چیئرمین ابوالحسن نغمی ورجینا امریکا میں ''کلیات حالی'' کی رونمائی کرتے ہوئے
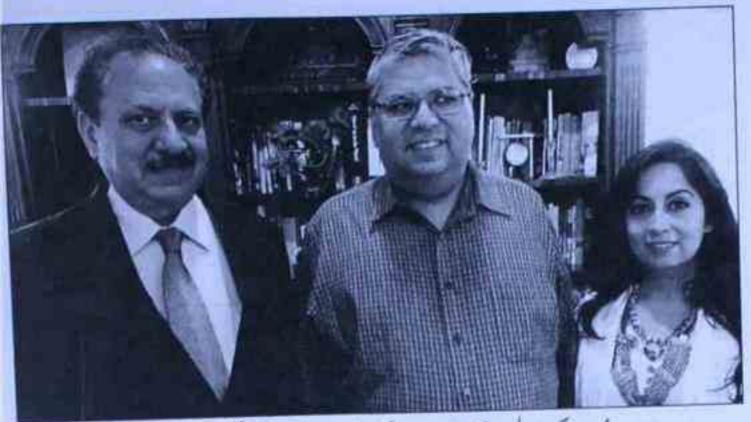
اُردو مرکز ڈالس کے چیئرمین ڈاکٹر سلیمان اوران کی بیگم کے ہمراہ

محفل ''اظہار'' ٹورنٹو میں، دائیں سے بائیں
(ایستادہ) ریحان، صبا، منور جہاں، عاصم، فیصل (بیٹھے ہوئے) تقی عابدی، صبیح رحمانی، ذکیہ غزل

اسپین میں توسیعی لکچر، دائیں سے بائیں: کیانی، نا معلوم، تقی عابدی، ارم بتول، حافظ اور نذیر ساحل

لندن میں ''مسدس حالی'' اور ''حالی فہمی'' کی رونمائی

دائیں سے بائیں: نا معلوم، یاور علی، تقی عابدی، ایوب اولیا، ہما اور نا معلوم

ایوب اولیا اور شاعر خان صاحب کے ساتھ

ڈاکٹر جاوید کے ساتھ

دائیں سے بائیں: واشنگٹن میں خلش، تقی عابدی، ساجد اور باقر زیدی

ناٹنگھم، دائیں سے بائیں: شہزاد، تقی عابدی، فرزانہ خان اور دو خاتون

دائیں سے بائیں: زیبا، ارم بتول، تقی عابدی، شفیق مراد اور خاتون
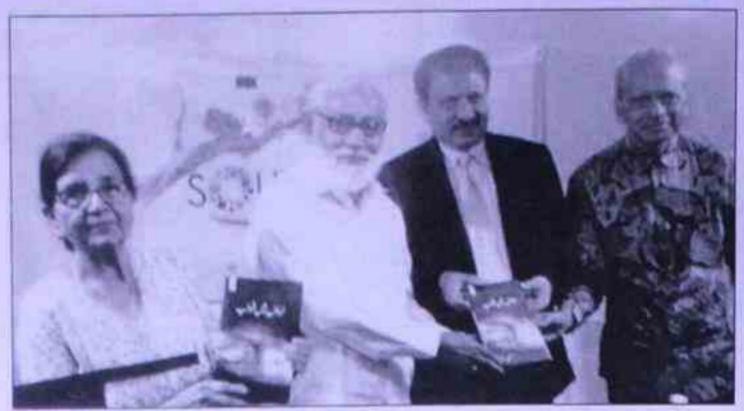
دائیں سے بائیں: معظم صدیقی صدر VOA، تقی عابدی، نا معلوم، بیگم نغمی کے ساتھ

سول ورجینا میں معظم صدیقی اور بیگم نغمی کے ساتھ لکچر

دائیں سے بائیں: صدر اقبال اکاڈمی حیدرآباد دکن، غلام یزدانی نے استقبال کیا

نظام آباد یونی ورسٹی میں شال پوشی

تحریک آزادی لکچر میں ڈاکٹر سیدین اور عراق زیدی کے ساتھ

صدر اُردو اکاڈمی پروفیسر شکور کے ساتھ

جموں یونی ورسٹی میں خطبہ

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، پروفیسر ریاض احمد، شہاب ملک، وائس چانسلر شرما، صغیر افراہیم، علی جاوید

کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے

دائیں سے بائیں: بھتیش پیارے، شہاب ملک، تقی عابدی، وائس چانسلر شرما، صغیر افراہیم، علی جاوید

دائیں سے بائیں: فاطمہ حسن، تقی عابدی، نامعلوم، سحر انصاری

دائیں سے بائیں: خواجہ اکرام، صدیق الرحمان قدوائی، رضا حیدر اور تقی عابدی

دائیں سے بائیں: شوکت زیدی، تقی عابدی، فرحت شجاعت، نا معلوم

شریمتی دیوی نے مرثیہ کانفرنس میں ایوارڈ حاصل کیا

دائیں سے بائیں: کامنا پرساد، عمار رضوی، خواجہ اکرام، تقی عابدی، عارف نقوی، شارب ردولوی

دائیں سے بائیں: اطہر حسین، تقی عابدی، عقیل عباس جعفری

دائیں سے بائیں: تقی عابدی، گورنر اتر پردیش، حمید صاحب، عمار رضوی

نصرت مہدی صاحبہ سے پھول کا گلدستہ لیتے ہوئے

''کاشی سے کربلا تک'' کے گروپ میں، کامنا پرساد اور نصرت مہدی کے ساتھ

خورشید رضوی سے ایوارڈ (دوحہ کی مجلس) میں لیتے ہوئے محمد عتیق اور دیگر کارکنوں سے دوحہ مجلس کا ایوارڈ لیتے ہوئے

میر انیس کے بھائی میر انس کے پرپوتے

اور پیارے صاحب رشید کے بھانجے

سلطان صاحب فرید

کے غیر مطبوعہ مرثیوں، سلام اور رباعیات کا مجموعہ

اظہارِ حق کی رسم اجراء

(تحقیق و تدوین، ڈاکٹر سید تقی عابدی مقیم کینیڈا)

بسمہٖ سبحانہٗ

ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب (کینیڈا)

کی تازہ ترین کتاب

کائنات نجم

(علامہ نجم آفندی شاعر اہل بیت)

کی رسم رونمائی

زیر صدارت

پروفیسر ڈاکٹر نیر مسعود صاحب مدظلہ

بمقام **گولڈن پیلس** (لکھنؤ)

بتاریخ ۱۵ جنوری ۲۰۰۹ صبح ۹ بجے

زیر اہتمام

چشم براہ

رسم اجرا

حضرت سلطان صاحب فرید لکھنوی اعلی اللہ مقامہٗ

کی

غیر مطبوعہ رباعیات، سلام، اور مراثی کا مجموعہ

اظہارِ حق

تحقیق۔ تدوین و ترتیب ڈاکٹر سید تقی عابدی

کا رسم اجراء

۶ اگست ۲۰۰۳ء بروز چہار شنبہ ۷½ ساعت شام

بمکان سجاد نظر صاحب روبرو مسکو ہاسپٹل کالی قبر روڈ

بدست، علامہ سہیل آفندی صاحب عمل میں آئیگا

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید سابق صدر شعبۂ اردو وینکٹیشورا یونیورسٹی جلسہ کی صدارت فرمائینگے

ڈاکٹر حسن اختر کے خطبۂ استقبالیہ کے بعد ڈاکٹر علی احمد جلیلی، ڈاکٹر صادق نقوی

اور جناب ہاشم حسن سعید مہمانان خصوصی کی حیثیت سے مخاطب فرمائینگے

رسم اجراء کی محفل کے بعد غیر طرحی مسالمہ منعقد ہوگا۔

زیر اہتمام

ڈاکٹر سید اختر احمد ایجوکیشنل ٹرسٹ

معتمد جلسہ، سید عزیز اختر — معتمد مسالمہ، سجاد نظر

ادبی کانفرنس، قوال مشاعرہ

نیشنل پیس میکرس فاؤنڈیشن بنگلور
Venue
Ravindra Kalakshetra
J.C.Road, Bengaluru
Date: 24-12-2016
Time: 9:30 PM
عالمی مشاعرہ
بہ اشتراک کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور
مہمانانِ خصوصی

اردو اکادمی
دہلی
کی جانب سے
کناڈا سے تشریف لائے معروف دانشور و ادیب ڈاکٹر تقی عابدی کا
توسیعی خطبہ
"پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے"
صدارت : ڈاکٹر سید ظفر محمود، چیئرمین اقبال اکیڈمی و صدر زکوٰۃ فاؤنڈیشن، انڈیا
خیر مقدم : ڈاکٹر ماجد دیوبندی، وائس چیئرمین، اردو اکادمی، دہلی
تاریخ و وقت : ۲۲ر دسمبر ۲۰۱۶ء، شام چار بجے
مقام : قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم، اردو اکادمی، دہلی
سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی
آپ سے بہ پابندیٔ وقت شرکت کی درخواست ہے
سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ
کشمیری گیٹ، دہلی
23863858
23863566
ایس۔ ایم۔ علی
سکریٹری

کلیات شاداں اندوری کا اجراء
سیمینار اور مشاعرہ
پروگرام

ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کے ساتھ

ادبی محفل

حالی کی پرپوتی، رابطہ تعلیمات

خواجہ غلام سیدین کی بیٹی مولانا آزاد یونیورسٹی کی سابق چانسلر، حقوق نسواں کی نگہبان،
متعدد کتابوں کی مصنفہ ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کے ساتھ ایک ادبی شام منعقد کی جا رہی ہے
جس میں ان کی دو کتابوں کی رونمائی ہوگی۔ محترمہ سیدین اپنی تصانیف پر سیر حاصل گفتگو کریں گی
اور خطبے کے بعد ماحضر بھی ہوگا۔

میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں
خطاب
ڈاکٹر سید تقی عابدی، کناڈا
26th December-16
Time: 10:30
Venue
Lecture Room 212, Committee Room
SL Old Building, JNU
Dr. Syed Taqi Abedi (Canada)
Prof. S.M.Anwar Alam
Chairperson
Prof. Khwaja Md Ekramuddin
Convener
Organized by: Centre of Indian Languages

یک روزہ بین الاقوامی سمینار
عنوان: "غالب کی شاعری میں ترقی پسند رجحانات"
کلیدی خطبہ: ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا)
زیر اہتمام: شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی
مورخہ: 7 جنوری 2017ء
بمقام: پروفیسر گیان چند جین سمینار ہال شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی
One Day International Seminar
Topic: "Progressive Trends in the Poetry of Mirza Galib"
Key note Address: Dr.Taqi Abdi (Canada)
Organizer: Deptt. of Urdu, University of Jammu
Date: 7th of January,2017
Venue:Prof.Gian Chand Jain Seminar Hall of Urdu,Deptt.Jammu University

رسم اجراء
جنگ آزادی میں اردو شعراء کا کردار
مرتبہ: افشاں انجم
ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا)، پروفیسر اختر الواسع،
پروفیسر یوسف عامر (مصر)،
پروفیسر عراق رضا زیدی، ڈاکٹر سیدہ سیدین،
ڈاکٹر شہوار نقوی، سراج مہدی
پروفیسر عباس رضا نیر جلال پوری،
پروفیسر شہاب ملک
کا استقبال

JNU

تقریب رسم اجرا

تاریخ: 20-02-2017

ڈاکٹر سید تقی عابدی: بحیثیت نقاد و محقق

مصنف: محمد رکن الدین

مہمان خصوصی: ڈاکٹر سید سیدین حمید (سابق ممبر پلاننگ کمیشن)

مہمان اعزازی: ڈاکٹر سید تقی عابدی (کناڈا)

صدارت: پروفیسر شہاب عنایت ملک (جموں یونیورسٹی، جموں)

تعارفی کلمات: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین (جے این یو، دہلی)

نظامت: ڈاکٹر شفیع ایوب

مقررین:

پروفیسر انور پاشا، پروفیسر ابن کنول

پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر اطہر فاروقی

ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر محمد کاظم،

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، خالد انور

ڈاکٹر سید تقی عابدی

بحیثیت نقاد و محقق

محمد رکن الدین

پروگرام

مورخہ 25 فروری 2017 بروز ہفتہ

بوقت 11 بجے دن

بمقام

پاکستان اسٹڈی سنٹر

پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس لاہور

Writers' Forum-Kuwait

Welcomes

Dr. Taqi Abedi
(Canda)

Dr. Taqi Abidee, an Urdu Scholar

To deliver
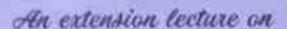
"Ghalib kaa hai andaaz-e-Bayan aur"

Venue:- Titanic Complex, Salmiya-Kuwait Date :- 3rd Nov 2017

To continue the glorious tradition of mushaira in our city
We cordially invite you to

Mushaira Jashn-e-Bahar

on Friday 13th April, 2018 at 6.30 p.m.
at Delhi Public School, Mathura Road, New Delhi-110003

Dr S Y Quraishi, Former CEC, will **Preside**
Pandit Birju Maharaj, Legendary Kathak Maestro will be the **Chief Guest**

Kamna Prasad
Jashn-e-Bahar Trust

M R Morarka Foundation

Mushaira Jashn-e-Bahar

کلیاں بھی گیت گاتی ہیں گلشن میں پیار کا
ہے بیسواں مشاعرہ جشن بہار کا
ایسے عظیم شعرا نے اس میں پڑھا کلام
معیار بن گیا ہے یہ اردو وقار کا

कलियाँ भी गीत गाती हैं गुलशन में प्यार का
है बीसवाँ मुशायरा जश्न-ए-बहार का
ऐसे अज़ीम शोअरा ने इसमें पढ़ा कलाम
मयार बन गया है ये उर्दू वक़ार का

Dr Taqi Abedi

Join us in Mushaira Jashn-e-Bahar at DPS, Mathura Road in New Delhi, 13 April 2018 at 7:00PM

CONFERENCE
WHY THE 21ST CENTURY'S
WORLD NEEDS
THE MAVLANA TEACHINGS?
SPEAKER
DR. SYED TAGHI ABEDI
THE SCARBOROUGH HOSPITAL / CANADA
4
MARCH 2019
MONDAY
10:30 A.M
SELCUK UNIVERSITY
MUSEUM BUILDING
AUDITORIUM

İstanbul Üniversitesi
Edebiyat Fakültesi
Urdu Dili ve Edebiyatı Anabilim Dalı
SEMİNER
"Modern Urdu Şiiri ve
Emced İslâm Emced"
Konuşmacılar

ZORE
FOUNDATION
"امجد حیدرآبادی کی رباعیات میں آفاقی قدریں"
آپ سے مع احباب بہ پابندی وقت شرکت کی پر خلوص درخواست کی جاتی ہے

توسیعی لکچر
عالم انسانیت کے رہبر حضرت امام حسینؓ
ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینڈا)
صدارت: مولانا محمد رحیم الدین انصاری
مہمانانِ خصوصی
پروفیسر فاطمہ بیگم پروین
پروفیسر محمد نسیم الدین فریس
آپ سے مع احباب بہ پابندی وقت شرکت کے خواہش مند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علامہ اقبالؒ اور عشقِ رسولﷺ

کی محمدﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
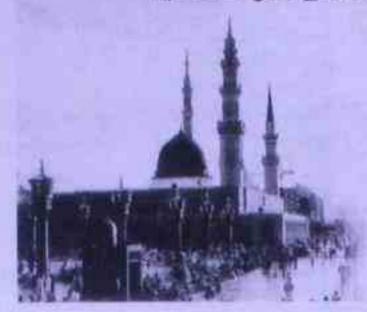
Extension Lecture:
Dr. Syed Taqi Abedi
Expert in Iqbaliyaat, International Speaker, Scholar, Poet,Author of over 80 books, International Awards Winner

Host:
Imam Ilyas Sidyot
Dr. Tahir Abbas

Saturday: 18th April, 2020
Time: 8:30 pm

Join Zoom Meeting
Meeting ID: 751 520 8388
Password: 587423

For Further Information: Qasim Ali 306-717-0937

WORLD URDU ASSOCIATION
NEW DELHI, INDIA

عہد حاضر میں فراق فہمی کی اہمیت
کے عنوان پر

ڈاکٹر سید تقی عابدی، کناڈا
کا آن لائن خصوصی خطبہ اور مذاکرہ

Date: 13th June 2020
Time: 9:00 PM (India)
11:30AM (New York)
11:30AM (Toronto)
4:30PM (London)

ZOOM
Meeting ID: 443 863 5323
Password:Taqiabedi